مصفاة الينابيع
شرح
مشكوة المصابيح
جلد اول
مقدمه • كتاب الايمان • كتاب العلم
شارح
مفتی محمد طاہر صاحب
استاذ حدیث ومفتی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور
مکتبہ سعدیہ دار العلوم غازی آباد
رسول پور، سکروڈہ، غازی آباد، یوپی

مصفاۃ الینابیع

شرح

مشکوٰۃ المصابیح

جلد اول : مقدمہ، کتاب الایمان، کتاب العلم

شارح

مفتی محمد طاہر صاحب استاذ حدیث ومفتی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

معاون:

مفتی بشیر احمد استاذ و معین مفتی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

تخریج:

مفتی محمد اسرار استاذ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

ناشر

مکتبہ سعیدیہ

دارالعلوم غازی آباد رسول پور، سکروڈہ، غازی آباد، یوپی

تفصیلات

نام کتاب: .... ''مِصْفاۃ الیَنابیع'' شرح مشکاۃ المصابیح (جلد اول)

شارح: .... مفتی محمد طاہر صاحب زید مجدہٗ مفتی واستاذ حدیث مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

معاونت: .... مفتی بشیر احمد، معین مفتی مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

تخریج: .... مفتی محمد اسرار، استاذ مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

کمپوزنگ: .... سلیم احمد دھانوی دفتر تعلیمات مظاہر علوم سہارنپور (یوپی)

اشاعت: .... شعبان ۱۴۴۲ھ مطابق اپریل ۲۰۲۱ء

تعداد: .... گیارہ سو

ملنے کے پتے:

(۱) مکتبہ سعیدیہ، دارالعلوم غازی آباد، ، رسولپور سکروڈہ، غازی آباد، فون نمبر: 08595480031

(۲) کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند، سہارنپور، فون نمبر: 01336223294 - 09756202118

(۳) مکتبہ حکیم الامت، نزد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، فون نمبر: 09759870037

(۴) ادارہ فیض شیخ، اشرف نگر، احمد آباد، ۵۵، فون نمبر: 09904152928

(۵) مکتبہ ابن عباس، نزد مظاہر علوم سہارنپور فون نمبر: 9045555413

فهرست
مِصُفاة اليَنابيع شرح مشكوة المصابيح

تمت بالخیر

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا سید محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث وناظم جامعہ مظاہر علوم سہارنپور

دینی مدارس میں دورۂ حدیث سے پہلے مشکوٰۃ شریف موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہے اس لیے اس کا درس طالب علم اوراستاذ دونوں ہی کے لیے بڑی خصوصیت اوراہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

ہمارے مدرسہ میں درسِ مشکوٰۃ کی یہ ذمہ داری ایک عرصہ (۱۴۲۲ھ سے ۱۴۳۳ھ) تک محبّ گرامی قدر جناب مفتی محمد طاہر صاحب زیدمجدہم پررہی ہے، جوماشاء اللہ صاحب نظرفقیہ اورکہنہ مشق مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ، بااستعداد استاذ اور کامیاب مدرس بھی ہیں، فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کے خلفاء اورمعتمد تلامذہ میں سے ہیں، بلکہ کچھ عرصہ تک آپ کی نگرانی اورسرپرستی میں ’’الأشباہ والنظائر‘‘ کا درس بھی دے چکے ہیں۔

آپ کا ’’درسِ مشکوٰۃ‘‘ اپنی حسنِ ترتیب، جامعیت اورافادیت کی بناپر طلبہ میں نہایت مقبول تھا، اسی لیے بہت سے طلبہ بڑے اہتمام سے اس کو ضبط بھی کرتے تھے۔

چونکہ طلبہ ہی کے ذریعے مجھے آپ کے درس کی اِن خصوصیات اورنافعیت کا علم ہوتارہتاتھا، اس لیے میری خواہش تھی کہ آپ کے یہ افادات طبع ہوکر شائع ہوجائیں، تاکہ یہاں کے طلبہ کے علاوہ دیگرمدارس کے طلبہ اوراساتذہ بھی ان سے استفادہ کرسکیں۔

میں نے اپنی اس خواہش کا اظہارمفتی صاحب سے کیا تو انھوں نے اِس طرف توجہ کی، پھرمیری ہی بار بار کی تحریک اورتقاضے سے اس پر باقاعدہ نظرثانی اور تحقیق وتہذیب کا کام شروع ہوا، اِس وقت سردست کتاب العلم کے آخرتک کی احادیث کی تشریح وتحقیق پرمشتمل جلد اول طباعت کے لیے تیارہے، جس کے شروع میں تقریباً ستر صفحات پرمحیط ایک نہایت بسیط اوربصیرت افروز مقدمہ بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مؤلف زیدمجدہم کی صحت اورعمرمیں برکت کے ساتھ، جلد ازجلد اس سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچادیں، اوراس خدمت کوشرفِ قبول عطافرماکر طالبین وشائقین کے لیے نافع اورمفتی صاحب کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں، اورالدال علی الخیر کفاعلہ کے قاعدہ سے ان کے اجروثواب میں میرابھی حصہ لگادیں، آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ وأصحابہ اجمعین، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

محمد عاقل عفی عنہ

۱۰؍ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی زید مجدہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند وخلیفہ حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

مشکوٰۃ المصابیح کتب احادیث میں اپنی چند در چند خصوصیات کی بنا پر بہت اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، جن کی تفصیل پیش نظر کتاب کے مقدمہ میں ذکر کی گئی ہے، اسی بنا پر درس نظامی کے نصاب تعلیم میں دورۂ حدیث سے پہلے اہمیت کے ساتھ مشکوٰۃ شریف کا درس دیا جاتا ہے اور پوری کتاب ترجمہ وتشریح کے ساتھ پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کتاب کے ذریعہ طلبہ عزیز کو احادیث سے اتنی مناسبت ہوجاتی ہے کہ دورۂ حدیث کے سال تیز رفتار درس حدیث کے دوران تقریباً تمام ابواب کے مضامین سے اجمالاً سبھی کے کان آشنا ہوجاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب ''شرح مشکوٰۃ شریف'' محبّ مکرم جناب مولانا مفتی محمد طاہر صاحب کے درسی افادات پر مشتمل ہے، مفتی صاحب جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے دارالافتاء میں ایک ذمہ دار اور وسیع النظر مفتی کے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ اہم کتابوں کی تدریس کی ذمہ داری بھی پوری کرتے ہیں۔

اس سے قبل علامہ ابن نجیم کی قواعد الفقہ سے متعلق اہم ترین کتاب ''**الاشباہ والنظائر**'' کی شرح ''**عقود الجواهر**'' کے نام سے جناب مفتی محمد طاہر صاحب کے درسی افادات پر مشتمل شائع ہوچکی ہے اور اہل علم سے سند قبول حاصل کرچکی ہے۔

پیش نظر شرح میں جن امور کا اہتمام کیا گیا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱- کتاب کے آغاز میں مقدمۃ العلم اور مقدمۃ الکتاب کے عنوان سے بیش قیمت مباحث۔

۲- ہر حدیث کے راوی کا تعارف اور ان کے احوال کا تذکرہ۔

۳- احادیث مبارکہ میں وارد جملوں اور کلمات کی لغوی، نحوی اور صرفی ضروری تحقیق۔

۴- حدیث سے حاصل ہونے والے فقہی مسائل کی توضیح۔

۵- احادیث کی تخریج اور دیگر درج شدہ مضامین کے حوالہ جات کی نشاندہی وغیرہ۔

ان کے علاوہ شرح میں دیگر متعدد امور کی رعایت کی گئی ہے، جن کا اندازہ مطالعہ کنندگان خود کرلیں گے، مذکورہ بالا امور کی بناپر کہاجاسکتاہے کہ انشاء اللہ یہ کتاب طلبہ عزیز کے لیے حل کتاب کے سلسلہ میں بہترین معاون ثابت ہوگی، اللہ تعالیٰ اس علمی خدمت کوشرف قبولیت سے نوازے اور طلبہ عزیز کے لیے نافع بنائے۔آمین

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۴۴۲/۳/۴ھ/۲۲/۱۰/۲۰۲۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہم
شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ تعلیم الدین، ڈابھیل گجرات
وخلیفہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم .

برصغیر ہند وپاک کے علماء کرام کو اللہ تعالی نے اس آخری دور میں کتب احادیث کی خدمت کی خاص توفیق عطا فرمائی ، انہوں نے متداول کتب احادیث کی بہت سی شروح عربی زبان میں لکھی ہیں جو عرب دنیا میں مقبول ہیں ،اور بہت سی شروح اردو میں بھی لکھی گئی ہیں ، اسی سلسلہ کی اہم کڑی مشکوۃ المصابیح ہے، اس کی بہت سی شرحیں عربی ، فارسی ، اردو زبان میں لکھی گئی ہیں ، اس کی وجہ یہ ہے کہ: اہل علم جس کتاب کو جس درجے اور رتبے کی سمجھتے ہیں ، اسی حد تک اس پر کام کرتے ہیں ، اس کے حواشی ، رجال ، شروح، تعلیقات اور اشاریوں وغیرہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، اور اسی سے کتاب کے مقام و مرتبہ کا تعین ہوجاتا ہے، چنانچہ ''مشکوۃ المصابیح'' اسی نوع کی کتاب ہے۔

اس کی امتیازی شان یہ ہے کہ: اس میں صحاح ستہ کے علاوہ دیگر کتب احادیث مثلاً : شعب الایمان للبیہقی ، مسند احمد ، مسند رزین وغیرہ کی احادیث وافر مقدار میں موجود ہیں، ''مشکوۃ المصابیح'' میں ایک خصوصیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ: اس میں ان احادیث کی روایت کا التزام نہیں کیا گیا کہ جن کے سمجھنے میں قاری کو دشواری اور مشکلات کا سامنا ہو، بلکہ بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ مشکوۃ المصابیح کو ابتدائی تعارف یا ایک عام مسلمان کے لئے احادیث نبویہ سے علمی و عملی تعلق وربط پیدا کرنے کے لئے منصۂ شہود پر لایا گیا تھا ، چنانچہ آج بھی مدارس اسلامیہ میں اس کو صحاح ستہ سے پہلے پڑھایا جاتا ہے ، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ تعارف کا اول مرحلہ ایسی کتاب کے ذریعہ ہو کہ جس میں نہ اتنا طول ہو کہ صرف منتہی طلبہ ہی اس سے استفادہ کرسکیں ، اور نہ ہی اتنا اختصار ہو کہ جس سے عام قاری بدکنے لگیں۔

دوسری طرف یہ بات ہے کہ: اگر صحیح بخاری کو یہ رتبہ حاصل ہے کہ مصائب و مشکلات میں اس کا ختم کرایا جاتا ہے ،تو مشکوۃ شریف کو یہ مقام حاصل ہے کہ وہ صوفیا کے حلقہ میں زیر درس رہی ہے ،صوفیائے کرام نے حدیث کے اس مجموع کو اذکار و وظائف سے معمور زندگی میں اس وجہ سے مقدم رکھا کہ یہ کتاب فن حدیث کی دیگر کتابوں کی طرح اطناب و ایجاز پر مشتمل نہیں ہے۔

ماضی قریب میں شمالی ہند میں آزادی کی جد و جہد کرنے والے جن کی قیادت حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی قدس سرہ (م ۱۲۴۶ھ) فرمارہے تھے ، ان کا اپنے مجاہدین کے سلسلے میں یہ طریقۂ کار رہا کہ: مشکوۃ شریف کے درس و

تدریس کا التزام تھا، درس کی ذمہ داری حضرت شاہ اسماعیل علیہ الرحمۃ (م ۱۲۴۶ھ) انجام دیتے تھے، البتہ اسرار و رموز اور نکات و حِکم حضرت سید احمد بریلویؒ بیان فرماتے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ (م ۱۱۷۴ھ) کی معرکۃ الآراء تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' جو علوم اسرارِ الٰہیہ اور حِکمات شرعیہ کے موضوع پر مشتمل ہے، مثالی کتاب ہے، اس کے متعلق صاحب النظر علماء کی یہ رائے ہے کہ: وہ درحقیقت مشکوۃ شریف کی شرح ہے، جو حضرات کتاب کی ظاہری ترتیب سے ہٹ کر تخریج احادیث پر عمیق نظر رکھتے ہیں، وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ شاہ صاحب عموماً مشکوۃ شریف کی احادیث کو پیش نظر رکھ کر امت مسلمہ کے سامنے اپنے قیمتی جواہر پیش کرتے تھے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ (م ۱۳۷۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

''جس طرح ہندوستان میں بخاری کی متعدد شروح مختلف علماء کے قلم سے پائی جاتی ہیں، مشکوۃ کے حواشی و شروح کی تعداد تو ان سے کہیں زیادہ ہے، آخر میں دنیائے اسلام کی وہ نادرو بے مثال کتاب جس کا نام ''حجۃ اللہ البالغہ '' ہے، بہ ظاہر وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی کوئی مستقل کتاب معلوم ہوتی ہے، لیکن اپنے تجربہ وتتبع کی بنیاد پر میرا یہ خیال ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ''مشکوۃ'' ہی کو سامنے رکھ کر ہر باب کی حدیثوں کو مجموعی نقطۂ نظر سے کچھ اس طرح مرتب فرمایا ہے کہ: اسلام ایک فلسفے کی شکل میں بدل گیا ہے، ایسا فلسفہ جس کی طرف نہ رہنمائی پہلوں کو میسر آئی اور نہ پچھلوں کو، اسی لئے میں ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو عموماً مشکوۃ ہی کی ایک خاص شرح قرار دیتا ہوں۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۱/۲۰۱)

زیر نظر کتاب ''مصفاۃ الینابیع'' جو درحقیقت مولانا مفتی محمد طاہر صاحب زید مجدہ (صدر مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) کا درس مشکوۃ ہے، شرح احادیث کی عمدہ کاوش ہے، مفتی صاحب موصوف ماشاء اللہ صاحب نظر فقیہ اور کہنہ مشق مفتی ہونے کے ساتھ ساتھ بااستعداد استاد اور کامیاب مدرس بھی ہیں، ان کے ان درسی افادات کی اہمیت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ: حضرت مولانا محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم (شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور) جیسے کہنہ مشق محدث اور ''الدر المنضود علی سنن ابی داوٗد'' کے مصنف نے بار بار انہیں مشکوۃ شریف کے درسی افادات جمع کر کے طبع کرنے کی تاکید کی، حضرت دامت برکاتہم کی تقریظ میں یہ بات موجود ہے ''ہیرے کی پرکھ جوہری جانے'' مثل مشہور ہے، یعنی اہل ہنر کو قدرداں ہی پہچانتے ہیں۔

دل سے دعا کرتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ اس کتاب کے فیض کو عام و تام کرے، اور شارح کو کتاب کے بقیہ حصوں کی تکمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

املاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۴۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ

حضرت اقدس مولانا محمد ابراہیم صاحب پانڈور زید مجدہم
خلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ
وجانشین فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین.

امابعد! مشکوٰۃ المصابیح حدیث نبوی کی ایک جامع اور بنیادی کتاب ہے، جس میں صحاح ستہ اور دیگر معتبر کتب احادیث سے تقریباً ۵۹۴۵ حدیثیں جمع کی گئی ہیں، یہ کتاب درس نظامی میں برسہابرس سے داخل نصاب ہے، اور دورۂ حدیث کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتی ہے، بہت دنوں سے اس کتاب کی اردو میں ایک جامع، مختصر اور آسان شرح کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔

چنانچہ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود الحسن صاحب نوراللہ مرقدہ کے لائق فائق شاگرد اور خلیفہ ومجاز حضرت مفتی محمد طاہر صاحب مدظلہ العالی استاذ حدیث وصدر مفتی مظاہرعلوم سہارنپور کے درس مشکوٰۃ شریف کی مقبولیت کودیکھ کر مدرسہ مظاہرعلوم سہارنپور کے صدرالمدرسین وشیخ الحدیث حضرت مولانا عاقل صاحب دامت برکاتہم نے انہیں حکم فرمایا کہ آپ اپنے درس کوقلم بندکراکر مرتب فرمادیں، انشاءاللہ اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

حضرت مفتی محمد طاہر صاحب مدظلہ العالی نے کام شروع کیا، جس کی پہلی جلد الحمدللہ مکمل ہوگئی، حضرت مولانا عاقل صاحب زیدمجدہ ہی کے مشورہ سے ''مِصْفاة اليَنابيع '' نام تجویز کیا گیا، الحمدللہ یہ شرح اسم بامسمّیٰ ہے، تشریح صاف شفاف، آسان اور تشفی بخش ہے، نہ اختصار مخل ہے نہ تطویل ممل ہے، اور ینابیع ومراجع کے حاشیہ میں حوالجات بھی موجود ہیں، جس کی مدد سے اصل کتاب تک رسائی آسان ہے، اور کتاب کے شروع میں ۶۷ صفحہ کا قیمتی مقدمہ ہے جس میں بعض ضروری عناوین بالکل نئے انداز میں مؤلف زیدمجدہ نے قائم فرمائے ہیں، یہ مقدمہ گویا کہ دریا کو کوزہ میں سمودیا گیاہے، نیز مقدمۃ العلم اورمقدمۃ الکتاب کو جامع ہونے کے ساتھ افادۂ عامہ پربھی مشتمل ہے، جیسے ایک عنوان ''آداب الطالبین'' ہے، جو ہرطالب علم کے لئے ضروری اورمفید تر ہے۔

مولانا موصوف کی اس سے قبل حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کے افادات پرمشتمل ''الاشباہ والنظائر '' کی شرح

''عـقـود الـجواهر '' کی دوجلدیں منظرعام پرآ چکی ہیں جوطلبہ افتاء ومفتیان کرام کے نزدیک منظورومقبول ہیں، یقیناً یہ سب حضرت رحمہ اللہ ہی کا فیضان اورخصوصی توجہ کی برکت ہے **اللھم زد فزد**.

امید ہے کہ ان شاء اللہ یہ محنت بھی عنداللہ وعندالناس قبولیت کا مرتبہ حاصل کرلے گی، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ موصوف کی اس خدمت کو بے انتہا قبولیت عطافرمائے اوراساتذہ وطلبہ ہرایک کے لئے خوب خوب نافع بنائے اوراس شرح کی جلدتکمیل کی توفیق فرمائے۔

ایں دعا ازمن واز جملہ جہاں آمین باد

وصلی اللہ علی خیرخلقه سیدنا ومولانا محمد وعلی آله واصحابه اجمعین

وأنا العبد

محمد ابراہیم
جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ)

پیش لفظ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین وعلی من تبعھم باحسان إلی یوم الدین ......امابعد

بحمداللہ اِس زمانہ میں علم کے وسائل وذرائع ماضی کی بہ نسبت کثیر ہیں، اسی لئے اب علم کی تحصیل بہت سہل وآسان ہوگئی ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ علم کی راہ میں جس قدر سہولتیں وآسانیاں پیدا ہورہی ہیں اتنی ہی علمی پختگی میں کمی واقع ہوتی جارہی ہے، بالخصوص علوم عربیہ ''نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع وغیرہ میں عموماً وہ استعداد پیدا نہیں ہو پاتی جوعلوم مقصودہ ''قرآن وحدیث اوران سے مستنبط شدہ علوم کوکما حقہ سمجھنے کے لئے درکار ہے إلاماشاء اللہ فالی اللہ المشتکیٰ وھو المستعان.

اِسی وجہ سے موجودہ دور میں علماء نے کتبِ درس نظامی کی اردو شروحات پرتوجہ مبذول فرمائی ہے، ورنہ قدیم زمانہ میں اردو شروحات کارواج نہ تھا۔

درسِ نظامی کے نصاب کے مطابق طلباء کے لئے حدیث کی ابتدائی کتاب مشکوۃ شریف ہے، لیکن اس کتاب کو حق تعالیٰ شانہ نے انتہائی مقبولیت عطافرمائی ہے، یہ کتاب ہمیشہ اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی بلکہ وقتِ تالیف سے آج تک عوام وخواص سب کے لئے مرجع بنی ہوئی ہے، اورصحاح ستہ کے درس کے لئے موقوف علیہ کا درجہ رکھتی ہے۔

مظاہرعلوم سہارنپور میں تقریباً بارہ سال تک اس کا درس (مکمل مشکوۃ کا بھی اوراخیر کے چند سال جلد اول کا)احقر سے متعلق رہا، نمونۂ اسلاف شیخ کامل حضرت مولانا سید محمد عاقل صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث وناظم مظاہرعلوم سہارنپور نے اپنے حسنِ ظن کی بناپر احقر کے سبق پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''میں یہ چاہتاہوں کہ تمہارا یہ درس شرح کی صورت میں آجائے جس سے دیگرمدارس کے طلباء واساتذہ بھی استفادہ کرسکیں اس لئے اس کی شرح کا کام شروع کرو''۔

بندہ اپنی علمی کم مائیگی کی بات سوچ کر خاموش رہ گیا، لیکن حضرت دامت برکاتہم متعدد مواقع پر یہ بات دہراتے

رہے، بالخصوص جب ''عقود الجواھر شرح الاشباہ والنظائر '' کی جلد اول بندہ کی طرف سے طبع ہوکر آئی اس وقت حضرت نے شرح مشکوۃ کے لئے تقاضہ کے طور پر امر فرمایا، اس وقت دل میں یہ بات آئی کہ اگر چہ احقر کی وہ صلاحیت نہیں ہے جو مشکوۃ جیسی اہم کتاب کی شرح کے لئے درکار ہے، لیکن جب حضرت بار بار اِس طرف توجہ دلارہے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے فضل سے اِس ناتواں سے یہ عظیم خدمت لے لے، کیونکہ مشہور ہے ''قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید'' کہ اہل اللہ جو کہتے ہیں وہ نورِ فراست سے دیکھ کر کہتے ہیں، اور جب اللہ چاہتا ہے تو مکڑی سے بھی کام لے لیتا ہے۔

چنانچہ اللہ پر بھروسہ کر کے حضرت دامت برکاتہم کی سرپرستی میں تقریباً ایک سال قبل باقاعدہ شرح کے طور پر کام شروع کیا گیا، تاوقتِ تحریر الحمدللہ کتاب العلم کے آخر تک کی احادیث کی تشریح وتحقیق مکمل ہوگئی ہے جو جلد اول کے طور پر طباعت کے لئے تیار ہے۔

چونکہ حضرت کا مقصود وقت کی ضرورت کی وجہ سے مشکوۃ کی ایک متوسط شرح ہے، جس میں نہ طوالتِ ممل ہو، جو اکتاہٹ کا سبب بنے، نہ اختصارِ مخل ہو کہ ضرورت کے مضامین بھی ناقص رہ جائیں اور طلباء تشنگی محسوس کریں، اس لئے اِس شرح میں توسط واعتدال کو قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، اِسی بات کو ذہن میں رکھ کر ارادہ یہ ہے اور تخمینہ بھی یہی ہے کہ تقریباً چھ جلدوں میں اِس شرح کی تکمیل ہوجائے، اس شرح میں درجِ ذیل امور ملحوظ ہیں:

(۱) کتب حدیث کی تدریس کا جو طرز مدارس میں رائج ہے اس سے پورے طور پر مناسبت پیدا ہونے کے لئے حدیث کے مبادیاتِ عشرہ کا بیان کافی نہیں، بلکہ ابتدائی اور بھی کچھ مباحث ایسے ہیں جن سے طلباء کو واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً تدوینِ حدیث کے مراحل، منکرینِ حدیث کے شبہات کا جواب، علم الحدیث فی الھند، تعلق علم الفقہ بعلم الحدیث، مقام الامام الاعظم ابی حنیفۃ فی الحدیث، وغیرہ امور ایسے ہیں جن میں عام طلبہ اخیر تک بھی تشنگی محسوس کرتے ہیں، اِس ضرورت کا احساس کر کے کتاب کے شروع میں ایک بسیط ومفصل مقدمہ تحریر کیا گیا، اس کے مطالعہ سے طلباء کے قلوب میں حدیث کی اہمیت پیدا ہوگی، ذوق وشوق بڑھے گا اور ان کی بصیرت میں اضافہ ہوگا۔

(۲) مشکوۃ کے کتب وابواب کا باہمی ربط، مشکوۃ کی ایک خصوصیت ''حسن ترتیب'' ہے یعنی مشکوۃ میں کتاب اور باب کے لفظ سے تراجم (عنوانات) قائم کر کے ان کے تحت ایک خاص ترتیب سے روایات کو لایا گیا ہے، یہ ترتیب بہت اہمیت کی حامل ہے، اِس شرح میں لفظ کتاب کے عنوان کے تحت تفصیلی ربط اور لفظ باب کے عنوان کے تحت جزئی وخصوصی ربط اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تاکہ پوری کتاب کے مضامین مرتب طور پر ذہن نشین ہوں۔

(۳) حدیث کی عبارت مع اعراب لکھ کر بامحاورہ ترجمہ۔

(۴)ہرحدیث کے راوی کا تعارف اوران کے احوال کا تذکرہ۔

(۵)تشریح حدیث، مشکوۃ شریف طلباء کے لئے پہلی کتاب ہے اسلئے تشریحی امور کے لئے جامع، مرتب لیکن سلسیس اورواضح تعبیر لائی گئی ہے تاکہ حدیث کا مفہوم بخوبی واضح ہوجائے۔

(۶)اہم تشریحی مضامین پرذیلی عنوانات قائم کئے گئے ہیں، تاکہ عنوان ہی سے حدیث کا خلاصہ اور اس کے اجمالی مضامین سمجھ میں آجائیں،عنوان کے بعد مضمون کی تشریح کی گئی ہے، کیونکہ اجمال کے بعد تفصیل سے بات اوقع فی النفس ہوجاتی ہے۔

(۷)ضرورت کی جگہ کلماتِ حدیث کی لغوی وصرفی تحقیق۔

(۸)حدیث سے مستنبط ہونے والے فقہی مسائل کی توضیح اورمفتی بہ قول کی نشاندہی۔

(۹)اختلافی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف، ان کے دلائل، اورراجح دلیل کی تعیین۔

(۱۰)حاشیہ میں احادیث مشکوۃ کی تخریج اورتشریحی مضامین کے حوالہ جات۔

(۱۱)حدیث سے مستنبط ہونے والے فوائد ونکات۔

(۱۲)عبرت وموعظت پر مشتمل روایات کے بیان کے موقعہ پرطلباء کوتنبیہ اوربعض مقامات میں موقعہ کی مناسبت سے اکابر کے واقعات ،تاکہ علم پرعمل کا جذبہ پیداہوتارہے۔

حدیث کے طالب علم کے لئے یہ سب امورضروری ہیں لیکن اِس شرح میں ان امورکو اختصار کے ساتھ اِس طورپرلانے کی سعی کی گئی ہے کہ قاری اکتاہٹ میں مبتلا نہ ہواوروہ توسط واعتدال ختم نہ ہو جو اِس شرح میں بطورخاص ملحوظ ہے۔

احادیث کے حل وتوضیح کے لئے مشکوۃ المصابیح کی بنیادی شروحات ''مرقاۃ المفاتیح،شرح طیبی، لمعات التنقیح، فتح الالٰہ فی شرح المشکوۃ لابن حجرالمکی'' وغیرہ تو خاص طورپرزیرنظر ہیں، ان کے علاوہ خود مصابیح السنہ کی درج ذیل قدیم شرحوں سے بھی استفادہ کیاجارہاہے۔

۱:–کتاب المیسّر،لشہاب الدین فضل اللہ بن حسن التوربشتی الحنفی متوفی ۶۰۰ھ۔

۲:–تحفۃ الابرار، قاضی ناصرالدین عبداللہ بن عمرالبیضاوی متوفی۶۸۵ھ۔

۳:–المفاتیح فی شرح المصابیح و مُظہِر الدین الحسین بن محمود بن الحسن الزیدانی الحنفی متوفی ۷۲۷ھ ۔

۴:– شرح المصابیح محمد بن عبداللطیف بن عبدالعزیز بن ملک الرومی الحنفی متوفی ۸۵۴ھ.

حضرت اقدس مولانا محمدعاقل صاحب زیدمجدہم ہی کے مشورہ سے کتاب کا نام ''مِصْفاۃ الیَنابیع'' تجویز کیاگیاہے،

ینابیع: ینبوع کی جمع ہے، بمعنی پانی کا چشمہ، اور مِصْفاۃ؛ صفایصفو سے اسم آلہ کا صیغہ ہے، اس کے معنی ہیں چھاننے کا آلہ، معنی ہوئے چشموں کے پانی کو چھاننے کا آلہ، چَھلنا (بڑی چھلنی) مشکوۃ اور مصابیح السنہ کی بنیادی شروحات چشمہ ہیں، زیر نظر شرح میں انکا خلاصہ اور ماحصل مہذب وملخص کر کے پیش کیا گیا ہے تاکہ مِصفاۃ (اس شرح) کے مطالعہ سے قاری کو ینابیع (بنیادی شروحات) تک رسائی حاصل ہو سکے اور ان کو سمجھنے کی لیاقت پیدا ہو جائے۔

اِس شرح کی ترتیب میں عزیزِ مکرم مفتی بشیر احمد سلمہ معین مفتی واستاذ مظاہر علوم کا اور تخریج وحوالہ جات میں عزیزِ مکرم مفتی محمد اسرار سلمہ استاذ مظاہر علوم کا بڑا مخلصانہ تعاون رہا ہے **فجزاهما الله احسن الجزاء**۔

ظاہری اسباب کے لحاظ سے اِن دونوں حضرات کے تعاون سے احقر کے لئے یہ عظیم خدمت ممکن ہوئی، مفتی بشیر احمد سلمہ احقر کی **الاشباہ والنظائر** کی شرح ''**عقود الجواهر**'' کے بھی معاون ومرتب ہیں، حق تعالیٰ شانہ ہر دو کے علم وعمل میں برکت دے، حدیث کے برکات وثمرات عطا فرمائے، ان کو مزید علمی خدمات کی توفیق بخشے۔

اخیر میں احقر حق تعالیٰ شانہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے اِس عاجز وناتواں کو اِس عظیم ومبارک خدمت کی توفیق مرحمت فرمائی، کیونکہ حدیث پاک کی خدمت بہت بڑی دولت اور عظیم نعمت ہے، اس کی کریمانہ ذات سے کیا بعید ہے کہ وہ روزِ قیامت حدیث کے خدمت گذاروں میں حشر فرمادے، **والله ذو الفضل العظيم**.

اللہ کی بارگاہ میں التجا ہے کہ وہ عافیت وسہولت کے ساتھ اِس شرح کی تکمیل فرمائے اور اس کو اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ اور آخرت کا ذخیرہ بنائے اور اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔

العبد محمد طاہر عفا اللہ عنہ

مظاہر علوم سہارنپور ۲۳/۷/۱۴۴۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدِّمَة

اساتذہ کا ہمیشہ سے معمول رہا ہے کہ اصل کتاب کو شروع کرنے سے پہلے کچھ باتیں بطور مبادیات بیان فرماتے ہیں کچھ چیزیں اس فن سے متعلق ہوتی ہیں جس میں وہ کتاب ہے اور کچھ نفس کتاب سے متعلق ہوتی ہیں، ان دونوں کو مبادیات کہا جاتا ہے، یعنی شروع کی باتیں۔فن سے متعلق چیزوں کو ''مقدمۃ العلم'' اور کتاب سے متعلق امور کو ''مقدمۃ الکتاب کہتے ہیں'' (مقدمہ بکسر الدال والفتح دونوں صحیح ہیں راجح بکسر الدال ہے[1])

زیر نظر کتاب مشکوۃ المصابیح حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتاب ہے اس لئے یہاں بھی کچھ باتیں نفسِ فن سے متعلق اور کچھ نفسِ کتاب سے متعلق بیان کی جائیں گی۔

مبادیات سے پہلے تین بحثیں بطور آداب کے بیان ہوں گی: (۱) **بحث بداية الدرس في يوم الأربعاء**، (۲) **بحث فضيلة العلم**، (۳) **بحث آداب الطالبين.**

(۱) بحث بداية الدرس في يوم الأربعاء

ہمارے مشائخ رحمہم اللہ کا عام تعامل بدھ کے دن اسباق کی ابتداء کرنے کا رہا ہے، اس سلسلہ میں صاحبِ ہدایہ کے شاگرد علامہ زرنوجیؒ نے اپنے استاذ صاحبِ ہدایہ کی عادت نقل کی ہے: ''كَانَ أُسْتَاذُنَا الشَّيْخُ الإِمَامُ بُرْهَانُ الدِّيْنِ رَحِمَهُ اللّٰهُ يُوْقِفُ بِدَايَةَ السَّبْقِ عَلٰى يَوْمِ الأَرْبَعَاءِ''[2] کہ ہمارے استاذ یعنی صاحبِ ہدایہ سبق کی ابتداء کو بدھ کے دن پر موقوف رکھتے تھے، اور دلیل میں اپنی سند سے یہ حدیث بیان کرتے تھے: مَامِنْ شَئٍ بُدِئَ يوم الأربعاءِ إلَّا وَقَدْ تَمَّ۔[3] کہ بدھ کے دن جو کام شروع کیا جاتا ہے وہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

(۱) تاج العروس ۳۳/۱۳۹، ط: دار الكتب العلميه بيروت.
(۲) تعليم المتعلم ص ۸۵۔ط: مكتبه عكاظ ديوبند.
(۳) تعليم المتعلم ص ۸۵.

یوم الاربعاء میں درس کی ابتداء والی حدیث پر اشکالات اور جوابات:

لیکن علامہ سخاویؒ نے اس روایت پر دو اعتراض کئے ہیں، پہلا اعتراض کیا: لم أقف له على أصل یعنی مجھے اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ملی، اور دوسرا اعتراض کیا کہ یہ روایت طبرانی کی اس حدیث کے معارض ہے: "یوم الأربعاء یوم نحس مستمر" کہ بدھ کا دن منحوس ہے، اس میں یوم الاربعاء کو منحوس کہا گیا ہے؟(۱)

ملاعلی قاریؒ نے دونوں اعتراضوں کا جواب دیا ہے، انہوں نے فرمایا: علامہ سخاوی کا "لم أقف له على أصل" کہنا اپنے علم کے اعتبار سے ہے، اس لئے کہ صاحبِ ہدایہ جیسا فقیہ محدث ایک حدیث اپنی سند سے مرفوعاً بیان کررہا ہے، اور ان کے شاگرد صراحۃً فرمارہے ہیں کہ وہ اپنی سند سے حدیث بیان کرتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے تو یہ اس حدیث کے ثبوت کے لئے کافی ہے؛ اگرچہ متداول کتبِ حدیث میں وہ روایت نہ ملے، اور طبرانی کی مذکورہ روایت ضعیف ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو اس کا محمل یہ ہے کہ بدھ کے دن قومِ عاد پر عذاب نازل کیا گیا، جس کے نتیجہ میں کافر ہلاک ہوگئے، مگر مؤمنین محفوظ رہے، پس یہ دن کفار کے حق میں منحوس ہوا اور مؤمنین کے حق میں مبارک ہوا۔(۲)

اس کی تائید حضرت جابر بن عبداللہؓ کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ خندق کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجدِ فتح میں پیر، منگل اور بدھ کے دن دعاء فرمائی، بدھ کے دن ظہر وعصر کے درمیان وہ دعا قبول ہوئی اور کفار کو شکست ہوئی، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب بھی مجھے کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا ہے تو میں بدھ کے دن ظہر وعصر کے درمیان دعا کرتا ہوں، وہ دعا مجھے قبول ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔(۳)

صاحب ہدایہ اور اکابر کے اس معمول کی تائید میں بعض علماء نے حضرت جابرؓ کی یہ حدیث بھی ذکر فرمائی،

---

(۱) المقاصد الحسنة في بيان كثير من الاحاديث المشتهرة على الألسنة ص ٥٧٤، الرقم ٩٤٣. ط: دار الكتاب العربي بيروت، والحديث: أخرجه الطبراني في الأوسط ١/٢٤٣، برقم (٧٨٧) ٦/٢٨٣ برقم (٦٤٢٢) ط: دار الحرمين القاهرة.

(۲) الأسرار المرفوعة في الأحاديث الموضوعة (١/٣٠٢)

(۳) رواه البخاري في الأدب المفرد ص ٥٥-٥٥٨ (٧٠٤) ط: دار ابن كثير بيروت، وأحمد في مسنده ٢٢/٤٢٥ (١٤٥٦٣) ط: مؤسسة الرسالة بيروت، ونصه: "أن النبي صلى الله عليه وسلم دعا (بقیہ: اگلے صفحہ پر)

”إن الله خلق النور یوم الأربعاء[1] “ کہ اللہ نے نور کو چہارشنبہ کے دن پیدا فرمایا اور ظاہر ہے کہ علم بھی سراسر نور ہے اس لئے بھی چہارشنبہ کے دن اسباق کی ابتداء قرینِ قیاس ہے۔

پیر کے دن اسباق کی ابتداء:

بعض مرتبہ دوشنبہ (پیر کے دن) اسباق کو شروع کیا جاتا ہے، یہ بھی مناسب ہے، ابونعیم اصبہانی نے تاریخ اصبہان میں حضرت انسؓ کے واسطہ سے ایک روایت نقل فرمائی ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے: ”اطلبوا العلم یوم الإثنین فإنه میسّر لصاحبه[2]“، یعنی پیر کے دن سے طلب علم کا آغاز کرو، کہ یہ صاحبِ علم کے لئے سہولت کا باعث ہے۔

(۲) بحث فضیلة العلم

آدمی جس چیز کو حاصل کرنے کا قصد کرے اس کی فضیلت اور اہمیت معلوم ہونی چاہئے، عظمت واہمیت معلوم ہونے سے اس کی رغبت اور شوق پیدا ہوتا ہے، پھر انسان محنت ومجاہدہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

علم دین کے بے شمار فضائل قرآن وحدیث میں وارد ہوئے ہیں، چند فضائل یہ ہیں:

(۱) توحید، اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لاَاِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلاَئِكَةُ وَاُولُو الْعِلْمِ الآیة“ [3] یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتے ہیں اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور علم والے بھی گواہی دیتے ہیں، اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے توحید کے لئے اپنی اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ اہل علم کی شہادت کو شامل فرمایا، جو اہل علم کے لئے بڑے شرف ومجد کی چیز ہے۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ: في مسجد الفتح ثلاثا: یوم الإثنین ویوم الثلاثاء ویوم الأربعاء، فاستجیب له یوم الأربعاء بین الصلاتین فعرف البشر في وجهه، قال جابر: فلم ینزل بي امرمهم غلیظ الاتوخَّیْتُ أي: تحریتُ وقصدت. تلك الساعة، فأدعوا فیها فأعرف الإجابة“

(۱) أخرجه مسلم في صحیحه ۲/ ۳۷۱، کتاب التوبة.

(۲) أخرجه أبونعیم الأصبهاني بسنده عن أنسؓ في ”تاریخه“ ورواته ثقات ۱/ ۴۰۸. ط: دارالکتب العلمیه بیروت.

(۳) آل عمران: ۱۸۔

(۲) اہل علم کی غیر اہل علم پر برتری کو بیان کرتے ہوئے اللہ جل شانہ فرماتا ہے: ''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لايَعْلَمُونَ [۱]'' یعنی آپ فرمادیجئے کیاوہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟

اہل علم کی بلندی درجات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجات [۲]'' یعنی اللہ تعالیٰ تم میں سے ایمان والوں کے اور ان کے درجات بلند کرے گا جن کو علم دیا گیا۔

(۳) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَنْهُومَانَ لايَشْبَعَانِ صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا، وَلايَسْتَوِيان، أماصاحبُ الْعِلْمِ: فَيَزْدَادُ رِضاً للرّحمانِ واما صاحبُ الدّنيا فَيَتَمَادىٰ فى الطُّغيان [۳]'' یعنی دو حریص ایسے ہیں جو کبھی سیراب نہیں ہوتے ایک علم کا حریص اور ایک مال کا حریص، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ حریصِ علم کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور مال کا حریص سرکشی میں بڑھتا رہتا ہے۔

مال کے مقابلہ علم کی فضیلت کی وجوہِ سبعہ:

(۴) حضرت علیؓ نے علم کا مال سے تقابل فرمایا اور سات وجہوں سے علم کی افضلیت کو ثابت فرمایا: وہ سات وجوہ یہ ہیں:

(۱) ''العلمُ ميراثُ الأنبياءِ والمالُ ميراثُ الفَراعِنة'' علم انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے، اور مال فرعونوں کی میراث ہے۔

(۲) ''العلمُ لاينقُص بالنفقة والمالُ ينقُص'' علم خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا اور مال کم ہوتا رہتا ہے۔

(۳) ''يَحتاج المالُ إلى الحافظ والعلمُ يُحفَظ صاحبَه'' مال حفاظت کرنے والے کا محتاج ہے جبکہ علم خود علم والے کی حفاظت کرتا ہے۔

---

(۱) الزمر: ۹۔

(۲) المجادلة: ۱۱.

(۳) رواه الدارمي فی سننه ۱/۱۰۸ رقم: ۳۳۲. ط: مکتبه دار الإيمان، سهارنپور.

(۴)''إذامات الرجلُ يَبقیٰ مالُه و العلم يَدْخُل مع صاحبه قبرَه ''جب آدمی مرجاتا ہے تو مال ساتھ چھوڑ دیتا ہے، جبکہ علم اپنے ساتھی کے ساتھ قبر میں داخل ہوکر ساتھ رہتا ہے۔

(۵)''المالُ يَحْصُل للمؤمن والكافر والعلمَ لايَحْصُلُ إلاللمؤمن ''مال مؤمن اورکافر سب کو حاصل ہوجاتا ہے، جبکہ علم (معرفت الٰہی) صرف ایمان والے کو حاصل ہوتا ہے۔

(٦)''جميعُ الناسِ يَحْتَاجُون إلى صاحبِ العلمِ فی أمرِ دِيْنِهِم ولايَحْتَاجُوْن إلى صاحبِ المال ''دینی معاملات میں سب لوگ اہل علم کے محتاج ہیں جبکہ ایسی عمومی حاجت مال والوں سے لوگوں کی وابستہ نہیں ہے۔

(۷)''العلم يُقَوِّي الرجلَ على المرور على الصراط والمالُ يَمْنَعُه ''علم پل صراط پر گذرنے میں قوت دے گا اور مال وہاں گذرنے سے مانع بن جائے گا۔(1)

حقیقت یہی ہے کہ جب آدمی کو علم کا چسکا لگ جاتا ہے اورقلب علم کی لذت سے آشنا ہوجاتا ہے، تو اس کی نظر میں دنیا و مافیہا کی کوئی وقعت وحیثیت باقی نہیں رہتی۔

حضرت علیؓ کا ہی شعر ہے:

رَضِيناقسمةَ الجبّارِ فينا لنا علمٌ وللأعداء مالٌ

فإنّ المالَ يفنيٰ عن قريبٍ وإنّ العلمَ يبقیٰ لايزالُ(2)

یعنی ہم اپنے رب جبار کی تقسیم پرراضی ہیں ہم کو اس نے علم دیا اوردشمنوں کو مال (جس کے حقوق ادا نہ کئے جائیں) کیونکہ مال عنقریب ختم ہوجائے گا اورعلم ہمیشہ باقی رہے گا۔

(۵)امام محمدؒ نے فرمایا''لوكان الناسُ كُلُّهم عبيدی لأعْتَقْتُهم وتبرَّأتُ عن وَلائِهم (3)'' اگرتمام لوگ میرے غلام باندی ہوں تو میں تمام کو آزاد کردوں اوران کی ولاء (میراث) سے بھی بری ہوجاؤں، (مگرمشغلۂ علم نہ چھوڑوں)

(٦)علامہ زرنوجیؒ نے فرمایا ہے:

---

(۱) التفسير الكبير،مفاتيح الغيب للرازي٢/ ٤٠٣(البقرة: ٣١،ط:دارإحياء التراث العربی بيروت)

(۲) تعليم المتعلم ص ٧٠.

(۳) تعليم المتعلم ص ٣٠.

تعلَّمْ فإنّ العلمَ زَيْنٌ لأهلِه　　وفَضْلٌ وعُنوَانٌ لكلِّ مَحَامِدِ

وكُنْ مُستَفِيداً كلَّ يومٍ زيادةً　　من العلمِ واسبَحْ فی بِحَارِ الفوائد (۱)

یعنی علم حاصل کرو کہ علم اہل علم کے لئے زینت ہے اور فضیلت ہے اور ہر عمدہ خصلت کی دلیل ہے، اور علم سے روزانہ خوب مستفید ہوتے رہو اور فائدوں کے سمندر میں تیرتے رہو۔

اگر عذاب دینا ہوتا تو علم عطاء نہ کیا جاتا:

(۷) امام محمدؒ کا انتقال ہوا کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کس حال میں انتقال ہوا؟ تو فرمایا ''کتاب المکاتب'' کا ایک مسئلہ سوچ رہا تھا، اسی دوران روح نکل گئی اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا، خواب دیکھنے والے نے پوچھا وہاں کیا گذری؟ فرمایا: کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا گیا اے محمد! اگر تمہیں عذاب دینا ہوتا تو ہم اپنا علم تمہارے سینہ میں نہ رکھتے۔ (۲)

(۸) انسان جو اشرف المخلوقات ہے وہ اسی علم کی وجہ سے ہے ورنہ اکل، شرب، جماع، شجاعت وغیرہ اوصاف تو جانوروں میں بھی ہوتے ہیں، بلکہ انسانوں سے زیادہ ہوتے ہیں اور علم سے مرادِ علمِ دین ہے جس کا اطلاق عموماً تین علوم پر ہوتا ہے، تفسیر، حدیث اور فقہ۔

(۳) آداب الطالبین

آداب کی شریعت میں بہت اہمیت ہے، ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں آداب کا لحاظ کر کے کام کیا جائے تو وہ ثمر آور ہوتا ہے، علامہ زرنوجیؒ نے فرمایا ہے کہ: طالبِ علم کو چاہئے کہ آداب کا لحاظ رکھے کیونکہ جو شخص آداب میں کوتاہی کرتا ہے وہ سنتوں سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور جو سنتوں سے محروم ہو جائے اس کو فرائض سے محروم کر دیا جاتا ہے، اور جو فرائض میں کوتاہی کرے وہ آخرت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ (۳)

علم کے بہت آداب ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) اخلاص النیة:

طالبِ علم اللہ کو راضی کرنے کی نیت کرے، اپنی آخرت کو سنوارنے کی نیت کرے، اپنے سے صفتِ

(۱) تعليم المتعلم ص ۳٤، ط: مكتبه عكاظ ديوبند.

(۲) درمختار ۱/۸۔

(۳) تعليم المتعلم ص: ۱۱۷۔

جہل کو ختم کرنے کی نیت کرے، احیائے اسلام، ابقائے دین اور خود عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی نیت کرے، جاہ وشہرت مقصود نہ ہو، اگر کسی نے جاہ وناموری کے لئے علم حاصل کیا تو یہ علم نافع نہیں ہوگا، بلکہ وبالِ جان ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ طَلَبَ العلمَ لِيُجَارِيَ بِهِ العلماءَ اولِيُمارِيَ به السفهاءَ أويَصْرِفَ بِهٖ وُجُوهَ الناسِ إليه أدخلهُ اللّٰهُ النارَ''(۱) یعنی جو اس لئے علم حاصل کرے گا تاکہ علماء سے مقابلہ آرائی کرے یا جاہلوں سے جھگڑے کرے یا لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف پھیرے یعنی لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جہنم میں داخل کرے گا۔

لہٰذا تحصیل علم سے ان میں سے کوئی بھی بات مقصود نہ ہو، نہ علماء سے مقابلہ آرائی، نہ جہلاء سے بحث ومباحثہ، اور نہ شہرت، البتہ بغیر نیت کے اللہ تعالیٰ شہرت دیدے تو الگ بات ہے۔

اسی طرح مال جمع کرنا بھی مقصود نہ ہو، چنانچہ حدیث شریف میں ہے: ''من تعلم علماً مما يُبْتَغٰى بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ لايتعلَّمُهُ إلا ليُصيب به عرضَ الدنيا لم يجدْ عَرْفَ الجنة يومَ القيامةيعني ريحَها''(۲) یعنی جو شخص وہ علم جس سے اللہ کی رضا وخوشنودی کو طلب کیا جاتا ہے (یعنی علم دین) دنیا کا ساز و سامان جمع کرنے کے مقصد سے حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

اس لئے طالب علم پہلے اپنی نیت کو درست کرے، نیت کی درستگی سے ہی عمل عنداللہ مقبول ہوتا ہے، حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری کا آغاز حدیث ''إنما الاعمال بالنيات '' سے فرما کر اسی بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ ہر عمل میں نیت اور ارادہ کو درست کر لینا چاہئے، کیونکہ اگر نیت درست نہ ہو تو عمل گو اچھا ہو، مگر عنداللہ قبولیت سے محروم رہتا ہے، علامہ زرنوجیؒ نے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ بہت سے اعمال بظاہر شکل وصورت میں دنیوی امور کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن حسنِ نیت کی وجہ سے وہ اعمال عبادت بن کر قربِ الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں، اور بہت سے اعمال اپنی ظاہری شکل وصورت میں اعمالِ آخرت کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن فسادِ نیت کی وجہ سے بے سود اور رائیگاں ہوجاتے ہیں۔(۳)

---

(۱) مشكوٰة شريف ۱ / ۳٤، نقلاً عن الترمذی ۲ / ۹٤ وابن ماجه ۱ / ۲۲.

(۲) مشكوٰة ۱ / ۳٤ — ۳۵. نقلاً عن سنن أبي داود ۲ / ۵۱۵ وابن ماجه ۱ / ۲۲ واحمد ۲ / ۳۳۸ (۸٤۳۸)

(۳) تعليم المتعلم ص ۳۰.

علماء سے تبلیغ علم کے بارے میں سوال ہوگا:

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے روایت پہنچی ہے کہ یومِ قیامت علماء سے تبلیغِ علم کے بارے میں سوال ہوگا جیسا کہ انبیاء علیہ السلام سے تبلیغِ دین کے بارے میں سوال ہوگا(۱) لہٰذا اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے علم حاصل کیا جائے۔

(۲)احترام العلم والعلماء:

علماء سے مراد اساتذہ اور علم سے مراد اسباب علم ہیں، یعنی وہ تمام چیزیں جن سے علم کی وجہ سے تعلق ہوتا ہے، جیسے استاذ، کتاب، قلم، کاپی وغیرہ سب کا ادب واحترام نہایت ضروری ہے، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ قلم کا برادہ نالی وغیرہ گندی جگہ میں ڈالنا ممنوع ہے(۲) علامہ زرنوجیؒ نے لکھا ہے کہ طالب علم، علم سے منتفع ہو ہی نہیں سکتا جب تک علم، علماء اور اساتذہ کا احترام نہ کرے، جس شخص نے جو حاصل کیا ہے وہ ادب واحترام کی بدولت حاصل کیا ہے، اور جو گرا ہے وہ بے حرمتی سے گرا ہے: ''مَاوَصَلَ مَنْ وَصَلَ إلا بالحُرْمَةِ وماسَقَطَ مَنْ سَقَطَ إلا بِتَرْکِ الْحُرْمَة'' نیز فرمایا ہے کہ آدمی گناہ کرنے سے کافر نہیں ہوتا مگر دین کے کسی جزء کی بے حرمتی کرنے سے کافر ہوجاتا ہے۔(۳)

از خدا خواہیم توفیقِ ادب　　بے ادب محروم گشت از فضل رب

(۳)اهتمام الحضور فی الدرس:

سبق میں حاضری کا اہتمام ہونا چاہئے، مواظبت میں اللہ نے برکت رکھی ہے اسی سے علم حاصل ہوتا ہے، اگر مواظبت اور درس کی پابندی ہوتو طالب علم چاہے غبی ہو اللہ اس سے کام لے لیتا ہے۔

امام ابویوسفؒ کی پابندیِ درس:

امام ابویوسفؒ امام صاحب کی مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، ایک روز امام صاحب نے

(۱)مقدمة أوجز ۱/ ۵۵، الفائدة الثانية في شرافة ذاک العلم وأهله والثناء عليهما، ت: الدکتور تقی الدين الندوي .

(۲)شامی ۱/ ۳۲۲ مطبوعه مکتبه زکریا، دیوبند

(۳) تعلیم المتعلم ص ۳۵.

ان سے فرمایا: ''كُنتَ بليداً فَأَخرَجتُک المواظبة'' کہ تم کند ذہن تھے لیکن مواظبت اور پابندی نے تم کو بلند مرتبہ پر پہنچادیا۔(۱)

صاحب آداب المتعلمین نے ''مناقب موفق'' کے حوالہ سے امام ابویوسفؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے:

مات ابنٌ لی فلم أَحضُرْ جِهَازَه ولادفنَه وتركتُه علی جيراني وأقربائي مَخَافةَ أن يفوتَني من أبي حنيفةَ شيئٌ ولا تَذْهَب حسرتُه عني یعنی میرے بچہ کا انتقال ہوگیا لیکن میں نہ اس کی تجہیز وتکفین میں شریک ہوسکا اور نہ تدفین میں، اور میں نے اس اندیشہ سے یہ کام اپنے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے سپرد کردیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے درس کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے جس کی حسرت ختم نہ ہو۔(۲)

اس لئے طالب علم خوب اہتمام سے سبق میں حاضر ہو، ناغہ نہ کرے کہ اس سے بے برکتی ہوتی ہے، دل اکھڑ جاتا ہے، شوق میں کمی آتی ہے، حضرات اکابرؒ نے فرمایا ہے کہ ایک روز سبق ناغہ کرنے سے چالیس روز کی برکت اٹھ جاتی ہے، اور ہمارے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ فرماتے تھے کہ میں نے اس کو محسوس بھی کیا ہے۔

(٤) المشقة فی تحصيل العلم:

علم کی دولت حاصل کرنے کے لئے ہرطرح کی تکالیف اور مشقتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہنا چاہئے، دنیا کی ادنی شی بھی محنت ومشقت کے بغیر حاصل نہیں ہوتی، تو پھر علم جیسی عظیم الشان چیز بلامحنت ومشقت کیسے حاصل ہوسکے گی؟ علم کی راہیں جبھی کھلتی ہیں جب آدمی اس کے لئے مشقت اٹھائے، حضرت یحیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کیا: ''يا يحيىٰ خُذِ الكتابَ بِقُوَّةٍ(۳)'' کہ اے یحیٰ! کتاب قوت کے ساتھ پکڑو، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تحصیل علم کے لئے طاقت وہمت درکار ہے۔

ایک بزرگ یحیٰ بن کثیر کا قول ہے ''لايُستطاعُ العلمُ براحةِ الجِسْمِ(۴)'' کہ تن پروری کے ساتھ

(۱) تعليم المتعلم للزرنوجی ص ٦٨۔

(۲) آداب المتعلمین ص۲۴۔

(۳) مریم: ۱۹۔

(٤) رواه مسلم (۱/ ۲۲۳)

علم حاصل نہیں ہوتا، نیز امام شافعیؒ نے فرمایا ہے: ''لایُفلِحُ من طَلَبَ هذا العلمَ بالتملّل وغِنَى النّفسِ ولكن من طَلَبَهُ بذِلَّةِ النفسِ وضِيقِ العَيْشِ وخدمةِ العلمِ أَفْلَحَ'' یعنی جو شخص کسل اور لاپرواہی کے ساتھ علم حاصل کرنا چاہے وہ کامیاب نہیں ہوگا، ہاں جو اپنے نفس کو ذلت میں ڈال کر معاشی تنگی برداشت کرکے اور علم (یعنی علماء) کی خدمت کرتے ہوئے علم طلب کرے وہ بے شک علم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔[1]

عزمِ مصمم، عملِ پیہم اور بلند ہمتی ایسے امور ہیں جن سے مشکل چیز بھی آسان ہو جاتی ہے اور دور کی چیز بھی نتیجۃً قریب ہو جاتی ہے، اس لئے طالب علم کو اپنا عزم پختہ اور ہمت بلند رکھنا چاہئے اور محنت وکوشش میں کمی نہیں کرنا چاہئے، علامہ زرنوجیؒ فرماتے ہیں:

الجد يُدْنِي كل أمر شاسعٍ والجد يفتح كل باب مغلق[2]

یعنی محنت وکوشش ہر دور کی چیز کو نزدیک کر دیتی ہے، محنت وکوشش ہر بند دروازہ کو کھول دیتی ہے۔

مغل بادشاہ بابر کا ایک واقعہ:

بابر بادشاہ نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو ناکام ہوا، پھر حملہ کیا پھر ناکام ہوا، جس کی وجہ سے مایوسی میں ڈوب گیا، اسی دوران اس نے دیکھا کہ ایک چیونٹی کھانے کا ذرہ لے کر اپنے سوراخ میں پہنچنے کے لئے دیوار پر چڑھتی ہے اور نیچے گر جاتی ہے، پھر چڑھتی ہے پھر گر جاتی ہے، یہ اس کو دیکھتا رہا اور اس کے چڑھنے اور گرنے کو بھی گنتا رہا، یہاں تک کہ وہ ننانویں مرتبہ چڑھی اور گری، بالآخر وہ اپنے سوراخ میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی، اس سے اس کو عبرت حاصل ہوئی، چنانچہ اس نے پھر حملہ کیا اور کامیاب ہو گیا۔[3]

علامہ زرنوجیؒ فرماتے ہیں:

بِقَدْرِ الْكَدِّ تُكْتَسَبُ الْمَعَالِيْ وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِيْ
تَرُوْمُ الْعِزَّ ثُمَّ تَنَامُ لَيْلاً يَغُوْصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللاٰلِيْ[4]

---

(۱) مقدمہ أوجز ۱/ ۲۳٤.

(۲) تعليم المتعلم ص ۷۰.

(۳) ملفوظات فقيه الأمت ج۳ ص ۱٤۳، بعنوان: (بابر کی چیونٹی سے عبرت)

(٤) تعليم المتعلم ص ۷۱.

یعنی محنت وکوشش کے بقدر بلند مرتبے حاصل ہوتے ہیں، جوشخص بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہے وہ راتوں کو (مطالعہ میں) بیدار رہتا ہے، تو عزت کا خواہشمند ہے اورپھر رات کو سونے میں گذارتا ہے، (حالانکہ) جوشخص سمندر سے بیش قیمت موتی حاصل کرنا چاہے اس کو سمندر میں غوطے لگانے پڑتے ہیں۔

(۵)الاحتراز عن المعاصي:

گناہوں سے احتراز اورتقوی کا اہتمام، یہ بہت بڑا ادب ہے، حقیقی علم کی دولت حاصل کرنے کے لئے تقوی بنیادی شرط ہے، اس کے بغیر علم کے الفاظ اورمعلومات میں تو اضافہ ہوسکتا ہے مگرعلم کی حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ علم اللہ تبارک وتعالیٰ شانہ کا نور ہے اس کے لئے پاک محل چاہئے، اگرقلب معاصی کی گندگی میں ملوث ہوگا تو علم کا نورقلب میں نہیں اترے گا۔

سوء حفظ سے بچنے کے لئے امام شافعیؒ کومعاصی سے اجتناب کی تلقین:

حضرت امام شافعیؒ کا واقعہ مشہور ہے، انہوں نے اپنے استاذ امام وکیع سے سوء حفظ کی شکایت کی تو انہوں نے معاصی سے بچنے کی تاکید فرمائی:

شَكَوْتُ إِلٰى وكيعٍ سوءَ حِفْظِي   فَأَوْصَانِيْ إلى تَرْكِ المَعَاصِي

فإنّ العلمَ فضلٌ من إلهي   وفضلُ اللهِ لايُعْطىٰ لعاصٍ[1]

یعنی میں نے امام وکیعؒ سے حافظہ کے کمزور ہونے کی شکایت کی تو انہوں نے ترک معاصی کا حکم دیا، کیونکہ علم اللہ کا نور ہے اور اللہ کا نورگنہ گار کونہیں دیا جاتا۔

علماء نے فرمایا ہے کہ: جوشخص زمانۂ طالب علمی میں بھی گناہوں میں مبتلا رہتا ہے تو تین مصیبتوں میں سے کوئی ایک مصیبت ضرور آتی ہے (۱) یا جوانی میں اس کا انتقال ہوجاتا ہے، (۲) یا وہ ناقدرے لوگوں میں چلا جاتا ہے، (۳) یا بادشاہوں اورامراء کی چاپلوسی کرتا ہے، غرض یہ کہ اس کے علم سے خلقِ خدا کو فائدہ نہیں ہوتا۔[2]

---

(۱)تعليم المتعلم ص ۱۲۸. ديوان الامام الشافعي ص۱۳.

(۲)تعليم المتعلم ص ۱۲۱.

(٦)الثبات و الصبر:

صبر کے معنی ہیں: ''حبس النفس علی مایکرہ ''یعنی نفس کو ناگوار امور پر جمانا،اس کی تین قسمیں ہیں: (۱) صبر عن المعاصی، یعنی گناہوں سے رکنا (۲) صبر علی الطاعات، یعنی طاعات پر جمنا، (۳) صبر علی البلایا والمصائب، یعنی آفات ومصیبتوں سے دلبرداشتہ نہ ہونا، طالب علم کو تینوں قسم کا صبر اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے،صبر اور ثابت قدمی کے بعد ہی علم حاصل ہوتا ہے۔

تحصیل علم کے مراحل ومراتب:

سفیان ثوریؒ نے حصول علم کی ترتیب یہ بیان فرمائی ہے: ''أول العلم النية ثم الاستماع، ثم الإنصات، ثم الفهم، ثم الحفظ، ثم العمل، ثم النشر ''[۱] بعض نے اس مقولہ کی نسبت عبداللہ بن مبارکؒ کی طرف کی ہے اور بعض نے اوراشخاص کی طرف۔ اس مقولہ میں علم نافع کے حصول کے مراتب ومراحل کا بیان ہے کہ تحصیل علم کا پہلا مرحلہ نیت کی درستگی ہے اورپھر استاذ کی بات کو توجہ سے سننا ہے، پھر اس کے مطلب کو سمجھنے کے لئے اس میں غور وفکر کرنا ہے پھر اس کو یاد کرنا اور ذہن نشین کرنا ہے، پھر اس علم کے تقاضہ پر عمل کرنا ہے، پھر اس علم کو پھیلانا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے، ان مراحل کی تکمیل کے بعد علم کی حقیقت حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اس مقولہ کو کثرت سے بیان فرماتے تھے، اور مذکورہ مراحل کی توضیح وتشریح واقعات کی روشنی میں دلچسپ انداز میں بیان فرماتے تھے،طوالت کے خوف سے تفصیل کو یہاں ترک کیا جارہا ہے، حضرتؒ کے مواعظ میں اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔[۲]

مقدمة العلم

مقدمۃ العلم میں حضراتِ اکابر عموماً تین چیزیں بیان کیا کرتے تھے جنکو امور ثلاثہ کہا جاتا ہے تعریف، موضوع اور غرض وغایت، ان تین چیزوں کو فی الجملہ مناسبت پیدا ہونے کے لئے بیان کیا جاتا تھا تاکہ علم علی وجہ البصیرۃ حاصل ہو،اس کے بعد انحطاط شروع ہوا، طبیعتوں میں کاہلی اور غفلت آنے لگی تو حضراتِ اکابر نے فرمایا کہ اب مناسبت پیدا ہونے کے لئے محض تین چیزیں کافی نہیں، چنانچہ پھر حضراتِ اکابر

(۱) جامع بيان العلم وفضله ۱ / ٤٧٦ — ٤٧٨ ''باب منازل العلماء'' مطبوعہ دار ابن جوزیہ۔

(۲) مواعظ فقيه الأمت : ۱ / ۲۹۲ (مراتب علم)

آٹھ چیزیں بیان کرنے لگے، جن کو مناطقہ کی اصطلاح میں ''رؤس ثمانیہ'' کہا جاتا ہے، اس کے بعد اساتذہ نے دو کا اضافہ اور کیا اور کل دس چیزیں بیان کرنے لگے جن کو ''مبادیاتِ عشرہ'' کہا جاتا ہے، یعنی دس ابتدائی باتیں، کسی نے ان کو شعر میں یوں بیان کیا ہے:

إن مبادئَ كلِّ فنٍّ عشرةٌ — الحدُّ والموضوعُ ثم الثمرةُ

وفضلُه ونسبةٌ والواضعُ — الاسمُ والاستمدادُ وحكمُ الشارع

ومسائلُ والبعضُ بالبعض اكتفىٰ — ومن دَرَى الجميعَ حاز الشرفا (۱)

لیکن دس ہی ضروری نہیں، اس سے زیادہ اور اس سے کم کو بھی بیان کیا جاسکتا ہے، اصل یہ ہے کہ فن سے طلبہ میں مناسبت پیدا ہو جائے، یہاں مشکوۃ کے شروع میں مبادیات عشرہ کو بیان کیا جائے گا، اور کتاب کی اہمیت کے پیش نظر مزید سات باتیں بیان کی جائیں گی، اس طرح مقدمۃ العلم کے تحت کل سترہ باتوں کا بیان ہوگا اور مقدمۃ الکتاب کا بیان اس کے بعد ہوگا، وہ مزید سات باتیں یہ ہیں: (۱) قسمۃ وتبویب (۲) مرتبۂ علم حدیث (۳) حجیۃ الحدیث ومکانتہ فی التشریع الاسلامی (۴) تعلق علم الفقہ بعلم الحدیث (۵) مقام الامام أبی حنیفۃؒ فی الحدیث، (٦) علم الحدیث فی الہند (۷) بیان الإسناد۔

(۱) حدیث اور علم حدیث

یہاں دو چیزیں ہیں: حدیث اور علم حدیث، دونوں الگ الگ ہیں، علم حدیث ایک کلی ہے جس کے تحت بہت ساری انواع ہیں اور ہر نوع مستقل علم ہے، مثلاً علم اسماء الرجال، علم الجرح والتعدیل، علم مختلف الحدیث ومشکلہ، علم ناسخ الحدیث ومنسوخہ، علم غریب الحدیث، علم أسباب ورود الحدیث، علم روایۃ الحدیث، علم درایۃ الحدیث وغیرہ، یہ سب علم حدیث کی انواع ہیں، جن کے لئے ''علوم الحدیث'' جمع کا لفظ بولا جاتا ہے۔

یہاں تمام انواع کو بیان نہیں کیا جائے گا، ہمارے سامنے جو کتاب ہے یعنی مشکوٰۃ شریف، یہ علمِ روایت حدیث سے تعلق رکھتی ہے، یہاں اسی کی تعریف بیان کرنا مقصود ہے، ضمناً حدیث اور علمِ درایت حدیث کی تعریف بھی کی جائے گی، مناسب ہے کہ پہلے حدیث کی تعریف جانی جائے، اس کے بعد علم روایۃ الحدیث اور درایۃ الحدیث کی۔

---

(۱) جمعها محمد بن علي الصبان كما في الكوكب الوهاج شرح صحيح مسلم ۱/۳۹، لمحمد الهرري، ط: دار المنهاج. حاشية الصبّان على شرح شيخه الملّوي على السلّم ص۳۳ (مخطوط)

حدیث کی لغوی واصطلاحی تعریف:

حدیث کے لغوی معنی ہیں: کلام اور گفتگو خواہ قلیل ہو یا کثیر، اور خواہ کسی بھی قسم کا کلام ہو اور قائل کوئی بھی ہو، اور جمع اس کی ''احادیث'' ہے۔(۱)

اور حدیث کے اصطلاحی معنی یہ ہیں: **هو أقوال النبی صلی الله علیه وسلم وأفعاله وأحواله وتقریراته.** یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ اقوال، افعال، احوال اور تقریرات حدیث ہیں۔

اس تعریف میں چند باتیں وضاحت طلب ہیں:

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال واحوال دو قسم کے ہیں: اختیاریہ اور غیر اختیاریہ، اختیاریہ: جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اختیار سے کیا، غیر اختیاریہ: جس میں آپ کے اختیار کو دخل نہ ہو، جیسے آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے اخلاق، آپ کا حلیہ مبارک، قد، چہرہ وغیرہ جن کو ''شمائل'' اور ''احادیثِ صفت'' بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) تقریر کے معنی آتے ہیں: ثابت کرنا، مضبوط کرنا، تائید کرنا، اور کسی کام کو ہوتا دیکھ کر اس پر نکیر نہ کرنا، اور تقریرِ نبی علیہ السلام کا مفہوم یہ ہے کہ کسی امتی نے آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے سامنے کوئی کام کیا اور آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، نہ اس وقت اور نہ بعد میں، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ''تقریر'' کہا جاتا ہے اور جو چیز اس طرح ثابت ہو اس کے بارے میں بھی یہ کہا جائے گا کہ وہ حدیث سے ثابت ہے، اور آپ علیہ السلام کے قول وفعل کی طرح وہ بھی حجت شمار ہوگی، کیونکہ نبی کی شان سے یہ بعید ہے کہ اس کے سامنے کوئی ناجائز کام کیا جائے یا اس کے علم میں کسی کا ناجائز عمل آئے اور وہ اس پر نکیر نہ فرمائے، لہٰذا پیغمبر کا اس پر سکوت اختیار کرنا اس کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔(۲)

---

(۱) الصحاح للعلامة الجوهری فی مادة ح دث.

(۲) جیسے: عن عمرو بن العاصؓ قال: احتلمت فی لیلة باردة فی غزوة ذات السلاسل فأشفقت إن اغتسلت أن أهلک، فتیممت ثم صلیت بأصحابی الصبح فذکروا ذلک لرسول الله صلی الله علیه وسلم فقال: یاعمرو! صلیت بأصحابک وأنت جنب؟ فأخبرته وبالذی منعنی من الاغتسال، فضحک رسول الله صلی الله علیه وسلم ولم یقل شیئا .(ابوداود ۱ / ۴۸)

(۳)حضرات فقہاء غیراختیاری افعال واحوال کو حدیث شمار نہیں کرتے، جبکہ محدثین دونوں کو حدیث کہتے ہیں، کیونکہ فقہاء کا مقصد احادیث سے مسائل کومستنبط کرنا ہے اور وہ اختیاری افعال واحوال سے ہی ہوسکتے ہیں، غیراختیاری افعال واحوال سے کوئی مسئلہ مستنبط نہیں ہوتا، اس لئے فقہاء ان کوحدیث نہیں کہتے اورنہ ان کوفقہی احکام کا ماخذ مانتے ہیں اورمحدثین کا مقصد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب شدہ تمام چیزوں کوجمع کرنا ہے، **حتی الحركات والسكنات في اليقظة والمنام قبل البعثة وبعدها**، اورغیراختیاری افعال واحوال اسی طرح بعثت سے قبل کے افعال واحوال بھی آپ علیہ الصلاۃ و السلام کی طرف منسوب ہیں اس لئے حضرات محدثین ان کوبھی حدیث کی تعریف میں داخل مانتے ہیں۔

تعریف علم روایۃ الحدیث:

علامہ عینیؒ وکرمانیؒ نے اس کی تعریف یہ کی ہے: **هو علمٌ يُعرفُ به أقوالُ رسول الله صلى الله عليه وسلم وأفعالُه وأحوالُه** یعنی وہ علم جس کے ذریعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اوراحوال کاعلم ہو۔

اس تعریف پرعلامہ سیوطی نے یہ تبصرہ کیا ہے "**هذا الحدُّ مع شموله لعلمِ الاستنباطِ غيرُ محرَّرٍ**"(۱) یعنی یہ تعریف واضح، منقح اور مانع عن دخول الغیر نہیں ہے، کیونکہ یہ تعریف "علمِ استنباط" پربھی صادق آتی ہے، اسی طرح یہ تعریف سیرت کی ہرکتاب پربھی صادق آتی ہے، خواہ وہ کتاب اردو میں ہو یاعربی میں، سند سے ہو یا بلاسند کے، کیونکہ ان کے ذریعہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اوراحوال معلوم ہوجاتے ہیں، اسی لئے خود علامہ سیوطیؒ نے اس کی ایک دوسری تعریف فرمائی ہے جو جامع مانع ہے وہ یہ ہے:

"**علمٌ يَشْتملُ على نقلِ أقوالِ النبيِ صلى الله عليه وسلم وأفعالِه وروايتِها وضَبْطِها وتحريرِ ألفاظِها**"(۲) یعنی علم روایت حدیث وہ فن ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کی نقل وروایت اوران کا ضبط ہواوران کے الفاظ کی تحقیق ہو۔

اس تعریف میں "احوال" کالفظ موجود نہیں، جوغالباً اختصاراً حذف کیا گیاہے، ایسے ہی "تقریرات" کا

(۱)التدریب ۲/ ۲۹.

(۲)تدریب الروای۲/ ۱۲-۱۳.

لفظ بھی مذکور نہیں، لیکن ''تقریرات'' ''افعال'' میں آسکتی ہیں، اس لئے کہ ''تقریر'' کہتے ہیں سکوت اور ترک نکیر کو اور یہ بھی فعلٌ من الافعال ہے۔[1] لہٰذا اس لحاظ سے ''تقریرات'' افعال میں داخل ہوں گی۔

بعض نے علم روایت حدیث کی تعریف یہ کی ہے: ''**الحديث- في اصطلاحِ جمهورِ المحدثين- يُطْلَقُ على قول النبي صلى الله عليه وسلم وفعله وتقريره وكذلك يطلق على قول الصحابي وفعله وتقريره وعلى قول التابعي وفعله وتقريره.**''[2]

اس تعریف سے ظاہر ہے کہ صحابہؓ وتابعین کے اقوال وافعال بھی حدیث میں داخل ہیں، چنانچہ جمہور کے یہاں حدیث کا یہی عام مفہوم ہے اور بعض نے حدیث کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے اقوال وافعال کے ساتھ خاص کیا ہے اور تابعین کے اقوال وافعال پر ''اثر'' کے لفظ کا اطلاق کیا ہے۔

تعریفِ علم درایۃ الحدیث:

علم درایۃ الحدیث کو ''علم اصول حدیث'' اور ''مصطلح الحدیث'' کہتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تعریف یہ فرمائی ہے جو نہایت مختصر وجامع ہے: ''**معرفة القواعد المُعَرِّفة بحال الراوي والمروي**''[3] یعنی فن درایت حدیث ان قواعد واصول کا جاننا ہے جن کے ذریعہ رواۃ اور روایات کے احوال پہنچانے اور پرکھے جاسکیں۔

اسی تعریف کو علامہ سیوطی نے اپنے ''الفیہ'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

عِلْمُ الحديثِ ذوقوانينَ تُحَد — يُدرىٰ بها أحوالُ متنٍ وسند

فذ انک الموضوعُ والمقصودُ — ان يُعْرَف المقبولُ والمردودُ[4]

ان دو اشعار میں علم اصول حدیث کی تعریف، موضوع، غرض وغایت تینوں چیزیں آگئیں، یعنی علم اصول حدیث اُن چند قوانین کا نام ہے جن سے حدیث کی سند اور متن کے احوال معلوم ہوں، اور یہی دو چیزیں

(۱) الدر المنضود ۱/ ۹.

(۲) انظر: مقدمة الشيخ عبدالحق المحدث الدهلوی ص۳ .

(۳) النکت علی ابن الصلاح ۱: ۲۲۵۔

(٤) الفيّة السيوطی ص ۳ .

یعنی متن اورسند اِس علم کا موضوع ہیں اورغرض اِس فن کی یہ ہے کہ مقبول اورمردود روایات کی معرفت حاصل ہوجائے کہ کونسی حدیث مقبول اورقابلِ استدلال ہے اورکونسی مردود وغیر معتبر ہے۔

اورعلامہ سیوطیؒ نے اس کی ایک مفصل تعریف یہ بھی فرمائی ہے:

هو علم يعرف منه حقيقةُ الرواية وشروطُها وأنواعُها وأحكامُها وحالُ الرواة وشروطُهم وأصنافُ المرويات ومايتعلق بها. (۱) یعنی علم درایۃ الحدیث وہ علم ہے جس کے ذریعہ روایت حدیث کی حقیقت، اس کی شرطیں، اس کی اقسام واحکام اوررواۃ کے احوال اوران کی (روایات کے معتبر ہونے کی) شرطیں اورروایات کی اقسام اوران سے متعلقہ دیگر امور کی معرفت حاصل ہو۔

اکثر محدثین کے یہاں علم درایۃ الحدیث کا یہی مفہوم ہے جس کی رو سے علم داریۃ الحدیث کا اطلاق اس علم پر ہوتا ہے جس میں حدیث کے درجہ اوراس کے رواۃ کے احوال سے بحث ہو اور علامہ طاش کبری زادہ (۹۶۸ھ) نے اس کی تعریف یہ کی ہے: **علم دراية الحديث علم يبحث فيه عن المعنى المفهوم من الفاظ الحديث وعن المراد منها مبنيا على قواعد العربية وضوابط الشريعة ومطابقا لاحوال النبى عليه الصلاة والسلام** یعنی علم درایت حدیث وہ علم ہے جس میں الفاظ حدیث کے معنی ومفہوم اورعربی قواعد، شرعی ضوابط اور نبی علیہ السلام کے احوال کے مطابق اس کی مراد واضح کی جائے۔

اس تعریف کی رو سے علم درایۃ الحدیث کا اطلاق حدیث کے معنی ومراد سے واقف کرانے والے علم پر ہوگا مگر حدیث کا معنی ومفہوم روایتِ حدیث کے ضمن میں بھی معلوم ہوجاتا ہے اس لئے عام محدثین نے مستقل فن کی حیثیت سے اس کو ذکر نہیں کیا۔

(۲) الموضوع

علامہ کرمانیؒ جو بڑے محدث ہیں اورحافظ ابن حجرؒ اورعلامہ عینیؒ وغیرہ سب سے مقدم ہیں انہوں نے شرح بخاری میں علم حدیث کا موضوع یہ بتایا ہے: "**ذات رسول الله صلى الله عليه وسلم**" (۲) اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے ہی اس فن میں بحث کی جاتی ہے۔

---

(۱) التدريب ۲ / ۱٤ ت: الشيخ عوامه حفظه ط دار اليسر.

(۲) "شرح البخاري" للعلامة الكرماني ۱ / ۱۲۔

علم حدیث کے موضوع پر علامہ کافیجیؒ کا اشکال اور اس کا جواب:

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ علامہ کافی جیؒ ہمیشہ اس بات پر تعجب کرتے تھے کہ کرمانی نے موضوعِ علمِ حدیث آپ کی ذات کو کیسے قرار دیا؟ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو انسان ہیں اور انسان لحم وشحم سے مرکب ہوتا ہے اور لحم وشحم سے مرکب ہونے کی حیثیت سے بدنِ انسانی علمِ طب کا موضوع ہے؟ علامہ سیوطیؒ نے اپنے استاذ کا یہ اعتراض نقل کیا ہے اور اس پر سکوت اختیار فرمایا ہے، شراح حدیث نے علامہ سیوطیؒ کے اپنے استاذ کے اس اشکال کو نقل کرنے کے بعد خود ان کے خاموش رہنے پر تعجب کیا ہے، کیونکہ اس کا جواب واضح ہے، وہ یہ کہ آپ کی ذات کی دو حیثیتیں ہیں: ''من حيث إنه إنسان ومن حيث إنه رسول''، علامہ کرمانیؒ نے جو ذات رسول کو موضوع قرار دیا وہ رسول ہونے کی حیثیت سے قرار دیا ہے نہ کہ لحم وشحم سے مرکب انسان ہونے کی حیثیت سے اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی اشکال یا تعجب کی بات نہیں ہے۔(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک مطلق علم حدیث کا موضوع ہے، اور علم روایت حدیث چونکہ علم حدیث کی ایک خاص نوع ہے اس لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ اس کا موضوع بھی خاص بیان فرمایا کرتے تھے وہ یہ ہے: ''**الروايات والمرويات من حيث الاتصال والانقطاع**'' یعنی آپ علیہ السلام کی احادیث مبارکہ اپنے شیخ سے سماع یا عدم سماع کے لحاظ سے، کیونکہ ''علم روایت حدیث'' کا مقصود یہی ہے کہ امت میں احادیث مبارکہ **سماعاً من الشيخ** پہنچیں۔(۲)

(۳) الثمرة

غرض وغایت کا مفہوم اور فرق:

یہاں پر دو لفظ ہیں: غرض اور غایت، غرض کہتے ہیں: **مالأجله الفعل** کو یعنی جس شی کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کام کیا جائے، پھر اس کام پر جو شی مرتب ہوتی ہے اس کو ''غایت'' کہا جاتا ہے، پھر وہ مرتب ہونے والی شی اگر آدمی کی منشاء کے مطابق ہے تو وہ ''غرض'' بھی ہے اور ''غایت'' بھی اور اگر وہ منشاء کے خلاف ہے

(۱) مقدمۃ اوجز ۱ / ۵۵ (الفائدة الثانية في موضوعه).

(۲) المصدر السابق.

تو اس کو غایت یعنی نتیجہ تو کہا جائے گا، لیکن غرض نہیں کہیں گے،لہٰذا غرض خاص اور غایت عام ہوئی، جیسے تاجر حصول نفع کے لئے تجارت کرتا ہے پھر اس تجارت پر کبھی نفع مرتب ہوتا ہے اور کبھی نقصان، تو اس نقصان کو غایت تو کہیں گے لیکن غرض نہیں کہہ سکتے۔

تحصیل علم حدیث کے اغراض وفوائد:

علم روایت حدیث کی متعدد اغراض بیان کی گئی ہیں، مگر ان میں تضاد نہیں ہے وہ سب بیک وقت مقصود اور حاصل ہوسکتی ہیں:

(۱) ان بشارتوں، فضیلتوں اور دعاؤں کو حاصل کرنا جو حدیث کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لئے وارد ہوئی ہیں، مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''نَضَّر اللهُ امرأً سَمِعَ مَقالتي فَوَعَاها وأَدَّاهَا فَرُبَّ حاملُ فقهٍ غيرُ فقيهٍ وربَّ حامل فقهٍ إلى من هو أفقه منه''(۱) اِس میں نضر اللہ خبر بھی ہوسکتی ہے اور دعا بھی،خبر ہونے کی صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ جو حدیث پڑھاتا ہے اللہ اس کو تروتازہ اور خوش حال رکھتا ہے اور دعا ہونے کی صورت میں یہ مفہوم ہوگا کہ: اللہ تعالیٰ حدیث پڑھانے والوں کو سرسبز و شاداب رکھے، چنانچہ علماء نے فرمایا ہے کہ: ''مـامن رجلٍ يَطْلَبُ الحديث إلاكان في وَجْهه نَضْرَةٌ'' یعنی جو شخص حقیقی معنیٰ میں طالب حدیث ہوتا ہے اس کے چہرہ پر ایک رونق ہوتی ہے، جو اس نبوی دعا کا اثر ہوتی ہے۔

نیز مذکورہ حدیث کے اگلے جملہ میں دوسروں تک روایت پہنچانے کا فائدہ بھی بیان فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو روایت پہنچائی جارہی ہے وہ روایت پہنچانے والے سے زیادہ فہیم اور سمجھدار ہوتے ہیں، یعنی بعض شاگرد فہم وحفظ وغیرہ اوصاف میں استاذ سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں جس کی بناء پر وہ حدیث سے ایسے مسائل ونکات مستنبط کرلیتے ہیں کہ جن تک پہنچانے والے کے ذہن کی رسائی نہیں ہوتی، جبکہ حدیث کی نقل وروایت سے یہی مقصود ہے۔

ایک حدیث میں ہے ''إِنَّ اَوْلَـى الـنَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلاةً (۲)'' یعنی قیامت کے دن میرے سب سے قریب وہ ہوں گے جو مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھتے ہوں، ابن حبان نے فرمایا ہے

(۱) أخرجه الترمذي ۲/ ۹۵، باب ماجاء في الحث على تبليغ السماع.

(۲) أخرجه الترمذي في الصلوة،باب ماجاء في فضل الصلوة على النبي صلى الله عليه وسلم ۱/ ۱۱۰.

کہ اس کا مصداق محدثین ہیں، اس لئے کہ ان کا رات دن کا مشغلہ حدیث ہے[1] ان ہی حضرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آنے پر درود پڑھنے اور لکھنے کی سب سے زیادہ سعادت حاصل ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے ”اللهم ارْحَمْ خُلَفَائِي“ اے اللہ میرے خلفاء کے ساتھ رحم کا معاملہ فرما، صحابہؓ نے پوچھا: ”يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ خُلَفَاءُكَ؟ قَالَ الَّذِيْنَ يَرْوُوْنَ أَحَادِيْثِيْ يُعَلِّمُوْنَهَا النَّاس[2]“ یعنی میرے خلفاء وہ ہیں جو میری احادیث کو روایت کرتے ہیں اورلوگوں کو ان کی تعلیم دیتے ہیں۔

یہ دعائیں اور بشارتیں ہیں جو احادیث میں وارد ہوئی ہیں ان کا مصداق بننے کے لئے علم حدیث پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔

(۲) دوسری غرض ہے فہم قرآن اور عمل بالقرآن ،اس لئے کہ احادیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں اور نہ ہی عمل کرنا ممکن ہے، کیوں کہ قرآن میں احکام شریعت کے اصول بیان کئے گئے ہیں، پھر ان کی تفصیل وتشریح احادیث میں ذکر کی گئی ہے، پس چونکہ احادیث کے بغیر قرآن کا فہم اوراس پر عمل ممکن نہیں اس لئے علم حدیث پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔[3]

(۳) ”معرفة كيفية الاقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم“ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی کا طریقہ جاننے کے لئے علم حدیث پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔[4]

(۴) حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ: میرے نزدیک حدیث کی سب سے بہتر غرض ہے محبوب کے کلام سے لطف اندوز ہونا، کیونکہ مقولہ مشہور ہے: ”مَن أَحَبَّ شيئاً أَكْثَرَ ذِكْرَه“ کہ جس سے محبت ہوتی ہے اس کا بکثرت تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۵) شارح ابوداؤد علامہ محمود بن محمد خطاب السبکیؒ نے غرض بیان کی ہے: ”الاحترازُ عن الخطأ فی نَقْلِ ماأضيفَ إلَى النبي صلى الله عليه وسلم“ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی چیز کے غلط انتساب سے محفوظ ہونا، کیونکہ کلام رسول اور غیر کلام رسول میں امتیاز وہی حضرات کرسکتے ہیں جو فنِ حدیث

---

(۱) مقدمۂ أوجز ص ۱/ ۵٦۔

(۲) مجمع الزوائد للهيثمی عن ابن عباس ۱/ ۱۲٦.

(۳) الدرالمنضود ۱/ ۱۲.

(٤) المصدرالسابق ۱/ ۱۲.

سے واقف ہوں۔ (۱)

(٦) بعض علماء نے یہ غرض بیان کی ہے: ''التحلي بالآداب النبويةِ والتَّوقيّ عما يَكْرَهُه ويَنْهاه'' یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق واوصاف کے ساتھ اپنے آپ کو آراستہ کرنا اور جو چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ناپسند تھیں ان سے بچنا اور یہی آپ علیہ السلام کا مقصدِ بعثت بھی ہے۔

(٤) الاسم

حدیث کی وجوہِ تسمیہ:

اسم کا مطلب ہے وجہ تسمیہ: حدیث کی وجہ تسمیہ بھی متعدد ہیں:

(۱) حدیث بمعنی حادث ہے جو قدیم کی ضد ہے، اللہ کا کلام یعنی قرآن قدیم ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس کے بالمقابل حادث ہے، اس لحاظ سے حدیث کو حدیث کہا جاتا ہے۔

(۲) حدیث کے معنی کلام اور گفتگو کے ہیں، چونکہ احادیث مبارکہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اور گفتگو ہیں اس لئے ان کو ''حدیث'' کہا جاتا ہے اس پر سوال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تو فعل کے قبیل سے بھی ہیں تو احادیثِ فعلی کیسے حدیث کا مصداق بنیں گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تغلیباً احادیث فعلی بھی اس کا مصداق ہیں۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد روایات میں خود اپنے کلام کو حدیث کہنا ثابت ہے، جن میں سے ایک روایت حدیث کی اغراض کے ذیل میں بھی گذر چکی ہے، اس میں یہ مذکور ہے ''الذين يروون احاديثي يعلمونها الناس'' پس چونکہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام کو حدیث کہا ہے اس لئے اس کو حدیث کہا جاتا ہے، یہ وجہ تسمیہ سب سے بہتر ہے۔

(۴) قرآن کریم میں ہے: واما بنعمة ربك فحدث (الضحی: ۱۱) یعنی آپ اپنے رب کے انعامات کو بیان کیجئے، اس ''نعمة'' میں آپ پر نازل ہونے والی وحی اور قلب پر وارد ہونے والے علوم ومعارف اور مسائل واحکام بھی داخل ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بیان وتبلیغ کا حکم صیغۂ تحدیث کے ذریعہ دیا، اس لئے آپ علیہ السلام کی بیان فرمودہ تعلیمات کو ''حدیث'' کہا جاتا ہے۔ (۲)

---

(۱) المنهل العذب المورود ۱/ ۳ مطبعة الاستقامة، القاهرة، مصر.

(۲) فتح الملهم ۱/ ٥.

سنت، خبر اور اثر کا مفہوم ومصداق

حدیث کے علاوہ کچھ اور الفاظ بھی بولے جاتے ہیں مثلاً سنت، خبر اور اثر، یہ الفاظ باہم مترادف ہیں یا مختلف؟ اس کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

(۱) سنت:

بعض نے اس کو حدیث کا مترادف قرار دیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حدیث کا اطلاق صرف قول پر ہوتا ہے اور سنت کا اطلاق آپ علیہ السلام کے اقوال، افعال اور احوال سب پر ہوتا ہے، لہٰذا حدیث خاص ہے اور سنت عام۔

(۲) خبر:

اس کے بارے میں علماء کے تین قول ہیں:

(۱) حدیث وخبر دونوں مترادف ہیں۔

(۲) دونوں میں تباین کی نسبت ہے، یعنی حدیث وہ بات جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور خبر وہ بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سے منقول ہو۔

(۳) بعض نے کہا کہ خبر عام ہے اور حدیث خاص ہے، حدیث اس چیز کو کہا جاتا ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور خبر عام ہے خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سے منقول ہو دونوں کو خبر کہا جائے گا۔

(۳) اثر:

ایک لفظ ہے اثر، اثر کا اطلاق محدثین کے یہاں حدیث مرفوع وموقوف دونوں پر ہوتا ہے، اسی لئے امام طحاوی نے اپنی کتاب کا نام ''شرح معانی الآثار'' رکھا ہے، جس میں مرفوع وموقوف دونوں قسم کی روایات ہیں، اور بعض نے دونوں کو مباین قرار دیا ہے، بایں معنی کہ وہ موقوف یعنی صحابہ کے اقوال وافعال کو ''اثر'' قرار دیتے ہیں اور مرفوع یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال وغیرہ کو ''حدیث'' کہتے ہیں۔

(٥)الاستمداد

یعنی اس فن کا ماخذ کیاہے؟ توفنِ حدیث کا ماخذ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال اوراحوال ہیں۔

(٦)حکم الشارع

یعنی اس فن کو حاصل کرنے کا شرعی درجہ کیاہے؟تو واضح رہے کہ تمام علوم شرعیہ کاحکم ایک ہی ہوتا ہے کہ ہرعلاقہ میں ان کا جاننا فرض کفایہ ہے،علم حدیث کاحکم بھی یہی ہے۔

(٧)الفضیلة

فضیلت دوقسم کی ہوتی ہے: ایک نقلی اور ایک عقلی،علمِ حدیث کی فضیلت نقلی اغراض کے بیان میں پیچھے گذرچکی ہے،عقلی فضیلت کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ حدیث سیدالاولین والآخرین کا کلام ہے، جومخلوق میں سب سے افضل ہیں،تو آپ کا کلام بھی سب سے افضل ہوگا اوراس کی تحصیل بھی سب سے زیادہ باعث فضیلت ہوگی۔

علم حدیث:افضل العلوم:

تدریب الراوی میں علامہ سیوطیؒ نے تحریر کیاہے کہ حدیث افضل العلوم ہے،[1] لیکن ''الاتقان'' میں انھوں نے علم تفسیر کو افضل کہاہے[2] صحیح بات یہ ہے کہ علم حدیث افضل ہے، اس لئے کہ کسی بھی فن کی افضلیت موضوع،غرض اور احتیاج کے اعتبار سے ہوتی ہے،علم حدیث کا موضوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بہ حیثیت وصف رسالت ہے، اوراس کی اغراض بھی اہم ہیں،نیزحدیث کی طرف احتیاج بھی سب سے زیادہ ہے،خودتفسیر کے لئے بھی حدیث کی احتیاج ہے،لہٰذااس لحاظ سے علم حدیث ہی افضل ہے۔[3]

(٨)النسبة

فن روایت حدیث کی نسبت یعنی اس کی جنس کونسی ہے؟ملحوظ رہے کہ علوم کی اجناس مقرر ہیں: اولاً

(١)التدریب ٢ / ١٢٣، نصه: فإن علم الحديث أفضل القرب.

(٢)الإتقان فی علوم القرآن ص ٤ / ١٩٩،ت محمدأبوالفضل إبراهيم، ط الهيئته المصرية العامة لكتاب.

(٣)تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں مقدمۂ اوجزص ١ / ٥٥—٦٥۔

علم کی دوقسمیں ہیں:عقلیہ اورنقلیہ، پھرنقلیہ کی دوقسمیں ہیں: شرعیہ اورغیرشرعیہ، پھرشرعیہ کی دوقسمیں ہیں: اصلیہ اورفرعیہ، اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض علوم شرعی ہوتے ہیں اور بعض غیرشرعی جیسے علم سحر، اوربعض نقلی ہوتے ہیں اوربعض عقلی جیسے منطق، پھربعض علوم اصلی ہوتے ہیں اوربعض فرعی، جیسے علم فقہ، پس فن حدیث کی نسبت یہ ہے کہ وہ شرعی، نقلی اوراصلی ہے۔(١)

(٩)الواضع

کتابتِ حدیث اورتدوینِ حدیث؛مفہوم اورفرق:

یہ کچھ طویل بحث ہے، اولاً تدوین حدیث کے معنی سمجھنے چاہئیں، تدوینِ حدیث کا مطلب ہے: احادیث کوکتابی شکل میں جمع کرنا، احادیث حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدوّن نہیں ہوئیں، بلکہ دورصحابہ میں بھی تدوین کا سلسلہ نہیں تھا، البتہ کتابت حدیث کا وجوددورصحابہ میں ملتاہے، چنانچہ بعض صحابہ احادیث کولکھ لیا کرتے تھے،مگر یہ تدوین سے علیحدہ چیز ہے،خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ۹۹ھ میں تدوین احادیث کی ابتداء ہوئی ہے، اب سوال یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے اپنے زمانہ میں احادیث کو مدون کیوں نہیں کیا؟ حضرت ابوبکرؓ نے بھی اپنے زمانہ میں قرآن کوتومدون کیا مگراحادیث کو انہوں نے بھی مدون نہیں کیا؟صحابۂ کرام کی احادیث کومدون نہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں:

دورنبوی میں حدیث مدون نہ کئے جانے کی وجوہات:

(١)حضرات صحابہؓ نے اپنے زمانہ میں جمع قرآن کا فریضہ انجام دیاتھا تو انہوں نے جمع احادیث کو مناسب نہیں سمجھا، اس لئے کہ اگرجمع حدیث کا کام بھی کیا جاتا تو اندیشہ تھا کہ ناقص العقل لوگ احادیث کے صحیفوں کوکلام اللہ کا درجہ دیدیتے، گویا کہ قرآن وحدیث کے خلط کا احتمال تھا، اس لئے ان حضرات نے جمعِ احادیث کا کام نہیں کیا۔

(٢)حضرات صحابہ کوحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک اداسے عشق ومحبت تھی،انہوں نے آپ

(١)هدى الساري مقدمة فتح الباري، الفصل الأول ص ٦.

صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سیکھا کہ آپ احادیث بیان فرماتے اور صحابہ انہیں حفظ کرلیا کرتے تھے، عموماً لکھتے نہیں تھے، تو ان حضرات نے اپنے شاگردوں کے لئے یہی طریقہ پسند کیا کہ وہ بھی احادیث کو حفظ یاد کریں، حضرت ابوسعید خدریؓ کے بارے میں مروی ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے شاگردوں کو حکم دیا: ''كَانَ نبيُناصلى الله عليه وسلم يُحَدِّثُ فنَحفَظُ فاحفظُوا كماكُنَّا نَحْفَظ''[1]

(۳) ان حضرات کے حافظے بہت قوی تھے، انہوں نے اپنے حافظے سے احادیث کی حفاظت کی، انہوں نے لکھنے کی اور تدوین کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، پس ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو مدون نہیں کیا۔

تدوینِ حدیث:

پھر جب صحابہ وتابعین دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اس بات کا اندیشہ محسوس ہوا کہ صحابہ وتابعین کے سینوں میں جو احادیث محفوظ ہیں وہ ضائع نہ ہوجائیں، اس ضرورت وخطرہ کو سب سے پہلے عمر بن عبدالعزیزؒ نے محسوس کیا اور انہوں نے اپنے زمانہ کے علماء کو جمعِ احادیث کا حکم دیا، عمر بن عبدالعزیزؒ کی پیدائش علی اختلاف الاقوال ۶۲ھ یا ۶۳ھ میں ہوئی، ۹۹ھ میں آپ خلیفہ بنائے گئے اور دو سال کے بعد ہی یعنی ۱۰۱ھ میں آپ کی وفات ہوگئی، عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زیر اثر بلاد کے حفاظ حدیث کو لکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو جمع کیا جائے، تاریخ اصبہان میں ہے ''كتب عـمـرُ بن عبدالعزيز إلى الآفاقِ أنْظُروا حديثَ رسول الله صلى الله عليه وسلم فاجْمَعُوا''[2] اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے خاص طور پر ابوبکر محمد بن حزمؒ کے نام خط لکھا جو مدینہ منورہ کے قاضی وامیر تھے، حضرت امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں ''باب كيف يقبض العلم'' کے تحت لکھا ہے ''كتب عـمـرُ بـن عبدالعزيز إلى أبي بكر بن حزمٍ: أنْظُرْ ما كان من حديثِ رسول الله صلى الله عليه وسـلم فاكْتُبْهُ لي فإني خِفتُ دُروسَ العلم وذهابَ العلماء''[3] چنانچہ اس زمانہ کے علماء نے جمع احادیث کا کام انجام دیا۔

---

(۱) تاريخ دمشق ۲۰/ ۳۹۲ مكتبه دار الفكر.

(۲) تاريخ أصبهان ۱/ ۳۶۶ دار الكتب العلمية بيروت.

(۳) بخاری شریف ۱/ ۲۰.

اوراس سلسلہ میں سب سے نمایاں دوشخصوں کا نام سامنے آتا ہے: ایک امام زہری اوردوسرے ابوبکر محمد بن حزم الانصاری (زہری کا نام ہے محمد بن مسلم بن عبیداللہ بن عبداللہ بن شہاب الزہری المتوفی ۱۲۵ھ، ابوبکر کا نام ہے ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم الانصاری المتوفی ۱۲۰ھ) یہی دونوں حضرات حدیث کے مدون ہیں، ان دونوں کا زمانہ ایک ہے اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے سب سے پہلے کس نے یہ فریضہ انجام دیا؟ اور مدون اول کا سہرا کس کے سر ہے؟ امام مالک، سیوطی اور ابن حجر وغیرہ کی رائے امام زہری کے بارے میں ہے، اورامام بخاری کا میلان ابوبکر بن حزم کی طرف ہے، ابن عبدالبر نے ''**جامع بیان العلم وفضله**'' میں امام زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ہم کواحادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا ''**فكَتَبْنَاها دفتراً دفتراً**'' تو ہم نے احادیث کے دفتر کے دفتر لکھ ڈالے۔ (۱)

تدوینِ حدیث کے ادوار اور مناہج:

حضرت شیخؒ نے لامع الدراری (۲) کے مقدمہ میں ابن حجر کے واسطے سے تدوینِ حدیث کے چاردور نقل فرمائے ہیں۔

(۱) تدوینِ حدیث کا پہلا دور ''تدوین علی الاطلاق'' ہے جس میں احادیث کومضامین کی رعایت کے بغیر بلاکسی ترتیب کے کتابی شکل میں جمع کردیا گیا اور یہ کام پہلی صدی ہجری کے اخیر میں ہوا۔

(۲) دوسرا دور ''تدوین علی الابواب'' کا ہے یعنی احادیث کے ذخیرہ میں سے ایک ایک قسم کے مضمون کی احادیث کو الگ الگ باب میں جمع کردیا جائے مثلاً طہارت سے متعلق روایات کو کتاب الطہارۃ میں، نماز سے متعلق احادیث کو کتاب الصلوۃ میں جمع کردیا جائے وغیرہ، اس کام کو انجام دینے والے چند ہم عصر علماء تھے؛ جن میں سے کچھ نام یہ ہیں، امام مالک مدینہ طیبہ میں، ابن جریج مکہ مکرمہ میں، معمر بن راشد الیمنی یمن میں، امام ابوحنیفہ، سفیان ثوری اور عبداللہ بن مبارک کوفہ میں۔

(۳) تیسرا دور ''تدوین علی المسانید'' کا ہے، مسانید: مُسْند کی جمع ہے، مسند: کتب حدیث کی انواع میں سے ایک نوع کا نام ہے چنانچہ ''مُسْنَد'' حدیث کی اس کتاب کوکہا جاتا ہے کہ جس میں احادیث کوعلی ترتیب اسماء الصحابہ جمع کیا جائے اور مضمون کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے مثلاً ابوبکرؓ کی تمام روایات کوایک جگہ جمع کردیا جائے،

(۱) ۳۳۱/۱ (كتاب العلم) مطبوعه: دار ابن الجوزي المملكة العربية السعودية.

(۲) ص۲۸.

اس کے بعد حضرت عمرؓ کی مرویات کو جمع کر دیا جائے خواہ وہ کسی بھی مضمون سے متعلق ہوں، یہ کام سب سے پہلے عبیداللہ بن موسی العبسی اور نعیم بن حماد الخزاعی نے انجام دیا، اس کے بعد پھر بہت سی مسانید لکھی گئیں مثلاً مسند احمد، مسند بزار، مسند ابوداؤد الطیالسی، مسند ابویعلی وغیرہ۔

(۴) چوتھا دور ''تدوین علی الصحاح'' کا ہے یعنی صحیح احادیث کو یکجا جمع کر دیا جائے، اب تک جو احادیث جمع کی گئیں تھیں ان میں احادیث صحیحہ وضعیفہ کا امتیاز نہیں تھا، اگر کوئی صحیح حدیث سے استدلال کرنا چاہے تو امتیاز کرنا بہت مشکل تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ ذخیرۂ احادیث میں سے صحیح احادیث کو الگ جمع کر دیا جائے، امام بخاری کے استاذ اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں ایک روز یہ بات سامنے آئی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر یہ کام ہو جائے تو اچھا ہے، امام بخاری نے اسی وقت عزم کر لیا اور بخاری شریف میں خوب چھان پھٹک کے بعد صحیح احادیث کی ایک معتد بہ مقدار کو جمع فرمایا،[1] پھر امام مسلم نے بہت سی احادیث کو صحیح مسلم شریف میں جمع فرمایا، ان کے بعد بہت سے حضرات نے صحاح کو الگ جمع کیا۔

(۱۰) المسائل

مسائل حدیث کیا ہیں؟ حدیث شریف کے مسائل ہیں: ''**جميع مايتعلق بأحواله صلى الله عليه وسلم قولاً أو فعلاً أو تقريراً أو صفةً**'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلقہ تمام امور، آپ کے احوال، اقوال، افعال، تقریرات اور صفات۔

مبادیات عشرہ کا بیان یہاں ختم ہوا، اب کچھ اور مزید باتیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) القسمة والتبويب

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے مصنف جب کتاب کو شروع کرتا ہے تو کہتا ہے میری یہ کتاب اتنے ابواب اور اتنی فصول پر مشتمل ہوگی، اسی طرح مضمون کے لحاظ سے علم کی بھی تقسیم اور تبویب ہوتی ہے مثلاً علم منطق کے مضامین دو ہیں: تصورات اور تصدیقات، علم بلاغت کے مضامین تین ہیں معانی، بیان اور بدیع، ان کو ابوابِ علم کہا جاتا ہے، علم حدیث کے ابواب (مضامین) کتنے ہیں اور کیا ہیں؟

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۲ / ٤٠١.

ابواب ومضامینِ حدیث اوران کامختصرتعارف وتشریح:

حضرات محدثین نے علمِ روایتِ حدیث کے آٹھ مضامین بیان فرمائے ہیں، جو یہ ہیں: (۱) عقائد (۲) احکام (۳) تفسیر (۴) تاریخ (۵) رِقاق (۶) مناقب (۷) آداب (۸) فتن ، حدیث کی کتابوں میں انہی آٹھ قسم کے مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔

تمام احادیث میں سے ہر حدیث انہی میں سے کسی سے متعلق ہوگی، کوئی حدیث ان ابواب ثمانیہ سے خارج نہیں ہوگی، حدیث کی جو کتاب ان ابواب ثمانیہ پر مشتمل ہو اس کو ''جامع'' کہا جاتا ہے، جیسے امام بخاری کی الجامع الصحیح ،اسی طرح ترمذی شریف بھی جامع ہے۔

مشکوٰۃ شریف جامع ہے یانہیں؟ شیخ یونس جونپوریؒ کا جواب:

ہماری یہ کتاب مشکوۃ شریف جامع ہے ، یانہیں؟ اس میں سات مضامین کی روایات تو موجود ہیں البتہ تفسیر کا بیان باقاعدہ نہیں ہے، تو اس کو جامع کہا جائے گایانہیں؟ جن حضرات نے جامع ہونے کے لئے آٹھ مضامین کی تقیید فرمائی ان کے مطابق یہ جامع نہیں ہوگی، میں نے حضرت شیخ یونس صاحبؒ سے اس بارے میں استفسار کیا تو حضرت نے فرمایا: کہ میں نے بھی یہ بات حضرت شیخ زکریاؒ سے معلوم کی تھی تو حضرت شیخ نے فرمایا تھا کہ ہاں مشکوۃ شریف جامع ہے، اور بتایا تھا کہ یہ آٹھ کی اصطلاح شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانہ سے شروع ہوئی ہے، حضرات متقدمین کے یہاں جو کتاب حدیث کے مختلف ومتعدد مضامین پر مشتمل ہو اس کو جامع کہا جاتا تھا، آٹھ کی قید نہ تھی، پس متقدمین کی تعریف کے لحاظ سے مشکوۃ شریف جامع ہے، پھر حضرت شیخ یونس صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کے بعد سے ابتک تمھارے علاوہ کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا۔

مذکورہ آٹھوں مضامین کی کچھ تفصیل ذیل میں درج ہے:

(۱) عقائد:-احادیث متعلقہ بالعقائد کو'' علم التوحید'' بھی کہا جاتا ہے، بہت سے محدثین نے اس مضمون سے متعلق باقاعدہ کتابیں تصنیف فرمائیں ہیں،اس بارے میں امام بیہقی کی کتاب'' الاسماء والصفات'' معروف ومشہور ہے۔

(۲)احکام:- اس سے مراد ''احادیث متعلقہ بالحلال والحرام'' ہیں حدیث کی جس کتاب میں یہ احادیث ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مذکور ہوں اس کو ''سنن'' کہا جاتا ہے۔

(۳)تفسیر:-احادیث متعلقہ بالتفسیر کو ''علم التفسیر'' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں مثلاً سیوطی کی الدر المنثور، تفسیر ابن کثیر، تفسیر ابن جریر وغیرہ۔

(۴) تاریخ:-تاریخ کے دو حصے ہیں:

(الف)ایک حصہ وہ ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے حالات بیان کیے گئے ہیں مثلاً انبیاء سابقین کے حالات، امم سابقہ کے حالات، آسمان وزمین اور ملائکہ وغیرہ کی تخلیق کا بیان، تو وہ احادیث جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سے پہلے کے حالات کو بیان فرمایا ان کو ''بدء الخلق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

(ب)دوسرا حصہ وہ ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے وفات تک کے حالات اور آپ کے آل واصحاب کے حالات کو بیان کیا گیا ہے، اس کو ''سیرت'' کہا جاتا ہے، جیسے سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ المصطفیٰ، مدارج النبوۃ، زاد المعاد لابن القیم وغیرہ۔

(۵) رِقاق:- یہ رقیق کی جمع ہے بمعنیٰ مرقّق (نرم کرنے والی چیز)حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ وامت کو بہت سی ایسی نصیحتیں فرمائیں جن سے دل نرم ہوجاتا ہے، ایسی احادیث کو ''رقاق'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، بہت سے حضرات اس کے لئے ''علم السلوک والزہد'' کا عنوان لاتے ہیں۔

(٦) مناقب:- یہ مَنْقَبۃ کی جمع ہے بمعنیٰ فضیلت، عظمت وشرافت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص خاص صحابہ اور خاص خاص قبائل کے فضائل بیان فرمائے، ان کو ''مناقب'' کہا جاتا ہے۔

(۷) آداب:-حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت کے بہت سے آداب بیان فرمائے، جو روایات ان آداب سے متعلق ہوں ان کو ''کتاب الآداب'' کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے اور اس موضوع پر بھی مستقل تصانیف موجود ہیں، جیسے امام بخاری کی کتاب الادب المفرد.

(۸)فتن:- یہ فتنہ کی جمع ہے، قیامت تک جو فتنے آنے والے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان فتنوں سے آگاہ فرمایا، ان کو ''کتاب الفتن'' میں بیان کیا جاتا ہے۔[1]

(۱)مقدمۂ لامع ص ٤٣.

(۲)مرتبة علم الحديث

علم کا مرتبہ دو اعتبار سے ہوتا ہے: ایک فضیلت وشرافت کے اعتبار سے، اس لحاظ سے علم حدیث کا مرتبہ بتادیا گیا کہ یہ افضل العلوم ہے، دوسرے پڑھنے وپڑھانے کے اعتبار سے، اس لحاظ سے علوم دو قسم کے ہیں (۱) علوم عالیہ (۲) علوم آلیہ جیسے نحو، صرف، معانی اور بیان وغیرہ، چوں کہ علوم شرعیہ عربی زبان میں ہیں اس لئے نحو صرف وغیرہ کو بطور آلہ کے پڑھایا جاتا ہے تاکہ عجمی لوگ علوم شرعیہ کو سمجھ سکیں۔ اس دوسرے اعتبار سے علم حدیث علوم عالیہ میں سے ہے۔

(۳)حجية الحديث ومكانتها فی التشريع الإسلامی

یعنی حدیث کا حجت ہونا اور شریعت اسلامیہ میں اس کا مقام ومرتبہ

اہل قرآن (منکرین حدیث) کا رد:

جمہور امت کے نزدیک دلائل شرعیہ چار ہیں: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس، قرآن کریم کے بعد حدیث، اسلامی احکام اور تعلیمات کا دوسرا بڑا ماٰخذ ہے، بعض لوگ ایسے ہیں جنہوں نے حدیث کی حجیت کا انکار کیا، سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں معتزلہ نے احادیث کو مطلقاً ظنی قرار دیا، حالانکہ بہت سی احادیث قطعی ہوتی ہیں، مگر ان پر عقلیت غالب تھی، جس کے نتیجہ میں انہوں نے بہت سی احادیث کا سرے سے انکار ہی کردیا، اس کے بعد ہر زمانہ میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے جنہوں نے حجیت احادیث کا انکار کیا، ماضی قریب میں پاکستان میں غلام احمد پرویز وغیرہ نے منکرینِ حدیث کی جماعت کی باقاعدہ بنیاد ڈالی، اور انہوں نے اپنے گمان کے اعتبار سے اپنے لئے ایک اچھا نام "اہلِ قرآن" تجویز کیا، اس فرقہ نے "حسبنا كتاب الله" کا نعرہ لگایا، ان لوگوں کا مقصد حقیقت میں اپنے آپ کو شرعی قیودات سے آزاد کرنا تھا، قرآن کریم میں تو اجمالی احکام ہیں، ان کی تفصیلات وقیودات احادیث میں وارد ہوئی ہیں، انہوں نے کہا کہ نبی کی حیثیت محض سفیر کی ہوتی ہے، اس کا کام صرف قرآن کو پہنچا دینا ہے اور نبی کا احترام محض سفیر ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، مطاع ہونے کی وجہ سے نہیں، اس قسم کی نامعقول باتیں انہوں نے کہی ہیں۔

ہر زمانہ کے علماء نے ان کی تردید کی ہے، اس زمانہ میں بھی ان کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی گئی

ہیں، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی ''نصرۃ الحدیث '' اس موضوع پر عمدہ کتاب ہے، تفصیلات انھیں کتابوں میں ہیں البتہ ان کتب کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

حجیت حدیث کے بارے میں کیئے گئے شبہات وسوالات

ان لوگوں نے جو حدیث کا انکار کیا تو ان کو کچھ شبہات پیش آئے اورانہوں نے احادیث کے حجت ہونے پر کچھ سوالات اٹھائے:

(۱) قرآن؛ جامعیت کی وجہ سے کسی تفسیر کا محتاج نہیں!

پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن تو جامع ہے، اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے، خود قرآن میں ہے ''تبیاناً لکل شيءٍ[۱]'' جب قرآن جامع ہے تو اس کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، اس کی تفسیر کرنا جامعیت کے منافی ہے۔

(۲) احادیث؛ زمانۂ نبوی ﷺ کے بعد مدوّن ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں!

دوسرا سوال یہ ہے کہ احادیث کی تدوین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوئی ہے، چنانچہ ۹۹ھ میں تدوین ہوئی، جیسا کہ گزر چکا، گویا ایک صدی کے بعد احادیث کو مدون کیا گیا ہے، پس جو کلام متکلم کی وفات کے سو سال بعد لکھا اور مرتب کیا گیا ہو وہ کیونکر قابل قبول ہوسکتا ہے؟ اس طویل مدت میں سہو ونسیان کا قوی امکان ہے۔

(۳) قرآن قطعی اوراحادیث ظنی!

(۳) تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن قطعی ہے اوراحادیث ظنی ہیں تو ظنی چیز؛ قطعی چیز کی تفسیر کیسے ہوسکتی ہے؟

(۴) حدیث محض ایک تاریخ!

چوتھا سوال یہ ہے کہ حدیث کی حیثیت تاریخ کی ہے اورتاریخ کو کوئی حجت نہیں مانتا۔

شبہات کے جوابات:

حضرات علماء نے چاروں شبہات اورسوالوں کا معقول اور مدلل جواب دیا ہے، جو یہ ہے:

(۱) من سورۃ النحل: رقم الآیۃ ۸۹.

قرآن کے جامع ہونے کا صحیح مفہوم:

(۱) اول سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن بلاشبہ جامع ہے، لیکن جامع ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں تمام مسائل وجزئیات آگئے ہیں، بلکہ جامعیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے الفاظ مختصر اور بہت سے علوم ومعارف پر مشتمل ہیں، قرآن کریم میں اصول مجملہ اور کلیات مختصرہ کا بیان ہے، قرآن کریم کی حیثیت ''دستوراساسی'' کی سی ہے، جس میں کلیات کا بیان ہوتا ہے اور پھر دستوراساسی کی تشریح کی جاتی ہے، چنانچہ احادیث کے ذریعہ قرآن کریم کی تشریح کی گئی ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا، قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِم ''[۱] ایک جگہ فرمایا گیا: ''وَاَنْزَلْنَا اِلَيْکَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ ''[۲] ان آیات میں واضح کردیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بنیادی مقصد آپ پر نازل ہونے والی کتاب کی تفسیر وتشریح ہے۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذمہ داری کو ادا کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر وتشریح فرمائی، اس تفسیر کا نام ''حدیث'' ہے، اگر حدیث نہ ہوتی تو قرآن کو سمجھنا ممکن نہ تھا، امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے: ''لولا الحديث لَمَا فَهِمَ مِنَّا أَحَدٌ القرآنَ''[۳] یعنی اگر حدیث شریف نہ ہوتی تو ہم میں سے کوئی قرآن کو نہ سمجھ پاتا، اور حضرت امام شافعیؒ سے منقول ہے: ''جَمِيعُ مَاتَقُوْلُهُ الأَئِمَّةُ شَرْحٌ لِلسنةِ وجميعُ مافي السنةِ شرحٌ للكتابِ[۴]'' یعنی ائمہ دین جو کچھ فرماتے ہیں وہ سنت کی شرح ہے اور جو سنت میں بیان کیا گیا ہے وہ سب کتاب اللہ کی شرح ہے۔

نیز حضرات صحابہؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی، وہ اسلوب قرآن سے بہتر طور پر آشنا تھے، اُن تمام حالات وواقعات کا براہ راست مشاہدہ کرنے والے تھے جن میں قرآن نازل ہوا، مگر اس کے باوجود حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنے میں ان سے غلطی ہوتی تھی، حضرت عدیؓ بن حاتم کا واقعہ مشہور ہے کہ سحری کھانے سے

(۱) من سورة البقرة رقم الآية: ۱۲۹۔

(۲) من سورة النحل: ٤٤۔

(۳) حاشية فيض البارى ۱ / ۳۲۰۔

(٤) الإتقان فى علوم القرآن ٤ / ۲۸ النوع الخامس والستون الإكليل فى استنباط التنزيل ص ۱۱۔

متعلق آیت کریمہ ''حتیّٰ یتبیّنَ لَکُمُ الْخیطُ الابیَضُ مِنَ الْخَیطِ الاسوَدِ[۱]'' میں خیط ابیض اورخیط اسود سے حقیقی معنی مراد ہونا سمجھ کر دودھاگے سیاہ وسفید تکیہ کے نیچے رکھ لئے، جب روشنی سے دونوں کا رنگ نظر آنے لگا، اس وقت کھانا پینا بند کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عدی تمہارا تکیہ تو بڑا لمبا ہے کہ جس میں رات اوردن سما گئے؟ کیونکہ یہاں دودھاگوں سے رات کی تاریکی اوردن کی سفیدی مراد ہے۔[۲]

اس قسم کی غلط فہمیوں کی کچھ مثالیں خود مشکوۃ میں بھی آئیں گی، پس بغیر حدیث کے قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں، لہٰذا یہ تشریح وتفسیر جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے قرآن کی جامعیت کے منافی نہیں ہے۔

تاریخِ حفاظتِ حدیث:

(۲) سوال ثانی کا جواب سمجھنے کے لئے کئی چیزیں سمجھنا ضروری ہے:

(الف) اللہ نے قرآن کریم میں حفاظت قرآن کا وعدہ فرمایا ہے ''اِنَّا نَحنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ[۳]'' علماء نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں حدیث وفقہ اور دیگر علوم شرعیہ سب کی حفاظت کا وعدہ ہے، صرف الفاظ کی حفاظت مراد نہیں، اس لئے کہ حدیث وفقہ قرآن ہی کے معانی ہیں، ظاہر ہے کہ ذکر سے اگر صرف الفاظِ قرآنی مراد ہوں تو یہ حفاظت ناتمام ہوگی، کیونکہ اگر کسی کتاب کے الفاظ تو محفوظ ہوں، لیکن معانی محفوظ نہ ہوں تو اس کو محفوظ نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا قرآن کے الفاظ بھی محفوظ اور اس کے معانی بھی محفوظ۔

حق تعالیٰ شانہ نے ان معانی کی حفاظت اس عجیب وغریب انداز سے فرمائی کہ صحابہ کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت اور عشق ڈال دیا، عاشق؛ معشوق کی ہر ادا کو محفوظ کرتا ہے، اس عشق کی وجہ سے صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حالات کو محفوظ کیا اور امت تک پہنچایا، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بھی دیا تھا کہ میری احادیث کو یاد کرو اور قرآن میں بھی اطاعتِ رسول کا حکم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اسوہ قرار دیا گیا، ان سب وجہوں سے صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر حال کو محفوظ کیا، اللہ نے ان کو سمندر جیسا حافظہ عطا فرمایا تھا، اکثر صحابہ وتابعین کو اپنے طویل نسب نامے اور بڑے بڑے قصیدے ازبر یاد تھے، اس خداداد حافظہ کے ذریعہ انہوں نے احادیث کو محفوظ رکھا، امام ابوزرعہ رازی نے

(۱) البقرة:۱۸۷.

(۲) مسلم۱/۳٤۹(۱۰۹۰) لفظه: إن وسادک لعريض إنما هو سواد الليل وبياض النهار.

(۳) سورة الحجر رقم الآية،۹.

فرمایا کہ مجھے دو لاکھ حدیثیں ایسی یاد ہیں جیسے عام آدمی کو "قل ھو اللہ" یاد ہوتی ہے، [1] اور بعض افراد کو تمام حدیثیں یاد تھیں۔

(ب) ایک ہے تدوین حدیث اور ایک ہے کتابت حدیث، دونوں میں فرق ہے کما مر، تدوین تو بیشک بعد میں ہوئی، لیکن نفسِ کتابتِ حدیث کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی سے شروع ہو چکا تھا، حضرات صحابہ کے نزدیک حفاظتِ حدیث کا مدار اگرچہ حافظہ پر تھا، لیکن اسی کے ساتھ بہت سے صحابہ احادیث کو انفرادی طور پر لکھ بھی لیتے تھے، بہت سی احادیثِ صحیحہ اس پر دال ہیں، اگرچہ ابتداء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کو لکھنے کی ممانعت فرمائی تھی جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے: "لاتکتبوا عَنِّي غيرَالقرآن فمن كتبَ عني غيرَالقرآن فَلْيَمْحُه [2] "یعنی مجھ سے قرآن کے سوا کچھ مت لکھو، اور جس نے کچھ لکھا ہو وہ اس کو مٹادے، لیکن یہ ممانعت عارضی اور وقتی تھی تاکہ قرآن کے ساتھ حدیث کا التباس نہ ہو جائے، پھر جب یہ اندیشہ ختم ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث لکھنے کی اجازت دے دی۔

صحابہ میں کتابت حدیث کا رواج اور اس کے چند واقعات:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں "مامِنْ أصحابِ النبی صلی الله علیه وسلم أحدٌ أكثر حديثاً مِنِّي الا ما كان من عبدِاللهِ بن عمرو بن العاصِ فإنه كان يَكْتُبُ و لاأكْتُبُ [3] "یعنی صحابہؓ کرام میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ احادیث روایت کرنے والا نہیں ہے، بجز حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے، اس لئے کہ وہ لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔

لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ اس حدیث کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی مرویات حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات سے زائد ہونی چاہئیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد پانچ ہزار تین سو چہتر ہے، (۵۳۷۴) [4] اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے صرف

(۱) سیر اعلام النبلاء ۱۳/ ۶۸ و الطبقات الکبری ۱/ ۶۵۔

(۲) مسلم شریف۔

(۳) بخاری شریف ۱/ ۲۱۔

(٤) سیر اعلام النبلاء ۱۲/ ۶۳۲۔

سات سو کے قریب حدیثیں مروی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کے بعد حضرت عبداللہؓ بن عمرو کا زیادہ تر قیام مصر یا طائف میں رہا ہے، اور ان دونوں جگہوں کی طرف علماء کی رحلت علمیہ اتنی نہیں تھی جتنی مدینہ منورہ کی طرف تھی، اور حضرت ابوہریرہؓ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا، وہاں طالبین؛ علم حدیث حاصل کرنے کے لئے کثرت سے جاتے تھے، اس لئے ابوہریرہؓ سے روایت کرنے والوں کی تعداد دنیا میں بہت ہوئی اور ان کی روایات عالم میں خوب نشر ہوئیں۔

حدیث کی کتابوں میں کتابتِ حدیث کے متعدد واقعات ملتے ہیں:

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ فرماتے ہیں کہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو لکھا کرتا تھا، قریش نے مجھے اس سے منع کیا اور کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سی مرتبہ غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ فرط خوشی میں، اس لئے ہر بات لکھنے کے قابل نہیں ہوتی، عبداللہ بن عمرو نے اس کا تذکرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کہ میں آپ کی احادیث کو لکھتا ہوں اور قریش مجھے منع کرتے ہیں، اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اُكْتُبْ فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَايَخْرُجُ مِنْهُ اِلَّاحَقٌّ'' یعنی لکھا کرو، کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس زبان سے ہر حال میں حق ہی نکلتا ہے۔(۱)

(۲) ابو جحیفہ نے حضرت علیؓ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس کوئی خصوصی کتاب ہے؟ اس سوال کا منشاء یہ تھا کہ حضرت علیؓ کے بارے میں بہت سے لوگ یہ کہتے تھے کہ ان کے پاس مخصوص علوم ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ خاص وصیتیں فرمائی ہیں، جیسا کہ روافض کا یہی نظریہ ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا ''لا، إلا كتابُ اللّٰه أو فَهْمٌ أُعطِيَهُ رجلٌ مسلم أومافی هذه الصحيفة (۲)'' یعنی میرے پاس کتاب اللہ ہے اور وہ فہم ہے جو ایک مسلمان کو عطا کی جاتی ہے اور کچھ احکام وہ ہیں جو اس صحیفہ میں ہیں اس کے سوا کچھ نہیں، اور یہ کہہ کر حضرت علیؓ نے اپنی تلوار کی میان سے ایک تحریر نکالی جس میں دیت وقصاص اور قیدیوں سے متعلقہ کچھ احکام اور یہ کہ کسی مسلمان کو کافر کی وجہ سے قتل نہ کیا جائے وغیرہ امور تحریر تھے۔

---

(۱) ابوداود ۲/۵۱۳۔

(۲) بخاری شریف ۱/۲۱۔

(۳) فتح مکہ کے موقعہ پر ایک رجل خزاعی نے ایک رجل لیثی کو قتل کر دیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم محترم کی حرمت وتعظیم کے بارے میں رقت آمیز خطبہ دیا، سامعین پر اس کا بہت اثر ہوا، یمن کے ایک شخص ابوشاہ حاضر ہوئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھے لکھ دیجئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اکتبوہ لأبی شاہ'' یہ خطبہ ان کو لکھ کر دیا جائے۔[1]

(۴) عبداللہ بن عکیم الجہنی مدینہ سے باہر رہا کرتے تھے، فرماتے ہیں ''أتانا كتاب نبي الله صلى الله عليه وسلم قبل موته بشهر ان لاتنتفعوا بميتة باهاب ولا بعصب[2]'' یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط آپ کی وفات سے ایک ماہ پہلے اس بارے میں ہم تک پہنچا کہ تم لوگ مردار کی کچی کھال اور پٹھے سے انتفاع مت حاصل کرو۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے صحابہ کو مختلف مقامات پر عامل وگورنر بنا کر بھیجا تھا، اور ان کو بہت سے تفصیلی احکام زکوۃ وفرائض وغیرہ کے لکھ کر دیئے تھے، جیسے عمرو بن حزم الانصاری، اور دیگر عمالِ صحابہ کو بھی خطوط لکھ کر دیئے ہیں، ان خطوط کو محفوظ رکھا گیا، ان میں سے بہت سے خطوط محدثین نے کتبِ حدیث میں نقل فرمائے ہیں۔

اس تفصیل سے منکرینِ حدیث کے دوسرے سوال کا جواب واضح ہوگیا کہ احادیث بھی قرآن کریم کی طرح دورِ نبوی میں قید کتابت میں آ چکی تھیں۔

احادیث کے ظنی ہونے کا مفہوم:

(۳) سوالِ ثالث کا جواب یہ ہے کہ تمام احادیث کو ظنی کہنا درست نہیں ہے، بلکہ احادیث تین قسم کی ہیں: احادیث متواترہ، احادیث مشہورہ اور اخبار آحاد، متواترہ سے علم یقینی بدیہی کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اور مشہورہ سے علم یقینی نظری کا فائدہ ہوتا ہے اور اخبار احاد سے ظن کا فائدہ ہوتا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ظن دو معنی میں استعمال ہوتا ہے:

(۱) تخمینہ اور اٹکل سے کہی ہوئی بات، بے دلیل وبے تحقیق بات، یہ معنی یہاں مراد نہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلاَّ الظَّنَّ، اِنَّ الظَّنَّ لايُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئاً'' (النجم:۲۸)

(۱) بخاری شریف ۱/ ۲۲.

(۲) ترمذی ج۱/ ۳۰۳.

(۲)غالب گمان، اخبار آحاد کے ظنی ہونے سے یہی معنیٰ مراد ہیں، اورغالب گمان سے جوبات کہی جائے وہ شرعاً وعقلاً ہردولحاظ سے حجت ومعتبر ہے، چنانچہ تحویلِ قبلہ کی آیت نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصداس کی خبر لے کراہلِ قبا کے پاس پہنچا،تو انہوں نے شخص واحد کی خبر پرنماز میں ہی اپنارخ بدل دیا،اسی طرح صحابہؓ کی ایک جماعت کوایک شخص نے شراب کے حرام ہونے کی خبردی تو حضرات صحابہؓ نے شراب کے برتن تک توڑدیئے، حضرت امام شافعیؒ نے اس نوع کے متعدد واقعات نقل کرکے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبرواحد کی حجیت ثابت ہے، اوردنیاوی اموروامعاملات میں بھی اگرکوئی معتبرشخص کسی کے پاس پیغام پہنچائے تواس کا اعتبارکرکے معاملات کوانجام دیاجاتاہے، حقیقت یہ ہے کہ اگرخبرواحد کا اعتبارنہ کیا جائے تو دین ودنیا دونوں کا نظام معطل ہوجائے۔(۱)

حدیث وتاریخ کا فرق:

(۴)سوال رابع کا جواب یہ ہے کہ حدیث وتاریخ میں بڑافرق ہے، تاریخی روایت میں سند کا اہتمام نہیں ہوتا، برخلاف حدیث کے کہ ہرحدیث کی سند کتب حدیث میں موجود ہے ،پھرحدیث کوقبول کرنے کے لئے حضرات محدثین نے بڑے منضبط قواعد وضع فرمائے ہیں، سند کے تمام راویوں کی دیانت وصداقت کاجائزہ لیاجاتاہے، اس کا حافظہ کس معیارکاہے؟ یہ جانچاجاتاہے، سندمتصل ہے یانہیں؟ اورراویوں کی کڑیاں باہم مربوط ہیں یانہیں؟ روایت کے سند یامتن میں شذوذ یاعلت تونہیں ہے؟ غرضیکہ احادیث کی جانچ پڑتال کے لئے حضرات محدثین کاوضع کردہ ایسا نظام ہے کہ دنیا بھرکی تاریخ ایسا نظام پیش کرنے سے قاصرہے، تاریخی روایات کے لئے یہ نظام نہیں ہےاس لئے حدیث کوتاریخ پرقیاس کرنا سراسر مغالطہ ہے۔

(٤) تعلق علم الفقة بعلم الحديث

اہل حدیث (منکرین فقہ) کارد:

یعنی فقہ کا حدیث سے تعلق، اس سے پہلی بحث میں ایک فرقہ کا ردتھا جواپنے آپکواہلِ قرآن کہتے ہیں، اس مبحث میں بھی ایک فرقہ کارد ہے جواپنے آپ کواہلِ حدیث کہتے ہیں، یہ لوگ ظاہرحدیث پرعمل

(۱)الرسالة للشافعي: باب الحجة في تثبيت الخبر الواحد،ت:أحمدشاكر ط:مكتبه الحلبي.

کرنے کو ضروری قرار دیتے ہیں اور حدیث کے اصل مغز یعنی فقہ ودرایت کا انکار کرتے ہیں، اس قسم کے لوگ بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں، آج کے زمانہ کے غیر مقلدین نے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ فقہ کا قرآن وحدیث سے تعلق نہیں ہے، فقہ الگ چیز ہے، مگر یہ مغالطہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ حدیث وفقہ کا باہم گہرا ربط ہے، فقہ؛ حدیث کا مغز ہے اور حدیث کا ثمرہ وخلاصہ ہے، احادیث کا اصل مقصود فقہ ہی ہے، حدیث گزر چکی ہے "نَضَّرَ الله امرأً......الحديث" اس روایت میں حاملینِ حدیث کو فقاہت کی وجہ سے ہی دعا دی گئی ہے، علماء نے حدیث وفقہ کے باہمی گہرے ارتباط کو مختلف مثالوں سے سمجھایا ہے، بعض علماء نے فرمایا: "الحديثُ بغيرِ الفقهِ كَشَجَرٍ بلاثَمرٍ" کہ حدیث بغیر فقہ کے اس طرح ہے جیسے درخت بغیر پھل کے، علامہ خطابی نے معالم السنن میں حدیث وفقہ کی مثال بنیاد اور عمارت کے ساتھ دی ہے کہ حدیث بمنزلۂ بنیاد اور فقہ بمنزلہ عمارت کے ہے، جو عمارت مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو وہ بے بھروسہ اور کمزور ہوتی ہے، اور جس بنیاد پر عمارت تعمیر نہ کی جائے وہ ویران اور اجاڑ ہوتی ہے۔(۱)

حضرت اقدس شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں حدیث وفقہ کی مثال چھلکے ومغز اور سیپ وموتی سے دی ہے، پھل کے اوپر چھلکا اور اندر مغز یعنی گودا ہوتا ہے، حدیث شریف چھلکا اور فقہ اسکے مغز (گودے) کی طرح ہے، اسی طرح حدیث شریف سیپ اور فقہ اندر کے موتی کی طرح ہے۔(۲)

اصل میں تفقہ کے ذریعہ فقہاء نے متعارض احادیث میں تطبیق دی ہے، مثلاً ایک شخص نے سوال کیا روزہ کی حالت میں بیوی کو بوسہ دینا جائز ہے یا نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، ایک اور شخص نے اسی طرح کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی، اس کی تطبیق فقہاء نے بیان فرمائی کہ جس کو ممانعت فرمائی وہ جوان تھا اور جس کو اجازت دی وہ بوڑھا تھا۔

اس سے فقہ کی اہمیت اور معنویت ظاہر ہے، واقعہ یہ ہے کہ اگر فقہ وتفقہ نہ ہو تو انسان احادیث کے گھنے اور گہرے جنگل میں گم ہو کر رہ جائے جیسا کہ عبداللہ بن وہب سے مروی ہے کہ میں نے احادیث بہت جمع کر لی تھیں جس کی وجہ سے میں حیران وپریشان ہو گیا تھا، پھر میں نے ان کو مالک ولیث کے سامنے پیش

(۱) معالم السنن للخطابی شرح أبی داؤد ۱/۴، مطبوعه بيروت.

(۲) حجة الله البالغه ۱/۴، مطبوعه بيروت.

کرنا شروع کیا تو وہ دونوں میری رہنمائی فرماتے کہ یہ حدیث لو، یہ چھوڑ دو یہ ناسخ ہے، یہ منسوخ ہے۔[1]

(۵)مقام الإمام أبي حنيفةؒ في الحديث

(یعنی علم حدیث میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کی جلالتِ شان)

یہ ایک مسلم اور نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ بڑے بڑے علماء حدیث نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مقام بلند کا بھرپور اعتراف کیا ہے، اس کے لئے مناقبِ ابی حنیفہ پر جو کتب تصنیف کی گئی ہیں ان کی مراجعت کی جاسکتی ہے، یہاں اس بارے میں صرف چند حضرات کے اقوال و آراء پیش کی جاتی ہیں:

امام اعظم کے بارے میں اکابر محدثین کی آراء:

مکی بن ابراہیم امام بخاری کے جلیل القدر استاذ ہیں، جن سے امام بخاری کی اکثر ثلاثیات مروی ہیں، یہ امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں، تہذیب الکمال میں حافظ یوسف جمال الدین المزی نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''**كان أعلم أهل زمانه**[2]'' یعنی امام صاحبؒ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے، اس زمانہ میں مطلق علم کا اطلاق علم حدیث پر ہی ہوتا تھا، اس لئے مطلب یہ ہوا کہ امام صاحب اپنے زمانہ میں علم حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔

مشہور محدث یزید بن ہارون فرماتے ہیں کہ: ''**أدركتُ ألفاً من الشيوخ وكَتَبْتُ منهم فما وجدتُ أفقَهَ ولاأورَعَ ولاأعلَمَ من خمسةٍ، أولهم أبو حنيفة**[3]'' یعنی میں ایک ہزار شیوخ سے ملا اوران سے میں نے احادیث لکھیں، لیکن پانچ شیوخ سے زیادہ کسی کو علم وورع والا نہیں پایا، اوران پانچ میں سب سے پہلے امام ابوحنیفہؒ ہیں۔

حافظ ذہبیؒ نے امام ابوداؤد سے نقل کیا ہے: ''**إن أباحنيفة كان إماما**[4]'' کہ ابوحنیفہ امام تھے۔

---

(۱)اثر الحديث الشريف في اختلاف الأئمة الفقهاء ص۸۲،ازشیخ محمد عوامه.

(۲) تهذيب الكمال.(۱۰/۳۱۶برقم ۷۳-۷)ط: دار الكتب العلمية بيروت .

(۳)الجواهر المضيئه فی طبقات الحنفيه(۱/۲۹)ط: میر محمد کتب خانہ کراچی۔

(٤)تذكرة الحفاظ (۱/۱۲۷ برقم:۱٦۳،ط: دار الكتب العلميه بيروت)

امام ابوحنیفہؒ کے شیوخ وتلامذہ اور امام صاحب کے بارے میں ان کے تأثرات:

امام ابوحنیفہ کے تبحر فی علم الحدیث کا اندازہ ان کے شیوخ وتلامذہ پر نظر ڈالنے سے ہوسکتا ہے، حافظ ابوالحجاج مزی نے تہذیب الکمال میں امام ابوحنیفہؒ کے ۷۴ شیوخ شمار کیے،[۱] حافظ سیوطیؒ نے تبییض الصحیفۃ میں ۷۶؍شیوخ کا تذکرہ کیا ہے،[۲] ملاعلی قاری نے امام ابوحنیفہ کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے،[۳] پھر وہ شیوخ بھی بعد کے محدثین میں سے کسی کو حاصل نہ ہوسکے، کیونکہ امام صاحب کے شیوخ میں یا تو صحابہ ہیں یا پھر تابعین اور تبع تابعین اس سے نیچے کے رتبہ کا کوئی شیخ نہیں ہے، امام صاحب نے حضرت عامر بن شراحیل الشعبی سے علم حدیث حاصل کیا، حافظ ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:[۴] ''ھو أکبر شیخ لأبی حنیفۃ''، امام شعبی وہ ہیں جنہوں نے پانچ سو صحابہ سے علم حدیث حاصل کیا، ایک مرتبہ امام شعبی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان فرمارہے تھے اتنے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ پاس سے گذرے تو شعبی کی باتیں سن کر انہوں نے فرمایا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا ہوں لیکن شعبی کو غزوات کا مجھ سے زیادہ علم ہے۔[۵]

امام اعظم کے اساتذہ میں ابراہیم بن محمد المنتشر، قاسم بن عبدالرحمٰن (حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پوتے)، قتادہ، نافع، طاؤس بن کیسان، عکرمہ، عطاء ابن ابی رباح، عمرو بن دینار، عبداللہ بن دینار اور امام شیبان النحوی رحمہم اللہ تعالیٰ جیسے جلیل القدر تابعین اور اساطین امت داخل ہیں۔[۶]

آپ کے شاگردوں میں بھی بڑے بڑے ائمہ حدیث نظر آتے ہیں، آپ کے خصوصی شاگردوں میں عبداللہ ابن مبارک ہیں، جن کا قول ہے: ''لولا أن اللّٰہَ أعانَنی بأبي حنیفةَ وسفیانَ لکنتُ کسائرِ الناسِ[۷]'' یعنی اگر اللہ تعالیٰ ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوری کے ذریعہ میری اعانت نہ کرتا تو میں بھی عام لوگوں کی

---

(۱) تهذيب الكمال (۱۰/ ۲۰۹ – ۳۱۰ برقم ۷۰۷۳)
(۲) تبييض الصحيفة فی مناقب أبي حنيفة (من ص ۲۱ إلى ص ٤٦)
(۳) شرح مسند أبی حنيفة، لملا علی القاری (ص۸)
(٤) تذكرة الحفاظ (۱/ ٦٣ برقم ٧٦) فی ترجمة الشعبي عامر بن شراحيل.
(٥) المصدر السابق ۱/ ٦٤.
(٦) تهذيب الكمال ۱۰/ ۳۰۹ – ۳۹۰ وسير أعلام النبلاء ٦/ ۳۹۲.
(٧) تهذيب التهذيب (٨/ ٥١٧) (٧٤٣٣).

طرح ہوتا، جرح وتعدیل کے مشہور امام یحی بن سعید القطانؒ بھی امام صاحب کے شاگرد ہیں، حافظ ذہبی نے لکھاہے کہ وہ امام صاحب کے قول پر ہی فتویٰ دیا کرتے تھے، حافظ ابن حجر نے یحی بن سعید القطان کا قول نقل کیا ہے: ''قد أخذنا بأكثر أقواله [۱]''یعنی ہم نے امام ابوحنیفہؒ کی اکثر آراء واقوال کواختیار کیا الجواہرالمضیئہ [۲] میں یحی ابن معین کے حوالہ سے یحی ابن سعید القطان کا یہ قول نقل کیا ہے: ''جَالَسْنا واللهِ أباحنيفةَ وسَمِعْنَا منه وكنتُ واللهِ اذا نَظَرْتُ إليه عَرَفْتُ في وجهِهِ أنه يتقَّى اللهَ عزوجل [۳]'' یعنی ہم امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں بیٹھے اوران سے احادیث سنیں،اور میں بخدا جب بھی ان کو دیکھتا تو چہرے سے پہچان لیتا کہ ان میں اللہ عزوجل کا خوف ہے۔

نیز امام شافعیؒ کے استاذ خاص حضرت وکیع بن جراحؒ بھی امام صاحب کے شاگرد ہیں اور امام صاحب سے انہوں نے نوسو(۹۰۰) احادیث روایت کی ہیں، ابن عبدالبر نے ''الانتقاء''[۴] میں یحی بن معین سے نقل کیا ہے کہ وہ بھی امام صاحب کے قول پرفتویٰ دیا کرتے تھے، ان کے علاوہ مشہورمحدثین میں سے حفص بن غیاث النخعی ، یحی ابن زکریا، مسعر بن کدام، ابوعاصم النبیل ، قاسم بن معن، علی بن مسہر، عبدالرزاق بن ہمّام جیسے جلیل القدر محدثین نے امام صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، جس محدث کے شیوخ وتلامذہ میں

اس مرتبہ کے حضرات موجود ہوں اس کے بارے میں یہ کہنا کہ علم حدیث میں اس کا پایہ بلند نہ تھا کتنا بڑاظلم ہے!

''کتاب الآثار'' حدیث کی اولین کتاب:

امام ابوحنیفہؒ کے مآثر علمیہ میں ان کی ''کتاب الآثار'' علم حدیث میں ان کے عظیم المرتبت ہونے کی شاہد ہے، یہ کتاب فقہی ابواب پرحدیث کی سب سے پہلی مرتب کتاب ہے، امام سیوطی نے تبییض الصحیفۃ [۵] میں فرمایا ہے کہ علم حدیث میں امام ابوحنیفہؒ کی یہ فضیلت کچھ کم نہیں کہ انہوں نے ابواب فقہیہ کی

(۱)سير اعلام النبلاء ٦/٣٩٨،تهذيب الكمال ٣١٤١٠ وتهذيب التهذيب ٨/٥١٧ ط: دار الفكر بيروت.

(۲)الجواهر المضيئة فى طبقات الحنفية (٢/٢١٢في ترجمة يحى القطان)

(۳)تاريخ بغداد ١٣/٣٥١: درالكتب العلمية بيروت.

(٤)الانتقاء فى فضائل الأئمة الثلاثة الفقهاء (ص ٢١١)

(٥)تبييض الصحيفة (ص ١١٦)

ترتیب پر سب سے پہلے حدیث کی کتاب تالیف فرمائی، یہ فضیلت کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکی، امام اعظم کی یہ کتاب مؤطا مالک کے لیے مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ حافظ ذہبی نے باقاعدہ سند کے ساتھ مشہور محدث عبدالعزیز دراوردی کا قول نقل کیا ہے، ''**كان مالك يَنظُرُ في كتبِ أبي حنيفة ويَنتفعُ بها** ''یعنی امام مالک امام ابوحنیفہؒ کی کتابیں دیکھتے اور ان سے مستفید ہوتے تھے۔

حدیث کی دوسری کتب کی طرح ''کتاب الآثار'' کے بھی بہت سے راوی ہیں جن میں سے چار مشہور ہیں، (۱)امام ابویوسف (۲)امام محمد (۳)امام زفر (۴)امام حسن بن زیاد ، علامہ موفق مکی نے ''مناقب الامام الاعظم'' میں ابوبکر بن محمد کا قول نقل کیا ہے: ''**اِنتَخَبَ أبوحنيفة من أربعين ألفِ حديثٍ**''(۱) یعنی امام صاحبؒ نے چالیس ہزار احادیث میں سے منتخب کرکے کتاب الآثار لکھی، علامہ موفق ہی نے حافظ ابویحی زکریا بن یحی نیشاپوری کی مناقب ابوحنیفہ کے حوالہ سے ان کی سند کے ساتھ یحی بن نصر سے نقل کیا ہے: ''**سَمِعتُ أباحنيفةَ يقولُ: عندي صناديقُ من الحديثِ ماأخرجتُ منها الاالشئَ اليسيرُ الذي يُنتَفَع به** '' کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ: میرے پاس حدیث کے صندوق کے صندوق ہیں، میں نے ان میں سے صرف اتنی احادیث بیان کی ہیں جن سے لوگ مستفید ہوسکیں۔ (۲)

مسانیدِ امام اعظمؒ:

''کتاب الآثار'' امام صاحب کی واحد تصنیف ہے، اس کے علاوہ بڑے بڑے محدثین نے امام ابوحنیفہ کی روایات کو جمع کرکے مسند ابی حنیفہ کے نام سے مرتب کیا ہے، مسند لکھنے والوں میں حافظ ابن عساکر، حافظ ابوالعباس الدوری، حافظ ابن مندہ حتی کہ حافظ ابن عدی بھی شامل ہیں، جوشروع میں امام صاحب کے بڑے مخالف تھے، بعد میں جب امام طحاوی کے شاگرد بنے تو امام صاحب کی جلالتِ قدر کا اندازہ ہوا، اس وقت اپنے سابقہ نظریہ کی تلافی کے طور پر ''مسند ابی حنیفہ'' مرتب فرمائی۔

اس طرح مسندِ ابی حنیفہ کے نام سے سترہ یا اس سے زائد کتابیں لکھی گئیں جن کو بعد میں علامہ ابن خسرو نے ''**جامع مسانيد الإمام الأعظم**'' کے نام سے جمع فرمادیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب پر قلیل الحدیث ہونے کا الزام سفید جھوٹ ہے جس کی تعصب یا ناواقفیت کے سوا کوئی اور تاویل نہیں ہوسکتی۔

(۱)مناقب ابی حنیفه للموفق بن احمدالمکی(۱/۱۵۱)

(۲)مناقب أبي حنيفة للموفق ۱/۱۵۱.

امام اعظم سے صحاح ستہ میں کوئی روایت کیوں مروی نہیں؟

امام صاحب پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی روایات صحاحِ ستہ میں موجود نہیں ہیں، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ ستہ کے نزدیک وہ قابلِ استدلال نہ تھے، لیکن یہ اعتراض بہت سطحی اور عامیانہ ہے، ائمہ ستہ کا کسی جلیل القدر امام سے اپنی کتاب میں روایت کو درج نہ کرنا اس کی تضعیف کو مستلزم نہیں، کیونکہ کھلی ہوئی بات ہے کہ امام بخاری نے امام شافعی کی بھی کوئی روایت نہیں لی ہے، بلکہ امام احمد بن حنبل جو امام بخاری کے استاذ ہیں اور جن کی صحبت انہوں نے بہت اٹھائی ہے ان کی بھی صحیح بخاری میں صرف دو روایتیں ہیں، ایک تعلیقاً منقول ہے اور دوسری کسی کے واسطے سے روایت کی ہے، اسی طرح امام مسلم نے اپنی صحیح میں امام بخاری سے کوئی روایت نقل نہیں کی حالانکہ وہ انکے استاذ ہیں، نیز امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں امام مالک کی صرف تین روایات ذکر کی ہیں حالانکہ امام مالک کی سند اصح الاسانید شمار کی جاتی ہے، کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ امام شافعی، امام مالک، امام احمد تینوں ضعیف ہیں۔

اس معاملہ میں حقیقت وہ ہے جو علامہ زاہد الکوثری[1] نے بیان کی ہے کہ درحقیقت ائمہ حدیث کے پیش نظر یہ بات تھی کہ وہ ان احادیث کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کریں جن کے ضائع ہونے کا خطرہ تھا، جبکہ ائمہ اربعہ کے تلامذہ اور مقلدین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ان کی روایات کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے اس کی حفاظت کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی، اور ان سے احادیث روایت نہیں کیں۔

امام ابوحنیفہؒ پر قلیل الروایۃ ہونے کا الزام:

کچھ متعصب لوگوں نے الزام لگایا کہ امام ابوحنیفہؒ حدیث میں کمزور وکم مایہ تھے، وہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، بعض نے کہا کہ امام صاحب کو کل پچاس حدیثیں یاد تھیں، بعض نے کہا کہ آپ کو صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں، یہ اعتراضات کئے گئے ہیں، علمائے احناف نے مدلل طریقہ پر ان سب کا جواب دیا ہے اور ان اقوال پر جرح فرمائی ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے کہ امام صاحب مجتہد تھے اور مجتہد کی شرائط

(١) شروط الائمة الخمسة فی ثلث رسائل ص ١٦ حاشیه.

میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس کو احکام کی تمام روایات معلوم اور یاد ہوں اور اس کو علم حدیث میں پوری بصیرت حاصل ہو، امام صاحب مجتہد تھے اور آپ نے بذریعۂ اجتہاد تراسی (۸۳) ہزار مسائل بیان فرمائے، اگر آپ کو صرف سترہ یا پچاس حدیثیں یاد تھیں تو اتنے مسائل کہاں سے بیان فرمائے؟

مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک فصل قائم کی گئی ہے جس کا عنوان یہ ہے: ''یہ فصل امام ابوحنیفہؒ کے ان مسائل کے بیان میں ہے جو حدیث کے خلاف ہیں'' انھوں نے ایسے مسائل کی تعداد ایک سو پچیس شمار کرائی ہے۔(۱)

اگر چہ علماء نے ان کے جوابات بھی دیئے ہیں اور احادیث سے ان کو مدلل کیا ہے، مگر پھر بھی تراسی ہزار میں سے ۱۲۵ کے علاوہ تمام حدیث کے موافق ہیں، تو سوال یہ ہے کہ یہ سب مسائل حدیث کے مطابق کیسے ہوگئے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب الزام ہے اور حاسدین کی کرم فرمائی ہے۔

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی اور ایک غیر مقلد کا ایک دلچسپ واقعہ:

ہمارے مفتی صاحب (حضرت مفتی محمود صاحبؒ) نے سنایا تھا کہ ایک غیر مقلد آیا اور کہا کہ امام صاحب ضعیف تھے، حضرت نے فرمایا کہ: تم نے امام صاحب سے کشتی کی تھی جس سے پتہ چلا ہو کہ وہ ضعیف تھے؟ اور وہ کیا، ہر انسان ضعیف ہے! خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''خُلِقَ الانسَانُ ضَعِيفا(۲)'' اس نے کہا کہ نہیں یہ مطلب نہیں، بلکہ وہ حدیث میں ضعیف تھے، حضرت نے فرمایا کہ کس نے کہا؟ اس نے کہا کہ حافظ ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' میں لکھا ہے، حضرت نے فرمایا کہ حافظ ذہبی نے تو نہیں لکھا، اس نے کہا کہ انہوں نے لکھا ہے، حضرت نے فرمایا کہ حافظ ذہبی نے نہیں لکھا، بلکہ وہ کسی غیر مقلد کا تصرف ہے، جس کی صورت یہ ہوئی کہ کسی غیر مقلد نے ''میزان الاعتدال'' کے حاشیہ میں امام صاحب کی تضعیف کا جملہ لکھا، پھر جب وہ کتاب عرب میں چھپی تو بعض نے حاشیہ کی عبارت کو متن کی عبارت سمجھ کر کتاب میں شامل کر دیا، اس نے کہا کہ اس کے برعکس بھی تو ہوسکتا ہے، حضرت نے فرمایا کہ برعکس نہیں ہوسکتا کہ وہ جملہ متن میں ہو اور کسی نے وہاں سے نکال کر حاشیہ پر لکھ دیا ہو، کیونکہ ایسا کون کرے گا؟ حنفی یا غیر مقلد؟ غیر مقلد ایسا نہیں کرسکتا کہ امام صاحب کی تضعیف سے متعلق متن میں کوئی جملہ ہو اس کو متن سے نکال کر حاشیہ میں لائے اور

(۱)مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۵۳، کتاب الرد علی ابی حنیفۃؒ.

(۲)النساء:۲۸.

اپنی بات کو کمزور کرے، رہا حنفی سوا گر اس کا بس چلے گا تو اس جملہ کو نہ متن میں چھوڑے گا نہ حاشیہ میں۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ حافظ ذہبی نے ایسا نہیں لکھا، اس کی میرے پاس تین دلیلیں ہیں: (۱) حافظ ذہبی نے میزان کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں اس کتاب میں ائمہ متبوعین جیسے ائمہ اربعہ، ان کا تذکرہ نہیں کروں گا کیوں کہ ائمہ اربعہ کی ثقاہت مسلم ہے،[1] (۲) دوسری دلیل یہ ہے کہ میزان الاعتدال کی شرح ہے ''لسان المیزان'' جو حافظ ابن حجر نے لکھی ہے اس میں یہ عبارت موجود نہیں ہے، (۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ حافظ ذہبی نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں امام صاحب کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے[2] اور محدثین کی اصطلاح کے اعتبار سے حافظ اس کو کہا جاتا ہے جس کو ایک لاکھ حدیثیں سنداً ومتناً یاد ہوں، پس یہ کس طرح ممکن ہے کہ حافظ ذہبی اپنی ایک کتاب میں امام صاحب کو حافظ الحدیث لکھیں اور دوسری کتاب میں ان کو ضعیف کہیں، یہ ویسے ہی امام صاحب کے بارے میں افواہیں ہیں۔

ائمہ دین پر جرح معتبر نہیں:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے ''مقدمۂ اوجز'' میں فرمایا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ پر جرح کی گئی ہے، لیکن مطلق جرح معتبر نہیں، علماء جرح وتعدیل نے جرح کے کچھ قاعدے مقرر فرمائے ہیں، ان کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، ورنہ بڑے سے بڑے محدث کی عدالت وثقاہت ثابت نہ ہو سکے گی، کیونکہ تمام بڑے ائمہ پر کسی نہ کسی کی جرح ضرور موجود ہے، چنانچہ حضرت امام شافعیؒ پر یحی بن معین نے، امام مالک پر ابن ابی ذئب نے، امام احمد بن حنبل پر امام کرابیسی نے، امام بخاری پر امام ذہلی نے، امام اوزاعی پر امام احمد بن حنبل نے جرح کی ہے، ابن حزم نے امام ترمذی اور ابن ماجہ کو مجہول کہا ہے، امام نسائی پر بہت سے علماء نے تشیع کا الزام عائد کیا ہے اور انھیں مجروح قرار دیا ہے، یہ منکرین حدیث کا فرقہ اسی وجہ سے پیدا ہوا، انھوں نے جب یہ دیکھا کہ ہر امام پر کسی نہ کسی نے جرح کی ہے تو ان کی روایات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور سرے سے حدیث کے ہی منکر ہو گئے۔

علماء جرح وتعدیل کا مقررہ اصول ہے کہ جس شخص کی امامت وعدالت حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہو اس کے

(۱) میزان الاعتدال ۱/ ۱۱۳ ط: دار الکتب العلمیہ، —الطبعیۃ الثانیۃ.

(۲) تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۱۲۷ (۱۶۳)

بارے میں ایک دوافراد کی جرح معتبر نہیں ہوگی،(۱) امام ابوحنیفہؒ کی عدالت وامامت بھی حدتواتر کو پہنچی ہوئی ہے، بڑے بڑے ائمہ حدیث نے آپ کے علم وتقوی کو خراج تحسین پیش کیا ہے، اس لئے امام صاحب پر چند افرادِ آحاد کی جرح کا کچھ اعتبار نہیں۔

امام صاحب کے تلامذہ کی خدمات حدیث:

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے، علماء نے لکھا ہے کہ بخاری شریف میں بائیس ثلاثیات ہیں (یعنی وہ حدیث جس میں مصنفِ کتاب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک صرف تین راوی ہوں) اوران بائیس کے اکثر راوی حنفی ہیں،(۲)

امام مالک نے ''موطا'' لکھی، اس میں انہوں نے تین چیزیں ذکر کیں ہیں: احادیث مرفوعہ، آثارِ صحابہ اورعملِ اہلِ مدینہ، نیز اس میں بہت سی احادیث امام صاحب کے مسلک کے بھی خلاف ہیں، امام محمد نے بھی'' مؤطا'' لکھی اوراس میں انہوں نے امام صاحب کے مسلک کے مطابق احادیثِ مرفوعہ کودرج کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ'' مؤطامالک'' کی جواحادیث امام صاحب کے مسلک کے خلاف تھیں ان کا جواب بھی دیا ہے، اس طرح سے''موطا مالک'' میں کوئی حدیث مرفوع ایسی نہیں ہے جس کا جواب ''موطامحمد'' میں نہ ہو، امام محمد نے ''کتاب الآثار'' روایت کی، جس میں انہوں نے امام مالک کے مقابلہ میں آثارِ صحابہ ذکر کئے ہیں، اور امام محمد نے ''کتاب الحجۃ'' بھی تصنیف کی جس میں امام صاحب کے مسلک کے مطابق اہل مدینہ کا تعامل درج کیا ہے، اس طرح امام محمد نے امام مالک کے نقش قدم پر چلتے ہوئے حدیث کی خدمت انجام دی اورامام ابوحنیفہ کے مسلک کومدلل ومبرہن فرمایا۔

نیز پہلے گزر چکا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اپنی ''کتاب الآثار'' کو چالیس ہزارحدیثوں سے منتخب کر کے لکھا ہے، لہٰذا امام صاحب پرحدیث میں کم مائیگی کا اعتراض ناواقفیت کی وجہ سے یاحسد وتعصب کی وجہ سے ہے، البتہ یہ صحیح ہے کہ امام صاحب سے روایات کم منقول ہیں جس کی کئی وجہیں ہیں:

(۱) تاج السبکیؒ نے فرمایا: ''الصواب عندنا أن من ثبتت إمامته وعدالته وكثر مادحوه ومزكوه، وندر جارحوه، وكانت هناك قرينة دالة على سبب جرحه، من تعصب مذهبي أوغيره فإنا لانلتفت إلى الجرح فيه ونعمل فيه بالعدالة'' (قاعدة فى الجرح والتعديل للسبكى ص۱۹)

(۲) مقدمة اللامع ص۲۹.

امام اعظم کے قلیل الروایۃ ہونے کی وجوہ:

(۱) آپ کا اکثر وقت استنباط واجتہاد میں مشغول رہتا تھا، کیونکہ اس زمانہ میں اس کی بہت زیادہ ضرورت تھی، لہٰذا بیانِ احادیث کا موقعہ آپ کو کم ملتا تھا۔

(۲) امام صاحب کے نزدیک روایت حدیث کے لئے شرائط بہت سخت تھیں، ابن الصلاح نے اپنے مقدمہ میں بیان فرمایا: کہ بعض سلف کے یہاں بیان حدیث میں بہت تشدد تھا ان میں سے امام ابوحنیفہ اورامام مالک بھی ہیں، ان حضرات کا مذہب یہ ہے کہ محدث کے لئے ایسی ہی روایت بیان کرنا جائز ہے جواس کو حفظ یاد ہو، اگراحادیث اس کی کاپی وغیرہ میں درج ہیں تو ان کو دیکھ کربیان کرنا جائز نہیں، بخلاف جمہور کے کہ ان کے یہاں توسع تھا، بعض سلف کے یہاں یہ تشدید برسبیلِ احتیاط تھی کہ مبادا ''مَنْ قَالَ عَلَيَّ مَالَمْ أقلْه'' کی وعید میں داخل ہوجائیں، لہٰذا حدیث کو جاننا الگ ہے اورروایت کرنا الگ چیز ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے حضرت ابوبکرؓ اورحضرت ابوہریرہؓ، حضرت ابوبکرؓ سے روایات بہت کم منقول ہیں حالانکہ آپ سب سے زیادہ احادیث کو جاننے والے تھے، انہوں نے ہی سب سے زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی، لیکن ان کے اوقات امورسلطنت میں مشغول رہتے تھے، اس لئے بیانِ حدیث کا موقع کم ملتا تھا، برخلاف ابوہریرہؓ کے کہ اگرچہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بہت کم رہے، چنانچہ وہ فتحِ خیبر کے بعد ۷ھ میں مسلمان ہوئے اورصرف چارسال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے لیکن سب سے زیادہ انہی سے احادیث منقول ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو تعلیم وتعلم کے لئے وقف کردیا تھا۔

امام اعظمؒ پر قیاس کو نص پر مقدم کرنے کا اعتراض:

امام ابوحنیفہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ قیاس کو نصوص پر مقدم کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے، امام صاحب تو بعض اوقات ضعیف حدیث کی وجہ سے بھی قیاس کو چھوڑ دیتے ہیں جیسا کہ آگے آئے گا، شیخ عبدالوہاب شعرانی نے جوخود شافعی المسلک ہیں اس سلسلہ میں اپنی کتاب ''المیزان الکبریٰ'' میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے ''فصلٌ فی بیان ضعفِ قولِ من نَسَبَ الإمامَ أباحنیفةَ إلی أنه یُقَدِّمُ القیاسَ علی حدیثِ رسولِ الله صلی الله علیه و سلم'' اس

فصل میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس قسم کا کلام ان لوگوں سے صادر ہوا ہے جو امام ابوحنیفہ سے تعصب رکھتے ہیں، وہ لوگ اپنے دین میں کمزور ہیں، کلام میں غیر محتاط ہیں، اور عنداللہ جواب دہی سے غافل ہیں، حالانکہ قرآن کریم میں واضح فرمادیا گیا ہے ''اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولاالآیہ [۱]'' پھرانہوں نے فرمایا کہ امام ابوجعفر الشیزاماری نے سند متصل کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل فرمایا: ''كَذَبَ واللهِ وافترىٰ علينا من يقولُ عنّا إننا نُقَدّم القياسَ على النصِ، وهل يحتاجُ بعدالنصِّ إلى القِياسِ، وكان رضي الله عنه يقول إننا نَنظُر أولاً في دليل تلكَ المسئلةِ من الكتابِ والسنةِ وأَقْضِيةِ الصحابةِ، فان لم نَجِدْ دليلاً قِسْنا حينئذ......الخ [۲]'' یعنی ہمارے اوپر جھوٹ کہا اور بہتان باندھا اس شخص نے جو ہمارے متعلق یہ کہے کہ ہم قیاس کو نص پر مقدم کرتے ہیں، نص کے بعد قیاس کی ضرورت کہاں رہ جاتی ہے، ہم درپیش مسئلہ کے لئے اولا کتاب، سنت، اور صحابہؓ کے فیصلوں کو اوران کے اقوال کو دیکھتے ہیں اگر ان سب میں مسئلہ مصرح نہ ہو اس وقت مجبوری میں قیاس کرتے ہیں الخ۔

حضرت شیخ زکریاؒ نے مقدمۂ اوجز میں لکھا ہے کہ حضرت امام صاحبؒ سے متعدد طرق سے ان کے متعدد شاگردوں نے جن میں عبداللہ ابن مبارک بھی ہیں نقل فرمایا کہ: امام صاحب اولاً کتاب اللہ پر نظر فرماتے ہیں، کتاب اللہ میں مسئلہ نہ ملے تو حدیث کو دیکھتے ہیں، حدیث میں بھی نہ ملے تو اقوال صحابہ سے دلیل تلاش کرتے ہیں، اقوال صحابہؓ اگر مختلف ہوں تو ان میں سے جو قول کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کو اختیار فرماتے ہیں، اگر قولِ صحابی بھی نہ ملے تو پھر تابعین کے اقوال کو اختیار نہیں فرماتے بلکہ اس وقت اجتہاد فرماتے ہیں۔

ابن حجرؒ مکی شافعی نے فرمایا کہ درحقیقت امام صاحب کے متعلق ترجیحِ قیاس کی بات ان لوگوں نے کہی ہے جو امام صاحب کے اصول وقواعد سے ناواقف ہیں۔

امام اعظمؒ کے یہاں قبولِ روایت کی شرائط:

امام ابوحنیفہؒ کے یہاں مسائل کے استنباط واجتہاد کے لئے کچھ قاعدے اور ضابطے مقرر ہیں، جن پر انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے، ان میں سے چند اصول یہ ہیں۔

(۱)من سورة الإسراء : ٣٦.

(۲)مقدمة الأوجز ١/١٨٩-١٩٢.

(۱)خبر واحد اگر متفق علیہ اور اجماعی اصول کے خلاف ہوتو خبر واحد کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۲)راوی کا عمل اگر اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف ہوتو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حدیث منسوخ ہے، یا راوی کے نزدیک اس سے راجح دلیل ثابت ہوجانے کی وجہ سے مرجوح ہے۔

(۳)موضعِ عمومِ بلوی میں راوی کا تفرد (یعنی عام صحابہؓ کا اس حدیث کو روایت نہ کرنا) بھی روایت میں نسخ وغیرہ کا احتمال پیدا کرتا ہے، اسی لئے جمہور علماء نے بھی حدیث الجمع بین الصلوتین للمطر کو قابلِ عمل قرار نہیں دیا ہے۔

(۴)روایاتِ شہیرہ کی رو سے حدود وکفارات شبہ کی وجہ سے ساقط ہوجاتے ہیں، اس لئے ان کو واجب کرنے میں خبر واحد معتبر نہ ہوگی۔

(۵)جس مسئلہ میں خبر واحد وارد ہوئی ہے اگر وہ مسئلہ صحابہ کے درمیان مختلف فیہ ہو اور صحابہ میں سے کسی نے بھی اس روایت کو مستدل نہ بنایا ہوتو وہ روایت بھی نسخ وغیرہ کے احتمال کی وجہ سے قابل عمل نہ ہوگی۔

(۶)خبر واحد کا عموم قرآن کے خلاف ہونا؛ کیونکہ امام صاحب کے نزدیک خبر واحد کی وجہ سے آیتِ قرآنیہ میں نسخ وتخصیص جائز نہیں ہے۔

(۷)خبر واحد کا روایات مشہورہ کے معارض ہونا'' وغیر ذالک من القواعد التی بنی علیها مذهبه''۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بغیر قوی اور واضح دلیل کے کسی خبر واحد کو ترک نہیں فرمایا ہے، اس لئے ترجیح قیاس کا الزام بے بنیاد ہے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ تمام احناف کا اس پر اتفاق ہے کہ ضعیف حدیث قیاس سے اولی اور مقدم ہے۔[1]

قیاس؛ شجر ممنوعہ نہیں:

امام صاحب کی مجلس لگی ہوئی تھی آپ نے ایک مسئلہ کے بارے میں قیاس فرمایا، اس پر ایک شخص نے کہا کہ اس قیاس بازی کو چھوڑو، کیوں کہ سب سے پہلے قیاس ابلیس نے کیا تھا، اس پر امام صاحب نے

(۱) (ملخص از مقدمه أوجز ۱ / ۱۸۹ — ۱۹۲)

تحمل کے ساتھ فرمایا: ''یافلانُ! وضعتَ الکلامَ فی غیر موضِعِه'' کہ تم نے یہ بات بے موقعہ کہی، کیونکہ ابلیس نے اپنے قیاس سے اللہ کے حکم کو رد کیا تھا اس لئے وہ کافر قرار پایا، اور ہم جو قیاس کرتے ہیں وہ اللہ کے حکم کی تلاش کے لئے اور اس کی اتباع کے لئے کرتے ہیں، اگر قرآن وحدیث میں کوئی مسئلہ غیر منصوص مسئلہ کے موافق ہوتا ہے تو ہم اس کو اس پر قیاس کرتے ہیں، پس ہمارا مقصود تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کا اتباع ہے تو ہم ابلیس کے مساوی کیسے ہوجائیں گے! اس پر اس شخص نے امام صاحب سے معافی مانگی اور آپ کو دعا دی ''نوّر اللهُ قلبَکَ کمانوّرتَ قلبی''[1]

امام اعظم کے یہاں ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح:

ابن حزم کے حوالہ سے اوپر بتایا جاچکا ہے کہ احناف کے یہاں تو حدیث اگرچہ ضعیف ہو اس کو قیاس پر مقدم کیا جائے گا، احناف کی کتبِ فقہ میں اس کی سینکڑوں مثالیں ہیں مثلاً ''القهقهة فی الصلوة'' کہ امام صاحب کے یہاں یہ ناقضِ وضو ہے، جمہور کے یہاں نہیں، جمہور نے کہا ہے کہ خروجِ نجاست سے وضو ٹوٹتا ہے، اور قہقہہ فی الصلوۃ سے خروج نجاست نہیں ہوتا ہے، احناف کہتے ہیں کہ قہقہہ فی الصلوۃ کا ناقض ہونا خلافِ قیاس حدیث سے ثابت ہے جس کا واقعہ مشہور ہے،[2] یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر اس کو قیاس پر ترجیح دی گئی۔

مقدمہ مشکوٰۃ میں ہے کہ مرسل حدیث جمہور کے یہاں حجت نہیں ہے مگر احناف ومالکیہ کے یہاں مرسل روایت بھی حجت اور قیاس پر مقدم ہے، لہٰذا امام صاحب پر ترجیح قیاس علی الحدیث کا الزام سراسر غلط ہے۔

احناف کو ''اصحاب الرائے'' کہنے کی وجہ:

اب سوال یہ ہے کہ جب احناف کے یہاں قیاس کو ترجیح نہیں تو پھر احناف کو ''اصحاب الرائے'' کیوں کہا جاتا ہے، ملاعلی قاری نے اس کی وجہ یہ تحریر کی ہے: ''لدقة رأیهم وحذاقة عقلهم'' یعنی ان کی دقت رائے اور مہارت عقل کی بنا پر،[3] گویا کہ یہ لقب مذمت کے طور پر نہیں بلکہ مدح کے طور پر ہے، لیکن جن کے ذہن میں فتور ہے وہ اس کا اطلاق احناف پر مذمت کے طور پر کرتے ہیں فإلی الله المشتکی۔

---

(۱) مقدمۂ اوجز ۱/۱۸۹-۱۹۲.

(۲) سنن دارقطنی ۱/۲۹۰ ج۶۰۳)ط مؤسسة الرسالة بیروت.

(۳)مقدمۂ أوجز ص۱/۱۸۹-۱۹۲.

(٦) علم الحديث في الهند

یہ مبحث بیانِ اسناد کی تمہید ہے، حضرات اساتذہ نے فرمایا ہے کہ اُن اکابر کا ہم پر احسان ہے جو علم حدیث کو حجاز سے لائے، اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہی اسلام ہندوستان پہنچ گیا تھا جیسا کہ بعض کتب تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بلکہ صحابہ کے زمانہ تک بھی ہندوستان میں اسلام کا چرچہ نہیں ہوا تھا، یہاں اسلام زیادہ تر تاجروں کے ذریعہ سے پھیلا ہے چنانچہ تبع تابعین میں سے ایک محدث ابوجعفر ربیع بن صبیح سعدی البصری المتوفی ۱۶۰ھ،[1] ہندوستان میں گجرات کے علاقہ بھروچ میں تشریف لائے اور وہاں انہوں نے احادیث بیان کرنا شروع کی، مگر دسویں صدی ہجری تک ہندوستان میں علم حدیث کا چرچہ نہیں ہوا، یہاں علوم عقلیہ منطق فلسفہ وغیرہ کا زور تھا، دسویں صدی ہجری تک ''مشارق الانوار'' مولفہ ابوالفضائل حسن بن محمد الصاغانی الحنفی پڑھائی جاتی تھی، دسویں صدی ہجری میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ مکہ مکرمہ علم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے، پھر ہندوستان آئے، انہوں نے حدیث کی خوب خدمت کی اور خاص طور پر مشکوٰۃ شریف پر انہوں نے بہت محنت کی، اصول حدیث کے بارے میں ایک مقدمہ لکھا، جو ''مقدمۂ مشکوۃ'' کے نام سے مشہور ہے اور مشکوۃ کے شروع میں ملحق ہے، یہ مقدمہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا ہے، بعض لوگ اس مقدمہ کو صاحبِ مشکوٰۃ کا سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے مشکوۃ کی دوشرحیں لکھیں، ایک عربی زبان میں: ''**لمعات التنقیح**'' اور دوسری فارسی زبان میں: ''**اشعة اللمعات**'' سنہ ۱۰۵۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

لیکن آپ کے زمانہ تک ہندوستان میں مشکوٰۃ کا ہی درس ہوا، صحاح ستہ یہاں نہیں آئیں، گیارھویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اس میدان میں اترے، آپ کی وفات ۱۱۷۶ھ میں ہے، آپ نے عرب جاکر حرمین کے علماء سے بالخصوص شیخ ابوطاہر مدنی سے علم حدیث حاصل کیا اور آپ ہی صحاح ستہ کو اور ان کی اجازت حدیث کو ہندوستان لے کر آئے پھر ہندوستان میں صحاح ستہ کا بھی درس ہونے لگا، برصغیر کے تمام علماء کی سند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تک پہنچتی ہے، اسی لئے آپ کو ''مرکز الاسانید'' فی الہند کہا جاتا ہے۔

---

(۱) انظر ترجمته مفصلاً في السير ۷ / ۲۸۷ — ۲۸۹.

آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحب زادے کبار محدثین ہوئے، بڑے صاحب زادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ آپ کے جانشین مقرر ہوئے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی نے حدیث کی بڑی خدمت انجام دی اور آپ کے ہزاروں شاگرد ہوئے، ان میں سے خاص شاگرد دو ہوئے ہیں: (۱) شاہ اسحاق مہاجر مکیؒ، جو آپ کے نواسے بھی ہوتے ہیں (۲) مولانا رشید الدین کشمیری ثم الدہلوی، پھر شاہ اسحاقؒ کے مشہور شاگرد شاہ عبدالغنی مجددیؒ ہوئے، اور شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے دو اہم شاگرد ہوئے: (۱) حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ (۲) حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ، پھر ان دونوں کے شاگردوں میں علماء دارالعلوم ومظاہر علوم ہیں، دارالعلوم اور مظاہر علوم کے ذریعہ حدیث کی خوب خدمت ہوئی حتی کہ اہل عرب نے بھی اس کا اعتراف کیا۔[۱]

(۷) بيان الإسناد واهميته

اسناد کے معنی ہیں: حدیث کو نقل در نقل ترتیب کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانا، یہ اسناد امت محمدیہ کی خصوصیت ہے، کیونکہ امم سابقہمیں اپنے دین کی باتیں سند کے ساتھ بیان کرنے کا اہتمام نہ تھا، سب سے پہلے سند کا اہتمام امت محمدیہ نے کیا، علماء امت نے سند کی اہمیت بیان فرمائی، اور اس کی اہمیت کو مختلف مثالوں سے سمجھایا، عبداللہ ابن المبارکؒ نے فرمایا: ''**الإسْنادُ من الدينِ ولولا الإسْنادُ لَقالَ مَنْ شَاءَ ماشاءَ**'' [۲] کہ اگر اسناد نہ ہوتی تو ہر شخص جو چاہتا بیان کر دیا کرتا، محمد بن سیرین کا قول امام مسلم نے نقل کیا ہے: ''**إن هذا العلمَ دينٌ فانظُروا عمَّنْ تأخذُون دِيْنَكم**'' [۳] ''یعنی یہ علم (علم شریعت) دین ہے، لہٰذا غور کر لیا کرو کہ کس سے دین حاصل کر رہے ہو؟ بعض حضرات نے فرمایا: **السَّنَدُ للعالِمِ كالسَّيْفِ للمقاتِلِ** [۴] ''یعنی عالم کے لئے سند مجاہد کے لئے تلوار کے مثل ہے، بعض نے کہا ''**السَّنَدُ للمحدِّثِ كالسُّلَّمِ للصاعِدِ**'' یعنی محدث کے لئے سند اوپر چڑھنے والے کے لئے سیڑھی کے درجہ میں ہے۔

سند کی اہمیت معلوم ہو جانے کے بعد اب ہم اپنی سند بیان کرتے ہیں، علمائے ہند کی کتب حدیث کی

(۱) معظم هذا المبحث في العناقيد الغالية للشيخ عبدالرشيد النعماني.

(۲) رواه مسلم في مقدمته ص ۱۲.

(۳) اخرجه مسلم في مقدمته ص ۱۱.

(٤) لم أجد هذا القول بلفظه بل أجده هكذا: قال سفيان الثوري: الإسناد سلاح المؤمن إذا لم يكن معه سلاح فبأي شئ يقاتل، أخرجه ابن حبان في المجروحين ۱/ ۳۱.

جو سندیں ہیں ان کے تین دور ہیں: پہلا دور ہم سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ تک، دوسرا دور شاہ ولی اللہؒ سے لیکر صاحبِ کتاب تک، تیسرا دور صاحبِ کتاب سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک، ذیل میں تینوں ادوار کی سندیں درج ہیں:

پہلا دور:

میں نے یہ کتاب حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مجاہد پوری سہارنپوریؒ مظاہری، صدر مدرس مدرسہ خادم العلوم باغوں والی، ضلع مظفرنگر، سے پڑھی، انہوں نے یہ کتاب حضرت مولانا امیر احمد صاحب کاندھلویؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا منظور خاں صاحبؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا ثابت علی صاحب سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتویؒ سے پڑھی، انہوں نے استاذ الکل حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت مولانا رشید الدین کشمیریؒ ثم الدہلوی سے پڑھی، انہوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے پڑھی، انہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ سے پڑھی۔

دوسرا دور:

حضرت شاہ ولی اللہ سے لیکر صاحبِ کتاب تک کی سند حضرت شاہ صاحب کے ایک رسالہ ''الارشاد الی مہمات الإسناد '' میں بھی چھپی ہوئی ہے، اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدثؒ دہلوی نے اپنے رسالہ ''العجالة النافعة '' میں اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے مصنف کتاب یعنی صاحب مشکوۃ تک کی سند اس طرح نقل کی ہے:

إسناد مشكوة المصابيح لولي الدين محمد بن عبدالله الخطيب التبريزيؒ:

يرويه مسند الهند الشاه ولي الله، عن الشيخ أبي طاهر محمد ابن إبراهيم الكردي المدني، عن أبيه الشيخ إبراهيم الكردي المدني، عن الشيخ أحمد القُشاشي، عن الشيخ أحمد بن عبدالقدوس الشنّاوي، عن السيد غضنفر بن السيد جعفر النهروالي عن الشيخ محمد سعيد المعروف بمير كلان، عن الشيخ السيد نسيم الدين المعروف بميرك شاه، عن والده السيد جمال الدين عطاء الله بن السيد غياث الدين فضل الله بن السيد

عبدالرحمن، عن عمه السيد أصيل الدين عبدالله بن عبدالرحمن، عن شرف الدين عبدالرحيم بن عبدالكريم الجرهي الصديقي، عن إمام الدين علي بن مبارك الشاه الساوجي الصديقي، عن مؤلف الكتاب ولي الدين محمد بن عبدالله الخطيب التبريزي، كذاذكر هذا السند الشاه عبدالعزيز الدهلوي في العجالة النافعة.[1]

تیسرا دور:

صاحبِ مشکوۃ؛ حدیث نقل فرمانے کے بعد اس کتاب کا حوالہ تحریر فرماتے ہیں جہاں سے وہ حدیث لیتے ہیں، اوراس کتاب میں حدیث کی مکمل سند لکھی ہوئی ہے، اس طرح ہم سے لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک سند متصل ہوجاتی ہے۔

مقدمة الكتاب

کتاب سے متعلق چند باتیں ہیں (۱)تعارفِ مشکوۃ، نام اوروجہ تسمیہ (۲)وجوہ الفرق بین المصابیح والمشکوۃ (۳)روایات اورکتب وابواب کی تعداد(۴)مرتبۂ کتاب (۵)خصائص مشکوۃ(۶)مأخذ مشکوۃ(۷)شروحِ مشکوۃ (۸)حالاتِ صاحب مصابیح وصاحب مشکوۃ۔

(۱) تعارف مشكوة المصابيح

کتاب کانام'' مشکوۃ المصابیح'' ہے،'' المصابیح'' پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے، اصل میں تھا مصابیح السنۃ، مصابیح: مصباح کی جمع ہے بمعنی چراغ، اورمشکوۃ بمعنی طاق، جس میں چراغ رکھا جاتا ہے،اورطاق بھی ایسا جوصرف ایک طرف سے کھلا ہواہو،جس کو'' طاقِ غیرنافذہ'' کہاجاتاہے،اس میں چراغ رکھاجائے تو اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے،اب ترجمہ ہوگا: چراغوں کا طاق ،امام بغویؒ صاحبِ مصابیح نے

(۱)العناقيد الغالية من الأسانيد العالية/۱٦٧۔

وفی "العجالة النافعة" للمحدث الشاه عبدالعزيز الدهلوی: سيد غضنفر بن سيد جعفر "النهر وانی" بالنون المعجمة بدل "النهر والی" نسبة الی النهر وان وكذا الشيخ محمد سعيد معروف "بهر كلان" مكان "مير كلان" انظر العجالة النافعة بالفارسية/ ۲۹ط: مطبع مجتبائی۱۳٤۸ھ۔

احادیث کوتشبیہ دی روشن چراغوں کے ساتھ، مشکوۃ ان احادیث کے ایک بڑے مجموعہ کو شامل ہے تو گویا کہ روشن چیز (احادیث) کو طاق (مشکوۃ) میں رکھ دیا گیا ہے جس سے اس افادیت میں اضافہ ہوگیا، جیسا کہ چراغ کو طاق میں رکھنے سے اس کی روشنی بڑھ جاتی ہے، گویا کہ یہ کتاب اسم با مسمی ہوئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام بغویؒ نے ایک کتاب ''مصابیح السنۃ'' کے نام سے تحریر فرمائی، جس میں احادیثِ احکام کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مرتب فرمایا، یہ کتاب احادیثِ احکام کے بارے میں بہت جامع تھی، لیکن امام بغویؒ نے اس کتاب میں سندوں کو ذکر نہیں کیا، حتی کہ صحابی کا نام بھی ذکر نہیں کیا، اور نہ ہی احادیث کے مأخذ اور حوالوں کو ذکر کیا، اس کی وجہ سے مصابیح السنۃ کی احادیث کو تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا تھا، اور بعض حضرات کو اس کی بعض احادیث پر ضعیف ہونے کا بھی شبہ تھا، امام بغویؒ نے اس میں ہر باب کے تحت دو عنوان قائم فرمائے: (۱) الصحاح (۲) الحسان، ''الصحاح'' کے عنوان کے تحت وہ صحیحین (بخاری و مسلم) کی حدیث یا دونوں میں سے کسی ایک کی حدیث کو ذکر کرتے ہیں، اور ''الحسان'' کے تحت سنن خمسہ (ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی) کی روایات کو لاتے ہیں، پس کل یہ سات کتابیں ہوئیں، انہی سات کتابوں کی احادیث ''مصابیح السنۃ'' میں ذکر کی گئیں ہیں، جن کو ''اصولِ سبعہ'' بھی کہا جاتا ہے، مشکوۃ میں جب اصول کا لفظ بولا جائے تو اس سے یہی سات کتابیں مراد ہوتی ہیں، بعد میں علامہ خطیب تبریزی اور ان کے استاذ علامہ شرف الدین حسین بن محمد طیبی کا مشورہ ہوا کہ ''مصابیح السنۃ'' کو ایک خاص نہج پر مرتب کرنا چاہیئے، چنانچہ اس کام کا قرعۂ فال شاگرد محترم علامہ خطیب تبریزی کے نام نکلا، علامہ خطیب تبریزی نے ''مصابیح السنۃ'' کی احادیث کو بہت سے تغیرات کے ساتھ بڑی محنت وعرق ریزی سے ایک خاص نہج پر مرتب فرمایا، اور اس کا نام مشکوۃ المصابیح رکھا، مصابیح السنہ اور مشکوۃ میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک اہم بحث ہے، اس لئے دوسری بحث کا عنوان یہی ہے جو درج ذیل ہے:

(۲) وجوه الفرق بين المصابيح والمشكوة

مشکوۃ ومصابیح میں کئی فرق پائے جاتے ہیں:

(۱) ذکر صحابی: مشکوۃ میں روایت کرنے والے صحابی کا ذکر ہے، اور مصابیح میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) مأخذ وذکرِ حوالہ: مشکوۃ میں احادیث کے ماخذ وحوالہ کا اہتمام کیا گیا ہے، جبکہ مصابیح السنہ میں

ماخذ وحوالہ کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

(۳) بیاض چھوڑنے کا اہتمام: مصابیح السنہ میں بعض روایات ایسی تھیں جو خطیب تبریزی کو کہیں نہیں ملیں، نہ صحاح میں نہ حسان میں تو صاحبِ مشکوۃ نے وہاں خالی جگہ چھوڑ دی تا کہ بعد میں آنے والے لوگ اس حدیث کو باحوالہ کردیں، اس خالی جگہ کو ''بیاض'' کہا جاتا ہے، بعد میں بہت سے علماء اور شراح نے بہت سی بیاضوں کو پُر کیا ہے لیکن ابھی بھی کچھ بیاضیں خالی ہیں۔

(۴) تبدیلِ عنوان: صاحبِ مشکوۃ نے ''الصحاح'' کی جگہ الفصل الاول اور'' الحسان'' کی جگہ الفصل الثانی کا عنوان قائم کیا۔

(۵) اضافۂ فصل ثالث: صاحب مشکوٰۃ نے باب کے مضمون کی مناسبت سے کچھ احادیث کا اضافہ بھی کیا ہے، جن کو وہ فصلِ ثالث کا عنوان قائم کر کے ذکر کرتے ہیں، اس فصلِ ثالث میں صاحب مشکوۃ صحیحین اور سنن خمسہ کے علاوہ دیگر کتابوں کی احادیث بھی لاتے ہیں، مشکوۃ میں کل کتنی کتابوں کی احادیث ہیں اس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

(۶) حدیثِ موقوف ومقطوع: مصابیح السنہ میں بالقصد واصالۃً احادیثِ مرفوعہ ہی بیان کی گئی تھیں جبکہ صاحبِ مشکوۃ فصلِ ثالث میں اصالۃً احادیثِ موقوفہ ومقطوعہ کو بھی ذکر کرتے ہیں۔

(۷) حذفِ تکرار: مصابیح السنہ میں بہت سی روایات مکرر تھیں، صاحب مشکوۃ نے اس تکرار کو ختم کیا اور روایت کو صرف کسی ایک جگہ درج فرمایا۔

(۸) اختصارِ حدیث: امام بغوی نے مصابیح السنۃ میں بعض احادیث کو بہت طوالت کے ساتھ ذکر کیا حالانکہ باب اور ترجمہ کی وضاحت کے لئے اس کا بعض حصہ بھی کافی ہوسکتا تھا، ایسے مواقع پر صاحبِ مشکوۃ نے حدیث کے اس حصہ کو جو باب کے مناسب نہیں تھا حذف کر کے حدیث کو مختصر کردیا۔

(۹) تکمیلِ حدیث: امام بغوی نے بعض احادیث کو مختصراً ذکر کیا تھا حالانکہ حدیث کا بقیہ حصہ بھی باب اور ترجمہ کے مناسب تھا اور اس حصہ کے بغیر حدیث کے سمجھنے میں خلل واقع ہوتا تھا، نیز وہ بقیہ حصہ موقع کے لحاظ سے کثیر الفوائد بھی تھا، صاحبِ مشکوۃ نے ایسے مقامات پر حدیث کا بقیہ حصہ بھی ذکر کرکے حدیث کو مکمل فرمادیا۔

(۱۰) تبدیلِ حوالہ: بعض جگہ صاحب مشکوۃ مقررہ اصطلاح کے خلاف فصلِ اول میں سنن کا حوالہ دیتے

ہیں، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ حدیث ان کو صحیحین میں نہ ملے، اور فصلِ ثانی میں بعض مرتبہ صحیحین کا حوالہ دیتے ہیں، یہ اس وقت کرتے ہیں جب کہ وہ روایت ان کو صحیحین میں مل جائے۔

(۱۱) اختلافِ متن: بعض مرتبہ صاحبِ مشکوٰۃ، مصابیح میں مذکور متنِ حدیث میں تغیر کرتے ہیں، یہ اس موقع پر کرتے ہیں جب کہ اصولِ سبعہ میں ان کو وہ حدیث ان الفاظ کے علاوہ سے ملتی ہے جن الفاظ کے ساتھ امام بغوی نے ذکر کی ہے، اور ایسے موقع پر "**وجدت خلاف هذه الرواية في الأصول**" کہہ کر تنبیہ بھی فرمادیتے ہیں۔

(۱۲) عدمِ وجدان فی کتب الاصول: بعض مرتبہ صاحب مشکوۃ کو کوئی روایت کتب اصول میں نہیں ملتی، تو مصنف کتب اصول کے بجائے جہاں سے وہ حدیث ملتی ہے اس کا حوالہ دیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں: "**ماوجدت هذه الرواية في كتب الأصول**"

(۱۳) بیان ضعف ونکارت: صاحب مشکوۃ بعض جگہ حدیث کے ضعف ونکارت کو بھی بیان کرتے ہیں اور علت کی بھی نشان دہی فرماتے ہیں۔

(۳) روایات اور کتب وابواب کی تعداد

مصابیح السنہ کی کل روایات چاہزار چارسو چونتیس (۴۴۳۴) ہیں، ان میں دوہزار چارسو چونتیس (۲۴۳۴) صحاح کی اور دوہزار (۲۰۰۰) حسان کی احادیث ہیں، اور مشکوۃ میں علامہ خطیب تبریزی نے فصل ثالث کے عنوان سے پندرہ سوگیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا اضافہ کیاہے، اس طرح مشکوۃ شریف میں کل احادیث کی تعداد پانچ ہزار نوسو پنیتالیس (۵۹۴۵) ہے اور مشکوۃ میں لفظ "کتاب" کا عنوان انتیس (۲۹) مقامات پر ہے اور ان کتابوں کے تحت تین سوستائیس (۳۲۷) ابواب ہیں، اورابواب کے تحت درج فصلوں کی تعداد دس سواڑتیس (۱۰۳۸) ہے۔

(۴) مرتبۂ کتاب

اس کے لئے پہلے انواع کتب حدیث کو سمجھنا ہوگا، حضرات محدثین کے یہاں حدیث کی کتابیں لکھنے کے مختلف اسالیب اورانداز ہیں، اس لحاظ سے کتب حدیث کی مختلف انواع ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

انواع کتب حدیث:

(۱) الجامع: حدیث کی وہ کتاب جو حدیث کے آٹھوں مضامین پر مشتمل ہو۔

(۲) السنن: وہ کتاب جس میں احادیث احکام ابواب فقہیہ کی ترتیب پر مذکور ہوں جیسے سنن ترمذی۔

(۳) المسند: حدیث کی وہ کتاب جس میں احادیث کو علی ترتیب اسماء الصحابہ بیان کیا جائے۔

(۴) المستدرک: وہ کتاب جو دوسری کتاب سامنے رکھ کر لکھی جائے اور اس میں وہ حدیث ذکر کی جائے جو اس دوسری کتاب میں ہونی چاہئے کہ وہ اس کی شرائط کے مطابق ہے، مثلاً بخاری کا مستدرک لکھنا ہو، تو بخاری کی شرائط کو سامنے رکھیں اور وہ احادیث جو شرط بخاری پر ہوں مگر بخاری میں نہ ہوں ان کو جمع کیا جائے، جیسے ''مستدرک حاکم'' یہ صحیحین کا استدراک ہے۔

(۵) مشیخة: وہ کتاب جس میں احادیث کو علی ترتیب اسماء الشیوخ لکھا جائے۔

(۶) المعجم: وہ کتاب جس میں رواۃ حدیث کو، یا شیوخ مصنف کو حروف ہجاء کی ترتیب پر مرتب کرکے، ہر ایک کے ترجمہ کے تحت ان کی احادیث ذکر کی گئی ہوں، جیسے امام طبرانی کی معاجم۔

(۷) الأربعون: وہ کتاب جس میں چالیس احادیث مذکور ہوں خواہ کسی بھی مضمون کی ہوں، اس کو اردو میں ''چہل حدیث'' کہا جاتا ہے۔

(۸) تعالیق: وہ کتاب جس میں احادیث کے صرف متون کو لکھا جائے اور سندوں کو حذف کردیا جائے، مثلاً امام بغوی کی مصابیح السنة۔

(۹) المسلسلات: وہ کتاب جس میں احادیثِ مسلسلہ ہوں، اور مسلسل وہ حدیث ہے جس میں رواۃ کسی خاص وصف میں از اول تا آخر مشترک ہوں۔

(۱۰) الجزء: وہ کتاب جس میں کسی ایک مسئلہ سے متعلق احادیث کو جمع کیا گیا ہو جیسے حضرت شیخ زکریاؒ کی ''جزء حجۃ الوداع'' اور امام بخاری کی ''جزء رفع الیدین'' وغیرہ[1]۔

کتبِ حدیث کی ایک اور تقسیم:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ''عجالۂ نافعہ'' کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، جس میں

(۱) ان اصطلاحات کے لئے مقدمہ'' لامع الدراری'' اور محمد ابو اللیث الخیر آبادی کی'' تخریج الحدیث نشأته ومنهجيته'' کی مراجعت فرمائیں۔

حضرت شاہ صاحب نے احادیث کے قابل استدلال وغیر قابل استدلال اور صحت وضعف کے اعتبار سے کتبِ حدیث کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) وہ کتاب جس کی تمام احادیث صحیح ہوں مثلاً بخاری، مسلم، موطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ وغیرہ۔

(۲) وہ کتاب جس کی تمام روایات گو صحیح نہ ہوں، البتہ اس کی تمام روایات قابل استدلال اور صالح للأخذ ہوں جیسے ترمذی، ابوداؤد، نسائی، طحاوی۔

(۳) وہ کتاب جس میں قابل استدلال اور غیر قابل استدلال دونوں طرح کی احادیث ہوں جیسے ابن ماجہ، مصنّف عبدالرزاق وغیرہ۔

(۴) وہ کتاب جس کی تمام احادیث پر ضعف اور نکارت کا حکم ہو جیسے مسند فردوس۔

مذکورہ بالا انواع کے لحاظ سے ''مشکوۃ المصابیح'' ''سنن'' میں شمار ہے کہ اس کی ترتیب فقہی ہے، اور ''التعالیق'' میں بھی داخل ہے کہ اس میں حدیث کی اسانید مذکور نہیں ہیں، نیز شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تقسیم کے لحاظ سے دوسرے درجہ کی کتب میں شمار ہے جس کی تمام روایات قابل استدلال واحتجاج ہیں۔

(۵) خصائص مشکوۃ

ہر مصنف کا ذوق تصنیف جدا ہوتا ہے، اس کی کتاب اس کا مظہر ہوتی ہے، اسی وجہ سے ایک موضوع پر تحریر کی جانے والی کتابیں بھی الگ الگ افادیت کی حامل ہوتی ہیں، ''لایغنی کتاب عن کتاب'' جو جملہ مشہور ہے وہ اسی پس منظر میں کہا گیا ہے، حدیث کی مشہور چھ کتابیں جو ''صحاح ستہ'' کے نام سے معروف ہیں ان میں درج احادیث تقریباً یکساں ہیں مگر ان کے مصنفین کے ذوق کے اختلاف کے سبب ہر کتاب کی شانِ افادیت دوسرے سے ممتاز ہے۔

پیش نظر کتاب ''مشکوۃ المصابیح'' جو احادیث رسول کا ایک گلدستہ ہے اس کی بھی کچھ منفرد خصوصیات ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) اس کتاب میں متعدد معروف کتب حدیث سے جن کا بیان پہلے آچکا ہے احادیث کا انتخاب کرکے ان کو ایک خاص ترتیب سے جمع کیا گیا ہے، اس طرح یہ ایک کتاب کئی کتابوں کے قائم مقام اور ''دریا بکوزہ'' کا مصداق ہوگئی ہے۔

(۲)اس کتاب میں احادیث کے ذکروبیان کی ترتیب نہایت متوازن اور چوکس ہے، بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ اس میں جو حدیث جہاں درج ہے اگر اس کو وہاں سے ہٹادیا جائے تو پوری کتاب میں کہیں اور اس کو اندراج کی جگہ نہ مل سکے گی۔

(۳)اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں متعلقہ موضوع کے بارے میں وارد مختلف ومتنوع احادیث کو یکجا کردیا گیا ہے، جس سے اس موضوع کے بارے میں کامل بصیرت حاصل ہوجاتی ہے، اورشریعت کا مجموعی مزاج بھی سامنے آجاتا ہے چنانچہ بعض اہل نظر کا کہنا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بےنظیر کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا ماخذ یہی ''مشکوۃ المصابیح'' ہے، اس کے ابواب کی احادیث کے مجموعے کو پیش نظر رکھ کر شاہ صاحبؒ نے شریعت کے مزاج ومنشاء اوراحکام شریعت کے اسرار ورموز کو واضح فرمایا ہے۔

(۴)اس کتاب میں دین وشریعت کے تمام موضوعات اورمضامین کے استقصاء کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ اس میں مذکور کتب وابواب کی فہرست سے واضح ہے۔

(۵)یہ کتاب اطناب ممل اورایجاز مخل ہردو سے پاک اورتوسط واعتدال کا عمدہ نمونہ ہے، جس کی وجہ سے تمام علمی حلقوں میں اس کو پذیرائی حاصل رہی ہے۔

(۶)اس کتاب میں مذکور احادیث سہل الحصول ہیں، ان کو یاد کرنا اورسمجھنا دشوار نہیں، اس لئے بہت سے افراد و اشخاص اس کے حافظ بھی گزرے ہیں اوربہت سے دینی گھرانوں میں عورتوں کو بھی اس کے پڑھانے کا معمول رہا ہے۔

(۷)مصنفؒ نے یہ کتاب اس نقطۂ نظر سے ترتیب دی ہے کہ حدیث کے ابتدائی طالب علم کے لئے دیگر کتب حدیث سے استفادہ کے لئے زینہ بن سکے اوراس کے سامنے احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اجمالی خاکہ وتعارف آجائے، مصنفؒ کے اس خیال کو اللہ تعالیٰ نے ایسا حقیقت میں مبدل فرمایا کہ تمام دینی مدارس وجامعات میں یہ کتاب اسی نقطۂ نظر سے داخل نصاب ہے اوراس کو موقوف علیہ کا درجہ حاصل ہے، اس کے بعد ہی دیگر کتب حدیث پڑھائی جاتی ہیں۔

(۸)اس کتاب کو اس نقطۂ نظر سے بھی ترتیب دیا گیا کہ عام مسلمان دین وشریعت سے قریب ہوں اوران کی عملی زندگی کا رخ صحیح ہو، چنانچہ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب انتہائی مفید ہے، اسی لئے صوفیاء کرام کے یہاں خانقاہوں میں اس کا باضابطہ درس ہوتا تھا اوراس کی روشنی میں سالکین کو سلوک کے مدارج

طے کرائے جاتے تھے، اور جس وقت انگریزوں سے جہاد ہورہا تھا سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ مجاہدین کی جماعتوں اور حلقوں میں اس کا درس دیا کرتے تھے، جس سے ان کے اعمال واخلاق کی تہذیب کے ساتھ ان میں جذبۂ جہاد کی تحریک وتحریض بھی ہوتی۔

(٦) مأخذ مشکوٰۃ

یہ کتاب مصنفؒ نے ''مصابیح السنۃ'' کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے، مگر صاحب مصابیح نے احادیث کے مأخذ وحوالجات ذکر نہیں فرمائے، مصنفؒ نے تتبع وتلاش کرکے ان احادیث کے مأخذ ومصادر کو اس کتاب میں درج فرمایا، اس کے علاوہ ''فصل ثالث'' میں درج تمام احادیث مصنفؒ کا ہی اضافہ ہیں، اس طرح اس کتاب میں جن کتابوں کی مرویات جمع کی گئی ہیں اور ان مرویات کی اسنادی حیثیت کی وضاحت کے لئے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ہماری ناقص تتبع کے مطابق ان کی مجموعی تعداد (۴۲) کو پہنچ جاتی ہے، ان میں سے بیشتر کتابیں وہ ہیں جن کی مرویات اور احادیث اس کتاب میں ذکر کی گئی ہیں، پھر ان میں سے کچھ مصادر اصلیہ ہیں اور کچھ مصادر غیر اصلیہ، اور بعض کتابیں وہ ہیں کہ ان کے حوالہ سے صرف احادیث کی اسنادی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔

مصنفؒ نے خطبۂ کتاب میں ان میں سے کچھ مشہور مؤلفین ومحدثین کے اسماء ذکر کئے ہیں، ذیل میں اس کتاب کے تمام مأخذ ومصادر اور ان کے مؤلفین کے اسماء ذکر کئے جاتے ہیں:

مصادر اصلیہ:

(۱) ''**صحیح بخاری**''، اس کا پورا نام ''**الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول الله صلى الله عليه وسلم وسننه وايامه**'' ہے، اور اس کے جامع ومؤلف: امیر المؤمنین فی الحدیث ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ الجعفی البخاری (متوفی: ۲۵۶ھ) ہیں۔

(۲) ''**صحیح مسلم**'' اس کا اصل نام ''**المسند الصحيح المختصر من السنن بنقل العدل عن العدل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم**'' ہے، اس کے جامع ومؤلف: ابوالحسن عساکر الدین مسلم بن الحجاج القشیری النیساپوری (متوفی ۲۶۱ھ) ہیں۔(۱)

(۱) انظر: تحقيق اسمی الصحيحين للشيخ عبدالفتاح ابوغده.

یہ دونوں کتابیں ''صحیحین'' کے نام سے معروف ہیں۔

(۳) ''سنن ابی داؤد'' اس کا اصل نام ''کتاب السنن'' ہے اور اس کے مؤلف وجامع: ابوداود سلیمان بن اشعث بن اسحاق الازدی السجستانی (متوفی ۲۷۵ھ) ہیں۔

(۴) ''سنن ترمذی'' اس کا پورا نام ''الجامع المختصر من السنن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومعرفۃ الصحیح والمعلول وماعلیہ العمل'' ہے، اور اس کے جامع ومؤلف: ابوعیسی محمد بن عیسی بن موسی بن ضحاک السلمی الترمذی البوغی (متوفی ۲۷۹ھ) ہیں۔

(۵) ''سنن نسائی'' اس کا اصل نام ''المجتبی من السنن الکبری'' ہے، ابوعبدالرحمٰن احمد بن علی بن شعیب (متوفی ۳۰۳ھ) اس کے مؤلف وجامع ہیں۔

(۶) ''سنن المصطفی لابن ماجہ'' یہ ''سنن ابن ماجہ'' کے نام سے معروف ہے، جوابوعبداللہ محمد بن یزید بن عبداللہ الربعی القزوینی (متوفی ۲۷۳ھ) المعروف بابن ماجہ کی تالیف وتصنیف ہے۔

یہ چاروں کتابیں ''سنن اربعہ'' کے نام سے مشہور ہیں، نیز ان مذکورہ چھ کتابوں کو ''صحاح ستہ'' کہا جاتا ہے، جوتغلیبی نام ہے۔

(۷) ''مؤطاامام مالک'' یہ مشہور امام مجتہد: ابوعبداللہ امام دارالہجرۃ مالک بن انس الاصبحی المدنی (متوفی ۱۷۹ھ) کی تالیف ہے اور اسی نام سے معروف ہے۔

(۸) ''سنن دارمی'' اس کو ''مسند دارمی'' بھی کہا جاتا ہے، یہ ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام بن عبدالصمد الدارمی السمرقندی (متوفی ۲۵۵ھ) کی تالیف ہے۔

(۹) ''مسند احمد'' یہ ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد الشیبانی (متوفی ۲۴۱ھ) کی تالیف ہے، جومشہور امام ہیں۔

(۱۰) ''السنن الکبری''

(۱۱) ''شعب الایمان''

(۱۲) ''دلائل النبوۃ''

(۱۳) ''المدخل الی علم السنن''

(۱۴) ''کتاب البعث والنشور''

(۱۵)''الدعوات الکبیر''

یہ چھ کتابیں: ابوبکر احمد بن الحسین بن علی بن موسی الخراسانی (متوفی ۴۵۸ھ) المعروف بالإمام البیہقی کی تالیف ہیں۔

(۱۶)''سنن دارقطنی ''اس کا اصل نام''کتاب السنن ''ہے، جو ابوالحسن علی بن عمر بن احمد البغدادی الدارقطنی (متوفی ۳۸۵ھ) کی تالیف ہے۔

(۱۷)''صحیح ابن خزیمہ ''اس کا اصل نام''مختصر المختصر من المسند الصحیح عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ''ہے، جو ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمۃ السلمی النیسابوری (متوفی ۳۱۱ھ) کی تالیف ہے۔

(۱۹)''سنن سعید بن منصور ''یہ ابوعثمان سعید بن منصور بن شعبہ الخراسانی الجوزجانی (متوفی ۲۲۷ھ) کی تالیف ہے اوراسی نام سے معروف ہے۔

(۲۰)''المجتبی ''اس کا پورا نام''المجتبی عن السنن الماثورۃ ''ہے اور یہ امام دارقطنی کی تالیف ہے، جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، یہ ان کی ''کتاب السنن ''کے علاوہ دوسری تصنیف ہے۔

(۲۱)''شرح السنۃ ''یہ محی السنۃ ابومحمد حسین بن مسعود بن محمد ابن البغوی (متوفی ۵۱۶ھ) کی تالیف ہے، اس کتاب میں مؤلفؒ نے اپنی اسانید سے روایات نقل کرکے ان کی شرح فرمائی ہے، اس لحاظ سے یہ بڑی اہم کتاب ہے، ''مصابیح السنۃ ''کے مؤلف بھی یہی بزرگ ہیں۔

(۲۲)''مسند الامام الشافعی ''یہ ان روایات کا مجموعہ ہے جو امام شافعیؒ سے مروی ہیں، ان کی مختلف کتابوں سے جمع کرکے اس ''مسند'' میں ان کو درج کیا گیا ہے، صاحب مشکوۃ نے امام شافعیؒ کے حوالہ سے جو روایات نقل کی ہیں عموماً وہ اس میں موجود ہیں۔

(۲۳)''عمل الیوم واللیلۃ ''یہ امام نسائی کی تالیف ہے، جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔

(۲۴)''حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء ''یہ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی (متوفی ۴۳۰ھ) کی تالیف ہے اوراسی نام سے معروف ہے۔

(۲۶)''التاریخ الکبیر ''یہ امام بخاریؒ کی تالیف ہے۔

(۲۷)''الاستیعاب لابن عبدالبر ''اس کا اصل نام''الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب''

ہے، جوابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر النمر ی القرطبی (متوفی ۴۶۳ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے صحابہ کرام کے احوال وآثار جمع فرمائے ہیں اوراپنی سند سے جابجاان کی احادیث بھی ذکر کی ہیں۔

مصادر غیر اصلیہ:

(۲۸) ''التجرید للصحاح الستة '' یہ ابوالحسن امام الحرمین رزین بن معاویہ العبدری السَّرَقُسْطی الاندلسی (متوفی ۵۳۵ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے صحاح ثلاثہ (بخاری، مسلم، مؤطا امام مالک) اورسنن ثلاثہ (سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی) کی روایات کو حذفِ اسانید کے ساتھ جمع کیا ہے، ''رواہ رزین'' سے یہی کتاب مراد ہوتی ہے۔

(۲۹) ''جامع الاصول فی احادیث الرسول '' یہ مجدالدین ابوالسعادات مبارک بن محمد الشیبانی الجزری المعروف بابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ) کی تالیف ہے، جودراصل رزین بن معاویہؒ کی مذکورہ کتاب التجرید للصحاح کی مزید تہذیب وتکمیل ہے۔

(۳۰) ''الجمع بین الصحیحین '' یہ ابوعبداللہ محمد بن ابی نصرفتوح بن عبداللہ بن فتوح بن حمید الازدی الحمیدی الاندلسی القرطبی (متوفی ۴۸۸ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے صحیح بخاری اورصحیح مسلم کی روایات کوجمع کیا ہے۔

(۳۱) ''کتاب الأذکار للنووی ''اس کتاب کا پورانام ''حلیة الأبرار وشعار الأخیار فی تلخیص الدعوات والأذکار المستحبة فی اللیل والنهار ''ہے، جوشارح مسلم محی الدین ابوزکریا یحی بن شرف بن مری الدمشقی الشافعی (متوفی ۶۷۶ھ) کی تالیف ہے۔

(۳۲) ''المنتقی ''اس کاپورانام ''المنتقی من الاخبار فی احادیث الأحکام '' ہے، یہ علامہ ابن تیمیہؒ کے دادا ابوالبرکات مجدالدین عبدالسلام بن عبداللہ بن خضر بن محمد بن تیمیہ الحرانی (متوفی ۶۵۲ھ) کی تالیف ہے، جو''مجدابن تیمیہ''اور''ابن تیمیہ الاکبر'' بھی کہے جاتے ہیں، اس کتاب میں انہوں نے صحیحین، سنن اربعہ اورمسند احمد کی احادیث کوجمع کیا ہے۔

(۳۳) ''کتاب الوفاء لابن الجوزی ''اس کااصل نام ''الوفاء فی فضائل المصطفی '' ہے، جوابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد الجوزی القرشی البغدادی (متوفی ۵۹۷ھ) کی تالیف ہے۔

(۳۴)''ریاض الصالحین'' اس کتاب کا پورا نام ''ریاض الصالحین من کلام سیدالمرسلین'' ہے، جوشارح مسلم امام نوویؒ کی تصنیف ہے۔

وہ مأخذ جن سے احادیث کی اسنادی حیثیت کی وضاحت کے لئے استفادہ کیا گیا:

(۳۵)''الأربعون للنووية'' یہ شارح مسلم امام نووی کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے چہل حدیث جمع کی ہیں۔

(۳۶)''شرح مسلم للإمام النووی'' اس کا اصل نام ''المنهاج فی شرح صحیح مسلم ابن الحجاج'' ہے

(۳۷)''معالم السنن'' یہ ابوسلیمان احمد بن محمد الخطابی البستی (متوفی ۳۸۸ھ) کی تصنیف کردہ سنن ابوداؤد کی شرح ہے، اکثر وبیشتر اس کے حوالہ سے مصنفؒ نے احادیث کی اسنادی حیثیت کو واضح کیا ہے اور بسا اوقات روایت بھی اس کی جانب منسوب کی ہے۔

کچھ اور مأخذ:

(۳۸)''کتاب الزهد الكبير'' یہ امام بیہقی کی تالیف ہے۔

(۳۹)''المستدرک علی الصحيحين'' یہ ابوعبداللہ الحاکم (متوفی ۴۰۵ھ) کی تالیف ہے، جس میں انہوں نے وہ روایات جمع کی ہیں جو صحیحین کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود صحیحین میں مذکور نہیں۔

(۴۰)''مسند ابی داود الطیالسی'' یہ ابوداؤد سلیمان بن داؤد بن الجارود الطیالسی البصری (متوفی ۲۰۴ھ) کی تالیف ہے۔

یہ تینوں کتابیں وہ ہیں جن کے حوالہ سے مصنفؒ نے کوئی حدیث اس کتاب میں نقل نہیں فرمائی، لیکن ان احادیث میں سے جن کے آگے مصنفؒ نے بیاض چھوڑ دیا ہے کچھ احادیث ان کتابوں میں مذکور ہیں، اس لحاظ سے ان کتابوں کو بھی اس کے مأخذ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

(۴۱)''الصحيح للإسماعیلی'' یہ ابوبکر احمد بن ابراہیم بن اسماعیل المعروف بابی بکر الاسماعیل (متوفی ۳۷۱ھ) کی تالیف ہے، امام حمیدیؒ کے حوالہ سے اس کتاب سے بھی مصنفؒ نے روایت نقل کی ہے۔

(۴۲)''مسائل حرب الكرماني ''یہ ابومحمد حرب بن اسماعیل بن خلف الکرمانی (متوفی ۲۸۸ھ) کے ان مسائل ومرویات کا مجموعہ ہے، جوانہوں نے امام احمد بن حنبلؒ اورامام اسحاق بن راہویہؒ سے سماعت کئے ہیں، مصنفؒ نے محمد ابن تیمیہؒ کی ''المنتقی ''کے حوالہ سے اس سے بھی روایت نقل فرمائی ہے۔

(۷)شروح مشکوٰۃ

اللہ تعالیٰ شانہ نے اس کتاب کوقبولیت عامہ سے نوازاہے، ہرزمانہ میں یہ کتاب علماء کی توجہ کا مرکز رہی ہے اورسارے عالم میں اس کے تعلیم وتعلم اوردرس وتدریس کا سلسلہ برابرجاری ہے، اسی لئے اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، ان میں سے بہت سی نایاب ہیں اور بہت سی موجود ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱)''الکاشف عن حقائق السنن ''جو''طیبی'' کے نام سے مشہور ہے، یہ شرح عرصہ سے نایاب تھی، اب بہت سی جگہوں سے چھپی ہے، جومؤلف کتاب علامہ تبریزی کے استاذ علامہ شرف الدین طیبیؒ[1] کی تحریرکردہ ہے، درسِ نظامی میں صرف دوکتابیں ایسی ہیں کہ استاذ نے اپنے شاگرد کی کتاب کی شرح لکھی: مشکوۃ شریف، اوردوسرے کنزالدقائق کہ اس کی شرح علامہ زیلعی نے''تبیین الحقائق'' کے نام سے تحریرفرمائی، جوصاحبِ کنزعلامہ نسفیؒ کے استاذ ہیں۔

(۲)مرقاۃالمفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح: یہ نورالدین ابوالحسن علی بن سلطان المعروف بملاعلی قاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) کی تصنیف ہے اورحل مشکوۃ کے لئے سب سے بہترشرح ہے۔

(۳)لمعات التنقیح: شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (متوفی ۱۰۵۲ھ) کی شرح ہےاورعربی زبان میں ہے۔

(۴)اشعۃ اللمعات : یہ بھي شیخ عبدالحق بن سیف الدین محدث دہلویؒ کی شرح ہےاوراس کی زبان فارسی ہے۔

(۵)التعلیق الصبیح : حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلویؒ کی تحریر کردہ شرح ہے۔

(۶)مظاہرحق قدیم: علامہ نواب قطب الدین بن محی الدین شاہ جہاں آبادی(متوفی ۱۲۸۹ھ) کی ہے، یہ مشکوۃ کا ترجمہ ہے جس کوحضرت شاہ اسحاق مہاجر مکیؒ نے لکھا تھا، انکے شاگردنواب صاحب نے اس پرکچھ اضافہ کیا اوریہ انہی کی طرف منسوب ہوا،اس کی اردوجب پرانی ہوگئی تو اس کو جدید اردومیں منتقل کیاگیاجس کا نام''مظاہرحق جدید'' رکھاگیا،یہ سب شروحات شائع اوردستیاب ہیں۔

---

(۱)ھو الشیخ الحسین بن محمد بن عبدالله الطیبي المتوفی ۷٤۳ھ.

(۸) حالات صاحبِ مصابیح وصاحب مشکوٰۃ

صاحب مصابیح: - آپ کا نام حسین بن مسعود الفراء البغوی ہے، کنیت ابومحمد، لقب رکن الدین اور محی السنہ ہے اور نسبت بغوی ہے، آپ محی السنہ اور بغوی سے زیادہ مشہور ہیں، الفراء آپ کے والد ماجد کی صفت ہے، یہ فَرْوٌ بمعنی پوستین یعنی چمڑا سے ماخوذ ہے، آپ کے والد پوستین فروش یا پوستین دوز تھے، یہ فراء نحوی کے علاوہ ہیں، بغوی نسبت ہے بغ کی طرف اور یہ بغشور کا مخفف ہے اور معرب ہے باغ پور کا، جو خراسان کے شہروں میں سے ایک شہر تھا، یہ مرکب امتزاجی و بنائی ہے، مرکب امتزاجی میں کبھی جزو اول کی طرف نسبت کی جاتی ہے، اس لئے بغوی ہوا، ورنہ بغشوری ہونا چاہئے تھا، جیسے معدیکرب کے رہنے والے کو معدی کہا جاتا ہے، بعلبک کے رہنے والے کو بعلی کہا جاتا ہے، سوال یہ ہوتا ہے کہ بغ کی طرف نسبت ہے تو بغی ہونا چاہئے تھا واو کہاں سے آیا؟ بعض حضرات نے کہا کہ یہ واو زائد ہے، بعض نے کہا کہ بغی بمعنی زانیہ سے امتیاز کے لئے واو زائد کیا گیا ہے۔

آپ نے ''مصابیح السنہ'' سے پہلے علم حدیث میں ''شرح السنہ'' لکھی اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوئی، اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے خوش ہو کر فرمایا ''أحیاک اللہ کما أحییتَ سنتی'' اسوقت سے آپ کا لقب محی السنہ ہوا، اس کے بعد آپ نے ''مصابیح السنہ'' لکھی۔

۴۳۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، بڑے بڑے محدثین وفقہاء سے علم حاصل کیا، فقہ میں آپ کے مشہور استاذ قاضی حسین بن محمد ہیں، اور حدیث میں یعقوب بن محمد الصیرفی اور ابوالحسن داود بن علی الجوہری ہیں، آپ مذہباً شافعی تھے، آپ انتہائی جلیل القدر عالمِ دین، فنِ قراءت کے ماہر، مفسر، محدث، عابد، زاہد اور سادہ مزاج بزرگ تھے، قائم اللیل وصائم النہار تھے، بغیر سالن کے روٹی کھایا کرتے تھے، اخیر میں روٹی کے ساتھ روغن زیتون استعمال کرنے لگے تھے، مصابیح السنہ کے علاوہ تفسیر میں ''معالم التنزیل'' حدیث میں الجمع بین الصحیحین اور فقہ میں فتاوی بغوی وغیرہ آپ کی یادگار ہیں، اللہ نے آپکو اصابتِ رائے سے نوازا تھا، اسّی سال کی عمر میں ۵۱۶ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔ (۱)

(۱) انظر ترجمته في سير أعلام النبلاء ۱۹ / ۴۳۹ وتذكرة الحفاظ ۴ / ۱۲۵۷ — ۱۲۵۹.

صاحب مشکوۃ:- آپ کا نام محمد، کنیت ابوعبداللہ، والد کا نام عبداللہ، لیکن آپ نے ''اکمال'' میں اپنے والد کا نام عبیداللہ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے، الخطیب ،العمری، التبریزی، لقب ولی الدین ہے، خطیب تبریزی سے مشہور ہیں، آپ تبریز کی جامع مسجد میں مدت تک خطیب رہے، اس لئے ''خطیب تبریزی'' کہلاتے ہیں، اور عمری اس لئے کہ آپ عمر بن عبدالعزیزؒ کی اولاد سے ہیں، آپ آٹھویں صدی ہجری کے علماء ومشائخ میں سے ہیں، آپ نے اپنے استاذ علامہ طیبی کے مشورہ سے مشکوۃ المصابیح لکھنا شروع کی اور ۷۳۷ھ میں رمضان المبارک کے اخیر جمعہ کو اس سے فراغت پائی، پھر مشکوٰۃ المصابیح میں جن راویوں کے نام آئے ان کے حالات کے سلسلہ میں ایک رسالہ لکھا جس سے ۷۴۰ھ میں فارغ ہوئے، جو''الکمال فی اسماء الرجال'' کے نام سے مشکوۃ المصابیح کے اخیر میں ملحق ہے۔

۷۴۳ھ میں وفات ہوئی، بعض نے سن وفات ۷۴۱ھ اور بعض نے ۷۴۸ھ لکھا ہے، مشکوۃ شریف جتنی مشہور ہے اتنے ہی آپ کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔(۱)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلاهَادِيَ لَهٗ.

ترجمه : تمام تعریفیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے ہیں، ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں، اور اسی سے مدد ومغفرت کے طلبگار ہیں، اور ہم اپنے نفس کی برائیوں اور اپنی بداعمالیوں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس کو ہدایت عطا فرمائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے، اور جس کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ گمراہی میں چھوڑ دے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔

تشریح عبارت

بسملہ وحمدلہ اور اس سے کتاب کے آغاز کی وجوہات:

مصنفؒ نے بسملہ اور حمدلہ سے اپنی کتاب کو شروع فرمایا اس کی کئی وجہیں ہیں:

(۱)انظر:ترجمة في الأعلام للزركلي ٦ / ٢٣٦.

(۱) اقتداءً بکتاب اللہ تعالیٰ کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے بھی اپنی کتاب کو بسملہ وحمدلہ سے شروع فرمایا ہے۔

(۲) عملاً بالحدیث یعنی حدیث پر عمل کرنا بھی مقصود ہے، بسملہ سے ابتداء کے بارے میں بھی حدیث وارد ہوئی ہے ’’كلُّ أمرٍ ذي بالٍ لا يُبدأُ فيه ببسم الله الرحمن الرحيم أقطع[1]‘‘ اور حمد سے متعلق بھی حدیث ہے ’’كل كلام لا يبدأُ فيه بحمدالله فهو أجزم[2]‘‘ ان پر عمل کرنے کے لئے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے۔

ایک مشہور اشکال وجواب:

اس پر مشہور اشکال ہوتا ہے کہ ایک حدیث میں بسملہ سے شروع کرنے کا حکم دیا اور دوسری میں حمدلہ سے شروع کرنے کا حکم ہے، حالانکہ ابتداء تو کسی ایک چیز سے ہوسکتی ہے، معاً دو چیزوں سے ابتداء محال ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں حدیثوں کا مقصود ابتداء بالذکر ہے، اور ذکر میں بسملہ وحمدلہ دونوں داخل ہیں، لہٰذا دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے، چنانچہ مسند احمد اور دارقطنی کی ایک روایت میں ذکر اللہ کے الفاظ ہی آئے ہیں ’’كل أمر ذي بال لم يبدأ بذكر الله أقطع[3]‘‘

(۳) اتباع سلف صالحین کہ وہ اپنی کتابوں کو بسملہ وحمدلہ سے ہی شروع فرماتے تھے۔

تکرار حمد کی وجوہات:

الحمدلله نحمده الخ: -حمد کے لئے مصنفؒ دو جملے لائے ہیں الحمدلله اور نحمده، اول جملہ اسمیہ اور ثانی جملہ فعلیہ ہے، اس تکرار کی متعدد وجہیں حضرات شراح نے بیان فرمائی ہیں:

(۱) اللہ کی حمد اللہ کے انعامات کے مطابق ہونی چاہئے، اللہ کے انعامات بندوں پر بار بار بھی ہوتے رہتے ہیں اور کچھ انعامات ہمیشہ رہتے ہیں، گویا کہ ان میں تجدد بھی ہے اور استمرار بھی، مصنف پہلا جملہ اسمیہ لائے کہ وہ استمرار پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جملہ فعلیہ لائے جو حدوث وتجدد پر دلالت کرتا ہے، پس حمد انعامات کے مطابق ہوگئی۔

---

(۱) الدر المنثور للسيوطي ۱/ ۲۶ مطبوعه دار الفكر بيروت.

(۲) أخرجه أبو داود: كتاب الأدب، باب الهدي في الكلام ۲/ ۶۶۵ (۴۸۴۰)

(۳) مسند أحمد ۲/ ۳۵۹ (۸۶۹۷)، مطبوعه القاهره، دارقطني ۱/ ۲۳۵ (۸۷۲) مطبوعه دار الإيمان سهارنفور.

(۲) بعض نے کہا کہ الحمدللہ گویا کہ ایک دعوی ہے اور نحمدہ اس کی دلیل ہے کہ ہم اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں۔

(۳) بعض حضرات نے کہا کہ پہلے جملہ الحمدلله میں ازل سے ابدتک تمام حامدین کا تذکرہ ہے، ان حامدین کے زمرہ میں ہم سب بھی داخل ہوجائیں اس لئے اس کے بعد نحمدہ کا جملہ لکھا۔

(۴) بعض نے کہا کہ دوسرا جملہ نحمدہ فرقۂ جبریہ پر رد کرنے کے لئے لایا گیا ہے، جو انسان کو مجبور محض مانتے ہیں (اس کی تفصیلات آگے آئیں گی) یعنی اللہ نے ہمیں بھی حمد کا اختیار دیا ہے، جیسا کہ اس حمد یہ جملہ سے ظاہر ہے۔

پھر نحمده میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) یہ تواضع اور اظہار عجز کے لئے ہے کہ حمد ایسی اہم چیز ہے کہ میں تنہا اس پر قادر نہیں ہوں، لہٰذا ہم سب ملکر اس کی حمد کرتے ہیں۔

(۲) بعض نے کہا کہ جمع کا صیغہ عام ہے، مقبولین وغیر مقبولین سب کو شامل ہے، پس یہ صیغہ اس لئے لایا گیا تا کہ حمدِ مقبولین کے ساتھ ہماری حمد بھی شامل ہوجائے اور ان کی برکت سے ہماری حمد بھی قبول ہوجائے، کیونکہ مقبولین کی حمد عموماً قبول ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت سے یہ بعید ہے کہ مقبولین کی حمد کو قبول فرماویں اور غیر مقبولین کی حمد کو رد کردیا جائے۔

ونستعينه :-ماقبل میں حمد کو بیان کیا جو ایک عظیم الشان چیز ہے، اللہ کی مدد کے بغیر بندہ اس کو انجام نہیں دے سکتا ہے، اس لئے اس کی ادائیگی میں اللہ سے مدد طلب کی، اس کا مفعول ثانی عام ہے ''**ای فی المهمات كلها**'' جس میں حمد بھی داخل ہے۔

ونستغفره :-اس سے پہلے جو حمد بیان کی، ظاہر ہے کہ اس میں قصور رہا ہوگا، اللہ کی شایان شان ہماری حمد نہیں ہوسکتی، ہم کیا؟ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''**اللهم لاأُحْصِي ثناءً عليك أنتَ كما أثنيتَ على نفسِك**'' اے اللہ میں تیری ایسی تعریف بیان نہیں کرسکتا جیسا کہ تونے خود اپنی تعریف کی ہے، پس ادائیگی حمد میں جو قصور رہا ''**نستغفره**'' کے ذریعہ اس قصور کی معافی چاہی گئی ہے۔

شرور نفس سے پناہ اور اقسام نفس:

ونعوذ بالله من شرور انفسنا:- اللہ کی حمد سے بندہ کو اس کا نفس روکتا ہے، لہٰذا نفس کے شر سے

پناہ طلب کی جارہی ہے۔

نفس تین قسم کا ہوتا ہے: (۱) نفس امارہ، (۲) نفسِ لوامہ، (۳) نفس مطمئنہ، قرآن کریم میں تینوں نفوس کا تذکرہ موجود ہے، ''إن النفسَ لأمّارةٌ بالسوءِ[۱]'' یقیناً نفس تو بہت زیادہ برائی کا حکم دینے والا ہے، اس میں نفس امارہ کا تذکرہ ہے، ''ولاأقسم بالنَّفْس اللَّوَّامة[۲]'' اور قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی، اس میں نفس لوامہ کا تذکرہ ہے، ''یاأیتها النفسُ المطمئنةارْجِعِي الی ربِّکِ راضیةً مَّرْضِیَّة[۳]'' اے اطمینان والے نفس تو اپنے رب کی طرف واپس چل، تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، اس آیت میں نفس مطمئنہ کا بیان ہے۔

نفس امارہ انسان کو برائی پر آمادہ کرتا ہے اور بھلائی سے روکتا ہے، نفس لوامہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اللہ کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو نفس اپنی برائیوں کو انسان کے سامنے پیش کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ برائیاں انسان کو آئینہ میں عکس کی طرح محسوس ومشاہد ہونے لگتی ہیں، اگر انسان پھر بھی ان برائیوں سے رک نہیں پاتا ہے تو نفس اس کو ملامت کرتا ہے، اور یہ اچھی صفت ہے، اور نفس مطمئنہ وہ ہے جسے اللہ کے ذکر کے بغیر سکون نصیب نہ ہو، جیسے مچھلی کو پانی کے بغیر چین وقرار نہیں ملتا، اس کو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے، ان نفوس ثلثہ میں سے اول یعنی نفس امارہ برا اور مذموم ہے اور لوامہ ومطمئنہ محمود اور مطلوب ہیں۔

نفس تو درحقیقت ایک ہی ہے مگر اس کی صفات وکیفیات میں تغیر ہوتا رہتا ہے، اس لحاظ سے اس کی اقسام متعدد ہوجاتی ہیں۔

سیئات اعمالنا:- جمع ہے ''سیئۃ'' کی، ''شرور انفسنا'' سے نفس کی باطنی برائیاں اور ''سیئات اعمالنا'' سے ظاہری برائیاں مراد ہیں۔

من یهده الله فلامضل له الخ:- ہدایت کے معنی ہیں نرمی اور شفقت کے ساتھ راہ دکھانا، اس کی دو قسمیں مشہور ہیں ''إرائة الطریق اور ایصال إلی المطلوب[۴]'' یہاں دوسرے معنی مراد ہیں اسی وجہ

(۱) یوسف: ۵۳.

(۲) القیامه: ۲.

(۳) الفجر:

(٤) شرح التهذیب ص۲.

سے فرمایا ''من يهده الله فلامضل له''

وَأَشْهَدُ اَنْ لَّاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ شَهَادَةً تَكُوْنُ لِلنَّجَاةِ وَسِيلَةً، وَلِرَفْعِ الدَّرَجَاتِ كَفِيْلَةً، وأَشْهَدُ أَنَّ محمداً عبدُهُ ورسولُهُ، الَّذى بَعثَهُ وَطُرُقُ الإِيْمَانِ قَدْ عَفَتْ آثَارُهَا، وخَبَتْ أَنوارُهـا، ووَهَنَتْ أَرْكَانُها، وجُهِلَ مَكَانُها؛ فَشَيَّدَ-صلواتُ اللّٰهِ وَسَلامُهُ عَلَيْهِ – مِنْ مَعَالِمِهَا مَاعَفَا، وشَفىٰ مِنَ العَلِيْلِ فِي تَائِيْدِ كَلِمَةِ التَّوْحِيْدِ مَنْ كَانَ عَلىٰ شَفَا، وأوضَحَ سَبِيلَ الهِدَايَةِ لِمَنْ أَرَادَ أن يَّسْلُكَهَا، وَأَظْهَرَ كُنُوْزَ السَّعَادَةِ لِمَنْ قَصَدَأَنْ يَّمْلِكَهَا.

ترجمہ:-اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ عزوجل کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ایسی گواہی جو نجات کے لئے وسیلہ اور درجات کی بلندی کے لئے ضامن ہو، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس وقت مبعوث فرمایا جب ایمان کی راہوں کے نشانات مٹ چکے تھے، اور اس کی روشنیاں بجھ چکی تھیں، اور اس کے ستون کمزور پڑ چکے تھے اور اس کی جگہیں نامعلوم ہو چکی تھیں، پس حضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مٹے ہوئے نشانوں کو بلند اور مستحکم فرمایا، اور کلمۂ توحید کی تعلیم کے ذریعہ اس بیمار کو شفاء بخشی جو ہلاکت کے کنارہ جا پہنچا تھا اور اس شخص کے لئے ہدایت کے راستہ کو روشن کیا جو اس پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہو اور نیک بختی کے خزانے اس شخص کے لئے ظاہر کئے جو ان کے مالک ہونے کا ارادہ کرتا ہو۔

تشریح عبارت

واشهد أن لاإله الخ :-ماقبل میں حمد کا بیان تھا اس سے ایمان ثابت ہوا اب شہادت کے ذریعہ اس ایمان کی تکمیل کی جارہی ہے۔

حمد، استغفار وغیرہ امور ظاہری ہیں، دوسرے لوگوں میں بھی ان کے پائے جانے کا حکم لگایا جاسکتا ہے، اسلئے مصنف نے ان امور کو بہ صیغۂ جمع بیان فرمایا، جبکہ شہادت: اگر چہ اس کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوتا ہے، لیکن اصلاً وہ فعل قلبی ہے، اس کے وجود کو کہ کس کے اندر ہے اور کس کے اندر نہیں؟ اللہ ہی جانتا ہے، اس لئے مصنف اس کے لئے جمع کے بجائے واحد متکلم کا صیغہ لائے ہیں(۱)

(۱) المرقاة شرح المشكاة ١/ ٤٩-٥٠،ط أشرفيه.

حضور ﷺ کے اسماء گرامی اور محمد نام رکھنے کی وجہ:

محمدٌ:- یہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم شخصی ہے جو صفت سے منقول ہو کر آیا ہے، یہ نام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمائے شریفہ میں سب سے مشہور نام ہے، اس کے علاوہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اسمائے گرامی ہیں جن کی تعداد بعض علماء نے نناوے اور بعض نے تین سو بیان کی ہے[۱]
امام سیوطیؒ کا اس موضوع پر مستقل رسالہ ہے جس کا نام ''البهجة السوية في الأسماء النبوية'' ہے، اس میں انھوں نے آپ علیہ السلام کے پانچ سو سے زائد اسمائے صفاتی بیان فرمائے ہیں۔[۲]
علامہ ابن العربی مالکیؒ نے شرح ترمذی میں بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ہزار نام ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے ساتویں روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب نے بطور تفاؤل آپ علیہ السلام کا نام ''محمد'' رکھا، عبد المطلب سے معلوم کیا گیا کہ آپ نے اپنے بیٹے کا نام ''محمد'' کیوں رکھا، حالانکہ آپ کے اجداد میں کسی کا نام محمد نہیں تھا اور آپ کی قوم میں محمد نام رکھنے کا رواج بھی نہیں؟ تو انہوں نے کہا ''أردتُ أن يَحْمَدَه اللهُ في السماء وخَلْقُه في الأرض'' مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں اور اللہ کی مخلوق زمین میں ان کی تعریف کریں گے[۳] چنانچہ ان کی یہ توقع برحق ثابت ہوئی، بعض علماء نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کسی کا نام محمد نہیں رکھا گیا سوائے چھ یا پندرہ لوگوں کے، حافظ ابن حجرؒ نے ان میں سے کچھ کا تذکرہ کیا ہے۔[۴]
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا مشہور نام ''احمد'' ہے یہ نام آپ علیہ السلام سے پہلے کسی کا نہیں رکھا گیا۔[۵]

آپ علیہ السلام کی دو مشہور صفات:

عبده ورسوله: یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفتیں مذکور ہیں عبد اور رسول، عبدیت ورسالت

(۱) شرح الحموی علی الأشباه والنظائر (المسمّٰی غمزعیون البصائر) ۱/۳۲، ط: المکتبة الفیصل، دیوبند.
(۲) المرقاة شرح المشكاة ۱۰/٤٥٥ ط اشرفيه ديوبند، یہ رسالہ مطبوع ہے۔
(۳) فتح الباری /مبعث النبی صلی الله علیه وسلم ۷/۱۹۵ (۳۸۵۱) مطبوعه شیخ الهند دیوبند.
(٤) فتح الباری /ماجاء فی اسماء رسول الله صلی الله علیه وسلم ٦/٦٨٧ (۳٥۳۲)
(٥) البدایة والنهایة: ذکر نسبه الشریف: ۲/۳۱۹. ط احیاء التراث العربی، بیروت.

میں سے رسالت کا مقام اگرچہ اونچا ہے اور یہ مراتبِ بشریت میں اعلی ترین مرتبہ ہے، مگر بندہ کا اصل مقام ومرتبہ عبدیت ہے، اس لئے اس کو رسالت پر مقدم کیا، قرآن کریم میں بھی سب سے زیادہ اعزاز واکرام کے موقع میں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ''عبد'' کا لفظ ہی استعمال فرمایا گیا ہے: ''سبحان الذی أسری بعبده الخ''

بعض نے کہا کہ عبدیت میں توجہ من المخلوق إلی الخالق ہوتی ہے اور رسالت میں توجہ من الخالق الی المخلوق ہوتی ہے، پس اس لحاظ سے عبدیت ؛رسالت سے افضل ہے اور اس لئے اس کو مقدم کیا گیا۔

آپ علیہ السلام کی بعثت کے وقت انسانوں کی حالتِ زار:

الذی بعثه:- یہاں سے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کا اور بعثت کے وقت لوگوں کی عمومی گمراہی اور ان کی حالتِ زار کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسی ضرورت کے وقت ہوئی جبکہ لوگ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رہبری کے بڑے محتاج تھے، اس وقت ضلالت وجہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، لوگ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو بھول چکے تھے، صحیح رہبری کا وجود نہیں تھا، عیسائیوں کے کچھ راہب تھے انہوں نے بھی لوگوں کی بے نیازی سے تنگ آکر خلوت اور گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنے لگے تھے، ہدایت کا پیغام لے کر عامۃ الناس کے سامنے آنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔

ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا، آپ علیہ السلام نے ہدایت کے ان مٹے ہوئے نشانات کو واضح فرمایا اور لوگ جو شرک وکفر کی وجہ سے جہنم کے کنارہ پر جا پہنچے تھے ان کو وہاں سے نکالا، یہ ہے مقصد بعثت۔

طرق الأیمان قد عفت آثارھا :-''طرق ایمان'' سے مراد انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین ہیں کہ ان کے نشانات مٹ چکے تھے۔

وخبت أنوارھا:''انوار'' سے مراد انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات وہدایات ہیں۔

ووھنت أرکانھا:''ارکان'' اس سے مراد توحید، رسالت اور بعث بعد الموت ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے ارکان یہی ہیں۔

وجهل مكانها: اس سے مراد علم وہدایت کی جگہیں ہیں، جیسے مسجد، مدرسہ، خانقاہ وغیرہ، مراد یہ ہے کہ دینی مراکز بھی ختم ہوگئے تھے یا ان کی طرف رجوع باقی نہ رہا تھا۔

فشيد صلوات الله عليه وسلامه :- یہاں سے یہ بتارہے ہیں کہ ایسے حالات میں آپ علیہ السلام نے کیا کیا؟ آپ نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا احیاء فرمایا اوران کو استحکام بخشا، لوگوں کے دلوں میں ایمانی تخم کی آبیاری فرمائی، اور کفروشرک میں مبتلا ہونے کی وجہ سے لوگ جوجہنم کی دہلیز تک پہنچ گئے تھے کلمۂ توحید کی تلقین کرکے انکو جہنم کے عذاب سے بچایااور طلبگاروں کے لئے اعمال صالحہ، اخلاق حمیدہ اورقوانین شرعیہ کوواضح کیا تاکہ وہ ان کواختیار کرکے ابدی سعادت حاصل کرسکیں۔

وشفى من العليل: ''علیل'' سے شرک وکفر کا بیمار مراد ہے۔

اس مضمون میں آیت کریمہ ''**وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَاحُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا**[1]'' (اورتم آگ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں وہاں سے بچالیا) کی جانب تلمیح واشارہ ہے۔

> **أمابعدُ، فإنَّ التمسُّكَ بِهَدْيِه لايَسْتَتِبُّ إلاّ بِالاقتِفَاءِ لِمَا صَدَرَ مِنْ مِشْكَاتِه، والإعْتِصَامَ بحبلِ اللّٰه لايَتِمُّ إلَّابِبيانِ كَشفِه.**
>
> **ترجمه** :- بہرحال حمد وصلوۃ کے بعد؛ (جاننا چاہئے) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو اختیار کرنا معتبر نہیں ہوسکتا مگراس وقت جبکہ اس کا کامل اتباع کیاجائے جوآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارکہ سے صادر ہوا، اوراللہ کی رسی یعنی قرآن کریم کومضبوطی سے پکڑنا تام اورمکمل نہیں ہوسکتا مگرآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اورتفسیر سے۔

تشریح عبارت

امابعد: موقعِ استعمال اوراولین متکلم:

أمابعد : یہ کلمۂ فصل ہے جوایک کلام کودوسرے کلام سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، ماقبل میں حمدوثنااورمقصد بعثت کا بیان تھااورآگے حدیث کی ضرورت کا بیان ہے، ''امابعد'' کے ذریعہ ان دونوں

(۱) آل عمران: ۱۰۳.

مضمونوں میں امتیاز کیا گیا ہے۔

یہ کلمہ سب سے پہلے راجح قول کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام نے استعمال فرمایا، ''وَفَصْلَ الْخِطَاب[1]'' کے نام سے ان پر جس انعامِ خداوندی کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس سے یہی مراد ہے۔[2]

بعض نے کہا کہ اولاً حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ کلمہ استعمال کیا، بعض نے سحبان بن وائل کا نام لیا، بعض نے یعرب بن قحطان کا اور بعض نے کعب بن لؤی کا۔[3]

بیانِ ضرورتِ حدیث:

فان التمسک بھدیہ: مصنفؒ نے خطبہ میں چار باتیں ذکر کی ہیں: (۱)ضرورت حدیث، (۲) وجہِ تالیفِ کتاب، (۳) ماخذ کتاب، (۴) وجوہ الفرق بین المشکاۃ والمصابیح، اس عبارت میں ضرورت حدیث کو بیان کیا جارہا ہے، حدیث کی ضرروت دووجھوں سے ہے:

(۱) اول یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو امت کے لئے نمونہ قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم میں ہے ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' اس لئے ہر شخص اس بات کا مکلّف ہے کہ آپ علیہ السلام کی سیرت کو اختیار کرے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اختیار کرنا اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ مشکوۃِ نبوت سے جو باتیں صادر ہوئی ہیں یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ان کا اتباع کیا جائے۔

''**صدر من مشکوته**'' میں آپ علیہ السلام کے قلب منور کو روشن چراغ کے ساتھ اور سینۂ مبارکہ کو طاقچہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(۲) دوسری وجہ اعتصام بالقرآن ہے، باری تعالیٰ کا امر ہے ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعاً''، ''حبل

---

(۱) سورة ص: ۲۰.

(۲) فتح الباری ج۲ ص۴۹۷ (رقم الباب: ۲۹)

(۳) لمعات التنقیح ج ۱ ص ۱۳۹. التعلیق الصبیح ۱ / ۳. لفظ ''امابعد'' کی تحقیق وتفصیل کے لئے علامہ موسیٰ روحانی کی کتاب ''النجم السعد فی مباحث أمابعد'' ملاحظہ فرمائیں۔

اللہ ‘‘ سے مراد قرآن کریم ہے کمافی روایۃ الترمذي، [۱] اورقرآن کریم پرعمل اوراس کا اعتصام اسی وقت ہوسکتاہے جب احادیث کے ذریعے اس کی توضیح وتفسیر کی جائے۔

حضرت عمرانؓ بن حصین نے ایک موقعہ پرایک شخص کو حدیث کی ضرورت واہمیت بتاتے ہوئے فرمایا ’’إنک رجلٌ أحمقُ أتجِدُ في كتابِ اللهِ الظهرَ أربعاً لاتَجْهَرُ فيها بالقرأةِ ثم عَدَّدَ إليه الصلوةَ والزكوةَ ونحوهذا الخ [۲]‘‘ یعنی تم احمق آدمی ہوکیاتم اللہ کی کتاب قرآن کریم میں یہ صراحت پاتے ہوکہ ظہر (کی فرض نماز) میں چاررکعات ہیں اوران میں قرأت سرّا ہے، پھرانھوں نے نماز کیساتھ زکوۃ وغیرہ کوبھی اسی طرح گنوایا، یعنی قرآن کریم میں شریعت کے احکام اجمالی طور پربیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیلات احادیث میں ہیں، لہٰذا قرآن پرعمل احادیث کے بغیر ہرگزنہیں ہوسکتا۔

وَكَانَ كِتَابُ الْمَصَابِيْحِ الَّذِىْ صَنَّفَهُ الإمامُ مُحيِ السُّنَّةِ قَامِعُ الْبِدْعَةِ، أَبُوْمُحَمَّدٍ نِالْحُسَيْنُ ابْنُ مَسْعُوْدٍ نِالْفَرَّاءِ الْبَغوِيُّ رَفَعَ اللّٰهُ دَرَجتَهُ أَجْمَعَ كِتَابٍ صُنِّفَ فِيْ بَابِهٖ، وَأَضْبَطَ لِشَوَارِدِ الاَحَادِيْثِ وَأَوَابِدِهَا.

ولَمّا سَلَكَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ طَرِيْقَ الاخْتِصَارِ، وحَذَفَ الأَسَانِيْدَ، تكلَّمَ فِيْهِ بَعْضُ النُّقَّادِ، وَإِنْ كَانَ نَقْلُهُ– وإنَّه مِنَ الثِّقَاتِ– كَالإِسْنَادِ، لكِنْ لَيْسَ مَافِيْهِ أَعلامٌ كَالاغْفَالِ، فَاسْتَخَرْتُ اللّٰهَ تعالىٰ، وَاسْتَوْفَقْتُ مِنْهُ، فَأَعْلَمْتُ ماأَغْفَلَهُ، فَأَوْدَعْتُ كُلَّ حَدِيثٍ مِنْهُ في مَقَرِّهٖ، كما رَوَاهُ الأئِمَّةُ الْمُتْقِنُوْنَ، والثِّقَاتُ الرَّاسِخُونَ، مِثْلُ أَبِي عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ إِسْمَاعِيْلَ الْبُخَارِيِّ، وَأَبِيْ الْحُسَيْنِ مُسْلِمِ بْنِ الحَجَّاجِ القُشَيْرِيِّ، وأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مَالِكِ بْنِ أَنسٍ الأَصْبَحِيِّ، وأَبِي عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ إِدْرِيْس الشَّافِعِيِّ، وَأَبِي عَبْدِاللّٰهِ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ حَنْبَلِ نِالشَّيْبَانِيِّ، وَأَبِيْ عِيْسىٰ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسىٰ التِّرْمِذِيِّ، وَأَبِي دَاوُدَ سُلَيْمَانَ بن الأشعثِ السِّجِسْتَانِيِّ، وأبي عبدِالرَّحْمٰنِ أَحْمَدَ بْنِ شُعَيْبِ النَّسَائِيِّ، وَأَبِيْ عَبْدِاللّٰهِ مُحَمَّدِ بْنِ يَزِيْدَ بْنِ مَاجه القَزْوِيْنِيِّ، وَأَبِيْ مُحَمَّدٍ

(۱) ترمذی شریف ۲/۱۱۸، باب ماجاء فی فضل القرآن ،ابواب فضائل القرآن.

(۲) انظر: الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱/۱۸.

عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ الدَّارِمِيِّ،وَأَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ عُمَرَالدَّارَقُطْنِيِّ، وَأَبِيْ بَكْرٍأَحْمَدَ بْنِ حُسَيْنِ الْبَيْهَقِيِّ وَأَبِي الْحَسَنِ رَزِيْنِ بنِ مُعَاوِيَةَ العَبْدَرِيِّ وغَيْرِهِم وقَلِيْلٌ مَّاهُوَ.

ترجمه:-اور''کتاب المصابیح''جس کو امام محی السنۃ قامع البدعۃ ابومحمد حسین ابن مسعود الفراء البغوی،-اللہ ان کے درجات کو بلند فرمائے-نے تصنیف کیا تھا،اپنے موضوع پر تصنیف کی گئی کتابوں میں جامع ترین کتاب ہے اورنادر ومشکل المعنیٰ احادیث اس میں سب سے زیادہ درج کی گئی ہیں،مگر چونکہ(اس میں) مصنفؒ نے (نقل حدیث کے وقت) اختصار کے طریقہ کو اختیار کیا، اور سندوں کو حذف کردیا تو اس پر بعض ناقدین نے اعتراض کیا، اگرچہ مصنف کا حدیث کو بغیر سند کے نقل کرنا ایسا ہے جیسے سند کو ذکر کرنا؛ کیونکہ وہ ثقہ اور معتمد محدثین میں سے ہیں،لیکن پھر بھی بے نشان چیز اس چیز کے درجہ میں نہیں ہوتی جس میں نشان ہو؛اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ شانہ سے خیر وتوفیق طلب کی اورمیں نے نشان لگادیا ان چیزوں پر جن کو امام بغویؒ نے بے نشان چھوڑ دیا تھا، اورمیں نے ہرحدیث کو اس کی جگہ (باب) میں رکھا اس کے مطابق جیسا کہ اس کو متقن، ثقہ اورراسخ علماء ومحدثین مثلاً امام بخاری، مسلم، مالک، شافعی، محمد بن احمد بن حنبل شیبانی، ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی اور رزین بن معاویہ عبدری رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے ان ائمہ ومحدثین کے علاوہ کچھ دوسرے محدثین بھی ہیں (جن کی کتابوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں) مگران کی تعداد بہت کم ہے۔

تشریح عبارت

وجہِ تالیفِ کتاب:

وکان کتاب المصابیح الخ: یہاں سے کتاب کی وجہ تالیف بیان کی گئی ہے،فرماتے ہیں کہ امام محی السنۃ علامہ بغوی کی کتاب ''مصابیح السنۃ'' فن حدیث میں سب سے زیادہ جامع کتاب تھی، کیونکہ احادیثِ احکام کتب اصول میں منتشر ومتفرق تھیں،ہرکس وناکس کو ان کے مواقع اورمظان کا علم نہیں تھا، امام بغویؒ نے ان احادیث کو ایک خاص ترتیب سے جمع فرمایا،اسی طرح وہ احادیث جومشکل المعنیٰ تھیں اوران کی

مراد واضح نہیں تھی ان کو بھی بطور خاص مصنفؒ نے اس کتاب میں جمع فرمایا اور ترجمۃ الباب کے ذریعہ ان کی مراد واضح فرمائی، نیز انھوں نے کتب حدیث میں سے منتخب کر کے ایسی اہم روایات کو بھی ''مصابیح السنۃ'' میں درج فرمادیا جن سے طالبین میں داعیۂ عمل پیدا ہو، اور سالکین کے منازل ومدارج میں ترقی ہو، اس لحاظ سے امام بغوی کی ''مصابیح السنۃ'' حدیث کی نہایت جامع ومفید کتاب تھی، مگر اس میں مصنفؒ نے کچھ اختصار سے کام لیا تھا، چنانچہ حدیث کی سند ذکر نہیں کی گئی، اس کے مصادر اور مراجع کو بیان نہیں کیا گیا، نیز بہت سے مقامات پر متن میں بھی اختصار کردیا، جبکہ مقام کا تقاضہ تھا کہ حدیث کا مکمل متن مذکور ہو، اس وجہ سے بہت سے اہل علم نے اس کے طرز پر اشکال فرمایا اور اس کی ترتیب پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس فرمائی، مصنفؒ اور ان کے استاذ علامہ طیبیؒ نے اس بارے میں باہم مشورہ کیا اور طے کیا کہ کتاب پر نظر ثانی کر کے اس کو از سر نو مرتب کیا جائے اور جو خامیاں ہیں ان کی تلافی کی جائے اس طرح یہ کتاب منصۂ مشہود پر آئی۔

شوارد الاحادیث: جمع ہے ''شاردۃ'' کی، بمعنی بھاگنے والی اونٹنی، بہت سی احادیث کتب اصول میں موجود تھیں، لیکن طلباء کو ان کے مواقع معلوم نہ تھے، گویا کہ وہ احادیث طلبہ کے لئے بھاگے ہوئے اونٹ کی طرح تھیں، ''مصابیح السنۃ'' میں وہ روایات خاص ترتیب سے آنے کی وجہ سے طلباء کو معلوم ہوگئیں، گویا بھاگنے والا اونٹ قابو میں آ گیا۔

أوابدها: جمع ہے ''آبدۃٌ'' کی، بمعنی وحشی جانور، جیسے نیل گائے، ہرن وغیرہ، جو انسان کو دیکھ کر بدکتے ہیں اور انسانوں کے لئے غیر مانوس ہیں، مطلب یہ ہے کہ بہت سی احادیث طلبہ کو اگرچہ معلوم تھیں لیکن انکی دلالت اپنے معنی مرادی پر واضح نہیں تھی، گویا وہ احادیث طلباء کے لئے مانوس نہ تھیں، امام بغوی جب ان کو مناسب باب میں لے آئے تو ان کی دلالت معنی مرادی پر واضح ہوگئی اور وہ احادیث طلبہ کیلئے مانوس ہوگئیں، مثلاً کوئی حدیث نواقض وضوء سے متعلق ہے، لیکن اس کا مضمون صراحۃً ناقض وضو کا نہیں ہے، امام بغوی نے اس کو نواقض وضوء کے باب میں بیان کیا تو طلبہ کو معلوم ہوگیا کہ یہ حدیث نواقض وضوء سے متعلق ہے۔

تکلم فیه بعض النقاد الخ: اس جملہ میں شراح کے درمیان یہ بحث چھڑی ہے کہ ''فیہ'' کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ ملا علی قاری کی تشریح کے مطابق اس کا مرجع ''مصابیح السنۃ'' کی بعض احادیث ہیں، گویا عبارت یوں ہے ''**تکلم أي طعن فی بعض أحادیث کتابه باعتبار ذلک الحذف**'' جس کا مطلب یہ ہے کہ مصابیح السنۃ میں احادیث کی سند محذوف ہونے کی وجہ سے اس کی بعض حدیثوں پر اعتراض ہوا۔

اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ اعتراض تو سند کے راویوں کی وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ راوی غیر معتبر ہونے کی وجہ سے روایت قابل اعتراض ہوتی ہے، سند کو ذکر کرنے یا نہ کرنے سے اس پر فرق نہیں پڑتا، پھر حذفِ اسانید کو اعتراض کی بناء قرار دینا کہاں صحیح ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض روایات میں سند کا محذوف ہونا بھی اعتراض کا ذریعہ بن جاتا ہے مثلاً روایت کی سند، دو ہوں ایک صحیح دوسری غیر صحیح، اگر اس کی صحیح سند کو بیان کردیا جائے تو طالب کو تسلی ہو جائے گی، اگر سند مطلقاً حذف کردی جائے تو جس شخص کے علم میں محض دوسری (ضعیف) سند ہے وہ اس روایت کو ضعیف سمجھ کر اعتراض کرے گا، مثلاً حدیث "المرأ علی دین خلیله" جو مشکوٰۃ شریف [1] میں بھی آئی ہے، سراج الدین القزوینی نے اس کو موضوع کہا ہے، امام ترمذی نے حسن کہا ہے اور امام نووی نے صحیح کہا ہے، اگر اس کو بغیر سند کے ذکر کیا جائے تو جس شخص نے محض سراج الدین قزوینی کا کلام دیکھا ہوگا وہ اس کو موضوع قرار دے کر اعتراض کرے گا۔[2]

وان کان نقله وانه من الثقات کالاسناد الخ: فرماتے ہیں کہ امام بغوی اگرچہ بڑے ثقہ ہیں اور انکی شخصیت بہت معتمد ہے، ان کا بغیر سند کے روایات کو نقل کرنا ذکرِ سند کے درجہ میں ہے کہ ایسا قابلِ اعتماد شخص غیر معتبر روایات کو نقل نہیں کرے گا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ "**لیس مافیه اعلام کالأغفال**" یعنی بغیر نشان والی زمین نشان والی زمین کے برابر نہیں ہوتی۔ "**اعلام**" "علَم" کی جمع ہے بمعنی نشان والی زمین اور "**اغفال**" "غفل کی جمع ہے بمعنی بے نشان زمین۔

وضاحت اس کی یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں مسافر آدمی اپنی منزل پر پہنچنے کے لئے بیابان جنگلوں کی مسافت کو قطع کرتا تھا، ان جنگلات میں بعض راستوں میں نشانات بنے ہوتے تھے جس کی وجہ سے مسافر بھٹکتا نہیں تھا، اور بعض راستوں میں راہنمائی کے ایسے نشانات نہیں ہوتے تھے ان میں بھٹکنے کا قوی احتمال رہتا تھا، امام بغویؒ نے بھی "مصابیح السنۃ" میں چونکہ سندوں کا اور مصادر و مأخذ کا ذکر نہیں کیا، جس کی وجہ سے اس کا حال بھی اس بے نشان راستہ کا ہوگیا جس میں راہرو کے بھٹکنے کا امکان رہتا ہے۔

مشکوۃ المصابیح کا طرزِ تالیف:

فاستخرت الله تعالیٰ الخ: یہاں سے کتاب کی ترتیب اور طرز تالیف اور ان تغیرات کا بیان ہے

(۱) مشکوۃ ص ٤٢٧.

(۲) دیکھئے: مرقاۃ شرح مشکاۃ ۷ / ۲۲٤ ترمذی شریف ۲ / ٦٣ (۲۳٦۸)

جومصنف علامہ نے مصابیح السنہ میں فرمائے ہیں، فرماتے ہیں کہ: میں نے اس سلسلہ میں استخارہ کیا اور اللہ سے توفیق مانگی، چنانچہ اللہ پر بھروسہ کرکے مصابیح السنۃ پر نئی ترتیب سے کام شروع کیا، اور اس نئی ترتیب میں ایک اہم کام یہ کیا کہ ہر حدیث کے شروع میں روایت کرنے والے صحابی کا نام اور آخر میں اس کی تخریج کرنے والے امام (محدث) کا نام بیان کردیا جس سے حدیث شریف کا اصل حوالہ معلوم ہوگیا، البتہ اس نئی ترتیب میں مصابیح السنۃ کی اصل ترتیب کو باقی رکھا، چنانچہ مصابیح السنۃ میں جو حدیث جس کتاب اور جس باب کے تحت بیان کی گئی تھی نئی ترتیب (مشکوۃ) میں بھی اس حدیث کو اسی کتاب اور اسی باب کے تحت درج کیا گیا۔

یہاں مصنفؒ نے دو جملے ذکر کئے ہیں: ''**فأعلمتُ ماأغفلَهُ**'' اور ''**فاودعتُ کلَ حدیث الخ**'' مشکوۃ شریف کے نسخے ان دو جملوں کی تقدیم وتاخیر کے بارے میں مختلف ہیں، اکثر نسخوں میں ''**فاعلمت**'' مقدم ہے اور ''**فاودعت**'' اس کے بعد ہے، لیکن اس صورت میں اس جملہ کا آئندہ مذکور عبارت ''**کمارواہ الأئمہ**'' سے ارتباط صحیح نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ اس صورت میں ظاہری مطلب یہ ہوتا ہے کہ مصابیح السنۃ اور مشکوۃ میں احادیث کی وضع وترتیب میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے، یہ ان ائمہ حدیث کی ترتیب کے مطابق ہے جن کے نام صاحب مشکوۃ بعد کی عبارت میں بیان کررہے ہیں، حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے، ترتیب کا ان حضرات سے کوئی تعلق نہیں، یہ ترتیب تو صاحب مشکوۃ کی اپنی اختیار کردہ ہے۔

اور ''**مرقاۃ**'' اور ''**التعلیق الصبیح**'' میں مشکوۃ شریف کا جو نسخہ لیا گیا ہے اس میں ''**فاودعت**'' پہلے ہے اور ''**فاعلمت**'' بعد میں، اس صورت میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ میں نے حدیث کے شروع میں روایت کرنے والے صحابی کا نام اور حدیث کے آخر میں تخریج کرنے والے امام کا نام اس کے مطابق لکھا جس طرح ائمۂ حدیث نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، یہ مطلب بالکل درست ہے اس لیے یہی نسخہ راجح ہے، موجودہ متداول نسخہ جس میں **فاعلمت** مقدم ہے مرجوح ہے۔

کمارواہ الأئمۃ المتقنون الخ: یہ ان ائمہ متقنین کا تذکرہ ہے جن سے مشکوۃ میں احادیث لی گئی ہیں: ہم ان کتابوں اور ان کے مصنفین کا تذکرہ ''مقدمہ میں'' ماخذ مشکوۃ'' کے عنوان کے تحت کرچکے ہیں۔

وقلیلٌ ماھو الخ: یعنی مذکورہ مصنفین کے علاوہ جن سے اس کتاب میں روایات لی ہیں وہ مصنفین کم ہیں، مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مصنفین کی روایات بکثرت اس کتاب میں ذکر کی گئی ہیں اور ان کے علاوہ مصنفین سے لی گئی روایات کی تعداد قلیل ہے، چنانچہ بعض مصنفین سے صرف ایک دو روایات لی گئی ہیں۔

وإنِّي إذا نَسبْتُ الحَدِيثَ إلَيهِمْ كَأنِّي أسْنَدْتُ إلى النَبِيّ صلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسلَّمَ؛ لأنَّهُمْ قَدْ فَرَغُوا مِنهُ، وأغنَونَا عَنهُ، وَسَرَدْتُ الكُتُبَ وَالأبْوابَ كَماسَرَدَهَا، واقْتَفَيْتُ أثرَهُ فِيهَا، وَقَسَّمْتُ كلَّ بَابٍ غَالِباً عَلىٰ فُصُولٍ ثلاثةٍ: أوَّلُها ماأخْرَجَهُ الشَّيْخَانِ أوْأحَدُهُمَا، وَاكْتَفَيْتُ بِهِمَا وَإنِ اشْتَرَكَ فِيهِ الغَيرُ؛ لِعُلُوِّ دَرَجَتِهِمَا فِي الرِّوَايَةِ.

وَثَانِيهَا: مَاأوْرَدَهُ غَيرُهُمَا مِنَ الأئمَّةِ المَذْكُورِينَ.

وَثَالِثُهَا: مَااشْتَمَلَ علىٰ مَعْنَى البَابِ مِنْ مُلْحَقاتٍ مُنَاسِبَةٍ مَعَ مُحَافَظَةٍ عَلَى الشَّرِيْطَةِ؛وَإنْ كَانَ مَأثُوراً عَنِ السَّلَفِ والخَلَفِ.

ترجمہ: -اور جب میں نسبت کروں حدیث شریف کی ان ائمہ ومحدثین کی طرف، تو گویا میں نے اس کی سند پہنچادی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک؛ کیونکہ ان حضرات نے اپنی کتابوں میں سند بیان فرمادی ہے اور ہم کو اس سے مستغنی کردیا ہے، اور میں نے کتب وابواب کی ترتیب وہی رکھی جو صاحب مصابیح علامہ بغویؒ نے رکھی تھی، اور اس سلسلہ میں ان ہی کے نقش قدم کی میں نے پیروی کی ہے اور میں نے ہر باب کو عموماً تین فصلوں پر تقسیم کیا ہے، پہلی فصل ان روایتوں کے لئے ہے جن کو حضرت امام بخاری ومسلم دونوں یا کسی ایک نے اپنی سند سے ذکر فرمایا ہے اگرچہ ان حدیثوں میں بعض ایسی بھی تھیں جن کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے (لیکن اس فصل میں صرف حضرات شیخینؒ کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے) کیونکہ روایت کے سلسلہ میں حضرات شیخینؒ کا درجہ تمام محدثین سے بلند ہے، اور دوسری فصل میں وہ احادیث نقل کی ہیں جن کو حضرات شیخینؒ کے علاوہ دوسرے مذکورہ ائمہ میں سے کسی اور نے روایت کیا ہے، اور تیسری فصل میں احادیث کے علاوہ صحابہ وتابعین کے ان اقوال وآثار کو بھی جمع کیا گیا ہے جو باب کے مناسب اور لائق تھے (لیکن ان کی نقل میں بھی) مذکورہ شرائط کی رعایت کی گئی ہے۔

تشریح عبارت

ایک اشکال وجواب:

وإني إذانسبت الحديث الخ: -یہ ایک اعتراض کا جواب ہے، وہ یہ کہ اس کتاب میں جیسا کہ

مصنفؒ نے فرمایا حدیث کا ماخذ اورناقلِ حدیث صحابی کے تذکرہ کا اہتمام کیا گیاہے، مگرسوال یہ ہے کہ حدیث کی مکمل سند تواس میں بھی ذکرنہیں کی گئی ہے، حالانکہ اسی وجہ سے امام بغوی پر اعتراض ہواتھا،پس حذف اسناد جو بناءِ اعتراض تھی وہ یہاں بھی موجود ہے؟

علامہ تبریزیؒ اس کا جواب دیتے ہیں کہ میں نے حدیث نقل کرنے کے بعد اس کی نسبت ان ائمہ متقنین کی طرف کردی ہے جن کی کتابیں اپنے مصنفین کے نام سے معروف ومشہور ہیں، اوران کتابوں میں اس حدیث کی مکمل سند مذکورہے، پس یہ ایساہوگیا گویا میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی سند ذکرکردی، کیونکہ وہ حضرات اس حدیث کی مکمل سند لکھ چکے ہیں، لہٰذا اب ہمیں سند کے بیان کی حاجت نہیں۔

وسردت الکتب الخ: علامہ فرماتے ہیں کہ چونکہ مصابیح السنۃ کی ترتیب اورتبویب نہایت مناسب اورعمدہ تھی اس لئے اس میں کوئی تغیروتبدل نہیں کیا گیا اوراس بارے میں صاحب مصابیح کی مکمل اتباع کرتے ہوئے کتب وابواب کواسی کے طرز اورترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

مصابیح السنۃ اورمشکوۃ المصابیح میں فرق:

وقسمت کل باب غالباً الخ :- یہاں سے مصابیح السنہ اورمشکوۃ کے مابین وجوہ فرق کا بیان ہے،اس بارے میں دوفرق ماقبل میں آگئے ،ایک ذکرصحابی اوردوسرا بیان ماخذ جیسا کہ ’’**فأعلمت ماأغفله**‘‘ اور’’**إذانسبت الحدیث الیهم**‘‘ سے یہ دونوں باتیں مفہوم ہوئیں۔

اس عبارت میں مزید تین فرق مذکور ہیں، چنانچہ تیسرا فرق ہے: تبدیل عنوان، یعنی امام بغوی نے مصابیح السنہ میں دوعنوان ’’الصحاح‘‘ اور’’الحسان‘‘ قائم فرمائے تھے، اور’’ الصحاح‘‘ کے تحت صحیحین کی اور’’الحسان‘‘ کے تحت سنن خمسہ: ترمذی ابوداؤد ،نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایات کو ذکر کیا گیا تھا،مگر مشکوۃ شریف میں ’’الصحاح‘‘ کی جگہ’’ الفصل الاول‘‘ اور’’الحسان‘‘ کی جگہ’’ الفصل الثانی‘‘ کاعنوان قائم کیا گیا، نیزفصل اول کی احادیث کے لئے صرف شیخین کے حوالہ پراکتفاء کیا گیا اگرچہ مذکورہ ائمہ میں سے دیگر حضرات نے بھی اس کو روایت کیاہو، اس لئے کہ شیخین کا درجہ باقی ائمہ حدیث سے بڑھاہواہے، لہٰذا ان کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔

چوتھا فرق ہے: اضافۂ فصل ثالث، علامہ خطیب تبریزی نے مشکوۃ شریف میں فصل ثالث کا اضافہ

کیااور باب کی مناسبت سے اس میں بہت سی احادیث ذکرفرمائیں،اس طرح پندرہ سوگیارہ (۱۵۱۱) احادیث کا مشکوۃ شریف میں اضافہ کیا گیا،پھران اضافہ شدہ احادیث میں بھی وہ شرط واہتمام ملحوظ رکھا گیاجوفصل اول اورثانی میں رکھا گیاتھا،یعنی فصل ثالث میں بھی اول وثانی کی طرح راویِ حدیث صحابی کانام اور ماخذ حدیث ذکرکیا گیاہے۔

پانچواں فرق:اتیان احادیث موقوفہ ومقطوعہ،مصنف فصل ثالث میں احادیث مرفوعہ کی طرح احادیث موقوفہ ومقطوعہ کوبھی اصالۃً لاتے ہیں مصابیح السنۃ میں موقوف ومقطوع روایات اصالۃً ذکرنہیں کی گئی تھیں۔

عبارت میں مذکور''سلف وخلف'' سے مرادصحابہ اورتابعین ہیں صحابی کی حدیث ''موقوف'' کہلاتی ہے اورتابعین کی ''مقطوع''،''سلف وخلف'' کایہی مفہوم راجح ہے،بعض نے ''سلف'' سے قرون ثلاثہ کے حضرات اور''خلف'' سے ان کے بعد کے حضرات مراد لئے ہیں،لیکن مصنف کے کلام میں یہ اصطلاح مراد نہیں؛کیونکہ فصل ثالث میں تابعین کے بعدوالوں کی روایات نہیں ہیں۔

ثُمَّ إِنَّکَ إِن فَقَدْتَّ حَدِيْثاً فِيْ بَابٍ؛ فَذٰلِکَ عَنْ تَكْرِيرٍ أُسْقِطُهُ، وَإِنْ وَجَدْتَّ آخَرَ بَعْضَهُ مَتْرُوْكاً عَلَىٰ اخْتِصَارِهٖ، أَومَضْمُوْماً إِلَيْهِ تَمَامُهُ؛ فَعَنْ دَاعِيْ اِهْتِمَامٍ أَتْرُكُهُ وَأُلْحِقُهُ، وَإِنْ عَثَرْتَ عَلٰى اخْتِلافٍ فِي الْفَصْلَيْنِ مِنْ ذِكْرِغَيْرِالشَّيْخَيْنِ فِي الْأَوَّلِ وَذِكْرِهِمَا فِي الثَّانِيْ؛ فَاعْلَمْ أَنِّي بَعْدَ تَتَبُّعِيْ كِتَابَيِ ''اَلْجَمْعِ بَيْنَ الصَّحِيْحَيْنِ''لِلْحُمَيْدِيِّ وَ''جَامِعِ الْأُصُوْلِ'' اِعْتَمَدْتُ عَلٰى صَحِيْحَيِ الشَّيْخَيْنِ وَمَتْنَيْهِمَا.

ترجمہ:-پھرتحقیق کہ اے مخاطب اگرکسی باب میں کوئی حدیث تو نہ پائے تو(یہ سمجھا جائے کہ) میں نے تکرار کی وجہ سے اس کو ساقط کردیا (یعنی نقل نہیں کیا) اوراگر پاؤتم کسی حدیث کو کہ اس کا بعض حصہ اختصارکی وجہ سے حذف کردیا گیاہے یا اس میں بقیہ حصہ شامل کرکے اس حدیث کی تکمیل کردی گئی ہےتویہ حذف کرنا اورتکمیل کرناخاص مقصد کے تحت ہے، اوراگرتم دونوں فصلوں میں اختلاف پرمطلع ہویعنی فصل اول میں غیرشیخین کی احادیث ذکرہوں اورفصل ثانی میں شیخین کی احادیث، توجان لیجئے کہ (یہ اختلاف غلطی اورغفلت کی وجہ سے نہیں ہواہے)؛ بلکہ یہ میں نے حمیدی کی کتاب''الجمع بین الصحیحین''اور(ابن الاثیرکی)

کتاب ''جامع الاصول ''میں خوب تلاش وتحقیق کے بعد کیا ہے، اوراس سلسلہ میں میں نے (مصابیح السنۃ کے بجائے) بخاری ومسلم کے صحیح اوراصل نسخوں اوران کے متن پراعتماد کیا ہے۔

تشریح عبارت

ثم إنک إن فقدت حدیثا الخ: یہ چھٹا فرق ہے حذفِ تکرار: یعنی یہ کہ مصابیح السنہ میں بہت سی احادیث مکرر تھیں، علامہ خطیب تبریزی نے ایسی حدیث کوکسی ایک جگہ ذکرکیا اور باقی مقامات سے اس کوحذف کردیا، البتہ جن مقامات سے حذف کیاوہاں حوالہ دے دیا کہ ہم نے اس روایت کوفلاں باب میں ذکرکردیا ہے۔

وان وجدت آخر بعضہ الخ: یہ ساتواں فرق ہے: اختصارِ حدیث، یعنی امام بغوی نے بعض احادیث کوبہت طوالت کے ساتھ ذکرکیا تھا، حالانکہ باب کے مناسب اس کاصرف بعض حصہ تھا، علامہ تبریزیؒ نے جوحصہ باب کے مناسب نہ تھا اسکوحذف کرکے حدیث کومختصر کردیا۔''بعضہ'' ''آخر'' سے بدل بعض ہے۔

اومضموما الیہ تمامہ الخ :- یہ آٹھواں فرق ہے: تکمیل حدیث ،امام بغوی نے بعض احادیث کومختصراً ذکرکیا اوربعض حصہ کوچھوڑدیا تھا حالانکہ چھوڑا ہوا حصہ بھی باب کے مناسب تھا اوربغیراس کے حدیث کامطلب سمجھنا بھی دشوارتھا، صاحب مشکوۃ نے اس باقی حصہ کو ذکرکرکے حدیث کومکمل فرمادیا، مصنف فرماتے ہیں کہ یہ دونوں کام یعنی اختصارحدیث وتکمیل حدیث کسی وجہ وباعث کی بناپر کئے گئے، اور وجہ وہی ہے جوذکرکی گئی۔

وان عثرت علی اختلاف فی الفصلین الخ :- یہ نواں فرق ہے: تبدیل حوالہ، اس کا حاصل یہ ہے جیساکہ پہلے آچکا کہ امام بغویؒ مصابیح السنۃ کی فصل اول میں صحیحین کی اورفصل ثانی میں سنن خمسہ کی روایات لاتے ہیں اورعلامہ خطیب تبریزی اسی کے مطابق حوالہ بھی تحریرفرماتے ہیں،البتہ بعض مرتبہ فصل اول کی کسی روایت کے لئے بجائے صحیحین کے سنن کا حوالہ دیتے ہیں، اوریہ اس وقت ہوتاہے جبکہ وہ روایت صحیحین میں نہ ملے، مگرنہ ملنے کی وجہ تتبع وتلاش کی کمی نہیں،کیونکہ صاحب مشکوٰۃ نے تتبع وتلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، چنانچہ اپنے تتبع کے طرز کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں ایسے موقع پراس حدیث کواولاً امام حمیدی کی ''الجمع بین الصحیحین ''میں، اورعلامہ ابن الاثیرجزری کی ''جامع

الاصــول ‘‘ میں تلاش کرتا ہوں؛ کیونکہ ان دونوں کتابوں میں صحیحین کی روایات کو سند کے بغیر اور مکررات کو حذف کر کے جمع کیا گیا ہے، نیز جامع الاصول میں صحیحین کے ساتھ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور موطا مالک کی روایات کو بھی جمع فرمایا گیا ہے، جب وہ حدیث ان دونوں کتابوں میں نہیں مل سکی تو محض ان میں تلاش پر اکتفاء نہیں کیا؛ کیونکہ ممکن ہے کہ امام حمیدی اور علامہ جزری کو نقل کرنے میں سہو ہو گیا ہو، اور وہ روایت ان حضرات سے نقل کرنے میں رہ گئی ہو، اس لئے پھر میں نے بخاری، مسلم کے اصل نسخوں کو اور ان کتابوں کے متون کو غور سے اور گہری نظر سے دیکھا، خود بخاری، مسلم میں بھی جب وہ روایت نہیں ملی تو پھر کامل وثوق ہو گیا کہ یہ روایت صحیحین میں نہیں ہے، اس کمال تتبع کے بعد میں نے اس روایت کے لئے غیر صحیحین کا حوالہ دیا۔

مصنفؒ کے کلام میں ’’إعتمدت‘‘ کا مطلب یہی ہے کہ اس روایت کی صحیحین کی طرف نسبت نہ کرنے میں میں نے خود صحیحین کو بہ نظر عمیق دیکھنے پر اعتماد کیا، محض ’’جمعین‘‘ میں نظر ڈالنے پر اکتفاء نہیں کیا۔

کبھی اس کا برعکس ہوتا ہے کہ فصل ثانی کی حدیث صحیحین میں مل گئی، اس وقت اس کے لئے سنن کے بجائے صحیحین کا حوالہ دیتے ہیں۔

وإِنْ رَأَيْتَ اخْتِلافاً فِي نَفْسِ الْحَدِيْثِ فَذٰلِکَ مِنْ تَشَعُّبِ طُرُقِ الْأَحَادِيْثِ، وَلَعَلِّي مَااطَّلَعْتُ عَلٰى تِلْکَ الرِّوَايَةِ الَّتِي سَلَكَهَا الشَّيْخُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، وَقَلِيْلاً مَّاتَجِدُ أَقُوْلُ مَاوَجَدْتُّ هٰذِهِ الرِّوَايَةَ فِيْ كُتُبِ الْأُصُوْلِ أَوْوَجَدْتُّ خِلافَهَا فِيْهَا، فَإِذَا وَقَفْتَ عَلَيْهِ فَانْسُبِ الْقُصُوْرَإِلَيَّ لِقِلَّةِ الدِّرَايَةِ، لاإِلٰى جَنَابِ الشَّيْخِ رَفَعَ اللّٰهُ قَدْرَهٗ فِي الدَّارَيْنِ، حَاشَالِلّٰه مِنْ ذٰلِکَ، رَحِمَ اللّٰهُ مَنْ إِذَا وَقَفَ عَلٰى ذٰلِکَ نَبَّهَنَا عَلَيْهِ، وَأَرْشَدَنَا طَرِيْقَ الصَّوَابِ. وَلَمْ آلُ جُهْداً فِي التَّنْقِيْرِ وَالتَّفْتِيْشِ بِقَدْرِالْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ، وَنَقَلْتُ ذٰلِکَ الاخْتِلافَ كَمَا وَجَدْتُّ، وَمَاأَشَارَ إِلَيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ غَرِيْبٍ أَوْضَعِيْفٍ أَوْغَيْرِهِمَا، بَيَّنْتُ وَجْهَه غَالِباً، وَمَالَمْ يُشِرْإِلَيْهِ مِمَّافِي الْأُصُوْلِ فَقَدْ قَفَّيْتُهٗ فِيْ تَرْكِهٖ إِلَّا فِيْ مَوَاضِعَ لِغَرَضٍ، وَرُبَّمَاتَجِدُ مَوَاضِعَ مُهْمَلَةً، وَذٰلِکَ حَيْثُ لَمْ أَطَّلِعْ عَلٰى رَاوِيْهِ فَتَرَكْتُ الْبَيَاضَ، فَإِنْ عَثَرْتَ عَلَيْهِ فَأَلْحِقْهُ بِهٖ، أَحْسَنَ اللّٰهُ جَزَاءَکَ.

ترجمہ:- اور اگر نفسِ حدیث میں آپ کو اختلاف نظر آئے، تو یہ حدیث کی سندیں مختلف ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ میں اس روایت پر مطلع نہ ہوسکا ہوں جس کو شیخؒ نے

اختیار فرمایا ہے، اورایسا تم کو بہت کم ملے گا کہ میں نے کہا ہو کہ یہ روایت مجھے اصول کی کتابوں میں نہیں ملی ہے یااس کے خلاف ملی ہے؛ (جومصابیح السنہ میں ہے) اگرایسا ملے تو قصور کی نسبت کم علمی کے سبب میری طرف کیجئے نہ کہ شیخ (رفع اللہ قدرہ فی الدارین) کی طرف، ان کو اس سے منزہ سمجھا جائے (پھرکسی وقت) وہ روایت مل جائے تو اللہ سبحانہ وتعالی رحم فرمائے اس شخص پر جسے وہ روایت معلوم ہواورہمیں مطلع کرے اوردرستگی کاراستہ دکھائے، اورمیں نے تحقیق وتدقیق اورتلاش وجستجو میں یعنی وسعت وطاقت کے مطابق کوشش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، اوریہ اختلاف جیساپایا ویسا ہی نقل کردیا، اورجن احادیث کی طرف حضرت شیخؒ (علامہ بغوی) نے ضعیف یاغریب ہونے کا اشارہ فرمایاہے میں نے ان کا سبب بیان کردیاہے، اورجن احادیث (اسنادی حیثیت) کی جانب شیخ نے کوئی اشارہ نہیں فرمایا، تومیں نے بھی شیخ کی پیروی کرتے ہوئے اسے چھوڑدیا مگربعض مقامات پرمیں نے کسی مقصد سے توضیح کردی ہے۔

اورکچھ مقام ایسے بھی آپ کوملیں گے کہ جہاں حدیث کے بعد کتاب کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے کیونکہ باوجود تحقیق وتلاش کے میں راوی پرمطلع نہیں ہوسکا، لہٰذا وہ جگہ میں نے خالی چھوڑدی ہے پس اگرتم کواس کا حوالہ مل جائے تو اس کو خالی جگہ میں شامل کردینا، اللہ تمہیں جزاء خیر عطاء فرمائے۔

تشریح عبارت

وان رأیت اختلافا الخ:- دسواں فرق ہے: اختلاف متن، بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ امام بغوی نے مصابیح السنہ میں حدیث کے جوالفاظ ذکر کئے ہیں صاحب مشکوۃ کووہ الفاظ نہیں ملے، بلکہ دوسرے الفاظ ملے، مصنف کوجوالفاظ ملے انہوں نے مشکوۃ میں انہیں الفاظ کے ساتھ حدیث نقل فرمائی، اس اختلاف کی وجہ تعددِ اسناد ہے کہ سندوں کے مختلف ہونے سے الفاظ بھی بدل جاتے ہیں، امام بغوی کے سامنے جوسند تھی وہ ہمیں نہیں مل سکی، لہٰذا اس میں کسی کی کوتاہی نہیں ہے۔

وقلیلا ماتجد اقول الخ:- گیارھواں فرق: عدم وجدان فی کتب الأصول، بعض مرتبہ مصابیح السنہ کی حدیث صاحب مشکوۃ کوکتب اصول سبعہ میں کہیں نہیں ملتی ہے تو اس وقت جہاں سے ملتی ہے اس کا حوالہ دیتے ہیں اورفرماتے ہیں "ماوجدتُ هذه الروايةَ في كتبِ الأصول" اورکبھی مصابیح السنہ کی کوئی

حدیث مصنف کو اس کے برعکس ملتی ہے جوامام بغوی نے نقل کی ہے اس وقت مصنف حدیث کو اس طرح نقل فرماتے ہیں جس طرح ان کو ملی ہے اور پھر یوں کہتے ہیں ''وجدتُ خلافَها في كتب الأصول''

اس کے متعلق نہایت ادب کالحاظ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ میرے تتبع وتلاش کی کمی ہے اس میں شیخ کا قصور نہیں، حاشا وکلا وہ اس قصور سے بری ہیں، میں نے بہت جستجو اور تلاش کی مگر جب اصولِ سبعہ میں وہ روایت نہیں ملی یا برعکس ملی، تو جس طرح اختلاف پایا اس کا اظہار کرکے اسی طرح نقل کردیا، اگر کسی شخص کو وہ روایت صاحب مصابیح السنۃ کی نقل کے مطابق مل جائے تو وہ شخص میری زندگی میں مجھے مطلع کردے، اور میری وفات کے بعد اس کا حوالہ لکھ دے۔

''حاشا'' اسمائے افعال میں سے ہے بمعنیٰ مضارع ای أنزهه۔

وماأشار اليه رضي الله عنه الخ:- بارھواں فرق: بیان وجہ نوعیت حدیث، امام بغوی بعض احادیث کی نوعیت کو بیان کرتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے، غریب ہے وغیرہ، مگر اس کی وجہ بیان نہیں کرتے مگر میں اکثر وبیشتر اس کی وجہ بیان کردیتا ہوں، وجہ بیان کرنے سے مراد حوالہ دینا ہے، مثلاً یہ کہ امام ترمذی نے اس کو ضعیف کہا ہے وغیرہ، البتہ کہیں ضعیف وغیرہ کی وجہ کو بھی بتاتے ہیں۔

ومالم يشر إليه الخ:- تیرھواں فرق: بیان حیثیت فی بعض الحدیث، بعض احادیث کی حیثیت کتب اصول میں مذکور تھی یعنی ضعیف وغریب ہوناوغیرہ، مگر امام بغوی نے اسکی حیثیت کو بیان نہیں کیا تو میں بھی ان کی اتباع میں اس کی حیثیت بیان نہیں کرتا، لیکن بعض جگہ بیان کرتا ہوں اور ایسا کسی غرض کی وجہ سے ہوتا ہے وہ یہ کہ مثلاً مصابیح السنۃ کی بعض احادیث کو بعض لوگوں نے منکر کہا ہے، حالانکہ امام ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے وغیرہ، لہٰذا مصنف اس کی حیثیت بیان کرتے ہیں تا کہ ان لوگوں کا رد ہوجائے جنھوں نے اس کو منکر یا موضوع کہا ہے۔

وربماتجد مواضع مهملة الخ:- چودھواں فرق ترک بیاض، مصابیح السنہ کی بعض احادیث ایسی تھیں جو صاحب مشکوۃ کو کتب حدیث میں کہیں نہیں مل سکیں، اس وقت صاحب مشکوۃ حوالہ کی جگہ کو خالی چھوڑ دیتے ہیں، اس خالی جگہ کو بیاض کہا جاتا ہے، مصنف التماس کرتے ہیں کہ اگر کسی کو ان بیاضوں کا حوالہ مل جائے تو اس کو کتاب میں درج کردیں، پہلے بیاضیں زیادہ تھیں بعد میں شراح نے بہت سی بیاضوں کو پُر کیا ہے لیکن اب بھی چند بیاضیں باقی ہیں۔

وَسَمَّيْتُ الْكِتَابَ "بِـ مِشْكَاةِ الْمَصَابِيْحِ" وَأَسْأَلُ اللّٰهَ التَّوْفِيْقَ، وَالْإِعَانَةَ، وَالْهِدَايَةَ، وَالصِّيَانَةَ، وَتَيْسِيْرَ مَاأَقْصِدُهُ، وَأَنْ يَّنْفَعَنِيْ فِي الْحَيَاةِ وَبَعْدَالْمَمَاتِ، وَجَمِيْعَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ، حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ، وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِالْحَكِيْمِ .

ترجمه: اوراس کتاب کا نام میں نے مشکاۃ المصابیح رکھا ہے۔

اورمیں اللہ تعالیٰ شانہ سے ہی توفیق، مدد، ہدایت، حفاظت اوراپنے مقصد میں آسانی کے لئے دعاء کرتاہوں اوریہ کہ اللہ تعالیٰ شانہ زندگی میں اورمرنے کے بعد مجھے اور ہر مسلمان مرد اورعورت کونفع پہنچائے اوراللہ تعالیٰ ہی مجھ کو کافی ہے اور بہترین کارساز ہے اور برائی سے بچنے کی قوت اورنیک کام کرنے کی طاقت صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہے جوبڑا زبردست اورحکمت والا ہے۔

حدیث النیۃ

(۱)عَنْ عُمَرَبْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّمَاالْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ،وإِنَّمَالِامْرِئٍ مَّانَوىٰ؛ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُه إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِه فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِه، وَ مَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِامْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُها فَهِجْرَتُهُ إِلٰى مَاهَاجَرَ إِلَيْهِ. (متفق علیہ[1])

ترجمه:حضرت عمربن خطابؓ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ

(۱) أخرجه البخاری فی سبعة مواضع:باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱/ ۲ برقم۱، وكتاب الإيمان،باب ماجاء إن الأعمال بالنية والحسبة ولكل امرئ مانوى ۱/ ۱۳برقم٥٤ وكتاب العتق، باب الخطأ والنسيان فی العتاقة والطلاق ۱ / ۳٤۳ برقم ۲٤٦۰ وكتاب مناقب الأنصار، باب هجرة النبی صلى الله عليه وسلم وأصحابه إلى المدينة ۱ / ٥٥۱برقم ۳۷٦۰، وكتاب النكاح، باب من هاجر أوعمل خيراً لتزويج امرأة فله مانوى ۲ / ۷٥۹ برقم ٤۸۷۹، وكتاب الأيمان والنذور، باب النية في الأيمان۲ / ۹۸۹برقم ٦٤۳۳، وكتاب الحيل، باب فی ترک الحيل وإن لكل امرئ مانوى فی الأيمان۲ / ۱۰۲برقم ٦٦۸٥،ومسلم في الإمارة ۲ / ۱٤۰—۱٤۱.

علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: سوائے اس کے نہیں کہ اعمال کے حکم کا مدار نیت پر ہے اور سوائے اس کے نہیں کہ آدمی کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے، لہٰذا جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہی شمار ہوگی اور جس شخص کی ہجرت دنیا کے لئے ہو کہ اس کو حاصل کرلے یا کسی عورت کے لئے ہو کہ اس سے نکاح کرلے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے شمار ہوگی کہ جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے۔

تشریح حدیث

اب اصل کتاب کو شروع کیا جارہا ہے، اصل تو کتاب الایمان کو شروع کرنا تھا لیکن ایک خاص وجہ کی بناپر اس حدیث سے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے جس کا بیان آگے آرہا ہے۔

یہ حدیث بہت اہم ہے، اس سے متعلق چند مباحث ہیں: (۱) حدیث کی جلالت شان اور وجہ تقدیم، (۲) نوعیت حدیث، (۳) حدیث کا شان ورود، (۴) راویٔ حدیث کے مختصر حالات، (۵) اختلاف روایت فی الجملۃ الأولی، (۶) شرحِ کلماتِ حدیث۔

(۱) جلالت شان ووجہ تقدیم حدیث:

یہ حدیث حضرات محدثین کے یہاں انتہائی عظمت وجامعیت رکھتی ہے، حضرت امام احمد ابن حنبل نے اس حدیث کے متعلق فرمایا ''إنه ثلث العلم'' امام شافعیؒ نے فرمایا: ''إنه يدخل فيه نصف العلم'' اور بعض نے کہا: ''إنه ربع العلم''[1]

حضرت امام بیہقیؒ نے ثلث علم کہنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اعمال تین قسم کے ہوتے ہیں: (۱) اعمال متعلقہ بالجنان (۲) اعمال متعلقہ باللسان (۳) اعمال متعلقہ بالجوارح، اس حدیث میں اعمال متعلقہ بالجنان کا بیان ہے، کیونکہ نیت عمل قلبی ہے، لہٰذا یہ حدیث ثلث علم ہوئی،[2] امام شافعیؒ کے نصف علم قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں (۱) اعمال قلبی (۲) اعمال بدنی، اس حدیث میں اعمال قلبی کا بیان ہے اس لئے اس کو نصف علم فرمایا،[3] جن حضرات نے اس روایت کو ربع علم کہا ہے اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے

(۱) فيض البارى على صحيح البخارى ۱ / ۸۰ مطبوعه المكتبة الأشرفيه ديوبند.
(۲) لمعات التنقيح ۱ / ۱٦٦.
(۳) لمعات التنقيح ۱ / ۱٦٦.

کہ تمام احادیث کا خلاصہ اور نچوڑ چار حدیثیں ہیں: (۱)''من حسن إسلام المرء ترکه مالایعنیه'' (۲)''اتقوا الشبهات'' (۳) احادیث زہد جن میں دنیا کی فنائیت اور دنیا سے بے رغبتی کو بیان کیا گیا ہے، جن کا بیان کتاب الرقاق میں آتا ہے (۴)''إنما الأعمال بالنیات'' چونکہ یہ حدیث بھی ان چار میں سے ایک ہے اس لئے اس کو ربع علم فرمایا۔

اس حدیث کی اہمیت کے پیش نظر حضرات محدثین کے یہاں اس کا باقاعدہ نام بھی تجویز ہے، چنانچہ اس کے دو نام ہیں (۲) حدیث النیۃ (۲) طلیعة کتب الحدیث (کتب حدیث کا مقدمہ) اس کو مقدمۃ الجیش بھی کہہ سکتے ہیں؛ اس لئے کہ حضرات محدثین کی عادت ہے کہ عموماً وہ اپنی کتابوں کی ابتداء اسی حدیث سے فرماتے ہیں، حتیٰ کہ بخاری شریف کی ابتداء بھی اسی حدیث سے ہوئی ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی نے تو اس چیز کو باقاعدہ ادب بتایا کہ کتاب کی ابتداء مذکورہ روایت سے ہو، وہ فرماتے ہیں: ''یَنْبَغِيْ لِمَنْ صَنَّفَ کتاباً أن یَبدأ فیه بهذا الحدیث تنبیهاً للطالب علی تصحیح النیة ''(۱) یعنی طالب علم کو تصحیح نیت پر تنبیہ کرنے کے لئے مصنف کتاب کو اپنی تصنیف کا آغاز حدیث النیۃ سے کرنا چاہیئے، علامہ خطیب تبریزیؒ نے بھی اسی بات پر تنبیہ کے لئے کہ طالب علم اول وہلہ میں اپنی نیت درست کرلے اس حدیث سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔

طلب علم کی نیت ومقصد کیا ہو؟

علم نافع حاصل ہونے کے لئے نیت کا صحیح ہونا ضروری ہے، نیت ہونی چاہئے رضائے باری تعالیٰ کی، آخرت کو سنوارنے کی، اور اقامت دین کی، نیز یہ نیت ہو کہ اپنی ذات سے صفت جہل دور ہوجائے اور ہمارے واسطے سے دوسروں کا بھی جہل دور ہوجائے، جاہ اور مال کو حاصل کرنا مقصود نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس پر سخت وعید آئی ہے، حدیث شریف میں ہے ''مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِیُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ، أَوْلِیُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ، أویصرف بهٖ وجوهَ الناسِ إلیه أدخلهُ اللّٰهُ النارَ ''(۲) تحصیل علم کا مقصد مال کی ذخیرہ اندوزی بھی نہ ہو ورنہ ایسا شخص جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا کما ورد في الحدیث: مَنْ تَعَلَّمَ علماً

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۷۵ مطبوعه زکریا دیوبند.

(۲) أخرجه الترمذي ۲/ ۹۴، وابن ماجه ۱/ ۲۲، حدیث شریف کا ترجمہ ص۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

مـما يَبْتَغى به وجهُ اللهِ لايَتَعَلَّمَه إلا ليصيب به عرضاً من الدنيالم يَجِدْ عَرَفَ الجنةِ يوم القيامة يعني ريحَها. [۱]

تصحیح نیت کا طریقہ:

ہمارے استاذ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے تھے کہ نیت عمل قلبی ہے اس لئے بار بار اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، نیت میں کچھ کمی محسوس ہوتو بندہ اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہے اس طرح بار بار نیت کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرتا رہے گا تو اللہ کی مدد آئے گی، اور ایک وقت آئے گا کہ انشاء اللہ اخلاص حاصل ہو جائے گا۔

(۲) نوعیت حدیث:

یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح اور غریب ہے، اور بخاری شریف میں اس سند سے مروی ہے:
حميدي عن سفيان عن يحي بن سعيد عن محمد بن إبراهيم التيمي عن علقمة عن عمر بن الخطابؓ قال: قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم إنما الاعمال الخ.

حمیدی سے علقمہ تک اس سند کے تمام رواۃ اعلی درجہ کے ثقہ ہیں، لہٰذ یہ حدیث صحیح ہے، مگر غریب بھی ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ سے اس حدیث کو نقل کرنے والے محض علقمہ ہیں، اگر چہ حضرت عمرؓ اس حدیث کو منبر پر سنایا کرتے تھے، لیکن اتفاق ہے کہ ان سے روایت کرنے والے صرف علقمہ ہیں، اسی طرح علقمہؒ سے نقل کرنے والے محمد بن ابراہیم تنہا ہیں، اور ان سے نقل کرنے والے یحی بن سعید ہیں یہ بھی تنہاء ہیں، یحی ابن سعید سے نقل کرنے والی ایک بڑی جماعت ہے جن کی تعداد بعض نے ڈھائی سو (۲۵۰) اور بعض نے تین سو بیان کی ہے، پس سند کے آخری حصہ کے لحاظ سے یہ روایت مشہور بلکہ متواتر ہوگئی ہے لیکن ابتداء کے کئی طبقوں میں راوی تنہا تنہا ہیں اور حدیث پر حکم اقل کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے، پس کئی طبقوں میں راوی کے متفرد ہونے کی وجہ سے یہ حدیث غریب ہے۔ [۲]

---

(۱) أخرجه أبو داود ۲ / ۵۱۵ وابن ماجه ۱ / ۲۲، ترجمہ ص ۶ پر دیکھیں۔

(۲) فتح الباري ۱ / ۱۲ (۱) ط: شيخ الهند ديوبند، وفتح الإله ۱ / ۱٦٤، ط: بيروت.

(۳) شانِ ورودِ حدیث:

امام طبرانی نے سندِ جید کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے نقل فرمایا ہے کہ جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرامؓ اخلاص کے ساتھ ہجرت کرنے لگے، مکہ میں ایک عورت تھی قَیلہ ام قیس، ایک صحابی نے اس عورت کو نکاح کا پیغام دیا، وہ ہجرت کرکے مدینہ آ گئی، نکاح نہیں کیا، اُن صحابی نے مکہ مکرمہ سے دوبارہ نکاح کا پیغام بھیجا تو ام قیس نے ہجرت کی شرط لگائی، چنانچہ ان صحابی نے نکاح کی وجہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: اس کے بعد سے ہم ان صحابی کو ''مہاجر ام قیس'' کہنے لگے، حضرات محدثین ان صحابی کا نام بیان نہیں کرتے ہیں۔ (۱)

(۴) راویٔ حدیث حضرت عمرؓ کے احوال:

حدیث کے راوی مشہور صحابی حضرت عمر فاروقؓ ہیں ان کا مختصر تعارف بیان کیا جاتا ہے:

آپ کا نام عمر ہے، والد کا نام خطاب ہے، ابوحفص کنیت ہے، فاروق لقب ہے، بمعنیٰ فرق کرنے والے، اس لقب کی وجہ بعض حضرات نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے سے پہلے مسلمان چُھپے چُھپے رہا کرتے تھے، آپ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو قوت ملی اور پھر مسلمان شعائرِ اسلام کا اظہار کرنے لگے، گویا کہ آپ حق وباطل کے درمیان فرق کرنے والے ہوگئے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ایک یہودی اور منافق کا کسی معاملہ میں جھگڑا تھا، دونوں اپنے مقدمہ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے گئے، اس معاملہ میں یہودی حق پر تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں فیصلہ فرمایا، اس منافق نے کہا کہ: ہم حضرت عمرؓ سے بھی فیصلہ کرائیں گے، حضرت عمرؓ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قاضی تھے، چنانچہ یہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آئے، یہودی نے سارا واقعہ بتایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بھی سنا دیا، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ٹھہرو، پھر اندر جا کر تلوار لائے اور اس منافق کی گردن اڑا دی اور فرمایا کہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی تلوار ہے، اس

(۱) المعجم الكبير ٦ / ١٠٣ (٨٥٤٠) مطبوعه ابن تيميه، القاهره. قال الحافظ: لم نقف على تسمية مهاجر أم قيس، ونقل ابن دحيه أن اسمها: قيلة، وقال العلامة القنوجي في عون الباري لم يسم هذا الرجل أحد لمن صنف في الصحابة فيما رأيته. (مرعاة المفاتيح ١ / ١٨٥)

وقت یہ آیت شریفہ نازل ہوئی: ''اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلاً بَعِیْداً''[۱] یعنی (اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کونہیں دیکھا جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئیں ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اوراس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلہ کے لئے طاغوت کے پاس لیجانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کرے اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں بھٹکا کر پرلے درجہ کی گمراہی میں مبتلا کردے۔

اور جبرئیل علیہ السلام نے ایک موقع پر فرمایا: ''إن عمر فرق بین الحق والباطل ''پس اسی وقت سے آپ کا لقب فاروق ہوگیا۔[۲]

آپ چالیس لوگوں کے بعد ۶ھ نبوی میں اسلام لائے، واقعہ اصحاب فیل کے تیرہ سال بعد آپ پیدا ہوئے، جب آپ اسلام لائے تو یہ آیت شریفہ نازل ہوئی ''یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰہُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ''[۳] اے نبی! آپ کو اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ مومنین کافی ہیں جو آپ کے پیچھے چل رہے ہیں، آپ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے جو مشہور ومعروف ہے، اسلام لانے کے بعد سے آپ برابر دین کی خدمت اور اشاعت میں لگے رہے ۱۳ھ میں آپ خلیفہ مقرر ہوئے اور آپ کے زمانہ خلافت میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں، نئے نئے شہر وجود میں آئے، فارس کا علاقہ، شام کا علاقہ، اور روم کے بہت سے علاقے آپ کے زمانۂ خلافت میں ہی فتح ہوئے، ساڑھے دس سال آپ کی خلافت رہی، مغیرہ بن شعبہ کے غلام فیروز ابولؤلؤ نے صبح کی نماز میں دھوکہ سے آپ کو برچھا مارا، سخت زخمی ہوئے، بالآخر ماہ رجب بروز بدھ ۲۳ھ میں آپ کی وفات ہوئی، حضرت صہیبؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، بہت سی احادیث آپ سے مروی ہیں، علماء نے ان کی تعداد ۵۳۷ بیان کی ہے، بخاری ومسلم میں آپ سے ۸۱ حدیثیں مروی ہیں۔[۴]

(۱) النساء ٦٠.

(۲) بیضاوی شریف ۲/ ۲۰۷ مطبوعه درالفکر بیروت.

(۳) الأنفال: ٦٤.

(٤) الإصابة ٤/ ٣-٥ (٥٧٣٦) وسیر أعلام النبلاء ٢٨/ ٧١-١٣٧.

(۵)اختلاف الروایات فی الجملۃ الاُولیٰ:

اس جملہ میں پانچ ضبط وارد ہوئے ہیں:(۱)**إنما الأعمال بالنیات** (۲)**إنما الأعمال بالنیة** (۳)**الأعمال بالنیات** (۴)**الأعمال بالنیة** (۵)**العمل بالنیة.**

(۶)شرحِ کلماتِ حدیث

''**انما**'' کلمۂ حصر ہے، حصر کہتے ہیں''**إثبات الحکم للمذکور ونفیه ماعداہ**''یعنی شی مذکور کے لئے حکم کو ثابت کرنا اور اس کے علاوہ سے نفی کرنا۔

''**الاعمال**'' جمع ہے عمل کی ،ایک ہے عمل اور ایک ہے فعل، دونوں کے معنی کام کے ہیں لیکن عمل اور فعل میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟اس میں دونوں قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ عمل اور فعل دونوں مترادف ہیں،دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں میں فرق ہے، پھر ان میں دو فرق بیان کئے گئے ہیں:

(۱)عمل کا تعلق مکلّف وذی عقل کے ساتھ ہوتا ہے بخلاف فعل کے کہ وہ عام ہے کہ اس کا تعلق غیر ذی عقل کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اسی لئے فعل البہائم کہا جاتا ہے نہ کہ عمل البہائم۔(۱)

(۲)بعض نے کہا کہ عمل میں دوام اور استمرار پر بھی دلالت ہوتی ہے فعل میں دوام واستمرار پر دلالت نہیں ہوتی، اسی لئے قرآن کریم میں بار بار''**عملوا الصالحات**'' آیا ہے''**فعلوا الصالحات**'' نہیں آیا، کیونکہ اعمال صالحہ میں دوام واستمرار مطلوب ہے تب ہی جنت کا دخول اولی حاصل ہو سکے گا، محض ایک مرتبہ عمل کی انجام دہی سے جنت کا دخول اولی حاصل نہیں ہوگا۔

عمل کی مختلف اقسام اور ان میں نیت کے احکام:

اس کے بعد سمجھنا چاہئے کہ عمل دو قسم کا ہوتا ہے: اختیاری اور اضطراری، یہاں پر اعمال سے مراد اعمال اختیاریہ ہیں، اضطراری اعمال کا تعلق نیت سے نہیں ہوتا، پھر اعمال شرعیہ کی دو قسمیں ہیں: مقصودہ اور غیر مقصودہ، اعمال مقصودہ سے نماز روزہ وغیرہ عبادات مراد ہیں اور اعمال غیر مقصودہ سے وسائل جیسے وضوء، غسل، طہارت ثوب وبدن، وغیرہ مراد ہیں، کیونکہ یہ امور نماز کے وسائل ہیں، مقصود بالذات نہیں، حضرات

(۱)تاج العروس، وعمدۃ القاری ۱ / ۵۰.

شوافع کے یہاں دوسری قسم کے اعمال میں سے وضواور غسل میں بھی نیت شرط ہے احناف کے یہاں صرف اعمال مقصودہ میں نیت ضروری ہے وضواور غسل میں نیت شرط نہیں ہے، کیونکہ یہ اعمال مقصودہ نہیں ہیں۔

پھر عمل کی اور تین قسمیں ہیں: (۱) معاصی (۲) طاعات، (۳) مباحات، معاصی کا ارتکاب ہر حال میں گناہ ہے، چاہے نیت کچھ بھی ہو، چنانچہ اگر غریبوں کی امداد کی نیت سے چوری کی جائے یا لوگوں سے سود لیا جائے تب بھی یہ گناہ ہی رہیں گے، طاعات میں نیت موثر ہوتی ہے اصل ثواب کے اعتبار سے بھی اور زیادتی ثواب کے اعتبار سے بھی، جیسے نماز اور روزہ وغیرہ کہ ان کو ادا کرنے میں ثواب اسی وقت ہے جب صحیح نیت سے ان کو انجام دیا جائے، پھر نیت میں جس قدر حسن ہوگا اتنا ہی ثواب میں اضافہ ہوگا، مباحات میں بھی نیت موثر ہوتی ہے، اصلاً تو مباحات میں نہ ثواب ہے اور نہ گناہ، مگر حسن نیت کی وجہ سے مباحات پر ثواب ہوگا، جیسے کھانا اس نیت سے کھائے کہ اس سے حاصل ہونے والی قوت کو احیائے دین میں استعمال کرے گا تو اب یہ کھانا بھی عبادت بن جائے گا۔(۱)

بالنیات: میں ''باء'' استعانت کے لئے ہے اور بعض نے مصاحبت کے لئے بتلایا ہے یعنی نیت عمل کے مقارن اور ساتھ ساتھ ہونی چاہئے، اسی طرح مصاحبت کا مطلب یہ بھی ہے کہ نیت عمل کے اخیر تک باقی رہنی چاہئے، اس پر اشکال ہوگا کہ بہت سے اعمال میں نیت تقدیماً اور تاخیراً بھی کافی ہوجاتی ہے اسی طرح نیت کا اخیر تک بقاء بھی لازم نہیں؟(۲)

اس کا جواب یہ ہے کہ مقدم ومؤخر نیت بھی حکماً مقارن ہی سمجھی جاتی ہے اسی طرح اگر افتتاح عمل کے بعد منافیِ صلوۃ عمل نہ کیا جائے تو یہ بھی حکماً مصاحبت ہے۔

نیت کا مفہوم اور نیت وارادہ میں فرق:

نیت کے لغوی معنی ہیں قصد وارادہ اور شرعی معنیٰ ہیں: **تَوجّهُ القلبِ نحوَ الفعلِ ابتغاءً لِمَرْضَاةِ الله تعالیٰ**، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لئے کسی فعل کی جانب قلب کا متوجہ ہونا۔

ایک ہے نیت اور ایک ہے ارادہ، ان دونوں میں فرق ہے، نیت میں نیت کرنے والے کی غرض کو

(۱) "التعليق الصبيح" ۱/ ۱۰۔

(۲) المرقاة ۱/ ۹٤۔ الاشباه والنظائر لابن نجيم ص ۳٦، ط: دار الكتب العلميه.

دخل ہوتا ہے اور ارادہ میں ارادہ کرنے والے کی غرض کا دخل ضروری نہیں ہے، اس لئے ارادہ کی نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے "فَعَّالٌ لِّمَايُرِيْد" نیت کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہوتی، اس لئے کہ اللہ کے افعال معلل بالاغراض نہیں ہیں۔

مصنفؒ نے یہاں اس حدیث کے مختلف صیغوں میں سے "الأعمال بالنيات" کا صیغہ ذکر کیا ہے، جس میں اعمال و نیات ہر دولفظ جمع کے ساتھ ہیں، یہ اصطلاح میں "مقابلة الجمع بالجمع" کہلاتا ہے جو "انقسام الاحاد علی الاحاد" کو متضمن ہوتا ہے، اس لحاظ سے حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر عمل پر اس کی اپنی نیت کے لحاظ سے حکم ہوگا، اگر وہ اچھی نیت سے کیا گیا ہے تو مفید ثواب ہوگا اور اگر نیت درست نہیں ہے تو مستحق عقاب، نیز دونوں جمع کے الفاظ لانے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر متعدد نیات کے ساتھ کوئی عمل ہو تو وہ اگر چہ دیکھنے میں ایک عمل ہو مگر نیت کے تعدد کے لحاظ سے اس میں متعدد اعمال کی انجام دہی کا ثواب ہوگا، مثلاً کوئی شخص نماز کے لئے مسجد جائے اور وہ اعتکاف، لوگوں کی خبر گیری اور تعلیم وتعلم وغیرہ کی مختلف نیتیں کرے تو اس کو نیت کے مطابق محض ایک عمل پر یہ سب ثواب حاصل ہونگے۔

بالنیات کا متعلق:

"إنما الاعمال بالنيات" یعنی اعمال کا اعتبار شرعاً نیت پر ہے، یہاں اعمال کا وجود حسی مراد نہیں ہے کیونکہ وجود حسی تو بغیر نیت کے بھی ہو جاتا ہے، مثلاً ایک شخص سیر و تفریح کے لئے اسٹیشن کے راستہ پر چلا، مقصود اس کا اسٹیشن جانا نہیں ہے لیکن اس راستہ پر چلنے کی وجہ سے اسٹیشن پہنچ ہی جائے گا، حالانکہ قصداً اسٹیشن جانے کا نہیں تھا، پس جب اعمال کا حسی وجود مراد نہیں ہے تو یہاں ایک لفظ کی تقدیر ضروری ہے جس سے نفی کا تعلق ہو جائے، جو نفی کلمہ حصر (إنما) سے مفہوم ہو رہی ہے، نیز وہ لفظ جار مجرور (بالنیات) کا متعلَّق بھی بن جائے چنانچہ وہ لفظ بعض نے "تصح" اور بعض نے "تثاب" مقدر مانا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک وضو اور غسل میں نیت شرط صحت ہے اس لئے حضراتِ شوافع تصح کی تقدیر کو راجح قرار دیتے ہیں، اور عند الاحناف وضو و غسل میں نیت حصولِ ثواب کی شرط ہے نہ کہ صحت کی، اس لئے احناف تثاب کی تقدیر کو راجح مانتے ہیں۔

مگر "تثاب" کا لفظ عبادات مقصودہ کو شامل نہیں، کیونکہ ان میں نیت شرط صحت ہے نہ کہ محض شرط

ثواب، پس اس صورت میں یہ حدیث حنفیہ کے مذہب کے مطابق عبادات مقصودہ میں نیت کے شرط صحت ہونے کا مستدل نہیں بن سکے گی، اسی وجہ سے حضرت اقدس سہارنپوریؒ نے بذل المجہود میں اس کا متعلَّق فعلِ اعتبار کوقرار دے کر ''تعتبر'' کا لفظ مقدر مانا ہے، اس صورت میں حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ شرعی طور پر اعمال نیت کے ساتھ معتبر ہیں، بغیر نیت کے معتبر نہیں، معتبر ہونا صحت کے لحاظ سے ہو یا ثواب کے لحاظ سے، پس یہ لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے تمام اعمال کو شامل ہو جائے گا، اعمال خواہ عبادات مقصودہ ہوں کہ نیت ان میں معتبر ہے شرط صحت ہونے کے لحاظ سے، خواہ عبادات غیر مقصودہ (وسائل یعنی وضو غسل طہارت وغیرہ) ہوں کہ نیت ان میں شرطِ ثواب کے لحاظ سے معتبر ہے، خواہ امور مباحہ ہوں جیسے اکل وشرب وغیرہ کہ حسن نیت کی وجہ سے ان کی حیثیت طاعت کی ہو جاتی ہے۔

کن اعمال میں نیت کی حیثیت شرط صحت کی اور کن اعمال میں شرط ثواب کی ہے؟ اس کی تفصیل اور دلائل کتبِ اصول میں ہیں، لیکن یہ حدیث اپنی جامعیت کے لحاظ سے نیت کی ان مختلف حیثیتوں میں سے ہر ایک کے لئے بنیاد ہے، پس لفظِ تعتبر کی تقدیر سے یہ حدیث ایک انفرادی شان کی حامل ہو جاتی ہے فللّٰه درّ الشيخ السهارنفوري.

حدیث پر تکرار مضمون کا اشکال اور اس کے جوابات:

وإنما لإمرئ مانوى إلخ: یہ حدیث کا دوسرا جملہ ہے اس کے مضمون کا حاصل وہی ہے جو پہلے جملہ کا ہے کہ آدمی کو وہی چیز ملتی ہے جس کی وہ نیت کرے، گویا دونوں جملوں کے مضمون میں تکرار ہے اور یہ تکرار موجب اشکال ہے، اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں اور دونوں جملوں میں کئی طرح کا فرق بیان کیا گیا ہے:

(۱) پہلے جملہ ''إنما الأعمال بالنيات'' میں قاعدہ کلیہ کا بیان ہے اور دوسرے جملہ ''وإنما لامرئ مانوى'' آئندہ مضمون کیلئے تمہید ہے۔

(۲) بعض نے یہ جواب دیا کہ پہلے جملہ میں ضرورتِ نیت کا بیان ہے اور دوسرے جملہ میں کیفیت وکمیت نیت کا بیان ہے، یعنی آدمی جتنی اچھی نیت کرے گا اور جتنے کاموں کی نیت کرے گا اسی قدر ثواب کا مستحق ہوگا۔

(۳) بعض نے کہا کہ پہلے جملہ میں نفس نیت کا بیان ہے اور دوسرے جملہ میں تعیین نیت کا بیان ہے مثلاً ایک شخص نماز کی نیت کرنا چاہتا ہے تو ایک ہے نفس نماز کی نیت، اور ایک ہے تعیین نیت کہ کونسی نماز پڑھ رہا ہے اور دونوں ہی نیتیں مطلوب ہیں۔

(۴) بعض نے کہا کہ اول جملہ کا تعلق عمل کے ساتھ ہے اور ثانی جملہ کا تعلق عاملین کے ساتھ ہے۔

(۵) بعض نے کہا کہ نیت کی اہمیت کی وجہ سے تکرار کیا گیا ہے، لہٰذا یہ تکرار بے فائدہ نہیں ہے۔

نیت صحیحہ وفاسدہ کی تمثیل:

فمن کانت هجرته إلى الله الخ: اس جملہ میں نیت صحیحہ اور نیتِ فاسدہ کی مثال بیان کی گئی ہے کہ جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لئے ہی شمار ہوگی اور وہ اس عمل پر اجر وثواب کا مستحق ہوگا، اور جس نے دنیا کو حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے مقصد سے ہجرت کی اس کی ہجرت ان ہی چیزوں کے لئے شمار ہوگی، اس پر اجر وثواب کا مستحق نہیں ہوگا بلکہ گناہ ذمہ میں آسکتا ہے۔

اور اگر ہجرت کرنے میں دونوں مقاصد پیش نظر ہوں تو پھر غلبہ کا اعتبار ہوگا جو مقصد غالب ہو اسی کے لئے اصل ہجرت شمار ہوگی، اور یہ صرف ہجرت ہی کی تخصیص نہیں، بلکہ ہر وہ عمل جس میں دین ودنیا کی دونوں نیتیں جمع ہوجائیں اس میں غلبۂ نیت کے لحاظ سے حکم ہوگا۔

ہجرت کے معنی اور اس کی اقسام اور احکام:

"الهجرة" ہجر سے ماخوذ ہے اس کے لغوی معنی ہیں چھوڑنا، ترک کرنا، ہجرت کی دو قسمیں ہیں: (۱) ہجرت باطنی (۲) ہجرت ظاہری، ہجرت باطنی سے مراد ہے گناہوں کو چھوڑنا حدیث شریف میں وارد ہوا ہے "اَلْمُهَاجِرَ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ" یعنی اصل مہاجر وہی ہے جو معاصی اور مناہی چھوڑے، یہ ہجرت باطنی ہر شخص پر لازم اور فرض ہے اور ہجرت ظاہری کے معنی ہیں اللہ کی رضاء کے لئے اور اقامت دین کے لئے اپنے وطن کو چھوڑنا۔

پھر ہجرت ظاہری کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) هجرة من دار الكفر الىٰ دار الاسلام (۲) هجرة من دار الخوف الى دار الامن. حضرات صحابہؓ نے دونوں قسم کی ہجرت فرمائی ہے، وہ حضرات مکہ مکرمہ سے

مدینہ طیبہ گئے، یہ ہجرت کی پہلی قسم ہے اور بہت سے صحابہؓ حبشہ تشریف لے گئے، حبشہ دارالاسلام نہیں تھا، لیکن مسلمانوں کو وہاں امن حاصل تھا، اس لئے یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے۔

ابتدائے اسلام میں ہجرت من مکۃ الی المدینۃ فرض تھی، کیونکہ شریعت کا منشا یہ تھا کہ تمام مسلمان مدینہ طیبہ میں جمع ہوجائیں تاکہ مسلمانوں کی قوت مجتمع ہوجائے اور کفار کو شکست دی جاسکے، اس ہجرت کو ابتداء میں ایمان کی علامت قرار دیا گیا تھا، ۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو پھر اس ہجرت کا حکم ختم ہوگیا، چنانچہ فرمادیا گیا ''لاہجرۃ بعد الفتح'' [1] کہ اب اس ہجرت کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ مکہ مکرمہ خود دارالاسلام بن گیا۔

لیکن سِرے سے ہجرت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ مخصوص حالات میں ہجرت کرنا ہمیشہ فرض ہے، حدیث شریف میں ہے: ''**لاتنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة** [2]'' کہ ہجرت کا حکم اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جبتک توبہ کا دروازہ بند نہ ہوجائے، قبیل قیامت طلوع الشمس من مغربہا ہوگا اس کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہوگا، وہ مخصوص حالات جن میں ہجرت کرنا فرض ہے یہ ہیں کہ: آدمی اپنے وطن میں احکام شرعیہ پر عمل نہ کرسکے، مذہبی آزادی حاصل نہ ہو، کفار آڑے آتے ہوں، ایسی صورت میں اگر مسلمان طاقتور ہوں تو ان پر جہاد کرنا فرض ہوتا ہے اور اگر مسلمان طاقتور نہیں ہیں تو پھر ہجرت فرض ہوگی بشرطیکہ ہجرت کے اسباب مہیا ہوں اور کوئی جائے ہجرت موجود ہو۔

ایک ہجرت استحبابی ہوتی ہے کہ اپنے وطن میں بھی دین پر عمل پیرا ہے وہاں احکام شرعیہ کے عمل پر کوئی پابندی نہیں ہے اس کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے شہر کی طرف ہجرت کرے، یہ مستحب ہے جیسا کہ ہمارے متعدد اکابر نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی ہے حضرت سہارنپوریؒ، حضرت شیخ زکریاؒ اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کی ہجرت اِسی نوع کی تھی۔ (۳)

مذکورہ روایت میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے سے مقصود اخلاص کی تعلیم دینا ہے کہ جو شخص ہجرت الی

---

(۱) صحيح البخاري ۱/۳۹۱(۲۷۸۳)(۲۸۲۵) صحيح مسلم ۲/۱۳۱(۱۸٦٤)

(۲) سنن أبي داؤد ۱/۳۳٦(۲٤۷۹)

(۳) ملاحظہ ہو: المرقاة شرح المشكاة ۱/٤٤، الموسوعة الفقهية، مادة: هجرة.

الرسول یعنی ہجرت الی المدینہ کرے وہ اخلاص کے ساتھ کرے، بعض نے کہا کہ یہ بتانا مقصد ہے کہ ہجرت اِلی اللہ ہجرت الی الرسول ہے، جس طرح فرمایا گیا: ''من یطع الرسول فقد أطاع الله''[۱]

ایک نحوی اشکال اوراس کے جوابات:

''فمن کانت ھجرته'' اس جملہ کی ترکیب پر اشکال ہے اس میں اول جملہ شرط اورثانی جزاء ہے اور یہاں شرط وجزا میں اتحاد ہورہا ہے حالانکہ شرط وجزا میں تغایر ضروری ہے؟ اس کے کئی جوابات ہیں:

(۱) یہاں جانب شرط میں ایک قید ملحوظ ہے اسی طرح جانب جزا میں بھی ایک قید ملحوظ ہے، گویاعبارت یوں ہے، ''فمن کانت ھجرته إلی اللہِ ورسولِه قصداً ونیةً فھجرته إلی اللہِ ورسولِه ثمرةً وقبولیةً'' ان قیود سے شرط وجزا میں تغائر ہوگیا۔[۲]

(۲) بعض نے کہاہے کہ معنی یہ ہیں: ''فمن کانت ھجرته إلی اللہِ ورسولِه فی الدنیا فھجرته إلی اللہ ورسوله فی الآخرة'' یہاں بھی متعلق بدل جانے سے شرط وجزا میں مغایرت پیداہوگئی۔[۳]

(۳) بعض نے کہا کہ شرط وجزا کا یہ اتحاد مضمون میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے ہے، جیسے مشہور مقولہ ہے: شعری شعری، اب مطلب یہ ہوگا ہجرت وہی معتبر ہے جواللہ اوراس کے رسول کے لئے ہو۔[۴]

حدیث میں ''امرأۃ'' کی وجہ تخصیص:

ومن کانت ھجرته الی دنیا الخ: یہ نیت فاسدہ کی مثال ہے، اس جملہ میں اشکال کیا گیاہے کہ لفظ ''دنیا'' میں عورت بھی داخل ہے پھرعورت کا تذکرہ الگ سے کیوں کیا گیا؟ اس کے جوابات یہ ہیں:

(۱) شان ورود میں عورت کا ہی تذکرہ ہے اس لئے عورت کا تذکرہ الگ سے کیا گیاہے۔[۵]

---

(۱) النساء: ۸۰.

(۲) المرقاة ۱/۱۰۱.

(۳) المرقاة ۱/۱۰۱ والتعلیق الصبیح ۱/۱۰۔

(٤) المرقاة ۱/۱۰۲ والتعلیق الصبیح ۱/۱۰.

(٥) المرقاة ۱/۱۰۲.

(۲) تمام دنیا فتنہ ہے لیکن عورت بڑا فتنہ ہے، قرآن کریم نے بھی عورتوں کے مکر کو بڑا کہاہے ''إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ'' اور شیطان کے مکر کو ضعیف قرار دیا ''إِنَّ كَيْدَالشَّيْطَانَ كَانَ ضَعِيْفاً'' نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مَاتركتُ بعدي فتنةً أضرَّ علي الرجال من النساءِ''[1] کہ: میرے بعد مردوں کے لئے سب سے خطرناک فتنہ عورتیں ہیں، پس عورت کا مکر زیادہ خطرناک ہونے کی وجہ سے عورت کا صریح تذکرہ لایا گیا۔[2]

دوسرا سوال یہاں یہ ہے کہ اول جملہ میں جزا میں اللہ اور رسول کا لفظ مکرر بولا گیا ہے ضمیر پر اکتفاء نہیں کیا گیا اور دوسرے جملہ میں دنیا اور امرأۃ کی ضمیر پر اکتفا کیا گیا دوبارہ انکا لفظ ذکر نہیں کیا گیا، تو وجہ فرق کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ ورسول کا نام متبرک ہے اور اس میں لذت ہے برخلاف دنیا اور امرأۃ کے کہ یہ نام لینے کی چیز نہیں ہیں۔

دنیا؛ معنی اور مصداق:

دنیا: ''دنیا'' کے مشتق منہ میں دو احتمال ہیں: (۱) ایک یہ کہ یہ مشتق ہے دُنُوٌّ سے جس کے معنی ہیں قریب ہونا؛ مشتق اور مشتق منہ میں مناسبت یہ ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں قریب ہے۔

(۲) یہ مشتق ہے ''دناءة'' سے دناءة کے معنی ہیں کمینہ ہونا، اس صورت میں مشتق اور مشتق منہ کی مناسبت ہے یہ کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں کمینی اور حقیر ہے۔[3]

دنیا کسے کہتے ہیں؟ اس میں تین قول ہیں (۱) بعض نے کہا کہ ہر وہ چیز جو اللہ کے ذکر سے غافل کردے وہ دنیا ہے (۲) بعض نے کہا ماعلی الارض کو دنیا کہتے ہیں (۳) بعض نے کہا کہ ماسوا اللہ کو دنیا کہا جاتا ہے۔[4]

---

(۱) البخاري (٥٠٩٦) ومسلم (٢٧٤٠)

(۲) المرقاة ١/١٠٢.

(۳) المرقاة ١/١٠٣ والمقدمة للشيخ عبدالحق الدهلوي: ص٧.

(٤) فتح الباري ١/١٩، اور عمدةالقاري ١/٥٢ میں لکھا ہے: واختلف في حقيقتها فقيل: ماعلى الأرض من الهوا والجوو قيل كل المخلوقات من الجواهر والأعراض والأولى اَولى.

متفق علیہ :اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرات شیخین یعنی امام بخاری ومسلم دونوں نے اس حدیث شریف کی ایک ہی صحابی سے تخریج کی ہے۔(۱)

كِتَابُ الإِيْمَانِ

مصنفؒ نے تصحیح نیت پر تنبیہ کرنے اور اخلاص وللّٰہیت پیدا ہونے کی غرض سے حدیث نیت سے کتاب کو شروع فرمایا، اب اصل مقصود یعنی ایمانیات کو شروع کیا جارہا ہے، اس کے لئے کتاب الایمان کے الفاظ سے ترجمہ قائم کیا، اس ترجمہ میں دولفظ ہیں ایک کتاب اور دوسرے ایمان، ان دونوں سے متعلق چند مباحث ہیں:(۱) مشکوۃ کے کتب وابواب کی اجمالی ترتیب اور ان کا باہمی ربط،(۲) کتاب، باب اور فصل کے لغوی واصطلاحی معنی،(۳) ایمان سے متعلق چند مباحث۔

مشکوۃ کے کتب وابواب کی ترتیب اور ان کا باہمی ربط:

مشکوۃ شریف میں کتاب کے لفظ سے بہت سے تراجم ہیں،ان میں سب سے پہلے کتاب الایمان کو لایا گیا ہے،وجہ اس کی یہ ہے کہ شریعت کا حصہ دو چیزیں ہیں (۱) ایمان (۲) اعمال، ایمان اصل الاصول ہے اور اعمال واحکام پر مقدم ہے، کوئی عمل بغیر ایمان کے مقبول نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے بھی عمل سے پہلے ایمان کو بیان کیا ہے، اس لئے مصنفؒ نے بھی ایمان کی بحث کو مقدم کیا ہے، ایمان کے بعد درجہ ہے اعمال واحکام کا،احکام شرعیہ تین قسم کے ہیں (۱) عبادات محضہ (۲) معاملات محضہ (۳) ایسے احکام جو دونوں سے مرکب ہیں جیسے نکاح، ان میں پہلی قسم کا درجہ مقدم ہے اس لئے ایمان کے بعد عبادات محضہ کو بیان کیا جائے گا، اس میں یہ اعمال ہیں نماز، روزہ، زکوۃ اور حج، ان میں سب سے اہم اور مہتم بالشان نماز ہے، لہٰذا عبادات محضہ میں سب سے پہلے نماز کو بیان کیا جائے گا، لیکن نماز کے لئے طہارت شرط ہے، اور شرطِ شئی شئی سے مقدم ہوتی ہے، اس لئے ایمان کے بعد طہارت کو بیان کریں گے، عبادات محضہ کے بیان سے فراغت کے بعد دوسرے نمبر پر معاملات محضہ کو بیان کیا جائے گا، چنانچہ حج کے بعد بیوع کا بیان لائیں گے، معاملات محضہ کے بعد ایسے احکام کو شروع کیا جائے گا جن میں عبادت ومعاملہ دونوں کا پہلو ہو جیسے نکاح اور اس کے متعلقات، اس کے بعد زواجر کو پھر آداب کو اس کے بعد فتن کو، پھر سب سے اخیر میں

(۱) فیض القدیر ۱ / ۳۰ (۴۰۸۴)

مناقب صحابہ کو بیان کیا جائے گا، تفصیلی ربط آگے اپنے مقام پر آئے گا۔

کتاب، باب اور فصل کے معنی:

''کتاب'' بروزن فِعال باب مفاعلت کا مصدر ہے اس باب کا مصدر مُفاعلۃ اور فِعال دونوں وزن پر آتا ہے، کتاب کے دو معنی ہیں (۱) لکھنا (۲) جمع کرنا ،عنوان کے طور پر جب لفظ کتاب آتا ہے تو وہاں بہت سے مسائل لکھے اور جمع کئے ہوئے ہوتے ہیں، اصطلاحِ مصنفین میں کتاب سے مراد ایسے مسائل کا مجموعہ ہے جو جنس میں تو متحد ہوں لیکن انواع انکی مختلف ہوں، باب کے تحت ایسے مسائل ہوتے ہیں جن کی نوع متحد ہو البتہ صنف مختلف ہو، جیسے حیوان ایک جنس ہے جو تمام حیوانات کو شامل ہے لیکن اس کے تحت انواع مختلف ہیں جیسے انسان، بقر، غنم وغیرہ، پھر تمام انسانوں کی نوع ایک ہے البتہ صنف مختلف ہیں جیسے مرد وعورت۔

ترجمہ میں دوسرا جز ہے: الایمان، اس سے متعلق چند مباحث ہیں: (۱) ایمان کے لغوی وشرعی معنی، (۲) ایمان کی حقیقت میں ائمہ کا اختلاف، (۳) ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے یا نہیں، (۴) ایمان واسلام میں فرق ہے یا نہیں؟

(۱) ایمان کے لغوی وشرعی معنی:

''ایمان'' باب افعال کا مصدر ہے، مجرد میں اس کا مصدر اَمنٌ آتا ہے، جو لازم ومتعدی دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے، جس کے معنی ہیں محفوظ کرنا اور محفوظ ہونا، باب افعال میں اس کے معنی ہوئے تصدیق کرنا، مجرد اور مزید فیہ میں مناسبت پائی جاتی ہے جو یہاں بھی ہے، وہ یہ کہ جب کوئی شخص کسی کی تصدیق کرتا ہے تو مصدِّق، مصدَّق کو تکذیب سے محفوظ کر دیتا ہے اور مصدَّق محفوظ ہو جاتا ہے۔

اور ایمان کے شرعی معنی ہیں: ''التصدیق بما عُلِمَ بالضرورۃ أنه من دینِ محمد صلی الله علیه وسلم '' یعنی ان سب چیزوں کی تصدیق کرنا جن کے بارے میں بدیہی طور پر معلوم ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہیں۔

''تصدیق'' کا مطلب ہے کہ جو باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ان کو دل سے سچا تسلیم کرے لہٰذا جو ان کو دل سے سچ تسلیم نہ کرے خواہ اس کو ان کا علم ومعرفت ہو وہ مؤمن نہیں ہوگا۔

''ضروری'' ہونے کا مفہوم اور حکم:

''بالضرورۃ'' سے مراد ایسے احکام ہیں جو قطعی ہوں ثبوتاً بھی اور دلالۃً بھی اور وہ عوام وخواص میں مشہور ہوں اور ہر عالم وجاہل ان سے واقف ہو، خواہ فرض وواجب نہ ہوں، مثلاً نماز، روزہ، حج، مسواک وغیرہ، چنانچہ ایسی قطعی چیز کا انکار کرنے والا شخص کافر ہوگا، اور جو احکام قطعی ہوں؛ مگر اس درجہ مشہور ومعروف نہوں تو ان کے منکر کو اول وہلہ میں کافر نہیں کہا جائے گا، بلکہ پہلے اس کو تبلیغ کی جائے گی اور اس کا قطعی ہونا اس کے سامنے واضح کیا جائے گا، اس کے بعد بھی وہ انکار پر قائم رہے تب اس کے کفر کا فیصلہ کیا جائے گا۔ (۱)

نیز جو احکام ضروی یا قطعی نہ ہوں بلکہ ظنی ہوں، خواہ ثبوت کے لحاظ سے ظنی ہوں یا دلالت کے لحاظ سے، ان کی تصدیق نفسِ ایمان کے تحقق کے لئے شرط نہیں، کوئی اگر ان کی تصدیق نہ کرے وہ ایمان سے خارج قرار نہیں پائے گا۔

اور عوام وخواص میں شہرت سے مراد یہ ہے کہ دینی شعور رکھنے والی عوام میں سے اکثریت اس سے واقف ہو، لہذا جن لوگوں کو دینی شعور نہو وہ اگر کسی دینی مسئلہ سے ناواقف ہوں تو ان کی ناواقفیت کے باوجود وہ مسئلہ ''ضروری'' شمار کیا جائے گا اور اس کا منکر کافر ہوگا، ایسے ہی عوام میں سے ہر ہر فرد کا واقف ہونا بھی ضروری نہیں اکثر عوام کا واقف ہونا بھی کافی ہے، لہٰذا جس مسئلہ سے اکثر عوام واقف ہے اس کا منکر بھی کافر قرار پائے گا۔ (۲)

کفر کے لغوی واصطلاحی معنی:

کفر؛ ایمان کی ضد ہے اس کے معنی ہیں چھپانا، کافر کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو چھپاتا ہے۔

اور اصطلاح شرع میں کفر کہتے ہیں: '' **عدم التصدیق بماعلم بالضرورۃ أنه من دین محمد صلی الله علیه وسلم** '' یعنی جو امور ایسے ہیں کہ ان کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا حصہ ہونا

(۱) جواهر الفقه ۱/ ۱۱۳، ۱۱۴.

(۲) الفتاوی الحدیثیة ص ۱۴۱، اکفار الملحدین ص ۲.

ضروری یا قطعی طور پر ثابت ہے ان میں سے کسی ایک امر کو بھی دل سے سچا تسلیم نہ کرنا کفر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ محض کسی ایک امر قطعی کے انکار سے انسان کافر ہو جائے گا، تحقق کفر کے لئے تمام قطعیات کا انکار ضروری نہیں، البتہ تحقق ایمان کے لئے جملہ قطعیات پر ایمان رکھنا شرط ہے۔

بعض نے کفر کی تعریف انکار کے ساتھ کی: ''**الانکار بماعلم بالضرورة أنه من دین محمدالخ**'' لیکن یہ تعریف مخدوش ہے، اس لئے کہ جو شخص نہ تصدیق کرے اور نہ انکار کرے اس پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ اس سے تو منزلة بین المنزلتین لازم آئے گا جو معتزلہ کا مذہب ہے۔

ضروریات دین میں تاویل بھی کفر ہے:

''ضرورة'' کا مفہوم اور اس کا حکم تو اوپر ایمان کی تعریف کے ذیل میں ذکر کر دیا گیا، یہاں یہ واضح رہے کہ یہ بھی عدم تصدیق اور انکار میں داخل ہے کہ کوئی شخص دین کے ضروری اور قطعی احکام میں کوئی ایسی تاویل یا ان کا وہ مفہوم بیان کرے جو تواتر واجماع کے خلاف ہو، جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین ختم نبوت کے انکار کے ساتھ اس کا وہ مفہوم بیان کرتے ہیں جو تواتر و اجماع کے خلاف ہے، اس بناء پر وہ کافر اور خارج از اسلام ہیں۔

اقسام کفر اور ان کا مفہوم:

پھر کفر کی چار قسمیں ہیں (۱) کفر انکار (۲) کفر جحود، (۳) کفر عناد، (۴) کفر نفاق۔

کفر انکار یہ ہے کہ آدمی دل اور زبان دونوں سے انکار کرے، جیسے کفار مکہ دل و زبان دونوں سے انکار کرتے تھے۔

کفر جحود یہ ہے کہ قلب میں تو معرفت ہو، مگر زبان سے اقرار نہ کرے، جیسے کفر ابلیس اور علمائے یہود کا کفر، علماء یہود دل سے معرفت رکھتے تھے جیسا کہ ان کے متعلق قرآن کریم میں ہے: ''**الذین آتینهم الکتاب یعرفونه کمایعرفون ابنائهم**'' یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ ان کو اتنی اچھی طرح جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔[1]

---

(۱) سورة البقرة: ۱٤٦.

کفر عناد یہ ہے کہ قلب میں معرفت ہے زبان سے اقرار بھی ہے لیکن قبول نہ کرے جیسے کفر ابوطالب۔
کفر نفاق یہ ہے کہ قلب میں انکار ہو لیکن اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے زبان سے اقرار کرے جیسے کفر منافقین۔

(۲) حقیقتِ ایمانِ شرعی اور مختلف مذاہب:

ایمان کی حقیقت کے بارے میں امت کا اختلاف ہوا ہے، اسی وجہ سے امت میں مختلف فرقے بنے، ان فرقوں میں سے چند کی حقیقت اور ایمان کے بارے میں ان کے مسلک کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

(۱) فرقہ جہمیہ: ان کے نزدیک ایمان نام ہے صرف معرفت قلبی کا، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار، اعمال کا امتثال اور معاصی سے اجتناب ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے یہاں ضروری نہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے کیونکہ پھر تو علماء یہود بھی مومن شمار ہوں گے کہ یہ معرفت قلبی انھیں حاصل تھی، کمامر۔

(۲) فرقۂ مرجئہ: اس کا کہنا ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق قلبی ہے، باقی کچھ اور لازم نہیں کما ہو مذہب الجہمیہ، ارجاء بمعنی پیچھے ہٹانا یہ لوگ اعمال کو انکے درجہ سے پیچھے ہٹاتے ہیں اسی وجہ سے ان کو "مرجئہ" کہا جاتا ہے۔

(۳) فرقہ کرّامیہ: ان کا عقیدہ ہے کہ ایمان کی حقیقت محض اقرار باللسان ہے اس کے علاوہ کچھ اور لازم نہیں کما ہو مذہب الجہمیہ والمرجئہ۔

ان تینوں فرقوں کے یہاں ایمان ایک بسیط شئے ہے، یعنی یہ ایمان کی حقیقت شئے واحد قرار دیتے ہیں، جو ہر فرقہ کے یہاں الگ ہے کمامر۔

(۴) حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرات متکلمین، شیخ ابوالحسن اشعری اور شیخ ابومنصور ماتریدی یہ سب حضرات فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی کا اور اقرار باللسان دنیا میں اجراء احکام اسلامیہ کے لئے اور عمل بالارکان کمالِ ایمان کے لئے شرط ہے، یہ دونوں ایمان کا رکن نہیں ہیں۔

الحاصل ان حضرات کے یہاں عمل بالارکان ایمان کی حقیقت میں تو داخل نہیں ہے مگر مکمّلِ رکن ہے، یعنی کمال ایمان کے لئے لازم ہے، جبکہ فرقۂ مرجئہ اور دیگر فرقے عمل بالارکان کو نہ نفس ایمان کا جز مانتے ہیں اور نہ کمال ایمان کے لئے لازم قرار دیتے ہیں، بعض لوگوں نے متکلمین اور احناف پر مرجئہ ہونے کا الزام لگایا ہے جو حقیقت شناسی پر مبنی نہیں ہے۔

(۵)اکثر فقہائے احناف فرماتے ہیں کہ ایمان نام ہے تصدیق قلبی اوراقرار باللسان دونوں کے مجموعہ کا، گویا کہ اقرار باللسان بھی ایمان کارکن ہے،لیکن رکن اصلی نہیں ہے،رکن زائد ہے، اسی لئے اقرار باللسان بعض صورتوں میں ساقط ہوجاتا ہے جیسے گونگے سے اور مُکرَہ سے۔

مگر یہ اختلاف اس وقت ہے جب کہ اقرار باللسان کا مطالبہ نہ کیاجائے اوراگراقرار باللسان کا مطالبہ کیاجائے تو پھراقرار باللسان بالاتفاق رکن ہے اس کے بغیر آدمی مسلمان شمارنہیں ہوگا۔[1]

(۶)جمہور محدثین، ائمہ ثلاثہ،معتزلہ اورخوارج کہتے ہیں کہ ایمان نام ہے تین چیزوں کے مجموعہ کا: (۱)التصدیق بالجنان (۲)الاقرار باللسان (۳)العمل بالارکان، پھرایمان ان تمام اجزاء پر برابری کے ساتھ صادق آتا ہے یاتفاوت کے ساتھ،یعنی متواطی ہے یامشکک؟اس میں اختلاف ہے:

جمہورمحدثین اورائمہ ثلاثہ نے فرمایا: کہ اجزاءِ ایمان کی حیثیت میں تفاوت ہے، اگر تصدیق قلبی فوت ہوجائے اوراقرار موجود ہے تو وہ شخص منافق ہے اوراگر اقرار باللسان بھی فوت ہوجائے تو وہ کافرِ مجاہر ہے اوراگرعمل بالارکان فوت ہوجائے البتہ تصدیق واقرار موجود ہوتو ایسا شخص فاسق ہوگا، گویا ایمان ان کے یہاں کلی مشکک ہے کہ اپنے افراد پرکمی زیادتی کے ساتھ صادق آتا ہے،سب اجزاء کا درجہ برابرنہیں۔

معتزلہ وخوراج کے یہاں ایمان کلی متواطی ہے اوراس کے تینوں اجزاء کا درجہ مساوی ہے ان میں سے کوئی ایک بھی فوت ہوجائے تو وہ شخص مومن نہیں ہے، پھرایسے شخص کے متعلق معتزلہ وخوارج کے مابین اختلاف ہے کہ وہ کافر ہوا یانہیں؟ خوارج کہتے ہیں کہ کافر ہے اورمعتزلہ کہتے ہیں کہ نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ منزلۃ بین المنزلتین ہے،یہ کل آٹھ قول ہوگئے۔

---

(۱)اقرارباللسان کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ دنیامیں احکام اسلام (وراثت، ولایت، شہادت، امامت، اور تدفین فی مقابرالمسلمین وغیرہ) کے اجراء کے لئے اقرار باللسان شرط ہے، اس کے بغیر دنیامیں کوئی شخص مسلمان شمارنہیں ہوگا،خواہ وہ کسی عذرومجبوری کی بناء پراقرار باللسان سے عاجز ہو،اورآخرت میں مسلمان شمارہونے کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ: (۱)اگرکسی عذرشرعی کی بناء پراقرار باللسان نہ کیاہو، مثلاً گونگا ہو، یااس کی مہلت نہ مل سکی ہو کہ تصدیق قلبی کے بعدفوراً انتقال ہوگیاہو، یااقرار باللسان کرنے کے بارے میں جان کاخوف ہو اس قسم کے اعذار کی وجہ سے اقرار باللسان نہیں کیا تو آخرت میں بہرحال مسلمان شمارہوگا، اوراگر بلاعذرشرعی کے اقرار باللسان نہیں کیا تو اس کی دوصورتیں ہیں: (الف)اس سے اقرار باللسان کا مطالبہ کیا گیا تھا، اس کے باوجود اقرارنہیں کیاتو بالاتفاق آخرت میں مسلمان شمارنہیں ہوگا، اورخلود فی النارکا مستحق ہوگا، (ب) خودبھی اقرار نہ کیااورنہ کسی نے مطالبہ کیا، اس کے حکم میں اختلاف ہے: جمہورمحدثین فرماتے ہیں یہ بھی خلود فی النارکا مستحق ہے اوراحناف ومتکلمین کے نزدیک یہ مسلمان شمارہوگا اورنجات پائے گا(فتح الملہم ۱/۴۱۰، درس مسلم ازمفتی رفیع عثمانی ۱/۱۸۲)

احناف اور جمہور محدثین کے مذہب میں فرق اور اس کی وجہ:

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ احناف اور جمہور محدثین کا جو اختلاف ہے وہ لفظی ہے کہ احناف نے عمل بالارکان کو جزء اصلی نہیں مانا، اور جمہور محدثین بھی اس کو جزء اصلی نہیں مانتے، بلکہ جزء زائد مانتے ہیں، اس لئے عمل بالأرکان فوت ہوجانے کی صورت میں احناف اور ائمہ ثلثہ نتیجہ پر متفق ہیں، چنانچہ ایسے شخص پر سب کے یہاں فاسق ہونے کا حکم لگایا جائے گا نہ کہ کافر ہونے کا، اور در حقیقت احناف اور جمہور محدثین کا یہ اختلاف زمانہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے تعبیر کے فرق پر محمول ہے کہ امام صاحب کے زمانہ میں معتزلہ کا زور تھا جو عمل بالارکان کو ایمان کا جزو مانتے تھے، لہٰذا امام صاحب نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ عمل ایمان کا جزو نہیں ہے، اور جمہور محدثین کے زمانہ میں مرجئہ کا زور تھا جو عمل بالارکان کے قائل ہی نہ تھے، ان کی تردید کے لئے جمہور محدثین نے فرمایا کہ عمل بالارکان بھی ایمان کا جزو ہے۔

(۳) ایمان میں کمی یا زیادتی ہوتی ہے یا نہیں؟:

امام صاحب اور متکلمین فرماتے ہیں ایمان میں کمی زیادتی نہیں ہوتی **الایمان لایزید ولاینقص**، اور ائمہ ثلاثہ وجمہور محدثین فرماتے ہیں کہ ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، ان کی دلیل ہے ''وَإِذَاتُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيْمَاناً'' جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں[1] اصل میں یہ اختلاف پہلے اصولی اختلاف پر متفرع ہے کہ امام صاحب اور متکلمین کے یہاں ایمان مفرد ہے اور مفرد میں کمی بیشی نہیں ہوتی اگر اس میں کمی ہوجائے تو وہ چیز ہی فوت ہوجائے گی اور ائمہ ثلثہ ومحدثین کے یہاں ایمان مرکب ہے اور مرکب میں کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

امام صاحب کی طرف سے مذکورہ آیت کریمہ کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں ایمان کی زیادتی سے ''مومن بہٖ'' کی زیادتی مراد ہے، یعنی سو آیات نازل ہوئیں تو مومنین کا ان پر ایمان تھا، پھر مزید دس آیتیں اور نازل ہوئیں تو مومنین کا ان پر بھی ایمان ہوگیا، تو یہ زیادتی ''مومن'' بہٖ کے اعتبار سے ہوئی نہ کہ نفس ایمان کے اعتبار سے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اصل ایمان میں زیادتی مراد نہیں ہے بلکہ کمال ایمان میں زیادتی مراد ہے،

(۱) سورۃ الأنفال، رقم الآیۃ: ۲.

اعمال سے کمال ایمان اورنور ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اصل ایمان اپنے حال پر رہتا ہے۔

(۴)ایمان واسلام میں فرق:

علماء کے درمیان اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ ایمان اوراسلام میں فرق ہے یانہیں؟ چنانچہ بعض علماء نے فرمایا کہ ایمان واسلام دونوں مترادف ہیں، قوم لوط کے بارے میں اللہ نے فرمایا ''فَأَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ '' پس ہم نے نکال لیا ان مومنین کو جو اس بستی میں تھے، آگے فرمایا ''فَمَاوَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَبَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ[۱]'' کہ اس میں (بستی میں) ایک گھر کے سوا ہم نے کسی اور گھر کو مؤمن نہیں پایا، ان آیات میں ایک ہی قوم کو پہلے مؤمنین سے تعبیر کیا ہے اور پھر مسلمین سے، معلوم ہوا کہ ایمان اوراسلام دونوں مترادف ہیں۔

جمہورعلماء نے فرمایا کہ ایمان واسلام میں فرق ہے، کہ ایمان نام ہے طاعت وانقیاد باطنی کا اور اسلام نام ہے طاعت وانقیاد ظاہری کا، یہی صحیح ہے، قرآن کریم کی اس آیت سے دونوں میں فرق کا ہونا بداہۃً ثابت ہے ''قَالَتِ الاعْرَابُ اٰمَنَّا قَل لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا ''یعنی یہ دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں ان سے کہو کہ تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔[۲]

اسلام اورایمان کا مذکورہ فرق مفہوم کے لحاظ سے ہے کہ مفہوم میں دونوں کے تغائر ہے لیکن مصداق کے اعتبار سے دونوں میں تلازم ہے کہ اسلام کے لئے ایمان لازم اورایمان کے لئے اسلام لازم ہے، چنانچہ انقیاد باطنی، انقیاد ظاہری کے بغیر اورانقیاد ظاہری، انقیادی باطنی کے بغیر معتبر نہیں، حضرت علامہ انورشاہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ ایمان واسلام میں تلازم ہے، مبدأ دونوں کا الگ ہے مگر منتہی دونوں کا ایک، کہ ایمان تصدیق قلبی سے شروع ہوتا ہے اورطاعت ظاہری پر منتہی ہوتا ہے اوراسلام طاعت ظاہری سے شروع ہوتا ہے اورطاعت باطنی پر منتہی ہوتا ہے،[۳] حدیث جبرئیل جو آئندہ آرہی ہے اس سے بھی دونوں میں فرق کا ہونا ثابت ہے کہ ایک سوال اسلام کے متعلق ہے اورایک ایمان کے متعلق۔

(۱)سورۃ الذاریات: ۳٦.

(۲)سورۃ الحجرات: ۱٤.

(۳)فیض الباری ۱/ ۱٤۲، ۱٤۳. مطبوعه أشرفیه دیوبند.

قول اول کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ وہاں اسلام اور ایمان کا متحد ہونا مصداق کے لحاظ سے ہے اور مصداق کے لحاظ سے دونوں میں تلازم ہے کمامر۔

اَلفَصْلُ الاوَّلُ

۲/۱ عَنْ عُمَرَبْنِ الخَطَّابِ رضي الله عنه قَالَ : بَيْنَمَا نحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ علَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِيَابِ،شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لايُرَى عَلَيْهِ أَثَرُالسَّفَرِ، وَلايَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَبِيِّ صلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ،فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلٰى رُكْبَتَيهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ،وَقَالَ: يامُحَمَّدُ! أَخْبِرْنِيْ عَنِ الإِسْلامِ، قَالَ: اَلإِسْلامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّآإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَ تُقِيْمَ الصَّلاةَ ، وتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رمَضَانَ، وتحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيهِ سَبِيْلاً، قَالَ: صَدَقْتَ؛ فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ ويُصَدِّقُهُ! قَالَ: فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الإِيْمَان، قَالَ: أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلائِكَتِهٖ، وَكُتُبِهٖ، وَرُسُلِهٖ، وَالْيَوْمِ الآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ، قَالَ: صَدَقْتَ .قَالَ: فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الإِحْسَانِ، قَالَ: أَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ، قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ، قَالَ: مَاالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" قَالَ: فَأَخْبِرْنِي عَنْ أَمَارَاتِها. قَالَ: أَنْ تَلِدَ الأَمَةُ رَبَّتَهَا وَأَنْ تَرَى الْحُفَاةَ العُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ" قَالَ: ثُمَّ انْطَلَقَ، فَلَبِثْتُ مَلِيًّا،ثُمَّ قَالَ لِيْ:" ياعُمَرُ! أَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ" ؟ قلتُ: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: فَإِنَّهٗ جِبْرَئِيْلُ، أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ ، رَوَاهُ مُسْلِمٌ[۱] ورواه أَبُوْهُرَيْرَةَ مَعَ اخْتِلافٍ، وَفِيْهِ: وَإِذَا رَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الصُّمَّ الْبُكْمَ مُلُوْكَ الأَرْضِ، فِيْ خَمْسٍ لايَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللّٰه. ثُمَّ قَرَأَ "إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ"الآيَةُ، مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ[۲]

(۱)أخرجه مسلم في الإيمان،۱ / ۲۷.

(۲) أخرجه البخارى في الإيمان ،باب سؤال جبرئيل النبي صلى الله عليه وسلم عن الايمان الخ ۱ / ۱۲ برقم ۳۶، وفي التفسير، باب قوله تعالىٰ: إن الله عنده علم الساعة ۲ / ۷۰۴ برقم ۴۵۹۱، ومسلم في الإيمان، باب بيان الإيمان والإسلام والإحسان ۱ / ۲۹، برقم ۵.

ترجمہ: حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ اس دوران کہ ایک دن ہم حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے اچانک ایک شخص ہمارے درمیان آیا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال نہایت سیاہ تھے، اس شخص پر آثار سفر نظر نہیں آرہے تھے (جس سے یہ سمجھا جاتا کہ یہ شخص کہیں سے سفر کرکے آیا ہے اور اجنبی ہے) اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مقامی شخص نہیں تھا) وہ شخص حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت قریب آکر بیٹھا اور اس نے اپنے گھٹنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے ملادیئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی دونوں رانوں پر رکھ لئے اور عرض کیا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھ کو اسلام کے بارے میں خبر دیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ گواہی دے تو اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تو نماز قائم کرے، (اور اگر صاحب نصاب ہو تو) زکوۃ اداء کرے، رمضان المبارک کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر بیت اللہ جانے کی استطاعت پاوے، اس شخص نے یہ سن کر کہا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سچ فرمایا (حضرت عمرؓ فرماتے ہیں) کہ ہمیں اس کی حالت پر تعجب ہوا کہ یہ شخص (لاعلم آدمی کی طرح پہلے تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتا ہے اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے (جیسے اس کو ان باتوں کا پہلے سے علم ہو) پھر اس شخص نے عرض کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے ایمان کی حقیقت بتائیں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: (ایمان یہ ہے کہ) تو تصدیق کرے اللہ کی اور اس کے فرشتوں کی اور اس کی کتابوں کی، اور اس کے رسولوں کی اور قیامت کے دن کی اور ایمان لاوے تقدیر پر کہ اچھا برا، سب کچھ نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہے، اس شخص نے (یہ سنکر) کہا: (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) نے سچ فرمایا (پھر) اس شخص نے عرض کیا کہ اب آپ مجھے احسان کے متعلق خبر دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ شانہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو (یعنی اتنا حضور قلب میسر نہ ہوسکے) تو پھر (یہ دھیان میں رکھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے، پھر اس شخص نے عرض کیا کہ قیامت کے بارے میں مجھے بتایئے (کہ کب آئے گی؟) آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے

فرمایا کہ اس بارے میں مسئول عنہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا، پھراس نے کہا اچھا مجھے خبردیں قیامت کی کچھ نشانیوں کے بارے میں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا(کہ قیامت کی علامت یہ ہے کہ) باندی اپنی مالکہ کو جنے اورتم دیکھوگے برہنہ پا، برہنہ جسم، نادار وفقیر اوربکریاں چرانے والوں کو عالیشان عمارات ومکانات میں فخروغرور کرتے ہوئے (حضرت عمرؓفرماتے ہیں) اس کے بعد وہ شخص چلا گیا اورمیں چند دن ٹھہرارہا (یعنی فوراً اس کے بارے میں دریافت نہیں کیا) پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خودہی مجھ سے فرمایا اے عمر! جانتے ہوسوال کرنے والا وہ شخص کون تھا؟ میں نے عرض کیا اللہ اوراس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا یہ جبرئیل علیہ السلام تھے (جواس طریقہ سے) تم لوگوں کوتمہارا دین سکھانے آئے تھے، امام مسلمؒ نے اس حدیث کو اپنی کتاب صحیح مسلم میں اپنی سند سے بیان فرمایاہے، حضرت ابوہریرہؓ نے بھی اس روایت کو چند الفاظ کے اختلاف وفرق کے ساتھ بیان کیاہے (ان کی روایت کے آخری الفاظ یہ ہیں) **واذرایت الخ** کہ جب تم برہنہ پا، برہنہ جسم، اوربہرے گونگے لوگوں کو زمین پرحکمرانی کرتے دیکھو(توسمجھ لوقیامت قریب ہے) قیامت ان پانچ چیزوں میں سے ایک ہے جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سواکسی کونہیں ہے، اورپھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "**ان اللہ عندہ علم الساعۃ وینزل الغیث**" آخرتک، (جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: اللہ ہی کوقیامت کا علم ہے اوربارش کا، کہ کب برسائے گا اوروہی حاملہ کے پیٹ کی چیزوں کو جانتاہے اورکوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کام کرے گا، اورکسی شخص کومعلوم نہیں کہ کس زمین میں اسے موت آئے گی، بے شک اللہ تعالیٰ ہی جاننے والااور خبردار ہے)(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

عن عمر بن الخطابؓ قال بینما الخ: یہ حدیث جبرئیل ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگی ہوئی تھی اورصحابہ بیٹھے ہوئے تھے کہ اجنبی شخص کی شکل میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اورچند سوالات کئے، اسلام کے بارے میں سوال کیا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا، ایمان کے بارے میں سوال کیا، احسان کے بارے میں سوال کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کے جوابات ارشاد فرمائے، قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا اس کے جواب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت فرمادی، البتہ علامات قیامت کے بارے میں سوال کیا تو اس کا جواب مرحمت فرمایا۔

حدیث کی جامعیت:

علماء نے فرمایا کہ یہ روایت بہت جامع ہے، اس روایت میں پوری شریعت کا خلاصہ آگیا ہے، تمام عبادات ظاہرہ وباطنہ اس میں آگئی ہیں، کیونکہ دین کا خلاصہ تین چیزیں ہیں: عقائد، اعمال اور اخلاص واحسان، جس کو سلوک وتصوف بھی کہا جاتا ہے، اس حدیث میں یہ تینوں چیزیں آگئیں ہیں، اس لئے یہ حدیث باقی تمام احادیث کے لئے بمنزلہ متن کے اور باقی احادیث اس کے لئے بمنزلہ شرح کے ہیں، اور حدیث نیت بمنزلہ بسم اللہ کے ہے، جیسے سورہ فاتحہ کہ اس میں قرآن کریم کے تمام اجمالی مضامین آجانے کی وجہ سے وہ بمنزلہ متن کے اور باقی قرآن بمنزلہ اس کی شرح کے ہے۔

حدیث کے اسماء:

اس حدیث کی جامعیت کی وجہ سے اس کے متعدد نام رکھے گئے ہیں: (۱) ام الاحادیث (۲) ام السنۃ (۳) ام الجوامع (۴) اور مشہور نام حدیث جبرئیل ہے۔

حدیث پاک کا شان ورود:

اس حدیث کا شان ورود یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ اپنی ضرورت اور اپنی اصلاح نفس کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیا کرتے تھے، منافقین، مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے، چنانچہ وہ بھی مجلس میں حاضر ہوتے، وہ لوگ وقت کو ضائع کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرنے کے لئے بے ڈھنگے سوالات کرتے تھے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ''يَـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَاءَ الـخ'' اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوالات نہ کیا کرو جو اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔(۱)

(۱) سورۃ المائدۃ: ۱۰۱۔

اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کے سوالات کا سلسلہ بند ہوگیا، لیکن خوف کی وجہ سے صحابہ نے بھی سوالات بند کردیئے کہ اللہ کا عتاب نہ آجائے، لیکن اس سے صحابہؓ کو پریشانی ہوئی کیونکہ ان کو مختلف دینی ضرورتیں پیش آتی رہتی تھیں، اس لئے ان کی تمنا رہتی تھی کہ کوئی شخص آکر دین کے بارے میں سوالات کرے، آپ علیہ السلام جواب دیں جس سے ہمیں بھی علم حاصل ہو، دیہاتی لوگ آداب سے واقف نہیں ہوتے اور بڑوں کے یہاں ان کی گرفت بھی نہیں ہوتی، اس لئے وہ بے تکلف سوال کرتے ہیں، جس سے سننے والوں کو زیادہ فائدہ ہوسکتا تھا، اس بناء پر صحابۂ کرام کسی ایسے شخص کے منتظر تھے، اسی دوران ایک روز جبرئیل علیہ السلام ایک اجنبی انسان کی شکل میں تشریف لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سوالات کئے جو حدیث میں مذکور ہیں۔ (۱)

بینما: اس کی اصل ''بین'' ہے جو ظرف ہے، اس میں میم اور الف کا اضافہ ہوا ہے، الف کا اضافہ اشباع اور تحسین صوت کے لئے ہے، میم بھی اسی وجہ سے زائد کیا گیا ہے۔

عند: ظرف ہے اور اس کا متعلق محذوف ہے ''نحن حاضرون عند الخ'' اور ''حاضرون'' ''نحن'' کی خبر ہے۔

ذات یوم: ذات کا اضافہ تحسین کلام کے لئے ہے، بعض نے کہا کہ ''الیوم'' کا استعمال مطلق وقت کے معنیٰ میں بھی ہوتا ہے، وہ وقت خواہ دن ہو یا رات، جب اس لفظ کو دن کے ساتھ خاص کرنا منظور ہوتا ہے تو ذات کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں یہی بتانے کے لئے ''ذات'' کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔

طلع: بمعنی وَرَدَ و دَخَل، اس شخص کی آمد کو طَلَعَ سے تعبیر کیا، اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والے شخص کا چہرا انتہائی روشن ونورانی تھا، اس لئے کہ اہل عرب نورانی چیز کے آنے کو طلوع سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے طلوع شمس، طلوع قمر، طلوع نہار، رات اندھیرے والی ہوتی ہے اس لئے طلوع لیل نہیں کہا جاتا۔

رجلٌ: کی تنوین تعظیم کے لئے ہے ''ای رجلٌ عظیمٌ'' یعنی ذی وقار ذی وجاہت شخص تھا، مراد اس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔

---

(۱) مسلم شریف ۱/۲۹، والمرقاۃ ۱/۱۰۷۔

شدید بیاض الثیاب: یہ اضافت لفظیہ ہے کہ صیغۂ صفت کی اضافت اپنے معمول کی طرف ہورہی ہے، اصل عبارت تھی: "شدیدٌ بیاضٌ ثیابُہ" اورالثیاب کا الف لام عوضی ہے اس کی اصل تھی: "ثیابہ" یعنی آنے والے شخص کے کپڑے نہایت سفید تھے۔

طلبہ کوسفید کپڑوں کا اہتمام کرنا چاہئے:

اس سے معلوم ہوا کہ سفید کپڑا پہننا بالخصوص طلبہ کے لئے مستحب ہے خاص طور سے بڑوں کی خدمت میں جاتے وقت اس کا لحاظ زیادہ مناسب ہے، اگر سفید کپڑے میسر نہ ہوں تو پھر صاف ستھرے ضرور ہوں۔

شدید سواد الشعر: ابن حبان کی روایت میں ہے شدید سواد اللحیہ [1] کہ ڈاڑھی کے بال کالے تھے یعنی وہ نوجوان تھے۔

تحصیل علم کا زمانہ:

معلوم ہوا کہ تحصیل علم کا اصل وقت عنفوان شباب ہے کہ وہ قوت کا زمانہ ہوتا ہے، اس وقت الفاظ ومعانی کوذہن میں بٹھانا ان کو یاد کرنا اور مستحضر رکھنا سہل ہوتا ہے بڑھاپے میں حافظہ واعصاب کمزور ہوجاتے ہیں، سہوونسیان کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ [2]

لایری الخ: اس پرسفر کے آثار نظر نہیں آرہے تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا، یعنی وہ شخص مدینہ کا نہیں تھا بلکہ کوئی مسافر تھا لیکن اس پرسفر کے آثار یعنی جسم وکپڑوں پر گردوغبار بھی نہیں تھا۔ یہ بات حضرت عمرؓ نے بطور تعجب کہی کہ پھر آخر یہ آنے والا کون ہے؟

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ نے ان کونہیں پہچانا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ حضرات صحابہؓ میں سے کسی نے بھی نہ پہچانا ہو، پھر وہ سب کے پہچاننے کی نفی کیوں کررہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کے آنے پر حضرات صحابہؓ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے **فنظر بعضنا الی بعض** اس لئے حضرت عمرؓ نے سب کی طرف سے نفی کی ہے۔ [3]

---

(۱)صحیح ابن حبان ۱/۳۹۰(۱۶۸).

(۲)المرقاۃ ۱/۱۰۸، مطبوعہ اشرفیہ دیوبند.

(۳)مرقاۃ ۱/۱۰۸، مطبوعہ اشرفیہ دیوبند.

اورخود حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کب پہچانا؟ اس سلسلہ میں اگرچہ زین العرب نے فرمایا کہ آپ علیہ السلام نے اول وہلہ میں پہچان لیا تھا، لیکن حافظ ابن حجر نے بعض صریح روایات کی روشنی میں فرمایا کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت پہچانا جب جبرئیل علیہ السلام چلے گئے۔ (۱)

حتی جلس الخ: حتیٰ غایت کے لئے آتا ہے یہاں اس کا مغیا محذوف ہے، معنی یہ ہیں ''**لايعرفه منا أحد فاستأذن فاذن حتى جلس الخ**''

طالب علم کے لئے بیٹھنے کے آداب:

آنے والا شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب بیٹھا، معلوم ہوا کہ طالب علم کو استاذ کے قریب بیٹھنا چاہئے، سائل کو مسئول کے قریب ہونا چاہئے، پھر بیٹھنے کی ہیئت بتائی کہ وہ دوزانو بیٹھا، معلوم ہوا کہ دوزانو بیٹھنا ادب ہے، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملائے یہ تو بظاہر خلاف ادب ہے؟ لیکن ایسا اس لئے کیا تا کہ صحابہؓ اشتباہ میں رہیں کہ آنے والا کوئی دیہاتی ہے۔

فخذيه: اس کی ضمیر کا مرجع ''رجلٌ'' ہے کہ اس نے اپنی رانوں پر ہاتھ رکھے، لیکن نسائی کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: **وضع كفيه على فخذيه** (۲) کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر ہاتھ رکھے لیکن یہ تو بے ادبی ہے پھر ایسا کیوں کیا؟ تو ایسا یا تو کمالِ توجہ حاصل کرنے کے لئے کیا یا تعمیہ واشتباہ کے لئے کیا۔

یامحمد: اس شخص نے خطاب میں محمد کا لفظ استعمال کیا جو بظاہر بے ادبی ہے، مگر یہ بھی اشتباہِ حال کے لئے کہا تا کہ اس شخص کا دیہاتی پن ظاہر ہو اور کوئی پہچان نہ سکے، ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ محمد یہاں صفتی معنی میں ہو، یعنی وہ ذات جن کی تعریف کی گئی۔ (۳)

علاوہ ازیں مسند ابی حنیفہ میں اس موقعہ پر یارسول اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، نیز مسند ابی حنیفہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حاضری کے وقت سلام کیا اور آپ علیہ السلام نے جواب دیا۔ (۴)

---

(۱) مرقاۃ ۱/۱۰۸، مطبوعہ اشرفیہ دیوبند. فتح الباری ۱/۱۵۷ مطبوعہ شیخ الهند فی آخر المبحث تحت عنوان ''تنبیهات''

(۲) سن نسائی ۲/۲۲۹ (۴۹۹۰)

(۳) المرقاة ۱/۱۵، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان پاکستان.

(۴) مسند الإمام أبي حنيفة: ص ۲۱: برقم ۱.

اخبرني عن الاسلام: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ماہیت اسلام معلوم کرنا مقصود تھا، لیکن حقیقۃً مقصد اعمالِ اسلام معلوم کرنا تھا، جیسا کہ جواب اور تصدیق جواب سے معلوم ہورہا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں اولاً شہادتین کو بیان فرمایا کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی عمل معتبر مقبول نہیں ہے۔

پھر نماز کو بیان فرمایا، اس کے لئے **تقیم الصلوۃ** فرمایا **تصلی الصلوۃ** نہیں، کیونکہ اقامت کے معنی ہیں: کسی چیز کو سیدھا کھڑا کرنا،[۱] پس اقامت صلوۃ کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے فرائض، واجبات اور سنن و مستحبات کا لحاظ کر کے نماز پڑھی جائے اور اس پر مواظبت بھی ہو، بندوں سے منجانب اللہ ایسی ہی نماز مطلوب ہے اسی لئے مقام مدح میں **والمقیمین الصلوۃ** فرمایا گیا ہے اور مقام ذم میں **فویل للمصلین** بولا گیا، کیونکہ مطلق نماز پڑھنا بسا اوقات خراب طریقہ پر بھی ہوتا ہے۔

اس موقعہ پر مسلم میں ''الصلاۃ'' کے ساتھ ''المکتوبۃ'' کی قید بھی وارد ہے، لہٰذا یہاں بھی ''الصلاۃ'' سے صلاۃ مفروضہ مراد ہوگی، اور یہ ''صلاۃ نافلۃ'' سے احتراز ہوگا، کیونکہ وہ ارکان اسلام میں شمار نہیں۔[۲]

حج کی استطاعت کا مفہوم:

یہاں اعمال اسلام کو بتاتے ہوئے حج میں ''استطاعت'' کی قید لگائی حالانکہ استطاعت تو زکوۃ، صوم اور رمضان میں بھی ضروری ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حج میں ایک خاص قسم کی استطاعت ضروری ہے اور وہ ہے زاد و راحلہ پر قادر ہونا، اور بدن کا صحیح ہونا گویا کہ استطاعت بدنی و مالی دونوں ضروری ہیں، اسی لئے عند الاحناف نابینا پر حج فرض نہیں، خواہ وہ مالدار ہو، امام شافعیؒ کے یہاں استطاعت مالی شرط ہے بدنی نہیں، اس لئے ان کے یہاں نابینا پر بھی حج فرض ہے، امام مالک کے یہاں استطاعت بدنی ضروری ہے مالی ضروری نہیں ہے، لہٰذا ان کے یہاں صحیح البدن فقیر پر بھی حج فرض ہے، ایسا شخص حج کے لئے کماتا ہوا جائے جہاں مال ختم ہوجائے وہاں ٹھہر جائے اور کمائے پھر آگے چلے اسی طرح مکہ مکرمہ تک پہنچے۔

فعجبنا: سائل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کی تصدیق کی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں تعجب ہوا کہ سوال بھی کر رہا ہے اور تصدیق بھی! کیوں کہ سوال تقاضا کرتا ہے عدم علم کا اور تصدیق تقاضا کرتی ہے

(۱) تفسیر البیضاوي ۱ / ۱۱۵ ط: دار الفکر.

(۲) مسلم ۱ / ۲۹، کتاب الایمان.

سبقت علم کا، ان دونوں کا جمع ہونا یقیناً موجب حیرت وتعجب تھا۔

ایمان کیا ہے:

اخبرني عن الإيمان: اس نے دوسرا سوال کیا جوایمان کے متعلق ہے، صاحب مشکوۃ نے یہاں تغیر کیا ہے، مصابیح السنۃ میں ایمان کا سوال پہلے ہے اور اسلام کا سوال دوسرے نمبر پر ہے۔ (۱)

امام بغویؒ کے ایک تسامح پر تنبیہ:

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ روایت دوصحابہؓ سے مروی ہے حضرت عمرؓ سے اور حضرت ابو ہریرہؓ سے، حضرت عمرؓ کی روایت مسلم کی ہے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت متفق علیہ ہے، ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ایمان کا تذکرہ پہلے اور اسلام کا بعد میں ہے، امام بغوی نے مصابیح السنۃ میں حدیث عمرؓ کے الفاظ نقل کئے ہیں، اورسوال پہلے ایمان کا نقل کیا حالانکہ ان کی حدیث میں اسلام کا سوال مقدم تھا، یہ امام بغوی کو تسامح ہوا، صاحب مشکوۃ نے اس کو صحیح کیا اور مسلم کی روایت کے مطابق مشکوۃ میں روایت درج فرمائی۔

ایک اشکال وجواب:

أن تومن بالله الخ: یہاں اشکال ہے کہ ایمان کے متعلق سوال کیا جارہا ہے اور ایمان کے لفظ سے ہی اس کا جواب دیا جارہا ہے یہ تو تعریف الشي بنفسہ ہے جو ناجائز ہے؟

جواب: الایمان میں ایمان سے مراد ایمانِ شرعی ہے یعنی ''التصديق بماعلم بالضرورة أنه من دين محمد '' اورأن تومن میں ایمان کے لغوی معنی مراد ہیں کہ تصدیق کرے تو اللہ کی اس کے رسولوں کی اسکی کتابوں کی، الحاصل سوال میں ایمان کے شرعی معنی مراد ہیں اور جواب میں لغوی معنی، اس لئے یہ تعریف الشي بنفسہ نہیں ہے۔

ایمان باللہ اوراس کے تحت داخل امور:

ایمان باللہ میں تین چیزیں داخل ہیں:

(۱) اللہ کے وجود کو تسلیم کرے، اس کا انکار نہ کرے جیسا کہ دہریہ انکار کرتے ہیں۔ وجود باری تعالیٰ کے

(۱) المفاتيح شرح المصابيح ۱/ ۴۰.

بہت دلائل ہیں: ''اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَالاَرْضِ وَاخْتِلافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ الخ [۱]'' زمین میں اور خود انسان کی ذات میں وجود باری تعالیٰ کی نشانیاں موجود ہیں، ''وفي الأرض آيات للمؤقنين وفي انفسكم افلا تبصرون [۲]''، اس بدن انسانی میں عقلاء حیران ہیں، دماغ کی رگوں کی حقیقت تک اب تک بھی ڈاکٹر نہیں پہنچ سکے، اگر بدن انسانی کی رگوں کو پھیلایا جائے تو دور تک ان کا پھیلاؤ ہو جائے، حلق میں سانس کی نلکی الگ ہے، اور کھانے کی نلکی الگ ہے غذا کھانے کی نلکی میں جاتی ہے، غذا کا کوئی ذرہ اگر سانس کی نلکی میں چلا جائے تو پھندہ لگ جاتا ہے مگر غذا کا از خود کھانے والی نلکی میں ہی جانا خدا کی قدرت کا کھلا مشاہدہ ہے، غرض یہ کہ وجود باری تعالیٰ پر بے شمار دلائل ہیں، مشہور ہے کہ ایک چرواہے نے وجود باری پر استدلال کرتے ہوئے کہا:

البعرة تدل على البعير　　والاقدام تدل على المسير

فالسماء ذات البروج　　والأرض ذات الفجاج

كيف لاتدل على اللطيف الخبير

یعنی مینگنیاں اونٹوں کے گذرنے پر اور نشاناتِ قدم لوگوں کے چلنے پر دلالت کرتے ہیں، تو برجوں والا آسمان اور پہاڑوں والی زمین اللہ لطیف وخبیر کی جانب کیسے رہنمائی نہیں کرے گا۔

مگر یہ نشانیاں اہل دانش کو نظر آتی ہیں، ایک بوڑھی عورت سے پوچھا گیا کہ تو نے اللہ کو کس طرح پہچانا؟ اس نے کہا کہ میں نے اس چرخہ سے اللہ کو پہچانا کہ یہ بغیر چلائے نہیں چلتا، تو زمین وآسمان کا یہ مضبوط نظام بغیر چلانے والے کے کیسے چل سکتا ہے، کسی نے کہا:

وفي كل شئ له آية　　تدل على أنه واحدٌ

ہر چیز میں ایک نشانی ہے جو اللہ کے ایک ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

(۲) وحدانیت کی تصدیق کرے کہ وہ اکیلا اس کائنات کا خالق ہے، اور وہ تنہا اس کے نظام کو چلا رہا ہے اور وہی تنہا عبادت کا مستحق ہے، قرآن میں ہے: ''لَوْکَانَ فِیْھِمَا آلِھَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا [۳]'' اگر آسمان

(۱) البقرة: ۱٦٤۔

(۲) الذاريات: ۱۹—۲۰۔

(۳) سورة الانبياء: ۲۲۔

وزمین میں اللہ کے سوادوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہوجاتے، پس کائنات کے نظام کی درستگی اس کے صانع وخالق کے ایک ہونے کی بیّن دلیل ہے۔

(۳) اللہ کے لئے صفات کمالیہ کو ثابت مانے اور نقائص کی نفی کرے، اور اس کی صفات کو مخلوق کے مشابہ نہ سمجھے۔

ایمان بالملائکہ اور لفظ ''ملائکۃ'' کی تحقیق:

وملائکتہ: یہ مَلَکٌ کی جمع ہے، یہ اصل میں مـلئـکٌ تھا اس میں قلب مکانی ہوا ہے، اصل تھا: مئلک جو ألوکة سے ماخوذ ہے بمعنی پیغام رسانی، ألوکة میں قلب مکانی ہوا تو ملئک ہوگیا پھر تخفیف کی وجہ سے ہمزہ حذف کردیا گیا۔ (۱)

ایمان بالملائکہ یہ ہے کہ ان کے وجود کو تسلیم کرے، یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ انسان کے اندر جو جذباتِ خیر پائے جاتے ہیں انہیں کو ملائکہ کہا جاتا ہے، ان کے معصوم ہونے کا عقیدہ رکھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''لایعصون الله الخ''، ان کے مختلف المرتبہ ہونے کو تسلیم کرے کہ درجہ کے لحاظ سے کوئی بڑا ہے کوئی چھوٹا۔ (۲)

آسمانی کتابوں پر ایمان:

وکتبــــہ: ایمان بالکتب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے بہت سے رسولوں کو بھیجا اور ان پر کتابیں نازل فرمائیں، ان تمام کتابوں پر اجمالاً ایمان لاوے یعنی یہ کہ وہ سب اللہ کا کلام ہے اور ان میں جو کچھ فرمایا گیا وہ برحق ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کل ۱۰۴ کتابیں نازل ہوئیں، دس آدم علیہ السلام پر، پچاس شیث علیہ السلام پر، تیس ادریس علیہ السلام پر، دس ابراہیم علیہ السلام پر، ایک داود علیہ السلام پر ایک موسیٰ علیہ السلام پر، ایک عیسیٰ علیہ السلام پر اور ایک آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یعنی قرآن پاک جو ان میں سب سے افضل ہے۔ (۳)

---

(۱) المرقاة ۱/ ۱۱۶.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۱۶.

(۳) المرقاة ۱/ ۱۱۷.

رسولوں پر ایمان:

ورسله: رسولوں پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور اپنے احکامات ان تک پہنچانے کے لئے کچھ انسانوں کا انتخاب کیا، ان میں سے کچھ کا تذکرہ قرآن کریم میں ہے اور اکثر کا تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے، ان کے بارے میں اجمالی طور پر بتلایا گیا ہے، پس یہ ایمان رکھنا ضروری ہے کہ اللہ کی طرف سے رسول بھیجے گئے، اور قرآن کریم میں جن کی تعیین کردی گئی ان کو بالتعیین رسول ماننا ضروری ہے اور جن کی تعیین نہیں کی گئی ان پر اجمالی ایمان ضروری ہے کہ جس کو بھی رسول بنایا گیا وہ برحق تھا۔

یوم آخرت پر ایمان اور اس کا مصداق:

والیــــوم الآخـــــر : اس سے مراد قیامت کا دن ہے، قبروں سے اٹھنے تک اور پھر وہاں سے دخول جنت اور دخول جہنم تک کے زمانہ کو ''یوم آخر'' کہا جاتا ہے، زمانہ اس کے بعد بھی ہوگا لیکن اس کے بعد رات نہیں ہوگی طلوع وغروب کا یہ نظام نہیں ہوگا، اس لئے اس وقت کو یوم آخر قرار دیا گیا۔

اس پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے وقوع کو تسلیم کرے اور اس میں حساب وکتاب، قیام میزان اور جنت وجہنم کی تصدیق کرے۔ (۱)

تقدیر پر ایمان:

وتؤ من بالقدر الخ: مباحث قدر اگلے باب میں آئیں گے، ایمان بالقدر کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو چکا یا ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ ہوگا وہ سب اللہ کو ازل سے معلوم ہے، اور اللہ ہی کے ارادہ وخلق سے ہر چیز کا وجود ہے، اس نے یہ سب کچھ پہلے ہی مقدر فرما دیا تھا، اسی تقدیر کے مطابق یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اعادۂ عامل کی وجہ:

پھر ملائکہ، رسل، کتب وغیرہ پر ایمان کو بیان کرتے ہوئے عامل کا اعادہ نہیں کیا اور تقدیر پر ایمان کو بیان کرتے ہوئے عامل (یعنی ''تؤمن'') کا اعادہ کیا ہے، حالانکہ بذریعۂ عطف اس کو بھی بیان کیا جا سکتا تھا؟ اس

(۱) المفاتیح ۱/۴۳، فتح الإله ۱/۱۹۵-۱۹۶، شرح الطیبی ۱/۸۸.

کی دووجہیں ہیں:

(۱) ایمان بالقدر ایک محیر العقول عقیدہ ہے اس لئے عامل کا اعادہ کیا گیا ہے۔

(۲) ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ماقبل کے مومن بہ ایسے ہیں کہ ان کا کسی بھی طرح انکار موجب کفر ہے اور تقدیر کا انکار علی الاطلاق موجب کفر نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ تقدیر کے باب میں فرقۂ جبریہ اور فرقۂ قدریہ اختلاف کرتے ہیں، جبریہ کا کہنا یہ ہے کہ افعال کا خلق اللہ کرتا ہے بندہ کا سب بھی نہیں ہے، انھوں نے بندہ کو مجبور قرار دیا، اور فرقۂ قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے، افعالِ عباد میں اللہ کی قدرت مؤثر نہیں ہے، انہوں نے تقدیر کا سرے سے انکار کردیا، اسکا حاصل یہ ہوا کہ جبریہ وقدریہ دونوں نے تقدیر کا انکار کیا پس ان پر کیا حکم لگایا جائے گا؟

اس میں تفصیل یہ ہے کہ فرقۂ جبریہ میں سے اگر کوئی بندہ کے مکلّف ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور اگر محض اللہ کی تعظیم کی وجہ سے جبر کا قائل ہے اور بندہ کے مکلّف ہونے کا صراحۃً انکار نہیں کرتا تو وہ مبتدع ہے، اسی طرح قدریہ میں سے اگر کوئی شخص اللہ کی صفت خلق میں حقیقی شرکت کا عقیدہ رکھے تو یہ کفر ہے، اور اگر تقدیر کا منکر اس لئے ہے کہ فعل قبیح کی نسبت اللہ کی طرف لازم نہ آئے، تو وہ مبتدع ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انکار تقدیر علی الاطلاق کفر نہیں ہے، اس فرق کی وجہ سے اس مومن بہ کو الگ بیان کیا اور عامل کا اعادہ کیا گیا۔[۱]

احسان کامفہوم اور عمل کے طریقے:

قال فأخبرني عن الإحسان الخ: سائل نے تیسرا سوال احسان کے بارے میں کیا، احسان کے معنی ہیں: احسان العمل یعنی کسی کام کو اچھے طریقہ سے انجام دینا، سائل کا مقصد یہ ہے کہ ارکان خمسہ اور دیگر اعمال کو عمدہ طریقہ پر ادا کرنے کی صورت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دو طریقے بتائے ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ:

اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ استحضاری کیفیت اتنی بڑھ جائے گویا بندہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو ''استغراق ومشاہدہ'' کہا جاتا ہے، اس حالت میں جو عبادت ادا کی جائے گی وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی

(۱) المرقاة ۱/ ۱۱۶.

ہوگی، جیسے غلام آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرے جب وہ سامنے ہواور غلام کواور اس کے کام کو دیکھ رہاہو، اس وقت غلام خوش اسلوبی سے وظائفِ خدمت انجام دیتا ہے، اسی طرح بندہ جب یہ محسوس کرے کہ میں مولیٰ کے سامنے ہوں اور وہ میرے ہر کام اور ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اس وقت اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیاز مندی پیدا ہوگی اور عبادت عمدہ کیفیت کے ساتھ ادا ہوگی۔

ادنیٰ طریقہ یہ ہے کہ اگر اس قدر استحضاری کیفیت حاصل نہ ہوتو پھر اس عقیدہ کو تازہ کرلیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے کما قال اللہ تعالیٰ: ''اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى الآيه '' اس عقیدہ کے استحضار سے بھی عبادت شاندار ادا ہوگی، جیسے مکتب کا مدرس بچوں کے درمیان ہواور بچوں پر اس کی نظر ہوتو اس وقت زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں، اور اگر وہ وہاں سے اٹھ کر استنجاء کے لئے چلا جائے اور روشن دان سے بچوں کو دیکھے اور بچے اس کو نہ دیکھ رہے ہوں مگر بچوں کو یقین ہو کہ ان کی ہر حالت استاذ کی نگاہ میں ہے تو اس وقت بھی بچے دنگا فساد نہیں کریں گے اور سکون سے پڑھیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ استاذ سامنے ہونے کی صورت میں زیادہ توجہ سے پڑھتے ہیں، اس دوسرے درجہ کو ''مراقبہ واستحضار'' کہا جاتا ہے۔[1]

تصوف کے لئے قرآن کریم میں یہی احسان کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے لہٰذا یہ تصوف قرآن وسنت سے ثابت اور مشروع امر ہے، بدعت نہیں ہے، جیسا کہ بعض حقیقت سے ناآشنا لوگوں کا خیال ہے۔

قیامت کب آئے گی:

قال فاخبرني عن الساعة الخ : اى عن وقت قيام الساعة، دنیا کی تخلیق کا مقصد خالق کی عبادت ہے، یہ مقصد اسلام، ایمان اور احسان سے حاصل ہوگیا، اس لئے اب دنیا کے خاتمہ یعنی قیامت کے متعلق سوال کیا جارہا ہے، یہ سوال صحابہ بھی کیا کرتے تھے اور کفار بھی، لیکن صحابہؓ حصول علم کے لئے اور کفار ازراہِ انکار سوال کرتے، کیونکہ کفار کے لئے قیامت کا عقیدہ ہی سب سے زیادہ حیران کن تھا ورنہ وہ اللہ کو تو مانتے تھے، ان کا اشکال یہ تھا کہ ہزاروں سال پہلے مرے ہوئے لوگوں کو کون زندہ کرے گا؟ ''مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْم قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِىْٓ اَنْشَأَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' اس آیت میں حق تعالیٰ شانہ نے کفار کا سوال نقل فرما کر اس کا نہایت معقول جواب مرحمت فرمایا ہے، بہرحال لوگ سوال کرتے تھے کہ قیامت کب

(۱) المرقاۃ ۱/۱۲۰-۱۲۱، فتح الإله ۱/۲۰۱۱، ۲۰۲، شرح الطیبی ۱/۹۲-۹۶ لمعات ۱/۲۰۷-۲۱۱.

آئے گی؟ جبرئیل علیہ السلام نے بھی یہ سوال کیا۔

الساعة: بمعنیٰ مطلق وقت، غیر معین زمانہ، قرآن وحدیث کی اصطلاح میں اس سے قیامت مراد ہے۔[1]

ماالمسئول عنها بأعلم من السائل: جبرئیل علیہ السلام نے قیامت کے بارے میں سوال کیا حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قیامت کا علم نہیں ہے؟ اس میں اس بات کی تعلیم دینا مقصود ہے کہ جس چیز کا علم نہ ہو اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرنے میں شرم نہیں محسوس کرنی چاہئے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لاعلمی ظاہر فرمادی۔

یہاں شراح نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کے سوال کے جواب میں لاادری فرمانے کے بجائے مذکورہ تعبیر اس لئے اختیار فرمائی کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ کسی بھی سائل اور کسی بھی مسئول کو قیامت کا علم نہیں ہے۔[2]

"**ماالمسئول عنهاباعلم**" اس جملہ میں حرف نفی معنیٔ اسم تفضیل پر داخل ہے اور جب صیغہ تفضیل پر نفی داخل ہوتی ہے تو نفس فعل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی کی نفی ہوتی ہے، اس لئے یہاں سوال یہ ہے کہ کیا قیامت قائم ہونے کا کچھ علم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جبرئیل علیہ السلام کو حاصل تھا کہ جس کی بناپر زیادتِ علم کی نفی کرنا صحیح ہوجائے؟

جواب یہ ہے کہ قیام قیامت کے تحقق کا نفس علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور جبرئیل علیہ السلام دونوں کو تھا اس سے زیادہ (قیامت کے معین وقت) کا علم کسی کو نہ تھا اس لئے صیغہ تفضیل پر نفی داخل کرکے زیادتی کی نفی کی جارہی ہے۔

آپ علیہ السلام کے عالم الغیب ہونے کے بریلوی عقیدے کی تردید:

آپ علیہ السلام کے اس جملہ "**ماالمسئول عنها بأعلم من السائل**" سے اس کی بھی نفی ہوجاتی ہے کہ آپ علیہ السلام کو علم غیب حاصل تھا جیسا کہ بریلوی حضرات اس کے قائل ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو أنباء الغیب یعنی آئندہ وپچھلی بہت سی اخبار وواقعات کا علم عطاء کیا گیا تھا نہ یہ کہ مطلق علم غیب آپ کو

---

(۱) شرح الطیبی ۱/۹۶، مرقاۃ ۱/۱۲۲، فتح الالہ ۱/۲۰۶.

(۲) المرقاۃ ۱/۱۲۳ فتح الالہ ۱/۲۰۶–۲۰۷.

حاصل تھا، ورنہ پھر آپ یہ نہ فرماتے: "ماالمسئول عنھا باعلم من السائل" علم غیب یہ ہے کہ "جمیع ماکان ومایکون إلی یوم القیامۃ" کا علم ہو، ایک ایک جزئی اور ایک ایک ذرہ کا علم ہو، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت جو سب سے بڑا حادثہ ہے اسی کا علم نہ تھا، پھر یہ دعوی کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ آپ کو علم غیب تھا۔

علاماتِ قیامت اور اس کی اقسام:

قال فاخبرنی عن أماراتھا الخ: قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت فرمائی تو سائل نے قیامت کی ان علامات وآثار کے متعلق سوال کیا جن کا وقوع قیامت سے پہلے ہوگا، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامات بعیدہ بیان فرمائیں۔

علامات قیامت دو قسم کی ہیں: (۱) علامات قریبہ، جو عین قرب قیامت میں ظاہر ہوں گی، (۲) علامات بعیدہ، جن کا وقوع قیامت سے پہلے ہوگا۔

یہاں جواب میں چند علامات بعیدہ کو بیان فرمایا گیا ہے:

(۱) باندی آقا کو جنے گی:

ان تلد الأمۃ ربتھا الخ: یعنی باندی جنے گی اپنے آقا ومالکہ کو، اس کے تین مطلب بیان کئے گئے ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے اولاد کے نافرمان ہونے سے، اولاد نافرمان بہت ہوگی بلکہ والدین پر حکمرانی کرے گی، جیسے آقا غلام اور باندی پر حکم چلاتا ہے، تو "الأمۃ" سے مراد ہوگی "ماں" اور "ربۃ" سے مراد ہوگی اولاد، "ربۃ" بمعنی مؤنث اولاد اور جب مونث اولاد حکم چلائے گی تو مذکر تو بدرجہ اولیٰ حکم چلائے گی۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے کثرت فتوحات سے، یعنی فتوحات بہت ہوں گی، مسلمان بہت سے ممالک کو فتح کریں گے، اور فتوحات جب بہت ہوں گی تو باندیاں بھی بہت ہوں گی، یہاں تک کہ باندی سے بچہ ہوگا پھر باپ مرجائے گا اور وہ بچہ اپنے باپ کے تمام اموال کا مالک بنے گا، یہاں تک کہ اپنی ماں پر بھی تسلط قائم کرے گا اور اس کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ یہ میری والدہ ہے۔ (۲)

---

(۱) فتح الإلہ ۱/۲۱۰، المرقاۃ ۱/۱۲۵۔

(۲) شرح الطیبی ۱/۹۷، فتح الإلہ ۱/۲۰۹، المرقاۃ ۱/۱۲۴، لمعات التنقیح ۱/۲۱۱-۲۱۳۔

(۳) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے کثرت جہالت سے، کہ جہالت کی وجہ سے لوگ ام ولد کی بھی بیع کریں گے (ام ولد وہ باندی جس سے آقا نے وطی کی ہو اور اس سے بچہ ہوا ہو، یہ آقا کے مرنے کے بعد آزاد ہوتی ہے اور اس کی بیع جائز نہیں ہے) اور جب آدمی اپنی ام ولد کی بیع کرے گا تو وہ ام ولد فروخت ہوتے ہوئے مختلف ہاتھوں میں پہنچے گی، یہاںتک کہ ایک مدت کے بعد اس کی بھی نوبت آجائے گی کہ اس ام ولد کا جو بچہ تھا جو اپنے باپ کے پاس رہ گیا تھا وہ بڑا ہوکر اس اپنی ماں کو ایک باندی سمجھ کر خریدے گا، نہ اس باندی کو خبر ہوگی کہ یہ میرا بیٹا ہے اور نہ اس بیٹے کو خبر ہوگی کہ یہ میری باندی ہے، تو جب بیٹے نے اس ماں کو خرید لیا تو اس خریدنے کی وجہ سے (ظاہراً) اس کا ''رب'' (مالک) ہوجائے گا اور یہاں پر یہ بات صادق آئے گی کہ باندی نے اپنے مولی کو جنا۔(۱)

(۲) ذلیل لوگ عزت والے ہوجائیں گے:

وأن تری الحفاۃ العراۃ الخ : یعنی ذلیل لوگ عزیز ہوجائیں گے اور وہ تکبر اور فخر میں مبتلا ہوں گے اور عزیزوں کو ذلیل کیا جائے گا۔ ''حفاۃ'' جمع ہے ''حافی'' کی جس کے پاس جوتا نہ ہو، یعنی ننگے پیر، ''عراۃ'' جمع ہے ''عاری'' کی، بمعنی جس کے بدن پر کپڑا نہ ہو، ''عالۃ'' جمع ہے عائل کی بمعنی فقیر و محتاج، ''رعاء'' جمع ہے ''راعی'' کی بمعنی چرواہا، اس قسم کے نادار اور معمولی درجہ کے لوگ عالیشان عمارتیں بنوائیں گے اور ان کی وجہ سے فخر کریں گے۔(۲)

''تطاول'' باب تفاعل سے ہے، اس باب میں تقابل کے معنی پائے جاتے ہیں، یعنی ہر شخص یہ چاہے گا کہ میرا مکان محلّہ میں سب سے نمایاں ہو، کم سے کم پڑوسی کے مقابلہ میں میرا مکان اچھا ہو، کچھ وقت سے عمارتوں کی طرف لوگوں کی توجہ بہت زیادہ ہوگئی ہے جس کے پاس چار پیسے آجاویں اس کو سب سے پہلے مکان بنانے کی فکر ہوتی ہے، باقی تمام حاجتیں پیچھے چھوڑ دی جاتی ہیں، البتہ طویل اور اونچی عمارت بنانا بطور تقابل وتفاخر کے ناپسندیدہ ہے، اگر ضرورۃً طویل اور اونچی عمارت بنائی جائے اس میں کچھ حرج نہیں۔

قال فلبثت ملیا الخ: حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ وہ شخص چلا گیا پھر میں کچھ عرصہ تک ٹھیرا رہا، آپ

(۱) فتح الاله ۱/ ۲۰۹، المرقاۃ ۱/ ۱۲۵، لمعات التنقیح ۱/ ۲۱٤.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۱۲۵.

صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں استفسار نہیں کیا، ملیاً: بمعنیٰ زمانۂ طویل، مگر یہاں اس سے مراد تین دن ہیں، اس لئے کہ ابوداؤد کی ایک روایت میں ''ثلثة ایام'' کے الفاظ آئے ہیں، [1] اور مطلب یہ ہے کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ جانتے ہو وہ سائل کون تھا؟ میں نے کہا **الله ورسوله اعلم** کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔

الله ورسوله اعلم کا مفہوم ومقصد:

حضرات صحابہ کا یہ ادب تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات پوچھتے تو خواہ وہ بات معلوم ہو پھر بھی کہتے تھے **الله ورسوله أعلم**، مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہمارا علم ناقص ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کا جواب بتائیں گے تو کامل علم حاصل ہوگا، اس جملہ کی عبارت ہوتی ہے **الله ورسوله كل منهما أعلم**۔

سوال: اشکال ہوگا کہ حق تعالیٰ شانہ اعلم ہے، وہ عالم الغیب ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو عالم الغیب نہیں ہیں، پھر اعلم ہونے میں آپ کو کیسے شریک کیا؟

جواب: اس جیسے کلام میں اعلم کا تعلق ہر چیز سے نہیں ہوتا، بلکہ اسی جملہ سے تعلق ہوتا ہے جس میں گفتگو ہورہی ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ سائل کو اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں، رسول کے حق میں تمام چیزوں کا زیادہ جاننا مراد نہیں ہے۔

اتاكم يعلمكم دينكم: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ وہ جبرئیل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے، اصل دین تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا، جوابات آپ نے دیئے، لیکن جبرئیل کی طرف نسبت سبب اور ذریعہ ہونے کے اعتبار سے ہے۔

تاریخ حدیث جبرئیل:

یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اخیر عمر میں حجۃ الوداع سے قبل پیش آیا؛ چنانچہ بعض روایات میں صراحت ہے: **بينما نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم في آخر عمره**. [2] اور اخیر عمر میں

---

(۱) أبوداود ۲/ ٦٤٥، فيه: ''فلبثت ثلاثا'' نسائی ۲/ ۲۲۹ میں یہی الفاظ ہیں، ترمذی شریف ۲/ ۸۸ میں یہ الفاظ ہیں ''قال عمر فلقيني النبي صلى الله عليه وسلم بعد ذلك بثلاث''

(۲) المرقاۃ ۱/ ۱۰۷ اشرفیہ دیوبند.

آنے کا مقصد یہ تھا کہ ابتک دین کی جو باتیں تفصیلاً آچکی تھیں ان کا اجمالی خاکہ اخیر میں پیش کردیا جائے تاکہ صحابہؓ اس کو محفوظ کرلیں اوران کو استحضار میں سہولت ہوجائے۔ (۱)

ایک اشکال اوراس کا جواب:

حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے جانے کے بعد ہی بتادیا تھا کہ یہ جبرئیل تھے حالانکہ حضرت عمرؓ کی روایت میں تین دن کے بعد بتانا مذکور ہے جیسا کہ اوپر گذرا؟ جواب یہ ہے کہ اختتام مجلس پر بہت سے صحابہ چلے گئے تھے کچھ باقی رہ گئے،اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا حضرت ابوہریرۃؓ وہیں رہنے والوں میں تھے ان کو اسی وقت علم ہوگیا،حضرت عمرؓ چلے گئے تھے اس لئے ان کو تین دن بعد علم ہوا،پس انھوں نے اپنے علم کے لحاظ سے تین دن کی بات نقل فرمائی۔

حضرت عمرؓ اورحضرت ابوہریرۃؓ کی روایت کافرق:

ورواہ ابوھریرۃ مع اختلاف الخ : یہ روایت حضرت عمرؓ کے علاوہ ابوہریرۃؓ سے بھی مروی ہے مگر دونوں میں کچھ فرق ہے:

(۱) حضرت عمرؓ کی روایت اَفراد مسلم میں سے ہے جیسا کہ مصنف نے اس کے بارے میں فرمایا:''**ورواہ مسلم** ''اورحضرت ابوہریرۃؓ کی روایت متفق علیہ ہے،یعنی بخاری ومسلم دونوں نے اس کوروایت کیا ہے۔

(۲) دونوں میں الفاظ کا بھی فرق ہے حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت میں **الحفاۃ العراۃ** کے ساتھ **الصم البکم ملوک الأرض** کے الفاظ بھی آتے ہیں،**ملوک الارض** رأیت کا مفعول ثانی ہے کہ نااہل اور ذلیل لوگ زمین کے بادشاہ ہوں گے، بہرے سے مراد وہ شخص ہے جو حق بات کے سننے سے بہرا ہو،اور گونگے سے مراد وہ ہے جو اپنی زبان سے حق بات نہ کہتا ہو۔

(۳)حضرت ابوہریرۃؓ کی روایت میں یہ عبارت بھی ہے: **فی خمس الخ** جس کی تقدیر عبارت ہے: **متفکرین فی خمس، الخ** کہ یہ ذلیل اورکم عقل لوگ ان پانچ چیزوں میں غوروفکر کرنے لگیں گے جن کا علم اللہ کے علاوہ کسی کونہیں ہے، جواس آیت میں مذکور ہیں:''**اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الۡغَیۡث**

(۱)المرقاۃ ۱/ ۱۰۷ اشرفیہ دیوبند.

وَيَعْلَمُ مَافِي الاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتَ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ [۱]'' (بلاشبہ اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے، اور وہی بارش برساتا ہے، اور وہی اس کو جانتا ہے جو رحم مادر میں ہے، اور وہی جانتا ہے کہ کون انسان کل کیا کرے گا اور کس کی کہاں موت آئے گی، بیشک اللہ علم والا اور باخبر ہے) یعنی یہ لوگ ان چیزوں میں بھی رائے زنی کریں گے اور اپنے کو بڑا سمجھیں گے۔

بعض نے کہا کہ فی خمس کا تعلق **ماالمسئول عنها بأعلم من السائل** سے ہے أي: **علم قيام الساعة في خمس لايعلمهن الخ** یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کو صرف اللہ جانتا ہے ان امور خمسہ کو ''مفاتیح الغیب'' کہا جاتا ہے۔

محکمۂ موسمیات کی پیش گوئی اور الٹرا ساؤنڈ کی تحقیق:

اس زمانہ میں اشکال ہوتا ہے کہ سائنس داں حضرات آنے والے ایام میں بارش اور موسم کا رخ کیا رہے گا؟ یہ چیزیں پہلے ہی بتا دیتے ہیں نیز الٹرا ساؤنڈ کے ذریعہ رحم مادر کی بات بتاتے ہیں تو پھر ان کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کہاں خاص رہا؟

جواب یہ ہے کہ سائنس والوں کی خبروں میں اکثر تخلف ہوتا ہے، یہ خبریں آئے دن غلط ثابت ہوتی ہیں، اس لئے یہ علم غیب نہیں بلکہ ظن اور اندازہ کی چیزیں ہوتی ہیں، علم میں تخلف نہیں ہوتا، نیز **یعلم مافی الارحام** میں یہ سب داخل ہے کہ اللہ ہی جانتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے؟ بچہ ہے یا کوئی اور چیز ہے؟ بچہ ہے تو وہ مذکر ہے یا مؤنث؟ ایک ہے یا دو؟ مومن ہے یا کافر؟ پستہ قد ہے یا طویل القامت وغیر ذالک من الصفات؟ الٹرا ساؤنڈ سے ان چیزوں کو معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔ [۲]

وماتدری نفس الخ : کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، بسا اوقات آدمی کل کے لئے ارادہ کرتا ہے کسی کام کا، لیکن بخار آ گیا، کوئی حادثہ ہو گیا، انتقال ہو گیا، غرضیکہ اس کام کو نہیں کر پاتا۔

فسخ ارادہ معرفت الٰہی کا ذریعہ:

ایک عارف نے دوسرے عارف سے پوچھا کہ تم نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ انہوں نے کہا کہ کائنات کی علامات سے

(۱) لقمان: ۳٤.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۲۹.

(آسمان وزمین کی تخلیق وغیرہ) انہوں نے کہا کہ تم نے کچھ نہیں پہچانا، دوسرے عارف نے کہا کہ آپ نے اللہ کو کیسے پہچانا؟ انہوں نے فرمایا: عرفتُ ربِّی بفسخِ العَزَائِم. میں نے اپنے رب کو ارادوں کے فسخ کے ذریعہ پہچانا کہ میں ایک چیز کا ارادہ کرتا ہوں، لیکن اس کو نہیں کر پاتا ہوں، بلکہ بسا اوقات ارادہ ہی بدل جاتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اپنی باگ ڈور کسی اور ذات کے قبضہ میں ہے۔

۳/۲: وعَنِ ابنِ عُمَرؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وسَلَّمَ: "بُنِيَ الإِسْلامُ عَلٰى خَمْسٍ: شهادَةِ أَن لَّآ إِلٰهَ إِلاّ اللّٰهُ وأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَإِقَامِ الصَّلاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَالْحَجِّ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ" (متفق علیہ)(۱)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوۃ ادا کرنا (۴) حج کرنا (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

راوی حدیث حضرت ابن عمرؓ کے احوال:

آپ کا اسم گرامی عبداللہ ہے، حضرت عمرؓ کے صاحبزادے ہیں، نبوت سے تقریباً ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور ۷۳ھ میں وفات ہوئی، باپ اور بیٹے دونوں صحابی ہیں، لہٰذا ان کے نام کے ساتھ "رضی اللہ عنہما" پڑھیں گے، اپنے والد کیساتھ ہی اسلام میں داخل ہوئے اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی، غزوۂ بدر میں صغر سنی کی وجہ سے واپس کردیئے گئے، ان کی پہلی شرکت غزوۂ خندق میں ہوئی۔

آپ پر زہد کا بہت غلبہ تھا زندگی میں ایک ہزار غلام آزاد کئے، علماء نے فرمایا کہ: عمر اور عبداللہ بن عمر ان دونوں پر دنیا کبھی غالب نہیں آئی، سنت سے حد درجہ عشق تھا اور سنت کے اتباع کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے، ایک مرتبہ مکہ سے مدینہ منورہ آتے وقت ایک جگہ سواری سے اترے اور تھوڑی دیر بیٹھے اور چل دیئے، خادم کے

(۱) أخرجه البخاري في الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "بني الإسلام على خمس" ١/٦ برقم ٨، والتفسير، باب قوله تعالى وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله ٢/٦٤٨ برقم ٤٣٣٠ تعليقاً، ومسلم في الإيمان، باب بيان أركان الإسلام ودعائمه العظام ١/٣٢.

استفسار پر فرمایا: کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے گزرے تھے اور یہاں پیشاب کیا تھا، اس لئے میں بھی اتباع میں بیٹھ گیا، اگر چہ فی الحال مجھے تقاضہ نہ تھا، حجاج بن یوسف کے زمانہ میں آپکی وفات ہوئی، وفات کا سبب یہ ہوا کہ ایک دن حجاج خطبہ دے رہا تھا، نماز میں تاخیر ہورہی تھی، آپ نے فرمایا "إن الشمس لاینتظرک" یہ بات اس کو بہت ناگوار گزری، وہ آپ سے اندر اندر دشمنی رکھنے لگا، اور ایک شخص کو آپ کے پیچھے لگا دیا، اس شخص نے زہر میں بجھے ہوئے تیر سے آپ کے پیر میں خراش لگائی جس سے زہر پورے بدن میں پھیل گیا، اسی کے نتیجہ میں آپ وفات پاگئے اور شہادت کا درجہ حاصل ہوا۔(۱)

اسلام اور ارکانِ اسلام کی تمثیل:

بني الاسلام علی خمس الخ: حدیث جبرئیل میں اسلام کا ذکر آیا؛ اسلام ایک غیر محسوس چیز ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی، کہ غیر محسوس چیز کو محسوس کے ساتھ مثال دے کر سمجھاتے تھے کہ مثال سے بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ قوت عقلیہ تو معنوی امور کا ادراک کرلیتی ہے، لیکن قوت وہمیہ کا ادراک محسوسات کی حد تک ہے، اس لئے خالص معنوی چیز کے بارے میں عقل اور وہم کا نزاع رہتا ہے، قوت عقلیہ اسکو تسلیم کرلیتی ہے، وہمیہ نہیں، معنوی چیز کی محسوس کے ساتھ مثال بیان کردی جائے تو قوتِ وہمیہ بھی اس کو تسلیم کرلیتی ہے، عقل اور وہم کا نزاع ختم ہوکر وہ مضمون اوقع فی النفس ہوجاتا ہے۔(۲)

شراح نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں اسلام اور اعمال کے باہمی ربط اور شریعت میں ان کی حیثیت اور درجہ بتانے کے لئے اسلام کو خیمہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے؛ کیوں کہ اہل عرب کو خیمہ کے ساتھ بہت تلبس تھا، جب خیمہ قائم کیا جاتا ہے تو اس کے لئے پانچ لکڑیاں چاہئیں، چار کونوں میں اور ایک بیچ میں، جو لکڑی موٹی اور بڑی ہوتی ہے اس کو بیچ میں گاڑا جاتا ہے، اس کو "عمود" کہتے ہیں، پھر چاروں کونوں پر چار لکڑیوں کو گاڑا جاتا ہے، ان سے خیمہ کی رسیوں کو باندھ دیا جاتا ہے، خیمہ کی اگر یہ پانچوں لکڑیاں قائم ہوں تو خیمہ اچھے طریقہ سے قائم ہوگا، لیکن اگر چاروں میں سے کوئی لکڑی ٹوٹ جائے تو اس طرف سے خیمہ سمٹ جائے گا، اس میں نقص پیدا ہوجائے گا اور اس کا فائدہ کم ہوجائے گا، لیکن خیمہ بہر حال قائم رہے گا، کیونکہ بیچ کی

(۱) الإصابه ۳ / ۲۵۳ – ۲۵۸ مطبوعه دار الفکر، والمرقاة ۱ / ۱۳۰ مطبوعه أشرفیه دیوبند.

(۲) فتح الإله ۱ / ۲۲۰، المرقاة ۱ / ۱۳۱.

لکڑی جو اصل ہے وہ قائم ہے اور اگر بیچ والی لکڑی گر جاوے تو خیمہ ہی گر جائے گا۔

یہی مثال ہے اسلام اور دین کی کہ یہ خیمہ کے مشابہ ہے، اللہ کی وحدانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت بیچ کی لکڑی اور "عمود" کی طرح ہے، اسلام کے قیام کا مدار اسی پر ہے، نماز، زکوۃ، روزہ اور حج چار لکڑیوں کے درجہ میں ہیں، اب اگر کسی شخص میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں گی وہ دین میں پختہ ہوگا اور اس کا دین مضبوطی کے ساتھ قائم رہے گا اور اگر ان اعمال میں سے کسی میں خلل پیدا ہو گیا تو اسلام میں نقص پیدا ہو جائے گا، وہلم جراً؛ لیکن اگر خدانخواستہ شہادت اور تصدیق بھی ختم ہوگئی تو اسلام ہی ختم ہو جائے گا۔(۱)

علامہ کرمانیؒ نے ذکر کیا ہے کہ حسن بصری اور مشہور شاعر فرازدق ایک جنازہ میں جمع ہوئے حسن بصریؒ نے پوچھا: "**ماأعَدتَّ لمثل هذه الحالةِ؟** کہ اس حال کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے؟ فرازدق نے جواب دیا: **شهادة ان لااله الا الله**، حسن بصری نے فرمایا: **هذا العمود، فاين الأطناب** یعنی یہ تو عمود ہے، اطناب کہاں ہیں؟ کیونکہ خیمہ سے مکمل استفادہ کے لئے فقط درمیانی لکڑی (عمود) کافی نہیں۔

حدیث پاک میں مذکور مثال سے یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ جو شخص اپنے اسلام کو کامل بنانا چاہے وہ ان ارکانِ خمسہ کی محافظت کرے۔(۲)

ایک اشکال اور جواب:

اس حدیث پر ایک اشکال یہ ہے کہ ارکان اسلام تو ان پانچ کے علاوہ اور بھی ہیں، مثلاً جہاد وغیرہ، تو پھر ان پانچ پر کیوں اکتفاء کیا گیا؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱) مشہور یہی پانچ ارکان ہیں، پس بربناء شہرت ان کا تذکرہ ہے۔

(۲) عبادات دو قسم کی ہیں: قولی اور فعلی، پھر فعلی بھی دو قسم کی ہیں: ایجابی اور سلبی، پھر ایجابی کی تین اقسام ہیں: بدنی، مالی اور مرکب من المال والبدن، قولی: شہادتین ہیں، سلبی: روزہ ہے، فعلی ایجابی بدنی: نماز ہے، فعلی ایجابی مالی: زکوۃ ہے اور فعلی ایجابی مرکب من المال والبدن: حج ہے، پس تمام انواعِ عبادات کی ایک ایک مثال اس حدیث میں پیش کی گئی ہے۔

---

(۱) فتح الإله ۱ / ۲۲۰، المرقاة ۱ / ۱۳۱.

(۲) الكواكب الدراري شرح البخاري للكرماني ۱ / ۸۰ مطبوعه بيروت.

حلِّ عبارت:

عبارت میں خمس کا مضاف الیہ خصال یا دعائم ہے جو محذوف ہے،(۱) شھادۃ اوراس کے معطوفات پر تینوں اعراب جاری ہوسکتے ہیں، خمس سے بدل ہونے کی بناپر جر، اعنی فعل مقدر کا مفعول بہ ہونے کی وجہ سے نصب اوراحداھا مبتدا مقدر کی خبر ہونے کی بناپر رفع آئے گا۔

٤ / ٣: وعَن أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: الْإِیْمَانُ بِضْعٌ وسبْعُوْنَ شُعْبَةً، فأَفْضَلُها قَوْلُ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ و أَدْنَاهَا إِماطَةُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیاءُ شعبةٌ مِّنَ الْإِیْمَانِ. (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان کی شاخیں ستر سے کچھ زیادہ ہیں، ان میں سب سے افضل درجہ کی شاخ زبان و دل سے اس بات کا اقرار و اعتراف کرنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سب سے کم درجہ کی شاخ کسی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹا دینا ہے اور حیاء ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ کے احوال:

ابوہریرہ کنیت ہے، ان کے نام میں بہت اختلاف ہے، ۳۰/قول ہیں، راجح یہ ہے کہ جاہلیت میں آپ کا نام عبدِشمس یاعبدِ عمرو تھا اوراسلام لانے کے بعد آپ کانام عبداللہ یاعبدالرحمٰن ہوا،ان دونوں میں بھی راجح عبدالرحمٰن بن صخر ہے کماقاله الحاکم و ابن حجر العسقلانی (۳) لیکن آپ کی کنیت ہی نام پرغالب رہی ہے۔

(۱)فتح الإله ۱ / ۲۲۱، میں ہے (خمس)أي: خمس دعائم کما فی روایة أوقواعد أوخصال، وفی روایة لمسلم بالتاء؛ أي خمسة اشیاء أوأرکان أوأصول.

(۲)أخرجه البخاري فی الإیمان،باب أمورالإیمان وقول الله عزوجل ولیس البرأن تولوا وجوهکم قبل المشرق والمغرب الآیة ۱ / ٦ برقم ۹، ومسلم فیه، باب بیان عدد شعب الإیمان وأفضلها وأدناها الخ ۱ / ٤٧ برقم ٥٧—٥٨.

(۳)تقریب التهذب (٨٤٢٦)، فتح الإله ۱ / ۲۲٦،والمرقاة ۱ / ۱۳۳.

ھـریر ۃ،ھـرۃ کی تصغیر ہے بمعنیٰ بلّی ، ان کی یہ کنیت کیوں پڑی؟ حالانکہ کنیت تو باپ یا بیٹے کی وجہ سے ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل میں کسی چیز کے ساتھ تلبس کی وجہ سے بھی کنیت پڑ جاتی ہے اوراس وقت لفظ اب ''والا'' کے معنیٰ میں ہوتا ہے، جیسے حضرت علیؓ کی کنیت ابوتراب تھی، جس کا سبب یہ ہوا کہ ایک روز حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ سے ناراض ہوکر باہر آ گئے اورمٹی پر لیٹ گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اورفرمایا قم یـاأبـاترا ب ، اسی طرح حضرت انسؓ ایک روزحمزہ نامی ایک گھاس کاٹ رہے تھے، اس لئے آپ کی کنیت ہی ابوحمزہ ہوگئی۔

بعض نے کہا کہ آپ بچپن میں بلی کے ساتھ کھیل رہے تھے اس پر ان کے والد نے کہا: ابو ہریرہ، لیکن راجح بات وہ ہے جس کو علامہ ابن عبدالبر نے خود ابو ہریرہؓ کے حوالہ سے نقل فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد ایک مرتبہ میں بلی کے بچے کوآستین میں لئے ہوئے تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا اورفرمایا: **ماھذہ ؟** یہ کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ بلی کا بچہ ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **یـااباھریرۃ وفی روایۃ ابن اسحاق: أنت ابوھریرۃ** ۔[1]

آپ قبیلہ دوس کے تھے نبوت سے گیارہ سال قبل پیدا ہوئے، ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر اسلام لائے، ان کو چار سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر آئی لیکن صحابہ میں سب سے زیادہ احادیث ان ہی کے واسطہ سے مروی ہیں، ان کی روایات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) ہے،[2] صحیح اورراجح قول کے مطابق ۵۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی، جنت البقیع میں مدفون ہیں ۔[3]

ابو ہریرۃ منصرف ہے یا غیر منصرف:

''ابو ہریرہ'' منصرف ہے یا غیر منصرف ؟ اس میں بھی اختلاف ہے، بقول بعض یہ منصرف ہے کہ فقط ''ھریرۃ'' علَم نہیں ہے، لہٰذا دوسبب نہونے کی وجہ سے منصرف ہوگا، ضابطہ کی بات تو یہی ہے، مگر چونکہ یہ کلمۂ واحدہ کے طور پر بولا پڑھا جاتا ہے اوراس لحاظ سے اس میں تانیث وعلمیت موجود ہے، تواس کو غیر

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب ۲ / ۷۰.

(۲) فتح الإلہ ۱ / ۲۲۷ مرقاۃ ۱ / ۱۳٤ میں ہے: "وبلغ ماروا‌ہ خمسۃ آلاف وثلثمأۃ وأربعۃ وستین"

(۳) فتح الإلہ ۱ / ۲۲۷، المرقاۃ ۱ / ۱۳٤.

منصرف ہی قرار دیا جائے گا۔[1]

ایمان کے مختلف اور متعدد شعبے:

اس حدیث شریف میں بھی تمثیل ہے کہ ایمان کو تشبیہ دی گئی ہے مضبوط جڑ والے اور ہرے بھرے کثیر شاخوں والے درخت کے ساتھ، ایسے درخت کا سایہ گھنا ہوتا ہے، اس کا فائدہ بہت ہوتا ہے، اس کے سایہ سے کافی لوگ منتفع ہوتے ہیں اور پھل دار درخت ہوتو شاخیں کثیر ہونے کی وجہ سے پھل بھی زیادہ آتے ہیں، اگر اس کی شاخیں کاٹی جاتی رہیں تو اس میں نقص آتا رہے گا، اس کی منفعت کم ہوتی رہے گی، لیکن نفس درخت باقی رہے گا، اگر اس کے تنے کو ہی ختم کردیا جائے تو درخت ہی ختم ہوجائے گا، یہی حال ایمان کا ہے کہ اس کی جڑ تصدیق قلبی اور شہادت ہے اور اعمال اس کی شاخوں کے درجہ میں ہیں، پس جو شخص اپنے ایمان کو کامل ومکمل کرنا چاہے تو تصدیق قلبی کے ساتھ ساتھ اعمال کو بھی مکمل طور پر اختیار کرے، اگر اعمال میں نقص ہوگا تو ایمان میں بھی نقص پیدا ہوگا، اگرچہ نفس ایمان باقی رہے گا، لیکن اگر تصدیق قلبی ختم ہوجائے تو ایمان ہی ختم ہوجائے گا۔

الایمان: اس میں الف لام کمال کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ ایمان کامل کرنے کے لئے ان تمام اعمال کو اختیار کرے۔

بضع: ایک روایت میں **بضعة** ہے **بضع** اور **بضعة** دونوں میں راجح با کا کسرہ ہے اور فتحہ بھی جائز ہے بمعنی قطعہ، درمیان، حصہ، اس کا اطلاق کس عدد پر ہوتا ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں، راجح یہ ہے کہ تین اور دس کے درمیان کے اعداد پر اطلاق ہوتا ہے۔(۲)

شعبة: اس سے مراد شاخ اور خصلت ہے، یعنی اعمال ایمان۔[3]

اختلاف روایت اور اس کے اسباب:

ایک روایت میں اس کے بجائے ’’سبع وسبعون شعبة‘‘[4] اور ایک روایت میں ’’ست وسبعون

(۱) المرقاة ۱/۱۳۳.

(۲) انظر تفصیله فی تحفة الأبرار للبیضاوی ۱/۳۵ والمفاتیح فی شرح المصابیح ۱/۵۸ للزیدانی.

(۳) فتح الإله ۱/۲۲۸.

(٤) المرقاة ۱/۳٤.

شعبة ''[۱] اورایک روایت میں '' بضع وستون شعبة ''[۲] اورایک روایت میں '' اربعة وستون بابا ' یہ کل پانچ روایتیں ہوگئیں۔

پہلی تینوں روایتوں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ ''بضع '' کا اطلاق تین سے لیکر نوتک کے عدد پر ہوتا ہے جس میں سات بھی داخل ہے، لیکن روایت رابعہ وخامسہ پر اشکال ہوگا؟ اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) عدد قلیل عدد کثیر کے منافی نہیں ہوتا کیوں کہ ستر میں ساٹھ بھی پایا جاتا ہے، بغیر ساٹھ کے ستر کا تحقق نہیں ہوتا۔[۳]

(۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاً کم کا علم دیا گیا، پھر زیادہ کا علم دیا گیا اس لئے پہلے کم کو پھر زیادہ کو بیان فرمایا۔[۵]

(۳) ''ستر سے زیادہ '' سے تحدید مقصود ہے یا تکثیر؟ اس سلسلہ میں علامہ طیبی نے فرمایا کہ اظہر یہ ہے کہ تکثیر مقصود ہے، اس طرح کے الفاظ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کثرت کے لئے بولے جاتے ہیں کہا جاتا ہے ''میں تیرے پاس بیسیوں مرتبہ آیا '' (وغیرہ) تکثیر مراد ہونے کی صورت میں دونوں عددوں میں منافات کا سوال نہیں ہوگا۔[۶]

(۴) بعض نے کہا کہ بعض اعمال بعض کے مشابہ ہوتے ہیں جیسے زکوۃ، صدقۂ فطر، اور صدقۂ نافلہ بعض رواۃ نے ان کو تین اور بعض نے ایک شمار کیا، ظاہر ہے اس طرح تعداد کم زیادہ ہوجائے گی۔[۷]

فأفضلها : میں فاء تفصیلیہ اور تفریعیہ دونوں ہوسکتا ہے، یعنی اس میں ماقبل کے اجمال کی تفصیل اور ماقبل کے اصول پر تفریع دونوں احتمال ہیں جیسا کہ ظاہر ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ستر سے اوپر اعمال ہیں، مگر ان میں سب سے افضل عمل لا الہ الا اللہ کہنا ہے، پھر یہاں ''قول '' کہا کیوں کہ نفس لا الہ

(۱) رواه ابوعوانة في صحيحه.

(۲) كما في رواية البخاري ۱ / ٦.

(۳) المرقاة ۱ / ۱۳٤.

(٤) أخرجه الترمذي في سننه في في ابواب الايمان، باب في استكمال الايمان وزيادته ونقصانه.

(٥) شرح مصابيح السنة ص ۲۹، لابن الملك الرومي الحنفي.

(٦) شرح الطيبي للمشكاة ۲ / ٤۳۹.

(۷) شرح مصابيح السنة ص ۲۹، لابن الملك الرومي الحنفي.

الا اللہ تو ایمان کی جڑ ہے جبکہ یہاں مقصد اعمال کو بتانا ہے اس لئے قول کا لفظ لایا گیا۔ اوراس کے ساتھ محمد رسول اللہ نہیں کہا اختصار کی وجہ سے، ورنہ مراد پورا کلمہ ہے۔[۱]

وأدناھا :یہ یاتو ''دنوٌ'' سے ماخوذ ہے بمعنی قرب، اس وقت معنی ہوں گے (اقرب) یعنی ایمان سے سب سے زیادہ قریب خصلت تکلیف دہ چیز کوراستہ سے ہٹانا، اور مراداقرب سے اسہل وآسان ہے۔

یاادنی ''دنـــائة'' سے ماخوذ ہے بمعنی کم درجہ ہونا یہی راجح ہے، یعنی ایمان کا سب سے کم درجہ عمل راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے۔[۲]

''إماطة الأذى'' کی تین تفسیریں:

اماطة الأذى الخ:شراح نے فرمایا کہ اس جملہ کی تین تفسیریں ہیں:

(۱) تکلیف دہ چیز کا راستہ سے ہٹانا یہ خدمت خلق ہے اور اللہ کی مخلوق پر ترحم ہے کہ کسی کوضرر نہ پہنچے لہٰذا ضرروالی چیز راستہ سے ہٹادی جائے۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ تکلیف دہ چیز کوراستہ میں ڈالا ہی نہ جائے۔[۳]

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ دونوں تفسیروں کے تقاضہ پرعمل کیاجائے، اگرتمہاری ہمت اورظرف کم ہے تکلیف دہ چیز کوہٹانے کا جذبہ نہیں ہےتو کم سے کم یہ کرو کہ تکلیف دہ چیز راستہ میں نہ ڈالو۔

راستوں کی صفائی اور ہمارا طرز عمل:

مگر یہ ایمانی شعبہ آج ہمارے طلبہ اورخود مدارس سے ندارد ہے، طلبہ کا مدرسہ کے صحن میں تھوک اورناک کی ریزش ڈالنا روزمرہ کا معمول ہے، یہ نہایت فکر کی بات ہے، ہمیں تعلیم راستہ سے گندگی ہٹانے کی دیجارہی ہے اورہم اس کے برعکس راستہ میں گندگی پھینک رہے ہیں، **فالی اللہ المشتکی**۔

(۳) حضرات صوفیاء نے فرمایاہے کہ اذی سے نفس کوتکلیف پہنچانے والی چیز یعنی اخلاق رذیلہ اور طریق سے طریق سلوک مراد ہے اورمطلب یہ ہے کہ جوشخص اخلاق رذیلہ کواپنے نفس سے نکالے گا طریقِ سلوک اس کے لئے آسان ہوجائے گا، کیونکہ اخلاق رذیلہ تعلق مع اللہ سے مانع ہوتے ہیں۔[۴]

---

(۱) تحفة الابرار ۱/۳۵ والمرقاة ۱/۳٤.
(۲) المرقاة ۱/۱۳٤.
(۳) المرقاة ۱/۱۳۵، والمفاتيح ص ٦۳.
(٤) تحفة الأبرار ۱/۳۹.

صرف افضل اورادنی شعبہ کو ذکر کرنے کی وجہ:

ایمان کے ستر سے اوپر اعمال ہیں لیکن یہاں صرف افضل اورادنی کو بیان کیا، بعض نے اس کی وجہ بیان کی کہ ''قول لاالٰہ الا اللہ'' سے اشارہ ہے حقوق اللہ کی طرف اور ''إماطة الأذى عن الطريق'' سے حقوق العباد کی طرف اشارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کو کامل کرنے کے لئے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی ادائیگی ضروری ہے، گویا اجمالاً ایمان کے تمام شعبوں کا ذکر اس میں آ گیا ہے۔

حیاء کا مفہوم، اقسام اور علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ؟:

والحياء شعبة من الايمان: سوال ہوتا ہے کہ ''**بضع وسبعون شعبة**'' میں حیاء بھی داخل ہے تو پھر اس کو الگ سے کیوں بیان کیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ حیاء ایسی خصلت ہے جو باقی سب شعبوں پر آدمی کو ابھارتی ہے اس لئے حیا کو خاص طور سے بیان کیا ہے، یہ تخصیص بعد التعمیم ہے۔

حیاء کی دو قسمیں ہیں (۱) حیائے طبعی، (۲) حیائے ایمانی۔

حیائے طبعی کہتے ہیں ''**هو تَغَيُّرٌ وانكِسارٌ يعترِي المرءُ من خَوْفِ مايُلامُ ومايُعَابُ عليه**'' یعنی طبیعت کی شکستگی اور احساسِ ندامت جو قابل ملامت یا قابل عیب فعل کے اندیشہ سے پیدا ہو، اور حیاء ایمانی طبیعت کا وہ انفعال واحساس جو غیر مشروع فعل کے اندیشہ سے پیدا ہو۔

یہ حیاء انسان کو گناہوں سے روکتی ہے اس لئے حیاء ایمانی کی تعریف بایں الفاظ بھی کی جاتی ہے: ''**هو خُلُقٌ يَمْنَعُ الشخصَ من الفعلِ القبيحِ بسبب الإيمانِ كالحياء من كَشْفِ العورةِ**'' یہاں حیاء سے حیائے ایمانی مراد ہے، اس حیاء کا جتنا غلبہ ہوتا ہے اسی قدر آدمی گناہوں سے بچتا ہے، وہ یہ سوچتا ہے کہ میں ایسا کروں گا تو اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا، اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ''**إذافاتك الحياء فافعلْ ماشئتَ**'' لہٰذا یہ حیاء ایمان کا ایک بڑا شعبہ ہے۔(۱)

ایمان کے باقی شعبے:

یہاں ایمان کے شعبوں میں سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین شعبوں کی خود وضاحت فرمائی، باقی شعبے کونسے ہیں؟ اس کی تفصیل یکجا کسی حدیث میں موجود نہیں، البتہ حضراتِ محدثین نے ان کے احاطہ

(۱) شرح الطیبی ۱/۱۰۷، وفتح الإله ۱/۲۲۹ والمرقاۃ ۱/۱۳۵-۱۳۶.

کی کوشش کی ہے، امام بیہقیؒ کی ''شعب الایمان'' اس موضوع کی مشہور کتاب ہے، ہمارے اکابر میں سے حضرت تھانویؒ کا ''فروع الایمان'' نامی رسالہ اسی بارے میں ہے، مشہور محدث ابوحاتم ابن حبان البُستی نے سب سے زیادہ اس بارے میں تحقیق وتدقیق فرمائی ہے اوراس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ''بضع وسبعون '' سے تحدید ہی مراد ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مدت تک تتبع کیا اور تمام طاعات کی فہرست تیار کی تو وہ ۷۷ سے بہت زائد نکلیں، پھر میں نے ان طاعات کو جمع کیا جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ''من الایمان '' قرار دیا ہے تو وہ ۷۷ سے کم ہوئیں، پھر میں نے وہ طاعات جمع کیں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ''من الإیمان '' فرمایا ہے، تو وہ بھی ۷۷ سے کم نکلیں، پھر میں نے قرآن اوراحادیث میں ''من الإیمان '' کے حوالہ سے مذکور تمام طاعات وصفات کو جمع کیا تو وہ کل ۷۷ ہوئیں، نہ کم نہ زیادہ، ان تمام ۷۷ شعبوں کو انہوں نے اپنی کتاب ''وصف الایمان وشعبہ '' میں درج فرمایا ہے، خلاصہ ان کا یہ ہے کہ ایمان کامل: تصدیق قلبی، اقرار باللسان اورعمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ہے، تصدیق قلبی سے متعلقہ شعبے ۳۰ رہیں، اقرار باللسان سے متعلقہ شعبے سات ہیں اوراعمال سے متعلقہ شعبے ۴۰ ہیں، اس طرح یہ کل ۷۷ شعبے ہوجاتے ہیں، علامہ عینیؒ نے عمدۃ القاری میں ان ستتر شعبوں کا ذکر فرمایا ہے۔(۱)

۵/۴: وعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ، هٰذَا لَفْظُ الْبُخَارِيِّ(۲)، ولمسلم(۳) قَالَ إِنَّ رَجُلاً سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَيُّ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرٌ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کامل مسلمان وہ شخص ہے جس کے ہاتھ اورزبان (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہیں اور کامل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے منع فرمایا ہے، یہ الفاظ بخاری

(۱) عمدۃالقاری ۱/ ۲۰۰-۲۰۲، قاضی بیضاویؒ نے بھی تحفۃ الابرار ۱/ ۳۶-۳۹ میں تفصیل سے ان شعبوں کا ذکر فرمایا ہے۔

(۲) أخرجه البخاری فی الإیمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده ۱/ ٦ برقم ۱۰، والرقاق، باب الإنتهاء عن المعاصي ۲/ ۹٦۰ برقم ٦٢٣٥.

(۳) أخرجه مسلم فی الإیمان، باب بیان تفاضل الإسلام وأی اموره أفضل ۱/ ٤٨.

شریف کے ہیں اور مسلم شریف کے الفاظ یہ ہیں: حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

تشریحِ حدیث

احوال عبداللہ بن عمروؓ:

عبداللہ نام ہے، والد کا نام عمرو بن عاص ہے، اس اسم میں عمرو بفتح العین ہے ماقبل میں عمر بالضم تھا (رسم الخط کا قاعدہ یہ ہے کہ عمر کے بعد واو ہو تو عَمرو بفتح العین پڑھا جائے گا، واوَ نہ ہو تو عمر بضم العین پڑھا جائے گا، پھر عمرو میں حالت رفعی میں واو لکھا جاتا ہے اور حالت نصبی میں الف لکھا جاتا ہے)۔

عاص بن وائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھا، کفر کی حالت میں ہی مارا گیا، عمرو اس کے بیٹے تھے جو فتح مکہ سے قبل اسلام لائے، پھر جلیل القدر صحابی بنے، حضرت عمرو کے بیٹے عبداللہ ہیں، یہ وہی عبداللہ بن عمرو ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کثرت سے لکھا کرتے تھے جیسا کہ مقدمۃ العلم میں آچکا، یہ اپنے والد سے بھی پہلے مسلمان ہوگئے تھے، اپنے والد سے ۱۱یا۱۲ یا ۱۳سال چھوٹے تھے، بہت جفاکش تھے، عبادت کا بہت شوق تھا، رات بھر عبادت کرتے، دن کو روزہ رکھتے اس کی وجہ سے کمزور ہوگئے تھے اس پر ان کے والد حضرت عمرو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نصیحت کی اور فرمایا ''**إن لنفسک علیک حقاً وإن لأهلک علیک حقاً وان لزورک علیک حقاً**''

۶۵ھ یا ۷۳ھ میں ''مکہ مکرمہ'' یا ''طائف'' یا ''مصر'' میں آپ کا انتقال ہوا، راجح طائف ہے سات سو روایات ان کے واسطہ سے مروی ہیں، حالانکہ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ان کی مرویات مجھ سے زیادہ ہیں، لیکن ان کی مرویات کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ طائف میں رہتے تھے وہاں طالبین کم آتے تھے حضرت ابو ہریرہؓ مدینہ منورہ میں رہتے تھے جہاں طالبین زیادہ آتے تھے۔[1]

(۱) سیر أعلام النبلاء ۳/ ۷۹-۹۴ والمرقاۃ ۱/ ۱۳۷.

کامل مسلمان:

ماقبل کی دونوں حدیثوں میں ایمان کو مثال سے سمجھایا گیا تھا حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں خیمہ کے ساتھ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث میں شاخوں والے درخت کے ساتھ تشبیہ دے کر، اب یہاں یہ فرمارہے ہیں کہ محض عبادات سے اسلام کامل نہیں ہوگا بلکہ عبادات کے ساتھ حقوق العباد کو بھی ادا کرنا ضروری ہے۔

المسلم : اس میں الف لام کمال کے معنی کے لئے ہے،[1] یعنی کامل مسلمان وہ ہے جس ہاتھ وزبان سے تمام لوگ محفوظ رہیں،اس حدیث میں اعلی درجہ کی فصاحت ہے کہ ایک ہی مادہ کے تین لفظ استعمال کئے گئے ہیں:**المسلم ،سلم** اور**المسلمون**۔

ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ **المسلمون** کا لفظ تغلیباً ہے ورنہ **المسلمات** بھی اس حکم میں داخل ہیں، اسی طرح مسلمان کی قید بھی اتفاقی ہے ورنہ بلاوجہ کافر کو تکلیف پہنچانا بھی جائز نہیں ہے،پس **المسلمون** سے ''الناس'' مراد ہے[2] چنانچہ ابن حبان کی روایت میں الناس کا ہی لفظ وارد ہوا ہے،[3] بلکہ حیوانات کو بھی بلاوجہ تکلیف پہنچانا جائز نہیں، جیسا کہ معروف حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عورت کو محض اس بنیاد پر جہنم میں داخل فرمایا کہ اس نے بلی پالی تھی ،مگراس کے کھانے پینے کا کچھ خیال نہ کرتی تھی۔[4]

ہاتھ اورزبان کی وجہ تخصیص:

اس روایت میں ہاتھ اورزبان بول کرتمام ذات مرادلی گئی ہے کہ اپنی ذات سے کسی کوتکلیف نہ پہنچائے، اوران دونوں عضوکو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے اکثرافعال کا صدورانہی دونوں سے ہوتاہے،پھران دونوں میں زبان کومقدم کیا کیونکہ ہاتھ کے مقابلہ میں زبان سے تکلیف زیادہ پہنچتی ہے کہ ہاتھ سے مارتے رہنے سے خودہی تھک جائے گا برخلاف زبان کے، کہ وہ صبح سے شام تک چلتی رہتی ہے،

(۱)المرقاۃ ۱/ ۱۳۷.

(۲)المرقاۃ ۱/ ۱۳۷.

(۳)صحیح ابن حبان ۱۱/ ۲۰۴ت:شعیب الأرنؤوط نسائی شریف ۲/ ۲۳۰(٤٥٩٥)اورمسنداحمد ۱۱/ ٦٥٨(۷۰۸٦)میں بھی ''الناس'' ہی کالفظ وارد ہوا ہے۔

(٤)مسلم:باب تحریم قتل الهرة (۲۲٤۲) .

نیز ہاتھ سے صرف حاضر کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے اور زبان سے حاضر و غائب دونوں کو تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے نیز ہاتھ کا زخم جلدی بھر جاتا ہے برخلاف زبان کے زخم کے کہ وہ نہیں بھرتا ہے، شاعر نے کہا ہے۔

جراحاتُ السِّنانِ لها التیامٌ ولایَلْتَامُ ماجَرَحَ اللسانُ

اصل مہاجر:

المهاجر من هجر الخ: المہاجر پر بھی الف لام کمال کے معنی کے لئے ہے، ماقبل میں ہجرت کی دو قسمیں بیان کی تھیں: (۱) ظاہری (۲) باطنی، یہاں باطنی مراد ہے، یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے حال کی مناسبت سے ارشاد فرمایا، صحابہ ہجرت کر کے مدینہ آچکے تھے اس پر فرمایا کہ کمال اسلام کے لئے یہ ظاہری ہجرت کافی نہیں ہے، بلکہ گناہوں کو چھوڑنا بھی ضروری ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ فتح مکہ کے بعد اس وقت ارشاد فرمایا جب یہ اعلان فرمایا تھا: لاهجرة بعدالفتح تو اس سے بعض صحابہ کو جو ہجرت نہ کر سکے تھے رنج ہوا، انکی تسلی کے لئے آپ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔

هذا لفظ البخاری: یہ بخاری کے الفاظ تھے، مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کون مسلمان بہتر ہے؟ تو اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بات ارشاد فرمائی، مضمون دونوں کا ایک ہے کہ آدمی اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔

آدمی کو بے ضرر بن کر رہنا چاہئے:

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ''مَن اَکَلَ طَیِّباً وعَمِلَ فی سَنَّةٍ وأَمِنَ الناسُ بَوائقَه دَخَلَ الجنَّةَ''[1] جس شخص نے حلال رزق کھایا، سنت طریقہ پر عمل کیا اور لوگ اس کے شر سے امن میں رہے تو وہ جنت میں داخل ہوگا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ آدمی کو بے ضرر بن کر رہنا چاہئے، لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں بعض کی طبیعت میں کجی ہوتی ہے، فتنہ پرداز ہوتے ہیں، لوگ اس کی طرف سے ڈرے رہتے ہیں، اس سے خطرہ لگا رہتا ہے، کہ پتہ نہیں کس ضرر میں مبتلا کر دے، ایسا شخص اچھا نہیں ہے، اور بعض لوگ بے ضرر ہوتے ہیں، سب لوگ ان کی طرف سے مطمئن رہتے ہیں، اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں کرتے، ایسا آدمی اللہ

(۱) رواه الترمذی، بحواله مشکوة ص: ۳۰، باب الاعتصام بالکتاب والسنة.

کے یہاں پسندیدہ ہے، وہ اللہ کا مقرب ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے راستہ میں جہاد کرنا، پھر پوچھا: کونسا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو بیش قیمت ہو اور اپنے مالک کو زیادہ عزیز ہو، راوی نے پوچھا کہ اگر ایسا نہ ہوسکے؟ تو فرمایا کہ کسی ایسے شخص کی مدد کرنا جس کی کمائی اس کے گھر والوں کو ناکافی ہو، راوی نے پوچھا کہ اگر یہ بھی نہ ہوسکے؟ تو فرمایا کہ پھر اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے، مطلب یہ کہ فراخ دلی تو یہ ہے کہ خلق خدا کو فائدہ پہنچائے اور اگر اتنا ظرف نہیں ہے تو کم از کم اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچائے یہ بھی صدقہ ہے۔[1]

ایذارسانی کی ممانعت سے مستثنیٰ صورتیں:

ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ کسی کو تکلیف پہنچانا درست نہیں، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ غرض فاسد ہو، اگر صحیح غرض سے کوئی عمل کیا جائے اور اس سے کسی کو تکلیف پہنچے تو کچھ مضائقہ نہیں جیسے کفار سے جہاد کرنا، شریعت کے حدود وتعزیرات قائم کرنا، استاذ کا شاگرد کو، والدین کا اولاد کو اصلاح کے مقصد سے تنبیہ وتوبیخ کرنا وغیرہ ممانعت میں داخل نہیں، کیونکہ یہاں مقصد ایذاء نہیں، بلکہ اصلاح ہے۔[2]

طلبہ کو نصیحت:

مشکوۃ میں احادیثِ عمل ہیں، لہٰذا جو حدیث سامنے آتی رہے طالب علم اس پر عمل کرتا رہے، طالب علمی کے زمانہ میں عمل کی عادت نہ بنی تو بعد میں سنبھلنا مشکل ہوتا ہے۔

٧/٦: وَعَن أنسٍ رضی الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ: لايُؤمِنُ أحدُكُم حتّٰى أَكونَ أَحَبَّ إِلَيهِ مِن وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ والنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ، متفق عليه.[3]

---

(١) رواه البخاري ومسلم، بحواله مشكوة ص: ٢٩٣، كتاب العتق .

(٢) مرقاة ١/ ١٣٨.

(٣) أخرجه البخاري في الإيمان باب حب رسول الله صلى الله عليه وسلم من الإيمان ١/ ٧ برقم ١٥، عن انس بلفظه وعن ابى هريرة بنحوه ومسلم فيه، باب وجوب محبة الرسول صلى الله عليه وسلم أكثر من الاهل والولد والوالد ١/ ٤٩ برقم ٧٠.

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن (کامل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال انس بن مالکؓ:

انس بن مالک بن النضر الانصاری الخزرجی النجاری، کنیت ابوحمزہ ہے، یہ خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اس وقت حضرت انسؓ دس سال کے تھے، ان کے والد مالک بن نضر ہیں، ان کا کفر پر انتقال ہوا، اس کے بعد ان کی والدہ ام سلیمؓ نے ابوطلحہ انصاریؓ سے نکاح کرلیا، حضرت انسؓ ان کے ربیب تھے، ان کی والدہ ام سلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خالاؤں میں سے ہیں، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لئے اپنے صاحبزادے حضرت انس کو پیش کیا، چنانچہ وہ برابر حضور کی خدمت میں رہے، دس سال تک انھوں نے خدمت کی، ایک روز ان کی والدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ آپ کا چھوٹا سا خادم ہے آپ اس کے لئے دعا فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار دعائیں دیں: ''**اللھم بارک فی ماله، وولده، وأطل عمره، واغفر ذنبه**'' یا اللہ ان کے مال میں، اولاد میں، اور عمر میں برکت دے اور ان کی مغفرت فرما۔

حضرت انسؓ فرماتے تھے کہ ان میں سے تین دعاؤں کی قبولیت میں نے اپنی زندگی میں دیکھ لی، میرا باغ سال میں دومرتبہ پھل دیتا ہے حالانکہ دیگر لوگوں کے باغات میں ایک مرتبہ پھل آتا ہے، اولاد میں خوب برکت ہوئی، چنانچہ اولاد اور اولاد الاولاد میں سے اٹھانوے بچوں کو اپنے ہاتھ سے دفن کرچکا ہوں اور جو موجود ہیں وہ اس سے بھی زیادہ ہیں، ان کی عمر ۱۰۴ سال کی ہوئی یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی سے اکتانے لگے تھے، بصرہ میں آخری صحابی حضرت انسؓ ہی تھے، چوتھی دعا کے بارے میں فرمایا کرتے تھے ''**وأرجوا الرابعة**'' کہ چوتھی دعا کی قبولیت کا بھی اللہ سے امیدوار ہوں، ۹۳ھ میں بصرہ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

---

(۱) الإصابه ۱ / ۱۱۱-۱۱۳، المرقاة ۱ / ۱۳۹، مطبوعه أشرفيه ديوبند.

کمالِ ایمان کے لئے حبِّ نبوی اورحقوقِ نبوی کی ادائیگی ضروری:

اس حدیث میں بھی کمال ایمان کا بیان ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین واولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں، لہٰذا جس شخص کو اس کے والدین اور اولاد وغیرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب ہوں اس کا ایمان ناقص ایمان ہوگا، علامہ ابن بطالؒ نے تحریر کیا ہے کہ جب انسان کو ایمان کا کمال حاصل ہوجاتا ہے تو اسے اس کا ادراک ہوجاتا ہے کہ ان تمام چیزوں میں سب سے زیادہ حق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعہ راہ حق کی ہدایت اور گمراہی سے نجات حاصل ہوئی،(۱) اس لحاظ سے ''احب''''احق'' کے معنی میں ہوگا، اور مطلب یہ ہے کہ کمال ایمان اس وقت حاصل ہوگا جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حق سب سے زیادہ سمجھا جائے اور سب سے زیادہ اس کی ادائیگی کی سعی ہو۔

اقسام محبت اوران کا مفہوم:

شراح نے فرمایا کہ محبت دوقسم کی ہوتی ہے (۱) حب طبعی (۲) حب عقلی، حب طبعی سے مراد میلان نفسی وقلبی ہے، یہ غیراختیاری چیز ہے، اورحب عقلی یہ ہے کہ مقتضائے عقل کو مقتضائے طبیعت پر غالب کردے، جیسے مریض کے لئے کڑوی دوا کہ وہ اس کو ناپسند ہونے کے باوجود یہ سوچ کر استعمال کرتا ہے کہ میرا فائدہ اسی میں ہے، یہاں حدیث میں یہی حب عقلی مراد اور مطلوب ہے، طبعی میلان چاہے جہاں ہو، یعنی جی نہ چاہنے اور ظاہری مفاد کے خلاف ہونے کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضۂ محبت کو ترجیح دیجائے اور آپ کا اتباع کیا جائے۔

اسبابِ محبت:

یہ محبت اللہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ ہونی چاہئے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مناشی (اسباب) محبت چار ہیں اور وہ چاروں اسباب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کمال کے درجہ میں پائے جاتے ہیں، وہ اسباب یہ ہیں: جمال، کمال، نوال اور خصال، جمال یعنی حسن وخوبصورتی، کمال یعنی طبعی صلاحیت، نوال بمعنی عطاوبخشش اور خصال بمعنی اخلاق حمیدہ۔

---

(۱) شرح صحیح بخاری لابن بطال ۶/ ۹۶.

(۱) جمال نبوی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال سب سے زیادہ تھا، کتب حدیث میں شمائل کے تحت اس کا با قاعدہ باب آتا ہے، حضرت براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے چاندنی رات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد میں بیٹھے ہوئے دیکھا، میں کبھی چاند کی طرف دیکھتا اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کہ دونوں میں کون زیادہ خوبصورت ہے، بالآخر میری طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی چاند سے زیادہ خوبصورت ہیں۔(۱)

(۲) کمال نبوی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ کمال والے بھی تھے، اسی وجہ سے آپ کو اولین وآخرین کا سردار بنایا گیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''أنا سید ولد آدم ولافخر (۲)''

(۳) نوالِ نبوی:

آپ کی عطاو بخشش بھی سب سے زیادہ تھی، جو کچھ آتا آپ فوراً خرچ فرمادیا کرتے تھے، خود قناعت کی زندگی گزاری، غزوہ حنین میں بڑا مال حاصل ہوا، ایک ایک کو کئی کئی سو بکریاں دیں، واپسی میں کچھ دیہاتی لوگوں نے آپ سے مال کا مطالبہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے کچھ بھی لیکر نہ آئے اس لئے کچھ نہ تھا تو معذرت فرمائی، اعرابی لوگ مطالبہ واصرار کرتے ہوئے آپ سے اتنا چمٹے کہ آپ خاردار درختوں میں پہنچ گئے، حضرات صحابہؓ فرماتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی عطا تیز ہوا کی طرح ہوجاتی تھی۔ (۳)

(۴) خصالِ نبوی:

اچھے اخلاق بھی آپ کے سب سے زیادہ تھے حتی کہ قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نمونہ بتایا اورآپ کے اخلاق کی تعریف کی، ارشاد خداوندی ہے ''إِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم ''یعنی بے شک آپ اخلاق کے اعلی درجہ پر فائز ہیں۔

(۱) شمائل ترمذی ص ۲/فی خلق رسول الله صلی الله علیه وسلم.

(۲)سنن ابن ماجه(۴۳۰۸)،سنن ترمذی(۳۱۴۸)میں یه الفاظ هیں''أنا سید ولد آدم یوم القیامة ولافخر''

(۳)فتح الملهم ۱/۴۲۶.

معیارِ محبت:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل محبت کے بغیر آدمی کامل مسلمان نہیں ہوسکتا، اوراس کا پتہ تقابل کے وقت چلے گا کہ وقت آوے تو اپنی ہر چیز پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ترجیح دے، اگرایسا نہ کرے گا تو قرآن کریم میں اس پر سخت وعید بیان کی گئی ہے، ارشاد باری ہے: ''قُلْ اِنْ کَا نَ آبَاؤُکُمْ وَاَبْنَائُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالِ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسَاکِنَ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ[۱]''یعنی اے پیغمبر لوگوں سے کہدو کہ اگرتمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اوروہ مال ودولت جوتم نے کمایا ہے اوروہ کاروبار جس کے تمہیں مندا ہونے کا اندیشہ ہے اوروہ رہائشی مکان جوتمہیں پسند ہیں تمہیں اللہ اوراس کے رسول سے اوراس کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کردے۔

محبت کے درجات:

حضرات علماء نے لکھا ہے کہ اللہ ورسول سے محبت کے دو درجے ہیں:

(۱)واجب: وہ یہ کہ ان سے اتنی محبت ہوجس سے انسان فرائض وواجبات بجالائے اورمنکرات ومعاصی سے بچتارہے، یہ محبت کا ادنی درجہ ہے، اگراس درجہ محبت نہیں ہےتو انسان گنہ گار ہوگا، بعض عارفین سے پوچھا گیا کہ اللہ ورسول سے محبت کا مفہوم اورمعیار کیا ہے؟ توانہوں نے کہا: تمام احوال میں ان کی اطاعت، لہٰذا اگراطاعت نہیں ہےتو وہ محبت نہیں، محض محبت کا دعوی ہے۔

(۲)مستحب، یعنی اس قدرمحبت ہوکہ انسان ان کی پسند کا ہرکام بجالانے کی کوشش کرے، حتی کہ نوافل ومستحبات کا بھی اہتمام ہو اوران کی ناپسند ہرچیز سے بچے، حتی کہ مکروہات کا بھی ارتکاب نہ کرے اوران کے ہرفیصلہ پرراضی وصابررہے، محبت کا یہ اعلی ترین درجہ ہے اوراس کو''درجۂ مقربین'' کہا جاتا ہے۔[۲]

---

(۱)التوبۃ:۲٤.

(۲)اختیار الاولی فی شرح حدیث اختصام اعلاء الاعلی لابن رجب الحنبلی۱/۱۲٦۔

فوائدحدیث:

(۱)اس حدیث پاک میں والد کاذکرتغلیباً ہے ورنہ والدہ بھی اس میں داخل ہے، نیز والد کو ولد پرمقدم کیااس لئے کہ والد حقیقۃً مقدم ہوتاہے،مسلم شریف کی روایت میں ولدمقدم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً ولد کی محبت زیادہ ہوتی ہے۔(۱)

(۲)حضرات صحابہؓ کی عادت شریفہ تھی کہ حضورصلی اللہ علیہ وسلم کی ہرنصیحت کو اپنے اوپرمنطبق کیاکرتے تھے، چنانچہ بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو اپنے اوپرمنطبق کیا اور غورکرکے فرمایا کہ یارسول اللہ مجھے آپ کی محبت سب سے زیادہ ہےسوائے اپنی ذات کے، اپنی ذات کی محبت اپنے اندر زیادہ پاتاہوں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر! ابھی تمہارا ایمان مکمل نہیں ہے،حضرت عمرؓ نے تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ یارسول اللہ اب آپ کی محبت میرے اندر اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی کہ اب تمہارا ایمان کامل ومکمل ہوگیا۔(۲)

سوال یہ ہوتاہے کہ حضرت عمرؓ کے اندر اس قلیل لحظہ میں تبدیلی کیسے آ گئی ؟اس کا جواب دیتے ہوئے عام شراح نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ اولاً یہ سمجھے کہ یہاں محبت سے حب طبعی مراد ہے،اس لئے اولاً یہ کہاکہ اپنی ذات کی محبت زیادہ ہے، پھراس وقفہ میں غورکیاتو سمجھ گئے کہ حب عقلی مراد ہے، اس لئے دوسری مرتبہ میں عرض کیا آپ کی محبت ہی زیادہ ہے۔

لیکن ملاعلی قاریؒ نے دوسری وجہ تحریر فرمائی ہے وہ یہ کہ جب حضرت عمرؓ نے صاف گوئی سے کام لیا اور اپنا روحانی مرض کھول کر بیان کردیا، تو اس صاف گوئی اور صدق کی برکت سے اللہ نے اس کمی کو دورفرمادیا اوران کے اندراپنے محبوب کی محبت زیادہ پیدافرمادی، جس میں حضورصلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ بھی شامل تھی،تو اچانک یہ ترقی وعروج صدق گوئی کی وجہ سے ہوا۔(۳)تبدیلی کی یہ وجہ زیادہ راجح اورقرین قیاس ہے۔

(۳)حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم پرجس کا بھی ایمان ہےاس کے دل میں آپ کی محبت ضرورہوتی ہے،

(۱) مسلم شریف ۱ /۴۹ (۱۸۰) فتح الملھم ۱ /۴۲۷.

(۲)بخاری ۲ /۹۸۱(۶۶۳۲)

(۳) المرقاۃ ۱ /۱۳۹.

البتہ اس کے درجات میں تفاوت ہوتا ہے، حضرات صحابہ کو آپ سے سب سے زیادہ محبت تھی، اس درجہ کو تو کوئی نہیں پہنچ سکتا، مگر جو لوگ بظاہر دیندار نظر نہیں آتے ہیں اور معاصی میں ڈوبے رہتے ہیں ان میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ جب کبھی ان کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آتا ہے تو وہ ''ماہیِ بے آب'' کی طرح تڑپ اٹھتے ہیں، اعداء اسلام اگر نبی علیہ السلام کی شان میں کوئی گستاخی کرتے ہیں تو سب سے پہلے ایسے ہی لوگ آواز بلند کرتے ہیں، جو قلوب میں حب رسول پنہاں ہونے کی علامت ہے، بس اس طرف توجہ چاہئے کہ اس حب رسول سے آدمی عملی زندگی میں فائدہ اٹھائے۔

۸/۷: وَعَنهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلاوَةَ الإِيْمَان: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُه أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْداً لايُحِبُّهُ، إِلَّا لِلّٰهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَن يَعُوْدَ فِيْ الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَن يُلْقٰى فِي النَّارِ. (متفق علیہ[1])

ترجمہ: اور حضرت انسؓ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین باتیں جس میں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت ولذت محسوس کرے گا، (۱) جس کو اللہ اور اس کا رسول ان کے سوا (ہر چیز سے) زیادہ محبوب ہوں، (۲) اور جو کسی شخص سے صرف اللہ کے لئے محبت رکھتا ہو (۳) اور جس کو کفر میں لوٹنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سے خلاصی عطاء فرمادی ایسا ناپسند ہو جیسا کہ وہ آگ میں ڈالا جانا ناپسند کرتا ہے۔

تشریح حدیث

ایمان کی حلاوت اور اس کے اسباب:

اس روایت کے راوی بھی حضرت انسؓ ہیں، اس حدیث پاک میں بھی کمال ایمان کا بیان ہے اور ایمان کو ایک شیریں اور میٹھی چیز کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور پھر بطریق استعارہ بالکنایہ حلاوت و مٹھاس اس کے لئے ثابت کی گئی ہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین باتیں جس میں موجود ہوں گی

(۱) أخرجه البخاري ۱/۷ برقم ۱٦ بنحوه و ۷-۸ برقم بلفظه سوى "بهن" و ۲/۸۹۲ في الأدب برقم ۵۸۰٦ بنحوه، و ۲/۱۰۲٦ برقم ٦٦۷۳، في الإكراه بنحوه ومسلم ۱/۴۹ برقم ٦۷-٦۸ بنحوه فيه لفظة "بهن"

وہ ایمان کی حلاوت کو پالے گا وہ تین باتیں یہ ہیں: (۱) اللہ اوراس کا رسول دوسری سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں، (۲) کسی بندہ سے صرف اللہ کے لئے محبت کرے، (۳) اللہ نے جب کفر سے نجات دیدی تو اب وہ کفر کو ایسا ناگوار سمجھے جیسے آگ میں ڈالا جانا ناگوار ہوتا ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان: ثلث پر تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے ای ثلث خصالٍ ۔[1]

حلاوت کی اقسام اورحدیث میں اس کا مصداق:

حلاوت کی تین قسمیں ہیں: (۱) حلاوت حسی (۲) حلاوت معنوی (۳) حلاوت اخروی، حلاوت حسی یہ ہے کہ فی الحقیقت منہ میں مٹھاس محسوس ہوجائے، حلاوت معنوی یہ ہے کہ حساً تو معلوم نہ ہو، البتہ طاعات میں لذت آنے لگے، اورحلاوت اخروی سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔

صوفیائے محدثین کے یہاں اس روایت میں حلاوت حسی مراد ہے، لیکن یہ چیز ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتی، جب تعلق مع اللہ قوی ہو تب حسی حلاوت محسوس ہوتی ہے، چنانچہ بعض اہل اللہ سے منقول ہے کہ ذکر کے وقت ان کی زبان میں مٹھاس ہوتی ہے، اورفقہائے محدثین کے یہاں حلاوت معنوی مراد ہے یعنی طاعات وعبادات میں لذت آنے لگے گی، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادگرامی ''جُعِلَتْ قُرَّۃُ عُیْنِیُ فِی الصلوۃِ[2]'' کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے اسی پس منظر میں وارد ہوا ہے، اور بعض نے کہا کہ حلاوت اخروی مراد ہے یعنی یہ تین خصلتیں جس میں ہوں وہ جنت میں داخل ہوگا اوروہاں کی نعمتوں کی حلاوت پائے گا، تینوں قسمیں بھی بیک وقت مراد لی جاسکتی ہیں۔[3]

(۱) اللہ ورسول کی محبت ہر چیز سے بڑھ کر ہو:

من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مماسواھما: یعنی سب چیزوں پر اللہ ورسول کی محبت غالب ہواوروہ ہر چیز پر اللہ ورسول کی اطاعت کو ترجیح دیتا ہو، جیسا کہ پچھلی حدیث میں گذرا۔

---

(۱) یا موصوف کے عوض میں ہے أي: خصال ثلث کما فی شرح الطیبی ۱ / ۱۱۵۔

(۲) مسند أحمد ۱۹ / ۳۰۵ (۱۲۲۹۳) ط: الرسالة، سنن النسائي: كتاب عشرة النساء /باب حب النساء، رقم (۳۹٤۰)

(۳) المرقاة ۱ / ۱۳۹.

ایک اشکال اورجواب:

اس پراشکال ہے کہ ایک حدیث میں اللہ اوراس کے رسول کے لئے ایک ضمیرلانے پرنکیرآئی ہے ایک خطیب نے کہاتھا: من يطع الله ورسوله فقد رشد ومن يعصهما فقد غوى تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایابئس الخطيب أنت [1]، کیونکہ اس سے شرک کا واہمہ ہوتاہے جبکہ یہاں خودایک ضمیرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال فرمائی ہے؟

علامہ عزالدین بن عبدالسلام نے اس کاجواب دیا ہے کہ حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسرا ایسا کرے تو ایہام شرک کی وجہ سے ممنوع ہے خودآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ممنوع نہیں، کیونکہ وہاں ایہام شرک نہیں ہے، موسی شاہین صاحبِ فتح المنعم نے فرمایا کہ عزالدین کا یہ جواب خیرالاجوبہ ہے۔[۲]

(۲) کسی بندہ سے صرف اللہ کے لئے محبت ہو:

ومن احب عبداً الخ: جوشخص کسی سے صرف اللہ کے لئے محبت کرے کوئی ذاتی غرض مقصود نہ ہو، اورمحبت کا منشا صرف اللہ ہو، خاندان وبرادری، رنگ ونسل اورعلاقہ وملک، منشاءِ محبت نہ ہو، نیز صرف اس لئے محبت ہوکہ اس میں دینی خوبی وکمال موجود ہے یا اس سے دینی فائدہ حاصل ہوتاہے، یہ بہت افضل شخص ہے اللہ اس کواپنے عرش کے سائے میں رکھیں گے، اسی طرح کسی سے نفرت اوربغض ہوتو وہ بھی اللہ کی وجہ سے ہو، یہ عمل بھی اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے۔

ابوبکرصدیق کا جذبۂ حبّ نبوی:

حضرات صحابہ کی زندگی میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے حضرت عبدالرحمٰن بن أبی بکر جنگ بدرمیں کفار کے ساتھ تھے، مسلمان ہونے کے بعد ایک مرتبہ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے عرض کیا: اباجان بدرمیں کئی مرتبہ آپ میری تلوار کی زدمیں آگئے تھے، مگر میں نے باپ سمجھ کر چھوڑدیا، حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: بیٹا! اگرتو میری تلوارکی زدمیں ایک مرتبہ بھی آجاتا تو میں تجھے نہ چھوڑتا

(۱) صحيح مسلم (۸۷۰)، سنن أبی داود (۱۰۹۹، ٤۹۸۱) سنن نسائی (۳۲۷۹)

(۲) فتح المنعم بشرح صحيح مسلم ۱/۱٦۲، وانظر لأجوبة اخرى: شرح الطيبی ۱/۱۱۷، عمدة القاری۱/۲۲۹-۲۳۰.

اور بیٹا ہونے کا خیال نہ کرتا، اسی طرح ایک مرتبہ ان کے والد نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کردی جس پر حضرت ابوبکرؓ نے ان کو ایسا طمانچہ رسید کیا کہ وہ گر پڑے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، آپ نے ابوبکر سے باز پرس کی، اس پر ابوبکر نے فرمایا کہ: اگر میرے قریب تلوار ہوتی تو ان کی گردن اڑا دیتا۔(۱)

(۳) کفر آگ میں ڈالے جانے کی طرح ناپسند ہو:

ومن یکرہ ان یعود فی الکفر الخ: یعنی کفر سے نجات سے حاصل ہوجانے کے بعد اس کو کفر میں لوٹنا آگ میں ڈالے جانا جیسے ناگوار ہو، یہ بات کہ ''کفر سے نجات کے بعد'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے حال کے مناسبت سے ارشاد فرمائی تھی کہ اکثر صحابہ کفر سے اسلام میں داخل ہوئے تھے ورنہ اگر کوئی پہلے سے مسلمان ہو اور کفر اختیار کرنے کو ایسا ہی ناپسند کرتا ہو اس کے لئے بھی یہی فضیلت ہے، لیکن ایسے شخص کے لحاظ سے ''یعود'' ''یصیر کافر ا'' کے معنی میں ہوگا۔(۲)

قصۂ حضرت عبداللہ بن حزافہ:

تاریخ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ: حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک لشکر روم کی جانب جہاد کے لئے بھیجا گیا جس کا امیر عبداللہ بن حزافہ کو مقرر کیا گیا، جو صحابی تھے اتفاق ایسا ہوا کہ مسلمانوں کی فوج کو شکست ہوگئی اور بادشاہ نے مسلمانوں کو گرفتار کرلیا، جس میں امیر لشکر عبداللہ بن حدافہؓ بھی تھے، بادشاہ نے ان کو بلاکر کہا کہ: تم میرے سامنے اپنے نبی کی تکذیب اور اسلام سے دستبرداری کا اعلان کرو، انہوں نے فرمایا: اگر مر کے دوبارہ زندہ ہوجاؤں تب بھی ایسا نہیں کرسکتا، اس نے کہا: میں تمہیں دردناک طریقہ پر قتل کردوں گا، انہوں نے فرمایا: ٹکڑے کردو تب بھی تمہاری مراد پوری نہیں ہوسکتی، اس نے پھر کہا: تمہیں عبرتناک موت دوں گا، مگر یہ پھر بھی اپنی بات پر جمے رہے، اس کے بعد اس کافر بادشاہ نے کڑھائی منگوائی اور اس میں تیل ڈلوا کر کھولایا، جب وہ خوب کھول گیا، تو اس میں ایک قیدی کو ڈال دیا جو فوراً جل بھن کر ختم ہوگیا، بادشاہ نے یہ کرنے کے بعد عبداللہ بن حزافہؓ کو دیکھا تو وہ رونے لگے، بادشاہ نے سوچا کہ شاید موت کے ڈر سے رو

(۱) انظر: تفسیر قرطبی: ۱۷/۳۰۷ خطبات محمود: ۳/۱۰۸.

(۲) المرقاۃ ۱/۱٤۲.

رہے ہیں، مگرانہوں نے فرمایا: کہ میں اس انجام کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں، بلکہ اس لئے رو رہا ہوں کہ میرے پاس صرف ایک جان ہے، کاش سو جانیں ہوتیں تو میں ان کو بھی اسی طرح اللہ کے راستے میں قربان کردیتا، بادشاہ ان کے اس عزم و استقلال سے حیرت زدہ رہ گیا اور اس کے دل میں کچھ نرمی آئی تو اس نے کہا: اچھا صرف اتنا کرو کہ میری پیشانی کو بوسہ دے دو، میں تمہیں چھوڑ دونگا انہوں نے کہا کہ: اگر میرے سب ساتھیوں کو چھوڑ دو تو میں اس کے لیے تیار ہوں، وہ اس پر آمادہ ہوگیا، عبداللہ بن حذافہؓ نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ دے دیا اور اپنے تمام ساتھیوں کو چھڑالیا، جب قافلہ مدینہ پہنچا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے مدینہ سے باہر ان کا استقبال کیا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، اور فرمایا کہ: اس لئے بوسہ دے رہا ہوں کہ تم نے ایک بوسہ کے ذریعہ تمام مسلمانوں کو چھڑالیا۔(۱)

۹ / ۸ وَعَنِ الْعَبَّاسِ بنِ عَبدِالْمُطَّلِبِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ذَاقَ طَعْمَ الإيمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا،وَبِالإِسْلامِ دِيْناً، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً، رواه مسلم.(۲)

ترجمہ: حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سبحانہ وتعالی کو رب ماننے پر اسلام کو اپنا دین ماننے پر اور حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے پر راضی ہوگیا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب:

اس حدیث کے راوی حضرت عباس بن عبدالمطلب ہیں، جو جلیل القدر صحابی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا ہیں، آپ طویل قد سفید رنگ اور خوبصورت تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں دو سال بڑے تھے، جب وہ مسلمان ہوگئے تو کسی نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو انہوں نے بہت مؤدبانہ اور سنجیدہ جواب دیا: ''هو أكبرُ وأنا أَسَنُّ'' یعنی مرتبہ کے لحاظ سے وہ بڑے ہیں اور عمر میری زیادہ ہے۔

(۱) الإصابه ۳ / ۱۸۱ بتصرف يسير.

(۲) أخرجه مسلم في الإيمان، باب الدليل على أن من رضي بالله رباً وبالإسلام دينا وبمحمد رسولاً ۱ / ۴۷.

حضرت عباسؓ غزوۂ بدر سے پہلے ہی مسلمان ہوگئے تھے،لیکن اپنے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا،حتی کہ غزوۂ بدر میں کفار کے ساتھ آئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا حال معلوم تھا اس لئے آپ نے اعلان کردیا تھا کہ عباسؓ کو قتل نہ کرنا، بلکہ قید کرلینا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر انھوں نے فدیہ دیا اور واپس مکہ مکرمہ آگئے اور مکہ آکر اسلام کا اعلان کیا اور پھر ہجرت کی۔

حضرت عباسؓ زمانۂ جاہلیت میں بھی رئیس اور سردار تھے، خانہ کعبہ میں زمزم پلانے کا کام آپ کے ذمہ تھا اور مسجد حرام کے متولی تھے، اسلام لانے سے پہلے بھی اسلام کے ہمدرد تھے،۱۲/رجب یا ۱۲/رمضان میں بروز جمعہ ۳۲ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

ایمان کی ذائقہ رسی کے اسباب:

اس حدیث پاک میں بھی ایمان کو شیریں چیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس شخص میں تین باتیں موجود ہوں وہ ایمان کا ذائقہ چکھ لے گا، (۱) جو اللہ سے راضی ہو رب ہونے کے اعتبار سے (۲) اور اسلام سے راضی ہو دین ہونے کے اعتبار سے (۳) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو نبی ہونے کے اعتبار سے۔

(۱) اللہ کو رب ماننا:

بالله ربا: اللہ سے راضی ہو یعنی اللہ کو رب ماننے پر راضی ہو،اس کے دو مطلب ہیں:

(۱) اللہ کو رب مانتا ہو،اس پر خوش ہو بلکہ فخر ہو۔

(۲) اللہ کے رب ہونے پر قناعت اختیار کرے کہ اللہ کو ہی اپنا رب مانے، کسی کو اس کا شریک تسلیم نہ کرے، تمام امور کا مالک اور متصرف اللہ کو ہی قرار دے۔ (۲)

(۲) اسلام کو دین ماننا:

وبالإسلام ديناً: اسلام سے راضی ہو یعنی احکام اسلامیہ پر خوش دلی کے ساتھ عمل کرے اور اس پر شرح صدر ہو اور اس کو نجات کے لئے کافی سمجھتا ہو، کسی اور دین کی طلب نہو۔

---

(۱) الإصابة ۳/ ۱٤٦، والمرقاة ۱/ ۱٤۳.

(۲) شرح الطيبى ۱/ ۱۱۹ والمرقاة ۱/ ۱٤۳.

(۳) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا:

وبــمــحــمــد رســولاً: اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راضی ہو یعنی آپ کو اپنا رسول و رہنما مانتا ہو، صرف آپ کی ذات کو قابلِ اتباع سمجھتا ہو، آپ کی سنتوں پر خوش دلی سے عمل کرتا ہو، جسمیں یہ باتیں ہوں وہ ایمان کا ذائقہ چکھ لے گا یعنی اسلام پر شرح صدر اور ایمان کی لذت اس کو نصیب ہوگی۔

بعض روایات میں ہے کہ جو شخص ان الفاظ کو صبح و شام تین، تین مرتبہ پڑھے تو اس کو اللہ کی رضا نصیب ہوگی۔(۱)

۱۰ / ۹ وعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضي الله عنه قَـالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: وَالَّـذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ، لایَسْمَعُ بِیْ أَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، یَهُوْدِیٌّ وَلانَصْرَانِیٌّ، ثُمَّ یَمُوْتُ، وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَّاكَانَ مِنْ أَصْحَابِ ا لنَّارِ . (رواه مسلم)(۲)

تــرجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اس امت میں سے خواہ یہودی ہو یا نصرانی جو بھی میری رسالت کی خبر سنے گا اور پھر اس شریعت پر ایمان لائے بغیر مرجائے جس کو لیکر مجھے بھیجا گیا ہے تو وہ جہنمیوں میں سے ہوگا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ کا بیان:

اس حدیث میں ایمان کا بیان ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے عام ہونے کا بیان ہے

(۱) عن أبی سلام خادم النبي صلى الله عليه وسلم، عن النبی صلى الله عليه وسلم ،قال: ما من مسلم أو انسان أو عبد يقول حين يمسی وحين يصبح ثلاث مرات: رضيت بالله رباً وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا، إلا كان حقا على الله أن يرضيه يوم القيامة، الترغيب والترهيب للمنذری ۱/ ۲۵۶ (۹۷۱)

(۲) أخرجه مسلم فی الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد صلى الله عليه وسلم إلى جميع الناس ونسخ الملل بملة ۱/ ۸۶ برقم ۲۴۰.

پہلے انبیاء مخصوص قوموں اور خطّوں کی طرف مبعوث کئے جاتے تھے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا''

والذی نفس محمد صلی الله علیه وسلم بیده الخ: اس حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے میری بعثت عام ہے جس شخص تک بھی میری بعثت کی خبر پہنچی اور وہ ایمان نہ لایا تو وہ نجات نہیں پائیگا، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر ارشاد فرمائی، تاکہ بات میں تاکید اور پختگی پیدا ہوجائے اور اس قسم میں جو ''بیـــده'' کا لفظ آیا ہے، یہ متشابہات میں سے ہے، جس کا صحیح مفہوم اللہ ہی کو معلوم ہے، سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس سے مراد اللہ کی قدرت وتصرف ہے۔[۱]

امت کی اقسام اور حدیث میں اس کا مصداق:

لایسمع بی أحد من هذه الأمة الخ: امت کی دو قسمیں ہیں (۱) امت دعوت (۲) اور امت اجابت، امت اجابت سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو قبول کیا اور امت دعوت سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنا ضروری ہے یعنی تمام انسان، یہاں یہی دوسری قسم مراد ہے کہ ہر شخص جس تک آپ کی آمد کی خبر پہنچے تو وہ آپ پر ایمان لائے، ورنہ جہنمی ہوگا، اور اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کے پاس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نہ پہنچی ہو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا، البتہ موحد ہونا اس کا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ توحید کا مسئلہ عقلی ہے۔[۲]

یہود ونصاری کی وجہِ تخصیص:

اس حدیث میں یہودی ونصرانی کی تخصیص کی گئی ہے، کیونکہ باقی لوگوں کے لئے حکم کو اولویت کے ساتھ ثابت کرنا مقصود ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر یہود ونصاری آپ پر ایمان نہیں لائیں گے تو وہ جہنمی ہوں گے، کیوں کہ اگرچہ یہود ونصاری اپنے اپنے زمانہ میں دین سماوی پر تھے، اسی پر عمل کرنے میں ان کی

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۱۲۲–۱۲۳، المرقاة ۱/ ۱٤٥.

(۲) المصدران السابقان.

نجات تھی، مگر آپ کی بعثت کے بعد ان کا دین منسوخ ہوگیا، تو جب ان کے لئے بھی آپ کی بعثت پر ایمان لانا ضروری ہے، تو دوسرے لوگ جو دین سماوی پر نہیں ہیں ان کے لئے تو بدرجۂ اولی آپ کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔

ثم یموت: اس میں ''ثم'' استبعاد کے لئے ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر آنے کے باوجود بھی ان پر ایمان نہ لائے یہ انتہائی مستبعد اور موجب تعجب بات ہے۔

سید احمد بریلویؒ اور ایک سادھو کا واقعہ:

حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ ہمارے اکابر میں سے ہیں، ان کے مرید تھے: حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ اور حضرت مولانا سید عبدالحی بڈھانوی، ایک مرتبہ دہلی میں ہندوؤں کا میلہ لگا ہوا تھا، اس میں یہ تینوں گئے، وہاں پہنچ کر حضرت سید احمد صاحبؒ نے ان دونوں سے فرمایا کہ جاکر دیکھو کوئی کام کا آدمی ہے؟ یہ حضرات گھومنے لگے، ایک جگہ دیکھا کہ کئی سادھو بیٹھے ہیں، واپس آکر بتلایا کہ ایک سادھو ہے، وہ کچھ کام کا معلوم ہوتا ہے، فرمایا: اچھا چلو دیکھیں کون ہے؟ تینوں اس سادھو کے پاس پہنچے اس حال میں کہ وہ ننگا تھا، ان حضرات کو دیکھ کر فوراً اس نے اپنے بدن پر کپڑا لپیٹا اور استقبال کے لئے کھڑا ہوگیا، یہ تینوں حضرات جاکر اس کے پاس بیٹھ گئے اور اس سے کہا: تم خدا کتنے مانتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں موحد ہوں، مولانا سید احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ رسول کو مانتے ہو اس نے کہا: نہیں، فرمایا: کیوں نہیں؟ کہا: ضرورت نہیں؛ اس لئے کہ رسول ذریعہ ہوتا ہے خدا تک پہنچنے کا اور میں خود ہی خدا تک پہنچا ہوا ہوں کہ موحد ہوں، اس کے بعد مولانا سید احمد صاحبؒ نے ہاتھ اوپر کو کیا تو ہاتھ میں ایک پھل آیا، اس کو کاٹا اور خود کھایا اور سادھو کو بھی کھلایا، سادھو نے بھی اسی طرح ہاتھ اوپر کو کیا اس کے ہاتھ میں بھی ایک پھل آگیا، اس کے بعد مولانا سید احمد صاحبؒ نے دوبارہ ہاتھ اوپر کو کیا تو ہاتھ میں ایک پیالی آئی اور ایک چھری، سادھو نے بھی ایسا ہی کیا، اس کے ہاتھ میں بھی ایک پیالی اور چھری آگئی، مولانا نے چھری سے اپنے ہاتھ کی نس کھول کر اس پیالی میں خون نکالا اور اس پیالی کو مٹی میں دفن کردیا، سادھو نے بھی اپنے ہاتھ کی نس سے خون نکال کر پیالی کو مٹی میں دبا دیا، کچھ دیر بعد مولانا نے اپنی پیالی نکالی، سادھو نے بھی اپنی پیالی نکالی، تو دیکھا کہ حضرت مولانا والا خون تو مشک کی طرح مہک رہا ہے اور سادھو کے خون میں کیڑے پڑ گئے، بدبو آنے لگی، تب مولانا سید

احمد صاحبؒ نے اس سے فرمایا کہ: زمین کے اوپر رہتے ہوئے تم کو رسول کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، زمین کے نیچے یعنی مرنے کے بعد تم کو رسول کی ضرورت پڑے گی، اس سادھو نے کہا کہ آپ نے ٹھیک کہا، مولانا نے کہا پھر کیا دیر ہے؟ اس نے کہا کچھ نہیں، فوراً کلمہ پڑھا: **لاإلـه الا الـلـه محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم**، اور مسلمان ہوگیا۔ (۱)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری ہے اس کے بغیر نجات حاصل نہیں ہوگی، جیسا کہ حدیث کا مضمون بھی یہی ہے۔

۱۱ / ۱۰ وَعَنْ أَبِيْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ثَلٰثَةٌ لَهُمْ أَجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ، وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ إِذَا أَدَّى حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أَمَةٌ يَطَأُهَا، فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيْبَهَا، وعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا: فَلَهُ أَجْرَانِ. (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین شخص ایسے ہیں کہ جن کیلئے دوہرا اجر ہے (۱) اہل کتاب میں سے وہ شخص جو ایمان لایا اپنے نبی پر اور پھر ایمان لایا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (۲) غلام جبکہ وہ ادا کرے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا حق بھی اور اپنے آقاؤں کا حق بھی (۳) وہ شخص جس کی کوئی ایسی باندی تھی جس سے وہ وطی کرتا تھا، پس اس نے اس کو اچھے طریقہ پر ادب سکھایا اور اچھے طریقہ پر تعلیم دی اس کے بعد اس کو آزاد کر کے اس سے نکاح کرلیا تو اس شخص کے لئے بھی دوہرا اجر ہے۔ (بخاری ومسلم)

---

(۱) ملفوظات فقیه الامت ۳ / ۱۵٦.

(۲) أخرجه البخاري في "العلم" ۱ / ۲۰ برقم ۹۷، وفي "العتق" ۱ / ۳٤٦ برقم ۲٤۷٤، وفي الجهاد ۱ / ٤۲۲ برقم ۲۹۱۹ بنحوه، وفي "كتاب الانبياء" ۱ / ٤۹۰ برقم ۳۳۳۰ بنحوه وفي "النكاح" ۲ / ۷٦۱، برقم ٤۸۹۲ ومسلم في "الإيمان" ۱ / ۸٦ برقم ۲٤۱ و"النكاح" ۱ / ٤٦۰ مختصراً.

تشریحِ حدیث

احوال ابوموسی اشعری:

آپ جلیل القدر صحابی ہیں اسم گرامی عبداللہ بن قیس ہے، ''اشعری'' اشعر کی طرف منسوب ہے، جو یمن کا ایک قبیلہ ہے، اسی نسبت سے مشہور ہیں، پتلے دبلے اور پستہ قد تھے، چہرے پر بال نہیں تھے، اور نہایت عمدہ قرآن پڑھتے تھے، مکہ مکرمہ میں ایمان لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی ہجرت نہیں کی تھی کہ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، پھر ۷ھ میں فتح خیبر کے سال اصحاب سفینہ کے ہمراہ مدینہ طیبہ آئے، گویا کہ ذوہجرتین ہیں ۲۰ھ میں حضرت عمرؓ نے ان کو بصرہ کا والی مقرر کیا تھا، حضرت عمرؓ نے ضابطہ بنایا تھا کہ کسی کو ایک سال سے زائد عامل مقرر نہیں کیا جائیگا، مگران کو چار سال تک عامل مقرر کیا، پھر حضرت عثمانؓ نے ان کو بصرہ سے ہٹا کر کوفہ کا والی مقرر فرمایا، انہوں نے ہی اہواز شہر کو فتح کیا، ۵۲ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ (۱)

حدیث کی باب سے مطابقت:

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین قسم کے لوگوں کو دوہرا اجر ملتا ہے، ایک وہ جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر سن کر آپ کے اوپر بھی ایمان لایا، ایمان کا بیان اسی جملہ میں ہے اور مقصد یہ ہے کہ گذشتہ نبیوں پر ایمان لانے والے بھی آپ پر ایمان لائیں، ان کا یہ فریضہ بھی ہے اور فضیلت والا عمل بھی، باب کے مناسب صرف یہی جملہ ہے، باقی دونوں جملوں کا مضمون الگ ہے، روایت الباب میں کسی ایک جز کا باب کے مطابق ہونا بھی کافی ہے، حدیث کے ہر ہر جز کا مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔

دوہرے اجر کے مستحق لوگ:

ثلثة لهم اجران: اس میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے ای ثلثة أشخا ص یعنی تین طرح کے لوگ دوہرے اجر کے مستحق ہیں۔ (۲)

---

(۱) الإصابة ۳ / ۲۷۳.

(۲) شرح الطیبی ۱ / ۱۲۵.

(۱) پہلا شخص:

رجل من اهل الكتاب الخ :''اہل کتاب'' سے یہود ونصاری دونوں مراد ہیں یعنی یہود میں سے جو شخص موسی علیہ السلام پر ایمان لایا یا نصاری میں سے جو شخص عیسی علیہ السلام پر ایمان لایا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لایا اس کو دوہرا اجر ہے، بعض روایات میں رجل من اهل الكتابين [۱] اور بعض میں تورات وانجیل کی صراحت ہے۔[۲]

بعض نے کہا کہ اہل کتاب سے یہاں نصاری مراد ہیں، یہود نہیں،[۳] اس لئے کہ دین موسی تو منسوخ ہوگیا تھا دین عیسی کی وجہ سے، اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد موسی علیہ السلام پر ایمان لانا معتبر نہیں، لہٰذا اہل کتاب سے نصاری مراد ہونگے نہ کہ یہود۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ نصرانیت نے یہودیت کو منسوخ کیا یا نہیں؟ اس میں علماء کی دونوں رائے ہیں، جو حضرات ملتِ نصرانیہ کو ناسخ کہتے ہیں ان کے قول پر یہود کو دوہرا اجر نہیں ملے گا۔

جمہور فرماتے ہیں کہ اہل کتاب سے یہود ونصاری دونوں مراد ہیں، اس لئے کہ ظاہراً دونوں کا ایک ایک نبی پر ایمان تھا، اور ظاہری ایمان دونوں کا صحیح تھا، اگرچہ حقیقۃً تو ان میں سے کسی کا بھی ایمان درست نہیں تھا، کیوں کہ نصاریٰ بھی تثلیث کے قائل تھے، جمہور ہی کا قول راجح ہے۔[۴]

(۲) دوسرا شخص:

والعبدالمملوک اذا ادی حق الله وحق موالیه: دوسرا شخص وہ غلام ہے جو اپنے آقا کے حق کو بھی ادا کرے اور اللہ تعالیٰ کے حق کو بھی ادا کرے یعنی احکامات الٰہیہ کی بھی پابندی کرے، اس کے لئے بھی دوہرا اجر ہے۔

''عبد'' کے ساتھ ''مملوک'' کی قید لگائی گئی ہے، اس لئے کہ اللہ کے بندے تو سب ہیں پس

(۱) مسند احمد ۳۶ / ۵۷۰ (۲۲۲۳٤) فیه: ''من أسلم من أهل الكتابين''

(۲) نسائی شریف ۲ / ۲۶۱.

(۳) شرح الطیبی ۱ / ۱۲۵.

(٤) فتح الباری ۱ / ۲٤۰، المرقاۃ ۱ / ۱٤۶۔

''عبد'' کے یہاں عام معنی مراد نہیں ہیں بلکہ وہ مملوک کے معنی میں ہے، اس لئے **مملوک** کی قید لگائی گئی ہے۔ (۱)

موالیه: جمع مولیٰ بمعنی آقا، اس کو جمع لانے کی وجہ کیا ہے؟ بعض نے فرمایا کہ اس سے عبد مشترک مراد ہے کہ وہ کئی آقاؤں کے حق کو ادا کرتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ ''عبد مشترک'' مراد لینے کی ضرورت نہیں، بسا اوقات غلام یکے بعد دیگرے کئی کئی لوگوں کی ملکیت میں جاتا ہے اس لحاظ سے جمع لایا گیا اور مطلب یہ ہے کہ وہ جس کی ملک میں بھی جاتا ہے اس کے حق کو ادا کرتا ہے۔ (۲)

(۳) تیسرا شخص:

رجل کانت عندہ امة الخ: تیسرا شخص وہ ہے جس کے پاس ایک باندی تھی خدمت کے لئے اور وہ اس سے وطی بھی کرتا تھا، لیکن اس کی اس نے اچھی تربیت کی اور اس کو تعلیم دی، پھر اس کو آزاد کر دیا اور پھر اس سے نکاح بھی کر لیا، تو اس کے لئے بھی دو اجر ہیں، ایک اجر ہے تربیت و تعلیم پر اور ایک اجر اعتاق وتزوج پر، یہی مطلب راجح ہے، باندی عموماً آقا کی خدمت میں لگی رہتی ہے، مگر اس نے اسکا وقت فارغ کیا اور اس کو ادب سکھایا، یعنی معاشرت کے آداب سکھائے اور احکام شرعیہ کی تعلیم دی پھر مزید احسان یہ کیا کہ اس کو آزاد کر دیا اور پھر مزید برآں خود ہی اس سے نکاح بھی کر لیا، اس لئے اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

مذکورہ اشخاص کی وجہ تخصیص:

یہاں سوال ہوتا ہے کہ مذکورہ تین قسم کے لوگوں کے لئے دوہرا اجر بتایا ہے؛ حالانکہ ان کے کام بھی دو ہیں اور ہر وہ شخص جو دو کام کرے اس کو دو ہی اجر ملتے ہیں، جو شخص نماز پڑھے اور روزہ بھی رکھے اس کو دو اجر ملیں گے، پس ان تین افراد کی کیا خصوصیت ہوئی؟ اس سوال کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) ظاہر میں یہ وہم ہوسکتا تھا کہ ان تینوں کو ایک ہی اجر ملے دو اجر نہ ملیں، اس وہم کو دور کرنے کے لئے دوہرے اجر کی صراحت فرمائی، وہم اس لئے ہوسکتا ہے کہ پہلے شخص کو اپنے نبی پر ایمان لانے پر اجر نہیں ملنا چاہئے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد ان کی شریعت منسوخ ہو چکی تھی، یہود کی

(۱) فتح الإله ۱ / ۲٦٥.

(۲) فتح الإله ۱ / ۲٦٥.

بھی اور نصاریٰ کی بھی، اور منسوخ چیز معتبر نہیں ہوتی، ایسے ہی غلام کو آقا کی خدمت پر ثواب نہیں ملنا چاہئے کیوں کہ آقاء کی خدمت تو اس کے ذمہ میں لازم ہے، کہ آقاء اس کا نفقہ برداشت کرتا ہے، اسی طرح تیسرے شخص کو تزوج پر اجر نہیں ملنا چاہئے، کیونکہ اس میں اپنی خواہش کی تکمیل ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وہم کو دور فرمایا اور واضح فرمایا کہ ان لوگوں کو ہر دو کاموں پر ثواب ملے گا، کیونکہ تینوں اشخاص کے یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کام کے ساتھ دوسرے کام کو انجام دینا بہت مشکل ہوتا ہے، مثلاً اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کرنا بڑا مشکل امر ہے، غلام عموماً آقا کی خدمت میں لگے رہتے ہیں ان کو عبادت کا موقعہ کم ملتا ہے، مگر پھر بھی اللہ کی عبادت کی ادائیگی اہم بات ہے، اسی طرح باندی سے لوگ خدمت لیتے ہیں، اس کو کون ادب و تعلیم سکھاتا ہے اور کون ان سے خود نکاح کرتا ہے، مگر اس شخص نے ایسا کیا، اس لئے ان تینوں کو دوہرا اجر ملے گا۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ أجـــــران سے مراد ہے دو عملوں میں سے ہر عمل پر دوہرا اجر ملے گا، اب خصوصیت ظاہر ہے۔(۲)

(۳) اور بعض نے کہا کہ ان تین قسم کے لوگوں کو پوری زندگی ہر ہر عمل پر دوہرا اجر ملتا رہے گا، اب تو خصوصیت کا کیا ہی کہنا ہے۔(۳)

۱۲ / ۱۱ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أُمِرتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَن لاإلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، وَيُؤتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ، إِلَّا بِحَقِّ الإِسْلَامِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ. (متفق علیہ(۴)) إِلَّا أَنَّ مُسْلِماً لَمْ يَذْكُرْ "إِلَّا بِحَقِّ الإِسْلَامِ"

(۱) المرقاة ۱ / ۱۴۶. تین کی قید احترازی نہیں ہے اور بھی کچھ حضرات ایسے ہیں جن کو دوہرا اجر ملتا ہے ازواج مطہرات کے بارے میں اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا "ومن يقنت منكن لله ورسوله وتعمل صالحاً نؤتها اجرها مرتين" علامہ سیوطی علیہ الرحمہ نے ایک مستقل رسالے (مطلع البدرين فيمن يؤتى أجره مرتين) میں ان کو جمع کیا ہے، جن کی تعداد تقریباً (۳۵) تک پہنچتی ہے۔

(۲) المرقاة ۱ / ۱۴۸.

(۳) المرقاة ۱ / ۱۴۸.

(٤) أخرجه البخارى فى الإيمان، باب فإن تابوا وأقاموا الصلاة الخ ۱ / ۸ برقم ۲۵ ومسلم فيه، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لاإله إلا الله محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱ / ۳۷ برقم ۳۶.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قتال کروں کفار سے، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دینے لگیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوۃ ادا کرنے لگیں، پس جب وہ ایسا کرنے لگیں گے تو انہوں نے اپنی جان اور مال کو مجھ سے بچالیا، مگر حق اسلام کی وجہ سے (یعنی اسلامی ضابطہ کے تحت جو باز پرس ہوگی وہ اب بھی باقی رہے گی) اسکے بعد ان کے باطن کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے (بخاری و مسلم) مسلم شریف کی روایت میں ''إلا بحق الاسلام'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

تشریح حدیث

محض زبانی اقرار پر ایمان کا حکم:

ایمان کا بنیادی رکن تصدیق قلبی ہے، اور وہی اسلام و ایمان عنداللہ مقبول و معتبر ہے جو صدقِ قلب سے ہو، مگر بعض صورتوں میں صرف ظاہر پر اعتماد کرتے ہوئے ایمان و اسلام کا حکم لگادیا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک صورت وہ ہے جو عموماً جنگ کے دوران پیش آتی ہے کہ اگر کوئی کافر یا جماعتِ کفار کلمۂ اسلام پڑھ لے اور اسلامی احکام کی تعمیل کا وعدہ کرلے تو پھر ان کے اس اقرار و وعدہ پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو مسلمان سمجھا جائے گا اور ان سے جنگ و قتال کو روک دیا جائے گا، اگر انہوں نے ایسا محض اپنی جان و مال بچانے کے لئے کیا ہو تو ان کا حساب و کتاب اللہ کے حوالہ کردیا جائیگا ان کو کافر سمجھ کر ان کو قتل کرنا اور ان کا مال لینا جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ ہم ظاہر کے مکلّف ہیں اور دل کے اندر کا حال جاننا ہمارے لئے ممکن بھی نہیں، پس ہم ظاہر پر اعتماد کریں گے۔

حضرت اسامہ بن زیدؓ نے ایک جنگ کے دوران ایک کافر کو کلمہ پڑھ لینے کے باوجود قتل کر ڈالا، یہ سوچ کر کہ اس نے جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا ہے نہ کہ صدقِ قلب سے، آپ علیہ السلام کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ نے سخت غصہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: **افلا شققت عن قلبه**؟ یعنی اگر مسلمان ہونے کا مدار صرف دل پر ہے تو تم نے اس کے سینہ کو چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا! (۱)

---

(۱) بخاری: کتاب المغازی، باب بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسامۃ بن زید الی الحرقات من جھینۃ، ومسلم: کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لاالہ الا اللہ.

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جوکلمۂ اسلام پڑھ لے اس کومسلمان قرار دیا جائے گا، خواہ اس کے دل میں اسلام ہو یا نہ ہو، الا یہ کہ خود اسی سے ایسی بات سرزد ہو جائے جومنافیٔ اسلام ہو۔

جزیہ کا ذکر کیوں نہیں؟

یہاں سوال ہوتا ہے کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ کفار کو اولاً اسلام کی دعوت دی جائے اگر اسلام قبول کرلیں تو وہ مسلمان شمار ہوں گے، اور اگر اسلام قبول نہ کریں تو ان پر جزیہ پیش کیا جائے گا، اگر وہ جزیہ دینا منظور کرلیں تب بھی قتال نہ ہوگا اور اگر جزیہ پر بھی آمادہ نہ ہوں پھر قتال کیا جائے گا، یہاں روایت میں جزیہ کا تذکرہ نہیں ہے، محض اسلام قبول نہ کرنے پر قتال کا حکم مذکور ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حکمِ دنیا کے اعتبار سے جزیہ کلمہ ہی کے حکم میں ہے، کیونکہ کلمہ قبول کرنے کا مقصد اسلام کا غلبہ ہے، جزیہ منظور کرنے سے بھی اسلام کا غلبہ ہوتا ہے، لہٰذا صراحۃً اگرچہ اس کو ذکر نہیں کیا ہے البتہ کلمہ کے ضمن میں اس کا تذکرہ آ گیا ہے۔ (۱)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ ''الناس'' کا الف لام عہد خارجی کے معنی کے لئے ہے اور اس سے خاص مشرکین عرب مراد ہیں جن سے جزیہ نہیں لیا جائے گا وہ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر ان سے قتال کیا جائے گا۔ (۲)

کیا بے نمازی اور زکوۃ نہ دینے والے کو قتل کیا جائے گا؟

اس حدیث پاک میں اسلام کے ظاہری اعمال کا ذکر ہے، اس کا مفہوم مخالف نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایمان لائے لیکن نماز قائم نہ کرے اور زکوۃ ادا نہ کرے تو اس کو بھی قتل کیا جائے گا، چنانچہ امام نووی نے اس روایت سے استدلال فرماتے ہوئے تحریر کیا کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ تارک صلوۃ عامداً کو قتل کیا جائے گا، (۳) اس لئے ائمہ ثلثہ ایسے شخص کو واجب القتل کہتے ہیں، البتہ وجہ قتل میں اختلاف ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ بلا عذر نماز کو چھوڑنے والا مرتد ہے، حدیث میں ہے: ''مَنْ تَرَکَ الصلوۃَ متعمِّداً

(۱) فتح البارى ۱/۷۹ شيخ الهند، النكت على صحيح البخاري لابن حجر ۱/۲۸۹ ط المكتبة الإسلامية القاهرة.

(۲) شرح النووي على مسلم ۱/۳۸.

(۳) شرح النووي على مسلم ۱/۳۸.

فَقَدْ كَفَرَ'' اس لئے وہ واجب القتل ہوگا، امام شافعیؒ اورامام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تارک صلوۃ مرتد تو نہیں ہے، البتہ حداً اس کو قتل کیا جائے گا، جیسے زانی محصن کہ بطور سزا کے رجم کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ ایسا شخص نہ مرتد ہے نہ واجب القتل ہے، البتہ اس کو جیل میں بند کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا وہیں مرجائے، یہی حکم مانع زکوۃ کا ہے کہ اگر وہ زکوۃ کا منکر ہے تو وہ مرتد ہے اوراس پر ارتداد کا حکم جاری ہوگا، لیکن اگر وہ منکر تو نہیں ہے مگر دینے سے منع کرتا ہے تو اس سے جبراً وصول کی جائے گی اوراس کو تعزیر بھی کی جائے گی، مگر قتل نہیں کیا جائے گا۔

احناف اس استدلال کے جواب میں کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ابتدائی حصہ میں اسلامی سزاؤں کا بیان نہیں، اسلامی سزاؤں کو تو روایت کے اخیر حصہ میں ''الا بحق الاسلام '' کہہ کر بیان فرمایا ہے، روایت کے ابتدائی حصہ میں تو جنگ بندی کا بیان ہے اور مطلب یہ ہے کہ کفار کی فتنہ پردازی کی وجہ سے ان سے جہاد وقتال ہوتا ہے، اگر جنگ کے دوران وہ مسلمان ہوجائیں تو پھر جنگ بند کردینی ضروری ہے، کیونکہ جہاد کا مقصد اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کے راستہ پر ڈالنا ہے، پس جو شخص اللہ کے دین کو قبول کرلے اوراللہ کی بندگی کو قبول کر کے شریعت کے قانون پر چلنا منظور کرلے اس کے ساتھ جہاد کے کوئی معنی نہیں، اقامت صلوۃ اور ایتاء زکوۃ کا تذکرہ بطور مثال ہے بدنی عبادت میں سے اہم (نماز) کو لیا ہے اور مالی عبادت میں سے بھی اہم (زکوۃ) کو لیا، مراد پورا دین اسلام قبول کرنا ہے محض کلمہ پڑھ لینا مراد نہیں ہے۔

الابحق الاسلام: اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اگر لوگ کوئی ایسا جرم کریں جسکی سزا اسلام کے قانون میں جان یا مال لینا ہوتو اس کو وہ سزا دیجائے گی، ایمان لانے سے اور مسلمان کہلانے سے وہ قانونی گرفت سے بچ نہ سکیں گے، مسلم شریف میں یہ لفظ نہیں ہے، البتہ اس میں ''الابحقها'' ہے، جس کا مفہوم یہی نکلتا ہے۔

وحسابهم على الله: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کلمہ پڑھ کر اور اللہ کی بندگی قبول کر کے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرے ہم اس کو مسلمان مان کر جنگ بند کردیں گے، اوراس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کریں گے لیکن اگر حقیقت میں اس کی نیت میں کھوٹ ہے اوراس کے قلب میں ایمان نہیں ہے تو اس کا حساب آخرت میں اللہ تعالیٰ لیں گے کہ وہ دلوں کے راز سے واقف ہیں۔

ایک مشہور اعتراض اوراس کا جواب:

یہ حدیث اوراس جیسی دیگراحادیث وآیات کولیکر اعداءِ اسلام کی طرف سے ایک مشہور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام تنگ نظر اورپُرتشدد مذہب ہے، وہ لوگوں کوآزادی کے ساتھ کسی اورمذہب پرعمل پیرانہیں دیکھنا چاہتااورانہیں زبردستی اسلام میں شمولیت پرمجبورکرتاہے، چنانچہ اس حدیث میں بھی یہی کہا گیاہے کہ اگرلوگ شہادتین کااقرارنہ کریں اوراسلامی احکام قبول نہ کریں توان سے قتال کیاجائے تاآنکہ وہ اس پرآمادہ ہوجائیں،تو اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے پھیلایا جاتارہاہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اسلامی احکام وقوانین سے ناواقفیت اوران کے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے،اس لئے کہ خوداسلامی شریعت میں یہ طے ہے کہ:(الف) جن کفار سے صلح ہوجائے ان سے تعرض نہ کرو:''وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا''[1](ب)جوکفار دارالاسلام میں امان لے کرآنا چاہیں انہیں امان دو:وَإِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ[2](ج) جواسلام کی ماتحتی قبول کرکے جزیہ دینے پرآمادہ ہوجائیں ان کی جان ومال کی حفاظت کرو:حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ[3] یہ وہ صورتیں ہیں جن میں کافروں پرتلوار اٹھانا مسلمانوں پرتلوار اٹھانے کے مثل ہے،اسلام تنگ نظر ہوتایااس کا مقصد لوگوں کوزبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو پھروہ ان صورتوں میں کافروں پرتلوار اٹھانے کو کیوں منع کرتا۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں حدیث میں''النـــاس'' سے مراد جملہ کفارومشرکین نہیں ہے بلکہ وہ کفارومشرکین مراد ہیں جونہ جزیہ دے کراسلام کی ماتحتی قبول کریں اورنہ کسی قسم کی صلح پرآمادہ ہوں اوروہ مسلمانوں کے لئے خطرہ بن رہے ہوں تو ایسے کفارومشرکین سے جنگ وجہاد کاحکم ہے کیونکہ جب ان سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں تو وہ بھی مسلمانوں پرجب چاہے حملہ آورہوسکتے ہیں،لہٰذا مسلمانوں کوبھی اجازت ہے کہ اگروہ اسلام اورمسلمانوں کے لیے خطرہ بن رہے ہوں ان کاسرکچل دیں،غورکیاجائے کہ اس میں کونسا تشدداورظلم ہے؟ ساری دنیا کا اصول یہی ہے کہ جوخطرہ بن رہاہے اس سے تحفظ کی سعی کی جائے

(۱)الأنفال:٦١.

(۲)التوبة:٦.

(۳)التوبة:

عقل ودانش کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

۱۳ / ۱۲ وعن انسٍ رضی اللہ عنہ أنہ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم مَن صلّٰى صلاتَنا، واستقبلَ قبلتَنا، وأَكَلَ ذَبِيْحَتَنا فذلك المسلمُ الذى له ذِمةُ الله وذِمة رسولِه فلاتُخفِروا اللهَ فى ذِمتِهٖ. (رواہ البخاری)(۱)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص ہماری نماز کی طرح نماز پڑھے اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارے ذبیحہ کو کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کیلئے اللہ سبحانہ وتعالی اور اس کے رسول کا عہد وامان ہے، پس تم اللہ سے خیانت مت کرو اس کے عہد وامان کے بارے میں۔ (بخاری)

تشریح حدیث

علاماتِ اسلام:

اس حدیث میں اسلام کی علامات اور مسلمان ہونے کی ظاہری شناخت اور پہچان بیان کی گئی ہے اور مقصد یہ ہے کہ جو آدمی ظاہر میں اعمالِ اسلام کو اختیار کرے گا وہ مسلمان شمار ہوگا اور اللہ ورسول کی ذمہ داری میں آجائے گا، یعنی اس کے جان ومال محفوظ ہوجائیں گے، لہٰذا دیگر مسلمانوں کے لئے ان کے جان ومال سے تعرض جائز نہیں ہوگا ورنہ یہ بدعہدی شمار ہوگی۔

من صلی صلاتنا: ہماری جیسی نماز پڑھے یعنی یہود ونصاریٰ جیسی نماز نہ پڑھے کہ ان کی نماز مسلمانوں کی نماز سے الگ ہوتی ہے، چنانچہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں ہوتا، اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزوں میں فرق ہے۔

واستقبل قبلتنا: اسلام کی ایک امتیازی اور بہت کھلی ہوئی علامت بتائی کہ خانۂ کعبہ کو اپنا قبلہ ماننے، یہ امتیازی علامت اس لئے ہے کہ اپنے قبلہ کو ہر شخص پہچانتا ہے چاہے اس کو نماز کا علم نہ ہو، مگر اپنے قبلہ کا علم ضرور ہوتا ہے، مسلمانوں کا قبلہ خانہ کعبہ، یہود کا قبلہ بیت المقدس اور نصاری کا قبلہ جہت مشرق ہے، من صلی صلوتنا میں استقبال قبلہ بھی داخل ہے لیکن یہ اسلام کی کھلی ہوئی علامت ہے اس لئے اس کو الگ سے

(۱) أخرجه البخارى فى الصلاة، باب فضل استقبال القبلة يستقبل بأطراف رجليه القبلة ۱ / ۵٦ برقم ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱.

بیان کیا گیا ہے۔

واکل ذبیحتنا: تیسری ظاہری علامت اسلام کی یہ ہے کہ ہمارے ذبیحہ کو کھائے، مراد عبادات وعادات دونوں میں مسلمانوں کا اتباع کرنا ہے۔

یہ اوراس سے پہلی حدیث دونوں اس میں مشترک ہیں کہ بعض صورتوں میں ظاہر حال کے لحاظ سے اسلام کا حکم لگادیا جاتا ہے، ایک صورت کا بیان اس سے پہلی حدیث میں ہوا کہ جو ظاہر میں کلمہ پڑھ لے اوراحکامِ اسلام کی پابندی کا عہد کرلے اس کو مسلمان شمار کیا جائے گا، اوردوسری صورت کا بیان اس حدیث میں ہے کہ جو اسلام کی ظاہری تعلیمات کو اپنالے اورمسلمانوں کے شعائر کو اختیار کرلے اس کو بھی مسلمان قرار دیا جائے گا اوران کے دل کا حال اللہ کے حوالہ کردیا جائے گا۔

قادیانی کافر کیوں؟

یہاں اشکال ہے کہ مذکورہ تین کام کرنے والا شخص مسلمان ہے اوراللہ کے عہد میں ہے تو پھر قادیانیوں پر کفر کا حکم کیوں لگایا جاتا ہے جبکہ انکے اندر تینوں امور پائے جاتے ہیں؟ نیز متکلمین کے یہاں باقاعدہ ضابطہ ہے ''لانُکفِّر احداً من أهلِ ا لقبلةِ'' کہ ہم اہل قبلہ کی تکفیر نہ کریں گے، قادیانی بھی خانہ کعبہ کو اپنا قبلہ تسلیم کرتے ہیں، پھران پر کفر کا حکم کیوں ہے؟

جواب: متکلمین کی اصطلاح میں ''اہل قبلہ'' سے وہ شخص مراد ہوتا ہے، جو تمام ضروریات دین (قطعی احکام) کی تصدیق کرے، لہٰذا اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی منکر ہو تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں ہے، اس حدیث کی بھی مراد یہی ہے کہ جو دین کے بدیہی احکام کی تصدیق کرے وہ مسلم ہے، یہ تینوں امور بدیہیات دین میں سے ہیں اورمطلب یہ ہے کہ جو دین کی بدیہی اورضروری باتوں کا معترف ہوجن میں یہ تینوں امور بھی داخل ہیں اس کو مسلمان قرار دیا جائے گا، قادیانی ضروریات دین میں سے ختم نبوت کا انکار کرتے ہیں،اس لئے وہ مسلمان نہیں ہیں، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ جوان تینوں کو اختیار کرے اس کو ہرحال میں مسلمان کہا جائے گا، خواہ وہ دوسرے کسی بھی قطعی حکم کا منکر ہو، اس لئے کہ قطعیاتِ دین صرف انہی تین میں منحصر نہیں ہے، ان تین کا تذکرہ تو بطور مثال ہے۔

اہل قبلہ کا صحیح مفہوم:

نیز متکلمین کے ضابطہ میں بھی ''بذنب'' کی قید ہے اوراس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ارتکاب معاصی اور عملی کوتاہیوں کی وجہ سے کسی کی تکفیر نہیں کریں گے اوراس کو اہل قبلہ سے خارج نہیں کریں گے، جیسا کہ معتزلہ اورخوارج کرتے ہیں ، البتہ اگرکوئی قطعیات دین اورمسلماتِ دین کا منکرہوتو اس کو اہل قبلہ سے خارج قرار دیاجائے گا اوراس کی تکفیر کی جائے گی، پس اس ضابطہ کی روسے قادیانی بھی اہل قبلہ میں شمار نہیں ہوں گے، مذکورہ ضابطہ سے متعلق یہ تفصیل شرح عقائد کی شرح ''نبراس'' میں موجود ہے۔ (۱)

فلاتخفروا الله في ذمته: یہ ''اخفریخفراخفاراً'' سے ہے، جس کے معنی بدعہدی کرنے کے ہیں۔

فوائد حدیث:

(۱)اس حدیث سے استقبال قبلہ کی اہمیت وعظمت ظاہر ہے، کہ اس کو اسلام وغیراسلام کے مابین حدفاصل اوراس کے اختیار کرنے والے کی جان ومال کومحفوظ اورمامون قرار دیا گیا ہے۔

(۲)نماز کے ساتھ استقبال قبلہ کے تذکرہ سے اس کانماز کے لئے شرط ہونابھی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس پرائمہ اربعہ کا اتفاق ہے، الایہ کہ مصلی استقبال قبلہ سے عاجز ہویا خارج مصرسواری پرنفل نماز پڑھ رہاہو۔

(۳)مسلمانوں کا ذبیحہ کھانا بھی اسلام کی علامات میں سے ہے، چنانچہ بعض قومیں مثلاً یہود ومجوس وغیرہ مسلمانوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے۔

١٤ / ١٣ وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ: أَتٰى أَعْرَابِيٌّ النبیَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دُلَّنِي عَلٰى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ، قَالَ: تَعْبُدُاللّٰهَ، وَلاتُشْرِکُ بِهٖ شَيْئًا، وتُقِيْمُ الصلوةَ المكتوبةَ، وَتُؤَدِّی الزَّکٰوةَ الْمَفْرُوْضَةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، قَالَ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لاأَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا شَيْئاً ولاأَنْقُصُ مِنْهُ، فَلَمَّا وَلّٰى قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يَنْظُرَ إِلىٰ رجلٍ من أَهْلِ الجنةِ فَلْيَنْظُرْ إِلٰى هذا. (متفق علیہ)(۲)

(۱)نبراس ص:۲٤٩.

(۲)أخرجه البخاری فی "الزكوة" باب وجوب الزكوة وقول الله عزوجل وأقيموا الصلاة وآتوالزكاة١ /١٨٧برقم ١٣٨١ ومسلم فی الإيمان،باب السؤال عن أركان الإسلام١ / ٣٠ برقم ١٥.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے کہ اس کے کرنے سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نماز پڑھو، فرض زکوۃ اداء کرو، اور رمضان کے روزے رکھو۔ (یہ سن کر) اس دیہاتی نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس پر نہ کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس میں سے کچھ کم کروں گا، پس جب وہ دیہاتی واپس چلا گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو اس بات سے خوشی ہو کہ وہ کسی جنتی آدمی کو دیکھے وہ اس شخص کو دیکھ لے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اعمالِ ایمان اوران کی فضیلت:

اس حدیث میں اعمال ایمان کا بیان ہے اعمال ایمان سے ایمان میں پختگی آتی ہے اس لحاظ سے حدیث الباب کی کتاب الایمان سے مناسبت ہے۔

یہاں حدیث شریف میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور سوال کیا کہ مجھے ایسا عمل بتادیجئے کہ جس سے میں جنت میں داخل ہوجاؤں، اس نے بہت اخلاص کے ساتھ سوال کیا، حضور نے جواب دیا کہ اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اس کے علاوہ آپ نے اس کو نماز، زکوۃ اور روزہ کی بھی تلقین کی، اس نے جواب میں بلاکم وکاست تعمیل کا عہد کیا، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنت کی بشارت سنائی۔

اعرابی: یہ قبیلہ قیس کے ایک شخص ہیں، ان کا نام لقیط بن صبرہ ہے، ان کے اجداد میں ایک شخص کا نام منتفق ہے اس لئے لقیط بن صبرہ کو ابن المنتفق بھی کہا جاتا ہے۔[1]

دخلت الجنة: دخول جنت سے مراد جنت کا دخول اولی ہے، اس لئے کہ جنت کا مطلق داخلہ تو ہر مومن کو حاصل ہوگا۔

---

(۱) عمدة القاري ۸ / ۲٤۲.

ایک تعارض کا حل:

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کا داخلہ اعمال کے سبب سے ہے؛ حالانکہ ایک حدیث میں ہے: ''مامن أحدٍ یَدْخُل الجنۃَ الا بفضلِ اللہِ الخ''یعنی جنت میں جو بھی داخل ہوگا وہ محض فضل الٰہی سے داخل ہوگا، اعمال کی بناء پر نہیں، اس پر حضرات صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا آپ بھی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہیں جائیں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ مجھے اپنی مغفرت ورحمت میں چھپالیں،[1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دخول جنت فضل الٰہی سے ہوگا، اعمال کی بنیاد پر نہیں ہوگا؟ دونوں روایتوں کے مقتضا میں تعارض ہوا، اس کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) کسی چیز کی ایک ہوتی ہے علت تامہ اور ایک ہوتا ہے سبب، علت تامہ کے بعد معلول کا وجود یقینی ہوتا ہے اور سبب کے پائے جانے کے بعد مسبب کا پایا جانا ضروری نہیں، دخول جنت کے لئے علت تامہ تو اللہ کا فضل ہے اور اعمال سبب ہیں، حدیث الباب میں سبب کا بیان ہے اور دوسری حدیث میں علتِ تامہ کا، لہٰذا کوئی منافات نہیں۔

(۲) دخول جنت کے دو سبب ہیں: ایک قریب دوسرا بعید، سبب قریب ایمان واعمال ہیں اور سبب بعید فضل خداوندی ہے، بخاری شریف کی مذکورہ حدیث میں سبب بعید کا بیان ہے اور یہاں روایت میں سبب قریب کا، نصوص میں زیادہ تر سبب قریب کا ذکر آتا ہے۔

(۳) ایک ہے نفس دخول جنت اور ایک ہے جنت میں اعلی مراتب کا حصول، نفسِ دخولِ جنت اللہ کے فضل سے ہوگا اور اعلی مراتب کا حصول اعمال کی بنا پر ہوگا۔

(۴) اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ دخول جنت فضل الٰہی کی وجہ سے ہوگا، لیکن عادت اللہ یہی ہے کہ فضل اسی پر کیا جاتا ہے جو اعمال بھی اختیار کرے، اس لحاظ سے اعمال بھی دخول جنت کا سبب ہوئے۔

تعبد: مضارع کا صیغہ ہے بمعنی امر أی اُعبداللہ، اہل عرب مبالغہ کے مقصد سے امر کی جگہ صیغہ مضارع لاتے ہیں، گویا مخاطب کو ایک بات کا حکم دیا گیا اور مخاطب نے اس پر عمل بھی کرلیا اور اب متکلم اس کی خبر دے رہا ہے۔

---

(۱) بخاری شریف ۲/۸٤۷(٥٦٧٣)، ۲/۹٥۷(٦٤٦٣)

بعض علماء نے کہا کہ یہاں عبادت سے مراد توحید ہے، حضرت ابن عباسؓ نے تو ضابطہ بیان کیا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی لفظ عبادت آیا ہے اس سے توحید مراد ہوتی ہے، اسی وجہ سے اگلے جملہ میں اس کی ضد شرک کی نفی کی گئی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اعرابی کا سوال اعمال کے متعلق تھا لہٰذا عبادت سے اعمال ہی مراد ہیں، اس وقت شرک نہ کرنے سے مراد شرک خفی ہوگا، شرک جلی کہا جاتا ہے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ذات یا صفات میں، اور شرک خفی سے مراد ریاء ہے یعنی اعمال کو ریا کاری سے پاک رکھا جائے، اگر اعمال مراد ہیں تو مابعد کے جملے تخصیص بعد التعمیم کے قبیل سے ہونگے۔

المکتوبة: بمعنی لکھی ہوئی چیز، لکھا جاتا ہے ضروی چیز کو اور فرض بھی ضروری ہے لہٰذا ''الصلوة المکتوبة'' سے مراد فرض نماز ہے۔

المفروضة: اس سے صدقات نافلہ کو نکال دیا گیا اور صوم میں فرض کی قید نہیں لگائی، اس لئے کہ رمضان کے روزے فرض ہی ہوتے ہیں، یہاں تفنن کے لئے تین اعمال کے ساتھ تین الگ الگ قیدیں لائی گئی ہیں جبکہ مراد تینوں کی ایک ہے۔

ایک سوال وجواب:

لاأزید علی هذا شیئا الخ: یہاں یہ سوال ہے کہ ''**لاانقص منه**'' کہنا تو صحیح ہے، لیکن ''**لاأزید علی هذا**'' کہنے سے تو اعمال نافلہ کی نفی ہو جاتی ہے، حالانکہ شریعت میں اعمال نافلہ بھی مطلوب ہیں، بلکہ رفع درجات کے لئے اعمال نافلہ ضروری ہیں؟ اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) اہل عرب اس جیسا جملہ'' زیادة اهتمام فی العمل'' کے لئے بولتے ہیں، اس کے حقیقی معنی (زیادتی) مراد نہیں ہوتے، گویا اس نے کہا کہ میں ان اعمال کی خوب پابندی کرونگا، یہی جواب راجح ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ اس اعرابی کا مقصود ''**لاازید علی هذا**'' سے یہ تھا کہ میں اپنی طرف سے ان اعمال پر اضافہ نہیں کروں گا کہ یہ تو بدعت ہے، ہاں اگر آپ مزید اعمال بتائیں تو میں ان پر بھی عمل کروں گا۔

(۳) یہ شخص اپنے قبیلہ کا نمائندہ تھا، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنی قوم کے سامنے اتنا ہی بیان

کروں گا جتنا آپ نے بتایا ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہوں گا۔

(۴) مقصود یہ تھا کہ فرائض میں کمی بیشی نہیں کروں گا، چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "والله لاازید ولاانقص مما فرض الله تعالیٰ علی شیئا"[1]

قال النبی صلی الله علیه وسلم من سره الخ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ اس کا جنتی ہونا معلوم ہوگیا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جنتی ہونے کی بشارت دی، یا اس کے جذبۂ اخلاص کی بناپر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے میں جنتی ہونے کا ظن غالب ہوگیا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت سنائی، ایسے بہت سے صحابہ کرامؓ ہیں جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت سنائی ہے، جن میں عشرۂ مبشرہ مشہور ہیں۔

اس حدیث میں صرف تین اعمال بیان فرمائے گئے ہیں، حج وجہاد کا ذکر نہیں کیا گیا، اس لئے کہ جہاد ہر وقت نہیں ہوتا اور حج فرض ہوا ہے ۹ھ یا ۱۰ھ میں، اس وقت تک حج کی فرضیت نہیں ہوئی تھی۔

۱۵ / ۱٤ وعن سفیانَ عبدِالله الثقفِيّ قال: قلت : یارسولَ الله! قُل لی فی الإسلام قولاً لاأسأل عنه أحداً بعدَکَ وفی روایة غیرَکَ قال: قُل "آمنتُ بالله" ثُمَّ استَقِمْ. (رواہ مسلم[2])

ترجمہ: -حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اسلام کی کوئی ایسی (جامع) بات بتادیجئے کہ آپ کے بعد مجھے کسی دوسرے سے معلوم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ (زبان اور دل سے) اس بات کا اقرار کرو کہ میں اللہ پر ایمان لایا ہوں، اور پھر اس پر قائم رہو۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

احوال سفیان ثقفی:

ثقفي: ثقیف کی طرف نسبت ہے جو طائف میں ایک قبیلہ تھا، والد کا نام عبداللہ اور دادا کا نام ربیعۃ ہے،

(۱) رواه البخاري في صحيحه، في كتاب الصوم، باب وجوب صوم رمضان ۱ / ۲۰٤ (۱۸۰۳)

(۲) أخرجه مسلم فی الإيمان باب جامع أوصاف الإسلام ۱ / ٤۸.

یہ متأخرالاسلام صحابی ہیں، بعض نے ان کے صحابی ہونے کا انکار کیا ہے لیکن راجح یہ ہے کہ یہ صحابی ہیں، ان کے واسطہ سے پانچ روایات منقول ہیں، حضرت عمرؓ نے ان کو طائف کا گورنر مقرر فرمایا تھا۔[1]

ایمان پر استقامت کا بیان:

اس حدیث میں بھی ایمان کا بیان ہے اور اس پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے، راوی حدیث سفیان بن عبداللہ ثقفی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ مجھے اسلام کے بارے میں ایسی جامع اور مکمل بات بتائیں جس میں سارے دین کا خلاصہ آجائے اور پھر اس کے متعلق آئندہ کسی سے سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے: **قل لي في الإسلام أي فيما يكمل به الإسلام.**

حدیث کی اہمیت وجامعیت:

یہ بہت اہم سوال ہے، شراح نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جواب دیا وہ سوال سے بھی زیادہ اہم ہے، ملاعلی قاری نے اس روایت کو اصول اسلام پر مشتمل ہونے کی وجہ سے جوامع الکلم سے قرار دیا ہے[2] چنانچہ حدیث کے دو جملوں نے پورے دین کا احاطہ کرلیا ہے۔

آمنت بالله: اس سے صرف اللہ پر ایمان لانے کا حکم دینا مقصود نہیں، بلکہ جمیع مؤمن بہ پر ایمان لانے کا حکم دینا مقصود ہے اور ایمان کے تقاضوں اور حکموں پر عمل کرنا بھی اس میں داخل ہے، اس لئے کہ جب بندہ صحیح معنی میں اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اللہ کو اپنا خالق ومالک اور خود کو اللہ کا غلام مانتا ہے اور غلام کا کام ہوتا ہے کہ اپنے مالک کے تمام اوامر کو بجالائے اور اس کے تمام نواہی سے بچے، اور حقوق اللہ وحقوق العباد سب ادا کرے۔

استقامت کے معنی اور اس کی اہمیت:

ثم استقم: اس جملہ میں ایمان اور اس کے مقتضیات پر ثابت رہنے کا حکم دیا گیا، استقامت کے معنی ہیں کسی چیز کو درست کرنا، یہاں مراد ہے اعمال صالحہ پر مداومت وپابندی کرنا، استقامت بہت اہم چیز ہے، امام فخرالدین رازی نے فرمایا ہے: **الإستقامةُ امرٌ صَعْبٌ** یعنی استقامت بہت مشکل امر ہے، کیونکہ آدمی

(۱) الإصابه ۲/ ۳۵٦–۳۵۷، والمرقاة ۱/ ۱۵٤.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۵٤.

بعض مرتبہ جوش وجذبہ میں بڑا عمل شروع کرتا ہے پھر جب جذبہ اور جوش کم ہوجاتا ہے تو عمل میں کمی کردیتا ہے اور بسا اوقات چھوڑ بیٹھتا ہے، یہ کمال نہیں ہے، بلکہ عمل پر استقامت کمال کی چیز ہے، اسی وجہ سے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: ''خَيرُ العملِ مادِيْم عليه وإن قَلَّ'' کہ سب سے بہتر عمل وہ ہے جس پر مداومت ہو، گو عمل کم ہو۔

حضرات صوفیا فرماتے ہیں کہ ''الإستقامةُ خيرمن ألفِ كرامةٍ'' یعنی استقامت ہزار کرامتوں سے افضل ہے، اور امام غزالی نے فرمایا کہ: شریعت پر استقامت دُنیا میں پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ضعف لاحق ہوگیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ''شَيَّبْتَ'' یعنی آپ بوڑھے ہوگئے؟ تو آپ نے فرمایا: ''شَيَّبَتْنِي هُودُ وأمثالُها'' کہ مجھے سورۂ ھود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کردیا، اور سورۂ ھود میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے: ''فاستقم كماامرت''۔

١٦ / ١٥ وعن طلحةَ بنِ عبيدِاللّٰهِ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إلى رسولِ الله صلى الله عليه وسلم مِنْ أَهلِ نَجْدٍ، ثائرَ الرأسِ، نَسْمَعُ دوِيَّ صوتِه ولانَفْقَهُ مايقول، حتى دَنا من رسولِ الله صلى الله عليه وسلم، فَإِذا هويَسْأل عن الإسلامِ، فقال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم'' خمسُ صَلَوٰتٍ في اليومِ والليلةِ'' فقالَ: هَل عليَّ غَيرُهُنَّ؟ فقال :لا، إلَّا أَنْ تَطَوَّعَ، قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: ''وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ'' فقال هلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ؟ قال: لاإلَّا أَنْ تطوَّعَ قَالَ: وَذَكَرَلَهُ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم الزكاةَ، فقال هلْ عَلَيَّ غيرُها؟ فقال: لا، إلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَأَدْبَرَالرَّجلُ وهو يقول: والله لاأَزِيْدُ عَلٰى هذا، ولاأَنْقُصُ منه، فقال رسو ل الله صلى الله عليه وسلم: ''أَفْلَحَ الرَّجُل إنْ صَدَقَ'' (متفق عليه[1])

ترجمہ:- حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے مروی ہے کہ نجد والوں میں سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، جو پراگندہ بال تھا، ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ تو سن رہے تھے، لیکن (دور ہونے کی وجہ سے) یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچ گیا تو اچانک (ہم نے سنا) کہ اسلام کے (فرائض کے)

(١) أخرجه البخاري في اربعة مواضع، ''الإيمان'' ١ / ١١ برقم ٤٦، و''الصوم'' ١ / ٢٥٤ برقم ١٨٣٥، و''الشهادات'' ١ / ٣٦٨ برقم ٢٦٠١، و''الخيل'' ٢ / ١٠٢٨ برقم ٦٦٨٨، ومسلم في الإيمان ١ / ٣٠.

بارے میں سوال کررہاہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں، اس شخص نے عرض کیا، ان پانچ نمازوں کے علاوہ کچھ اورنمازیں بھی مجھ پرفرض ہیں؟ آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشادفرمایانہیں، الا یہ کہ تم نفل نماز پڑھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور ماہ رمضان کے روزے (فرض ہیں) اس شخص نے عرض کیا ان روزوں کے علاوہ کیا کچھ اورروزے بھی میرے اوپرلازم ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایانہیں مگر یہ کہ نفل روزے رکھنا چاہو، راوی کا بیان ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد اس کے سامنے زکوۃ کاذکرفرمایا، اس نے عرض کیا کہ: کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پرکوئی صدقہ لازم ہے؟
حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایانہیں الا یہ کہ نفلی صدقہ کرنا چاہو، راوی کہتے ہیں کہ: اس کے بعد وہ شخص واپس چلاگیا، دراں حالیکہ وہ کہہ رہاتھا کہ: خدا کی قسم! میں اس پر نہ تو کچھ زیادہ کروں گااورنہ اس میں کچھ کمی کروں گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ شخص کامیاب ہوگیا اگراس نے سچ کہا۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال طلحہ بن عبیداللہ اوران کے قبولِ اسلام کا واقعہ:

یہ جلیل القدرصحابی ہیں، عشرۂ مبشرہ اوراولین اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں، قریشی ہیں، حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پراسلام قبول کیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ:
یہ بُصریٰ کے بازار میں گئے ہوئے تھے وہاں کسی راہب نے آواز لگائی کہ کیاتم لوگوں میں کوئی اہل حرم میں سے بھی ہے؟ انہوں نے کہا میں ہوں، اس پراس نے پوچھا کہ کیاتم میں کوئی احمد نامی شخص ظاہر ہواہے؟ انھوں نے کہا کون احمد؟ اس نے کہا: احمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب، اور یہ ان کے ظہور کا مہینہ ہے، اور وہ آخری نبی ہوں گے جوحرم میں ظاہر ہوں گے اورمدینہ ہجرت کریں گے، تم ان پرایمان لانے میں سبقت کرنا، طلحہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی، میں فوراً مکہ آیا اورلوگوں سے پوچھا کہ کوئی واقعہ تو پیش نہیں آیا؟ لوگوں نے کہا کہ: محمد نے نبوت کا دعوی کیا ہے اور ابن ابی قحافہ (ابوبکر) نے ان

کی اتباع کرلی، فرماتے ہیں کہ میں ابوبکر کے پاس پہنچا اور وہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور میں نے فوراً اسلام قبول کرلیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو راہب کا یہ پورا واقعہ سنایا۔

یہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوسکے، اس کا افسوس رہا، اس لئے غزوۂ احد میں بڑی دلیری کے ساتھ لڑے، بدر کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ان کو ایک مہم پر روانہ فرمایا تھا، جس کی بناء پر ان کو بھی بدر کے مال غنیمت سے حصہ دیا گیا، غزوۂ احد میں کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نرغہ میں لے لیا تھا اور چاروں طرف سے تیر آرہے تھے تو حضرت طلحہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ڈھال بن گئے تھے حتی کہ ان کا ہاتھ شل ہوگیا اور بدن پر ۷۵ زخم تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلحہ نے یہ جاں نثاری کا مظاہرہ کرکے اپنے لئے جنت واجب کرلی۔ ۳۶ھ میں جنگ جمل میں شہید ہوئے اور بصرہ میں مدفون ہوئے، آپ کی عمر ۶۴ سال ہوئی۔[1]

ایک صحابی کا اعمالِ ایمان کے بارے میں سوال:

اس حدیث پاک میں بھی اعمال ایمان کا بیان ہے اور اس میں ابوہریرہؓ کی حدیث کی طرح ایک واقعہ مذکور ہے کہ اہل نجد میں سے ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور مختلف سوالات کئے اور ان پر پابندی واستقامت کا وعدہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی سرخروئی کی بشارت سنائی۔

ان آنے والے شخص کا نام ضمام بن ثعلبہ تھا[2] یہ قبیلہ "بنوبکر بن سعد" کی طرف سے آئے تھے، جو عرب کا بہت بڑا قبیلہ تھا، عرب کے دو علاقہ ہیں ایک بلندی کا ہے اور دوسرا کچھ نشیب وپستی کا ہے، جیسے مغربی یوپی اور مشرقی یوپی، عرب کے بلند علاقہ کو "نجد" اور پستی کے علاقہ کو "تہامہ" اور دونوں کے درمیان کا علاقہ "حجاز" کہلاتا ہے، حجاز بمعنی حائل، درمیان کی آڑ۔

ثائر الراس: اس کے بال پراگندہ تھے جیسا کہ مسافروں کے ہوا کرتے ہیں، اس میں مضاف الیہ محذوف ہے "ثائر شعر الرأس" اکہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا صفت ہونے کی بنا پر مرفوع ہے، اور روایت مشہور ہے۔[3]

(۱) الاصابۃ ۳/ ۸۴-۸۶.

(۲) فتح الإلہ ۱/ ۲۸۵.

(۳) لمعات ۱/ ۲۳۸.

نسمع دوی صوته : یعنی ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ تو سن رہے تھے لیکن بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی، دویّ: بمعنی شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ۔

حتی دنا الخ: راوی کہتے ہیں کہ وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کے بارے میں سوال کر رہا ہے، پہلے دوری کی وجہ سے سوائے آواز کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، بعض نے کہا کہ یہ شخص قبیلہ کا قاصد بن کر کچھ سوالات لے کر آیا تھا تو وہ ان سوالات کا جلدی جلدی تکرار کر رہا تھا اس وجہ سے بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

فاذا هو يسأل عن الإسلام: بہرحال اس نے اسلام کے بارے میں سوال کیا، بظاہر ماہیتِ اسلام کے بارے میں سوال تھا، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمالِ اسلام بتائے اس لئے کہ آپ کو معلوم تھا کہ یہ مسلمان ہے، یا پھر اس کا مقصد اعمال کے بارے میں ہی سوال کرنا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، نماز کے بارے میں سب سے پہلے اس لئے بتایا کہ وہ اول فریضۂ اسلام ہے، اس نے پوچھا اس کے علاوہ کچھ اور؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا، **الا ان تطوع**، یعنی نہیں الا یہ کہ تم نفل نماز پڑھنا چاہو تو جتنا چاہے پڑھو۔

وتر کا حکم:

حضرات صاحبین اور ائمہ ثلاثہ نے اس جملہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ وتر کی نماز واجب نہیں ہے، بلکہ سنت ہے، کیونکہ فرض نمازوں کے علاوہ کو تطوع فرمایا ہے، امام صاحبؒ کے یہاں وتر واجب ہے، ان کی طرف سے اس روایت کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب وتر کی نماز کا وجوب نہیں ہوا تھا، وتر میں بطور وجوب تاکید بعد میں آئی ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ تر عشاء کی نماز کے تابع ہے، مستقل نماز نہیں ہے، اسی وجہ سے عشاء کے فرض کے بغیر وتر کی ادائیگی درست نہیں، اس لحاظ سے "**خمس صلوت**" میں عشاء کو بیان فرمایا تو اس کے ضمن میں وتر بھی آگیا۔

إلاأن تطوع : یہ جمہور کے یہاں استثناء منقطع ہے، کیوں کہ مستثنیٰ منہ میں فرض کا بیان ہے اور مستثنیٰ میں نفل کا اور فرض ونفل دونوں کی جنس الگ ہے۔

بعض احناف نے اس کو مستثنیٰ متصل کہا ہے اور اس کے معنی بیان کئے ہیں: **الا أن تشرع فی التطوع** یعنی پانچ نمازوں کے علاوہ اگر کسی نفل کو شروع کردے تو شروع کرنے سے یہ نماز بھی واجب ہوجائے گی اور اس کی تکمیل لازم ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "**لاتبطلوا اعمالکم**"، یہ احناف کا مذہب ہے، امام شافعی کے یہاں نفل نماز شروع کرنے سے واجب نہیں ہوتی، اس تفسیر کے لحاظ سے عند الاحناف یہ استثناء متصل ہے کہ اول میں بھی ضروری نمازوں کا بیان ہے اور بعد میں بھی۔ (۱)

وصیام شهر رمضان: پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماہ رمضان کے روزے بیان کئے، اس نے سوال کیا کہ اس کے علاوہ کچھ اور روزے بھی لازم ہیں؟ فرمایا: نہیں الا یہ کہ نفل روزہ رکھو۔

وذکر له الخ: راوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کا بھی ذکر فرمایا، یہاں تعبیر بدل دی کیونکہ راوی کو بعینہ الفاظ یاد نہیں رہے، اس لئے **ذکر له** کہہ کر مضمون بیان کیا، اور حج کا حکم نہیں دیا کیونکہ حج اس وقت تک فرض نہیں ہوا تھا۔ (۲)

قال فأدبر الرجل الخ: راوی کا بیان ہے کہ جب وہ شخص جانے لگا تو اس نے کہا کہ: واللہ! میں اس پر نہ اضافہ کروں گا اور نہ ہی ان اعمال میں کمی کروں گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ شخص کامیاب ہوگیا اگر اس نے سچ کہا، "**لاأزید علی هذا**" میں وہی سوال اور جوابات ہوں گے جو اس سے قبل حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں آئے۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

افلح الرجل ان صدق: سابق واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو حتمی طور پر جنت کی بشارت دی تھی اور یہاں فلاح کو معلق کیا ہے صدق پر، یہ فرق کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ علماء کا اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ دونوں واقعے الگ ہیں یا ایک ہی واقعہ ہے، اگر واقعے الگ ہیں تو کوئی اشکال نہیں، کیونکہ پہلے شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حتمی طور پر جنت کی بشارت دی بذریعہ وحی معلوم ہوجانے کی وجہ سے، اور یہاں حتمی طور پر معلوم نہیں ہوسکا تھا اس لئے حتمی بات ارشاد نہیں فرمائی۔

اور بعض نے یہ فرق بتایا کہ حدیث ابو ہریرہؓ میں آنے والے شخص کو جنت کی بشارت دی گئی اور یہاں

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۱۳۷، فتح الإله ۱/ ۲۸۷، المرقاة ۱/ ۱۵۸، لمعات التنقیح ۱/ ۲۳۹.

(۲) شرح الطیبی ۱/ ۱۳۸.

فلاح کو ثابت فرمایا گیا اور فلاح؛ دخول جنت سے اعلیٰ درجہ کی چیز ہے، کیونکہ ''فلاح'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی ناراضگی سے محفوظ رہتے ہوئے جنت میں داخلہ ملے اور دخولِ جنت کی بشارت کے ساتھ ناراضگی بھی جمع ہوسکتی ہے، بایں معنی کہ اولا عتاب وعذاب ہو پھر جنت کا داخلہ حاصل ہو، پس حصول فلاح کے لئے جو اعلیٰ درجہ ہے اس قسم کی تقیید درست ہے۔(۱)

بعض نے کہا کہ یہ دونوں واقعے ایک ہیں صرف راوی کے الفاظ کا فرق ہے، اس پر اشکال ہوگا کہ پھر شخص واحد پر دو مختلف حکم کیوں کر لگائے گئے؟ جواب یہ ہے کہ وہ شخص جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رہا اس وقت تک آپ نے فلاح کو صداقت کی قید کے ساتھ مقید فرمایا تاکہ اس کے اندر تکبر وعجب پیدا نہ ہو، جب وہ چلا گیا اور عجب کا اندیشہ نہ رہا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دخول جنت کی حتمی بشارت دی۔

خلاصہ یہ نکلا کہ اولا اس شخص کی کامیابی کے بارے میں غیر حتمی بات ارشاد فرمائی گئی اور پھر حتمی طور پر کامیابی کی بشارت دیدی گئی، پس ایک راوی نے غیر حتمی بات کو نقل کیا اور دوسرے راوی نے حتمی بات کو روایت کیا۔ (۲)

۱۷ / ۱٦ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: إِنَّ وَفْدَ عَبْدِالقَيْسِ لَمَّا اَتَوا النبىَ صلى الله عليه وسلم؛ قال رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم: "مَنِ القومُ؟ أومَنِ الوفدُ؟" قالوا: ربيعةُ. قال: مرحباً بالقومِ او: بالوفد، غَيْرَخَزَايا ولانَدَامَى قالوا: يارسولَ الله! إِنَّا لانَسْتَطِيْعُ أَنْ نَاْتِيَکَ إِلَّا في الشهرِالْحَرَام، وبَيْنَنا وبينَکَ هَذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ؛ فَمُرْنَا بأمرٍ فصلٍ، نُخْبِرُ به مَنْ وَارَئنَا، وَنَدْخُلُ بِهِ الجنةَ،وسَأَلُوْهُ عَنِ الْأَشْرِبَة، فَأَمَرَهُمْ بـأَرْبَعٍ، ونَهاهم عن أربعٍ: أَمَرَهُمْ بالإيمانِ باللهِ وَحْدَهُ،قَالَ: أَتَدْرُوْنَ مَاالإِيْمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهُ؟ قالوا: اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَم، قَالَ: شهادةُ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وأَنَّ محمداً رسولُ اللهِ، وإقامُ الصلوةِ، وإيتاءُ الزكاةِ، وصيامُ رمضانَ، وأن تُعْطُوْا مِنَ المَغْنَمِ الخُمُسَ، ونَهَاهُمْ عَنْ أربعٍ: عن الحَنْتَمِ، والدُّبَّاءِ والنقيرِ، والمزفَّتِ وقال: "اِحْفَظُوْ هُنَّ وَأَخْبِرُوْا

(۱)فتح الإله ۱ / ۲۸۹، والمرقاة ۱ / ۱۵۹.

(۲)فتح الإله ۱ / ۲۸۹، والمرقاة ۱ / ۱۵۹.

بھن مَنْ وَرَاءَ کم" (متفق علیہ[1]) ولفظه للبخاری.

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وفد عبدالقیس جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون لوگ ہیں؟ یا فرمایا کس قبیلہ کا وفد ہے؟ ان لوگوں نے عرض کیا کہ قبیلہ ربیعہ کے افراد ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوش آمدید دراں حالیکہ تمہارے لئے نہ رسوائی ہے اور نہ شرمندگی اہل وفد نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! چونکہ ہمارے اور آپ کے درمیان کفارِ مضر کا قبیلہ پڑتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں صرف اُس مہینہ میں آسکتے ہیں جس میں لڑنا حرام ہے، لہٰذا آپ ہمیں ایسی واضح بات بتادیجئے جس پر ہم خود بھی عمل کریں اور ان لوگوں کو بھی بتائیں جن کو ہم اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے ہیں اور اس پر عمل کرنے سے ہم جنت میں داخل ہوجائیں، (اس کے بعد) انہوں نے شراب کے برتنوں کے متعلق بھی پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے منع فرمایا (اول) اللہ جل شانہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ وفد والوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، (پھر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (۱) (اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ) اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، (۲) پابندی سے نماز پڑھنا (۳) زکوۃ دینا، (۴) ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم ادا کرو مال غنیمت میں سے خمس، اور چار برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا (۱) ہرے رنگ کا گھڑا، (۲) تو نبی (۳) لکڑی کھود کر بنایا ہوا برتن (۴) تارکول بھرا ہوا برتن، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان باتوں کو اچھی طرح یاد کرلو اور جو لوگ تمہارے پیچھے ہیں (وطن میں) ان کو یہ باتیں بتاؤ۔ (بخاری ومسلم) اور یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

(۱) أخرجه البخاری فی عشرة مواضع: الإیمان ۱/۱۳ برقم ۵۳، و"العلم" ۱/۱۹ برقم ۸۸، و"مواقیت الصلوة" ۱/۷۵ برقم ۵۱۷ و"الزکاة" ۱/۱۸۸ برقم ۱۳۸۲، و"فرض الخمس" ۱/۴۳۶ برقم ۲۹۹۶، و"المناقب" ۱/۴۹۸ برقم ۳۳۸۷، و"المغازی" ۲/۶۲۶ برقم ۴۱۹۴ و۴۱۹۵ و"الأدب" ۲/۹۱۲ برقم ۵۹۳۵، و"کتاب أخبار الأحاد" ۲/۱۰۷۹ برقم ۶۹۷۵ و"التوحید" ۲/۱۱۲۸ برقم ۷۲۵۵. ومسلم فی موضعین "الإیمان" ۱/۳۳ برقم: ۲۳، ۲۴، ۲۵ و"الأشربه" ۲/۱۶۵.

تشریحِ حدیث

احوال ابن عباسؓ:

انکانام عبداللہ ہے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں[۱] صغار صحابہ میں سے ہیں، ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ۱۰یا۱۳یا۱۵سال کی عمر تھی لیکن فہیم بہت تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعا دی تھی: **اللهم فقِّهْهُ في الدين وعَلِّمه التاويلَ**، اس لئے یہ امت کے مفسر قرآن بنے اور ترجمان القرآن کے نام سے مشہور ہوئے، ان کو ''**حبر العرب**'' اور ''**حبر الأمة**'' بھی کہا جاتا ہے، ''**بسطة في العلم والجسم**'' کے مصداق تھے، علم جتنا وسیع تھا جسم بھی اسی طرح وسیع تھا، لکھا ہے کہ جب بیٹھتے تھے تو دو آدمیوں کی جگہ لے کر بیٹھتے تھے۔

انھوں نے جبرئیل علیہ السلام کو بھی دومرتبہ دیکھا ہے، ان کی مرویات بہت ہیں،[۲] ان میں بعض ایسی ہیں جوانہوں نے خودسنی ہیں اور بہت سی روایات دیگر صحابہؓ سے سنی ہیں جن کا عموماً وہ نام نہیں لیتے تھے، صحابہؓ سب عادل ہیں اس لئے نام لینا ضروری بھی نہیں، ۶۸ھ میں عبداللہ ابن زبیرؓ کے زمانہ میں طائف میں آپ کا انتقال ہوا۔[۳]

قبیلہ عبدالقیس اورخدمت نبوی میں اس کی آمد:

ان وفد عبدالقيس الخ: زمانۂ جاہلیت میں عرب میں دو بھائی تھے ایک ربیعہ اور ایک مضر، یہ دونوں نزار بن معد بن عدنان کے لڑکے تھے، پھر ان دونوں کی اولاد بہت ہوئی اور ہر ایک کا باقاعدہ ایک قبیلہ بن گیا، ان دونوں کی طرف وہ قبیلے منسوب ہوئے، پھر قبیلہ ربیعہ میں ایک شخص ہوا: عبدالقیس، اِس قبیلہ کو

---

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خالو بھی ہوتے ہیں کیونکہ ان کی والدہ لبابہ بنت الحارث ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کی بہن ہیں، مرقاۃ ۱/۱۵۹۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی کل مرویات ۱۶۶۰ ہیں **متفق عليه** ۷۵ **ماانفرد به البخاري** ۱۲۰، اور **ماانفرد به مسلم** ۹ ہیں (**تلقيح فهوم اهل الأثر في عيون التاريخ والسير** ص ۲٦۳، ط—دار ارقم، بیروت)

(۳) **الاصابة** ۳/۲۲۹—۲۳٦، اصابہ میں لکھا ہے "**توفي عبدالله بن عباس بالطائف، فجاء طائر أبيض فدخل بين النعش والسرير، فلما وضع في قبره سمعنا تاليا يتلو "ياايتهاالنفس المطمئنة الآية وهكذا في السير** ۳/۳۵۸، ت **شعيب الارنؤوط، ط مؤسسة الرسالة**"

اس کی طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے، گویا کہ ربیعہ قبیلہ کا جد اعلی وابعد اور عبد القیس جد اقرب ہے، یہ لوگ بحرین (قطیف اور ہجر) میں آباد تھے ان دونوں قبیلوں یعنی ربیعہ ومضر کی باہم دشمنی تھی، زمانہ جاہلیت میں اکثر قبائل عرب کا یہی حال تھا۔ (۱)

"وفد" کہا جاتا ہے اس جماعت کو جو کسی قبیلہ یا بادشاہ کی طرف سے کسی حاکم یا بادشاہ کے پاس کسی مشترک غرض سے جاویں، یہ وافد کی جمع ہے بمعنی آنے والے، وفد عبد القیس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، یہ آنے والے ایک روایت کے مطابق ۱۴ تھے اور ایک روایت میں چالیس کی تعداد آئی ہے لیکن تطبیق یہ ہوگی کہ مجموعی تعداد ۴۰ تھی اور ان میں سے اشراف چودہ تھے۔ (۲)

یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دو مرتبہ آئے ہیں، پہلے ۵ھ یا ۶ھ میں اور دوسری مرتبہ ۹ھ میں، ۹ھ میں عرب کے اکثر قبائل اسلام لا چکے تھے کہ وہ اہل مکہ کے قبول اسلام کا انتظار کررہے تھے، ۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا اہل مکہ مسلمان ہوگئے اسکے بعد عرب کے اکثر قبیلے اسلام میں داخل ہوگئے، پھر ان کے اندر جذبہ پیدا ہوا کہ احکامِ اسلام معلوم کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جائیں، چنانچہ ۹ھ میں مختلف وفود آپ کے پاس آئے، اسی وجہ سے ۹ھ کو "عام الوفود" کہا جاتا ہے اس حدیث میں راجح یہ ہے کہ وفد عبد القیس کی پہلی آمد مراد ہے۔ (۳)

حدیث کا شان ورود اور وفد کے آنے کا مقصد:

مدینہ منورہ میں کسی جگہ ایک واقعہ پیش آیا کہ قبیلہ ربیعہ کے ایک شخص تھے منقذ بن حبان، یہ بحرین سے مدینہ تجارت کے لئے آتے تھے، ایک روز بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تعظیماً، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ ادا پسند آئی، آپ نے پوچھا کہ تم منقذ بن حبان ہو؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ربیعہ قبیلہ کے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں، پھر آپ نے فرمایا کہ: تمہارا سردار منذر الاشج ہے؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں، منقذ نے معلوم کیا کہ: آپ کو یہ تمام باتیں کیسے معلوم ہوئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۶۰۔

(۲) فتح الباری ۱/ ۱۶۴ ط مکتبہ شیخ الھند دیوبند۔

(۳) فتح الباری ۱/ ۱۶۴۔

فرمایا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعوتِ اسلام دی، انہوں نے اسلام قبول کرلیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز سکھائی اوران کے قبیلہ کے نام ایک دعوتی خط بھی دیا، یہ واپس گئے اوراپنے گھر میں چپکے سے نماز پڑھنے لگے، ان کی بیوی جو مُنذر سردار کی بیٹی تھی اس نے اپنے والد سے اس کا تذکرہ کیا، انہوں نے منذرکو بلایا اورصورتِ حال دریافت کی، انھوں نے سارا واقعہ بیان کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط بھی پیش کیا جس سے منذر مسلمان ہوگئے، پھر منذر چونکہ سردار تھے، انہوں نے قبیلہ کے لوگوں کو خط سنایا، چنانچہ ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔

ان کو اسلام کے تفصیلی احکام معلوم نہ تھے، لہٰذا احکام اسلامیہ معلوم کرنے کی غرض سے قبیلہ کی طرف سے ایک وفد تیار ہوا اور یہ وفد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس میں خود منذر بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ مشرق کے اچھے لوگ تمہارے پاس آرہے ہیں ''لمعات'' میں ہے کہ مدینہ منورہ پہنچتے ہی یہ لوگ اپنی سواریوں سے زیارت نبوی کے شوق میں نیچے کود پڑے اور بہت رواں دواں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جذبات کا مشاہدہ فرماتے رہے، اس وفد کے جو سردار تھے یعنی اشج انہوں نے پہلے غسل کیا صاف ستھرے کپڑے پہنے پھر مسجد میں دو رکعت ادا کیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہایت خشوع وخضوع اور سکون ووقار کے ساتھ حاضر ہوئے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی کہ تم میں دو صفتیں ایسی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں، ایک حلم ووقار اور ایک اناءۃ یعنی کام میں جلدی نہ کرنا، ان کے چہرے پر کچھ گڑھے سے تھے جو زخم نما تھے، اس لئے ان کو ''منذر اشج'' کہا جاتا تھا، اُشج بمعنی زخمی چہرے والا، بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لئے باوجود معلوم ہونے کے پوچھا ''من القوم'' یا فرمایا من الوفد؟ یہ شک بعض نے ابن عباس کی طرف منسوب کیا اور بعض نے اس کو منسوب کیا ہے شعبہ راوی کی طرف۔ (۱)

مرحباً بالقوم اوبالوفد: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آمد پر ان کو ان الفاظ سے مبارکباد دی، یہ ظرف ہے جو ظرف زمان بھی ہوسکتا ہے اورظرف مکان بھی ای **أتی القوم مکاناً واسعاً أوزماناً واسعاً** یعنی تم کوٹھہرانے کے لئے جگہ بھی کافی ہے اورملاقات کے لئے وقت بھی خوب ہے، تمہارے آنے سے

(۱) مرقاۃ ۱ / ۱۶۰ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند. فتح الباري ۱ / ۱٦٤ مكتبه شيخ الهند ديوبند، رقم ۵۳.

کوئی تنگی نہیں ہے۔ (۱)

غیر خزایاولا ندامی : ''خزایا'' جمع ہے، خزیان کی بمعنی رسوائی، اورندامی جمع ہے ندمان کی بمعنی شرمندہ، دونوں حال واقع ہیں اور معنی یہ ہیں کہ عرب کے اکثر قبائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہؓ سے دشمنی رکھتے تھے، بہت سے صحابہؓ کو یہ قبائلی لوگ سفر میں شہید کردیتے تھے، پھر بعد میں جب یہ لوگ مسلمان ہوتے تو ان کو پہلے فعل پر ندامت ہوتی، مگر قبیلہ ربیعہ ازخود مسلمان ہوگیا، اس لئے یہ ندامت والی چیز ان کو پیش نہیں آئی، نیز ان سے جہاد نہیں کیا گیا، اس لئے ان کو قتل وقید کی صعوبتیں پیش نہیں آئیں، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر خزایاولاندامی فرمایا۔ (۲)

بعض علماء نے کہا کہ یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے طور پر فرمایا ہے کہ تمہیں کوئی رسوائی وشرمندگی پیش نہ آئے۔

مالانستطیع ان ناتیک الخ : بہرحال جب وہ مانوس ہوگئے تو ان کا حوصلہ کھلا اور آنے کا مقصد بیان کیا، اس کے لئے پہلے تمہید قائم کی کہ ہم آپ کے پاس صرف ''شہر حرام'' میں آسکتے ہیں، کیونکہ درمیان میں قبیلہ مضر ہے جس سے ہماری لڑائی ہے، ربیعہ کے لوگ بحرین کی طرف رہتے تھے، وہاں سے مدینہ آنے کے لئے درمیان میں مضر کا قبیلہ تھا جو اُن کو قدیم عداوت کی بناء پر ستایا کرتے تھے، لیکن اہل عرب اشہر حرم کی تعظیم کرتے تھے اور اس میں قتل وقتال کو ناجائز سمجھتے تھے، اشہر حرم : ذی قعدہ، ذی الحجہ، اور محرم اور رجب کے مہینہ ہیں، اسلام نے ابتداء میں ان کی حرمت کو باقی رکھا پھر اس میں نسخ وارد ہوا (۳) یہاں حدیث میں ''الشھر الحرام'' واحد ہے کیونکہ مضر صرف رجب کی تعظیم کرتے تھے جبکہ دیگر اہلِ عرب چاروں ماہ کی تعظیم کرتے تھے، اسی وجہ سے بہت سی روایات میں رجب کی نسبت مضر کی طرف کی جاتی ہے: رجبُ مُضَر، اس لئے انھوں نے کہا کہ: یارسول اللہ ہم صرف اسی ایک مہینہ میں حاضر ہوسکتے ہیں۔

---

(۱)شرح الطیبی ۱ / ۱۳۸، وفتح الإله ۱ / ۲۹۲۔

(۲)شرح الطیبی ۱ / ۱۳۸–۱۳۹، فتح الإله ۱ / ۲۹۲، والمرقاة ۱ / ۱۶۰.

(۳)فتح الاله ۱ / ۲۹٤.

وفد کی تعلیمِ دین کی درخواست:

فمرنابأمر فصل الخ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیں امرِ فصل کا،''فصل'' مصدر ہے اسم فاعل یامفعول کے معنی میں ہے، پہلی صورت میں معنی ہونگے: بامر فاصل بین الحق والباطل یعنی فیصلہ کن باتیں بیان فرمادیں، یامعنی ہونگے بأمر مفصول یعنی واضح احکامات، جن میں پیچیدگی نہو، کہ ہم پڑھے لکھے نہیں ہیں، تاکہ ہم ان باتوں کو واپس جاکر قبیلہ والوں کو بتاسکیں اور ایسی بنیادی باتیں ہوں جن پر عمل کر کے ہم جنت میں داخل ہوجائیں۔

نیز انہوں نے اپنے معاشرہ سے متعلق ایک سوال کیا کہ شراب کے جو برتن مشہور تھے''حنتم، دباء وغیرہ''ان میں نبیذ بنانا جائز ہے یانہیں؟''سألوه عن الأشربة'' سے ظروف اشربہ مراد ہیں، جس کا قرینہ یہ ہے کہ راوی حدیث حضرت ابن عباس سے نبیذ بنانے کے متعلق سوال کیا گیا تھا، اس کے جواب میں انہوں یہ حدیث سنائی تھی، جس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث میں وفد عبدالقیس کے سوال کا مقصد ان ظروف میں نبیذ بنانے کے بارے میں معلوم کرنا تھا نہ کہ نفس شراب کے بارے میں، گویا عبارت یوں ہے: ''وسألوه عن حكم ظروف الأشربة''(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا، اور چار قسم کے برتنوں کو استعمال کرنے کی بالخصوص ان میں نبیذ بنانے کی ممانعت فرمائی۔

چار باتوں کا حکم:

امرهم بالايمان بالله وحده: اولاً اجمالی طور پر بتایا تاکہ یادرکھنے میں سہولت ہو، پھر تفصیل فرمائی، سب سے پہلے ایمان باللہ وحدہ کا حکم دیا، اور ان سے معلوم بھی کیا کہ ایمان باللہ وحدہ جانتے ہو کیا ہے؟ ان لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، وحدانیت کی اور رسالت کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا اور روزہ رکھنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجمالی طور پر ان کو ارکانِ اسلام سے آگاہ کردیا، تفصیل بیان نہیں فرمائی، اس لئے کہ اعمال کی تفصیلی کیفیت خود حضور اور صحابہ کے عمل کو دیکھ کر ہی معلوم ہوسکتی تھی، اس کو لفظوں میں سمجھانا مشکل ہے، اس کے بعد مال غنیمت میں سے خمس ادا کرنے کا بھی حکم دیا۔

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱٦۱.

ایک سوال اور جواب:

سوال ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا بقول راوی لیکن تفصیل میں پانچ باتیں مذکور ہیں یعنی (۱) شہادتین، (۲) اقامت صلوۃ، (۳) ایتاء زکوۃ، (۴) صوم رمضان اور (۵) اداء خمس، تو اجمال اور تفصیل میں فرق ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) قاضی بیضاوی نے فرمایا ہے کہ یہ پانچوں باتیں ایمان باللہ کی شرح ہیں یعنی یہ سب مل کر ایک ہی بات ہوئی، باقی تین باتیں یا تو راوی بھول گیا یا اس نے اختصاراً چھوڑ دیا۔(۱)

مگر یہ جواب سیاق حدیث کے لحاظ سے درست معلوم نہیں ہوتا اس لئے کہ راوی ''اربع'' کی تصریح کر رہا ہے اس تصریح کے بعد پھر چاروں کا ذکر نہ کرنا یا بھول جانا مستبعد ہے۔

(۲) اصل مقصود تو اخیر کے چار احکام بتانا تھا ایمان باللہ کا حکم بطور تبرک وتمہید ہے کیونکہ وہ لوگ مسلمان تھے ان کو ایمان لانے کا حکم دینا ضروری نہ تھا۔(۲)

(۳) ابن بطال رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چار باتوں کا حکم فرمایا تھا وہ شہادتین، اقامت صلوۃ، ایتاء زکوۃ اور صوم رمضان ہیں پھر ان کے حال کے مناسب بطور زیادتِ افادہ ایک مزید بات خمس والی بتائی گئی، جیسے ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ ہم جنگل میں اونٹ چرانے جاتے ہیں اور چھاگل میں پینے کے لئے پانی لیجاتے ہیں، پس اگر آہستہ سے خروج ریح ہوجائے تو کیا وضو کئے بغیر نماز پڑھ سکتے ہیں؟ کیونکہ پانی تھوڑا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إذافَسَاأحدُکم فلیتوَضّأو لاتأتوا النساءَ فی أدبارِهن:(۳) جب تم میں سے کوئی گوز مارے تو چاہئے کہ وضو کرے اور تم عورتوں سے پچھلی راہ میں صحبت مت کرو، یہ آخری بات ان صاحب نے نہیں پوچھی تھی، یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بتائی، کیونکہ الشیئ بالشی یذکر بات سے بات نکلتی ہے، اسی طرح یہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار باتوں کا وعدہ فرمایا تھا، اولاً وہ چار باتیں بتائیں پھر خیال آیا کہ ان کی مضر قبیلہ کے ساتھ جنگیں ہوتی رہتی ہیں یہ لوگ اب مسلمان ہوگئے اب آئندہ ان کی جنگ اسلام وکفر کے

(۱) تحفة الأبرار ۱ / ۵۱.

(۲) شرح الطیبی ۱ / ۱۴۱، والمرقاة ۱ / ۱۶۳.

(۳) رواه الترمذی وابوداوٗد، بحواله مشکوة ص ۴۰.

لحاظ سے ہوگی اس میں جو مال حاصل ہوگا اس کی حیثیت مالِ غنیمت کی ہوگی اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مزید یہ بھی بتایا کہ تمہیں جو مال غنیمت حاصل ہواسکا پانچواں حصہ مرکزی حکومت کو بھیجو۔ (۱)

ابن بطال کی ہی رائے راجح ہے، کیونکہ ان کو ایمان باللہ کا باقاعدہ حکم دیا ہے، پھر وہ تمہید کیسے ہوسکتی ہے؟ رہا یہ امر کہ جب وہ مسلمان تھے تو ان کو ایمان باللہ کا حکم کیوں دیا؟ جواب یہ ہے کہ ایمان کا حکم ان لوگوں کو پیش نظر رکھ کر دیا ہے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، اس وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ ہمیں جامع بات بتائیں تاکہ ہم خود بھی اس پر عمل کریں اور قبیلہ کے جو لوگ وطن میں ہیں ان کو بھی اس کی دعوت دیں، قبیلہ کے جو لوگ وطن میں تھے وہ سب مسلمان نہ تھے، بعض ان میں سے کافر تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ملحوظ رکھ کر پہلا حکم ایمان باللہ کا دیا یعنی جو لوگ ابھی مسلمان نہیں ہوئے ان کو تبلیغ اس طرح کی جائے کہ پہلے ان سے شہادتین کا اقرار کرالیا جائے اس کے بعد نماز روزہ، زکوۃ اور اداء خمس کا حکم دیا جائے، تم خود بھی اور وہ بھی اس پر عمل پیرا ہوں۔

چار برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت:

ونهاهم عن اربع: چونکہ وفد نے شراب کے برتنوں کے بارے میں خاص طور سے پوچھا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو چار برتنوں سے منع فرمایا جو شراب کے خاص برتن تھے، وہ چار برتن یہ ہیں:
(۱) **حنتم:** یہ حنتمۃٌ کی جمع ہے اس کے معنی ہیں: روغنی گھڑا (گھڑے پر روغن کردیا جائے) (۲) **الدباء:** سوکھا کدّو، جو برتن کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اردو میں اس کو "تونبی" کہتے ہیں، یہ ایک قسم کا تلخ کدو ہوتا ہے جس کا چھلکا بہت موٹا ہوتا ہے اس کا گودا نکال لیا جاتا ہے پھر وہ برتن کا کام دیتا ہے، (۳) **النقير:** بمعنی منقور، نقر ینقر کے معنی ہیں: کریدنا، کھودنا، لوگ درخت کے تنے کرید کر برتن بناتے تھے، پھر اس میں نبیذ بناتے تھے، (۴) **المزفت:** تارکول پھیرا ہوا گھڑا۔ (۲)

وجہ ممانعت اور اس میں اختلافِ ائمہ:

ان چار برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی علت کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے، امام مالکؒ اور امام احمدؒ

(۱) شرح ابن بطال ۱ی/۱۱۹، ط: مكتبة الرشد، الرياض.
(۲) از تحفة القاری ۱/۳۰۰.

کے نزدیک علت ہے احتمال تخمر یعنی ان برتنوں میں مسامات نہیں تھے جب گھڑے پر تارکول پھیر دیا جاتا ہے یا رنگ دیا جاتا ہے تو اس کے مسامات بند ہوجاتے ہیں اور تونبی اور لکڑی کے برتن میں مسامات ہوتے ہی نہیں، اس لئے ان میں جلدی گرمی پیدا ہوجاتی ہے اور چیز جلدی سڑ جاتی ہے، اس میں نشہ پیدا ہوجاتا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ نشہ ہوگیا ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان برتنوں میں نبیذ بنانے سے منع فرمایا، یہ علت ابھی بھی پائی جاتی ہے اِس لئے ممانعت بھی باقی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے یہاں تذکرِ خمر علت ہے کہ اگر شراب کے برتن گھر میں رہیں گے تو جب بھی ان پر نظر پڑے گی شراب یاد آئے گی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے برتن استعمال کرنے کی ممانعت فرمادی، پھر جب طبیعتیں شراب سے ہٹ گئیں اور ان برتنوں سے شراب کی طرف لوگوں کا دھیان جانا بند ہوگیا تو وہ علت باقی نہیں رہی، پس ممانعت بھی ختم ہوگئی، اس کی دلیل مسلم شریف کی ایک حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے: **نَهَيتُكم عن النبيذِ إلافي سَقاءٍ، فاشرِبُوا في الأَسقِيةِ كلِها ولاتَشرَبوا مُسكِراً** (۱) یعنی میں نے تمہیں کچھ برتنوں میں نبیذ پینے سے منع کیا تھا، پس اب سب برتنوں میں پی لیا کرو البتہ نشہ آور نبیذ مت پیا کرو۔

الحاصل امام مالک اور امام احمد کے نزدیک ان ظروف میں نبیذ بنانے کی ممانعت ابھی بھی باقی ہے اور امام ابوحنیفہ وامام شافعی کے نزدیک منسوخ ہوچکی ہے اور اب ان میں نبیذ بنائی جاسکتی ہے۔

شراب کی خالی بوتلوں کا حکم:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شراب کے برتن کو اگر پاک وصاف کرلیا جائے تو دوسری چیزوں میں اس کا استعمال درست ہے پس شراب کی خالی بوتلوں کو پاک کرکے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وقال احفظوهن واخبروهن من ورائكم: پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ان احکامات کو یاد رکھو اور غائبین کو بھی اس سے باخبر کرو، گویا کہ عمل اور دعوت کو ان کے ذمہ میں لازم کردیا۔

۱۸/۱۷ وعَنْ عُبادَةَ بنِ الصَّامِتِ رضي الله عنه قال: قالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وَحَوْلَهُ عِصابةٌ منْ أصحابه: "بَايِعُوْنِي علىٰ أَن لاتُشرِكُوا باللّٰهِ شَيئاً،

(۱) مسلم شریف ۲/ ۱٦٦.

وَلاتَسْرِقُوْا، وَلاتَزْنُوْا، ولاتَقْتُلُوْا أَوْلادَكُمْ، وَلاتَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهُ بينَ أَيْدِيكُمْ وأَرْجلِكُمْ، وَلاتَعْصُوْا فِي مَعْرُوْفٍ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، ومَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئاً فَعُوْقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا، فَهُوَ كَفَارَةٌ لَهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئاً، ثم سَتَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ، فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ، وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ، فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ''(۱) (متفق علیہ)

ترجمہ :-حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دراں حالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد حضرات صحابہؓ کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی کہ: مجھ سے بیعت کرو اس بات پر کہ تم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروگے، چوری نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، اپنے بچوں کو (فقر کے ڈر سے) قتل نہیں کروگے، کسی پر بہتان نہیں لگاؤگے، جس کو تمہارے ہاتھوں اور پیروں نے گھڑا ہو، اور صحیح بات میں نافرمانی نہیں کروگے، پس تم میں سے جو شخص اس عہد واقرار کو پورا کرے گا تو اس کا اجر خدا کے ذمہ ہے اور جو شخص (سوائے شرک کے) ان میں سے کسی گناہ میں مبتلا ہوجائے اور پھر دنیا میں اسے اس گناہ کی سزا بھی مل جائے (حدوغیرہ جاری ہوجائے) تو یہ سزا اس کے گناہ کے لئے کفارہ ہوجائے گی، اور اگر اللہ سبحانہ وتعالی نے ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرنے والے کی ستر پوشی فرمائی (دنیا میں سزا نہ ملی) تو پھر یہ اللہ کے حوالہ ہوگا، اگر چاہیں گے تو اس کو معاف فرمادیں گے اور اگر چاہیں گے تو اس کو عذاب دیں گے (راوی کہتے ہیں کہ) ہم نے ان سب باتوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال عبادۃ بن صامت:

جلیل القدر انصاری صحابی ہیں، بیعت عقبہ اولی وثانیہ میں شریک تھے، اوران بارہ نقباء (نگرانوں)

(۱) أخرجه البخاری فی احدی عشرة مواضع: "الإيمان" ۱/۷ برقم ۱۸ "والمناقب" ۱/۵۵۰ برقم ۳۷۵٤، و ۳۷۵۵، و"المغازی" ۲/۵۷۰ برقم ۳۸۵۵، و"التفسير" ۲/۷۲٦ برقم ٤۷۰۵ و"الحدود" ۲/۱۰۰۳ برقم ٦۵۲٦، و"فيه أيضاً" ۲/۱۰۰٤ برقم ٦۵٤۳، و"الديات" ۲/۱۰۱۵ برقم ٦٦۰۸، و"الأحكام" ۲/۱۰٦۹ برقم ٦۹۱۱ و"فيه أيضاً" ۲/۱۰۷۱، برقم ٦۹۱۱، و"التوحيد" ۲/۱۱۲ برقم ۷۱٦۸. ومسلم فی "الحدود" ۲/۷۳.

میں شامل ہیں جوحضور نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر اہلِ مدینہ کے لئے مقرر فرمائے تھے، قدیم الاسلام ہیں، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت فرمانے سے قبل اسلام لائے، ابوالولید کنیت ہے، تفقہ فی الدین کا مرتبہ حاصل تھا، دیگر صحابہ بھی اس کا اعتراف کرتے تھے، ۳۴ھ میں فلسطین میں انتقال ہوا ہے۔ (۱)

شانِ ورود حدیث:

ہجرت سے قبل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلِ مدینہ سے کچھ خفیہ ملاقاتیں ہوئیں، پہلی ملاقات ۱۱ر نبوی میں حج کے موقعہ پر ہوئی، یہ چھ افراد تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی دعوت پیش کی، انہوں نے مدینہ میں یہود کی زبانی کچھ سن رکھا تھا، اس لئے فوراً اسلام قبول کرلیا اور مدینہ پہنچ کر آپ کا تعارف کرایا، جس سے پورے مدینہ میں آپ کی شہرت پھیل گئی، دوسری ملاقات اس سے آئندہ سال یعنی ۱۲ر نبوی میں حج ہی کے موقعہ پر ہوئی، اس مرتبہ ۱۲ر لوگ مدینہ سے آئے، جن میں سے کچھ وہی تھے جو سال گزشتہ آئے تھے اور کچھ نئے تھے جن میں حضرت عبادۃ بن الصامت بھی تھے، جو اس روایت کے راوی ہیں، یہ ملاقات منی میں ایک گھاٹی میں ہوئی، حضور نے ان کو بیعت بھی فرمایا جن میں آپ نے ان سے چند باتوں کا عہدو پیان لیا جو یہاں مذکور ہیں، اس روایت میں حضرت عبادۃ بن الصامتؓ نے اسی واقعۂ بیعت اور امور بیعت کا تذکرہ فرمایا ہے، یہ ملاقات و بیعت کتب سیرت میں ''بیعت عَقَبہ اولیٰ'' کے نام سے معروف ہے۔

۱۳ نبوی میں حج کے موقعہ پر پھر تیسری ملاقات ہوئی، اس مرتبہ مدینہ سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۷۵ر تھی جن میں دو عورتیں بھی تھیں، یہ ملاقات بھی منی کی اسی گھاٹی میں ہوئی جہاں پچھلے سال ملاقات ہوئی تھی، اس مرتبہ قبولیت اسلام اور بیعت کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بارے میں بھی گفتگو اور مشاورت ہوئی اور بالآخر ہجرت کی بات طے پاگئی، ہجرت سے قبل مدینہ میں اسلامی امور کی انجام دہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی راہ ہموار کرنے کے لئے آپ نے بارہ نقیب (نگراں) بھی مقرر فرمائے، جن میں ایک عبادہ بن الصامت بھی تھے، یہ ''بیعت عقبہ ثانیہ'' کہلاتی ہے۔
بعض سیرت نگاروں نے پہلی ملاقات کے موقعہ پر بھی بیعت کا تذکرہ کیا ہے، اس لحاظ سے کل تین

(۱) الاصابہ ۳/ ۵۰۵.

بیعتیں ہوجائیں گی، مگر معروف یہی ہے کہ صرف دوسری اور تیسری ملاقات پر بیعت ہوئی، پہلی ملاقات میں صرف قبول اسلام ہوا تھا، بیعت نہیں ہوئی تھی۔ (۱)

ایمان اور اعمالِ ایمان پر بیعت:

اس حدیث میں حضرت عبادہؓ بیعت عقبہ اولی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ منی کی گھاٹی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد صحابہ کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ چند باتوں پر مجھ سے بیعت کرو اور بیعت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ بیعت کے بعد جو شخص اس عہدو پیمان کا لحاظ کرے گا تو اللہ اس کو اجروثواب سے نوازیں گے اور جو شخص عہدو پیمان کا خیال نہیں کرے گا اور کسی گناہ کا ارتکاب کرے گا اور دنیا میں امیر المؤمنین کو اس گناہ کا پتہ چل گیا اور اس پر ثبوت قائم ہوجانے کی وجہ سے حد جاری کردی گئی تو دنیا کی یہ سزا اس کے لئے کفارہ ہوجائے گی اور اگر دنیا میں معلوم نہ ہوا اور اس پر حد جاری نہ ہوئی تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے چاہے اس کو معاف کرے یا سزا دے۔

عصابة :بمعنی بڑی جماعت، دس سے لیکر چالیس افراد تک کی جماعت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، یہ **عصب** سے ہے بمعنی مضبوط وقوی کرنا، ایسی جماعت میں بعض بعض کی قوت کا سبب بنتا ہے، اس لئے اتنی بڑی جماعت کو''عصابة'' کہتے ہیں۔ (۲)

مفہوم بیعت:

بایعونی علی ان لاتشر کوا الخ :''بایعونی'' باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے اس کا مصدر مبایعت ہے اور مجرد میں **بیعة** مصدر ہے، معنی ہیں ہاتھ پر ہاتھ مارنا، عقد بیع بھی اسی سے ہے، اس لئے کہ اہل عرب جب کسی چیز کی خرید وفروخت کرتے تھے تو متعاقدین میں سے ہر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا، بیعت میں بھی یہی ہوتا ہے کہ عہد کرنے والا اپنا ہاتھ اس شخص کے ہاتھ میں دیتا ہے جس سے عہد کر رہا ہے اور اس سے معاہدہ کی مضبوطی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ (۳)

---

(۱) سیرت النبی شبلی نعمانی ۱/۱۵۷.

(۲) المرقاة ۱/۱٦٤.

(۳) شرح الطیبی ۱/۱٤۲.

اقسامِ بیعت:

اسلام میں بیعت چار قسم کی ہوتی ہے (۱)بیعت اسلام (۲)بیعت خلافت (۳)بیعت علی الجہاد (۴)بیعت طریقت۔

بیعت اسلام یہ ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام لائے، جیسے صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

بیعت خلافت یہ ہے کہ انتظامی اور سیاسی امور میں اطاعت وفرمانبرداری کی بیعت کرنا، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگوں نے بیعت کی، اسی طرح حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی، بعد میں خلفاء وامراء میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

بیعت علی الجہاد یہ ہے کہ امیر کے ہاتھ پر یہ عہد کیا جائے کہ ہم تمہارے ساتھ مل کر کفار سے جہاد کریں گے لڑائی کے وقت پشت نہیں پھیریں گے، چاہے جان چلی جائے، جیسے صحابہ نے صلح حدیبیہ کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔

بیعت طریقت یہ ہے کہ کسی متبع سنت صاحبِ نسبت بزرگ کے ہاتھ پر اپنے گناہوں سے توبہ اور احکامِ شریعت کا عہد کیا جائے، اس کو ''بیعت سلوک'' بھی کہا جاتا ہے۔

بیعت سلوک کے بارے میں مختلف نظریات:

بیعت سلوک کے تعلق سے لوگوں میں تین نظریے پائے جاتے ہیں:(۱)غیر مقلدین سلفیوں اور دیگر بعض فرقوں کا خیال ہے کہ بیعت سلوک بے اصل ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں،(۲)بریلوی کہتے ہیں کہ آخرت میں نجات کے لئے بیعت ضروری ہے، جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے، (۳) تیسرا نظریہ علماء دیوبند کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ بیعت سلوک کا ثبوت قرآن وحدیث سے ہے، نجات اخروی کے لئے بیعت سلوک ضروری نہیں، نجات کا مدار ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے، البتہ بیعت کے دو بڑے فائدے ہیں:

(۱)عبادت کا اہتمام بالخصوص نفل اعمال کی زیادتی اور اس کے ذریعہ جنت میں بلند درجات حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، نفل اعمال کا اہتمام آدمی خود بھی کرسکتا ہے لیکن تجربہ یہ ہے کہ از خود مکمل کامیابی

نہیں ملتی، اگر خود کو کسی کے سپرد کر دے تو یہ مقصد آسانی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(۲) اخلاقِ رذیلہ سے انخلاء اور اخلاقِ حسنہ کے ساتھ مزین ہونا جسے کتاب وسنت میں تزکیہ سے تعبیر کیا گیا، یہ مقصد بھی بیعت سلوک کے ذریعہ بآسانی حاصل ہوتا ہے۔

حدیث مذکور میں اسی ''بیعت سلوک'' کا تذکرہ ہے کیونکہ اس میں صحابہ سے بیعت لی گئی، یہ کافر نہیں تھے، لہٰذا یہ نہ بیعت اسلام ہے نہ بیعت جہاد اور نہ بیعتِ خلافت، بلکہ بیعت طریقت کے اعمال کا تذکرہ ہے، قرآن کریم میں سورۂ ممتحنہ کی آیت ''یاایھاالنبی اذا جائک المؤمنات الخ'' میں بھی یہی بیعت مذکور ہے، ان اعمال کی تفصیل اور اس بیعت کی دفعات یہ ہیں:

(۱) ولاتسرقوا: چوری مت کرنا، اس لئے کہ اسلام میں مال بھی جان ہی کی طرح محترم ہے، ''سرقہ'' کہتے ہیں: أخذ مال الغير خفية کو، اس کے مباحث آگے آئیں گے۔

(۲) ولاتزنوا: زنا مت کرنا کیونکہ اسلام عزتوں کا محافظ ہے۔

(۳) ولاتقتلوا اولادکم: کسی کو ناحق قتل نہیں کرنا، بالخصوص اپنی اولاد کو، اہل عرب زمانۂ جاہلیت میں اپنی اولاد کو فقر کے خوف سے قتل کرتے تھے اور بیٹیوں کو عار کے خوف سے قتل کر دیا کرتے تھے، جس میں قتل نفس، قطع رحمی اور فساد عقیدہ متعدد مفاسد پائے جاتے ہیں، ویسے تو کسی کے بھی قتل کی اجازت نہیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کی تخصیص اس لئے کی کہ اہل عرب کے یہاں یہ جرم عام تھا۔

قتل اولاد کی مختلف صورتیں:

شراح نے فرمایا ہے کہ قتل اولاد میں ضمناً وہ تمام صورتیں داخل ہیں جس میں اضاعتِ ماء ہو، اور اضاعت ماء کی تین صورتیں یا تین درجے ہیں:

(۱) منع حمل، یعنی ایسی کوئی تدبیر کرنا، جس سے منی رحم میں نہ پہنچے، قدیم زمانہ سے اس کی جو صورت چلی آتی ہے، وہ ''عزل'' ہے، یعنی رحم سے باہر منی خارج کر دینا، حدیث میں بھی اس کو ''واْدِ خفی'' کہا گیا ہے، اس لئے یہ صورت مکروہ وناپسندیدہ ہے گو جائز ہے۔

(۲) اسقاط حمل، یعنی حمل قرار پا جانے کے بعد اس کو گرا دینا، اس کا حکم یہ ہے کہ حمل چار ماہ یا اس سے زیادہ کا ہو چکا ہو تو اس کو ساقط کرنا مطلقا ناجائز ہے، گو کوئی عذر ہو، حتی کہ عورت کی جان کو خطرہ ہو تب

بھی جائز نہیں، اس لئے کہ عورت کی جان کو تو صرف خطرہ ہے اوراسقاط کی صورت میں بچہ یقینی طور پر مرجائے گا، اوراگرحمل کو ابھی چارماہ نہیں ہوئے تو اگرکوئی عذرہو تو اس کے اسقاط کی گنجائش ہے، بلاعذر گنجائش نہیں۔

(۳) قطع نسل، یعنی ایسی کوئی تدبیر کرنا جس سے آئندہ کبھی اولاد پیدا نہ ہو مثلاً نسبندی یا بچہ دانی نکلوادینا، یہ بالکل ناجائز اورحرام ہے۔(۱)

بہتان وغیبت کا مفہوم وفرق:

(۴) **ولاتاتوا ببهتان الخ**: کسی پر بہتان نہ باندھو، بہتان کہتے ہیں: "**الكذب الذى يَبْهَت السامع**" ایسا جھوٹ جو سننے والے کو حیرت میں ڈالدے، پس کسی کی طرف ایسی برائی کی نسبت کرنا جوواقعۃً اس میں موجود نہ ہو "بہتان" ہے، اورکسی کے پس پشت ایسی برائی کرنا جواس میں موجود ہو "غیبت" کہلاتا ہے۔

تفترونه بين ايديكم: (ہاتھ وپیروں کے درمیان گھڑنا) اصلاً یہ عورت کی صفت ہے، بعض عورتیں جن کو بچہ نہیں ہوتا وہ کسی اورشخص کا بچہ چراکر کہتی ہیں کہ یہ میرا بچہ ہے، اوربچہ ہاتھ وپیروں کے درمیان یعنی پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اس لئے دوسرے کے بچے کو اپنا قرار دینے کو "**بهتان مفترىٰ بين ايدى وارجل**" سے تعبیر کرتے ہیں، یہاں یہ لفظ بولا گیا ہے مردوں کے لئے، لہٰذا ایدی واَرجل سے مراد ہے: انفس ہے ای **لاتاتوا ببهتان تفترونه من عند أنفسكم** یعنی اپنے آپ گھڑ کر کوئی بات کسی کی طرف منسوب نہ کرو، چونکہ آدمی کے اکثر افعال ہاتھ وپیر سے ہی صادر ہوتے ہیں اس لئے "**ایدی وارجل**" بولکر "**انفس**" یعنی ذات مراد لی گئی ہے۔(۲)

(۵) **ولاتعصوا الخ** : "معروف" ایسی بات جس کو شریعت نے پسند کیا ہو، مطلب یہ ہے کہ کسی بھی شرعی حکم کی تم نافرمانی نہ کرو، خواہ اس معروف کے خلاف کرنے کا حکم کوئی بھی دے، استاذ، شیخ، یا حاکمِ وقت کسی کی بھی خلاف معروف میں اطاعت جائز نہیں، **لاطاعةَ لمخلوقٍ فى معصيةِ الخالقِ**. (۳)

ان امور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی اورفرمایا اس کے بعد دوطرح کے لوگ ہوں گے،

---

(۱) جواهر الفقه ۷ / ۸۰.

(۲) شرح الطيبى ۱ / ۱۴۳، وفتح الاله ۱ / ۲۹۸.

(۳) فتح الاله ۱ / ۲۹۹.

بعض تواس عہد کالحاظ رکھیں گے اوران جرائم سے بچیں گے ان کا اجراللہ پر ہوگا ''علی ''لزوم کے لئے ہے لیکن یہ لزوم بطور تفضّل واحسان اورایفاء وعدہ کے لحاظ سے ہے ورنہ اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں، اوربعض وہ ہوں گے جواس عہد کا لحاظ نہیں کریں گے، پس ان کا یہ جرم اگرثابت ہوگیااور دنیامیں اس کی حدجاری ہوگئ تو وہ حد کفارہ ہوجائے گی، اوراگر دنیامیں اللہ نے پردہ پوشی کرلی تواب اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا،ان شاء عفا عنه وان شاء عذبه۔

حدود رافعِ اثم ہیں یانہیں؟

فهو كفارة له الخ : ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف ہے کہ حدود رافعِ اثم ہیں یانہیں؟یعنی حدود کے اجراء سے گناہ ختم ہوجاتا ہے یانہیں؟ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ حدود رافع اثم ہیں، اوراحناف فرماتے ہیں کہ حدود رافع اثم نہیں، بلکہ محض زجروتوبیخ کے لئے ہیں،عنداللہ گناہ معاف ہونے کے لئے توبہ شرط ہے۔

جمہورعلماء کی دلیل یہی حدیث ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **فهو كفارة له**، امام صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں ایک قید ملحوظ ہے: **ان تاب** اور یہ قید خودقرآن کریم سے ثابت ہے،ارشاد باری ہے: **''وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصِنٰتُ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَلاتَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا الخ''** یعنی جولوگ پاک دامن عورتوں پرزنا کی تہمت لگائیں اورپھراس پرچارگواہ نہ پیش کرسکیں تو ان کے اسی کوڑے لگائیں جائیں اورکبھی ان کی گواہی قبول نہ کی جائے اور یہ لوگ فاسق ہیں سوائے ان کے جوتوبہ کرلیں۔اس آیت میں حدقذف جاری ہونے کے بعدبھی ان کو فاسق کہا گیاہے اورفسق کاحکم ختم ہونے کے لئے توبہ کوضروری قراردیاہے، معلوم ہوا کہ گناہ معاف ہونے کے لئے توبہ ضروری ہے۔

اسی طرح قطاع طریق کی سزابیان فرمائی گئی **''انما جزاءُ الذين يُحاربون اللهَ ورسولَه الخ''** اس آیت میں اجراء حد میں چارباتوں کا اختیاردیا گیاہے یعنی قطاع طریق پرچارقسم کی سزائیں جاری کی جاسکتی ہیں، اگلی آیت میں سزا کا مقصد بیان فرمایا: **''اولئک لهم خزیٌ فی الدنيا ولهم فی الآخرةِ عذابٌ عظيمٌ''** حدوداگرکفارہ ہوجاتی ہیں تو پھرآخرت میں عذاب عظیم کیوں قراردیا گیا ہے؟لہذا صرف

اجراء حدود سے گناہ معاف نہیں ہوتا، اس کے لئے مستقلا توبہ ضروری ہے۔

یہاں حدیث میں توبہ کی قید اس لئے مذکور نہیں ہے کہ آدمی پر جب حد جاری ہوتی ہے تو اکثر وبیشتر وہ توبہ کر ہی لیتا ہے اور عموماً توبہ کا تحقق ہوجاتا ہے یعنی حد کے ساتھ فعلی توبہ شامل ہوہی جاتی ہے، اس اعتبار سے حدود کو گناہوں کے لئے کفارہ کہا گیا ہے، ورنہ تمام کبائر کے لئے جیسا کہ ضابطہ ہے توبہ ضروری ہے۔

خوارج ومرجئہ کی تردید:

إن شاء عفاعنه : کہ اگر اللہ چاہے تو اس کو معاف کردے، اس میں معتزلہ وخوارج کی تردید ہے جو کہتے ہیں کہ مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج ہے، اگر ایسا ہوتا تو اس کی معافی نہ ہوتی۔

وإن شاء عاقبه: کہ چاہے ان کو عذاب دے، اس میں تردید ہے مرجئہ کی، جو کہتے ہیں کہ گناہوں سے کچھ نقصان نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو ان کو عذاب دینے کی بات نہ کہی جاتی۔

۱۹ / ۱۸ وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ أَضْحٰى أَوْفِطْرٍ إِلَى الْمُصَلّٰى، فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ، فَقَالَ:" يَامَعْشَرَ النِّسَاءِ! تَصَدَّقْنَ ، فِإِنِّيْ أُرِيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ"فَقُلْنَ: وَبِمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: تُكْثِرْنَ اللَّعَنَ، وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ، مَارَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ، قُلْنَ: وَمَانُقْصَانُ دِيْنِنَا وَعَقْلِنَا؟ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: "أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ؟" قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ "فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا ،قَالَ: أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟"قُلْنَ: بَلٰى، قَالَ: "فَذٰلِكَ مِنْ نُقْصَانِ دِيْنِهَا" (متفق علیہ[1])

ترجمہ : حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) عیدالاضحیٰ یا عید الفطر کے موقع پر عیدگاہ کی طرف نکلے، آپ کا گزر عورتوں کے پاس سے ہوا، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: اے عورتوں کی جماعت! تم صدقہ وخیرات کرو، کیونکہ

(۱) أخرجه البخاري في أربعة مواضع: "الحيض" ۱ / ٤٤ برقم ۳۰۲ و"الزكاة" ۱ / ۱۹۷ برقم ٤٤۱، و"الصوم" ۱ / ۲٦۱ برقم ۱۹۰۹، و"الشهادات" ۱ / ۳٦۳ برقم ۲٥۸٤. ومسلم في موضعين: "الإيمان" ۱ / ٦۰ و"صلاة العيدين" ۱ / ۲۹۰.

جہنم میں مجھے عورتیں زیادہ دکھائی گئیں، عورتوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیوں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لعن طعن بہت کرتی ہو اور اپنے شوہروں کی نافرمانی اور ناشکری کرتی رہتی ہو، اور میں نے عقل ودین میں کمزور ہونے کے باوجود ہوشیار مرد کو بیوقوف بنادینے میں تم سے زیادہ کسی کو نہیں دیکھا، عورتوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہماری عقل اور ہمارے دین میں کیا کمی ہے؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی آدھی گواہی کے برابر نہیں ہے؟ عورتوں نے عرض کیا: جی ہاں! ایسا ہی ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: یہ عورت کے عقل کے نقص کی وجہ سے ہے، اور کیا ایسا نہیں ہے کہ جس وقت عورت حیض کی حالت میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! ایسا ہی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اس کے دین میں نقصان کی وجہ سے ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال ابوسعید الخدریؓ:

جلیل القدر صحابی ہیں، صغار صحابہ میں سے ہیں، نام سعد بن مالک بن سنان الانصاری الخدری ہے، ''خُدرۃ'' انصار کا ایک قبیلہ تھا، اس کی طرف منسوب ہوکر خدری کہلاتے ہیں، غزوۂ احد میں کم سنی کے باعث شریک نہیں ہوسکے، لیکن اس کے بعد تمام غزوات میں شریک ہوئے، نوعمر صحابہ میں سب سے زیادہ فقیہ شمار ہوتے تھے، نیز حفاظ وفضلائے صحابہ میں سے ہیں اور کثیر الروایۃ ہیں، ۶۴ھ میں وفات ہوئی۔ (۱)

ربط حدیث:

اس حدیث میں ایمان کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اعمال مذکور ہیں، مثبت عمل: صدقہ اور منفی عمل: اکثارِ لعنت اور کفرانِ عشیر ہے، اس لئے اس حدیث کی کتاب الایمان سے مناسبت مثبت اور منفی دونوں لحاظ سے ہے۔

(۱) ان کی کل مرویات: ۱۱۷۰ ہیں، متفق علیہ ۴۳ ہیں، ماانفرد بہ البخاری ۱۶ اور ماانفرد بہ مسلم ۵۲ ہیں، (سیر اعلام النبلاء ۳/ ۱۴۲ ط مؤسسة الرسالة)

عورتوں کی جہنم میں کثرت اوران کوصدقہ کی تلقین:

خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فى اضحى او فطر الخ: حضرت ابوسعید خدریؓ واقعہ بیان کررہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز کے لئے نکلے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ اورعیدالفطر کی نمازعیدگاہ میں پڑھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزرعورتوں کی جماعت کے پاس سے ہوا، اس زمانہ میں عورتیں بھی عیدگاہ جایا کرتی تھیں، لیکن منبر سے دور رہتی تھیں جس کی وجہ سے خطبہ نہیں سن پاتی تھیں، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اور نصیحت کی کہ صدقہ کیا کرو کیوں کہ مجھے جہنم میں عورتیں زیادہ دکھائی گئی ہیں۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت وجہنم کا مشاہدہ کیا ہے، شب معراج میں تو حتمی ہے نیز ایک مرتبہ سورج گہن کی نماز پڑھارہے تھے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جنت وجہنم کی مثالی شکل پیش کی گئی، جس کی تفصیل آگے آئے گی، ممکن ہے کہ اس حدیث میں اسی وقت کا دیکھنا مراد ہو، نیز دیکھنے سے بطور وحی یا بطور مکاشفہ کے مطلع ہونا بھی مراد ہوسکتا ہے۔

نمازعیدگاہ میں پڑھنا سنت ہے:

یہ بھی معلوم ہوا کہ عید کی نمازعیدگاہ میں پڑھنا مسنون ہے اگرچہ عذر کی وجہ سے مسجد میں بھی جائز ہے۔

عورتوں کا لعنت وملامت کرنا:

فقلن وبم یارسول الله؟ عورتوں نے سوال کیا کہ یارسول اللہ ایسا کیوں؟ یعنی جہنم میں ہماری تعداد زیادہ کیوں ہوگی؟ اس کا جواب دیا کہ تم میں دو بڑی خرابیاں ہیں، ایک لعنت ملامت زیادہ کرتی ہو حتی کہ بعض مرتبہ اپنی اولاد کو بھی لعنت کرتی ہو، یہ بڑی خرابی ہے، کیونکہ لعنت کا مطلب ہے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا کرنا، کسی کو کیا حق ہے کہ اللہ کی رحمت سے کسی کو دور کرے، اللہ کی رحمت تو وسیع ہے۔

لعنت کا حکم:

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کی زندگی میں اس کا نام لے کر اس پر لعنت کرنا جائز نہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، اور جو کفر پر مرا ہو یا کسی کا کفر پر مرنا یقینی ہو بایں طور کہ نص سے اس کا علم ہوجائے کہ یہ کفر پر مرے

گا تو اس پر لعنت کرنا درست ہے، جیسے ابولہب اور اس کی بیوی اور ابلیس، اور کسی کو متعین کیے بغیر لعنت کو کسی وصف پر معلق کر کے لعنت کرنا جائز ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، جیسے **لعنة الله علی الکاذبین** وغیرہ۔[۱]

عورتوں کا ناشکری کرنا:

دوسری خرابی جو عورتوں میں ہوتی ہے، وہ شوہر کی نافرمانی ہے، **عشیر** جس کے ساتھ زندگی گزاری جائے، یہاں کفر کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی ناشکری و ناقدری کرنا، حدیث میں ہے کہ ان کی ناشکری کا عالم یہ ہے کہ تم زندگی بھر ان پر احسان کرتے رہو اور اتفاقاً کوئی ناگوار بات پیش آجائے تو کہتی ہیں "**ما رأیت خیرا منک قط**[۲]" کہ مجھے تیری طرف سے کبھی کوئی خیر حاصل نہیں ہوئی، یہ لعن طعن اور ناشکری عورتوں کی گھٹی میں ہے، اس سے پوری حفاظت ناممکن ہے، چنانچہ اس کی تلافی کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو صدقہ کا حکم دیا کہ اس سے گناہ معاف ہوں گے اور اللہ کا غضب دور ہوگا، حدیث میں ہے: **ان الصدقة تطفئ غضب الرب.**[۳] کہ صدقہ اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتا ہے، صدقہ کا یہ حکم واجب اور نفل دونوں قسم کے صدقات کو شامل ہے، نیز عورتوں کو صدقہ کا حکم اس وجہ سے بھی دیا گیا کہ عورتوں میں بخل اور حب دنیا زیادہ ہوتا ہے۔

عورتوں کی ایک خوبی:

ما رأیت من ناقصات عقل و دین الخ : پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں ایک دنیوی خوبی ہے، مگر وہ خوبی بھی اپنے اندر مفسدہ لئے ہوئے ہے کہ تم عقل و دین کے نقص کے باوجود اچھے اچھے مردوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہو، اسی لئے ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے: "**ما ترکتُ بعدی فتنة اضرَّ علی الرجال من النساء**[۴]" کہ میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑا فتنہ نہیں چھوڑا۔

---

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۱٤٦.

(۲) کمافی روایة البخاری ۱/ ۹ (۲۹)

(۳) رواه الترمذی واحمد وابن ماجه، بحواله مشکوة ص ۱٤.

(٤) بخاری شریف ۲/ ۷٦۳ (٥٠٩٦)، مسلم ۲/ ۳٥۲، (۲۷٤٠)

اللُّبُّ: بمعنی خالص عقل، جس میں خواہش نفس کی آمیزش نہ ہو، ''الرجل الحازم '' بمعنی سمجھدار، ہوشیار، محتاط آدمی، عورت اپنے حسن وجمال اوراپنی نزاکت کی وجہ سے مردکو اپنے قبضہ میں کرلیتی ہے، عورتوں میں برائی کا مادہ زیادہ ہے اور مرد اس کی برائی کوجلدی قبول کرتا ہے، لیکن عورت مرد کی خوبی کوجلدی قبول نہیں کرتی۔

ایک سوال وجواب:

یہاں سوال یہ ہے کہ ''مارأیت من ناقصات عقل و دین الخ'' میں ''منکن'' کے بجائے ''احدٰکن'' کیوں فرمایا، جب کہ یہ خصلت تقریباً سب عورتوں میں پائی جاتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جب ایک عورت اتنا کام کرسکتی ہے تو ساری عورتوں کا کیا حال ہوگا خود اندازہ لگالو۔[1]

ومانقصان عقلنا و دیننا: پھرعورتوں نے پوچھا کہ: یارسول اللہ! ہمارے عقل ودین میں کمی کیسے ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی وجہ بتائی کہ عورت کی گواہی مرد کی نصف گواہی کے برابر ہوتی ہے جس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی: ''أن تُضِلَّ اِحْدیھما فتُذَکِّر احدیھما الاخری[2]'' کہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلائے یعنی عورتوں کا حافظہ نسبتاً کمزور ہوتا ہے، اس لئے دوعورتوں کی گواہی ایک مرد کے قائم مقام قراردی گئی، یہ نقصان عقل کی علامت ہے، عورتوں نے اس کا اقرارکیا، اورعورتیں حالت حیض میں نماز وروزہ سے محروم رہتی ہیں، یہ نقصان دین ہے، یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقصان عقل کو نقصان دین پرمقدم فرمایا، اسلئے کہ عورتوں میں نقصانِ عقل فطری اورجبلی امر ہے اس لئے وہ مقدم ہے اورنقصان دین ایک امرحادث ہے، امرحادث مؤخر ہوتا ہے۔[3]

شراح فرماتے ہیں کہ عورتوں کا یہ سوال ''ومانقصان دیننا وعقلنا'' اس سے خودان کا نقصانِ عقل ثابت ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عقل کومقدم کیا تھا اوران عورتوں نے دین کومقدم کیا، کلام

(۱)المرقاۃ ۱/ ۱۶۷–۱۶۸۔

(۲)سورۃ البقرۃ، رقم الایۃ ۲۸۲.

(۳)شرح الطیبی ۱/ ۱۴۶۔

نبوی کی ترتیب کا لحاظ بھی ان سے نہیں ہو پایا۔ (۱)

کچھ اور سوال وجواب:

سوال: اشکال ہوگا کہ بعض عورتیں مردوں سے بھی زیادہ عقلمند ہوتی ہیں اور بعض مرد بیوقوف ہوتے ہیں؟

جواب: یہ حکم جنس کے اوپر ہے کہ عورت کی جنس مرد کی جنس کے مقابلہ میں کم عقل والی ہوتی ہے، اَفرادِ عورت پر حکم لگانا مقصود نہیں ہے، جیسے الرجل خير من المرأة.

سوال: حیض آنا تو غیر اختیاری چیز ہے، اس کی وجہ سے نقصان دین کیوں ہوا؟

جواب: حیض اگرچہ غیر اختیاری چیز ہے اور حیض کے زمانے میں نماز وروزہ کو ترک کرنے سے عورت گنہ گار نہیں ہوگی، لیکن بہرحال ثواب میں کمی ہوگی، پس نقص تو ہے ہی۔ (۲)

۲۰ / ۱۹ وعن أبي هريرةؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ : كَذَّبَنِيْ ابنُ آدَمَ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ، وَشَتَمَنِيْ ولم يَكُنْ لَهٗ ذٰلِكَ؛ فَأَمَّا تَكْذِيبُه إِيَّايَ فَقَوْلُه: لَنْ يُّعِيدَنِيْ كَمَابَدَأَنِي، وَلَيْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهٖ، وأَمَّا شَتْمُهٗ إِيَّايَ: فقولُه: اتَّخَذَاللّٰهُ وَلَداً وأَنَا الأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ وَلَم يَكُنْ لِي كُفُواً أَحَدٌ، وفي روايةِ ابن عباسٍ: وَأَمَّاشَتْمُهٗ إِيَّايَ فَقَوْلُهٗ: لِيْ وَلَدٌ، وَسُبْحَانِيْ أَنْ أَتَّخِذَ صَاحبةً أَوْوَلَداً. (رواہ البخاری (۳))

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ابن آدم مجھے جھٹلاتا ہے، حالانکہ اس کو یہ زیبا نہیں ہے، اور مجھے برا کہتا ہے، حالانکہ یہ اس کو زیبا نہیں ہے، پس اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ کہتا ہے جس طرح اللہ نے مجھے

(۱) المرقاة ۱ / ۱٦٧.

(۲) شرح الطيبي ۱ / ۱٤٦.

(۱) أخرجه البخاري في "بدألخلق" ۱ / ٤٥٣ برقم ۳۰۸۹ و"التفسير" ۲ / ۷٤۳ برقم ٤۷۸٤، وفيه أيضاً ۲ / ۷٤٤ برقم ٤۷۸٥، ورواية ابن عباسؓ: فقد أخرجه البخاري في "التفسير" "باب قوله تعالى: وقالوا اتخذ الله ولداً سبحانه ۲ / ٦٤٤ برقم: ٤۲۹۷"

(اس دنیا میں) پہلی بار پیدا کیا ہے اس طرح وہ (آخرت میں) مجھے دوبارہ ہرگز پیدا نہیں کرسکتا ہے، حالانکہ پہلی مرتبہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے دوسری مرتبہ پیدا کرنے کے بنسبت (یعنی دونوں برابر ہیں) اوراس کا مجھ کو برا کہنا یہ ہے: کہ وہ کہتا ہے اللہ نے بیٹا بنا رکھا ہے، حالانکہ میں تنہا اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ مجھے کسی نے جنا اور نہ کوئی میرا ہمسر ہے، اور ابن عباسؓ کی روایت میں اس طرح ہے اور انسان کا مجھے برا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ کا بیٹا ہے حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ کسی کو بیوی یا بیٹا بناؤں۔ (بخاری)

تشریح حدیث

ربط حدیث:

اس حدیث میں منافی ایمان دواعمال کا بیان ہے، لہٰذا کتاب الایمان سے مناسبت باعتبار ضد کے ہے، اور وہ اعمال یہ ہیں: بنی آدم کا تکذیب الٰہی اور بنی آدم کا شتم الٰہی۔

حدیث قدسی کا مفہوم اوراس کے وحدیثِ نبوی کے درمیان فرق:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: قال الله تعالىٰ الخ: یہ حدیث قدسی ہے۔

حدیث قدسی: وہ حدیث ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "قال الله تعالىٰ" کہہ کر بیان کریں، شراح نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو تین طرح کا کلام سنایا (۱) کلام الٰہی (قرآن کریم) (۲) حدیث قدسی (۳) حدیث نبوی، اور یہ تمام کلام اللہ کی جانب سے ہے، اللہ کا پاک ارشاد ہے "وماينطق عن الهوى الخ"

تینوں کلاموں میں فرق یہ ہے جو کلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور اس کے الفاظ ومعانی على وجه الاعجاز والتحدی اترے اور امت میں تواتر کے ساتھ پھیلے، وہ کلام الٰہی یعنی قرآن کریم ہے، اور حدیث قدسی وہ کلام ہے جس کے الفاظ ومعانی دونوں اللہ کی طرف سے آئے لیکن على وجه الاعجاز والتحدی نہیں، نیز امت میں وہ تواتر کے ساتھ بھی نہیں پھیلے، اور حدیث نبوی کہتے ہیں کہ معانی تو اللہ کی طرف سے ہوں اور ان معانی کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

کیا ہو۔[1]

منافی ایمان دواعمال: (۱) تکذیب الٰہی

کذّبنی ابن آدم الخ :''ابن آدم'' یہ لفظ تحقیر کے لئے ہے کہ نطفہ سے پیدا ہوا اور بات بہت بڑی کرتا ہے، پہلا منافی ایمان عمل تکذیب الٰہی ہے، اللہ کی تکذیب یہ ہے کہ انسان حشر کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا، اور انکارِ حشر اللہ کی تکذیب کو مستلزم ہے، کیونکہ قرآن کی سینکڑوں آیات میں حشر کا اثبات ہے، پس جو شخص حشر کا انکار کرے گا گویا اس نے کلام اللہ کا انکار کیا اور کلام اللہ اللہ کی صفت ہے اور صفت کا انکار موصوف کا انکار ہوتا ہے۔

ولیس اول الخلق باھون :اللہ فرماتا ہے کہ دوبارہ پیدا کرنا پہلے کے مقابلہ میں کچھ بھی مشکل نہیں ہے، کیونکہ پہلے بغیر نمونہ کے پیدا کیا تھا اور بغیر نمونہ کے کوئی چیز پیدا کرنا نمونہ موجود ہونے کے مقابلہ میں نسبۃً مشکل ہوتا ہے، لہٰذا جب اللہ نے پہلی مرتبہ پیدا کر دیا تو دوبارہ پیدا کرنا کیا مشکل ہوگا؟

(۱) اور قرآن کریم اور حدیث قدسی میں چند فرق ہیں:

(۱) قرآن کریم حدیث قدسی سے افضل ہے کیونکہ اس کے نظم والفاظ اللہ کی طرف سے علی وجہ الاعجاز اترے ہیں۔

(۲) قرآن کریم حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے نازل ہوا ہے جبکہ حدیثِ قدسی کبھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے تو کبھی خواب والہام کے ذریعہ بھی آئی ہے۔

(۳) قرآن کریم پورا کا پورا متواتر ہے جبکہ تمام احادیثِ قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔

(۴) قرآن کریم ہمیشہ کے لئے ایک معجزہ ہے جبکہ حدیث قدسی ایسی نہیں ہے۔

(۵) قرآن کریم میں کسی بھی قسم کی غلطی ممکن نہیں ہے جبکہ حدیث قدسی میں امکان ہے کہ کوئی راوی غلط روایت کردے۔

(۶) قرآن کریم کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے حدیث قدسی ایسی نہیں ہے۔

(۷) محدث کا قرآن کریم کا چھونا اور جنبی کا اس کو پڑھنا ممنوع ہے جبکہ حدیث قدسی کے سلسلہ میں یہ ممانعت نہیں ہے۔

(۸) قرآن کریم کی تلاوت پر ثواب کا ملنا ثابت ہے اور حدیث قدسی کے لئے اس طرح کی کوئی فضیلت وارد نہیں ہے۔

(۹) قرآن کریم سورتوں، آیات، احزاب اور پاروں میں تقسیم شدہ ہے جبکہ حدیث قدسی کی یہ صورتحال نہیں ہے۔

(۱۰) حدیث قدسی کو روایت بالمعنی بیان کرنا جائز ہے جبکہ قرآن کریم میں تلاوت بالمعنی جائز نہیں ہے، (الصحیح المسند من الاحادیث القدسیة ص: ٤، الاتحافات السنیة ص: ٥)۔

پھر یہ تعبیر بھی لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہے کہ تمہارے اعتبار سے کسی چیز کو پہلی مرتبہ پیدا کرنا مشکل ہے کہ اس میں نمونہ نہیں ہوتا ہے، ورنہ اللہ کے حق میں اولِ خلق اور اعادۂ خلق دونوں برابر ہیں، کیونکہ وہاں تو صرف کلمۂ ''کن'' پر اثر مرتب ہوتا ہے، لہٰذا جب تمھیں یہ تسلیم ہے کہ پہلی مرتبہ اللہ نے پیدا کیا تھا تو دوبارہ پیدا کرنے میں تمھیں کیا استجاب واستبعاد محسوس ہوتا ہے؟

(۲) شتم الٰہی:

واما شَتْمُهُ إياي الخ: منافی ایمان دوسرا عمل ہے شتم الٰہی کرنا، شتم کے معنی ہیں کسی کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو اس کے لئے موجب عیب وتحقیر ہو، جس کو اردو میں ''گالی'' کہتے ہیں، اللہ کے لئے اولاد کا قائل ہونا جیسا کہ یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں، یہ اللہ کو شتم کرنا اور عیب کی نسبت اللہ کی طرف کرنا ہے، کیونکہ العیاذ باللہ اگر اللہ کی اولاد ہے تو وہ اللہ کی ہم جنس ہوگی یا خلاف جنس، اگر ہم جنس ہے تو تعدد قدماء لازم آئے گا جو عند العقلاء باطل ہے، نیز خود پیدا ہونا قدیم ہونے کے منافی ہے، اور اگر وہ اولاد خلاف جنس ہے تو خلاف جنس اولاد کا ہونا انسانوں میں بھی معیوب اور موجب حقارت ہے، تو اللہ کے حق میں موجب عیب وحقارت کیوں نہیں ہوگا، اس لئے اللہ کے لئے اولاد کا قائل ہونا شتم ہے۔

الأحد: جو ذات وصفات میں یکتا ہو، **الصمد**: وہ ذات جو کسی کی محتاج نہ ہو اور باقی سب لوگ اس کے محتاج ہوں، اگر اللہ کے لئے اولاد مانی جائے تو نعوذ باللہ اللہ کا محتاج ہونا بھی لازم آئے گا، کیونکہ اولاد کی ضرورت احتیاج کی وجہ سے ہوتی ہے۔

حضرت سہارنپوریؒ کا ایک شبہ اور حضرت گنگوہیؒ کا جواب:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: ''**وقالوا اتخذ الله ولداً سبحانه**'' حضرت سہارنپوریؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو اپنا شبہ لکھ کر بھیجا کہ (**اتخذ الله ولداً**) مشرکین کا مقولہ ہے اور سبحانہ ان کی تردید کے لئے اللہ کا قول ہے، تو دونوں کے درمیان وقفِ لازم ہونا چاہئے؟ تا کہ دونوں کے درمیان امتیاز ہو جائے، حضرت گنگوہیؒ نے جواب دیا کہ یہ مشرکین کا ایسا خطرناک قول ہے کہ اس کی تردید بلا وقف لازم

ہے[1] اللہ کا پاک ارشاد ہے: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ وَالارْضِ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالَ هَدًّا، اَنْ دَعَوْلِلرَّحْمٰنِ وَلَداً. [2]یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے ولد ہونے کا دعوی ایسی خطرناک بات ہے کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہوجائے اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں (کچھ بعید نہیں)

وفی روایة ابن عباس الخ: یہ روایت ابو ہریرہؓ اور ابن عباسؓ دو صحابہ سے مروی ہے، ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ ابو ہریرہؓ کی روایت سے کچھ مختلف ہیں، اس لئے مصنف نے ان کو علیحدہ سے ذکر کیا ہے۔

۲۰ / ۲۱ وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: يُؤْذِيْنِي ابنُ آدَمَ: يَسُبُّ الدَّهْرَ، وَأَنَا الدَّهْرُ، بِيَدِي الأَمْرُ، أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ. (متفق علیہ)[3]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے ارشاد فرمایا کہ انسان مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، زمانہ کو برا کہتا ہے، حالانکہ میں زمانہ ہوں، میرے ہاتھ میں امور ہیں، شب وروز کو میں الٹتا پلٹتا ہوں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

یہ بھی حدیث قدسی ہے اور اس میں بھی منافی ایمان ایک عمل کا بیان ہے۔

ابن آدم کا اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچانا:

یؤذینی ابن آدم الخ : اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ ابن آدم مجھے اذیت پہنچاتا ہے، اس طرح کہ جب کوئی نقصان ہوتا ہے یا مرض لاحق ہوتا ہے تو زمانہ پر لعن طعن کرتا ہے، امام خطابیؒ نے لکھا ہے کہ اہل عرب کا مزاج تھا کہ جب بھی کوئی جانی ومالی نقصان ہوتا تو "یاخیبة الدهر" (وائے ناکامی زمانہ) جیسے الفاظ سے زمانہ پر سب وشتم کرتے، اور ایسا کہنے والے دو قسم کے لوگ تھے، بعض وہ جو خدا کے وجود کے قائل

(۱) ملفوظات فقیہ الامت ۱ / ۱۱۳.

(۲) سورة مریم: ۶۰، ۶۱.

(۳) أخرجه البخاری فی "التفسير" ۲ / ۷۱۵ برقم ۴۶۴۰ و"الأدب" ۲ / ۹۱۳ برقم ۵۹۴۰ و"التوحيد" ۲ / ۱۱۱۶ برقم ۷۱۹۱، ومسلم فی "كتاب الألفاظ من الأدب وغيرها" ۲ / ۲۳۷.

نہیں تھے، تمام حوادثات وانقلابات میں زمانہ ہی کو موثر سمجھتے تھے، اس لئے جو بھی نقصان ہوتا تو کہتے: ''ومایھلکنا الا الدھر ''اور بعض وہ تھے کہ جو تمام اموراللہ کے ہی قبضہ وقدرت میں جانتے تھے، مگر آفات وبلایا کی نسبت انہیں اللہ کی طرف کرنا پسند نہیں تھا، اس وجہ سے انہیں زمانہ کی طرف منسوب کر کے زمانہ پر لعن طعن کرتے۔(۱)

اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا زمانہ پر سب وشتم مجھ پر سب وشتم ہے، کیونکہ زمانہ میں ہی ہوں، یعنی زمانہ میں جو کچھ ہورہا ہے وہ میرے ارادہ ومشیت سے ہورہا ہے، رات و دن کی تبدیلی اوران میں رونما ہونے والے انقلابات سب میری جانب سے ہیں، زمانہ تو محض ان کا جائے وقوع اورمحلِ اظہار ہے لہٰذا لوگ اس سے اجتناب کریں۔

زمانہ کو برا بھلا کہنے کا حکم:

اگرکوئی زمانہ کو موثرِ حقیقی سمجھ کر برا بھلا کہے تو یہ کفر ہے اورایسا شخص دہریہ ہے اور اگرکوئی زمانہ کو مؤثر حقیقی سمجھے بغیر ایسا کہے تو یہ بھی ممنوع وناجائز ہے تاہم وہ کافر نہیں ہوگا کہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف برائی منسوب نہیں کی۔

وانا الدھر: اس کی ترکیب میں دواحتمال ہیں: (ا) یہ مبتدا وخبر ہوں، اس صورت میں ''الدھر'' مرفوع ہوگا، اوراصل عبارت ہوگی: انا خالق الدھر، أو مُصرّفه، مضاف کوحذف کرکے مضاف الیہ کواس کے قائم مقام کردیا، (۲) الدھر کوظرف قرار دیں اورمنصوب پڑھیں ای انا أُقَلِّبَ اللیلَ والنھارَ مدةَ الدھر، پہلا احتمال راجح ہے۔

قاضی عیاضؒ نے لکھاہے کہ اس روایت کی بناء پر بعض حضرات نے ''الدہر'' کو اسماء الہی میں شمار کیاہے، مگر محققین نے اس کی تردید کی ہے اور کہاہے کہ ''دہر'' اللہ کا نام نہیں ہے، بلکہ دنیا کی از ابتداء تاانتہاء مدت کا نام ہے۔(۲)

---

(۱)معالم السنن للخطابي ٤/ ١٥٨، عمدة القاری ١٥ /٣٠٨(٦١٨١) .

(۲)عمدة القاری ١٣ /٣٠٦-٣٠٧(٤٨٢٦)وإكمال المعلم٧ /١٨٢(٢٢٤٦)

ایک سوال وجواب:

سوال: ایذاء کہتے ہیں: ''إيصال المكروه إلى الغير ''یعنی کسی کے ساتھ تکلیف دہ اورنا گوار معاملہ کرنے کو،اورجس کو ایذاء پہنچائی جاتی ہے وہ کمزور ومتاثر ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے،اس کے دوجواب ہیں:

(۱) ایذاء کے لئے تأذی لازم نہیں ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ تکلیف پہنچ بھی جاوے، بلکہ مراد یہ ہے کہ بندہ تکلیف پہنچانا چاہتا ہے اور بری کوشش کرتا ہے لیکن وہ تکلیف پہنچتی نہیں ہے، محض مشاکلت صوری کی وجہ سے ''يؤذيني'' استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) ایذاء کے دومعنی ہیں: ابتدائی وانتہائی، ابتدائی معنی وہی ہیں جو مذکور ہوئے اور انتہائی معنی ہیں: غضب وناراضگی، یہاں یہی انتہائی معنی مراد ہیں، کہ بندہ مجھ کوناراض کرتا ہے۔[۱]

۲۱ / ۲۲ وَعَنْ أَبِيْ مُوْسَى الْأَشْعَرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَاأَحَدٌ أَصْبَرَ عَلٰى أَذًى يَسْمَعُهُ مِنَ اللّٰهِ يَدْعُوْنَ لَهُ الوَلَدَ، ثُمَّ يُعَافِيْهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ. (متفق عليه)[۲]

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تکلیف دہ بات پر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صبروتحمل کرنے والا کوئی نہیں، لوگ اس کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ پھربھی ان کو عافیت دیتا ہے اورروزی پہنچاتا ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کی شناعت وقباحت کا اورحق تعالیٰ شانہ کے غایت حلم وصبرکا بیان ہے۔

اللہ کی طرف اولاد کی نسبت اوراللہ کا حلم وصبر:

ماأحد أصبرعلى أذى الخ:اللہ سے زیادہ تکلیف کی بات پرصبرکرنے والا کوئی نہیں،صبر کہتے ہیں:

---

(۱)شرح النووي ۲/۲۳۷(۲۲۴٦) وشرح المشكاة للطيبي ۱/۱۵۳–۱۵٤(۲۲) وفتح الباری ۸/٤۸٤(٤۸۲٦)

(۲)أخرجه البخاري ۲/۱۰۹۷(۷۳۷۸) ومسلم ۲/۳۷٤(۲۸۰٤)

حبس النفس علی ماتکرہ. یعنی جو بات نفس کو ناگوار ہو اس کو برداشت کرنا، اللہ سے زیادہ ناگوار بات برداشت کوئی نہیں کرسکتا، العیاذ باللہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد بنائی ہے جیسے یہود عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور مشرکین ملائکہ کو اللہ کی بیٹی قرار دیتے تھے، یہ اتنی خطرناک بات ہے کہ اس کی وجہ سے آسمان وزمین کا پھٹ کر گر جانا اور نظام عالم کا تہ وبالا ہو جانا مستبعد نہیں، مگر اللہ تعالیٰ بندوں کی ان باتوں پر صبر کرتا ہے اور اس کی وجہ سے ان کی ضروریات نہیں روکتا، بدستور ان کو مصائب وتکالیف سے نجات دیتا رہتا ہے، اور ان کو روزی بہم پہنچاتا رہتا ہے، مخلوق میں کوئی بھی اس درجہ صبر نہیں کرسکتا۔

ایک سوال وجواب:

یہاں حدیث میں صبر کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے جس سے اللہ کا ناگواری سے متاثر ہونا لازم آئے گا، حالانکہ حق تعالیٰ شانہ متاثر ہونے سے منزہ ہے؟

جواب: یہ صبر کے ابتدائی معنیٰ ہیں اور انتہائی معنی ہیں تاخیر العذاب عن مستحقہ کہ مستحقِ عذاب سے عذاب کو مؤخر کرنا، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

اسم الٰہی صبور وحلیم کے معنی اور دونوں میں فرق:

اس معنی کی رو سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام "صبور" بھی ہے اور اس کے ہم معنی ایک دوسرا نام "حلیم" بھی ہے، مگر دونوں میں فرق ہے، "حلیم" میں "صبور" کی بہ نسبت صفت رحمت زائد ہے، اس لئے کہ "صبور" کا مطلب ہے عذاب کو مؤخر کرنے والا، جس کا مفہوم یہ ہوا کہ بعد میں عذاب ہوسکتا ہے، اور "حلیم" کے معنی ہیں عذاب پر قدرت کے باوجود درگزر کرنا اور بالکل معاف کردینا۔ یہاں یہی معنیٰ مراد ہیں۔(۱)

۲۳ / ۲٤ وَعَنْ مُعَاذٍؓ قَالَ: كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِمَارٍ، لَيْسَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ إِلا مُؤَخِّرَةُ الرَّحْلِ، فَقَالَ: "يَامُعاذُ! هَلْ تَدْرِيْ مَاحَقُّ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ؟ وَمَاحَقُّ العباد عَلَى اللّٰهِ؟ "قلتُ: اللّٰهُ ورسولُه اَعْلَمُ، قال: فَإِنَّ حقَّ اللّٰهِ عَلَى العِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوْهُ وَلايُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئاً، وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ أَنْ لايُعَذِّبَ مَنْ

(۱) شرح النووی ۲ / ۲۷٤.

لَايُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!أَفَلَا أُبَشِّرُبِهِ النَّاسَ؟ قَالَ: لَاتُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا. (متفق علیہ)[1]

ترجمہ: حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ (ایک سفر میں) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدھے پر (جس کا نام عفیر تھا) بیٹھا ہوا تھا، میرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف کجاوہ کا پچھلا حصہ حائل تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاذ! جانتے ہو بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے اور کسی کو اس کا شریک نہ مانے، اور اللہ پر بندوں کا حق یہ ہے کہ جس نے کسی کو اللہ کا شریک نہیں قرار دیا اس کو عذاب نہ دے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا میں یہ خوشخبری لوگوں کو سنادوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤ ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے (اور عمل کرنا چھوڑ دیں گے)۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال معاذ بن جبل:

معاذ بن جبل الانصاری الخزرجی، آپ کی کنیت ابوعبداللہ ہے، عقبۂ ثانیہ میں شریک تھے، جلیل القدر اور قدیم الاسلام صحابی ہیں، اللہ نے ان کو تفقہ سے نوازا تھا، اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "اعلمھم بالحلال والحرام" کے خطاب سے نوازا، بہت ہوشیار اور بااستعداد تھے، اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی اور تعلق تھا، تمام غزوات میں شریک رہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی حیات میں یمن کا قاضی بنا کر بھیجا، حضرت عمرؓ نے ان کو ملک شام کا گورنر بنایا، وہیں ۱۸ھ میں طاعون "عمواس" میں آپ کی وفات ہوئی، کل عمر ۳۸ سال ہوئی، اور ایک قول کے مطابق

---

(۱) أخرجه البخاري في خمسة مواضع "الجهاد" ۱/ ۴۰۰ برقم ۲۷۷۱، و"اللباس" ۲/ ۸۸۲ برقم ۵۷۳۳، و"الاستيذان" ۲/ ۹۲۷ برقم ۶۰۲۶، و"الرقاق" ۲/ ۹۶۲ برقم ۶۲۱۵، و"التوحيد" ۲/ ۱۰۹۶ برقم ۱۰۹۶-۱۰۹۷، ومسلم في "الإيمان" ۱/ ۴۴.

۳۴ سال ہوئی، مگر بڑے بڑے صحابہ حضرت عمر، ابن عمر، ابن عباس وانس وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں۔(۱)

ایمان کی اہمیت کا بیان:

اس حدیث میں اور آگے چند احادیث میں ایمان کی اہمیت اور فائدہ بیان کیا گیا ہے، ان احادیث کے ظاہر سے محض ایمان کا نجات کے لئے کافی ہونا اور اعمال کا ضروری نہ ہونا مفہوم ہوتا ہے؛ حالانکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اعمال بھی ضروری ہیں، یہاں اولا ان احادیث کا ترجمہ وتشریح بیان کی جائے گی، اس کے بعد ان مجموعی روایات کے متعدد جوابات تحریر کئے جائیں گے جس سے ان روایات کا صحیح مطلب واضح ہوجائے گا اور دیگر نصوص جن سے اعمال کا ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے ان نصوص کے ساتھ ان احادیث کی مطابقت بھی معلوم ہوجائے گی۔

کنت ردف النبی صلی اللہ علیہ وسلم : حضرت معاذ بن جبل ایک واقعہ بیان کررہے ہیں، اگلی حدیث میں بھی یہی واقعہ مذکور ہے، لیکن اس حدیث میں خود صاحبِ واقعہ حضرت معاذؓ بیان کررہے ہیں اور اگلی حدیث میں حضرت معاذ کے حوالہ سے حضرت انسؓ نے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں گدھے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ردیف بنا ہوا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گدھے پر سوار ہونا اور آپ کے گدھے کا نام:

"ردیف" کے معنی ہیں: "**الذی یرکب خلف الراکب**" (سوار کی اجازت سے سوار کے پیچھے بیٹھنے والا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری گدھے کی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ گدھے کی سواری جائز ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال تواضع بھی معلوم ہوئی کہ دوجہاں کے سردار گدھے پر بھی سواری فرماتے، یہ بھی ثابت ہوا کہ جانور پر دو آدمیوں کا سوار ہونا سواری پر ظلم نہیں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس گدھے کا نام "عفیر" تھا، لہٰذا گدھے اور دوسرے جانوروں کے نام بھی رکھے جاسکتے ہیں، امام بخاری نے اس کے اثبات کے لئے کتاب الجہاد میں "**باب اسم الفرس والحمار**" کے نام سے عنوان قائم کیا ہے۔(۲)

(۱) الإصابة ٥/ ١٥٤—١٥٥ ط دارالفکر، سیر اعلام النبلاء ١/ ٤٤٣—٤٦١.

(۲) بخاری شریف ١/ ٤٠٠.

إلا مؤخرة الرحل: ''رحل'' بمعنی کجاوہ ''مؤخرة'' بضم المیم وکسر الخاء المعجمہ: کجاوہ کے پیچھے کی لکڑی، جس پر سوار ٹیک لگالیتا ہے آرام کے لئے، حضرت معاذؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ کجاوہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، اس جملہ کا مقصد اپنے غایت قرب کو بیان کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ جو حدیث میں بیان کررہا ہوں وہ مجھے اچھی طرح محفوظ ہے، میں نے یہ روایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت نزدیک سے سنی ہے، (١) بعض نے کہا کہ حالات بیان کرنے کا مقصد استلذاذ ہے کیوں کہ محبوب کے حالات میں محبّ کو لذت محسوس ہوتی ہے۔

فقال یامعاذ! هل تدری الخ: حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پکارا: اے معاذ! یہاں ایک مرتبہ پکارنا مذکور ہے اور اگلی حدیث میں تین مرتبہ پکارنے کا تذکرہ ہے، ظاہر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ہی پکارا ہوگا، یہاں راوی نے اختصار کیا ہے، تین مرتبہ پکارنا کمال توجہ اور کمال اصغاء کے لئے تھا، تاکہ آنے والے مضمون کی اہمیت واضح ہوجائے، پکارنے کے بعد فرمایا اے معاذ! کیا تم جانتے ہو کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے؟ اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ حضرت معاذؓ نے معذرت فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرے اللہ اس کو عذاب نہ دے۔

یہاں لفظ ''حق'' دو مرتبہ آیا ہے: ''**حق الله علی العباد**'' اور ''**حق العباد علی الله**'' پہلی جگہ ''**حق**'' لزوم و وجوب کے معنی میں ہے، کیونکہ اللہ کی عبادت اور شرک سے اجتناب بندوں پر لازم ہے اور دوسری جگہ ''**حق**'' مناسب اور لائق کے معنی میں ہے، کیونکہ اہل سنت والجماعۃ کے عقیدہ کے مطابق اللہ پر کچھ لازم و واجب نہیں، محض مشاکلۃً اور مقابلۃً اس کو ''**حق**'' کہدیا گیا ہے، یا پھر اللہ نے اپنے فضل واحسان کی وجہ سے ایسے شخص کو عذاب نہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اللہ کے وعدہ کی بنا پر اس کا حصول ایسا یقینی ہے جیسے واجب چیز یقینی ہوتی ہے، اس لحاظ سے لفظ ''حق'' لایا گیا ہے۔

---

(١) المرقاة ١/ ١٧٢. لفظ ''مؤخرة'' میں تین ضبط ہیں (١) میم کا ضمہ اس کے بعد ہمزہ ساکنہ اور خاء مکسورہ (مؤخِرة) (٢) میم کا ضمہ بعدہ ہمزہ مفتوحہ اور خاء مکسورہ مشددہ (مؤَخِّرة) (٣) میم کا ضمہ بعدہ ہمزہ اور خاء مشددہ کا فتحہ (مُؤخَّـرَة) راجح ضبط اول ہے۔ (المرقاة ١/ ١٧٢)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ محض ایمان کی وجہ سے آدمی جنت میں داخل ہوجائے گا۔

''لاتبشرهم فیتکلوا الخ'' حضرت معاذ نے پوچھا یارسول اللہ: کیا میں لوگوں کو اس بات کی بشارت نہ دیدوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ پھر لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے اور اعمال کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔

''فیتکلوا'' یہ ''اتکال'' باب افتعال سے جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، اور نہی کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، جس کی وجہ سے نون اعرابی حذف ہوگیا ہے، معنی ہیں: بھروسہ کرنا۔(۱)

۲۴ / ۲۵ وَعَنْ أَنسٍؓ: أن النبيَ صلى الله عليه وسلمَ -ومعاذٌ رَدِيفُهُ عَلَى الرَّحْلِ- قال: ''يامُعاذُ!'' قال: لَبَّيْکَ يارَسُولَ اللهِ وَسَعْدَيْکَ، قال: ''يامُعَاذُ!'' قال: لبيک يارسولَ الله وسعديک، قال: ''يامعاذُ!'' قال: لبيک يارسولَ الله وسعديک ثلاثاً قال: ''مامِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لاإلٰهَ إلاّ الله وأَنَّ محمداً رسولُ اللّٰهِ، صِدْقاً مِنْ قَلْبِهٖ إلاَّ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النارِ'' قال: يارسول الله! أَفَلاأُخْبِرُبه النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا؟ قال: ''اِذاً يَتَّكِلُوْا'' فَأَخْبَرَ بها مُعاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَأَثُّماً. (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت جبکہ سواری پر آپ کے پیچھے معاذ بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا: اے معاذ! انہوں نے عرض کیا: حاضر ہوں یارسول اللہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: اے معاذ! انہوں نے عرض کیا: حاضر ہوں یارسول اللہ، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے پھر تیسری مرتبہ مخاطب فرمایا: اے معاذ! انہوں نے پھر عرض کیا: یارسول اللہ حاضر ہوں، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کا جو بندہ سچے دل سے اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو اس پر اللہ تعالی دوزخ کی آگ حرام کردیتا ہے، یہ سن کر حضرت معاذؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میں اس کی خبر لوگوں کو دیدوں کہ وہ خوش ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، لوگ پھر اسی پر بھروسہ کر بیٹھیں گے (اور عمل کرنا چھوڑ

(۱) المرقاة ۱ / ۱۷۳.

(۲) أخرجه البخاري في ''العلم'' ۱ / ۲۴ برقم ۱۲۸ و ۱۲۹ ومسلم ''فيه'' ۱ / ۴۶.

دیں گے)، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت معاذؓ نے (کتمان علم) کے گناہ کے خوف سے اپنی موت کے وقت اس حدیث کو بیان کردیا تھا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی وہی واقعہ ہے، البتہ یہاں راوی حضرت انسؓ ہیں اوراس میں تین مرتبہ پکارنے کا ذکر ہے۔

لبیک وسعدیک کی تحقیق:

لبیک یارسول اللہ وسعدیک :لبیک اصل میں ''لبین'' تثنیہ تھا، کاف ضمیر کی طرف اضافت کی وجہ سے نون ساقط ہوگیا، یہ اُلَبِّی فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے، جو وجوباً محذوف ہے، اصل عبارت ہے: **البی لک لبین** ،تکرار کے معنی پیدا کرنے کے لئے تثنیہ لایا گیا ہے، اس لئے معنی ہوں گے: **أجبتک اجابةً بعد أجابةٍ** یعنی میں بار بار تعمیلِ حکم میں حاضر ہوں، اسی طرح **سعدیک** کی ترکیب ہے اوراس کی اصل عبارت ہے: **ساعدتک مساعدةً بعد مساعدةٍ** یعنی میں مسلسل تعاون کے لئے حاضر ہوں۔ (۱)

شہادتین کا اقرار کرنے والے پر جہنم حرام:

مامن احد یشھد ان لاالہ الا اللہ الخ : تین مرتبہ پکارنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو آدمی سچے دل سے اللہ کے ایک ہونے کی اورمحمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی گواہی دے گا اللہ اس کو جہنم پر حرام کردیں گے، حضرت معاذ نے پوچھا کہ کیا میں لوگوں کو اس کی بشارت نہ سنادوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا: راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت معاذ نے یہ حدیث لوگوں کو نہیں بتائی، البتہ جب ان کا انتقال ہونے لگا تو کتمان علم کے گناہ کے خوف سے یہ حدیث سنائی، کتمان علم پر وعید آئی ہے کہ ایسے شخص کو قیامت میں آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ (۱)

(۱)موسوعة علوم اللغة العربية ۷ / ۵۰۰۔

(۲)عن أبی ھریرةؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ھن سئل عن علم علمه ثم کتمه ألجم یوم القیامة بلجام من نار رواہ احمد وأبوداود والترمذی، مشکوة ۱ / ۳۴.

علماء نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ممانعت ابتداء اسلام میں تھی، جب صحابہ اعمال میں پختہ نہیں ہوئے تھے اس وقت یہ اندیشہ تھا کہ لوگ اس پر بھروسہ کرلیں گے اور اعمال نہیں کریں گے، لیکن جب صحابہ اعمال میں پختہ ہوگئے اوراعمال کی اہمیت سے وہ واقف ہوگئے تو پھر ممانعت نہیں رہی، چنانچہ بعد میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے جیساکہ ابوہریرہؓ کی روایت میں آئندہ آرہا ہے۔

۲۵/۲۶ وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رضی الله عنه قال: أَتیتُ النبيَ صلی الله علیه وسلم- وَعَلَیْهِ ثَوْبٌ أَبْیَضُ، وهو نائمٌ، ثم أَتَیْتُهُ وقد اسْتَیْقَظَ- فقال: "مَامِنْ عَبْدٍ قال: لاإِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ،ثم ماتَ عَلیٰ ذٰلِکَ؛ إِلاَّ دَخَلَ الْجَنَّةَ"قلت: وإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ؟ قال: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ" قلتُ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ؟ قال: "وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ" قلت: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ؟! قَالَ: "وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ عَلٰی رَغْمِ أَنْفِ أَبِیْ ذَرٍّ"وکان أبو ذر إِذَا حَدَّثَ بهذاقال: وإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِیْ ذَرٍّ. (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے تھے(اس وقت تو میں واپس چلا آیا) پھر دوبارہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جبکہ آپ بیدار ہو چکے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہااوراسی عقیدہ پر انتقال ہوگیا تو وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، میں نے عرض کیا :اگر چہ اس نے چوری اورزنا کا ارتکاب کیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں خواہ وہ چوری اورزنا کا مرتکب کیوں نہ ہو، میں نے پھر سوال کیا اگر چہ اس نے چوری اورزنا کاارتکاب ہی کیوں نہ کیا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں خواہ وہ چوری اورزنا کے جرم کامرتکب ہی کیوں نہ ہو (میں نے سہ بارہ پھر) عرض کیا اگر چہ اس نے چوری اورزنا کاارتکاب کیا ہو؟

(۱)أخرجه البخاری فی ثمانیة مواضع: "الجنائز" ۱/۱٦٥برقم ۱۲۲۳، و"الاستقراض" ۱/۳۲۱ برقم ۲۳۲٦و"بدء الخلق" ۱/٤٥۷ برقم ۳۱۱۸، و"اللباس" ۲/۸٦٦ برقم ٥٥۹۸، و"الإستیذان"۲/۹۲۷برقم ٦۰۲۷، و و"الرقاق" ۲/۹٥۳برقم ٦۱۹٤، و٦۱۹٥، و"التوحید"۲/۱۱۱٥برقم ۷۱۸۷ ومسلم "الإیمان"۱/٦٦.

(تیسری مرتبہ بھی) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا: ہاں خواہ وہ چوری اور زنا کا مرتکب کیوں نہ ہوا ہو، ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود، راوی کہتے ہیں کہ جب بھی حضرت ابوذرؓ یہ حدیث بیان کرتے (بطور فخر) اس آخری جملہ "وإن رغم أنف أبی ذر" کو ضرور نقل فرماتے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال ابوذر غفاریؓ:

ابوذر کنیت ہے، مشہور قول کے مطابق ان کا نام جندب بن جنادہ الغفاری ہے، قبیلہ "غِفار" کے تھے، مکی زندگی میں ایمان لائے، بعض نے کہا کہ پانچویں نمبر پر ایمان لائے، اسلام کی وجہ سے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں، کفار مکہ نے ان کو بہت مارا تھا جس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان کے قبیلہ میں بھیج دیا اور فرمایا: کہ جب ہمارے غلبہ کی خبر سنو اس وقت آجانا، چنانچہ ہجرت کا حکم آنے کے بعد غزوۂ خندق کے سال یعنی ۵ھ میں مدینہ تشریف لائے، ان پر زہد اور فکر آخرت کا بہت غلبہ تھا، ضرورت سے زائد مال جمع کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے، اور ایسا کرنے والوں پر سختی کرتے تھے، لوگوں سے اس بارے میں جھگڑتے تھے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مدینہ طیبہ سے باہر مقام ربذہ میں رہنے لگے تھے، وہاں کوئی آبادی بھی نہیں تھی، مقام "ربذہ" میں ہی ۳۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا، انتقال کے وقت کوئی نہیں تھا جو تجہیز وتدفین کے فرائض انجام دے، اہلیہ پریشان ہوئی تو ابوذرؓ نے فرمایا کہ: کچھ دیر کے بعد یہاں سے ایک قافلہ گزرے گا ان کو خبر کردینا وہ کفن دفن کا نظم کریں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ وہاں سے حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے رفقاء جو کوفہ سے آرہے تھے گذرے، اہلیہ نے اطلاع دی ان لوگوں نے آپ کی تکفین وتدفین کی، ان کے بڑے فضائل ہیں اور کثیر الروایات صحابی ہیں۔(۱)

کلمۂ ایمان کی برکت اور فائدہ:

اس حدیث میں کلمۂ ایمان کے فائدہ کا بیان ہے، حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سفید کپڑا اوڑھے ہوئے سو رہے

(۱) الإصابة ٦/ ٨٤–٨٧، سیر اعلام النبلاء ٢/ ٤٦–٧٨.

تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بیدار نہیں کیا، واپس آ گئے، معلوم ہوا کہ بڑے آدمی کو بلاضرورت بیدار نہیں کرنا چاہئے اور وہاں بیٹھنا بھی نہیں چاہئے، لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں کہ سونے کی حالت میں کوئی ان کے پاس بیٹھا رہے، حضرت ابوذرؓ کچھ دیر کے بعد دوبارہ حاضر ہوئے، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا، حضرت ابوذر یا تو یہی سوال کرنے کے لئے آئے تھے، یا ویسے ہی ملنے آئے تھے، مگر سونے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس مضمون کا القا ہوا ہو، تو بیداری کے فوراً بعد ابوذرؓ کو وہ مضمون سنایا۔

لاالہ الا اللہ سے پورا کلمہ مراد ہے، اختصاراً دوسرا جزو چھوڑ دیا، اور **ثم مات علی ذالک** کی قید لگا کر مرتد کو نکال دیا کہ وہ اس بشارت کے تحت داخل نہیں ہوگا۔

قلت: وان زنی وان سرق : حضرت ابوذرؓ کو تعجب ہوا اس لئے پوچھا: **وإن زنی وإن سرق ؟** تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، چاہے اس نے چوری وزنا کیا ہو، اس جملہ میں واو مبالغہ کے لئے اور ''اِن'' وصلیہ ہے، شرطیہ نہیں، اسی طرح دوبارہ اور سہ بارہ کہا، تیسری مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: **علی رغم انف ابی ذر**، یعنی ابوذر کی ناک خاک آلود ہونے کے باوجود۔

''**رغم**'' بمعنی خاک آلود ہونا، یہ اصلاً بددعا ہے، ذلت کے لئے بولا جاتا ہے، لیکن اہل عرب اس کو بہت سی مرتبہ تعجب پر نکیر کرنے کے لئے بولتے ہیں، یہاں یہی مقصد ہے کہ اس بات پر تمہیں تعجب نہیں کرنا چاہئے، راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ جب بھی اس حدیث کو بیان فرماتے تو بطور استلذاذ کے کہتے: **وان رغم انف أبی ذر.** (۱)

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوا کہ صرف کلمہ پڑھنے سے آدمی کو جنت کا داخلہ مل جائے گا۔

صرف سرقہ اور زنا کا ذکر کیوں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف دو گناہوں کو ذکر کیا کیوں کہ زنا میں حق اللہ کا ضیاع ہے اور سرقہ میں حق العباد کا ضیاع ہے مراد حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں کہ اگر ان حقوق کو بھی توڑا ہو تب بھی جنت میں داخل ہوگا۔

---

(۱) فتح الإله ۱/ ۳۲۲.

۲۶ / ۲۷ وعن عبادة بن الصامتؓ قَالَ: قال رَسُوْلُ اللّٰہِ صلى الله عليه وسلم: ''مَنْ شَهِدَ أَنْ لاإِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وحدَهٗ لاشَرِيْکَ لَهٗ وَأَنَّ محمداً عبدُهٗ ورسولُه، وَأَنَّ عِيْسٰى عبدُاللّٰهِ ورسولُه وابْنُ أَمَتِهٖ وكلمتُه أَلْقَاها إِلىٰ مَرْيَمَ، وروحٌ مِنْهُ، والجنةُ والنَّارُ حَقٌّ؛ أدخلَهُ اللّٰهُ الجنةَ عَلٰى ماكانَ مِنَ الْعَمَلِ'' (متفق عليه)(۱)

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ کی بندی مریم علیہا السلام کے بیٹے اور اللہ کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف ڈالا تھا اور اللہ کی (بھیجی ہوئی) روح ہیں اور یہ کہ جنت و دوزخ حق ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں ضرور داخل کرے گا خواہ وہ کسی بھی عمل پر ہو۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی کلمہ اور ایمان کا فائدہ بیان کیا گیا ہے۔

اسلامی عقائد کا تذکرہ اور باطل عقائد کی تردید:

مضمون حدیث یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ایک ہونے کی گواہی دے اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں (چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب مشرکین کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں افراط وتفریط میں مبتلا تھے، اس لئے بالخصوص عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق صحیح عقیدہ رکھنے کی تلقین فرمائی، چنانچہ فرمایا کہ) اور جو اس کی بھی گواہی دے کہ عیسیٰ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، عبداللہ کہہ کر نصاریٰ کی تردید فرمائی کیونکہ وہ ان کو ابن اللہ مانتے تھے، اور ''رسولہ'' سے یہود کی تردید کی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو رسول نہ مانتے بلکہ اللہ کا دشمن کہتے تھے۔

وابن أمته: اس میں بھی نصاریٰ کی تردید ہے کیونکہ نصاریٰ حضرت مریم کو العیاذ باللہ اللہ کی بندی کے بجائے اللہ کی بیوی کہتے تھے، ''امۃ'' کی اضافت اللہ کی طرف بطور تشریف وتکریم کے ہے ورنہ سب عورتیں

(۱) أخرجه البخاري في ''الأنبياء'' ۱ / ۴۸۸ برقم ۳۳۲۰ ومسلم ''الإيمان'' ۱ / ۴۳.

امۃ اللہ ہیں۔ [۱]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہنے کی وجوہات:

وكلمته الخ : یہ لفظ قرآن کریم میں بھی ہے، عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا کلمہ کہنے کی کئی وجہیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے خلاف عادت بچپن میں کلام کیا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے "قال انی عبدالله الخ" اس لئے ان کو اللہ کا کلمہ کہا۔

(۲) بعض نے کہا کہ آپ اللہ کے کلمہ "کن" سے بغیر باپ کے واسطہ کے پیدا ہوئے ہیں۔

(۳) آپ کا کلام بہت موثر تھا تاثیر کلام کی وجہ سے ان کو کلمۃ اللہ کہا جاتا ہے۔

(۴) کلام عرب میں کلمہ "حجت" کو بھی کہتے ہیں، کہا جاتا ہے: هو كلمة الاسلام أي حجة الاسلام ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا یہ بعث بعد الموت کی حجت ودلیل ہے، پس اس معنی میں ان کو "کلمہ" کہا گیا ہے۔ [۲]

وروح منه: یہ لفظ بھی قرآن میں ہے، اس کے معنی ہیں ذی روح منه [۳] یعنی اللہ کی طرف سے روح والے ہیں "منه" میں "من" تسخیر کے لئے ہے تبعیض کا نہیں ہے، یعنی ایسی روح والے ہیں جو اللہ کی طرف سے مسخر وتابع ہے، جبکہ نصاریٰ "من" کو تبعیضیہ مانتے ہیں اور اس بناء پر حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، جو بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہے۔

ایک عیسائی کا استدلال اور ایک مسلمان عالم کا جواب:

ملا علی قاری نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک مجلس میں ایک عیسائی نے ایک قاری کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو اس نے کہا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا وہی عقیدہ ہے جو عیسائیوں کا ہے کہ عیسیٰ اللہ کا جزو یعنی بیٹے ہیں، مجلس میں علی بن حسین بن واقد بھی تھے، انہوں نے اس کو جواب دیتے ہوئے فوراً آیت پڑھی "وسخرلكم مافي السموات ومافي الارض جميعاً منه" اور فرمایا کہ اگر اس

(۱) شرح الطيبى ۱/ ۱٦٧.

(۲) شرح الطيبى ۱/ ١٦٨.

(۳) فتح الإله ۱/ ۳۲٥.

آیت میں ’’من‘‘ کو تبعیض کا قرار دیا جائے تو تمام مخلوق کا اللہ کا بیٹا ہونا ثابت ہوگا جس کے قائل تم بھی نہیں ہو، اس سے وہ عیسائی مبہوت ہوگیا اور مسلمان ہوگیا۔ (۱)

عیسٰی علیہ السلام کو ’’روح‘‘ کہنے کی وجوہات:

عیسٰی علیہ السلام کو روح کہا گیا جس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اللہ کے حکم سے جبرئیل علیہ السلام نے ان کی والدہ کے گریبان میں ان کی روح پھونکی تھی، تو ان کی روح پھونکنے کی چونکہ منفرد شکل اختیار کی گئی اس لئے ان کو ’’روح‘‘ کہا گیا۔

(۲) وہ لوگوں کے لئے حیات جسمانی اور حیات روحانی کا سبب تھے، ایمان کی دعوت دیتے تھے یہ حیات روحانی ہے اور بطور معجزہ مردوں کو زندہ کرتے تھے، یہ حیات جسمانی ہے، پس بطور مبالغہ ان ہی کو ’’روح‘‘ کہدیا گیا۔ (۲)

والجنة والنار حق: یہ بھی ایک مؤمن بہ ہے کہ جنت وجہنم کے حق ہونے کو تسلیم کیا جائے۔

حدیث کا حاصل یہ ہوا جس کے عقائد صحیح ہوں اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، چاہے اس کا عمل کیسا ہی ہو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان نجات کے لئے کافی ہے، نیز یہود ونصاریٰ میں سے جو بھی ایمان لائے گا اس کو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں بھی اپنا عقیدہ صحیح کرنا ہوگا اسی وقت اس کا ایمان قبول ہوگا۔

٢٧ / ٢٨ وعن عمرو بن العاصؓ قال: أَتَيت النبيَ صلى الله عليه وسلم، فقلت: أُبْسُطْ يمينک فَلِأُبايِعَکَ، فَبَسَطَ يَمِينَهُ، فَقَبَضْتُ يَدِيْ، فَقَالَ: مَالَکَ يَاعَمْرو؟ قلت: أردتُّ أَنْ أَشْتَرِطَ، فَقَالَ: "تَشْتَرِطُ مَاذَا؟" قُلْتُ: أن يُغْفَرلِيْ، قال: "أَمَا عَلِمْتَ يَاعَمْرُو أَنَّ الإسلامَ يَهْدِمُ ماكانَ قبلَه، وأنَّ الهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَاكانَ قبلَها، وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ ماكان قبلَه؟!" (رواه مسلم) (۳) وَالْحَدِيْثَانِ الْمَرْوِيَّانِ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ:

(۱) المرقاة ۱ / ۱۷۷.

(۲) شرح الطيبى ۱ / ۱٦۸.

(۳) أخرجه مسلم فى "الإيمان" ۱ / ۷٦.

قَالَ اللّٰـهُ تـعـالـى: أنـا أَغْـنَـى الشُّـرَكَـاءِ عَنِ الشِّرْكِ والآخرُ: "الكبرياءُ رِدَائِي"
سنذكرهما في باب الرياء والكبر إن شاء الله تعالىٰ.

ترجمه: حضرت عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ! اپنا ہاتھ پھیلایئے تاکہ میں آپ سے بیعت کروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جب) اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، آپ نے (تعجب سے) فرمایا عمرو! تمہیں کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں کچھ شرط کرنا چاہتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا شرط ہے؟ میں نے عرض کیا: (میں چاہتا ہوں کہ) میرے (ان تمام) گناہوں کو معاف کردیا جائے (جو میں نے اسلام سے پہلے کئے تھے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو! کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ان تمام گناہوں کو مٹادیتا ہے، جو اسلام سے پہلے کیے گئے ہوں، ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کردیتی ہے جو اس سے پہلے کیے گئے ہوں، اور حج ان تمام گناہوں کو مٹادیتا ہے جو اس سے پہلے کئے گئے ہوں۔ (مسلم) اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ دونوں حدیثیں یعنی "قال اللہ تعالی انا أغنی الشرکاء عن الشرک الخ اور "الکبریاء ردائی الخ" ریا اور کبر کے باب میں نقل کی جائیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تشریحِ حدیث

احوال عمروؓ بن عاصؓ بن وائل:

عمرو آپ کا نام ہے، ابوعبداللہ کنیت ہے، آپ کے والد عاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے، عمرو بھی پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے دشمن تھے، لیکن پھر ۸ھ کے اوائل میں فتح مکہ سے قبل اسلام لے آئے اور بڑے صحابی بنے، بہت ہوشیار و عقلمند تھے، عقلاء عرب میں اُن کا شمار ہوتا تھا، ایسے چند حضرات تھے عمرو بن عاص، مغیرہ بن شعبہ، حضرت معاویہ، حضرت خالد بن ولید وغیرہ، یہ حضرات بڑے بہادر بڑے شجاع اور بہت عقلمند اور بہت صلاحیت والے تھے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان حضرات کو جہاد میں امیر لشکر بنایا کرتے تھے، حضرت عمروؓ، حضرت عمرؓ کے زمانے میں فوجوں کے جرنل تھے، انہوں نے

ہی مصرفتح کیا ہے، حضرت عمرؓ ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ اللہ نے ان کو دنیا میں امیر بننے ہی کے لئے پیدا کیا ہے، کسی نے ان سے پوچھا کہ تم نے اسلام قبول کرنے میں کیوں تاخیر کی؟ جبکہ تمہارا شمار عرب کے عقلاء میں ہوتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ عرب میں ہم سے بھی بڑے لوگ تھے، جن کی عقلوں کا موازنہ پہاڑوں سے کیا جاتا تھا، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو تسلیم نہیں کیا، ہم نے بھی ان کی اقتداء کی، جب وہ ختم ہوگئے اور ہم بڑے ہوگئے تو ہم نے پھر خود غور کیا اور آپ کی حقانیت صاف محسوس ہوئی، تو ہمارے قلب میں اسلام کی محبت بیٹھ گئی اور ہم نے اسلام قبول کرلیا، قریش نے جن لوگوں کو شاہِ حبشہ سے مہاجر صحابہ کو واپس لانے کے لئے بھیجا تھا، یہ بھی ان میں شامل تھے۔(۱)

عمرو بن العاصؓ کے قبول اسلام کا واقعہ:

اس حدیث میں عمرو بن العاص اپنے ایمان لانے کا واقعہ بتاتے ہیں کہ ہم مکہ مکرمہ سے آئے، حضرت خالد بن ولید بھی ساتھ تھے، میں نے بیعت اسلام کرنا چاہی اور درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہاتھ پھیلا دیں، چنانچہ آپ نے ہاتھ پھیلایا، لیکن میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھیں کیا ہوا؟ عرض کیا: میں کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ حضرت عمرو بن عاص نے عرض کیا: میری شرط یہ ہے کہ میرے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں، مطلب یہ کہ ان کو اپنے پچھلے اعمال پر ندامت تھی اور ذہن میں یہ تھا کہ اگر اسلام لانے کے باوجود گناہ معاف نہ ہوں تو اسلام لانے کا فائدہ کیا؟

اسلام اور اعمال صالحہ سے گناہوں کی معافی:

اما علمت یاعمرو! ان الاسلام الخ :حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام پچھلے سب گناہوں کو ختم کردیتا ہے؟ نیز فرمایا کہ اسلام کی بات تو بڑی ہے، اسلام لانے کے بعد شریعت میں بہت سے اعمال ایسے ہیں جو گناہوں کو ختم کردیتے ہیں، چنانچہ ہجرت سے بھی گناہ معاف

(۱) طبقات ابن سعد ۷ / ۳۴۲، تاریخ دمشق ۴۶ / ۱۱۲، سیر أعلام النبلاء/ ۵۵، الإصابه ۴ / ۴۴، رقم الترجمه ۵۸۸۲ مطبوعه : دارالفکر بیروت لبنان.

ہوجاتے ہیں اور حج سے بھی گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اس میں تفصیل ہے: اسلام لانے والا اگر کافر حربی ہے تو اس کے تمام گناہ ختم ہوجاتے ہیں سوائے مسلمانوں کے مالی حقوق کے، اور اگر کافر ذمی مسلمان ہو تو اسلام اس کے صرف ان گناہوں کو مٹاتا ہے جو حقوق اللہ کے قبیل سے ہیں، حقوق العباد کو ادا کرنا ضروری ہوگا، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ (۱)

وانّالهجرة تهدم الخ: ہجرت اور حج سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں، مگر علماء نے دیگر نصوص کی روشنی میں فرمایا کہ ہجرت اور حج وغیرہ اعمال سے صغائر معاف ہوتے ہیں، کبائر کی معافی کے لئے توبہ ضروری ہے۔ (۲)

ایک اہم اشکال اور اس کے متعدد جوابات:

اوپر حضرت معاذ کی احادیث سے یہاں تک یہ پانچ حدیثیں ہوئیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نجات کے لئے ایمان کافی ہے، اعمال کی ضرورت نہیں، حالانکہ یہ مذہب تو مرجئہ کا ہے، اہل سنت والجماعت کے یہاں اعمال بھی ضروری ہیں، کیونکہ صحیح احادیث سے عُصاۃِ مومنین کا بھی جہنم میں داخل ہونا ثابت ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ عاصی مؤمنین جہنم میں داخل کئے جائیں گے، جس سے ان کے بدن کوئلے کی طرح ہوجائیں گے اور پھر انہیں نہر حیات میں ڈالا جائے گا جس سے وہ چمک اٹھیں گے، اس کے بعد جنت میں داخل ہوں گے، (۳) لہٰذا یہ روایات بظاہر اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے خلاف ہیں۔

---

(۱) المرقاۃ ۱/۱۷۹.

(۲) فتح الإله ۱/۳۲۹، والمرقاۃ ۱/۱۷۹، علامہ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۴ھ نے اس حدیث شریف کی شرح کرنے کے بعد لکھا ہے "وفيه فوائد منها: إنه يسن بسط اليمين عند المبايعة، وإنه ينبغي للعالم إذاظهرله من المتعلم شيئاً ينافي التعلم أن يسأله عن سببه، وإن اشتراط المتعلم على المعلم أمراً ينتفع به منه لاينافي التأدب معه، فإنه ليس القصد بذلك إلا مزيد الإمداد والانتفاع، وإنه إذا ظهرله من ذكي يخالف ذكاء ه أن يشعره بأنه كان ينبغي لك التفطن، وأن لايشكك في ذلك، وإن زيد في الجواب للحاجة والمناسبة، وأن يستعمل الأمور البديعة من الاستعارات وغيرها، فتح الإله في شرح المشكاة ۱/۳۳۰ مبطوعه دارالكتب العلميه بيروت ولبنان"

(۳) رواه مسلم في كتاب الايمان، باب اثبات الشفاعة واخراج الموحدين من النار.

علماء نے ان روایات کے کئی جوابات دیئے ہیں:

(۱) سعید ابن المسیب نے فرمایا ''إن هذا كان قبل نزول الفرائض والأمر والنهي'' کہ یہ حکم فرائض اور اوامر ونواہی کے نزول سے پہلے تھا۔

(۲) حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جیسی احادیث کا مطلب ہے: ''مَنْ قَالَ الْكَلِمَةَ وَادَّىٰ حَقَّهَا وَفَرِيْضَتَهَا'' یعنی جو کلمہ کا قائل ہو، اور اسکا حق بھی اداء کرے اور فرائض بجالائے، لہٰذا اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب بھی شہادتین میں داخل ہے کہ یہ کلمہ کا حق ہے۔

(۳) امام بخاریؒ نے فرمایا کہ: یہ روایات اس شخص کے لئے ہیں جو اخیر حیات میں ایمان لایا ہو اور اس کے بعد اس کو اعمال کا موقع نہ ملا ہو، چنانچہ حدیث شریف میں اس طرح کا واقعہ آتا ہے کہ ایک کافر آیا مسلمان ہوا اور اونٹنی سے گر کر مر گیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے جنت کی بشارت سنائی۔ (۱)

(۴) ملا علی قاریؒ نے فرمایا: الأقرب ان يراد تحريم الخلود یعنی اس پر جہنم حرام ہوتی ہے بر سبیل خلود و دوام، نہ کہ بر سبیل دخول، یہ بہتر جواب ہے۔(۲)

(۵) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا کہ: جہنم کے حرام ہونے سے مراد جہنم کا خاص طبقہ ہے جو صرف کافروں کے لئے تیار ہوا ہے، لیکن ایک طبقہ عصاۃ مومنین کیلئے ہے، اس میں مسلمان اپنی بدعملی کی وجہ سے جاسکتا ہے۔(۳)

(۶) بعض نے کہا کہ: ان احادیث کا مقصود کلمہ کی تاثیر کو بیان کرنا ہے، اور کسی بھی چیز کی تاثیر ظاہر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ شرائط موجود ہوں اور موانع کا ارتفاع ہو، جیسے گلِ بنفشہ کی تاثیر ہے کہ نزلہ کو ختم کرتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ مقدار مجوزہ میں کھائے اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز کرے، اسی طرح شہادتین؛ حرمت جہنم اور دخول جنت کا سبب ہے مگر شرط ہے کہ امتثال اوامر اور اجتناب نواہی بھی ہو۔

(۷) بعض نے کہا کہ: حضرت انسؓ کی روایت میں ''صِدْقاً مِنْ قَلْبِهٖ'' کی قید ہے یعنی اخلاص ہونا چاہئے اور اخلاص کہا جاتا ہے استقامت علی الطاعات والاعمال کو، لہٰذا اس سے اعمال کی ضرورت خود ثابت ہوگئی۔

---

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۱۵۹ مکتبہ زکریا دیوبند وفتح الإله ۱/ ۳۲۰.

(۲) المرقاة ۱/ ۱۷۹.

(۳) لمعات التنقيح ۱/ ۲۵۸.

(۸) بعض نے کہا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اغلبی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے کلمہ پڑھتا ہے وہ عموماً اعمال میں لگ ہی جاتا ہے۔ (۱)

(۹) بعض نے کہا کہ: جہنم کے حرام ہونے سے مراد تحریم نار علی اللسان ہے، تحریم نار علی الاعضاء کلہا مراد نہیں ہے، باقی اعضاء اور جسم کو آگ جلاسکتی ہے۔ (۲)

مذکورہ روایات کے یہ جوابات دیئے گئے ہیں، کیونکہ دیگر احادیث سے اعمال کا ضروری ہونا ثابت ہوتا ہے، ان احادیث سے خوارج ومعتزلہ کی بھی تردید ہوتی ہے، جو مرتکب کبیرہ کے خلود فی النار یا عدم دخول جنت کے قائل ہیں، کیونکہ ان احادیث میں ایسے افراد کے لئے بھی واضح طور پر دخول جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

مصنف کی طرف سے ایک وضاحت:

والحدیثان المرویان عن الخ :مصنفؒ فرماتے ہیں کہ مصابیح السنۃ میں یہاں دوحدیثیں اور مذکور تھیں، دونوں کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں اوردونوں حدیث قدسی ہیں لیکن ہم ان کو باب الریاء والکبر (جلد ثانی) میں ذکرکریں گے کیونکہ انکی مناسبت ریاء وکبر سے زیادہ ہے ایمان سے صرف باعتبار ضد کے مناسبت ہے۔

الفصل الثانی

۲۸ / ۲۷ عَنْ مُعَاذٍؓ قَالَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِیْ الْجَنَّةَ، وَيُبَاعِدُنِیْ عَنِ النَّارِ قَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ أَمْرٍ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ يَّسَّرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ، تَعْبُدُ اللّٰهَ وَلاتُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً، وَتُقِيْمُ الصَّلاةَ، وَتُؤتِی الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وَتَحُجُّ الْبَيْتَ، ثُمَّ قَالَ "أَلا أَدُلُّکَ عَلٰى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَالصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلاةُ الرَّجُلِ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ" ثُمَّ تَلا: "تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ" حَتّٰى بَلَغَ "يَعْمَلُوْنَ" ثُمَّ قَالَ: "أَلا أَدُلُّکَ بِرَأْسِ الأَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ؟" قُلْتُ: بَلٰى، يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: رَأْسُ الْأَمْرِ: الإِسْلامُ

(۱) شرح نووی ۱ / ۷٦ مکتبہ اشرفی.

(۲) فتح الإله فی شرح المشكاة ۱ / ۳۲٦ دارالکتب العلمیہ بیروت.

وَعَمُوْدُهُ: اَلصَّلاةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ: اَلْجِهَادُ، ثُمَّ قَالَ: "أَلاأُخْبِرُكَ بِمِلاكِ ذٰلِكَ كُلِّهِ؟" قُلْتُ: بَلٰى، يَانَبِيَّ اللّٰهِ! فَأَخَذَ بِلِسَانِهِ، فَقَالَ: "كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا" فَقُلْتُ: يَانَبِيَّ اللّٰهِ! وَإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَانَتَكَلَّمُ بِهِ؟ قَالَ: "ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَامُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِيْ النَّارِ عَلٰى وُجُوهِهِمْ، أَوْعَلٰى مَنَاخِرِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟"(رواه أحمد والترمذی، وابن ماجة)[1]

ترجمه: حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی عمل ایسا بتادیجئے، جو مجھ کو جنت میں داخل کرادے اور دوزخ سے دور کردے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ تم نے ایک بڑی چیز کے بارے میں سوال کیا ہے، لیکن جس پر اللہ تعالیٰ آسان فرمادے اسکے لئے یہ بہت آسان بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیراؤ، اور نماز پابندی کے ساتھ اداء کرتے رہو، اور زکوۃ دیتے رہو، رمضان کے روزے رکھو، اور خانہ کعبہ کا حج کرو، پھر فرمایا: اے معاذ! کیا تم کو خیر کے دروازے (اعمال) نہ بتلاؤں؟ (سنو) روزہ ڈھال ہے اور صدقہ گناہوں کو ایسے ختم کردیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھادیتا ہے، (اور اسی طرح) رات کے حصہ میں آدمی کا نماز (تہجد) پڑھنا (گناہ کو ختم کردیتا ہے) پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "تتجافی جنوبهم يعملون" تک (پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے رب کو خوف وامید سے پکارتے ہیں اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرتے ہیں پس کوئی شخص نہیں جانتا کہ آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے کیا اس کے لئے چھپایا گیا ہے ان کے اعمال کے بدلہ میں)، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اے معاذ!) کیا تم اِس امر (دین) کا سر اور اس کا ستون اور اس کے کوہان کی بلندی نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ! (ضرور بتایئے) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: "اِس امر (دین) کا سر اسلام ہے اور

(۱) أخرجه الترمذی فی "الإیمان" ۲/ ۸۹ برقم ۲٦۱٦، وابن ماجة فی "الفتن" ۲/ ۲۸٦ برقم ۳۹۷۳ وأحمد ۵/ ۲۳۱ برقم ۲۲۰٦۹، و۵/ ۲۳٤ برقم ۲۲۱۰۰ و۵/ ۲۳۵ برقم ۲۲۱۰٤، و۵/ ۲۳٦ برقم ۲۲۱۱٦ و۵/ ۲۳۷ برقم ۲۲۱۲۵ و۵/ ۲٤۲ برقم ۲۲۱۵۷، و۵/ ۲٤۵ برقم ۲۲۱۷۵.

اس کا ستون نماز ہے اوراس کے کوہان کی بلندی جہاد ہے، پھر آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: کیا تمہیں ان تمام چیزوں کی جڑ نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کیا: اللہ کے نبی! کیوں نہیں (ضرور بتایئے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک پکڑی (اوراس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: اس کو روک کر رکھو (لایعنی اورفضول باتوں سے) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم اپنی زبان سے کچھ الفاظ بول لیتے ہیں کیااس پر بھی مواخذہ ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: معاذ! تمہاری ماں تمہیں گُم کردے (اچھی طرح جان لو) لوگوں کو ان کے منھ کے بل یا ان کے نتھنوں کے بل جہنم میں گرانے والی چیز ان کی زبانوں کی کاٹی ہوئی کھیتی (بری باتیں) ہی ہونگی۔ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

ایک عظیم سوال:

یہ حدیث بھی حضرت معاذؓ کی ہے اوراس میں بھی اعمال ایمان کا بیان ہے حضرت معاذؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ مجھے ایسے عمل کے بارے میں بتلادیں جو مجھے جنت میں داخل کردے اور جہنم سے دوری ہوجائے، حضرات صحابہؓ کے سوالات کا اکثر محور یہی ہوا کرتا تھا کہ ہماری آخرت سنور جائے ان کو یہی ایک دھن تھی اور یہی ایک فکر تھی کہ جنت نصیب ہوجائے اور جہنم سے حفاظت ہوجائے۔

اخبرني بعمل يدخلني الجنة: دخول جنت سے مراد جنت کا دخول اولی ہے۔

لقد سألت عن امر عظيم: یعنی تم نے ایک بڑا اوراہم سوال کیاہے، اس کے کئی مطلب ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ: اس سے ''مشکل امر'' مراد ہے کہ تم نے ایک مشکل چیز کا سوال کیا کیونکہ جنت کے دخول اولی کے لئے اصولاً تمام اوامر کا امتثال اور تمام نواہی سے اجتناب ضروری ہے اورظاہر ہے کہ یہ مشکل چیز ہے، لیکن حق تعالیٰ شانہ جس کے لئے آسان فرمادے اور جس کو توفیق بخشے اس کے لئے آسان ہے۔ [۱]

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے: **أَمْرٌ عَظِيمٌ جزائُه** یعنی ایسا عمل جس کی جزاء عظیم ہو اوروہ دخول جنت ہے۔

---

(۱) شرح الطيبى ۱/ ۱۷۳-۱۷٤.

(۳) بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے: **امرعظیم جوابه** یعنی جس کا جواب اور نشاندہی مشکل ہو، کیونکہ اس کا جواب بغیر علم غیب کے نہیں دیا جاسکتا، اور علم غیب پر مطلع ہونا بغیر وحی کے نہیں ہوسکتا ہے۔[1]

اعمالِ ایمان:

تعبد الله الخ: یہ مضارع بمعنی امر ہے، اور عبادت سے یا تو ایمان وتوحید مراد ہے اسی لئے آگے اس کی ضد یعنی شرک کی نفی کی گئی ہے یا اس سے اعمال مراد ہیں اس صورت میں شرک سے شرک خفی مراد ہوگا۔[2]

مرجیہ، جہمیہ اور کرّامیہ کی تردید:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ارکان خمسہ: نماز روزہ، زکوۃ اور حج کی ادائیگی کا حکم دیا، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عقیدہ کی درستگی کے ساتھ اعمال کی انجام دہی بھی لازمی ہے، اس سے مرجیہ، جہمیہ اور کرامیہ وغیرہ کا رد ہوجاتا ہے جو اعمال کو ضروری نہیں سمجھتے۔

ابواب خیر:

ثم قال: ألا ادلک علی أبواب الخیر: حضرت معاذ کے سوال کا جواب پورا ہوگیا، لیکن چونکہ حضرت معاذؓ کے اندر علم کی طلب اور اس کا شوق بہت تھا اور وہ فطری طور پر بااستعداد تھے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اضافہ فی الجواب کے طور پر ان کو کمال ایمان اور رفع درجات کے لئے کچھ نفلی اعمال بتائے۔

''ابواب'' بمعنی (طرق) یعنی کیا میں تمہاری خیر کے راستوں کی طرف رہنمائی نہ کروں کہ تم اس سے خیر وبھلائی تک پہونچ جاؤ، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تین اعمال بتائے (۱) نفلی روزے رکھے جائیں (۲) نفلی صدقہ کیا جائے (۳) نماز تہجد پڑھی جائے۔

ابواب خیر کہنے کی وجہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم، صدقہ اور نماز کو ابواب الخیر فرمایا، اس میں بطور استعارہ بالکنایہ

(۱) فتح الإله ۱/ ۳۳۲.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۱۸۱.

ان اعمال ثلثہ کو مکان کے بند دروازوں کے ساتھ تشبیہ دی، دروازہ بند ہوتو مکان میں داخل ہونا مشکل ہے اور دروازہ کھلنے پر داخلہ آسان ہوجاتا ہے، اسی طرح ان تین اعمال کو انجام دینا مشکل ہوتا ہے کہ روزہ میں نفس کی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے،صدقہ میں اپنی محبوب چیز (مال) کو نکالنا ہوتا ہے اور تہجد کے وقت میں بیدار ہونا اور نماز پڑھنا اشق علی النفس ہے، پس جو شخص ان تین اعمال کا عادی ہوجائے گویا اس نے بند دروازوں کو کھولدیا، پھر باقی احکام پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہوجائے گا، جس طرح دروازہ کھلنے کے بعد مکان میں داخل ہونا آسان ہوجاتا ہے۔[1]

روزہ اور صدقہ کے فوائد:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نفل اعمال کے فوائد بھی بیان کیے، روزہ کے بارے میں فرمایا: **الصوم جنة** کہ روزہ ڈھال ہے، ڈھال حفاظت کا ذریعہ ہوتی ہے، اسی طرح دنیا میں روزہ وساوسِ شیطانی سے حفاظت کا ذریعہ ہے، انسان جب زیادہ کھاتا ہے تو شیطان کو اس کے رگ وریشہ میں داخل ہوکر کاہلی لانے اور خواہشات میں مبتلا کرنے کا موقعہ زیادہ ملتا ہے، روزہ رکھنا شیطان کے انسانی رگوں میں داخلہ سے رکاوٹ کا سبب بنتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے: **ان الشیطان یَجْرِی من الانسان مَجْری الدم، الافَضَیِّقُوْا مَجَارِیَه بِالْجُوْعِ** [2] یعنی شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے، لہٰذا ہوشیار رہو اور بھوک سے خون کے مقامات کو تنگ کرو، اور آخرت میں روزہ عذاب جہنم سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

والصدقة تطفی الخطیئة: صدقہ کا فائدہ بیان کیا کہ صدقہ گناہوں کو ایسے ختم کردیتا ہے جیسے پانی آگ کو ختم کردیتا ہے، لہٰذا انسان کو چاہئے کہ حسب وسعت موقعہ بموقعہ صدقہ کرتا رہے۔

وصلوة الرجل فی جوف اللیل: اس جملہ میں تہجد کا بیان ہے اس کی تائید میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی "**تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ**" (ترجمہ حدیث کے ترجمہ کے ذیل میں آچکا)

دین کے اہم ترین اعمال اور اجزاء:

ثم قال الاأدلک برأس الا مر وعموده وذروة سنامه: اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۸۲.

(۲) احیاء علوم الدین ۱/ ۳۰٤.

نے دین اسلام کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے اہم اورخصوصی اجزاء کو بیان کیا اوردین میں ان کے مرتبہ اورحیثیت کوبھی واضح کیا،چنانچہ آپ نے تین چیزیں ذکرفرمائیں:

(۱) **رأس الامر الاسلام** :''راس'' بمعنی سر اور''امر'' سے مرادامر دین، یعنی دین کا سر اسلام یعنی توحید ورسالت کی شہادت دینا ہے، پس جس طرح سر کے بغیر آمی کا وجودنہیں ہوسکتا اسی طرح بغیر اقرارِ شہادت کے دین قائم نہیں ہوسکتا۔

(۲) **وعموده الصلوة** :دین کا ستون نماز ہے کہ دین کی عمارت اسی پر قائم ہے، پس جس طرح بے ستون کی عمارت منہدم ہونے کااندیشہ رہتا ہے اسی طرح نمازوں کو ضائع کرنے سے ضیاع دین کا اندیشہ رہتاہے۔

(۳) **وذروة سنامه الجهاد**:''ذروة'':بتثلیث الذال ہےیعنی ذال پرتینوں حرکات صحیح ہیں،معنی ہیں: بلندی، اس جملہ میں دین کوتشبیہ دی گئی ہے اونٹ کے کوہان کے ساتھ، اونٹ کا کوہان خود بلند ہوتا ہے پھربطور مبالغہ اس کے لئے بلندی کوثابت کیا گیاہے۔

کچھ اعمالِ اسلام کی خاصیتیں:

یعنی دین کی سربلندی اورغلبہ دنیامیں جہاد کے ذریعہ سے ہوگا، اس سے جہاد کی خاصیت اورشان کا بھی علم ہوگیا، اعمال شریعت نماز، روزہ وغیرہ ہرایک کی اپنی اپنی جداگانہ خاصیتیں اورامتیازات ہیں مثلاً نماز کی خاصیت ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: **اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ**[1]،یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے، روزہ کی خاصیت تقوی ہے، چنانچہ روزہ کی فرضیت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیاہے: **لعكم تتقون**[1]، تاکہ تم متقی بن سکو) زکوۃ سے اخلاق رذیلہ بالخصوص رذیلۂ بخل ختم ہوتا ہے، **خذ من أموالهم صدقة تطهرهم الخ**[2](آپ ان کے مال میں سے صدقہ لیجئے جو انھیں پاک کرے اوران کا تزکیہ کرے)حج سے اللہ کی محبت اورعشق پیداہوتاہے، جہادبھی شریعت کا ایک عمل ہے اس سے اعلاء کلمۃ اللہ اوردین کا غلبہ حاصل ہوتاہے، یہ مقصد

(۱)العنكبوت: ٤٥.

(۲)البقرة: ۱۸۳

(۳)التوبة: ۱۰۳.

معتد بہ طور پر دیگر عبادتوں سے حاصل نہیں ہوگا، اس لئے اس کو اسلام کے لئے ''ذروۃ السنام'' کہا گیا۔

تمام اعمال صالحہ کو تقویت پہنچانے والا عمل:

قال الأخبرک بملاک ذلک کلہ : اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس سے مذکورہ تمام اعمال میں مدد ملے اور تقویت حاصل ہو؛ مِلاک کے معنی ہیں: مابہ إحکام الشی وتقویتہ یعنی کسی شئ کا ایسا سبب اور ذریعہ جس سے اس شی کی پختگی اور تقویت ہو، حضرت معاذؓ نے فرمایا: کیوں نہیں ضرور بتائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا اور فرمایا اس کی حفاظت کرو شرک اور کفر کی بات سے، غیبت سے، جھوٹ وغیرہ سے، اس پر حضرت معاذؓ نے سوال کیا: اے اللہ کے نبی! ہم زبان سے جو الفاظ بولتے ہیں کیا اس پر بھی مواخذ ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! تیری ماں تجھے گم کرے، لوگ جہنم میں منہ کے بل اسی زبان کی وجہ سے ڈالے جائیں گے۔

ثکلتک امک : یہ جملہ اصلاً بددعائیہ ہے، تیری ماں تجھے گم کرے یعنی تو ہلاک ہوجائے، لیکن عرب کے محاورہ میں اس کا وقوع مقصود نہیں ہوتا، بلکہ محض تادیب کے لئے اور غفلت پر تنبیہ کے لئے یہ جملہ بولا جاتا ہے۔

وجوھھم أومناخرھم: اس میں راوی کو شک ہے وجوہ فرمایا، یا مناخر کہا۔

حصائد السنتھم : بمعنی کاٹی ہوئی کھیتی، یہاں زبان کو تشبیہ دی ہے درانتی کے ساتھ کہ وہ کھیتی کو کاٹ دیتی ہے، چاہے وہ کچی ہو یا پکی، اور زبان سے بولی ہوئی باتوں کو تشبیہ دی ہے کٹی ہوئی کھیتی کے ساتھ، یعنی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوں گے، لہٰذا اس پر قابو رکھا جائے۔[1]

تنبیہ : اس حدیث میں تمام اعمال کی انجام دہی کو زبان کی حفاظت سے جوڑا گیا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ حفاظتِ لسان سے قلب میں صفائی ونورانیت آتی ہے، اور جب قلب میں نورانیت ہوتی ہے تو نیکیوں کی طرف آدمی کا ذہن چلتا ہے اور قلب میں اعمال صالحہ کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں عمل کی انجام دہی سہل ہوجاتی ہے، زبان کی حفاظت نہ ہو تو قلب میں غفلت وتاریکی پیدا ہوتی ہے، پھر بجائے نیکیوں کے برائیوں کی طرف ذہن چلتا ہے، برے خیالات آتے ہیں اور برائیوں کا داعیہ ابھرتا ہے، اس وقت

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۸٤.

اعمال صالحہ کوانجام دینا بہت مشکل ہوتا ہے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کی حفاظت کوتمام اعمال کی جڑ بتایا ہے۔

٢٩ / ٢٨ وَعَنْ أَبِیْ أُمَامَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ، وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ، وَأَعْطىٰ لِلّٰهِ، وَمَنَعَ لِلّٰهِ، فَقَدْ اِسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ" رواه ابوداود ورواه الترمذی عن معاذ بن انس مع تقديم وتاخير، وفيه فقد استكمل ايمانَهٗ.(١)

ترجمه: حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جوشخص اللہ ہی کے لئے محبت کرے اور اللہ ہی کے لئے نفرت کرے اور اللہ ہی کے لئے دے اور اللہ ہی کے لئے روکے تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کرلیا۔ (ابوداود) اور ترمذی نے اس حدیث کو معاذ بن انسؓ سے کسی قدر تقدیم وتاخیر کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: تو یقیناً اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔

تشریحِ حدیث

احوال ابوامامہ:

نام: صُدَیٰ بن عجلان الباہلی، کثیر الروایۃ صحابی ہیں، فتح مصر کے بعد مصر چلے گئے تھے، پھر وہاں سے شام منتقل ہوگئے اور ملک شام میں ہی ٨٦ھ میں انتقال ہوا، بعض نے کہا کہ شام میں آخری صحابی یہی ہیں، جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔ (٢)

اخلاص کا حکم بالخصوص محبت، بغض، اعطاء اور منع میں اخلاص کی تاکید اور فضیلت:

من احب لله وابغض لله الخ: اس حدیث میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے کہ بندہ ہر عمل میں اللہ کی رضا وخوشنودی کی نیت کرے، چار اعمال خاص طور پر بتائے گئے کہ ان میں اخلاص پیدا ہوجائے تو آدمی کا

(١) أخرجه ابوداود فی "كتاب السنة" ٢/ ٦٤٣ برقم: ٤٦٢١، والترمذي فی "أبواب صفة القيامة" ٢/ ٧٨ برقم: ٢٥٢١.

(٢) السير ٣/ ٣٥٩-٣٦٢، والإصابه ٣/ ١٤-١٥.

ایمان کامل اور مکمل ہو جائے گا وہ چار اعمال یہ ہیں: **الحب لله، البغض لله، الاعطاء لله** اور **المنع لله**، کسی سے محبت کرے، کسی سے نفرت کرے، کسی کو کوئی چیز دے، یا منع کرے، سب اللہ کی رضا کے لئے ہونا چاہئے۔

صحابہ کی زندگی میں اخلاص کی روشن مثالیں:

حضرات صحابہؓ میں یہ بات بدرجۂ اتم موجود تھی اور وہ اس بارے میں اپنی قرابت اور رشتہ داری کا بھی خیال نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کوئی حدیث بیان کی، تو ان کے صاحبزادے نے کوئی ایسی بات کہدی جس سے حدیث کا معارضہ محسوس ہو رہا تھا، تو عبداللہ بن عمر نے اپنے اس صاحبزادہ سے تا زندگی بات نہیں کی، [1] جو حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی مثال ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے بھانجے حضرت مسطحؓ کا کچھ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا، جب منافقین نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تو حضرت مسطحؓ نے بھی ان کی کچھ تائید کردی، جس سے ناراض ہو کر حضرت ابوبکرؓ نے ان کا وظیفہ بند کر دیا، مگر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ نازل فرما کر اس کے اجراء کا حکم دیا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سب کچھ بھلا کر فوراً وظیفہ جاری فرمادیا، [2] یہ اعطاء للہ اور منع للہ کا خوب تر مظاہرہ ہے۔

اعمال اربعہ کی وجہ تخصیص:

یہاں چار اعمال مذکور ہیں، اگلی حدیث میں ان چار میں سے اختصاراً دو عمل ذکر کئے گئے: **الحب في الله والبغض في الله**، سوال یہ ہے کہ بندہ سے ہر عمل میں اخلاص مطلوب ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: **ان صلوتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين** [3]؟ یعنی میری نماز میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے، پھر ان چار کی تخصیص کیوں ہے؟

جواب: ان چار اعمال میں عموماً حظ نفس شامل ہوتا ہے آدمی ان اعمال کو نفس کے تقاضہ سے کرتا ہے لہٰذا اگر ان چار اعمال میں اخلاص پیدا ہو گیا تو باقی چیزوں میں اخلاص کا حصول آسان ہو جائے گا اس نکتہ کی

(۱) رواه مسلم في كتاب الصلوة، باب خروج النساء الى المساجد.

(۲) تفسير قرطبي ۱۲/ ۲۰۷.

(۳) الانعام: ۱٦۲.

وجہ سے ان چار اعمال کو ذکر فرمایا گیا۔ [(۱)]

ورواه الترمذی عن معاذ بن أنس الخ: اس مضمون کی روایت ترمذی میں معاذ ابن انس الجہنیؓ سے مروی ہے، البتہ اس میں کچھ الفاظ کی تقدیم وتاخیر ہے اور کچھ اضافہ بھی ہے، چنانچہ اس کے الفاظ اس طرح ہیں: **من اعطی لله ومنع لله واحب لله وابغض لله وانکح لله فقداستکمل ایمانه**، "**انکح لله**" کا مطلب ہے کہ کسی کے نکاح میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے جانی یا مالی تعاون کرے۔

۳۰/ ۲۹ وَعَنْ أَبِیْ ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ، وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ" (رواه ابوداود) [(۲)]

ترجمہ: حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اعمال میں سب سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت رکھی جائے اور اللہ ہی کے لئے کسی سے نفرت رکھی جائے۔ (ابوداود)

تشریحِ حدیث

حب فی اللہ اور بغض فی اللہ افضل الاعمال:

"**حب فی الله اوربغض فی الله**" جس کی وضاحت اوپر حدیث میں آئی ہے کہ اللہ کے لئے محبت رکھی جائے اور اللہ ہی کے لئے بغض وعداوت ہو، اس حدیث میں اس کو افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اخلاص حاصل ہوجانا دیگر تمام اعمال میں اخلاص پیدا ہوجانے کا سبب ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس وجہ سے ان کو افضل الاعمال کہا گیا ہے۔

افضل الاعمال کونسا عمل ہے؟

افضل عمل کیا ہے؟ اس سلسلہ میں روایات مختلف ہیں بعض روایات میں **الحب فی الله والبغض فی الله** کو افضل عمل بتایا ہے اور بعض روایات میں **الصلاة لوقتها** کو افضل الاعمال قرار دیا ہے اور بعض میں

(۱) المرقاة ۱/ ۱۸۵.

(۲) أخرجه أبو داود في "السنة" ۲/ ۶۳۲ برقم ۴۵۹۹.

’’شهادة ان لاإلـه الا الـله ‘‘ کوافضل عمل فرمایا گیا ہے اور بعض روایات میں دیگر کچھ چیزیں آئی ہیں، ظاہر ہے کہ افضل عمل تو کوئی ایک ہی ہوگا؟ پھر کئی اعمال پر افضل عمل کا اطلاق کیوں کر کیا گیا ہے؟

اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱)حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عموماً کسی سائل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے متعدد افعال پر افضل الاعمال کا اطلاق کیا ہے، یہ اختلاف سائل کے حالات کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے، حضور علیہ الصلوۃ والسلام روحانی طبیب تھے، سائل افضل عمل کا سوال کرتا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حالت کے موافق جواب دیتے، مثلاً کسی کے اندر اخلاص کی کمی ہے اس نے سوال کیا ای الـعـمـل افـضـل اس کو جواب دیا الحب فی الله والبغض فی ا لله، کسی کی طبیعت میں بخل ہے اس نے افضل عمل کا سوال کیا تو اس کو فرمایا افـضـل الاعـمـال اطـعـام الـطـعـام، سائل کے اندر اگر نماز کی پابندی نہیں ہے تو اس کے حق میں فرمایا الصلوۃ لوقتها، جیسا کہ ڈاکٹر وطبیب مریض کی حالت کے موافق مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں۔

(۲)بعض نے کہا کہ افـضـل الاعـمـال کا لفظ جہاں بھی آتا ہے وہاں مِن مقدر ہوتا ہے اي: من أفضل الأعمال یعنی افضل اعمال ایک نوع کلی ہے اس کے افراد کثیر ہیں۔

(۳)بعض نے کہا کہ افضل اسم تفضیل کا صیغہ ہے لیکن یہاں تفضیل کے معنی میں نہیں، بلکہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اور مقصود محض اس عمل کی فضیلت واہمیت بیان کرنا ہوتا ہے، نہ کہ دوسروں کے مقابلہ اس کی افضلیت کو ثابت کرنا، اہل عرب بھی تفضیل کا صیغہ ہمیشہ تقابل کے لئے استعمال نہیں کرتے، لہٰذا یہاں معنی ہوں گے کہ یہ اعمال فی نفسہ بڑی فضیلت والے ہیں دوسرے عمل سے تقابل مقصود نہیں ہے۔

۳۱ / ۳۰ وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَال: قـال رسـول الـلـه صلى الله عليه وسلم: ’’اَلْـمُسْـلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ،وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ‘‘(رواه الترمذي، والنسائي)[1] وَزَادَ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْإِيْمَانِ[2] بِرِوَايَةِ

(۱)أخرجه الترمذی فی ’’الإیمان‘‘ ۲ / ۹۰برقم ۲۶۲۷ والنسائی فی ’’الإیمان وشرائعه‘‘۲ / ۲۶۶ برقم ۴۵۵۹.

(۲)أخرجـه البيهـقـی فی ’’شعب الإيمان‘‘باب فی أن يحب الرجل لأخيه المسلم مايحب لنفسه ويكره له مايكره لنفسه ۷ / ۴۹۹قد عزاه صاحب المشكاة إلى البيهقی وقد أخرجه ابن ماجه أيضاً فی ’’الفتن‘‘۲ / ۲۸۲، برقم ۳۹۳۴.

فَضَالَةَ "وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبَ"

ترجمہ :حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کامل مسلمان وہ شخص ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور کامل مؤمن وہ ہے جس سے لوگ اپنی جان اور مال کو مامون سمجھیں ۔(ترمذی، نسائی)،اورشعب الایمان میں امام بیہقیؒ نے فضالہ سے یہ روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: اور حقیقی مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اوراصل مہاجر وہ ہے جس نے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کوترک کردیا۔

تشریح حدیث

اس حدیث میں اسی طرح اگلی حدیث میں کمالِ ایمان کا بیان ہے۔

کامل مسلمان:

المسلم من سلم المسلمون الخ اس جملہ سے متعلق کلام گزرگیا۔

کامل مؤمن:

والمومن من أمنه الناس : کامل مؤمن وہ ہےجس کی طرف سے لوگ اپنے جان ومال کے بارے میں مطمئن رہیں،مطلب یہ ہے کہ آدمی کو بے ضرر بن کر رہنا چاہئے ،لوگ اس کے متعلق مطمئن اور بے فکر رہیں کہ یہ شخص ہمیں کسی جانی یامالی نقصان میں مبتلانہیں کرے گا،ایسا شخص مؤمن کامل ہے، ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیاہے کہ مؤمن کامل وہ ہے جس کولوگ اپنے مال وجان پرامین بنائیں،لیکن یہ معنی پہلے معنی سے مختلف نہیں، بلکہ اس کا جزء زائد ہےاورمطلب یہ ہے کہ آدمی کی جانب سے لوگ اتنے مطمئن اور بے خوف ہوں کہ وہ خود اپنے جان ومال اس کی امانت میں دینے سے نہ ہچکچائیں۔

وزاد البیھقی : امام بیہقی نے بھی شعب الایمان میں حضرت فضالہ کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا، اس میں دو جملے زائد ہیں، جن کی تشریح آگے آرہی ہے۔

احوال فَضالة بن عبید:

ان کا پورا نام فَضالہ بن عبید الانصاری الاوسی ہے، جلیل القدر صحابی ہیں، ان کی پہلی شرکت غزوۂ احد میں ہوئی، ملک شام کو فتح کرنے کے لئے جو لشکر گیا اس میں آپ بھی شریک تھے، پھر وہیں سکونت اختیار کرلی، حضرت معاویہؓ نے ان کو دمشق کا قاضی مقرر کیا تھا، نیز ایک مرتبہ ان کو اپنا نائب بھی بنایا تھا، اُن کے دورِ خلافت میں شام میں ہی ۵۳ھ میں وفات ہوئی، حضرت معاویہؓ بھی ان کا جنازہ اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ (۱)

حقیقی مجاہد:

والمجاهد من جاهد الخ : حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے یعنی اپنے نفس کو شریعت کے تابع بنائے، نفس نہ چاہے تب بھی احکام شرعیہ بجالائے، نفس میں جو خلاف شرع تقاضے آئیں ان کو دبائے اور کچلے، ایسا شخص اصل مجاہد ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار اور نفس دونوں انسان کو دین پر چلنے سے روکتے ہیں، دین پر عمل کے لئے دونوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، لیکن کفار سے مقابلہ کی کبھی کبھار نوبت آتی ہے جبکہ نفس سے ہر وقت مقابلہ ہے، تو جو اس ہمیشہ کے دشمن کو رام کرلے وہی اصل مجاہد ہے۔

''رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر'' روایت کا صحیح مفہوم اور ایک غلط نظریہ کی تردید:

ایک غزوہ سے واپسی پر مدینہ کے قریب آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر (۲) یعنی ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم ابتک دشمن کی زمین میں کفار کے مقابلہ برسرپیکار تھے وہاں نفس کو اسباب لذت میسر نہ تھے، اس لئے وہاں نفس کو لذتوں سے روکنے کا مجاہدہ نہ ہوسکا، پس وہ جہاد اصغر ہوا، اب وطن واپسی ہورہی ہے جہاں اسباب عیش ولذت میسر ہوتے ہیں ایسے موقعہ میں نفس کو غیر مشروع لذتوں سے روک کر شریعت کی قید

(۱) الإصابة ٤ / ٣٤٣-٣٤٤.

(۲) الزهد للبيهقي، رقم: ٣٧٣، ولفظه: قدمتم خير مقدم من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر، رواه عن جابر وقال هذا الإسناد ضعيف.

میں مقید کرنا اور مکمل شریعت پر عمل پیرا ہونا نفس کا بڑا مجاہدہ ہے جو جہاد اکبر کے درجہ میں ہے، اس روایت کا یہی صحیح مطلب ہے۔

بعض لوگ اس حدیث کی وجہ سے جہاد کی حیثیت گھٹاتے ہیں کہ ہم نفس سے جہاد کر رہے ہیں وہ افضل ہے جہاد مع الکفار کے مقابلہ میں جو درست نہیں، کیونکہ جو روایت اوپر گذری اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو شریعت کا مکمل تابع بنادے یعنی شریعت کا جو حکم سامنے آئے اس کو بجالائے، مثلاً وقت پر نماز ادا کرے، روزے رکھے، زکوۃ ادا کرے، حج ادا کرے اور اگر کفار سے جہاد کا حکم ہوجائے اس حکم کو بھی بجالائے، یہ نہ کہے کہ ہم تو جہاد اکبر میں مشغول ہیں پس چھوٹے جہاد کی حاجت نہیں، اس لئے کہ اگر ایسا کہے گا تو پھر یہ مجاہدۂ نفس کہاں ہوا؟ مجاہدۂ نفس میں تو مکمل شریعت کا اتباع داخل ہے جس کا ایک حصہ اور شعبہ جہاد مع الکفار بھی ہے، پس مجاہدہ نفس اس وقت مکمل ہوگا جبکہ جہاد مع الکفار بھی کیا جائے۔[1]

اصل مہاجر:

والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب: اس کی تشریح بھی حدیث "المسلم من سلم المسلمون الخ" کے تحت گزر چکی ہے۔

> ۳۱ / ۳۰ وَعَنْ أَنَسٍ ؓ قال: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَّا قَالَ: لَاإِيْمَانَ لِمَنْ لَاأَمَانَةَ لَهُ، وَلَادِيْنَ لِمَنْ لَاعَهْدَ لَهُ. "رواه البيهقی فی "شعب الايمان"[2]
>
> **ترجمہ**: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا خطبہ کم دیا ہوگا جس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی کچھ نہیں اور جس میں ایفاءِ عہد نہیں اس کا دین بھی کچھ نہیں۔ (شعب الایمان)

تشریح حدیث

قلما خطبنا الخ: اس حدیث میں بھی کمال ایمان کا بیان ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت

(۱) المرقاۃ ۱ / ۱۸۷.

(۲) أخرجه البيهقی فی شعب الإيمان ٤ / ٧٨، برقم: ٤٣٥٤.

صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے اس مضمون سے بہت کم خالی ہوتے تھے جس سے اس مضمونِ ہدایت کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قلما میں ما مصدریہ بھی ہوسکتا ہے اور ما کافہ بھی، ''ما مصدریہ'' بعد کے فعل کو مصدر کے معنی میں کردیتا ہے اور ''ما کافہ'' ماقبل کو مابعد میں عمل کرنے سے روک دیتا ہے۔ تفصیل نحو کی کتابوں میں ہے۔(۱)

امانت کی اہمیت:

لاإیمان لمن لاأمانة له : امانت سے کیا مراد ہے؟ اور نفی کیسی ہے؟ کمال کی یا اصل کی؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) کہ امانت کے معروف معنی مراد ہوں کہ کسی نے تمہارے پاس اپنا کچھ مال امانت کے طور پر رکھا، یا وہ باہر سفر پر جارہا ہے اپنے اہل وعیال کو تمہارے اوپر بھروسہ کرکے ان کی نگرانی تمہارے حوالہ کرگیا، اب تمہارا فرض یہ ہے کہ خیانت نہ کرو، امانت داری اختیار کرو، اگر امانت میں خیانت کی تو ایمان کامل نہیں اس صورت میں نفی کمال کی ہوگی۔

(۲) امانت سے تکالیف شرعیہ مراد ہوں جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے ''**إِنَّا عَرَضْنَا الامَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالارْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الإِنْسَانَ اِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا**''(۲) (یقیناً ہم نے امانت پیش کی آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر تو ان سب نے انکار کیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈرے اس سے، اور اس کو انسان نے اٹھالیا یقیناً وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل ہے) اس آیت میں راجح قول کے مطابق امانت سے احکام شرعیہ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے احکام (مجموعہ ایمان وعمل) بندوں کے حق میں امانت ہیں، اگر ان احکام سے روگردانی کی اور ان کو قبول نہ کیا تو ایسا شخص ایمان والا نہیں ہے، اس صورت میں نفی اصل ایمان کی ہوگی۔

عہد کی سنگینی:

ولادین لمن لاعهدله : اس میں بھی دونوں احتمال ہیں: (۱) عہد سے باہمی عہد مراد ہو تو اس وقت

(۱) المرقاة ۱/ ۱۸۷ ط اشرفیه دیوبند.

(۲) الأحزاب: ۷۲.

نفی، نفی کمال ہوگی کہ جو کئے ہوئے عہد کی پاسداری نہیں کرتا اس کا دین کامل نہیں۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے عہد اَلست مراد ہو جو اللہ نے عالم ارواح میں لیا تھا، اس وقت نفی اصل دین کی ہوگی یعنی جو اللہ کی وحدانیت کا قائل نہیں وہ دین والا نہیں بلکہ بے دین ہے۔

الفصل الثالث

٣٣/٣٢ عَنْ عَبَادَةَ بنِ الصَّامِتِؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ شَهِدَ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰه وَأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ. رواه مسلم.(۱)

ترجمہ:- حضرت عبادہ بن الصامتؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جس شخص نے گواہی دی اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ اس پر جہنم کی آگ حرام فرمادیں گے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں اور آئندہ کی دو حدیثوں میں ایمان وکلمۂ ایمان کی برکت اور ان کے فائدہ کا بیان ہے، ان روایات سے محض ایمان کا نجات کے لئے کافی ہونا معلوم ہوتا ہے، اس مضمون کی احادیث ماقبل میں گزر چکی ہیں اور اس سے متعلق سوالات کے جوابات بھی دیئے جاچکے ہیں۔

٣٤/٣٣ وَعَنْ عُثْمَانَؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لاإِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ" رواه مسلم.(۲)

ترجمہ:- حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کی وفات اس یقین پر ہوئی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا (مسلم)

(۱) رواه مسلم فی الایمان، باب من لقی الله بالإیمان وهو غیر شاک فیه دخل الجنة وحرم علی النار (۲۹)

(۲) أخرجه مسلم في الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً، ۱/۴۳.

تشریحِ حدیث

احوال عثمان بن عفان:

امیر المؤمنین، خلیفۂ ثالث، حضرت عثمانؓ بن عفان، عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، ذوہجرتین ہیں، ذو النورین ہیں، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوصاحبزادیاں رقیہ اورام کلثوم یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں، آپ کے فضائل جلد ثانی میں مستقل باب میں آئیں گے، بارہ سال تک آپ خلیفہ رہے، ۳۵ھ میں مصر کے باغیوں نے آپ کوشہید کیا۔(۱)

کیااقرار باللسان ضروری نہیں؟

اس روایت میں ''لاالٰہ الااللہ'' سے مراد پورا کلمہ ہے اور ''یعلم'' سے مراد علم یقین ہے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدانیت ورسالت پریقین رکھنا کافی ہے، اقرار باللسان ضروری نہیں؟

جواب یہ ہے کہ یہ روایت اقرار باللسان کے بارے میں ساکت ہے اور دیگر روایات اس سلسلہ میں ناطق ہیں اور ناطق ساکت پر مقدم ہوتا ہے، اس لئے اقرار باللسان بھی ضروری ہے۔

۳۵ / ۳۴: وَعَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ" قَالَ رجلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَاالْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ: "مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ، وَمَنْ مَاتَ لايُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ" (رواه مسلم)(۲)

ترجمہ:- حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: دوچیزیں واجب کرنے والی ہیں (جنت اوردوزخ کو) ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! (جنت اوردوزخ کو) واجب کرنے والی وہ چیزیں کون سی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (پہلی چیز تو یہ ہے کہ) جوشخص اس حال میں مرا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوشریک ٹھیرا

(۱) الإصابة ۳ / ۳۲۵–۳۲۷.

(۲) أخرجه مسلم في كتاب الإيمان، باب الدليل على أن من مات لايشرك بالله شيئا دخل الجنة ۱ / ٦٦ وليس فيه ثنتان موجبتان.

رکھا تھا تو وہ دوزخ میں داخل ہوگا (اور دوسری چیز یہ ہے کہ) جس کی وفات اس حال میں ہوئی کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا تھا تو وہ جنت میں جائے گا۔

تشریحِ حدیث

احوال جابر بن عبداللہ:

جابر بن عبداللہ بن عمرو انصاری صحابی ہیں ابوعبداللہ کنیت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اٹھارہ غزوات میں شریک ہوئے، البتہ غزوۂ بدر اور احد میں شریک نہیں ہوسکے، جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی والدہ نہیں تھیں اور بہنیں متعدد تھیں، تو والد محترم نے ان کو بہنوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر رہنے کا حکم دیا تھا اور خود جنگ میں تشریف لے گئے تھے، پھر جب وہ احد میں شہید ہوگئے، اس کے بعد سے یہ تمام غزوات میں شریک ہونے لگے، ان سے بکثرت روایات مروی ہیں، احادیث کے سماع اور حصول کا بہت شوق تھا، صرف ایک حدیث کے سماع کے لئے ملک شام کا سفر کیا جس میں ایک ماہ لگا، اور اخیر عمر میں بھی صرف سماع حدیث کے لئے مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت تعلق تھا اور آپ ان کی امداد بھی فرماتے تھے، اخیر عمر میں نابینا ہوگئے تھے، ۷۴ھ میں مدینہ میں انتقال ہوا اور بعض نے کہا کہ یہ مدینہ میں آخری صحابی ہیں۔(۱)

شرک وایمان اوران کے لازمی اثرات:

ثنتان موجبتان: اس حدیث میں بہ حیثیت وعدہ اور وعید شرک کو دخول نار واجب کرنے والا اور توحید کو دخول جنت واجب کرنے والا قرار دیا گیا ہے، ورنہ اللہ کے ذمہ کچھ واجب نہیں ہے، یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے، جبکہ معتزلہ نیک اعمال پر ثواب اور گناہوں پر سزا دینے کو اللہ کے ذمہ واجب قرار دیتے ہیں کمامر۔

۳۶/۳۵ وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: كُنَّا قُعُوْداً حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعْنَا اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ رضي الله عنهما فِيْ نَفَرٍ، فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا،

(۱) اسد الغابة ۱/۴۹۲،(۶۴۷) والإصابة ۱/۲۳۰، سير اعلام النبلاء ۳/۱۸۹—۱۹۴، حضرت جابرؓ کی مرویات کی تعداد ۱۵۴۰ ہے ۵۸ متفق عليه، ۲۶ ماانفرد به البخاري اور ۱۲۶ ماانفرد به مسلم هيں، كمافي السير ۳/۱۹۴.

فَأَبْطأَ عَلَيْنَا، وَخَشِيْنَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُوْنَنَا، وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَخَرَجْتُ أَبْتَغِي رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰه عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى أَتَيْتُ حَائِطاً لِلأَنْصارِ لِبَنِي النَّجَّارِ، فَدُرْتُ بِهٖ، هَلْ أَجِدُلَهٗ بَاباً؟ فَلَمْ أَجِدْ، فَإِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِيْ جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ، وَالرَّبِيْعُ: الْجَدْوَلُ، قَالَ: فَاحْتَفَزْتُ، فَدَخَلْتُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "أَبُوْهُرَيْرَةَ؟" فَقُلْتُ: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ "مَاشَأْنُكَ؟" قُلْتُ: كُنْتَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَأَبْطَاتَ عَلَيْنَا، فَخَشِيْنَا أَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا، فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ، فَأَتَيْتُ هٰذَا الْحَائِطَ، فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ، وَهٰؤُلاءِ النَّاسُ وَرَائِيْ، فَقَالَ: يَا"أباهريرة"وَأَعْطَانِيْ نَعْلَيْهِ،فَقَالَ: اِذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيكَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ" فَكَانَ أَوَّلُ مَنْ لَقِيتُ عُمَرَ فَقَالَ: مَاهَاتَانِ النَّعْلانِ يَاأَبَاهُرَيْرَةَ؟ قُلْتُ: هَاتَانِ نَعلارَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِيْ بِهِمَا، مَنْ لَقِيْتُ يَشْهَدُ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهٗ، بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ، فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْيَيَّ، فَخَرَرْتُ لِإِسْتِي، فَقَالَ، ارْجِعْ: يَاأَبَاهُرَيْرَةَ! فَرَجَعْتُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ، وَرَكِبَنِيْ عُمَرُ، وَإِذَا هُوَ عَلٰى أَثَرِيْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَالَكَ يَاأَبَاهُرَيْرَةَ؟" فَقُلْتُ: لَقِيْتُ عُمَرَ فَأَخْبَرْتُهٗ بِالَّذِيْ بَعَثْتَنِيْ بِهٖ، فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِإِسْتِي فَقَالَ: اِرْجِعْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "يَاعُمَرُ! مَاحَمَلَكَ عَلٰى مَا فَعَلْتَ؟" قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّي، أَبَعَثْتَ أَبَاهُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ، مَنْ لَقِيَ يَشْهَدُ أَنْ لاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرَهٗ بِالْجَنَّةِ؟ قَالَ: "نَعَمْ" قَالَ: فَلا تَفْعَلْ،فَإِنِّيْ أَخْشٰى أَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا، فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "فَخَلِّهِمْ" (رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے ساتھ ابوبکروعمرؓ بھی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچانک ہمارے

(۱)أخرجه مسلم في الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً ۱/ ٤٤.

درمیان سے اٹھے (اور باہر تشریف لے گئے) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی تو ہمیں ڈر ہوا کہ ہماری غیر موجودگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچادی جائے، ہم گھبرائے اور اٹھ کھڑے ہوئے اور میں پہلا وہ شخص تھا جو گھبرایا، پس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں باہر نکلا اور تلاش کرتا ہوا قبیلہ بنی النجار کے ایک انصاری کے باغ کے قریب پہنچ گیا (اس خیال سے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس باغ کے اندر ہوں) میں نے (اندر جانے کے لئے) دروازہ تلاش کیا، مگر دروازہ نہیں مل سکا، اچانک ایک نالی نظر آئی جو باہر کے کنویں سے باغ کے اندر جارہی تھی، میں سمٹ کر اس نالی میں داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارکہ میں پہنچ گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوہریرہ تم ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں: یارسول اللہ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے عرض
کیا: یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرماتھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے (اور باہر) تشریف لے گئے جب بہت دیر ہوگئی (اور واپس تشریف نہیں لائے) تو ہم گھبرا گئے کہ کہیں ہماری غیر موجودگی میں آپ کو تکلیف نہ پہنچادی جائے، اور سب سے پہلے گھبراہٹ میرے اوپر طاری ہوئی، چنانچہ میں آپ کو تلاش کرتا ہوا اس باغ تک آ گیا، (یہاں دروازہ نظر نہیں آیا) تو لومڑی کی طرح سکڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر داخل ہوگیا اور لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں، (یہ سن کر) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی دونوں جوتیاں نکال کر مجھے دیں، اور فرمایا: اے ابوہریرہ! جاؤ ان جوتیوں کو ساتھ لیجاؤ (تاکہ لوگ جان لیں کہ تم میرے پاس سے آئے ہو) اور باغ کے باہر جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ یہ گواہی دینے والا تمہیں ملے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دیدو، حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پیغام کو لیکر میں باہر نکلا تو) سب سے پہلے حضرت عمرؓ سے میری ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا ابوہریرہؓ یہ جوتیاں کیسی ہیں؟ میں نے کہا: یہ جوتیاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ جوتیاں (نشانی کے طور پر) دے کر اس لئے بھیجا ہے کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں تو اس کو جنت کی بشارت دیدوں، یہ سن کر عمرؓ نے میرے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا

کہ میں سرین کے بل نیچے گر پڑا، اور پھرانہوں نے کہا: ابوہریرہؓ! جاؤ، واپس چلے جاؤ، چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس لوٹ آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، ادھر عمرؓ کا خوف مجھ پر سوار ہی تھا کہ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آپہنچے، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حالت دیکھ کر پوچھا، ابوہریرہ کیا ہوگیا؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ میں آپ کا پیغام لیکر باہر نکلا تو سب سے پہلے میری ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ان تک پہنچایا، انہوں نے اسکو سنکر میرے سینے پر اس طرح ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل زمین پر گر پڑا اور انہوں نے کہا کہ: واپس چلے جاؤ، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (حضرت عمرؓ سے پوچھا) عمر! تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا یارسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان؛ کیا واقعی آپ نے ابوہریرہؓ کو اپنی جوتیاں دیکر اس لئے بھیجا تھا کہ جو شخص صدق دل اور پختہ اعتقاد کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہو، اسے جنت کی بشارت دے دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ایسا نہ کیجئے، مجھے ڈر ہے کہ لوگ کہیں اسی بشارت پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں (اور عمل کرنا چھوڑ دیں) اس لئے آپ ان کو ایسے ہی چھوڑ دیجئے، عمل میں لگے رہنے دیجئے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا (کہ ٹھیک ہے)'' پھر ان کو چھوڑ دو (عمل میں لگا رہنے دو)۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

واقعۂ حدیث:

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس لگی ہوئی تھی، صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ بھی تشریف فرما تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجلس سے کھڑے ہوئے اور کہیں تشریف لے گئے، جب کافی دیر ہوگئی تو صحابہ کو فکر لاحق ہوئی، کیونکہ مدینہ میں بھی دشمن بہت تھے، صحابہ گھبرائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں وہاں سے نکلے، ابوہریرہؓ بنونجار کے ایک باغ کے پاس پہنچے، اس کا دروازہ نہیں ملا تو پانی کی نالی میں سے اندر داخل ہوگئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا ہوا؟ ابوہریرہؓ نے پورا واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ باقی لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں، حضور صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنے نعل مبارک ان کو دیئے اور فرمایا کہ جو شخص صدقِ دل سے اللہ کی وحدانیت کی گواہی دے اس کو جنت کی بشارت سنادو، چنانچہ میں باہر نکلا سب سے پہلے عمرؓ سے میری ملاقات ہوئی، میں نے ان سے قصہ بتایا اس پر عمرؓ نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا جس سے میں سرین کے بل گر گیا اور مجھے واپس ہونے کا حکم دیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو میں نے واقعہ بیان کیا، اتنے میں عمرؓ بھی پہنچ گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو عمرؓ نے اقرار کیا اور عرض کیا کہ: لوگوں کو اس کی بشارت نہ سنائیں ورنہ وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ٹھیک ہے ان کو چھوڑ دو یعنی لوگوں کو اس کی اطلاع نہ دو۔

کلمۂ ایمان کی تصدیق واقرار پر دخول جنت کی بشارت:

اس حدیث میں بھی مذکورہ واقعہ کے ضمن میں کلمۂ ایمان کے فائدہ کو بیان کا گیا ہے کہ جو قلبی یقین وتصدیق کے ساتھ اس کا اقرار کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

کنا قعودا: قعود یا قاعد کی جمع ہے، یا مصدر ہے، مصدر قرار دیں تو مصدر کا حمل ذات پر لازم آئے گا، جو درست نہیں، اس لئے مصدر ہونے کی صورت میں قعود سے پہلے ذی مقدر ہوگا أی کنا ذی قعود اس صورت میں ذات کا حمل ذات پر ہوگا نہ کہ مصدر پر۔ (۱)

صحابہ میں ابوبکرؓ وعمرؓ کا مقام ومرتبہ:

ومعنا ابوبکر وعمر الخ: حضرت ابوہریرہؓ نے اہل مجلس میں سے صرف حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا تذکرہ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب کی عادت تھی کہ پوری جماعت کا نام لینے کے بجائے صرف اشراف وسربراہوں کا نام لیتے تھے اس سے پوری جماعت کی حیثیت سمجھ میں آجاتی تھی۔

بین اظہرنا: یہ جمع ہے ''ظہر'' کی، اور یہ لفظ تحسین کلام کے لئے بڑھایا گیا ہے، اصل عبارت ہے: **فقام من بیننا**، ملا علی قاریؒ نے فرمایا ہے کہ اس لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمارا سہارا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات مبارکہ تھی کہ ظہر سہارے کا ذریعہ ہے اور آپ ہی ہمارے سردار تھے۔ (۲)

---

(۱) المرقاۃ ۱/ ۱۹۱.

(۲) مرقاۃ المفاتیح /۱۹۱.

خشینا وفزعنا: علامہ طیبی نے کہا کہ یہ دونوں مترادف ہیں، ایک مترادف کا دوسرے مترادف پرعطف ہے، دونوں کے معنی ڈرنے کے ہیں[1] ملا علی قاری کا رجحان یہ ہے کہ دونوں کے مفہوم میں اعتباری فرق ہے، وہ یہ کہ خشیت کا تعلق قلب کے ساتھ اورفزع کا تعلق ظاہری اعضاء وجوارح کے ساتھ ہے، اعضاء وجوارح پرگھبراہٹ کے جوآثار ظاہر ہوں اس کو''فزع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[2]

ان تقتطع: اقتطاع کے معنی ہیں ایک شے کو دوسری شے سے جدا کردینا، یہاں پرمراد ہے''ان یصاب بمکروہ'' کہ مبادا کوئی تکلیف پہنچ جائے۔[3]

دوننا: یعنی ہماری غیر موجودگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی تکلیف پہنچے یہ ہمیں پسند نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے پہلے ہماری جانیں جانی چاہئیں۔

حتی أتیت حائطاً الخ: ''حائط'' سے مراد باغ ہے اہل عرب حفاظت کے مقصد سے باغ کی چہاردیواری بنایا کرتے تھے گویا باغ کے لئے دیوار لازم تھی، اس لئے لازم بول کر ملزوم مراد لیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کو کیسے معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم علمی مجلس سے اٹھ کر گئے تھے تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم باغ میں گئے ہوں گے، اور صحیح بات تو یہ ہے کہ عاشق کو معشوق کی بوآجاتی ہے اور اللہ مدد کرتا ہے۔

فلم اجد به باباً: سوال ہوتا ہے کہ دروازہ کیوں نہیں ملا؟ جواب یہ ہے کہ شدت فزع کی وجہ سے دروازہ نظر نہیں آیا، یا پھر دروازہ دیوار کے ساتھ اس طور سے لگا ہوا ہو کہ وہ محسوس نہ ہوسکا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے پوری دیوار کا چکر نہ لگایا ہو، اول وہلہ میں ہی نالی نظر آ گئی ہو، اوراسی سے داخل ہو گئے ہوں۔

والربیع الجدول: یہ حدیث کا جملہ نہیں بلکہ بعض رواۃ کی طرف سے ربیع کی تفسیر ہے، جدول بمعنی گول، نالی، چھوٹی نہر۔

---

(۱)طیبی طاب الله ثراه ۱/ ۱۸۵.

(۲)المرقاة ۱/ ۱۹۱.

(۳)شرح الطیبي ۱/ ۱۸۵.

من بئر خارجة : حافظ ابوموسی اصفہانی نے ان الفاظ کو تین طریقے سے ضبط کیا ہے:

(۱) ''بئر'' اور ''خارجۃ'' دونوں کو تنوین کے ساتھ پڑھا جائے، اس صورت میں دونوں موصوف صفت ہونگے، اور معنی ہوں گے کہ: ایسے کنویں سے جو باغ کے باہر تھا۔

(۲) ''بئر'' پر تنوین ہو اور ''خارجۃ'' میں صیغہ اسم فاعل کو مضاف کیا جائے ہا ضمیر کی طرف، اور جیم پر فتحہ پڑھا جائے ظرف یا حال ہونے کی بنا پر أي: بئر خارجَه، ضمیر کا مرجع حائط (باغ) ہوگا، أي: البير في موضع خارج عن الحائط یعنی نالی داخل ہورہی تھی ایسے کنوین سے جو باغ سے باہر تھا۔

(۳) ''بئر'' کی اضافت ''خارجۃ'' (تاء مدورہ کے ساتھ) کی طرف ہو، ''خارجۃ'' ایک شخص کا نام ہے، اس وقت خارجۃ غیر منصرف ہوگا اور اس پر فتحہ آئے گا، ترجمہ یہ ہوگا: وہ نالی خارجہ نامی شخص کے کنویں سے داخل ہورہی تھی۔

حافظ ابن صلاح نے پہلا ضبط نقل کیا ہے، اور امام نووی نے اسی کو مشہور کہا ہے۔ (۱)

فقال: أبوهريرة: اس میں ہمزۂ استفہام محذوف ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: أأنت أبوهريرة؟

یہ استفہام کیسا ہے؟ بعض نے کہا کہ یہ استفہام حقیقی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت استغراق کی کیفیت تھی اس لئے اول وہلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابو ہریرہؓ کو پہچان نہیں سکے اس لئے سوال کیا، بعض نے کہا کہ استفہام برائے تعجب ہے کہ باغ کا دروازہ بند ہے، پھر اندر کیسے آگئے؟ اس پر ابو ہریرہؓ نے واقعہ بیان کیا۔ (۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نعلین مبارکین عطاء فرمانا:

اذهب بنعليّ الخ: دونوں جوتوں کا دینا زیادتی اعتماد کے لئے تھا ورنہ ابو ہریرہؓ خود ثقہ تھے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سلامتی اور خیریت کے اظہار کے لئے ان کو جوتے دیئے ہوں، کیونکہ صحابہ آپ کے اس طرح چلے جانے اور واپس نہ آنے سے آپ کی جانب سے گھبراہٹ میں مبتلا تھے۔

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے دیئے کوئی اور چیز کیوں نہیں دی؟

(۱) بعض نے کہا کہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جوتوں کے علاہ کچھ اور نہیں تھا۔

(۱) شرح النووي ١ / ٤٥، والمرقاة ١ / ١٩١.

(٢) طيبي طاب الله ثراه ١ / ١٨٦.

(۲)بعض نے کہا کہ جوتے قدم میں پہنے جاتے ہیں اشارہ اس طرف تھا کہ کلمہ اس وقت مفید ہوگا جب کہ آدمی اس پر ثابت قدم رہے۔

(۳)بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوتے نکالے اس سے اشارہ تھا کہ میری شریعت میں قیدو بند اور مشکل احکامات نہیں ہیں۔

(۴)بعض نے کہا کہ امت کو یہ پیغام دینا تھا کہ جس طرح میں نے جوتے نکالے اسی طرح تمہیں بھی قلب سے دنیا کی محبت نکالدینی چاہئے۔ (۱)

فمن لقیک من وراء ھذا......الخ:مذکورہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ کو جو بشارت دے کر بھیجا تھا وہ کس کے لئے تھی؟ صرف انہیں صحابہ کے لئے جو آپ کو تلاش کرنے آئے تھے یا تمام امت کے لئے؟ اس میں شراح کے دونوں قول ہیں، تمام امت کے لئے ہونا راجح ہے، کیونکہ دیگر احادیث سے اس طرح کی بشارت تمام کے لئے ثابت ہے۔

حضرت عمر وابوہریرہؓ کے مابین مباحثہ:

فضرب عمر الخ:حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو مارا، یہاں مضمون میں اختصار ہے، ملاعلی قاری نے فرمایا کہ سیاق وسباق کا تقاضہ یہ ہے کہ یہاں دو جملے مقدر ہوں، وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو واپس جانے کے لئے فرمایا، حضرت ابوہریرہؓ نے ان کی بات نہیں مانی، اس پر حضرت عمرؓ نے تنبیہ کے طور پر ان کے سینہ پر ہاتھ مارا، یہ مارنا بطور تادیب وتنبیہ کے تھا، جیسے استاذ شاگرد کو تنبیہ کرتا ہے، کیوں کہ ابوہریرہؓ متعلم کے درجہ میں تھے اور حضرت عمرؓ معلم کے درجہ میں۔

اور یہ توجیہ بھی ہوسکتی ہے کہ حضرت عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر بھی تھے، ان کو عام صحابہ تک اس پیغام کا پہنچنا خلاف مصلحت معلوم ہوا، اس لئے انہوں نے ابوہریرہؓ کو اس سے روکنا چاہا، مگر ابوہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے پیش نظر ہر حال میں اس کو عام صحابہ تک پہنچانا چاہتے تھے، حضرت عمر کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ اس پیغام کو ضرور پہنچا کر رہیں گے، تو انہوں نے اپنے منصب کا استعمال کرتے ہوئے ان کو پیچھے کو دھکا دیا اور زبردستی ان کو واپس لوٹانے کی کوشش کی، ابوہریرہؓ کو عمر فاروقؓ سے اس طرز عمل کی توقع نہ تھی،

(۱)مرقاۃ المفاتیح ۱/ ۱۹۲ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند.

چنانچہ حضرت عمرؓ کی جانب سے اس خلاف توقع طرز عمل کے ظاہر ہونے کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس ہوئے اور پوری صورت حال بیان کی، واللہ اعلم

فخررت لإستي: ''اِستٌ'' بمعنی سرین، یعنی میں سرین کے بل پیچھے کو گر گیا۔

فأجهشت: اجہاش کے معنی ہیں روتے ہوئے فریاد کرنا، مرادی ترجمہ ہے: پھوٹ پھوٹ کر رونا۔

اِثری: بمعنی نشان قدم، اس میں بفتحتین اور بفتح الاول وسکون الثانی دونوں ضبط ہیں۔

أبعثت أباهريرة ......الخ : حضرت عمرؓ کے استفسار کا منشاء رفع اشتباہ تھا کہ ممکن ہے حضرت ابو ہریرہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کو سمجھ نہ سکے ہوں، بے اعتمادی منشاء نہ تھا۔

ایک سوال وجواب:

سوال: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دینے کے لئے بھیجا تھا تو حضرت عمرؓ نے کیوں روکا؟

جواب: وہ بشارت تو صحیح تھی، لیکن اس کا اظہار اس وقت مصلحت تھا یا نہیں؟ یہ غور طلب تھا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر استغراقی کیفیت تھی اور صفات جمالیہ کا غلبہ تھا اس لئے مصلحت پر نظر نہیں گئی اور بشارت سنانے کا حکم دیدیا، حضرت عمرؓ مظہر جلال تھے ان پر اس طرح کی کیفیت بھی نہیں تھی اور وہ آپکے مشیر بھی تھے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس لئے ان کو اس بشارت سے لوگوں کے ترکِ عمل کا اندیشہ ہوا، چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس مصلحت کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے اتفاق کیا اور اس بشارت کے سنانے سے منع کر دیا، اس کا حاصل یہ ہوا کہ امت کے روحانی معالجہ میں حضرت عمرؓ کی رائے بجائے مفرد دوا کے معجون مرکب کی تھی کہ ایمان بھی ہو اور اعمال بھی ورنہ لوگ صرف ایمان پر اکتفاء کر بیٹھیں گے۔

اس حدیث سے محض ایمان کا نجات کے لئے کافی ہونا ثابت ہوتا ہے اس میں حسب سابق نو جوابات جاری ہونگے۔[۱]

دوسرے کی زمین میں بلا اجازت داخل ہونا:

اس روایت سے معلوم ہوا کہ دوسرے کی زمین میں بلا صریح اذن داخل ہونا جائز ہے جب کہ دلالۃً

(۱)شرح الطیبی ۱/۱۸۷، والمرقاۃ ۱/۱۹۳، والمرعاۃ ۱/۱۱۰.

اجازت ہو، دلالۃً اجازت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مالک کے متعلق یقین یا ظن غالب ہو کہ معلوم ہونے پر اس کو ناگواری نہ ہوگی، جیسا کہ ابو ہریرہؓ اس انصاری کے باغ میں داخل ہو گئے، حالانکہ صریح اجازت نہیں تھی۔

۳۷/۳٦ وَعَنْ مُعَاذِ بِنِ جَبَلٍ قَالَ: قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "مَفَاتِيحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ أَنْ لاَإِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ" (رواه أحمد)(۱)

ترجمہ:-حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنت کی کنجیاں اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ (احمد)

تشریح حدیث

جنت کی چابی:

اس حدیث میں جنت کو تشبیہ دی گئی ہے شئ مقفل کے ساتھ، ایسی چیز جس پر تالا لگا ہو تو اس کے لئے چابی چاہئے: اور جنت کی چابی وحدانیت ورسالت کی شہادت ہے، جو اس کی شہادت دے گا اس کے لئے جنت کا تالا کھل جائے گا یعنی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

مبتدا وخبر میں عدم مطابقت کا اشکال:

مفاتیح الجنة شهادة لااله الا الله: اس جملہ میں "**مفاتیح**" مبتدا ہے اور "**شهادة**" خبر ہے، یہاں مبتدا اور خبر کے درمیان افراد وجمع میں یکسانیت نہیں ہے، حالانکہ دونوں میں مطابقت ضروری ہے، اس کے لئے مبتدا یا خبر میں سے کسی ایک میں تاویل کی جائے گی، چنانچہ مبتدا میں دو تاویلیں اور خبر میں بھی دو تاویلیں کی گئی ہیں، جانب مبتدا کی دو تاویلیں یہ ہیں:

(۱) مفاتیح اگرچہ لفظاً جمع ہے مگر معنیً واحد ہے، اس لئے کہ تالے کی چابی باعتبار نوعیت تو ایک ہی ہوگی اور لفظاً اس لئے جمع لایا گیا ہے کہ ایک چابی میں دندانے متعدد ہوتے ہیں۔

(۲) اہل عرب بعض مرتبہ مفرد کو جمع سے تعبیر کرتے ہیں جیسے مَعِيَ جِيَاعٌ (میرے ساتھ کئی بھوکی اونٹنیاں ہیں) حالانکہ اونٹنی ایک ہوتی ہے۔

---

(۱) أخرجه احمد ۵/۲٤۲ برقم ۲۲۱۵۵.

اورجانب خبر کی دوتاویلیں یہ ہیں:

(۱) شہادۃ جنس ہے، جنس کا اطلاق قلیل وکثیر سب پر ہوتا ہے لہٰذا یہاں شہادت سے جمع مراد ہے کیونکہ ہر شخص کے لئے الگ الگ شہادت ضروری ہے، اس صورت میں مطابقت ہوگئی۔

(۲) شہادۃ سے یہاں تثنیہ مراد ہے اسلئے کہ یہاں دوچیزوں کی گواہی مراد ہے ایک وحدانیت کی اورایک رسالت کی اورتثنیہ بھی جمع کے حکم میں ہوتا ہے الاثنان ومافوقهما جماعة۔(۱)

۳۸ / ۳۷ وَعَنْ عُثْمَانَؓ قال: إِنَّ رِجَالاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ تُوُفِّي حَزِنُوْا عَلَيْهِ،حَتّٰى كَادَ بَعْضُهُمْ يُوَسْوِسُ، قَالَ عُثْمَانُ وَكُنْتُ مِنْهُمْ، فَبَيْنَا أَنَاجَالِسٌ مَرَّعَلَيَّ عُمَرُ، وَسَلَّمَ، فَلَمْ أَشْعُرْبِهٖ، فَاشْتَكٰى عُمَرُ إِلٰى أَبِىْ بَكْرٍ رضى الله عنهما، ثُمَّ أَقْبَلا، حَتّٰى سَلَّمَا عَلَيَّ جَمِيْعاً،فَقَالَ أَبُوْبَكر: مَاحَمَلَكَ أَنْ لاتَرُدَّ عَلٰى أَخِيْكَ عُمَرَ سَلامَهٗ؟ قُلْتُ: مَافَعَلْتُ، فَقَالَ عُمَرُ:بَلٰى، وَاللّٰهِ لَقَدْ فَعَلْتَ، قَالَ: قُلْتُ وَاللّٰهِ مَاشَعَرْتُ أَنَّكَ مَرَرْتَ وَلاسَلَّمْتَ، قَالَ أَبُوْبكر: صَدَقَ عُثْمانُ، قَدْ شَغَلَكَ عَنْ ذٰلِكَ أَمْرٌ، فَقُلْتُ: أَجَلْ قَالَ مَاهُوَ؟ قُلْت:تَوَفَّى اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيَّهٗ صلى الله عليه وسلم قَبْلَ أَنْ نَسْأَلَهٗ عَنْ نَجَاةِهٰذَا الأَمْرِ، قَالَ أَبُوْبَكرٍ: قدسألته عن ذلك، فَقُمْتُ إِلَيْهِ وَقُلْتُ لَهٗ:بِأَبِىْ أَنْتَ وَأُمِّي ، أَنْتَ أَحَقُّ بِهَا، قَالَ أَبُوْبَكرٍ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَانَجَاةُ هٰذَا الأَمْرِ؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "مَنْ قَبِلَ مِنِّى الكلمةَ الَّتِىْ عَرَضْتُ عَلٰى عَمِّى فَرَدَّهَا، فَهِيَ لَهٗ نَجَاةٌ" (رواہ احمد(۲))

ترجمہ:-حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو صحابہ کرام پررنج وحزن کا غلبہ تھا حتی کہ یہ خطرہ پیداہوگیا تھا کہ بعض لوگ وسوسہ کے اندرمبتلا نہ ہوجائیں، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں میں سے ایک میں بھی تھا چنانچہ میں (غم کی حالت میں) بیٹھا تھا کہ حضرت عمرؓ میرے پاس سے گزرے اورسلام کیا، مجھے اس کا احساس نہ ہوا (کہ وہ کب میرے پاس سے گزرے اورکب سلام کیا) حضرت عمرؓ نے اس بات

(۱)المرقاة ۱ / ۱۹۵.

(۲)أخرجه احمد ۱ / ٦ برقم ۲۰ و ۲٤ ، ۱ / ۷برقم۳۷.

کی شکایت حضرت ابوبکرؓ سے کی، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں حضرات (میرے پاس) تشریف لائے اور دونوں حضرات نے مجھے سلام کیا، حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے پوچھا، تم نے اپنے بھائی عمرؓ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا تھا؟ میں نے عرض کیا ''میں نے تو ایسا نہیں کیا'' (یعنی مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ عمرؓ نے آ کر سلام کیا ہو اور میں نے جواب نہ دیا ہو) حضرت عمرؓ نے فرمایا: کیوں نہیں؟ خدا کی قسم تم نے ایسا کیا ہے (یعنی میرے سلام کا جواب نہیں دیا) حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا اللہ کی قسم مجھے بالکل اس کا احساس نہیں ہوا کہ آپ میرے پاس سے گزرے اور نہ ہی آپ نے سلام کیا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: عثمان سچ کہتے ہیں (لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) آپ کو کسی خاص معاملہ نے اس احساس سے روک دیا ہے (کہ نہ تو تمہیں عمرؓ کے آنے کی خبر ہوئی اور نہ تم ان کے سلام کا جواب دے سکے) میں نے عرض کیا: جی ہاں! ایسا ہی ہے، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے وفات دیدی، لیکن ہم آپ سے یہ دریافت نہ کر سکے کہ اس معاملہ سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (تم غم نہ کرو) میں اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر چکا ہوں، پس میں خوشی میں کھڑا ہو گیا اور میں نے ان سے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں واقعی آپ ہی (فضیلتوں اور کمالات میں سبقت لیجانے والے ہونے کی وجہ سے) یہ سوال کرنے کے زیادہ مستحق تھے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: میں نے عرض کیا تھا کہ: یا رسول اللہ! اس معاملہ میں نجات کی صورت کیا ہوگی؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے (خلوص دل کے ساتھ) مجھ سے وہ کلمہ توحید قبول کر لیا جسے میں نے اپنے چچا کے سامنے پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو رد کر دیا تھا تو وہ کلمہ اس شخص کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ (احمد)

تشریحِ حدیث

واقعۂ حدیث:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جب وفات ہوگئی تو بڑے بڑے صحابہؓ ہوش کھو بیٹھے، حتی کہ بہت سے

صحابہ کو وسوسہ آنے لگا کہ اب اسلام ختم ہوجائے گا، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی انہی لوگوں میں تھا، ایک جگہ میں اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا کہ عمرؓ میرے پاس سے گزرے اور سلام کیا، لیکن مجھے ان کے آنے کا اور سلام کا پتہ نہیں چلا، انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اس کی شکایت کی، پھر حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ دونوں میرے پاس آئے اور سلام کیا، حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ تم نے عمرؓ کے سلام کا جواب کیوں نہیں دیا؟ میں نے کہا کہ میں نے تو ایسا نہیں کیا، حضرت عمرؓ نے قسم کھا کر فرمایا کہ تم نے ایسا ہی کیا ہے، میں نے کہا کہ اللہ کی قسم آپ کے آنے کا اور آپ کے سلام کا مجھے پتہ نہیں چلا، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہاں عثمان سچ کہتے ہیں، کسی معاملہ میں غور وفکر کی وجہ سے ان کو پتہ نہیں چلا ہوگا، میں نے کہا: جی ایسا ہی ہے، حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا کہ تم کیا سوچ رہے تھے؟ تو میں نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے وفات دے دی، لیکن ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ معلوم کر سکے کہ اس امر سے نجات کیسے ہوگی؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اس امر کے بارے میں پوچھ چکا ہوں، تو میں ان کی طرف محبت میں لپکا اور میں نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ ہی اس سوال کے زیادہ حقدار تھے، آپ کو تمام فضیلتیں اور سبقتیں حاصل ہیں، پھر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا ''ما نجاة هذا الأمر؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اس کلمہ کو قبول کرلے جو میں نے اپنے چچا پر پیش کیا تھا جس کو انہوں نے رد کردیا تھا تو وہ کلمہ اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔

کلمۂ اسلام جہنم سے نجات کا وسیلہ:

اس حدیث میں کلمۂ اسلام کا فائدہ مذکور ہے کہ اس کلمہ میں ہر مشکل سے نجات ہے، حتی کہ جہنم سے بھی، جیسا کہ اوپر واقعہ سے معلوم ہوا۔

کاد بعضهم يوسوس: یہ وسوسہ انقطاعِ دین اور شریعتِ غراء کے نور کے بجھ جانے کا تھا جو بہت محنت ومشقت سے حاصل ہوا تھا۔

فاشتكى عمر إلى أبي بكر: سوال ہوتا ہے کہ سلام کا جواب نہ دینا کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ اس کی کسی سے شکایت کی جائے، پھر حضرت عمرؓ نے کیوں شکایت کی؟

جواب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کو محسوس ہوا کہ شاید عثمانؓ کے دل میں میری طرف سے کچھ خلش ہے،

جس کی بناء پر ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی ہے، اگر ابھی سے ہمارے اندر نفرت پیدا ہو جائے تو ہم اسلام کی کیا خدمت کریں گے، یہ بہت اہم بات تھی اور اعلی سوچ تھی اس لئے شکایت کی اور خود حضرت عثمانؓ سے اس لئے نہیں کہا کہ وہ اور ناراض ہو جائیں گے بلکہ حضرت ابوبکرؓ سے کہا، کیونکہ وہ دونوں کے بڑے تھے۔

باہمی نفرت وکدورت مٹانے کا ایک ادب وطریقہ:

اس سے معاشرت کا ادب معلوم ہوا کہ اگر دو ساتھیوں کے درمیان کوئی بات ہو جائے تو درمیان میں کسی عقلمند کو ڈال لینا چاہئے، اور کدورت ومیل کو ختم کر لینا چاہئے، ورنہ پھر وہ بغض وعداوت میں تبدیل ہو جائے گا اور دینی ودنیوی فساد پیدا ہوگا۔

عن نجاۃ هذا الأمر: اس کی مراد میں شراح کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ نجاۃ سے مراد: **نجاۃ عن نار جهنم** اور "**هذا الامر**" سے امر دین مراد ہے، یعنی اس دین میں جہنم سے نجات کا مدار کس چیز پر ہے؟ تو فرمایا کہ نجات کا مدار اس دین میں وہ کلمہ ہے جس کو میں نے اپنے چچا پر پیش کیا تھا۔

(۲) بعض نے کہا کہ "**هذا الامر**" سے مراد **ما علیه الناس من حب الدنیا والشهوات** ہے یعنی وہ حب دنیا اور شہوات جو لوگوں میں پائی جاتی ہیں، اس سے نجات کا کیا راستہ ہے، اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اس سے نجات کلمہ کے ذریعہ ملے گی۔

(۳) بعض نے کہا کہ "**هذا الامر**" سے مراد ہے وسوسہ کی وہ حالت جس پر صحابہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی وفات کے وقت تھے یعنی ہم لوگوں کو اگر کسی وقت انقطاع دین کا وسوسہ آنے لگے تو اس سے نجات کیسے حاصل ہوگی؟ اس کا جواب بھی وہی ہوگا۔[1]

الحاصل سوال میں کئی احتمال ہیں لیکن جواب تمام سوالوں کا ایک ہی ہے۔

فلم أشعر به: "به" کی ضمیر کا مرجع بعض نے کہا مرورِ عمر اور بعض نے کہا کہ اس کا مرجع ہے سلامِ عمر، راجح یہ ہے کہ اس کا مرجع دونوں چیزیں ہیں جو المذکور کی تاویل میں ہیں۔[2]

(۱) شرح المشکاۃ للطیبی ۱/۱۸۹.

(۲) مرعاۃ المفاتیح ۱/۳۰۵.

۳۹ / ۳۸ وَعَنِ الـمِقْدَادؓ أنه سمع رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "لايَبْـقٰـى عَـلٰى ظَهْرِ الأَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلاوَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الإِسْلَامِ بِعِزِّعَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ، إِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ أَهْلِهَا، أَوْيُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا" قُلْتُ: فَيَكُوْنُ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ. (رواہ أحمد)(۱)

ترجمه:- حضرت مقدادؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ روئے زمین پر کوئی گھر خواہ مٹی کا ہو یا اونٹ کے بالوں کا ایسا باقی نہیں رہے گا کہ جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو معزز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی رسوائی کے ساتھ داخل نہ کرے (پس جو لوگ خوشی سے اسلام قبول کریں گے) ان کو اللہ تعالیٰ معزز بنا کر اس کلمہ کا اہل قرار دے گا، یا حق تعالیٰ شانہ ان کو (جو بخوشی قبول نہ کریں) ذلیل کرے گا پھر وہ اس کلمہ کے تابع اور منقاد ہو جائیں گے (بایں طور کہ وہ جزیہ اداء کریں گے) میں نے (خوش ہوکر) عرض کیا پھر تو چاروں طرف اللہ ہی کا دین ہوگا۔ (احمد)

تشریحِ حدیث

احوال مقدادؓ:

مقداد بن عمرو بن ثعلبہ الکندی، ان کو مقداد بن اسود بھی کہا جاتا ہے، کندی؛ قبیلہ کی طرف نسبت ہے، لیکن آپ کندہ قبیلہ سے نہیں تھے بلکہ ان کے والد عمرو بن ثعلبہ کندہ قبیلہ کے حلیف تھے، اوران کی وہاں شادی ہوئی تھی، مقداد وہیں پیدا ہوئے تھے، ان کو مقداد بن اسود اس لئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بنو کندہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا اور بھاگ کر مکہ آگئے تھے، اور اسود بن عبد یغوث کے حلیف ہو گئے تھے، پھر اس نے ان کو متبنیٰ بھی بنا لیا تھا، اس وقت سے مقداد بن اسود کے نام سے پکارے جانے لگے، لیکن جب "**ادعوھم لآبـــائھـم**" آیت کریمہ نازل ہوئی تو پھر اپنے والد کی طرف منسوب کئے جانے لگے، قدیم الاسلام صحابی ہیں، تمام غزوات میں شریک ہوئے، غزوہ بدر میں صرف انہی کے پاس گھوڑا تھا، اس لئے "**اول من قاتَلَ**

(۱) مسند أحمد ۳۹ / ۲۳۶ (۲۳۸۱٤)

فی سبیل الله علی فَرَس ‘‘ کہلاتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن زبیر بن عبد المطلب کی صاحبزادی ضباعہ سے نکاح ہوا تھا۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ نے مجھے چار لوگوں سے محبت کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ بھی ان کو بتادو کہ اللہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے، مقداد، علی، ابوذر، اور سلمان فارسی، ان کے انتقال کا بھی عجیب واقعہ ہے، وہ یہ کہ لحیم وشحیم تھے، پیٹ موٹا تھا، غلام نے کہا کہ میں پیٹ چیر کر زائد چربی نکال دونگا، چنانچہ اس نے یہ عمل کیا اور اوپر سے ٹانکے لگادیئے، اسی وقت انتقال ہوگیا اور غلام ڈر کر فرار ہوگیا، ۳۳ھ میں خلافت عثمانی میں آپ کا انتقال ہوا ہے، حضرت عثمان بن عفانؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں مدفون ہوئے، آپ کی عمر مبارک (۷۰) سال ہوئی ہے۔ (۱)

کلمۂ اسلام ہر کچے پکے گھر میں پہنچے گا:

اس حدیث میں اسلام اور کلمۂ اسلام کے غلبہ کا بیان ہے، کہ ایک وقت آئے گا کہ یہ کلمہ ہر گھر میں پہنچے گا۔

صحابہ کرام مکہ میں پریشان تھے اور عبادات بھی چھپ کر ادا کرتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے کہ اسلام کا غلبہ ہوجائے گا اور کلمہ کی دعوت ہر گھر میں پہنچے گی، پھر اس کے بعد دو طرح کے لوگ ہوں گے: ایک وہ جو اس کلمہ کو بخوشی اور باعزت طریقے سے قبول کریں گے، اللہ ان کو مرتے دم تک ایمان پر قائم رکھ کر اور زیادہ عزت دے گا اور بعض ایسے ہوں گے جو کلمہ کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے، ایسے لوگوں سے جہاد کیا جائے گا یہ لوگ قتل وقید کے خوف سے اسلام قبول کرلیں گے اور اس کلمہ کے تابع ومنقاد ہوجائیں گے، پھر اللہ آہستہ آہستہ ان میں اخلاص پیدا فرمادے گا اور بہت سے لوگ مسلمان نہیں ہوں گے لیکن جزیہ دینے پر آمادہ ہوجائیں گے اور اسلامی سلطنت کی ماتحتی قبول کرلیں گے۔

الغرض ایک وقت میں اس طرح اسلام کا غلبہ قائم ہوجائے گا کہ یا تو لوگ خواہی نخواہی اسلام قبول

(۱) الإصابة ۵/ ۱۹۴-۱۹۵، وسیر اعلام النبلاء ۱/ ۳۸۵-۳۸۹، مرقاۃ میں حضرت مقداد کی عمر ۹۰ سال اور وفات ۳۷ھ میں لکھی ہے، بظاہر یہ تسامح ہے واللہ اعلم بالصواب.

کرلیں گے یا اس کی ماتحتی میں آجائیں گے، اور قرآن کریم کی یہ بات "لِیُظْہِرَہ علی الدینِ کلِّہ" سچی ثابت ہوجائے گی۔

کیا یہ پیش گوئی پوری ہوچکی؟

لایبقی علی ظھر الارض :ظہر الارض سے کیا مراد ہے؟ اور یہ پیشین گوئی پوری ہوچکی ہے یا ابھی پوری نہیں ہوئی؟ اس میں حضرات شراح کے متعدد اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ اس سے مراد جزیرۃ العرب ہے یعنی جزیرۃ العرب میں کوئی گھر ایسا باقی نہیں رہے گا، جس میں کلمہ کی دعوت نہ پہنچے اس قول کے لحاظ سے یہ پیش گوئی پوری ہوچکی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک اکثر جزیرۃ العرب موحد ہوگیا تھا، پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تمام جزیرۃ العرب موحد ہوگیا کہ آپ نے یہود کو بھی عرب سے جلاوطن کردیا تھا۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے تمام روئے زمین مراد ہے کہ دنیا کے ہر گھر میں کلمۂ اسلام داخل ہوگا یہ پیشین گوئی اس صورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ومہدی کے زمانہ میں پوری ہوگی، ابھی پوری نہیں ہوئی۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ اگر اس سے تمام دنیا مراد ہے تو بھی یہ پیشین گوئی پوری ہوچکی ہے، کیونکہ اسلامی تاریخ میں ایک زمانہ گزر چکا ہے کہ اسلامی حکومت سب سے بڑی حکومت تھی، اور اکثر غیر مسلم اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کرتے تھے، یہ خلفاء بنو عباسیہ کا دور تھا، مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید جب کسی بادل کو دیکھتے تو کہتے: تو کہیں بھی برس، تیرا فائدہ بہرحال مسلمانوں کو پہنچے گا۔ (۳)

(۴) بعض نے کہا کہ اس سے کلمہ کا قبول کرنا یا اس کی ماتحتی میں آنا مراد نہیں، بلکہ اسلام کا تعارف مراد ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ساری دنیا اسلام سے متعارف ہوجائے گی، اس لحاظ سے بھی یہ پیش گوئی پوری ہوچکی ہے، بالخصوص جب سے الیکٹرانک میڈیا کا وجود ہوا ہے تو اس کے توسط سے تمام دنیا اسلام سے واقف ہوچکی ہے۔

---

(۱) مرعاۃ المفاتیح ۱/۳۰۷ (۴۲)

(۲) تفسیر قرطبی ۱۴/۲۱۴ (التوبۃ: ۳۳) والدر المنثور ۴/۱۷۶.

(۳) مرعاۃ المفاتیح ۱/۳۰۷ (۴۲)

بیت مدرولاوبر :"مدر" جمع ہے مَدَرَةٌ کی بمعنی اینٹ، چونکہ شہرودیہات میں لوگ اینٹوں کے مکانات بنا کر رہتے ہیں اس لئے اس سے شہرودیہات کے مکانات مراد ہیں۔

"وبر" بمعنی اونٹ کے بال، عرب میں بہت سے لوگ جنگل میں رہتے تھے اوراونٹ کے بالوں کی ترپال بنا کر اس کا خیمہ بناتے تھے اور بعض لوگ براہ راست اونٹ کے بالوں کا خیمہ بناتے تھے، تواس سے مراد خیمے اورتنبو ہیں اورمطلب یہ ہے کہ ہرگھر میں خواہ وہ پکا ہو یا کچا، دائمی رہائشگاہ ہو یا عارضی، سب جگہ اسلام پہنچے گا۔

بعزعزیز وذل ذلیل: یہ متلبسة محذوف سے متعلق ہوکر حال ہے، اور"**کلمة الاسلام**" ذوالحال ہے۔

اما یعزهم الله ......الخ: یہ جملہ"**بعزعزیزوذل ذلیل**" کی تفسیر ہے۔

قلت فیکون الدین کله لله: ظاہر یہ ہے کہ اس کا فاعل راوی حدیث حضرت مقداد ہیں، انہوں نے یہ بات یاتو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی کہی یا پھر اپنے تلامذہ کے سامنے حدیث کے بیان کرتے وقت کہی۔(۱)

۴۰ / ۳۹ **وَعَنْ وَهْبِ بْنِ مُنَبِّهٍ قِيلَ لَهُ: أَلَيسَ لااِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مِفْتَاحُ الْجَنَةِ؟ قَالَ: بَلٰى! وَلٰكِنْ لَيسَ مِفْتَاحٌ إِلاَّ وَلَهُ أَسْنَانٌ،فَإِنْ جِئْتَ بِمِفْتَاحٍ لَهُ أَسْنَانٌ فتح لَكَ وَإِلاَّ لَمْ يُفْتَحْ لَكَ.** (رواہ البخاری فی ترجمۃ باب)(۲)

ترجمه: حضرت وہب بن منبہؒ سے مروی ہے: کسی نے ان سے سوال کیا کہ:"**لااله الا الله**" کیا جنت کی کنجی نہیں ہے؟ وہب علیہ الرحمہ نے کہا: کیوں نہیں، لیکن کوئی کنجی ایسی نہیں ہوتی جس کے دندانے نہ ہوں، پس اگرتم ایسی کنجی لے کرآؤگے جس میں دندانے موجود ہوں تو تمہارے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے ورنہ نہیں کھولے جائیں گے۔(بخاری)

---

(۱)مرقاۃ المفاتیح ۱ / ۱۹۷ — ۱۹۸۔

(۲)ذکرہ البخاری فی الصحیح تعلیقاً فی "الجنائز" ۱ / ۱۶۵، وفی تاریخه الکبیر وصلاً ۱ / ۹۵ برقم ۲۶۱.

تشریحِ حدیث

احوال وہب بن منبہ:

وہب بن منبہ (بصیغۃ الفاعل) ابوعبداللہ الصنعانی کبار تابعین میں سے ہیں، اسرائیلیات کے ماہر اور دنیا کی تاریخ اورانبیاء علیہم السلام اور بادشاہوں کے حالات کے عالم تھے، فرماتے تھے کہ میں نے بہتّر (۷۲) آسمانی کتب کا مطالعہ کیا ہے ۱۱۴ھ میں وفات ہوئی ہے۔ [۱]

روایت کا حال:

یہ روایت سنداً مقطوع ہے، فصل ثالث میں صاحب مشکوۃ کبھی مقطوع روایت کو بھی لاتے ہیں، جیسا کہ کتاب کے دیباچہ میں ذکر کیا گیا تھا۔

اعمال ایمان کی اہمیت:

اس حدیث میں اعمال ایمان کی اہمیت کا بیان ہے، ایک مرتبہ وہب بن منبہ اعمال کی ترغیب بیان کررہے تھے تو کسی نے سوال کیا کہ: کیا لاالہ الا اللہ مفتاح الجنۃ نہیں ہے؟ انہوں نے بہت معقول جواب دیا کہ لاالہ الا اللہ جنت کی چابی ہے، اس سے انکار نہیں، مگر ہر چابی کے لئے دندانے ہونے ضروری ہیں اگر چابی تو ہو لیکن دندانے نہ ہوں تو چابی کام نہیں کرے گی، اسی طرح لاالہ الا اللہ کی چابی کے ساتھ اعمال کے دندانے نہوئے تو جنت کا تالا کھلنے میں دقت پیش آسکتی ہے، پس اعمال صالحہ چابی کے لئے دندانے کے درجہ میں ہوئے۔

علماء نے فرمایا کہ یہ قاعدہ کلی نہیں بلکہ اکثری ہے، کیونکہ بعض چابیوں میں ایک بھی دندانہ نہیں ہوتا، اسی طرح بعض کی مغفرت صرف ایمان کی بنیاد پر ہوجائے گی، خواہ اعمال میں کتنی ہی کوتاہی ہو: اِن اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء.

۴۱ / ۴۰ وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ فَكُلُّ حَسَنَةٍ یَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰی سَبْعِ مِاْةِ ضِعْفٍ،

---

(۱) وفیات الأعیان (۶ / ۳۵)، الاعلام للزرکلی ۸ / ۱۲۵.

وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ بِمِثْلِهَا حتىّٰ لَقِيَ اللّٰهَ"(متفق عليه)(١)

ترجمه :-حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے ایمان کو اچھا بنالیتا ہے پھروہ جو بھی نیکی کرے گا وہ اس کے لئے دس گنا زیادہ لکھی جاتی ہے سات سو گنا تک، اوروہ جو برائی کرتا ہے تو وہ اس کے برابر لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

حسن اسلام کی وجہ سے نیکی کے ثواب میں اضافہ:

اس حدیث میں بھی کلمہ اسلام کی برکت اور اس کے فائدہ کا بیان ہے، جب کوئی شخص مسلمان ہوجائے اوراس کے اسلام میں اخلاص بھی آجائے تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اب ایک نیک کام پر دس گنا سے لیکر سات سو گنا تک اجروثواب ملتا ہے، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سات سو آخری حد ہے، یا اس سے بھی زائد ثواب مل سکتا ہے؟

چنانچہ علامہ ماوردی نے اس حدیث کی بناء پر فرمایا ہے کہ سات سو انتہاء ہے، اس سے زیادہ ثواب نہیں، مگر امام نووی نے علامہ ماوردی کی بات کو غلط قرار دیا ہے، اس لئے کہ بخاری ومسلم کی حدیث میں یہ الفاظ ہیں "**إلى سبع مائة ضعف إلى أضعاف كثيرة** "یعنی آدمی کے اخلاص اور نیکی کے مقام وزمانہ کے اعتبار سے سات سو سے زیادہ بھی ثواب ملتا ہے،(٢) جیسا کہ نماز کے متعلق روایات میں تفصیل ہے کہ گھر میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک نماز کا ہے، اور محلّہ کی مسجد میں ۲۵ یا ۲۷ نمازوں کا ثواب ہے، اورشہر کی جامع مسجد میں پانچ سو نمازوں کا، مسجد بیت المقدس میں ایک ہزار نمازوں کا، مسجد نبوی میں پچاس ہزار نمازوں کا اور مسجد حرام میں ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے، معلوم ہوا کہ حسنات کے مضاعف ہونے کے لئے سات سو کی تحدید نہیں ہے، بلکہ اس سے زیادہ اجر سے نوازا جاسکتا ہے، یہ نیکی کا حکم ہے، سیئہ کا حکم یہ ہے کہ ایک سیئہ پر صرف ایک گناہ لکھا جائے گا۔

---

(١)أخرجه البخاري في "الإيمان" ١ / ١١ برقم ٤٢ ومسلم في "الإيمان" ١ / ٧.

(٢)شرح النووي على مسلم ١ / ٧٩.

اذاأحسن احدكم اسلامه: احسانِ اسلام سے مراد اخلاص ہے اور مطلب یہ ہے کہ صدق واخلاص کے ساتھ اسلام میں داخل ہوجائے، اخلاص کی برکت سے حسنات مضاعف ہوتی چلی جاتی ہیں جس کی کوئی حدوانتہا نہیں ہے۔

حتی لقی اللہ: بعض علماء نے کہاہے کہ اس کا تعلق کل سیئۃ سے ہے کہ اس گناہ پراس کو سزا ملے گی یانہیں؟ اس کا علم ابھی نہیں ہوگا یہاں تک کہ بندہ اللہ سے جاملے، یعنی آخرت میں معلوم ہوگا، ممکن ہے اس پرسزا ملے اور ممکن ہے کہ اس کو بخشد یا جائے۔

بعض نے کہا کہ اس کا تعلق دونوں جملوں سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ معاملہ یعنی حسنہ کا ثواب سات سوگنا اور سیئہ پرصرف ایک گناہ بندہ کے ساتھ چند دنوں تک کے لئے نہیں، بلکہ پوری زندگی کے لئے ہے یہاں تک کہ وہ اللہ سے جاملے۔

٤٢ / ٤١ وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَؓ أَنَّ رَجُلاً سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: مَاالإِيْمَانُ؟ قَالَ: "إِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ، وَسَاءَتْکَ سَيِّئَتُکَ؛ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ" قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فما الإِثْمُ؟ قَالَ: إِذَا حَاکَ فِيْ نَفْسِکَ شَيْءٌ فَدَعْهُ "(رواہ احمد)[1]

ترجمہ:- حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے کہ: ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ایمان کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تیری نیکی تجھ کوخوش کرے اور تیری برائی تجھے غمگین کرے تو سمجھ لو کہ تم پکے مومن ہو، پھراس شخص نے پوچھا کہ: یارسول اللہ ! گناہ (کی علامت) کیاہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب کوئی کام تمہارے دل میں تردد پیدا کردے تو اس کو چھوڑدو (یعنی سمجھ لو کہ وہ گناہ ہے) (احمد)

تشریحِ حدیث

ایمان اورگناہ کی علامت وکسوٹی:

اس حدیث پاک میں علامت ایمان اورعلامتِ اثم کا بیان ہے، اور مضمون حدیث یہ ہے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: ماالإیمان ای ماعلامۃ الایمان؟ کیونکہ یہاں "ما" سے

(١)مسندأحمد ٥ / ٢٥١(٢٢٢١٣)

حقیقت کو معلوم کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی علامات جاننا مقصد ہے، اور ایمان سے مراد: کمال ایمان ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نیک کام سے خوشی اور برے کام سے رنج وغم ہو تو یہ کمال ایمان کی علامت ہے، اس لئے کہ نیکی وبرائی میں امتیاز کرنا مومن کا کام ہے، کافر کو اس کی تمیز نہیں ہوتی، ایسے ہی مومنِ فاسق بھی یہ امتیاز نہیں کر پاتا، کہ اس کو گناہوں کی عادت ہوجاتی ہے اس لئے گناہ کا احساس کم ہوتا چلا جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ مومن سے گناہ سرزد ہوجائے تو وہ مضطرب اور پریشان ہوجاتا ہے، اس کو ایسا لگتا ہے جیسے پہاڑ اس کے اوپر گر رہا ہے حتی کہ وہ توبہ کرلے، توبہ کے بغیر اس کو قرار حاصل نہیں ہوتا، اور فاسق گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے کہ ایک مکھی ناک پر بیٹھی تھی اس کو اڑادی، کوئی خاص احساس اس کو نہیں ہوتا۔(۱)

فما الإثم ؟ پھر اس شخص نے دوسرا سوال کیا کہ گناہ کی علامت کیا ہے؟ یعنی جو چیز ایسی ہو کہ اس کے بارے میں صریح نص موجود نہ ہو کہ یہ گناہ کی چیز ہے یا نہیں؟ تو ایسی چیز کے گناہ ہونے کی علامت کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ جب تیرے نفس میں کوئی چیز کھٹکے اور اس کے بارے میں تمہارے قلب میں تردد ہو تو یہ اس کے گناہ ہونے کی علامت ہے، لہٰذا اس کو چھوڑ دو۔

ایک حدیث میں مزید تفصیل وارد ہوئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**دع ما یریبک الی مالا یریبک**" یعنی مشتبہ چیز چھوڑ کر غیر مشتبہ کو اختیار کرو، ایک شخص نے کہا کہ: یارسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ مشتبہ کیا ہے اور غیر مشتبہ کیا ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ، کیونکہ قلب حرام کو انجام دیتے وقت مضطرب اور پریشان ہوتا ہے اور حلال کو انجام دیتے وقت پرسکون رہتا ہے۔(۲)

البتہ علماء میں اس میں اختلاف ہے کہ کیا مشتبہ اور کسی کام کے گناہ ہونے کی یہ علامت تمام مؤمنین کے حق میں ہے؟ یا قلوب ونفوس کا تزکیہ کراچکے اہلِ دل کے حق میں ہے؟ اکثر کی رائے یہ ہے کہ سب کے حق میں ہے اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ صرف ان اشخاص کے حق میں ہے کہ جن کے قلوب کا تزکیہ ہوچکا ہے، اس لئے کہ ان کے قلوب ہی خیر کی جانب مائل اور شر سے متنفر ہوتے ہیں جبکہ عام لوگ خیر کو شر اور شر کو خیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔(۳)

---

(۱)مشکوۃ ص ۲۰٦،باب الاستغفار والتوبة.

(۲)رواہ ابویعلی الموصلی فی مسندہ (۷٤۹۲)

(۳)شرح المصابیح لابن ملک ۳/ ۳۹۰.

۴۲ / ۴۱: وعن عمرو بن عبسةؓ ،قال: أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰه! مَنْ مَعَکَ عَلَى هٰذَا الْأَمْرِ؟ قَالَ: "حُرٌّ وعَبْدٌ" قُلْتُ: مَاالإِسْلَامُ؟ قَالَ: طِيْبُ الْكَلامِ، وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ قُلْتُ: مَاالإِيْمَانُ؟ قَالَ: "الصَّبْرُوَالسَّمَاحَةُ" قَالَ: قُلْتُ أَيُّ الإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهِ وَيَدِهِ قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الإِيْمَانِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: "خُلُقٌ حَسَنٌ" قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الصَّلٰوةِأَفْضَلُ؟ قَالَ: طُوْلُ الْقُنُوْتِ قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ الْهِجْرَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: أَنْ تَهْجُرَ مَاكَرِهَ رَبُّکَ،قَالَ: فَقُلْتُ أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ عُقِرَجَوَادُهُ،وَأُهْرِيْقَ دَمُهُ قَالَ: قُلْتُ: أَيُّ السَّاعَاتِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: جَوْفُ اللَّيْلِ الآخِرُ. (رواہ أحمد)(۱)

ترجمہ:-حضرت عمرو بن عبسہؓ سے مروی ہے: فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا (جب آپ نے دعوت کا کام شروع فرمایا) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور کون تھا اس دین پر؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے ساتھ ایک آزاد (یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ) اور ایک غلام (حضرت بلالؓ) تھے، پھر میں نے عرض کیا کہ: اسلام کی علامت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عمدہ کلام اور کھانا کھلانا، (پھر) میں نے عرض کیا کہ: ایمان کی علامت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: صبر اور سخاوت اختیار کرنا، (پھر) میں نے عرض کیا کہ: کونسا مسلمان افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: وہ مسلمان بہتر ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کی ایذاء) سے مسلمان محفوظ رہیں (پھر) میں نے عرض کیا کہ: ایمان کا کونسا کام افضل ہے؟

(۱) أخرجه احمد ۴ / ۱۱۱ برقم ۱۷۰۵۹ و ۴ / ۱۱۲ برقم ۱۷۰۶۰ و ۴ / ۱۱۴ برقم ۱۷۰۶۸ و ۱۷۰۶۹ و ۴ / ۳۸۵ برقم ۱۹۴۵۱، ۱۹۴۵۲، ۱۹۴۵۳، ۱۹۴۵۴۔

قلت: قد عزاه صاحب المشكاة إلى مسند احمد، وقد أخرجه أيضاً مسلم فی "الصلوة، باب الأوقات التی نهي عن الصلوة فيها" ۱ / ۲۷۶، والترمذی فی "الدعوات، باب فی انتظار الفرج وغيرذلک ۲ / ۹۸، والنسائی فی "الصلوة باب النهی عن الصلاة بعد العصر ۱ / ۹۶ وأيضاً فی "الصلاة ، باب إباحة الصلاة إلى أن يصلي الصبح ۱ / ۹۷، وابن ماجه فی "السهوفی الصلاة، باب ماجاء فی الساعات التی تكره فيها الصلاة ۱ / ۸۸ وأيضاً فی " كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء فی أی ساعات الليل أفضل ۱ / ۹۷ وأيضاً "الجهاد ، باب القتال فی سبيل الله ۱ / ۲۰۰"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''اچھے اخلاق'' (پھر) میں نے عرض کیا کہ: نماز میں کونسی چیز افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''طویل قیام کرنا'' پھر میں نے سوال کیا: کونسی ہجرت افضل ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''افضل ہجرت یہ ہے کہ: جو چیزیں تیرے رب کو پسند نہیں ان کو چھوڑ دو، پھر میں نے عرض کیا: کونسا جہاد افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''جس میں آدمی کا گھوڑا بھی زخمی کردیا جائے اور خود اس کا بھی خون بہادیا جائے'' (پھر) میں نے عرض کیا: سب سے افضل وقت کونسا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا ''شب کا نصف آخر'' (احمد)

تشریحِ حدیث

تعارف عمرو بن عبسہ:

عمرو نام ہے، ابونجیح کنیت ہے، قبیلہ بنوسُلَیم کے تھے، اس لئے سُلمی کہلاتے ہیں، قدیم الاسلام صحابی ہیں، چوتھے نمبر پر ایمان لائے، خود کہا کرتے تھے کہ: انی لَرُبُعُ الاسلام یعنی میں اسلام کا چوتھائی حصہ ہوں، چوتھے نمبر پر ایمان لایا ہوں، اور فرماتے تھے کہ اسلام کی آمد سے پہلے ہی میں لوگوں کو ضلالت اور گمراہی پر سمجھتا تھا، اسی لئے میں نے بت پرستی ترک کردی تھی، ان کو معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو مکہ مکرمہ آئے اور مسلمان ہوگئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کے اعمال بتا کر انکے قبیلہ میں بھیج دیا اور فرمایا کہ جب ہمارے غلبہ کی خبر سنو اس وقت میرے پاس آجانا، چنانچہ ۷ھ میں فتح خیبر کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ پہنچے۔(۱)

اسلام اور اعمال اسلام کے بارے میں ایک صحابی کے سوالات:

اس حدیث پاک میں اعمال اسلام کا بیان ہے، راوی حدیث حضرت عمرو بن عبسہ کو علمی باتیں معلوم کرنے کا بہت شوق تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے کئی سوالات کئے جو ایمان، اسلام و اعمال اسلام سے متعلق تھے، کوئی ضروری نہیں کہ انہوں نے یہ تمام سوالات ایک ساتھ کئے ہوں، بلکہ ممکن ہے

(۱) الإصابة ٤/٤٩ (٥٩٠٢)

مختلف اوقات میں اور متعدد مرتبہ میں کئے ہوں، یہ نو سوال ہیں اور ہر سوال مستقل حدیث کے درجہ میں ہے، لہٰذا حکماً یہ نو حدیثیں ہوئیں۔

أتیت رسول الله صلی الله علیه وسلم : مطلب یہ ہے کہ میں اپنے قبیلہ سے ہجرت کر کے مدینہ آیا۔

حضور ﷺ کا ساتھ دینے والے:

من معک علی هذا الامر؟ شراح نے فرمایا ہے کہ اس سوال کا تعلق ماضی و مستقبل دونوں سے ہوسکتا ہے، ماضی سے تعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ابتدا میں دین اسلام کے بارے میں آپ کی موافقت کون کررہا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ایک آزاد اور ایک غلام یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت بلالؓ اور بعض نے کہا کہ غلام سے حضرت زید بن حارثہؓ مراد ہیں، اسلام لانے میں علی الاطلاق سبقت تو حضرت خدیجہؓ کو حاصل ہے لیکن وہ عورت تھیں ان کا معاملہ لوگوں میں زیادہ مشہور نہ تھا اس لئے اس موقعہ پر ان کا تذکرہ نہیں کیا۔

حضرت عمرو بن عبسہ کے اس سوال کا تعلق مستقبل سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ آپ کے دین میں کون داخل ہوں گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر قسم کے لوگ دین میں داخل ہونگے، آزاد بھی اور غلام بھی۔

اسلام کے شعبے:

قلت: ما الإسلام؟: یہ دوسرا سوال ہے، مقصود شُعَبِ اسلام کے بارے میں سوال کرنا ہے ای ماشُعَبُ الاسلام، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزیں بتائیں، نرمی سے گفتگو کرنا اور لوگوں کو کھانا کھلانا۔

ایمان کے ثمرات:

ما الإیمان؟ تیسرا سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ یہاں بھی حقیقت مقصد نہیں، بلکہ ایمان کا نتیجہ و ثمرہ معلوم کرنا مقصود ہے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صبر اور سخاوت۔

صبر و سخاوت کا مفہوم:

صبر کے معنی ہیں حبس النفس علی ما تکرہ یعنی جو امور نفس کو ناگوار ہوں نفس کو ان پر جمانا

اورثابت رکھنا، اوراس کی تین قسمیں ہیں (۱) صبر علی الطاعات: یعنی جی نہ چاہنے کے باوجود طاعات انجام دینا، (۲) صبر عن المعاصی: یعنی جی چاہنے کے باوجود معصیتوں سے رکنا، (۳) صبر علی البلایا: یعنی جانی یا مالی نقصان ہوجانے پر اس کا شکوہ نہ کرنا۔

اور سخاوت یہ ہے کہ خود دنیا سے اعراض کرے اور اپنے پاس جو کچھ ہو وہ دوسروں پر خرچ کرے۔

افضل ترین مسلمان:

ای الاسلام افضل: چوتھا سوال کیا کہ کونسا اسلام یعنی کون سا مسلمان افضل ہے؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ مسلمان افضل ہے جو بے ضرر ہو، ماقبل میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

افضل ترین خصلت:

قلت ای الایمان أفضل: پانچواں سوال کیا کہ ایمان کی کونسی خصلت افضل ہے؟ کیونکہ معنی یہ ہیں **ايُ خصال الایمان افضل** تو فرمایا کہ خلق حسن، عموماً اس کا مطلب طیب کلام سمجھا جاتا ہے، لیکن علماء نے فرمایا کہ خلق حسن کے معنی طیب کلام میں منحصر نہیں ہیں، بلکہ اس میں پوری شریعت پر عمل داخل ہے یعنی تمام اوامر کا امتثال اور تمام نواہی سے اجتناب ہو۔

اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی شہادت دی ہے: **انک لعلی خلق عظیم**، حضرت عائشہؓ کے ایک شاگرد نے ان سے سوال کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا **کان خلقه القرآن ای کان یمتثل الأوامر ویجتنب النواهی** اس کے عموم میں طیب کلام اور اور طلاقت وجہ بھی داخل ہے۔

افضل ترین نماز:

ای الصلوة أفضل؟ عمرو بن عبسہؓ نے ایک سوال یہ کیا کہ کون سی نماز افضل ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس میں طول قنوت ہو، قنوت کے متعدد معنی ہیں: قیام، قرات، خشوع وغیرہ، یہاں قیام مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جس نماز میں قیام طویل ہو وہ افضل ہے۔

طول قیام افضل ہے یا کثرت سجود:

یہ مسئلہ علماء کے درمیان اختلافی ہے کہ نماز میں طول قیام افضل ہے یا کثرت سجود؟ عندالجمہور طول

قیام افضل ہے اور بعض علماء کے نزدیک کثرت سجود افضل ہے، اس کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوگا جب کوئی شخص نفل نماز کے لئے کچھ وقت متعین کرے مثلاً بیس منٹ متعین کئے اگراس میں طول قیام کو اختیار کرے تو بیس منٹ میں چار رکعت ادا ہوں گی اور کثرت سجود سے مثلاً سولہ رکعات ادا ہوں گی، ایسی صورت میں جمہور کے یہاں طولِ قیام والی چار رکعات کو اولویت حاصل ہوگی، دلیل یہی حدیث ہے، دیگر حضرات کی دلیل آگے آئے گی۔

افضل ترین ہجرت:

قلت ای الھجرۃ افضل؟ ایک سوال یہ کیا کہ کون سی ہجرت افضل ہے؟ یہ اس لئے پوچھا کہ ہجرت کی کئی قسمیں ہیں ظاہری باطنی وغیرہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہجرت باطنی افضل ہے، کیونکہ ہجرت ظاہری کا مقصود بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے وطن کو چھوڑ کر اسلامی ماحول میں آجائے اور وہاں رہ کر احکام الٰہیہ کو بجالاوے۔

افضل ترین جہاد:

فقلت ای الجھاد افضل؟ ایک سوال کیا کہ کون سا جہاد افضل ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جس میں گھوڑا زخمی ہوجائے اور خود کا خون بھی بہہ جائے یعنی جان و مال دونوں کی قربانی دے۔

''جواد'' بمعنی عمدہ گھوڑا، اھریق کی اصل تھی، اُریق: جو باب افعال سے ہے، ہاء کا اضافہ مبالغہ کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

افضل ترین وقت:

قلت ای الساعات افضل: ایک سوال کیا کہ کون سا وقت طاعت کے لئے افضل ہے؟ طاعت سے نفل نماز مراد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نوافل کے لئے رات کا نصف اخیر افضل ہے، اس لئے کہ اس وقت نیند سے بیدار ہونا اشق علی النفس ہوتا ہے، نیز اس وقت ملائکہ کا نزول ہوتا ہے، رحمت الٰہی بکثرت نازل ہوتی ہے اور مخلوق سے تخلیہ ہوتا ہے۔

''جوف'' کے معنی بیچ اور درمیان کے ہیں شی درمیان میں پہنچ کر نصف ہوجاتی ہے اس لئے جوف کا مرادی ترجمہ نصف سے ہوتا ہے، ''الآخر'' جوف کی صفت ہے یعنی رات کا نصف اخیر۔

۴۳/ ۴۲: وَعَنْ معاذ بن جبلؓ ، قال :سمعتُ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقول: مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لايُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا، وَيُصَلِّي الْخَمْسَ، وَيَصُوْمُ رَمَضَانَ؛ غُفِرَلَهٗ"قُلْتُ: أَفَلا أُبَشِّرُهُمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا"(رواہ احمد)(۱)

ترجمه :-حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: جوآدمی اللہ تعالیٰ شانہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کوشریک نہیں کیا اور پانچوں وقت کی نماز پابندی سے پڑھتارہا اوررمضان المبارک کے روزے رکھتارہا تو اس کی مغفرت اوربخشش کردی جائے گی، میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول کیامیں لوگوں کو یہ بشارت سنادوں؟ آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشادفرمایا:"لوگوں کو(ان کے حال پر) چھوڑدوتاکہ وہ عمل کرتے رہیں"(احمد)

تشریح حدیث

حضرت معاذ بن جبل کی اس مضمون کی حدیث پہلے گزرچکی ہے جس میں کلمۂ ایمان کے فائدہ کا بیان تھا، اسی کاخلاصہ یہاں بیان کیا گیاہے، البتہ یہاں دوباتیں یادرکھنے کی ہیں: ایک یہ کہ اس حدیث میں جن اعمال کا تذکرہ ہے وہ بطورمثال ہے، اورمطلب یہ ہے کہ جوشخص تمام فرائض وواجبات بجالانے کے بعد اللہ سے ملاقات کرے گا اس کے سب گناہ معاف کردیئے جائیں گے، دوسرے یہ کہ مغفرت سے صغائر کی معافی مراد ہے، البتہ اداء فرائض وواجبات کے ساتھ توبہ بھی شامل ہوجائے تووہ کبائر بھی معاف ہوجائیں گے جوازقبیلِ حقوق اللہ ہیں اورحقوق العباد کی معافی اداءحقوق کے بغیرنہیں ہوگی، یاپھر اللہ اپنی جانب سے ان حقوق کی ادائیگی فرمادے۔

۴۴/ ۴۳: وَعَنْهُ أَنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَفْضَلِ الإِيْمَانِ؟ قَالَ: "أَنْ تُحِبَّ لِلّٰهِ، وَتُبْغِضَ لِلّٰهِ، وَتُعْمِلَ لِسَانَكَ فِيْ ذِكْرِاللّٰهِ "قَالَ: وَمَاذَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "وَأَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَاتُحِبُّ لِنَفْسِكَ، وَتَكْرَهَ لَهُمْ مَاتَكْرَهُ لِنَفْسِكَ" (رواہ احمد(۲))

(۱)مسند أحمد بن حنبل ۵/ ۲۴۶برقم :۲۲۱۸۳و۲۲۱۸۵.

(۲)أخرجه أحمد ۵/ ۲۴۶برقم:۲۲۱۸۳و۲۲۱۸۵.

ترجمہ:-حضرت معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ایمان کے بارے میں دریافت کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم (کسی سے) محبت کرو تو اللہ کے لئے اور (کسی سے) بغض رکھو وہ بھی اللہ کے لئے اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھو، حضرت معاذؓ نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! اس کے علاوہ اور کیا کروں میں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو اور جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہی دوسروں کے لئے ناپسند کرو۔ (احمد)

تشریح حدیث

افضل ترین اعمالِ ایمان:

اس روایت کے راوی بھی حضرت معاذ بن جبل ہیں، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ایمان کے بارے میں سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی باتیں فرمائیں کہ: اللہ کے لئے ہی محبت کرے اور اسی کے لئے نفرت کرے اور اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھے۔

''**تعمل**'' مضارع باب افعال سے ہے، استعمال کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ زبان اللہ کے ذکر کی عادی ہو جائے، اس کا کمال درجہ تو یہ ہے کہ قلب بھی ذکر میں مشغول رہے، حضور قلب کے ساتھ ذکر ہو، حضور قلب نہ ہو تب بھی زبان کا ذکر میں مشغول رہنا اللہ کی عبادت اور بڑی عنایت ہے کہ ایک عضوء کو اللہ نے عبادت میں لگا رکھا ہے اس پر شکر ادا کیا جائے تو اس میں ترقی ہوگی پھر حضور قلب بھی میسر ہوگا۔

اللہ کا نام غفلت کے ساتھ بھی اثر رکھتا ہے:

حضرت گنگوہیؒ ایک مرتبہ تخلیہ سے باہر تشریف لائے پوچھا کوئی ہے؟ مولانا یحییٰ صاحبؒ (حضرت شیخ زکریاؒ کے والد محترم) موجود تھے تو ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ اللہ کا نام کتنی ہی غفلت کے ساتھ لیا جائے اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔

دوسروں کے لئے پسند و ناپسند کا معیار:

قال: وماذا یارسول الله؟ پھر حضرت معاذؓ نے پوچھا کہ ان اعمال کے بعد کیا عمل ہے؟ حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تو لوگوں کے لئے اسی چیز کو پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرے اور جو اپنے لئے ناپسند کرے وہ دوسروں کے لئے بھی ناپسند کرے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس شخص کے دل میں کسی کی طرف سے حسد نہیں ہے بلکہ اس کے قلب میں اللہ کی مخلوق کے لئے شفقت اور ترحم کا جذبہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بہت پسند ہے۔

باب الکبائر وعلامات النفاق

باب الکبائر، کتاب الایمان کا دوسرا باب ہے،اس باب میں کبائر اور علامات نفاق کا بیان ہے، کبائر ونفاق کا تعلق ایمان سے باعتبار ضد کے ہے، جب کبائر ونفاق معلوم ہوں گے تو ایمان نکھر کر سامنے آئے گا، کیونکہ قاعدہ ہے: **تعرف الاشیاء بأضدادها**، ترجمہ میں دو لفظ ہیں کبائر اور علامات نفاق، دونوں سے متعلق چند باتیں پیش ہیں، کبائر سے متعلق تین ابحاث ہیں: (۱) تقسیم الذنوب الی الصغائر والکبائر، (۲) حد الصغیرۃ والکبائر، (۳) تعداد الکبائر۔

(۱) تقسیم الذنوب الی الکبائر:

کبائر : **کبیرۃ** کی جمع ہے بمعنی بڑی چیز، پھر یہ لفظ علم ہو گیا بڑے گناہوں کا، اصطلاح شرع میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے بڑے گناہ مراد ہوتے ہیں، لہٰذا ترجمہ میں ''ذنوب'' کا لفظ مقدر ہے، عبارت یہ ہوگی: **باب ذنوب الکبائر**.

علماء کا اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ گناہوں کی تقسیم صغائر وکبائر کی طرف ہے یا نہیں؟ قاضی عیاضؒ نے محققین کا مذہب یہ نقل کیا ہے کہ تمام گناہ بڑے ہیں، ابو اسحاق اسفرائنی بھی اسی کے قائل ہیں، اس لئے کہ ہر گناہ میں حق جل وعلا کی نافرمانی ہے جو بڑی عظمت اور بڑی قدرت وسلطنت والا ہے، ایسی ذات کی نافرمانی بڑی خطرناک چیز ہے، اس لئے ہر معصیت کبیرہ ہے، لیکن جمہور علماء، محدثین اور فقہاء تقسیم کے قائل ہیں، جمہور فرماتے ہیں کہ اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اگرچہ ہر نافرمانی بڑی ہے، مگر یہاں مقصود گناہوں کا باہم تقابل ہے، یعنی جب ایک گناہ کا دوسرے گناہ سے تقابل کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک گناہ بڑا ہے اور ایک چھوٹا ہے، مثلاً لمس اور زنا کا تقابل کیا جائے تو ظاہر ہے کہ زنا بڑا گناہ ہے لمس سے؛ اسی طرح چوری کرنا اور اس کے لئے چلنا، چوری کرنا بڑا گناہ ہے اور اس کے لئے چلنا اس سے چھوٹا گناہ ہے۔

یہ تقسیم خود قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لایُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَلاکَبِیْرَۃً اِلَّا أَحْصَاھَا، (۱) وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبَائِرَ الاثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّااللَّمَم، (۲) إِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَمَاتُنْھَوْنَ عَنْہُ نُکَفِّرْعَنکُمْ سَیِّئَاتِکُم (۳) امام غزالیؒ نے ''البسیط'' میں فرمایا ہے: ''انکارُ الفرقِ بین الصغیرۃِ والکبیرۃِ لایلیقُ بالفقہِ وقد فُھِما من مَدارکِ الشرعِ'' (۴) یعنی صغیرہ وکبیرہ کے فرق کا انکار عقل ودانش کے خلاف ہے اور یہ دونوں نصوص شرع سے ثابت ہیں۔

(۲) حدالصغیرۃ والکبیرۃ:

قرآن وحدیث میں صغیرہ اور کبیرہ کی تعریف بیان نہیں کی گئی، البتہ اللہ تعالیٰ نے بعض گناہوں کو زیادہ سختی کے ساتھ بیان کیا اور بعض پر اتنی سختی نہیں آئی، اسی طرح بعض پر لعنت وغضب کا لفظ آیا ہے اور بعض پر نہیں، بعض گناہوں کی دنیا میں حد متعین کردی گئی ہے اور بعض کی نہیں، علماء نے ان تمام چیزوں پر غور فرما کر اپنے اپنے اعتبار سے کبیرہ وصغیرہ کی تعریف کی ہے، جوذیل میں درج ہے:

(۱) ابن عباسؓ وحسن بصریؒ سے مروی ہے کہ ہر وہ گناہ جس پر لعنت غضب یا عذاب کا تذکرہ ہو وہ کبیرہ ہے اور اس کے علاوہ تمام صغیرہ ہیں۔ (۵)

(۲) بعض نے کہا کہ جو گناہ طاعات سے معاف ہوجائیں وہ صغیرہ ہیں اور جو طاعات سے معاف نہ ہوں وہ کبیرہ ہیں۔ (۶)

(۳) علامہ ابن قیم نے فرمایا کہ جن معاصی کا مفسدہ لذاتہ ہو وہ کبیرہ ہیں جیسے زنا اور جن کا مفسدہ لذاتہ نہ ہو وہ صغیرہ ہیں جیسے قُبلہ وبوسہ اور المشی للسرقہ. (۷) حضرت نانوتوی اور حضرت شیخ الہند رحمہما اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۱) الکھف:۴۹.
(۲) النجم:۳۲.
(۳) النساء:۳۱.
(٤) شرح النووي علی مسلم ۱/٦٤ (۱٤٤)، و"فتح الباری" ۱۰/٤۷٦ (۵۹۷٦)
(۵) فتح الملھم ۲/٤۷.
(٦) فتح الباری ۱۰/٤۷٦ (۵۹۷٦)
(۷) مدارج السالکین لابن القیم ۱/۳۲٤.

(۴)امام سدی نے فرمایا کہ گناہ کا مقدمہ صغیرہ ہے اور خود گناہ کبیرہ ہے۔[۱]

(۵) امام ابوالحسن الواحدی فرماتے ہیں: حدالکبیرۃ غیر معروف، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے بعض گناہوں کی صفت کبیرہ اور بعض کی صغیرہ بیان کی اور بعض کو مطلق رکھا، صغیرہ اور کبیرہ کی تعریف کے لئے کوئی اصول مقرر نہیں فرمایا۔[۲]

(٦)علامہ آلوسی نے روح المعانی میں ایک جامع تعریف نقل کی ہے کہ: کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس پر قرآن وحدیث میں وعید، حد یا لعنت آئی ہو، یا اس کا مفسدہ اس گناہ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہو جس پر وعید، حد یا لعنت وارد ہوئی ہو۔[۳]

(۷)بعض نے کہا **لاکبیرۃ مع الاستغفار ولاصغیرۃ مع الإصرار.**[۴]

(۳) تعداد الکبائر:

کبائر کی تعداد بھی قرآن وحدیث میں بیان نہیں کی گئی، بعض احادیث میں تین کا، بعض میں پانچ، بعض میں سات کا تذکرہ ہے، لیکن انہی میں انحصار مقصود نہیں، اصلاً شریعت میں ان کی تعداد متعین نہیں ہے اوراسی میں مصلحت بھی ہے ورنہ صغائر کا ارتکاب لوگ بے دھڑک کرتے، البتہ احادیث کی روشنی میں بعض نے تعداد متعین کی ہے، بعض نے تین بعض نے چار، بعض نے سات، بعض نے سترہ اور بعض نے ستر کہاہے۔[۵]

نفاق کے معنی:

ترجمہ کا دوسرا جز علامات النفاق ہے، **علامات** جمع ہے **علامة** کی **ای مایُعْلَم به الشئُ،**
نفاق: باب مفاعلت کا مصدر ہے، اس کے کئی معنی ہیں:

---

(۱)مدارج السالکین لابن القیم ۱/ ۳۲۳.

(۲)روح المعاني۳/ ۱۸.

(۳)روح المعاني ۳/ ۱۸.

(٤)شرح النووی علی مسلم ۱/ ٦۳، التیسیر بشرح الجامع الصغیر ۲/ ۵۰۲.وروی هذا أیضاً عن الشیخ أبی محمد بن عبدالسلام،(التعلیق الصبیح ۱/ ۵۰)

(٥)لینظر: مدارج السالکین ۱۰/ ۳۲۰ومابعدها.

(۱) یہ نفق سے ماخوذ ہے بمعنی ختم ہونا، نفاق کی وجہ سے بھی منافق کے اعمال حبط اور ختم ہوجاتے ہیں۔ [۱]

(۲) بعض نے کہا کہ یہ ماخوذ ہے ''نفقت السوق'' سے بمعنی گرم بازاری یعنی بازار میں خوب بیع وشرا ہونا، منافقین بھی گرم بازاری کرتے ہیں کہ کبھی مسلمانوں کے پاس جاتے ہیں اوران سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور کبھی کافروں کے پاس جاکر ان سے کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ [۲]

(۳) بعض نے کہا کہ یہ نافِقاء الفار سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں جنگلی چوہے کا سوراخ، جنگلی چوہا زمین میں لمبا سوراخ کرتا ہے اندر اندر زمین کو دور تک کھود دیتا ہے، حتی کہ دوسری جانب بھی سوارخ بنالیتا ہے اور پھر اس دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کہاں سے داخل ہوا تھا، پھر وہ سخت متحیر ہوتا ہے، اسی لئے چوہا نسیان میں ضرب المثل ہے، پس نفاق کے معنی ہوئے متحیر ہونا، منافقین بھی اپنے معاملہ میں متحیر اور حیران رہتے تھے کما قال اللہ تعالیٰ: وَهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ. [۳] (وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں) كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا. [۴] یعنی جب بجلی ان کے لئے روشنی پیدا کرتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب اندھیرا کرتی ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔ [۵]

عرف میں نفاق کے معنی ہیں: اظہار خلاف الباطن اور اصطلاح شرع میں نفاق کا حاصل ''إبطان الکفر وإظهار الإسلام'' ہے۔ [۶]

منافق کی قسمیں

پھر منافق کی دو قسمیں ہیں (۱) منافق اعتقادی (۲) منافق عملی، منافق اعتقادی وہ ہے جو کفر کو چھپائے اور اسلام کا اظہار کرے، یہ کافر سے سے بھی بدتر ہے: ''ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار'' اور منافق عملی یہ ہے کہ ایک شخص سچا مسلمان ہے لیکن اس کے اعمال میں خرابی ہے، اعمال منافقوں کے

(۱) تاج العروس ٢٦/ ٢٤٧-٢٤٨ (نفق)

(۲) المصدر السابق.

(۳) البقرة ١٥.

(٤) البقرة: ٢٠.

(٥) تاج العروس (نفق) والمزهر فی علوم اللغة للسيوطي ١/ ٢٤٠، ٢٣٥.

(٦) التعريفات للجرجاني ١/ ٢٩٨ (١٤٩٠)

سے ہیں، تو وہ منافق عملی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بعض بری عادتیں اور بری خصلتیں ایسی ہیں جن کو منافقوں سے خاص مناسبت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ خصلتیں منافقوں کے اندر ہی پائی جاتی تھیں، مسلمانوں میں نہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا وغیرہ، ایسی خصلتوں کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چیزیں منافق کی علامت ہیں یعنی ایسی خصلتیں ہیں جو عموماً انھیں میں ہوتی ہیں، کسی صاحب ایمان میں ان کی پرچھائی بھی نہیں ہونی چاہئے، اگر بدقسمتی سے کسی مسلمان میں ان میں سے کوئی عادت پائی جائے تو اسے منافقانہ عادت کہا جائے گا، اگر کسی میں بدبختی سے منافقوں والی ساری عادتیں پائی جائیں تو وہ پورا منافق کہلائے گا، مگر ہوگا وہ مسلمان۔

نفاق کی کچھ بحث آگے روایات کے ذیل میں آئے گی، یہاں شروع کی چند احادیث کبائر سے متعلق ہیں۔

الفصل الاول

۱/۴۵: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍؓ، قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَيُّ الذَّنْبِ أَكْبَرُ عِنْدَاللّٰهِ؟ قَالَ: "أَنْ تَدْعُوَلِلّٰهِ نِدّاً وَهُوَخلَقَكَ" قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ "أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ خَشْيَةَ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ" قَالَ ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: "أَنْ تَزْنِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ" فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَصْدِيْقَهَا؟"وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ وَلَايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّابِالْحَقِّ وَلَايَزْنُوْنَ الآية. (متفق علیہ(۱))

(۱)أخرجه البخاری فی سبعة مواضع: فی "التفسير"باب قول الله تعالى "فلا تجعلوا لله انداداً وانتم تعلمون" ۲/۶۴۳برقم ۴۲۹۲، وأيضاً، فيه، باب قوله تعالى والذين لايدعون مع الله الٰهاً آخر الآية ۲/۷۰،برقم ۴۵۷۵،وأيضاً فى الأدب، باب قتل الولد خشية أن يأكل معه، ۲/۸۸۷برقم ۵۷۶۷.

وأيضاً فى "كتاب المحاربين ، باب إثم الزناة وقول الله تعالى: ولايزنون، ولاتقربواالزنى إنه كان فاحشه وساء سبيلا ۲/۱۰۰۶برقم ۶۵۵۳ وفى "الديات"باب قول الله عزوجل "ومن يقتل مومنا متعمدا فجزاء ه جهنم ۲/۱۰۱۴برقم ۶۵۹۷و"التوحيد، باب قول الله تعالى"فلاتجعلوالله انداداً ۲/۱۱۲۱برقم ۷۲۱۹ وايضاً فيه، باب قول الله تعالى "ياأيهاالرسول بلغ ماانزل إليك من ربك ۲/۱۱۲۴برقم ۷۲۳۱، ومسلم "كتاب الإيمان ،باب كون الشرك أقبح الذنوب وبيان أعظمها بعده ۱/۶۳.

ترجمہ :-حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دو حالانکہ تم کو پیدا اللہ نے کیا ہے، پھر اس شخص نے دریافت کیا اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی، پھر اس شخص نے معلوم کیا کہ اس کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو'' اللہ تعالیٰ نے اسی مسئلہ کی تصدیق کے لئے یہ آیت شریفہ نازل فرمائی والذین...... الخ جس کا ترجمہ یہ ہے وہی اللہ کے مقرب اور خاص بندے ہیں جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کو معبود نہیں مانتے ہیں اور جس جاندار کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل نہیں کرتے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کے وبال میں پڑ جائے گا۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

تعارف عبداللہ بن مسعودؓ

نام عبداللہ کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے، قبیلہ ہذیل کے ہیں، چھٹے نمبر پر اسلام لائے، ذوہجرتین ہیں، بدر اور اسکے بعد تمام غزوات میں شریک رہے، جسمانی اعتبار سے کچھ کمزور تھے، غزوۂ بدر میں ابوجہل کو قتل کرنے میں ان کی بھی شرکت تھی، چنانچہ ابوجہل کی گردن کو جسم سے انہوں نے ہی الگ کیا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تفقہ کی دعا دی تھی، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصی خادم تھے، سفر وحضر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تکیہ، مسواک اور جوتے لے کر چلتے تھے، اسی لئے ان کا لقب ''صاحبُ الوسادة والنعلين والسواک'' ہے، ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آمد ورفت بکثرت رہتی تھی، ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن مسعودؓ کو بہت دن تک اہل بیت میں سمجھتے رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں امت کو یہ مژدہ سنایا رضيتُ لامتي مارَضِيَ لها ابنُ أم عبدٍ وسَخَطتُ لها ماسَخَطَ لها ابنُ ام عبدٍ.[1] یعنی میں اپنی امت کے لئے اس کو پسند کرتا ہوں جس کو ام عبد کا بیٹا (عبداللہ بن مسعود)

(۱) رواه الحاكم في المستدرك ۲ / ۳۱۷.

میری امت کے لئے پسند کرتا ہے، اور میں اپنی امت کے لئے وہ ناپسند کرتا ہوں جس کو امت کے لئے ام عبد کا بیٹا ناپسند کرتا ہے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں بغیر مشورہ کے کسی کو امیر بناتا تو ابن مسعودؓ کو بناتا، خلفائے اربعہ کے بعد آپ افقہ الصحابہ ہیں، حضرت عمرؓ نے ان کو کوفہ کا والی مقرر کیا اور کوفہ والوں کو لکھا کہ ابن مسعود ایسے شخص ہیں کہ ان کے علم کا میں خود محتاج ہوں، لیکن میں تم لوگوں کو اپنے اوپر ترجیح دے کر ان کو تمہارے پاس بھیج رہا ہوں، امام ابوحنیفہؒ نے زیادہ تر ان ہی کے شاگردوں سے علم حاصل کیا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں آپ کوفہ سے مدینہ آ گئے تھے اور مدینہ میں ہی ۳۲ھ میں انتقال ہوا، اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔[1]

کبیرہ گناہ:

اس حدیث پاک میں کبائر کو بیان کیا گیا ہے۔

قال رجل یارسول الله! بعض روایات میں اس کی جگہ ''قلت'' وارد ہوا ہے[2] یعنی سائل خود ابن مسعودؓ ہیں۔

أَيُّ الذنب اكبر عندالله؟ ''ذنب'' کے اصل معنی ہیں: پیچھے لگنا، جانور کی دم کو بھی ''ذنب'' کہا جاتا ہے کیونکہ دم بھی پیچھے ہوتی ہے، گناہ کا نتیجہ آدمی کے پیچھے لگ جاتا ہے اس لئے اس کو ''ذنب'' کہا جاتا ہے۔

گناہ کی اقسام اور احکام:

ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ گناہ چار قسم کے ہیں:

(۱) وہ گناہ جو طاعات سے معاف ہو جاتے ہیں جیسے صغائر، چنانچہ ارشاد باری ہے: ان الحسنات یذهبن السیئات[3] یعنی نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

---

(۱) الاصابة ٤ / ١٩٩.

(۲) كمافی روایة البخاري: ٢ / ٦٤٣ (٤٢٩٢)

(۳) هود: ١١٤.

(۲)وہ گناہ جوطاعت سے معاف نہیں ہوتے ان کے معاف ہونے کے لئے توبہ ضروری ہے جیسے کفروشرک۔

(۳) وہ گناہ کہ طاعات سے ان کامعاف ہونا یقینی نہیں البتہ توبہ سے یقیناً معاف ہوجاتے ہیں جیسے حقوق اللہ۔

(۴)وہ گناہ جونہ طاعات سے معاف ہوتے ہیں اورنہ توبہ سے، وہ حقوق العباد کی قبیل کے گناہ ہیں ان میں حق کواداکرنا ضروری ہوتا ہے۔[1]

شرک؛اکبرالکبائر:

یہاں حدیث میں مطلق کبیرہ کے متعلق سوال نہیں، بلکہ اکبرالکبائر کے بارے میں ہے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تو اللہ کے لئے کسی کو ذات یاصفات میں مثل قراردے یہ ''اکبرالکبائر'' ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بغاوت ہے اور بغاوت دنیامیں بھی سب سے بڑاجرم سمجھا جاتاہے۔

نِدّاً: بمعنی مثل، ایسا شخص جودوسرے کے برابر ہوذات وصفات میں۔

سوال: ایسامماثل جواللہ تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات میں برابرہو،کوئی نہیں ہے، پھراس کے لئے ''ند'' قراردینے کاکیامطلب ہے؟

جواب:''نـــد'' کالفظ بولاگیاہے مشرکین کےعقیدہ اورنظریہ کے اعتبارسے کہ وہ اللہ کے لئےمثل ہونے کا اعتقادرکھتے تھے،ورنہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ شانہ کاکوئی مثل نہیں ہے،''ليس كمثله شئ[2]''یعنی کوئی چیزاس کے مثل نہیں ہے۔

وهو خلقک: یہ جملہ حال ہےاورترجمہ ہے: حالانکہ اس نے تجھ کوپیداکیاہے، اس میں شرک کی انتہائی مذمت ہے کہ پیداتو اللہ نے کیا،نعمتیں وہی دیتاہے اورعبادت میں اس کے ساتھ دوسرے کوشریک کرتے ہو، یہ نمک حرامی ہوئی اوراللہ کے ساتھ بغاوت ہوئی۔[3]

---

(۱)المرقاة:۱/۲۰۴.

(۲)شوریٰ:۱۱.

(۳)فتح الإله:۱/۳۶۹

قتل اولاد:

قال ثم أي ؟: پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ ثم ترتیبِ رُتبی کے لئے ہے اور أيٌ کی تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے، تقدیرِ عبارت یہ ہے: **ثــم أيُّ شــيءٍ مــن الــذنــوبِ أكبــرُ بعدالشركِ**، یعنی شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کرنا کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے، یعنی فقر وفاقہ کے خوف سے قتل کرنا، اس میں قتل نفس کے ساتھ قطع رحمی بھی ہے اور عقیدہ کی خرابی بھی ہے کہ اللہ کے رزاق ہونے پر بھروسہ نہیں ہے، گویا اپنے آپ کو رزاق سمجھا، الغرض شرک کے بعد یہ اکبرالکبائر ہے کیونکہ اس میں کئی مفسدے ہیں: (۱) قتلِ نفس (۲) قطع رحم (۳) اعتقاد کی خرابی۔

زمانہ جاہلیت میں یہ گناہ بڑا عام تھا، لوگ فقر وفاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل کردیا کرتے تھے جس سے قرآن نے منع کیا: "**لاتَقْتُلُوْا أَوْلادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلاق**"(۱)

فیملی پلاننگ کا حکم:

آجکل جو فیملی پلاننگ کی باتیں کہی جاتی ہیں اس کے پیچھے بھی یہی نظریہ موجود ہے کہ بچے زیادہ ہونگے تو کھائیں گے کہاں سے؟ اس لئے ازروئے شرع اس سوچ کے ساتھ فیملی پلاننگ قطعاً ناجائز ہے۔

پڑوسن سے زنا:

قال ثم أي ؟: سوال کیا پھر کون سا گناہ بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ **ان تزني حليلة جارك** یعنی اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔

"**حليلة**" یہ **حل يحل حِلًّا و حلالاً** سے مشتق ہے اور حلال کے معنی میں ہے، بیوی کو "**حليله**" اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ شوہر کے لئے حلال ہوتی ہے، یا **حل يحل حلول** بمعنی نزول سے ماخوذ ہے کیونکہ زوجین کا باہم ایک دوسرے کے پاس نزول ہوتا ہے، اس معنی کے لحاظ سے بھی بیوی کو حلیلہ کہنا صحیح ہے۔(۲)

زنا کرنا خود کبیرہ گناہ ہے مگر پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا اکبرالکبائر ہے، کیونکہ اس میں دو مفسدے ہیں

(۱) بنی اسرائیل ۳۱.

(۲) فتح الإله: ۱/ ۳۷۰.

(۱)زنا (۲)حق جار میں خیانت، پڑوسی تمھیں اپنے جان ومال کا امین سمجھ کر تمہارے اوپر بھروسہ رکھے ہوئے ہے، اورتم نے یہ حرکت کرکے اس کی امیدوں کا خون کردیا۔

فا نـزل الـلــه تـصديقها : ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نازل فرمائی: ''وَالَّـذِيْـنَ لايَـدْعُـوْنَ مَـعَ الـلّٰهِ اِلٰهاً اٰخرَ وَلايَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِـالْـحَقِّ وَلايَـزْنُوْنَ'' (۱) یعنی مومنین اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی عبادت نہیں کرتے اور جس کی جان کو اللہ تعالیٰ نے محترم قراردیا، اس کوناحق قتل نہیں کرتے اور نہ زنا کرتے ہیں، یہاں تصدیق سے مراد تائید ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ مضمون کی تائید ان آیات سے بھی ہوتی ہے، البتہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ آیت کریمہ مذکورہ روایت کے بعد نازل ہوئی ہو، کیونکہ صحابہ کی عادت تھی کہ اگرکوئی حدیث کسی آیت کے موافق ہوتی تو وہ حضرات حدیث کو بیان کرتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ آیت اس حدیث کی تصدیق میں نازل ہوئی، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس آیت سے حدیث کی تائید ہورہی ہے۔ (۲)

٤٦ / ٢: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قال: قَالَ رَسُوْلُ الله صلى الله عليه وسلم: ''اَلْـكَبَائِرُ اَلإِشْرَاکُ بِاللّٰهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ'' (رواه البخاری) (۳)

وَفِیْ رِوَايَةِ أَنَسٍؓ : ''وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ'' بَدَلَ ''الْيَمِيْنُ الْغَموسُ'' (متفق علیہ) (۴)

تـرجـمـه :-حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے گناہ ''اللہ کے ساتھ کسی کوشریک قرادینا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، ناحق کسی کوقتل کرنا اورجھوٹی قسم کھانا(ہیں)'' (بخاری)

(۱)الشعراء :٦٨.

(۲)المفاتیح :١ / ١٣٥، تحفة الأبرار ١ / ٨٢، المرقاة ١ / ٢٠٥.

(۳)أخرجه البخاری فی ثلاثة مواضع، کتاب الإیمان والنذور، باب الیمین الغموس ٢ / ٩٨٧، برقم ٦٤١٩، و''الدیات، باب قول الله تعالی ومن أحیاها ٢ / ١٠١٥ برقم ٦٦٠٥، وکتاب استتابة المعاندین والمرتدین، باب إثم من أشرک بالله وعقوبته فی الدنیا والآخره ٢ / ١٠٢٢، برقم ٦٦٥٣''

(٤)أخرجه البخاری فی ثلاثة مواضع: ''کتاب الشهادات باب ماقیل فی شهادة الزور لقوله تعالی والذین لایشهدون الزور الخ ١ / ٣٦٢ برقم ٢٥٧٩'' و''کتاب الأدب، باب عقوق الوالدین من الکبائر ٢ / ٨٨٤ برقم ٥٧٤٣ و''کتاب الدیات، باب قوله تعالی: ومن أحیاها'' ٢ / ١٠١٥، برقم ٦٦٠٦ ومسلم فی کتاب الإیمان، باب بیان الکبائر وأکبرها ١ / ٦٤

اورحضرت انسؓ کی روایت میں الیمین الغموس کی جگہ ”شہادۃ الزور“ کاذکر ہے۔
(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

پانچ بڑے گناہ:

اس حدیث پاک میں پانچ کبائر کابیان ہے یہ روایت دوصحابہ سے مروی ہے، دونوں کی روایت میں بعض الفاظ کافرق ہے، دونوں کے مجموعہ سے پانچ کبیرہ گناہ معلوم ہوئے۔

(۱)شرک کرنا:

الإشراک بالله: یہاں شرک میں کفربھی داخل ہے کہ کفربھی کبائر میں سے ہے، کفراورشرک میں مفہوم کے لحاظ سے فرق ہے، شرک کے معنی ہیں ذات وصفات میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھیرانا اورکفرکا مطلب ہے: خداکے وجود کا انکارکرنا ، قرآن وحدیث میں شرک پرجو وعید اورسزائیں آئی ہیں وہ کفرپربھی ہیں اورقرآن کریم میں شرک کا لفظ اس لئے زیادہ استعمال ہواہے کہ قرآن کریم کے اولین مخاطب اہل عرب تھے جومشرک تھے۔

(۲)والدین کی نافرمانی:

وعقوق الوالدین :عقوق: عقٌّ سے ماخوذ ہے، بمعنی قطع، اس سے والدین کی نافرمانی مراد ہوتی ہے، قرآن وحدیث میں شرک کے بعدعموماً عقوق والدین کاذکرکیاجاتاہے کیونکہ دونوں میں مناسبت ہے، شرک میں سبب حقیقی (یعنی اللہ تعالیٰ) کاانکارہوتاہے اورعقوق والدین میں سبب ظاہری کا انکارہوتاہے، انسان کے وجود میں آنے کے لئے سبب ظاہری والدین ہیں۔

والدین کی نافرمانی کامعیاراوران کی اطاعت کاحکم:

والدین کی نافرمانی کا معیارکیاہے؟ حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ایسی بات جووالدین اولاد کی

(۱)اسراء : ۲۳.

طرف سے معاشرہ میں برداشت نہ کرسکیں اوراس سے انکو غیر معمولی اذیت پہنچے وہ عقوق الوالدین اوران کی نافرمانی میں داخل ہے، اسی لئے قرآن کریم لاتَقُلْ لَهُمَا أُف [۱] میں ''اف'' سے مراد کلمۂ ایذاء ہے، پس اگرکسی معاشرہ میں کلمۂ ''اف'' تکلیف کی بات شمار نہ ہوتی ہوتو یہ کلمہ کہنا ممانعت میں داخل نہیں ہوگا، اسی طرح اگروالدین کوئی ایسا حکم دیں یا کسی ایسی بات سے روکیں جس کی مخالفت عرف ومعاشرہ میں نافرمانی نہ سمجھی جاتی ہوتو ایسے امرونہی کی مخالفت عقوق ونافرمانی شمار نہیں ہوگی۔ [۱]

بہرحال عقوق والدین حرام ہے اوران کی خدمت ضروری ہے جسمانی بھی اور مالی بھی، مالی خدمت اس وقت ضروری ہے جب وہ اس کے محتاج ہوں اوراولاد اس پرقادربھی ہو، اوروالدین کی اطاعت بھی واجب ہے،لیکن ناجائز کاموں میں ان کی اطاعت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَالَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا'' [۲] یعنی اگر والدین تجھ کواس پرمجبورکریں کہ تو ان کیساتھ اس چیز کوشریک ٹھہرائے جسکا تجھے علم نہیں تو تو انکی اطاعت مت کر، نیز حدیث میں ہے ''لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ'' [۳] یعنی خالق کی معصیت والے کام میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی، چنانچہ والدین اگرترک فرض یاترک واجب کاحکم دیں تو ان کی اطاعت نہ کی جائے، البتہ سنن کوکبھی کبھاران کی وجہ سے ترک کیاجاسکتاہے اورترک مستحب ہمیشہ کیاجاسکتاہے۔ [۴]

(۳)ناحق قتل کرنا:

قتل النفس : یعنی ناحق کسی کوقتل کردینا اوراس سے مرادکسی بھی طرح ہلاک کرناہے، چنانچہ زہر دے کرماردینا، جان بوجھ کرغلط دوا دینا، جھوٹے مقدمہ میں پھانس کر پھانسی دلوادینا،کسی کو پیسے دے کرقتل کروانا، جادوکرکے یاکراکے کسی کو مارنا، یہ سب صورتیں ناحق قتل میں داخل ہیں، یہ ناحق قتل بھی کبیرہ گناہ ہے اورسخت ترین گناہ ہے،قرآن کریم نے اس کی سزاخلود فی النار یعنی دائمی جہنم بیان کی ہے،جس سے اس

(۱)تفسير القرطبي: ٥/ ٥٧٩،ط:دار الحديث القاهرة.

(۲)لقمان: ١٥.

(۳)أخرجه الترمذي: أبواب الجهاد، باب ماجاء لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق ١/ ٣٠٠، لفظه: عن ابن عمرؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب وكره مالم يؤمربمعصية فإن أمر بمعصية فلاسمع ولاطاعة.

(٤)مرقاة المفاتيح ١/ ٦٠٦مطبوعه اشرفيه ديوبند.

گناہ کی سنگینی اور شناعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، البتہ دیگر نصوص کی بناء پر علماء نے لکھا ہے کہ ایسا شخص بھی سزا بھگت کر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

خودکشی کا حکم:

اور قتل نفس سے صرف دوسرے انسان کا قتل ہی مراد نہیں، بلکہ اپنے آپ کو قتل کرنا بھی اس میں داخل ہے، جتنا جرم اور گناہ دوسرے انسان کو قتل کرنے کا ہے اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی کا بھی ہے، یہ سمجھنا بڑی غلط فہمی ہے کہ ہم اپنی جان کے مالک ہیں اور اس کے تلف کرنے کے مجاز ہیں، ہماری جان اللہ کی ملک ہے ہماری نہیں، اس لئے ہم نہ اس کے تلف کے مجاز ہیں اور نہ بے جا استعمال کے۔

(۴) جھوٹی قسم کھانا:

الیمین الغموس: علماء نے لکھا ہے کہ یمین تین قسم کی ہوتی ہے: یمین لغو، یمین غموس اور یمین منعقدہ۔

یمین کی اقسام اور ان کے احکام:

(۱) یمین لغو کہتے ہیں: بھول کر گذشتہ فعل پر جھوٹی قسم کھالینا، جیسے کہے کہ اللہ کی قسم زید آ گیا، حالانکہ نہیں آیا، مگر اپنے گمان میں یہی سمجھتا ہے کہ زید آ گیا ہے، اس یمین پر گناہ ومواخذہ نہیں ہے: لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ اَيْمَانِكُمْ.(۱) یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری لغو قسموں کے بارے میں مواخذہ نہیں کرے گا۔

(۲) یمین غموس کے معنی ہیں: عمداً گذشتہ فعل پر جھوٹی قسم کھانا، غموس بمعنی ڈوبنا، یہ قسم آدمی کو گناہ میں ڈبا دیتی ہے، چنانچہ یہ کبائر میں شمار ہے، البتہ اس میں کفارہ واجب نہیں، اور جمہور کے یہاں کفارہ بھی ہے۔

(۳) یمین منعقدہ کہتے ہیں: آدمی آئندہ کے لئے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھاوے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر یمین کو پورا کیا اور بارّ ہوگیا تو یمین پوری ہوجاتی ہے کفارہ واجب نہیں ہوتا اور اگر قسم کے خلاف کیا تو حانث ہوجائے گا اور کفارہ واجب ہوگا، کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلائے یا دس فقیروں کو کپڑے بنادے یا ایک غلام آزاد کرے، اگر ان تین چیزوں میں سے کسی پر قدرت نہیں ہے تو مسلسل تین دن کے روزے رکھے، پھر قسم کو پورا کرنے کا حکم اس وقت ہے جب کہ قسم جائز ہو اور اگر معصیت

(۱) البقرة: ۲۲۵.

کی قسم ہے تو ایسی قسم کھانا جائز نہیں اور نہ اس کو پورا کرنا جائز ہے، بلکہ اس میں حانث ہونا واجب ہے، لہٰذا قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرے۔ (۱)

(۵) جھوٹی گواہی دینا:

وفی روایۃ انس : یہ چار کبیرہ گناہ ہوئے، بخاری شریف میں یہی حدیث حضرت انسؓ کے واسطہ سے آئی ہے، اس میں چوتھے نمبر پر یمین غموس کے بجائے شھادۃ الزور کا لفظ ہے، یعنی جھوٹی گواہی دینا، اس طرح یہ کل پانچ کبائر ہوجائیں گے، زور بمعنی مائل ہونا، جھوٹی گواہی میں آدمی حق سے باطل کی طرف مائل ہوتا ہے، اس لئے جھوٹی گواہی کو ''زور'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، (۲) یہ کبیرہ گناہ ہے، حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو چالیس کوڑے لگاتے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دیا کرتے تھے، اسی لئے امام ابو یوسف ومحمدؒ کے نزدیک جھوٹے گواہوں کو مارا بھی جائے گا اور قید بھی کیا جائے گا، اور امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی صرف تشہیر ہوگی مار پٹائی نہیں کی جائے گی۔ (۳)

دو روایتیں اور ان میں فرق:

یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت انسؓ دونوں سے مروی ہے، دونوں کی حدیثوں میں چار گناہوں کا بیان ہے، البتہ دو باتوں کا فرق ہے، ایک یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت اَفراد بخاری میں سے ہے اور حضرت انسؓ کی روایت متفق علیہ ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں چوتھا گناہ یمین غموس ہے اور حضرت انسؓ کی حدیث میں چوتھا گناہ شہادت زور ہے۔

سوال: جب دونوں حدیثیں ایک ہی ہیں تو پھر دونوں روایتوں میں چوتھے گناہ کے بارے میں فرق کیسے ہوا، اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) دونوں راویوں کی روایت کا یہ اختلاف، اختلاف مجلس پر محمول ہے، ایک مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کبائر ذکر فرمائے اس کو ابن عمرؓ نے سنا، دوسری کسی مجلس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار کبائر بیان فرمائے، لیکن چوتھے نمبر پر شہادت زور کو بیان فرمایا اس کو حضرت انسؓ نے سنا، اس لئے

(۱) البحر الرائق ٤ / ٤٨٣–٤٨٨.

(۲) فتح الإله ١ / ٣٧٢.

(۳) البحر الرائق ٧ / ٢٦–١٢٥.

روایات مختلف ہوئیں۔(۱)

(۲) اگر مجلس ایک ہی رہی ہو تو پھر توجیہ یہ ہوگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ گناہ بیان فرمائے تھے ان میں سے ایک گناہ کو ابن عمر بھول گئے اور ایک کو حضرت انس بھول گئے۔(۲)

۴۷ / ۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اِجْتَنِبُوْا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ" قالوا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَاهُنَّ؟ قَالَ: "اَلشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّابِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُوْمِنَاتِ الْغَافِلاتِ" (متفق عليه)(۳)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، حضرات صحابہ کرامؓ نے معلوم کیا، یارسول اللہ! وہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کون سی ہیں؟ فرمایا (۱) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک قرار دینا (۲) جادو کرنا (۳) اللہ کے حرام کردہ نفس کو قتل کرنا مگر حق کی وجہ سے (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) لڑائی (جہاد) کے دن پشت پھیر کر بھاگنا (۷) ایمان والی بھولی بھالی پاکدامن عورتوں کو زنا کی تہمت لگانا۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

سات بڑے گناہ:

اس حدیث پاک میں سات کبائر کا بیان ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: **اجتنبو السبع الموبقات**، یعنی سات گناہوں سے بچو جو ہلاک کرنے والے ہیں، صحابہؓ نے عرض کیا **وماهن** یعنی وہ کیا ہیں؟

(۱) المفاتيح: ۱ / ۱۳۷.

(۲) المرقاة: ۱ / ۲۰٦۔

(۳) أخرجه البخاري في ثلاثة مواضع "كتاب الوصايا، باب قول الله تعالىٰ: إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما" ۱ / ۳۸۷ برقم ۲٦۸۵ وأيضاً "كتاب الطب، باب الشرك والسحر من الموبقات" ۲ / ۸۵۸ برقم: ۵۵۳۹، ومسلم في "كتاب الإيمان، باب الكبائر وأكبرها" ۱ / ٦٤ برقم ۸۹، كتاب المحاربين، باب رمى المحصنات، والذين يرمون المحصنات ثم لم يأتوا بأربعة شهداء ۲ / ۱۰۱۳، برقم ٦۵۹٤

تو آپ نے فرمایا:

(۱) شرک:

الشرک باللہ: اس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔

(۲) سحر:

السحر: اس کے لغوی معنی ہیں امرِ خفی، س ح ر کے مادہ میں خفاء کے معنی پائے جاتے ہیں، صبح کی روشنی کو "سحر" کہا جاتا ہے صبح صادق سے پہلے وقت کو بھی "سحر" کہتے ہیں اس لئے کہ اس وقت روشنی مخفی ہوتی ہے۔

اور اصطلاح میں سحر کے معنی ہیں: افعال خفیہ کے ذریعہ امور عجیبہ اور واقعاتِ عجیبہ پر قدرت حاصل کرنا۔

سحر حقیقت یا تخیل محض؟

امام راغب اصبہانی اور ابوبکر جصاص وغیرہ حضرات کا کہنا ہے کہ سحر: نظر بندی اور تخییل ہوتی ہے جس کی کوئی حقیقتِ واقعیہ نہیں ہوتی، مثلاً قوتِ خیالیہ مِسمَر یزم [1] وغیرہ کے ذریعہ کسی کے دماغ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے کہ وہ اس کی وجہ سے ایک چیز کو آنکھوں سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، مگر اس کی کوئی حقیقت واقعیہ نہیں ہوتی، اور کبھی یہ کام شیاطین کے ذریعہ کیا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے مسحور کی آنکھوں اور دماغ پر ایسا اثر ڈالا جاتا ہے جس سے وہ ایک غیر واقعی چیز کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے، معتزلہ کا بھی یہی قول ہے کہ سحر کا اثر صرف تخییل اور نظر بندی تک ہوسکتا ہے اس سے شئ کی حقیقت نہیں بدلتی، سحر اور جادو سے کسی انسان یا جاندار کو پتھر یا کوئی جانور بنا دیا جائے، ایسا نہیں ہوسکتا۔

اور جمہور فرماتے ہیں کہ سحر کی حقیقت ہے اور واقعتہً اس کی وجہ سے خلاف عادت امور وجود میں آجاتے ہیں اور سحر کے ذریعہ قلب ماہیت بھی ہوجاتا ہے، اس میں نہ کوئی عقلی امتناع ہے اور نہ شرعی، مثلاً جسم پتھر بن جائے یا کوئی شئ ایک نوع سے دوسری نوع کی طرف منقلب ہوجائے کچھ مستبعد نہیں، الفاظ سحر میں ایسی تاثیر کا ہونا قرآن وسنت سے ثابت ہے،، کعب احبار فرماتے تھے کہ میں صبح وشام کچھ کلمات پڑھ لیا کرتا ہوں ورنہ یہ یہود مجھے گدھا بنا دیتے، جس سے معلوم ہوا کہ سحر کے ذریعہ حقیقت بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔

(۱) (مِس، مِ، رَے، زَم) انگ، ڈاکٹر مسمر کا ایجاد کیا ہوا ایک علم، جس میں تصور یا خیال کا اثر دوسرے کے دل پر ڈال کر پوشیدہ اور آئندہ کے حالات پوچھے جاتے ہیں۔ (فیروز اللغات)

سحر وجادو سے حفاظت کرنے والے کلمات:

جوکلمات وہ پڑھتے تھے وہ یہ ہیں: اَعوذُ باللہِ العظیمِ الذی لَیسَ بشیٌٔ اعظمَ منه وبکَلِماتِ اللہ التامّات التی لایجاوز ھن برٌّ ولافاجرٌ وبأسْماءِ اللہ الحسنیٰ کلِّھا، ماعَلِمتُ منھا ومالَمْ اَعْلَمُ من شرِّ ماخَلَقَ وَبَرَءَ وَذَرَءَ .(۱)

سحر کا حکم:

سحر میں عموماً استمداد بالشیاطین ہوتا ہے، ان کوخوش کرنے کے لئے کبھی ایسے منتر اختیار کئے جاتے ہیں جن میں کفروشرک کے کلمات ہوتے ہیں اورشیاطین کی مدح کی جاتی ہے، کبھی ایسے اعمال اختیار کئے جاتے ہیں جو شیطان کو پسند ہیں، مثلاً کسی کو ناحق قتل کرکے اس کا خون استعمال کرنا، جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا وغیرہ، پس سحر کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں کفروشرک کے اقوال یااعمال اختیار کئے ہوں تو سحر کفر ہے، اور جس سحر میں اعمال کفر نہ ہوں مگر معاصی کا ارتکاب ہو، یاکسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کیاجائے، یاکسی ناجائز مقصد کے حصول کے لئے کیا جائے وہ گناہ کبیرہ ہے، اسی لئے سحر کا تعلیم وتعلم حرام ہے، البتہ اگر مسلمانوں سے دفعِ ضرر کے لئے بقدر ضرورت سیکھا جائے تو بعض فقہاء نے اجازت دی ہے (۲) مشائخ شوافع میں امام غزالی نے بھی اجازت دی ہے، امام مالکؒ اورعلماء کی ایک جماعت نے سحر کو مطلقاً کفر کہا ہے۔

(۳) قتل:

وقتل النفس التی حرم اللہ إلا بالحق: اس کی تفصیل بھی اوپر آچکی ہے، البتہ یہاں ''الا بالحق'' کا استثناء ہے، اس استثناء میں پانچ صورتیں داخل ہیں: (۱) قصاصاً قتل کرنا (۲) ردت کی وجہ سے قتل کرنا (۳) محصن اورمحصنہ کو زنا کی وجہ سے قتل کرنا (۴) باغیوں کو قتل کرنا (۵) جہاد میں قتل کرنا۔

(۴) سودخوری:

وأکل الربوا: اکل بمعنی اخذ ہے اس لئے کہ لینے سے مقصود کھانا ہوتا ہے، اور ''ربا'' کے معنی زیادتی

(۱) معارف القرآن (۱/۲۱۸)

(۲) شامی زکریا (۱/۱۳۴)

کے ہیں اورشرعاً فَضلُ مالٍ لایقابِلُه عوضٌ في معاوضةِ مالٍ بمالٍ[1] کو"ربا" کہتے ہیں، یعنی مالی لین دین کے معاملہ میں ایسا اضافہ جس کے مقابلہ میں دوسری طرف سے عوض نہ ہو، مثلاً ایک ہزارقرض دے کر گیارہ سو لینا، یاایک کلو چیز کے بدلہ اسی طرح کی چیز سواکلو لینا، یہ ربا تمام امتوں میں حرام رہاہے، اورقرآن وسنت میں اس پر بڑی سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

(۵) یتیم کا مال کھانا:

اکل مال الیتیم :یتیم، یتم سے ہے بمعنی قطع کرنا ،کاٹنا،یتیم کے اسباب معیشت منقطع ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو یتیم کہتے ہیں، علماء نے فرمایا ہے کہ یتیم کی اضافت تین چیزوں کی طرف ہوتی ہے اور تینوں صورتوں میں معنی الگ الگ ہوتے ہیں:(۱) یتیم الانسان (۲) یتیم الحیوان (۳) یتیم الجمادات۔

یتیم الانسان: وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مرگیا ہو، اس میں دوقید ہیں: نابالغ ہواور باپ مراہو، اگر بالغ ہےتو یتیم نہیں کہلائے گا نیز اگر والد کا نہیں بلکہ والدہ کا انتقال ہواہے پھربھی بچہ کو یتیم نہیں کہا جائے گا۔

یتیم الحیوان: جانور کا وہ بچہ جس کی ماں مرجائے اس لئے کہ جانوروں میں نسب مادہ کی طرف سے چلتاہے، انسان ہویا جانور اصل تو یہ ہے کہ ماں کی طرف منسوب ہو کیونکہ بچہ کے تولد میں نر کے بالمقابل مادہ کا عمل دخل زیادہ ہے ،کماہو ظاہر، لیکن انسانوں میں مرد کی تعظیم کی وجہ سے مرد کی طرف نسبت کی جاتی ہے، جانوروں میں اصل کا لحاظ کرتے ہوئے نسبت میں مادہ کا اعتبار ہوتاہے۔

اگر یتیم کی نسبت جمادات کی طرف ہوجیسے "دُرِّ یتیم" تو وہاں یتیم کے معنی یکتا اور بےنظیر کے ہوتے ہیں۔

یتیم کے مال کو کھانا حرام ہے، کھانے سے مراد اس میں ہرقسم کا تصرف واستعمال ہے اور کھانے کی تخصیص محض اس لئے ہے کہ مال کا اولین مصرف کھانا ہوتاہے، باقی ضروریات بعد میں ہیں، لیکن اگر یتیم کا ولی (خدمت کرنے والا) اپنی خدمت کے بقدر اس کے مال سے لےتو یہ جائز ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے: وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيراً فالْيَأكُلْ بِالْمَعْرُوفِ.[2] کہ جو ولی مالدار ہو وہ احتیاط کرے اور جو نادار ہو وہ عرف کے مطابق کھاسکتاہے۔

---

(۱)ھندیه ۳/ ۱۱۷.

(۲)من سورة النساء:۵.

(۶) میدان جنگ سے بھاگنا:

والتولی یوم الزحف: الزحف بمعنیٰ بچہ کا سرین کے بل گھسٹ کر چلنا، پھر اس کا اطلاق بڑے لشکر پر ہونے لگا کیوں کہ ازدحام کی وجہ سے وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے، چنانچہ یہاں یہی معنیٰ مراد ہیں۔

میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا اور وہاں سے ہٹ جانا جائز نہیں البتہ تین صورتوں میں اس کی اجازت ہے جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے:

(۱) اومتحرفاً لقتالٍ: یعنی لڑائی کا پینترا بدلنے کے لئے تاکہ پھر پلٹ کر ان پر حملہ کیا جائے اس کی اجازت ہے۔

(۲) أومتحیزاً إلی فئةٍ: یعنی ساتھیوں کی مدد حاصل کرنے اور مجتمع ہوکر حملہ کرنے کے لئے پشت پھیرنا یہ بھی جائز ہے۔

(۳) اگر کفار مسلمانوں کے مقابلہ میں دوگنا سے زیادہ ہوں تب بھی مقابلہ سے ہٹ جانا جائز ہے جیسا کہ اس آیت سے مفہوم ہوتا ہے "اَلآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَكُنْ مِنكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِأَتَيْنِ [۱]"

(۷) پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا:

وقذف المحصنات: پاک دامن کو تہمت لگانا حرام ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، عموماً عورت کو تہمت لگائی جاتی ہے اس لئے المحصنات کہا، المومنات کی قید سے کافرات کو نکال دیا کیوں کہ کافرہ کو تہمت لگانا کبیرہ گناہ نہیں، الغافلات سے ان کی براءت کی طرف اشارہ ہے کہ جس قبیح عمل کی نسبت ان کی طرف کررہے ہو وہ ایسی بھولی ہیں ان کو اس کا علم بھی نہیں۔

کسی محصن مرد یا محصنہ عورت کو تہمت لگانے پر دنیا میں بھی سزا دیجائے گی، جس کو "حدقذف" کہا جاتا ہے، پس اگر کوئی کسی پر زنا کی تہمت لگائے اور چار گواہوں سے اس کو ثابت نہ کرسکے اس کو بطور حد اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں گے۔

---

(۱) الانفال: ٦٦.

٤٨ / ٤: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَايَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهِ فِيْهَا أَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَايَغُلُّ أَحَدُكُمْ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَإِيَّاكُمْ إِيَّاكُمْ" (متفق عليه)[1]

وَفِيْ رِوَايَةِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ: "وَلَايَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ" قَالَ عِكْرِمَةُ: قُلْتُ لِابْنِ عَبَّاسٍ: كَيْفَ يُنْزَعُ الإِيْمَانُ مِنْهُ؟ قَالَ هٰكَذَا، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ ثُمَّ أَخْرَجَهَا، فَإِنْ تَابَ عَادَ إِلَيْهِ هٰكَذَا، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ وَقَالَ أَبُوْعَبْدِاللّٰهِ لَايَكُوْنُ هٰذَا مُؤْمِناً تَامًّا، وَلَايَكُوْنُ لَهُ نُوْرُالإِيْمَانِ. (هذا لفظ البخاری)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا "زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کاایمان باقی نہیں رہتا، اور چوری کرنے والا جب چوری کرتا ہے تواس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تواس وقت اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، اور جب لوٹنے والاکھلم کھلا لوٹتا ہے حال یہ کہ کہ لوگ اس کی طرف (بے بسی کے ساتھ) نظر اٹھائے ہوتے ہیں، تو اس کا ایمان باقی نہیں رہتا، اور جب تم میں سے کوئی خیانت کرتا ہے تواس کاایمان باقی نہیں رہتا، پس تم اپنے آپ کوان گناہوں سے بچاؤ! (بخاری ومسلم)

اورحضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: قتل کرنے والا جب (ناحق) قتل کرتا ہے تو اس کاایمان باقی نہیں رہتا، حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت ابن عباسؓ سے معلوم کیا کہ اس سے ایمان کیسے کھینچ لیا جاتا ہے؟ انہوں نے فرمایا اسطرح: اوراپنے

(١) أخرجه البخاري في ثلثة مواضع: كتاب المظالم، باب النهى بغيرإذن صاحبه ١ / ٣٣٦ برقم ٢٤١١ و وأيضا "كتاب الأشربة، باب قوله تعالى "انما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطان ٢ / ٨٣٦ برقم ٥٦١ ٣، وأيضا كتاب الحدود، باب الزنا وشرب الخمر ٢ / ١٠٠١ ومسلم كتاب الإيمان، باب بيان نقصان الإيمان بالمعاصي ونفيه عن الملبس بالمعصية على إرادة نفي كماله ١ / ٥٥ برقم ٥٧.

(٢) أخرجه البخاري في موضعين "كتاب الحدود، باب السارق حين يسرق" ٢ / ١٠٠٢ برقم ٦٥٢٤ وأيضاً "كتاب المحاربين، باب إثم الزناة وقوله تعالى ولايزنون، ولاتقربوا الزنا ٢ / ١٠٠٦ برقم ٦٥٥٢"

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں داخل کیں اور پھر ان انگلیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا، (اس کے بعد فرمایا) اگر وہ توبہ کرلیتا ہے تو ایمان اس طرح واپس آجاتا ہے: (یہ کہکر) پھر انہوں نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل کرلیا؛ ابوعبداللہ (حضرت امام بخاریؒ) نے فرمایا کہ وہ شخص مؤمن کامل نہیں رہتا اور اس سے ایمان کا نور نکل جاتا ہے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

چھ ایمان سوز گناہ:

اس حدیث پاک میں چھ کبائر کے ارتکاب پر ایمان کے سلب ہونے کی خبر دی ہے، فرمایا گیا ہے کہ (۱) زنا کرنے والا حالت زنا میں مومن باقی نہیں رہتا، (۲) اسی طرح چوری کے وقت ایمان باقی نہیں رہتا، (۳) اسی طرح شراب پینے کی حالت میں، (۴) اسی طرح مال کو لوٹتے وقت آدمی مومن نہیں رہتا ہے، (۵) اسی طرح خیانت کے وقت مومن نہیں رہتا، آگے ابن عباسؓ کی روایت میں ایک گناہ کا اور اضافہ ہے اور وہ ہے (۶) قتل کہ اس وقت بھی آدمی مومن نہیں رہتا ہے، اس سے ان گناہوں کی شدت معلوم ہوتی ہے۔

ایک اہم سوال وجواب:

سوال: یہ روایات اور اسی مضمون کی دیگر روایات ماقبل کی ان روایات کے معارض ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ ہر ایمان والا جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس نے زنا یا چوری کی ہو۔

نیز ان روایات سے معتزلہ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ارتکاب کبیرہ سے ایمان ختم ہوجاتا ہے اور یہ کہ ایسا شخص مخلد فی النار ہوگا؟

ان کی روایات کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں:

(۱) یہاں کمال ایمان اور نور ایمان کی نفی ہے جیسا کہ صاحب مشکوٰۃ نے امام بخاریؒ سے اس حدیث کی یہی تاویل نقل فرمائی ہے، یعنی زنا کی حالت میں آدمی کامل مومن باقی نہیں رہتا ہے، اور اس سے نور ایمان ختم ہوجاتا ہے۔ [1]

---

(۱) لم أجده في نسخ صحيح البخاري ولكن وجدته في حديثٍ موقوف لابن عباس (مصنف ابن أبي شيبة ۱۱/۱۴ (۳۰۹۶۶، و۴/۴۰۴ (۱۶۹۳۵) ت: محمد عوامة ونقل ابن حجر عنه حديثا مرفوعاً عن الطبرى بمعناه (لينظر: فتح البارى ۱۲/۶۸ (۶۷۷۲) وفتح الملهم ۲/۱۲)

(۲) ایمان کا عارضی طور پر نکل جانا مراد ہے، یہ جواب صاحب مشکوۃ نے حضرت عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے، یعنی گناہ کے عین ارتکاب کے وقت ایمان نکل جاتا ہے اور گناہ سے علیحدہ ہوجانے پر ایمان لوٹ آتا ہے، چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ ایسی حالت میں ایمان سائبان کی طرح اس کے سر پر کھڑا ہوجاتا ہے گویا کہ اس حالت میں بھی وہ اس کی حفاظت کرتا ہے، کیونکہ اس وقت اس شخص پر عذاب الٰہی کا خطرہ تھا، عکرمہؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ ایمان کیسے نکل جاتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس طرح؛ یہ کہہ کر ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے میں داخل کیں اور پھر ان کو نکال دیا، دراصل گناہ کے بعد مومن کو کچھ نہ کچھ ندامت ہوتی ہے اس سے ایمان قلب میں پھر لوٹ آتا ہے۔

(۳) یہ روایات تغلیظ وتشدید پر محمول ہیں [1] اور تغلیظ وتشدید کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ان گناہوں کی وجہ سے ایمان فی الحال تو نہیں نکلتا ہے لیکن خروج ایمان تک توبت پہنچ سکتی ہے، کیونکہ جب آدمی گناہ کا عادی ہوتا ہے تو قلب میں اس کی محبت پیدا ہوجاتی ہے اوراس کو قلب سے اچھا سمجھنے لگتا ہے حالانکہ شریعت نے اس کو برا کہا ہے، جو چیز شرعاً سیئہ ہو اس کو اچھا سمجھنا کفر ہے، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: "**فان لم یستطع فبقلبه و ذالک أضعف الإیمان**[2]" کہ اگر منکر ومعصیت کو طاقت یا زبان سے ختم کرنے کی قوت نہ ہو تو کم ازکم قلب سے اس کو برا سمجھو، یہ ایمان کا ادنی ترین درجہ ہے، پس اگر قلب سے بھی برا نہ سمجھا گیا تو اس کے بعد ایمان کا یہ ادنی درجہ بھی ختم ہوجائے گا۔

قرآن کریم سے بھی یہ مضمون ثابت ہے: "**بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ**[3]" (ہاں وہ شخص جو گناہ کرے اوراس کا گناہ اس کا احاطہ کرلے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا اور اس میں ہمیشہ رہے گا) قاضی بیضاوی نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ **احاطت به خطیئته** سے مراد تمام اعضاء وجوارح کا احاطہ ہے جس میں قلب بھی داخل ہے یعنی گناہ کرتے کرتے یہاں تک پہنچ جائے کہ دل سے اچھا سمجھنے لگے، ظاہر ہے کہ اس میں نص کا انکار ہے جو کفر ہے، اس کی

(۱) لمعات التنقیح ۱/ ۲۹۹ ولینظر التقریر الرفیع ۱/ ۹۶.

(۲) صحیح مسلم ۱/ ۵۱ (۷۸) وابن ماجه ص: ۲۹۰ (۴۰۱۳)

(۳) البقرہ: ۸۱.

وجہ سے ایسا شخص مخلد فی النار ہوتا ہے۔[1]

(۴) حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ: اس کا نام مومن نہیں رہے گا، جب اس نے ایمان قبول کیا تو اس کا نام مومن رکھا گیا تھا، یہ ایک متبرک نام ہے، ان گناہوں کے ارتکاب سے اب اس کو سارق، زانی، فاسق وغیرہ کہا جائے گا، مومن نہیں کہا جائے گا۔

(۵) بعض نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ: وہ مومن مطیع نہیں رہے گا۔

(۶) بعض نے کہا ہے کہ: یہاں مومن کے لغوی معنی (امن والا) کی نفی ہے، یعنی وہ فسادی بن جائے گا امن والا نہیں رہے گا۔[2]

(۷) بعض نے کہا ہے کہ: لایزنی لفظاً خبر ہے مگر نہی کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے آدمی کو زنا چوری وغیرہ نہیں کرنی چاہئے پس حدیث کا مقصود ممانعت ہے۔[3]

(۸) بعض نے کہا ہے کہ: یہ روایات مستحل پر محمول ہیں یعنی جو شخص ان گناہوں کو حلال سمجھے وہ مومن نہیں رہے گا، کیونکہ قرآن وحدیث سے ان گناہوں کی حرمت ثابت ہے ان کو حلال سمجھنے والا قرآن وحدیث کا منکر ہے۔[4]

(۹) بعض نے کہا ہے کہ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے ایمان کے مقتضا پر عمل نہیں کیا، جیسے جو عالم اپنے علم کے تقاضہ پر عمل نہیں کرتا اس کو جاہل کہا جاتا ہے، اسی طرح اس شخص نے ایمان کے مقتضا پر عمل نہیں کیا، لہٰذا وہ مومن ہی نہیں ہے۔[5]

نهبة يرفع الناس اليه فيها ابصارهم حين ينتهبها: یعنی جس کا مال لوٹا جا رہا ہے وہ حسرت سے اس کی طرف دیکھتا ہے یا لوگ اس لوٹنے والے کی جرأت پر اس کو دیکھتے ہیں، یہ قید احترازی نہیں کہ لوگ نہ

---

(۱) تفسير بيضاوي ١ / ٣٠٢ ط: دار الفكر.

(۲) فتح الباری فيه "معنى نفي الإيمان نفي الأمان من عذاب الله لأن الإيمان مشتق من الأمن"

(۳) فتح الملهم ٢ / ١٢.

(٤) فتح الباری ١٢ / ٧٠، وفتح الملهم ٢ / ١٢ قال: الحافظ وعنه العثماني: وقد ورد في تأويله: بالمستحل حديث مرفوع عن علي عند الطبراني في الصغير لكن في اسناده راوٍ كذبوه.

(٥) فتح الباری ١٢ / ٧٠.

دیکھیں تو حرام نہیں بلکہ قید واقعی ہے کہ لوٹ کے وقت لوگوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ (۱)

لایغل: بمعنی مال غنیمت میں خیانت کرنا یہ اس کے اصل معنی ہیں، مگر اس سے مطلق خیانت بھی مراد ہوتی ہے، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ (۲)

شبک: بمعنی ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے میں داخل کرنا۔

مصنفؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے بعد عبداللہ بن عباس کی روایت نقل فرمائی کیونکہ اس میں ایک گناہ کا اضافہ ہے، دوسرے خود اس روایت میں ان مجموعی روایات کے دو مطالب مذکور ہیں۔

۴۹ / ۵: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ". زَادَ مُسْلِمٌ: "وَإِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ" ثُمَّ اتَّفَقَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (متفق علیہ) (۳)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "منافق کی تین علامتیں ہیں، (اس کے بعد) امام مسلمؒ نے (اپنی روایت میں اتنا) اضافہ فرمایا "اگرچہ وہ نماز پڑھے اور روزے رکھے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے" اس کے بعد بخاری و مسلم متفق ہیں (وہ تین علامتیں یہ ہیں) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح حدیث

نفاق کی علامات:

اب تک کی روایات میں کبائر کا بیان تھا، ترجمہ کا دوسرا جزء "علامات النفاق" ہے اب یہاں سے چند

(۱) لمعات التنقيح ۱ / ۳۰۰، والمرعاة ۱ / ۳۲۷ والتقرير الرفيع ۱ / ۹۶.

(۲) فتح الملهم ۲ / ۱۵، اللمعات ۱ / ۳۰۰. عبارته: "والمشهور أن المراد في هذا الحديث هو الخيانة من المغنم وهو من الكبائر"

(۳) أخرجه البخاري في أربعة مواضع: "كتاب الإيمان، باب علامة المنافق ۱ / ۱۰ برقم ۳۳، وأيضاً "كتاب الشهادات، باب من أمر بانجاز الوعد وفعله الحسن" ۱ / ۳۶۸ برقم ۲۶۰۵، وأيضاً "كتاب الوصايا، باب قول الله تعالى" "من بعد وصية يوصى بها او دين" ۱ / ۳۸٤ برقم ۲٦٦۸ وأيضاً "كتاب الأدب، باب قوله تعالى "اتقوا الله وكونوا مع الصادقين ۲ / ۹۰۰ برقم ۵۸۵۷"، ومسلم "كتاب الإيمان، باب بيان خصال المنافق ۱ / ۵٦ برقم ۵۹۰۵۸.

روایات میں اس دوسرے جز کا بیان ہے، اس حدیث میں منافق کی تین علامتیں بتائی گئیں:(۱) جب بات چیت کرے تو جھوٹ بولے، (۲)وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، (۳)اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، امام مسلم نے یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں:''وان صلی وصام وزعم انہ مسلم'' کہ اگر چہ وہ نماز روزہ والا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو، اگلی حدیث میں چار علامتوں کا بیان ہے، تین تو یہی ہیں اور چوتھی علامت اس میں یہ مذکور ہے کہ جب لڑائی کرے تو گالی گلوچ کرے۔

کل علامات نفاق کتنی ہیں؟ ان روایات میں''إذا وعد أخلف اوراذاعاھد غدر'' یہ دو جملے آئے ہیں، پس وعدہ خلافی اور عہد شکنی دونوں کو علیحدہ علیحدہ شمار کریں جیسا کہ امام نووی (۱) نے فرمایا ہے، تو علامات نفاق پانچ ہونگی اور اگر دونوں کو ایک شمار کریں اس وقت چار علامتیں ہوں گی، بعض روایات میں''اذا وعد غدر'' کے الفاظ ہیں، اس سے دونوں کے ایک علامت ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

(۱) جھوٹ بولنا:

اذا حدث کذب: پہلی علامت نفاق جھوٹ بولنا ہے، یہ ہر دین و مذہب اور ہر قوم وملت میں حرام رہا ہے، ایک روایت میں وارد ہے کہ مؤمن سے ہر گناہ کا صدور ہوسکتا ہے سوائے جھوٹ کے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حتی الوسع جھوٹ سے بچا جائے، جھوٹ بولنے میں جھوٹی سفارش، جھوٹی شہادت، جھوٹی تعریف، جھوٹی تصدیق، جھوٹی نسبت، جھوٹا سرٹیفکٹ اور جھوٹا مذاق سب شامل ہے۔

(۲) وعدہ خلافی:

اذاوعدأخلف: علماء نے فرمایا کہ وعدہ خلافی اس وقت علامت نفاق ہے جبکہ وعدہ کرنے کے وقت ہی اس کو پورا نہ کرنے کی نیت ہو، اور اگر بوقت وعدہ ایفاء کا ارادہ تھا لیکن بعد میں کسی وجہ سے پورا نہ کرسکا تو یہ علامت نفاق نہیں ہے البتہ ایسی صورت میں بھی جس سے وعدہ ہے اس کو بتادینا چاہئے کہ میں کسی وجہ سے وعدہ پورا نہیں کرسکتا۔

(۳) امانت میں خیانت:

اذااؤتمن خان: خیانت میں پیسوں کی خیانت بھی شامل ہے اور اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی بھی،

(۱) شرح مسلم ۱/ ٥٦.

اسی طرح کسی کاراز افشاء کرنا، بلااجازت یاحدِّ اجازت سے ماوراء کسی کی چیز استعمال کرنا بھی خیانت میں شمار ہے۔

اگرکسی مسلمان میں یہ علامات ہوں؟

سوال: یہ علامتیں تو بہت سے مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہیں تو کیا ان پر بھی نفاق کا حکم ہوگا؟

اس کے متعدد جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) منافق دوقسم کا ہوتا ہے: (۱) منافق اعتقادی (۲) منافق عملی، منافق اعتقادی کافر اور مخلد فی النار ہے اور منافق عملی مؤمن ہے اور مخلد فی النار نہیں ہے، ان روایات میں منافق سے مراد منافق عملی ہے اور نفاق عملی ایمان کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے، پس جو مؤمنین ان گناہوں کا ارتکاب کریں گے وہ عملاً منافق شمار ہوں گے۔

(۲) ان روایات میں نفاق سے مراد نفاق عرفی ہے یعنی اظہار خلاف الباطن، اس سے اس شخص کا کافر ومنافق ہونا لازم نہیں آتا۔

(۳) یہ روایات تغلیظ وتشدید پر محمول ہیں یعنی ان گناہوں کی وجہ سے آدمی نفاق تک پہونچ سکتا ہے کہ شدہ شدہ ان گناہوں کو دل سے اچھا سمجھنے لگے کما مر تفصیلہ۔

(۴) بعض نے کہا انھا طلائع النفاق کہ یہ گناہ نفاق کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہیں، یہ جواب تیسرے جواب کے قریب قریب ہے۔

(۵) ان خصلتوں واعمال سے ان عادات کے مجموعے پر مداومت مراد ہے، اور مداوم منافق ہی ہوسکتا ہے، جیسا کہ لفظ ''اذا'' اس کی طرف مشیر ہے یعنی علی سبیل الدوام جس میں یہ باتیں ہوں وہ منافق ہوگا، ان گناہوں میں سے کسی گناہ کا کبھی کبھار مرتکب ہوجائے تو وہ منافق نہیں ہوگا، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، کیونکہ روایت میں ''اذا حدث کذب'' کے الفاظ ہیں اور ''اذا'' یقین ودوام کے لئے آتا ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ منافق وہ ہے جو مداومت کے ساتھ جھوٹ بولے کبھی سچ نہ بولے، اور مومن ہمیشہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ اکثر وبیشتر سچ ہی بولتا ہے یہی حال دوسری خصلتوں کا ہے۔

(۷) یہ روایات مستحل پر محمول ہیں کہ جو شخص ان اعمال کو حلال وجائز سمجھ کر کرے اور زبان سے اس

کا اظہار نہ کرے وہ منافق ہے۔

۵۰/٦: وَعَنْ عَبدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً وَمَنْ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيْهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا: إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَاحَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَاعَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَاخَاصَمَ فَجَرَ. (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت آ گئی جب تک کہ اس کو چھوڑ نہ دے (اور وہ چار باتیں یہ ہیں) (۱) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے (۲) جب بات کرے تو جھوٹ بولے، (۳) جب عہد کرے تو اس کے خلاف کرے، (۴) جب جھگڑے تو گالی گلوچ کرے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح حدیث

کان منافقا خالصا: یہ روایت ان علامات و امور کو حلال و جائز سمجھنے والے پر محمول ہے کیونکہ ایسا شخص ہی منافق خالص ہے۔

(۴) عہد شکنی:

اذاعاھد غدر: ''وعدہ'' اور ''عہد'' میں بعض علماء نے یہ فرق بتایا ہے کہ ''وعدہ'' وہ ہے جو ایک طرف سے ہو اور ''عہد'' وہ ہے جو جانبین سے ہو اور معاہدہ کی پاسداری بھی لازم ہے، خواہ شخصی معاہدہ ہو یا قومی اور ملکی۔

واذاخاصم فجر: منافق کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ جھگڑے کے وقت بدگوئی اور بدزبانی پر اتر آتا ہے اور گالیاں بکنے لگتا ہے، اور سچا مومن لعن طعن، بدگوئی اور فحش گوئی سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے،

(۱) أخرجه البخاري في ثلثة مواضع: "كتاب الإيمان ،باب علامة المنافق ١/ ١٠ برقم ٣٤، وأيضاً كتاب المظالم باب إذاخاصم فجر ١/ ٣٣٢ برقم ٢٣٩٥ وأيضاً "كتاب الجزية والموادعة،باب إثم من عاهدثم غدرالخ ١/ ٤٥١ برقم ٣٠٧٥" ومسلم "كتاب الإيمان ، باب بيان خصال المنافق ١/ ٥٦"

جیسا کہ ایک روایت میں ہے: ليس المؤمن بالطعان و لااللعان و لاالفاحش و لاالبذی۔[۱]

۵۱ / ۷: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثَلُ الْمُنَافِقِ كَالشَّاةِ الْعَائِرَةِ بَيْنَ الْغَنَمَيْنِ تَعِيْرُ إِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً وَإِلٰى هٰذِهٖ مَرَّةً. (رواه مسلم)[۲]

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: منافق کی مثال اس بکری کی سی ہے جو دو ریوڑوں کے درمیان جانے والی ہے (نر کی تلاش میں) کبھی اس طرف جاتی ہے اور کبھی اس طرف جاتی ہے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

منافقین کی مثال:

اس حدیث پاک میں منافقین کی تردد کی حالت کو بکری کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، منافقین اپنے معاملہ میں متردد و حیران رہتے تھے اگر مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی ہوتی اور مال غنیمت ملتا تو غیر اختیاری طور پر ان کا قدم اسلام کی طرف بڑھتا تھا اور اگر کبھی مسلمانوں کو شکست ہوتی تو وہ بڑھتا ہوا قدم رک جاتا اور کفار کے پاس جا کر ان سے کہتے: "اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ [۳]"، یعنی ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مذاق کررہے تھے، ایک دوسری آیت میں ان کے بارے میں ہے: "كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا [۴]"، یعنی جب کبھی بجلی ان کے لئے روشنی کر دیتی ہے تو اس میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں، اس آیت میں روشنی سے مراد فتوحات اور ظلمت سے مراد ان کے ذاتی مفادات ہیں، مطلب یہ ہے کہ جب اسلام کی فتوحات دیکھتے تو اسلام کی طرف راغب ہوتے اور جب اسلامی احکام پر عمل میں ذاتی مفادات متأثر ہوتے دیکھتے تو پھر توقف

(۱) ترمذی ابواب البر والصلة ماجاء في اللعنة: ۱۹۷٤.

(۲) أخرجه مسلم في كتاب الإيمان، باب خصال المنافق ۱ / ۵٦.

(۳) من سورة البقرة: ۱٤.

(٤) من سورة البقرة: ۲۰.

کر لیتے، یہ ان کی تردد کی حالت ہے اس لئے ان کی مثال اس بکری کی سی ہے جو اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لئے کبھی اس ریوڑ میں جائے اور کبھی دوسرے ریوڑ میں، بعض بکریوں میں جنسی خواہش زیادہ ہوتی ہے تو وہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے نر کی تلاش میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر جاتی ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ منافقین کو بکری سے تشبیہ دی ہے اس میں منافقین کی بزدلی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ بکری بزدلی میں ضرب المثل ہے۔

الفصل الثانی

۵۲/۸: عَنْ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّالٍؓ قَالَ: قَالَ يَهُوْدِيٌّ لِصَاحِبِهٖ: اِذْهَبْ بِنَا إِلٰى هٰذَا النَّبِيِّ فَقَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ، لَاتَقُلْ نَبِيٌّ، إِنَّهٗ لَوْسَمِعَكَ لَكَانَ لَهٗ أَرْبَعُ أَعْيُنٍ، فَأَتَيَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَأَلَاهُ عَنْ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَاتُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا، وَلَاتَسْرِقُوْا، وَلَاتَزْنُوْا، وَلَاتَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّابِالْحَقِّ، وَلَاتَمْشُوْا بِبَرِيٍّ إِلٰى ذِيْ سُلْطَانٍ لِيَقْتُلَهٗ، وَلَاتَسْحَرُوْا، وَلَاتَأْكُلُوْا الرِّبَا، وَلَاتَقْذِفُوْا مُحْصَنَةً وَلَاتُوَلُّوْا لِلْفِرَارِ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَعَلَيْكُمْ خَاصَّةً الْيَهُوْدَ، أَنْ لَاتَعْتَدُوْا فِي السَّبْتِ، قَالَ: فَقَبَّلَايَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ، وَقَالَا، نَشْهَدُ أَنَّكَ نَبِيٌّ، قَالَ: "فَمَايَمْنَعُكُمْ أَنْ تَتَّبِعُوْنِيْ؟ "قَالَا، إِنَّ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ دَعَارَبَّهٗ، أَنْ لَايَزَالَ مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ نَبِيٌّ، وَإِنَّا نَخَافُ إِنْ تَبِعْنَاكَ أَنْ يَقْتُلَنَا الْيَهُوْدُ. (رواه الترمذي، وأبوداود، والنسائي)(۱)

ترجمه: حضرت صفوان بن عسالؓ سے مروی ہے کہ (ایک دن) ایک یہودی نے اپنے ایک (یہودی) ساتھی سے کہا کہ: ہمیں ان نبی کے پاس لے کر چلو اس کے ساتھی نے کہا: انہیں نبی نہ کہو، کیونکہ اگر انہوں نے سن لیا (کہ یہودی بھی مجھے نبی کہتے ہیں) تو ان کی چار آنکھیں

(۱) أخرجه الترمذي في موضعين "كتاب الاستيذان، باب ماجاء في قبلة اليد والرجل ۲/ ۱۰۲ وأيضاً "كتاب تفسير القرآن، باب من سورة بني اسرائيل ۲/ ۱٤٦ والنسائي "كتاب المحاربة، باب السحرة" ۲/ ۱۷۱.

الملحوظه: عزاه صاحب المشكاة إلى أبي داود أيضاً، وفيه نظر، لأن المزي لم يعزه إليه في تحفة الأشراف ٤/ ۱۹۱ وقال الحافظ في "الدراية ۲ ۲۳۲" رواه الأربعة إلا أباداوُد، وكذا لم أجد أحداً من المحققين عزاه إليه؛ اللهم أن يقال إنه أراد به الطيالسي لاالسجستاني لأن أباداود الطيالسي قد أخرجه برقم ۱۲۶۰ والله اعلم بالصواب.

ہوجائیں گی، بہرحال وہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اورآپ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے (نو) واضح احکام کے بارے میں سوال کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ قرادو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنانہ کرو (۴) جس جان کا مارنا اللہ نے حرام قراردیا اس کو ناحق قتل نہ کرو (۵) کسی بے گناہ کوقتل کرانے کے لئے حاکم کے پاس مت لیجاؤ (۶) جادو نہ کرو (۷) سود نہ کھاؤ (۸) پاکدامن عورت پرتہمت نہ لگاؤ (۹) جہاد کے دن پشت پھیرکرنہ بھاگو، اوراے یہود! تمہارے لئے خاص طورسے واجب ہے کہ شنبہ کے دن میں حکم الٰہی سے تجاوز نہ کرو، راوی کہتے ہیں کہ: یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پیر چوم لئے اور بولے کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: توپھرمیرااتباع کرنے سے تم کوکیاچیز مانع ہے؟ انہوں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ: داود علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ دعاء کی تھی ’’کہ ان کی اولاد میں ہمیشہ نبی ہوا کرے لہٰذا ہمیں ڈرہے کہ اگرہم آپ کی پیروی کریں تو یہودی ہم کو مارڈالیں گے‘‘ (ترمذی، ابوداود، نسائی)

تشریح حدیث

احوال صفوان بن عسال:

یہ قبیلہ ’’مراد‘‘ کے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب فارس فتح ہوگیا تو کوفہ میں رہنے لگے تھے، ان کی روایات اہل کوفہ کے پاس زیادہ ہیں اورقلیل الروایۃ صحابی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بارہ غزوات میں شرکت فرمائی۔(۱)

واقعۂ حدیث:

ایک مرتبہ مدینہ میں ایک یہودی کے پاس اس کا کوئی مہمان آیا، اس نے میزبان سے کہا کہ ہمیں اس نبی کے پاس لے چلو جونبوت کا دعوی کرتے ہیں، اس پرمیزبان نے کہا کہ نبی مت کہو، اگرانہوں نے تمہاری یہ بات سن لی تو ان کی چارآنکھیں ہوجائیں گی، یہ گستاخی کا کلمہ تھا، بہرحال دونوں آئے اور’’آیات بینات‘‘ کے بارے میں سوال کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چنداحکامات بتلائے جوحدیث

(۱)الإصابة:۳/۳۵۳.

میں مذکور ہیں، ان کے قلب میں غیر اختیاری طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت پیدا ہوگئی، چنانچہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ لیا اور کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ: آپ واقعی نبی ہیں، اس سے ان کا مقصود شہادت دینا اور ایمان قبول کرنا نہیں تھا، بلکہ اپنے علم کو بیان کرنا مقصد تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پھر تم میرا اتباع کیوں نہیں کرتے؟ تو ان دونوں نے کہا کہ: حضرت داود علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ: ان کی ذریت میں ہمیشہ کوئی نبی رہے اور ظاہر ہے کہ ان کی دعا قبول ہوئی ہوگی، لہٰذا کوئی نبی ہم میں سے بھی آئے گا ہم اس پر ایمان لائیں گے، اور آپ بنی اسماعیل میں سے ہیں، اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہود ہمیں قتل کردیں گے۔

چار آنکھوں کا مطلب:

لکان له أربع اعین: چار آنکھیں ہوجانے سے کیا مراد ہے؟ اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض علماء نے کہا کہ یہ کنایہ ہے غایت سرور سے کہ اگر انہوں نے سن لیا تو وہ بہت خوش ہوں گے اس لئے وہاں انہیں نبی نہ کہنا، فرحت وسرور سے بینائی میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ غم کی وجہ سے بینائی متاثر ہوجاتی ہے، چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی غم فراق میں چلی گئی تھی۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے قوت سے یعنی اگر انہوں نے سن لیا تو ان کو قوت حاصل ہوگی کہ اب تو مخالفین ویہود بھی ہم کو نبی ماننے لگے ہیں۔

(۳) بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے شدت انتظار سے، یعنی تم انھیں نبی کہوگے تو پھر وہ تمہارے ایمان لانے کا انتظار کریں گے کہ آج انہوں نے اپنی زبان سے نبی کہا ہے تو کل ایمان بھی لاسکتے ہیں، ''اعین'' اور ''انتظار'' میں مناسبت یہ ہے کہ آدمی جدھر انتظار کرتا ہے ادھر نظریں بھی لگ جاتی ہیں۔

فسألاه عن آیات بینات: یہاں دو نسخے ہیں، ایک نسخہ کے الفاظ تو یہی ہیں اور دوسرے نسخہ میں **تسع آیات بینات** آیا ہے، یہی دوسرا نسخہ راجح ہے اور شروح مشکوۃ میں بھی یہی لیا گیا ہے۔

اب یہاں بحث یہ ہے کہ **تسع آیات بینات** سے کیا مراد ہے؟

(۱) بعض علماء نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نو معجزات عطا کئے گئے تھے وہ مراد ہیں، ان

---

(۱) اللمعات ۱/۳۰۴ والمرعاۃ ۱/۳۳۵-۳۳۶.

نومعجزات میں سے سات کا تذکرہ اس رکوع میں ہے: وَلَقَدْ أَخَذْنَاآلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتالآية[1] قحط، نقصِ ثمرات، طوفان، ٹڈیاں، جوں، مینڈک اور خون کا عذاب، یہ اس لحاظ سے معجزات ہیں کہ جب عذاب آتا ہے تو بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایمان لانے کا وعدہ کرتے اور دعا کی درخواست کرتے، ان کے وعدۂ ایمان پر موسیٰ علیہ السلام دعاء کرتے جس سے عذاب رفع ہوجاتا لیکن وہ ایمان نہ لاتے، آٹھواں معجزہ عصا اور نواں معجزہ ید بیضاء ہے۔

لیکن اگر یہ نومعجزات مراد لئے جائیں تو اس وقت سوال وجواب میں مطابقت نہیں ہوگی کیونکہ ان لوگوں نے نومعجزات کے بارے میں سوال کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معجزات کے بجائے ان کو احکام بتلائے اس کا جواب یہ ہے کہ:

یہاں راوی نے اختصار کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً نومعجزات بیان فرمائے تھے اور پھر اضافہ فی الجواب کے طور پر کچھ احکام بیان کئے، راوی نے ان معجزات کو یہاں ذکر نہیں کیا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے یہ معجزات قرآن پاک میں مذکور ہونے کی وجہ سے عوام وخواص میں مشہور ہیں اس لئے راوی نے ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں سمجھی، اضافہ فی الجواب کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام بتائے راوی نے صرف ان کو بیان کیا۔[2]

(۲) دوسرا قول یہ ہے کہ "تسع آیات بینات" سے مراد نومعجزات نہیں، بلکہ وہ احکام مراد ہیں جو سب شریعتوں اور تمام ملتوں میں مشترک رہے ہیں اور ان ہی احکام کا بیان یہاں روایت میں ہے، اس صورت میں بھی سوال اور جواب میں مطابقت نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس احکام بیان فرمائے حالانکہ سوال نو احکام کے متعلق تھا، جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال کے جواب میں نو احکام بتائے پھر اضافہ فی الجواب کے طور پر مزید ایک حکم بیان فرمایا جو خاص طور سے یہود کے حال کے مناسب تھا وہ یہ کہ یوم السبت کا احترام اور اس میں عبادت کا اہتمام کریں۔[3]

<u>ولاتمشوا ببريءٍ إلى ذي سلطان: ان احکامات ونواہی میں سے بیشتر کا بیان گذشتہ احادیث میں</u>

(۱) من سورة الأعراف: ۱۳۰-۱۳۳.

(۲) لمعات التنقيح ۱/ ۳۰۴-۳۰۵.

(۳) اللمعات ۱/ ۳۰۴-۳۰۵.

آچکا ہے،ایک گناہ جو''قتل نفس'' ہی کی ایک خاص صورت ہے جیسا کہ اوپر''الا بالحق'' کے ذیل میں ذکر کیا گیا تھا، اس کو یہاں حدیث میں مستقلاً ذکر کیا گیا، کیونکہ یہود اس میں ملوث تھے اوراس حدیث کے مخاطب یہود ہی تھے کیونکہ وہی سائل ہیں، یہود میں یہ خرابی تھی کہ وہ بے قصور آدمی کی بادشاہ سے شکایت کرتے اور اس کو قتل کرادیتے تھے،آپ نے اس سے منع فرمایا کہ یہ بھی قتل نفس ہی ہے اور شکایت کرنے والا ہی اصل قاتل سمجھا جائے گا۔

"**ذی سلطان**" اس سے ہر صاحب اقتدار مراد ہے، کیونکہ معنی ہیں: غلبہ والا، خاص ''بادشاہ'' مراد نہیں۔ (۱)

ولاتقذفوا محصنة :**محصنة** بفتح الصاد وکسرہا دونوں ضبط ہیں،**محصنة** بکسر الصاد کے معنی ہیں عزت کی حفاظت کرنے والی عورت اور **محصنة** بفتح الصاد کے معنی ہیں وہ عورت جس کی عصمت کی حفاظت کی گئی ہو۔ (۲)

جبین بوسی، ید بوسی، اورقدم بوسی کا حکم:

قال فقبلایدیه ورجلیه تعظیماً: ملاقات ہونے پر یا رخصت ہوتے وقت ہاتھ اور چہرے کو بوسہ دینا جائز ہے بشرطیکہ وہ قابل تعظیم ہومثلا عالم دین، استاذ، والدین، منصف بادشاہ، اور جو قابل تعظیم نہ ہو اس کے چہرے وہاتھوں کو بوسہ دینا جائز نہیں، الا یہ کہ دفع شر مقصود ہو، اور پیروں کو چومنا درست نہیں خواہ وہ قابل تعظیم ہو، کیونکہ اس میں جھکنا پڑے گا اور سجدہ کی سی حالت ہوجائے گی، جوممنوع ہے، لیکن یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہیں روکا اس سے تو قدم بوسی کا جواز معلوم ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ ابھی احکام شریعت کے مکلّف نہیں تھے اوران کے اس عمل میں اسلام کا غلبہ تھا، اس لئے آپ نے ان کو ایسا کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ (۳)

وقالانشهدانک نبی: ''**نشهد**'' سے''**نعلم**'' مراد ہے، کیونکہ وہ ایمان نہیں لائے اور ایمان لانا ان کا مقصود بھی نہ تھا بلکہ ان کے قلب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے برحق ہونے کا غیر اختیاری طور پر جو احساس پیدا ہوا اس کا اظہار مقصود تھا۔

---

(۱)مرعاة المفاتیح ۱ /۳۳۷.

(۲)المرعاة ۱ /۳۳۷.

(۳)تحفة الأحوذي (۷ /۴۳۸)

قالاإن داود عليه السلام :دعاربه الخ : ان دونوں نے حضرت داوٗدعلیہ السلام کی دعاء کا حوالہ دیا اور ایمان قبول نہیں کیا، اس دعاء کی حقیقت کیا ہے؟ اس بارے میں چنداقوال ہیں:

(۱) بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ افترائے محض ہے داود علیہ السلام نے ایسی کوئی دعانہیں کی ہے۔(۱)

(۲) اور بعض نے کہا کہ ممکن ہے کہ داود علیہ السلام نے اس نوع کی دعا کی ہولیکن ان کی مراد یہ ہوگی کہ نبی آخرالزماں تک میری اولاد میں نبوت کو باقی رکھا جائے، اس لئے کہ نبی آخرالزماں کی اطلاع سب نبیوں کوتھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بنی اسماعیل سے ہوں گے۔(۲)

(۳) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر زندہ ہیں اور قرب قیامت میں دنیامیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بن کرآئیں گے اور شریعت محمدیہ کے مطابق عمل اور فیصلے کریں گے؛ لیکن ان کا وصف نبوت باقی رہے گا اس لحاظ سے من وجہ داود علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی کہ قرب قیامت تک ان کی آل میں نبی موجود رہیں گے جیسے ایک علاقہ کا گورنرکسی دوسرے علاقہ میں چلاجائے تو وہ احکام میں دوسرے کے تابع ہوگا لیکن اس کا وصفِ گورنری باقی رہے گا۔(۳)

حدیث کی ترجمۃ الباب سے مناسبت:

اس حدیث کی ابتداء میں ''لاتشركوا بالله'' وغیرہ میں کبائر کا بیان ہے اس لحاظ سے حدیث کی ترجمہ کے اول جزو سے مناسبت ہے اور بعض نے کہا کہ اس حدیث میں نفاق کا بیان ہے اور یہ حدیث ترجمہ کے دوسرے جزء ''علامات النفاق'' سے متعلق ہے کیونکہ ان دونوں یہودیوں کا ایمان نہ لانا تو اپنی نفسانیت کی وجہ سے تھا اورانہوں نے بہانہ بنایاداوٗد علیہ السلام کی دعاکو، پس ان کی اس روش میں اظہار خلاف الباطن ہے جوعرفی لحاظ سے نفاق ہے۔(۴)

۵۳ / ۹: وَعَنْ أَنَسٍ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "ثَلٰثٌ مِنْ أَصْلِ الإِيْمَان: اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ: لاإِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ، لاتُكَفِّرْهُ بِذَنْبٍ، وَلاتُخْرِجْهُ مِنَ الإِسْلَامِ

(۱)شرح المشكاة للطيبي۲ /۵۱۲.

(۲)ذخيرة العقبى في شرح المجتبى ۳۲ /۳۹(۴۰۸۰)

(۳)مرقاة المفاتيح ۱ /۲۱۷.

(۴)شرح الطيبى ۱ /۲۱۰.

بِعَمَلٍ، وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُذْبَعَثَنِيَ اللّٰهُ إِلٰى أَنْ يُقَاتِلَ آخِرُهٰذِهِ الْأُمَّةِ الدَّجَّالَ، لايُبْطِلُهُ جَوْرُجَائِرٍ، وَلاعَدْلُ عَادِلٍ وَالإِيْمَانُ بِالْأَقْدَارِ ''(رواه ابوداود)[1]

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تین باتیں ایمان کی جڑ ہیں (۱) جو شخص لا الہ الا اللہ کا اقرار کرے اس سے ہاتھ (جنگ) روک لینا، اب کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر مت کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج قرار دو، (۲) اور جہاد جاری رہے گا جس وقت سے کہ اللہ نے مجھے مبعوث فرمایا یہاں تک کہ اس امت کے آخر میں ایک شخص دجال سے قتال کرے، کسی عادل کا عدل یا کسی ظالم کا ظلم جہاد کو ختم نہیں کرسکتا۔ (۳) اور تقدیر پر ایمان لانا۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

اس حدیث پاک میں تین احکام مذکور ہیں ان کے خلاف کرنے میں کبائر کا ارتکاب ہوگا اسلئے باب الکبائر سے مناسبت ہے۔

اصول ایمان:

ثلث من اصل الایمان: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں ایمان کی بنیاد ہیں، ان کے خلاف کرنے میں ایمان کی بنیاد ختم ہوجائے گی، وہ یہ ہیں:

(۱) تکفیر سے احتیاط:

الکف عمن قال لااله الا الله: اپنے آپ کو اس شخص سے روکنا جو لا الہ الا اللہ کہے، یعنی ایسے شخص کے جان و مال سے تعرض نہ کیا جائے، یہ نہ کہو کہ یہ تو ظاہراً کلمہ پڑھ رہا ہے نہ کہ دل سے، اس لئے اس کا مال اور دم مباح ہے، کیونکہ تم ظاہر کے مکلّف ہو، دل کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، اس لئے اس کو کافر سمجھ کر جانی یا مالی نقصان پہنچانا تمہارے لئے حرام ہے، نیز فرمایا کہ: ایسے شخص کو گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو اور نہ کسی عمل کی وجہ سے اس کو اسلام سے نکالو۔

(۱) أخرجه أبو داود في ''كتاب الجهاد، باب في الغزو مع الأئمة الجور ۱ / ۳٤۳۔

اس سے معلوم ہوا کہ ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے آدمی کافر نہیں ہوتا، لہذا اس سے خوارج ومعتزلہ دونوں کی تردید ہوجاتی ہے، کیونکہ خوارج کبیرہ گناہ کی وجہ سے مسلمان کو کو کافر کہتے ہیں اور معتزلہ بھی کبائر کی وجہ سے مسلمان کو اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں اگرچہ خوارج کی طرح کافر نہیں کہتے۔

"ذنب" اور "عمل" سے مراد وہ ذنب اور عمل ہے جو فسق وفجور کے قبیل سے ہو، لیکن اگر ایسا گناہ یا عمل ہے جو موجب کفر ہے تو بہرحال اس کو اسلام سے خارج اور کافر قرار دیا جائے گا۔

"لاتكفره" اور "لاتخرجه" ان میں دو ضبط ہیں: ایک صیغۂ خطاب کے ساتھ اور دوسرا صیغۂ جمع متکلم کے ساتھ، اول کے مطابق یہ نہی کا صیغہ ہے اور ثانی ضبط کے مطابق یہ خبر ہوگی صاحب شریعت کی طرف سے۔[1]

(۲) جہاد:

والجهاد ماض مذ بعثني الله: اس جملہ میں دوسری اصل جہاد کا بیان ہے اور **الأصل الثاني** یا **الخصلة الثانية** مبتدا محذوف ہے اور **الجهاد** اس کی خبر ہے، "ماض" "هو" مبتدا محذوف کی خبر ہے **اي: هو ماض** اور مطلب یہ ہے کہ جہاد دین کی اصل وبنیاد اور دائمی فریضہ ہے، وہ کبھی منسوخ نہیں ہوگا اور ہمیشہ وہر حال میں کیا جائے گا اور چونکہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنے والے پیدا ہوتے رہیں گے اس لئے اس کی ضرورت بھی ہمشہ باقی رہے گی یہاں تک کہ اس امت کا آخر ہوجائے گا۔[2]

اس سے مرزا غلام احمد قادیانی کی تردید ہوجاتی ہے جو یہ کہتا تھا کہ جہاد منسوخ ہوگیا، آپ علیہ السلام نے اس حدیث میں زبانی طور پر اس کے غیر منسوخ ہونے کی خبر دی اور عملی طور پر بھی آپ اخیر عمر تک جہاد میں لگے رہے، اور آپ کے بعد کوئی حکم شرعی منسوخ نہیں ہوسکتا، لہٰذا مرزا قادیانی کی بات بے معنی اور مہمل ہے۔

ایک اشکال وجواب:

"مذ بعثني" اس پر اشکال ہے کہ اول بعثت میں تو جہاد کی اجازت نہیں تھی بلکہ عفو ودرگذر کا حکم تھا، جیسا کہ اس آیت میں ہے "فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ[3]"، پھر یہ کیوں فرمایا کہ جہاد اول

(۱) التقرير الرفيع ۱/ ۱۰۰ والمرعاة ۱/ ۴۳۹.

(۲) شرح الطيبي ۱/ ۲۱۰.

(۳) من سورة البقرة: ۱۰۹.

بعثت سے مشروع ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہاں بعثت کے اصطلاحی معنی مراد نہیں بلکہ لغوی معنی یعنی بعثت الی المدینہ یا بعثت الی الجہاد مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس وقت سے جہاد کی اجازت اور اس کا حکم نازل ہوا ہے اس وقت سے لے کر قرب قیامت تک جہاد جاری رہے گا، اور اصل یہاں جہاد کی ابتداء کو بتانا مقصود نہیں بلکہ اس کی انتہاء کو بتانا اصل مقصود ہے۔ (۱)

اخیر زمانہ میں جہاد:

الی أن یقاتل آخر هذه الأمة: یہاں امت سے امت اجابت مراد ہے امت دعوت نہیں، اور ''**آخر هذه الأمة**'' سے کوئی شخص خاص مراد نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی اور ان کے زمانہ کے لوگ مراد ہیں، اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے فرد خاص یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے قبل حضرت مہدی دجال کے لشکر سے قتال کریں گے دجال قتل نہ ہو سکے گا، حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور وہ دجال کو قتل کریں گے۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس امت کے لوگوں میں سے شمار کیا گیا، کیوں کہ وہ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ بن کر آئیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق ہی فیصلے کریں گے اس لحاظ سے ان کا شمار امتِ محمدیہ میں کیا گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام جہاد کو منسوخ فرمائیں گے پھر جہاد ختم ہوجائے گا، اس لئے کہ اس کے بعد یا تو جہاد کی طاقت نہیں رہے گی یا ضرورت نہیں رہے گی، کیوں کہ قتل دجال کے بعد خروج یاجوج ماجوج ہوگا اور وہ پوری دنیا میں پھیل جائیں گے مسلمانوں میں ان سے لڑنے کی طاقت نہیں رہے گی، اس وقت عیسیٰ علیہ السلام تمام مسلمانوں کو ایک پہاڑ پر لے کر چلے جائیں گے، پھر یاجوج ماجوج ختم ہوجائیں گے، اس کے بعد روئے زمین پر تمام لوگ مسلمان ہونگے، پھر عیسی علیہ السلام کی وفات ہوجائے گی اور کچھ عرصہ کے بعد اللہ کی طرف سے ایک پاکیزہ ہوا چلے گی جس کے نتیجہ میں تمام مسلمان وفات پا جائیں گے اور پھر دنیا میں صرف کفار باقی رہ جائیں گے اور ان ہی پر قیامت قائم ہوگی، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قتل دجال کے بعد جہاد کی ضرورت نہیں رہے گی یا طاقت نہیں رہے گی۔

(۱) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۱۷.

لايبطله جور جائر: جہاد کے ختم ہونے کی دوصورتیں ہوسکتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی نفی فرمادی، وہ یہ کہ جہاد امیر کے ماتحت ہوتا ہے، امیر یا عادل ہوگا یا ظالم، اگر امیر ظالم ہوتو مسلمانوں کو عذر ہوسکتا تھا کہ ظالم امیر کے ساتھ ملکر کیسے جہاد کیا جاسکتا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نفی فرمادی: ''**لايبطله جور جائر**'' کہ ظالم کا ظلم اس کو ختم نہیں کرسکتا، کیونکہ جہاد کا مقصد اسلام کا غلبہ ہے اور یہ مقصد ظالم امیر کی امارت میں جہاد کرنے سے بھی حاصل ہوجائے گا، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''**الجهاد واجب عليكم مع كل امير براً كان أو فاجراً**''[1] یعنی ہر امیر کے ساتھ ملکر جہاد کرنا تمہارے اوپر فرض ہے، امیر نیک ہو یا بد، چنانچہ حضرات صحابہ نے ظالم امیر کی امارت میں بھی جہاد کیا ہے، یزید بن معاویہ فاسق تھا لیکن اس وقت اہل روم کے ساتھ بڑے بڑے جہاد ہوئے، اسی کے زمانہ میں قسطنطنیہ فتح ہوا اور اسی سفر میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی شہادت ہوئی۔

ولاعدل عادل: دوسرا عذر یہ ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کا امیر عادل ہو اور مسلمان سکون وچین کی زندگی بسر کررہے ہوں، اس وقت یہ خیال ہوسکتا تھا کہ ایسے سکون کے وقت میں جہاد کی کیا ضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا: ''**ولاعدل عادل**'' کہ بادشاہ چاہے عادل ہو لیکن کفار کو مرعوب کرنے اور ان کا سر کچلنے کے لئے اس امن کے زمانہ میں بھی جہاد کیا جائے گا۔

''**لايبطله**'' اس میں دو احتمال ہیں: یا تو یہ نفی ہے یا نہی، اگر نفی ہے تو یہ خبر اور پیش گوئی ہے، یعنی ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل جہاد کو ختم نہیں کرے گا، شراح نے اس حدیث کے ضمن میں عمل جہاد کے تسلسل کو بیان فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے اب تک جہاد مسلسل جاری رہا ہے، چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی، اور اگر یہ نہی ہو تو اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل تم کو جہاد سے نہ روکے ورنہ تم گنہگار ہوگے۔

(۳) تقدیر پر ایمان:

والايمان بالأقدار: ایمان کی تیسری بنیاد تقدیر پر ایمان لانا ہے، کہ جو کچھ ہوچکا یا ہورہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اللہ کو ازل سے معلوم ہے، ہر چیز کا وقوع اللہ کی مشیت اور اس کی قدرت سے ہوتا ہے،

(۱) رواه ابوداود، كتاب الجهاد، باب في الغز ومع ائمة الجور (۲۵۳۳)

آئندہ مستقل باب کے تحت اس کی تفصیلات آرہی ہیں۔

۵٤ / ۱۰: وعن أبي هريرةؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إِذَازَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الإِيْمَانُ، فَكَانَ فَوْقَ رَأْسِهِ كَالظُّلَّةِ، فَإِذَاخَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ رَجَعَ إِلَيْهِ الإِيْمَانُ" (رواہ الترمذی، وأبوداود)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس سے نکل جاتا ہے اوراس کے سر پر سائبان کی طرح معلق رہتا ہے پھر جب وہ اس گناہ سے فارغ ہوجاتا ہے تو ایمان اس کی طرف لوٹ آتا ہے۔ (ترمذی، ابوداود)

تشریح حدیث

خوارج ومعتزلہ کی تردید:

اس حدیث کا خلاصہ پہلے گذرچکا ہے کہ گناہ کے وقت ایمان آدمی سے نکل جاتا ہے لیکن اس وقت بھی مثل سائبان کے اس کے سر پر رہتا ہے، بندہ جب گناہ سے ہٹ جاتا ہے تو ایمان واپس لوٹ آتا ہے۔

پس زانی یامرتکب کبیرہ کو کافر یاخارج ازاسلام قراردینا درست نہیں، جیسا کہ خوارج یا معتزلہ کا مذہب ہے۔

الفصل الثالث

۵۵ / ۱۱: عن معاذٍؓ قالَ: أَوْصَانِي رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بعَشْرِ كلماتٍ، قال: "لاتُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئاً وَإِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ، وَلاتَعُقَّنَّ وَالِدَيْكَ وَإِنْ اَمَرَاكَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ أَهْلِكَ وَمَالِكَ، وَلاتَتْرُكَنَّ صَلاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّداً؛ فَإِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلاةً مَكْتُوْبَةً مُتَعَمِّداً فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ، وَلاتَشْرَبَنَّ خَمْراً فَإِنَّهُ رَأْسُ كُلِّ فَاحِشَةٍ، وَإِيَّاكَ وَالْمَعْصِيَةَ؛ فَإِنَّ بِالْمَعْصِيَةِ حَلَّ سَخَطُ اللّٰهِ، وَإِيَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَإِنْ هَلَكَ النَّاسُ، وَإِذَا أَصَابَ النَّاسَ مَوْتٌ وَأَنْتَ فِيْهِمْ فَاثْبُتْ، وَأَنْفِقْ عَلٰى

(۱) أخرجه أبوداود في "كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الإيمان ونقصانه ۲ / ٦٤٤، وذكره الترمذي تعليقاً في "كتاب الايمان، باب لايزني الزاني وهو مؤمن" ۲ / ۹۰.

عِيَالِكَ مِنْ طَوْلِكَ، وَلاتَرْفَعْ عَنهُمْ عَصَاكَ أَدَباًوَأَخِفْهُمْ فِي اللّٰهِ" (رواہ احمد)(۱)

تـرجمه: حضرت معاذؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دس باتوں کی وصیت فرمائی چنانچہ فرمایا(۱) کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اگرچہ تمھیں جان سے مارڈالا جائے اور جلادیا جائے (۲) اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو، اگرچہ وہ تمھیں اپنے اہل اور مال چھوڑنے کا حکم دیں (۳) جان بوجھ کر کوئی فرض نماز نہ چھوڑو کیونکہ جو شخص جان بوجھ کر فرض نماز چھوڑتا ہے اللہ کا ذمہ اس سے بری ہوجاتا ہے (۴) شراب نہ پیو کیونکہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے (۵) اللہ کی نافرمانی کرنے سے بچو کیونکہ نافرمانی کرنے سے اللہ کا غصہ اتر آتا ہے (٦) جہاد میں بھاگنے سے پرہیز کرو، اگرچہ (تمہارے ساتھ کے) تمام لوگ ہلاک ہوجائیں (۷) جب لوگوں میں موت (وباء کی صورت میں) پھیل جائے اور تم ان میں موجود ہو تو ثابت قدم رہو (یعنی ان کے درمیان سے بھاگو مت) (۸) اپنے اہل وعیال پر وسعت کے مطابق خرچ کرتے رہو (۹) تادیباً اپنا ڈنڈا ان سے نہ ہٹاؤ (۱۰) اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ان کو ڈراتے رہو۔ (احمد)

تشریح حدیث

دس باتوں کی نصیحت:

اس حدیث پاک میں کبائر کا بیان ہے اور یہ ترجمہ کے پہلے جزو یعنی ''الکبائر'' سے متعلق ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ فقیہ اور سمجھدار تھے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اہتمام کے ساتھ نصیحتیں فرماتے تھے، یہاں آپ علیہ السلام نے ان کو دس نصیحتیں فرمائیں، معاذ نام کے بہت سے صحابی ہیں لیکن مطلق بولنے کیوقت اس سے معاذ بن جبل مراد ہوتے ہیں، کیونکہ وہ معروف ومشہور تھے۔

أوصـــانـــي: یہاں وصیت سے مراد تاکیدی حکم ہے، اس لئے کہ وصیت کو پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔(۲)

---

(۱) أخرجه احمد ٥ / ٢٣٨ برقم ٢٢١٢٨.

(۲) مرقاة المفاتيح ١ / ٢١٩ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(۱)لا تشرک باللہ شیئاوإن قتلت وحرقت :یعنی شرک مت کرنا خواہ تمہیں ماردیا جائے یاجلادیا جائے۔

حالت اکراہ میں کفریہ کلمہ کہنے کا مسئلہ:

اس پر یہ سوال ہے کہ اکراہ کی وجہ سے کلمۂ کفرزبان سے ادا کرنا جائز ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:''اِلَّامَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيْمَان'' [1] یعنی جس پر جبر کیا جائے اوراس کا دل ایمان پرمنشرح ہو وہ کافرنہیں ہوگا، خواہ زبان سے کفریہ کلمہ کہدے،لیکن یہاں فرمایا گیا کہ خواہ جان چلی جائے مگرشرک کی بات نہ کہو، اس کے دوجواب دیئے گئے ہیں:

(۱)یہ حکم خاص ہے حضرت معاذؓ کے ساتھ کہ وہ جلیل القدرصحابی تھے اُن کا مرتبہ بڑا تھااور بڑے لوگوں کے لئے حکم بھی سخت ہوتا ہے،مقولہ مشہور ہے حسنات الأبرار سیئات المقربین یعنی جو امورنیک لوگوں کے حق میں حسنات سمجھے جاتے ہیں مقرب اورخاص لوگوں کی جانب سے ان کا ارتکاب برا شمارہوتا ہے، اسی طرح آیت کریمہ''یٰنِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ''میں صاف کہدیا گیا کہ نبی علیہ السلام کی بیویاں اپنے آپ کو عام عورتوں کی طرح نہ سمجھیں،یعنی ان کی جانب سے معمولی فروگزاشت بھی بڑا جرم ہوگا۔[2]

(۲)یہاں حدیث میں عزیمت کابیان ہے اورقرآن کی مذکورہ آیت میں رخصت کابیان ہے، یہی دوسراجواب راجح ہے۔[3]

بیوی کوطلاق دینے کے بارے میں والدین کی اطاعت کاحکم:

(۲)ولا تعقن والديكوان امراک ان تخرج من اهلک ومالک: اس سے مراد بیوی کو طلاق دینے کا اور مال کوخرچ کرنے کاحکم ہے کہ اگروہ اس کاحکم دیں اس میں بھی ان کی نافرمانی نہ کی جائے،تو والدین اگر بیوی کوطلاق دینے کاحکم دیں تو ان کی اطاعت واجب ہے یانہیں؟ مسئلہ یہ ہے کہ بیوی کے حال کودیکھا جائے گا اگر بیوی کاقصورنہ ہوتو بلاوجہ والدین کے حکم کی اطاعت واجب نہیں اوراگر بیوی

(۱)من سورة النحل:١٠٦.
(۲)سورة الأحزاب:٣٢.
(۳)لمعات ١/ ٣١١.

کا قصور ہو اور وہ اس کا ازالہ نہ کرتی ہو تو اب ان کی اطاعت کرنا واجب ہوگا، یہی تفصیل مال میں بھی جاری ہوگی، مثلاً اگر مال ضرورت سے زائد ہو تو ان کے حکم کی تعمیل واجب ہوگی اور اگر خود کو ضرورت ہے تو پھر تعمیل واجب نہیں۔

اور حدیث اسی دوسری شکل پر محمول ہے، اور حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ: ''وان امراک الخ'' میں والدین کی اطاعت میں مبالغہ مقصود ہے کہ ان کے حکم کو بجالاؤ خواہ نفس پر کتنا ہی شاق گذرے لہذا مبالغہ مقصود ہے نہ کہ حقیقت۔ (۱)

(۳) ولاتترکن صلاۃ المکتوبۃ: فرض نماز کو جان بوجھ کر مت چھوڑو کہ اس سے آدمی اللہ کے امان سے نکل جائے گا، امان سے نکل جانے کا کیا مطلب ہے؟ اس میں اختلاف ہے: امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ مرتد ہوگیا لہٰذا اس کو قتل کیا جائے، امام شافعی اور مالک فرماتے ہیں کہ اس کو حداً قتل کیا جائے، امام صاحب فرماتے ہیں کہ یہ اللہ کی امان میں نہیں رہا لہٰذا اس کو قید خانہ میں ڈال دیا جائے، تفصیل پہلے آچکی ہے۔

(۴) ولاتشربن خمرا فإنہ راس کل فاحشۃ: شراب مت پینا اس لئے کہ وہ ہر برائی کی جڑ ہے، کیونکہ آدمی کو گناہوں سے روکنے والی چیز عقل ہے اور شراب سے عقل زائل ہوجاتی ہے، پھر آدمی بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا ہوسکتا ہے، اسی لئے شراب کو ''ام الخبائث'' کہا جاتا ہے اور نماز برائیوں سے روکتی ہے اس لئے نماز کو ''ام العبادات'' کہا جاتا ہے۔

(۵) وإیاک والمعصیۃ: معصیت سے دور رہنا، کیونکہ انسان اس کی وجہ سے اللہ کی ناراضگی وغصہ کا مستحق بن جاتا ہے، یہ تعمیم بعد التخصیص ہے کہ ماقبل میں بھی معاصی کا ہی تذکرہ ہے۔

(۶) وایاک والفرار من الزحف: پہلے آچکا ہے کہ اگر کفار مسلمانوں سے دوگنا سے زیادہ ہوں یا اپنی جماعت سے مدد حاصل کرنا یا پلٹ کر حملہ کرنا مقصود ہو تو مقابلہ سے ہٹ جانا جائز ہے، پس یہاں حدیث میں عزیمت کا بیان ہے، اور عزیمت یہی ہے کہ ہر حال میں مقابلہ کرے، فتح ملے گی تو غازی کہلائے گا ورنہ شہید ہوگا۔

---

(۱) المرعاۃ ۱/ ۳٤۸.

(۷) وإذا أصاب الناس موت الخ: اگر کسی بستی میں وبا پھیل جائے تو اس بستی سے نہ نکلے، اس لئے کہ ایسا کرنے سے عقیدہ خراب ہوگا کہ وبا کی بستی میں رہنا موت کا سبب ہوتا اور وہاں سے نکلنا زندگی کا سبب ہوا، حالانکہ موت وحیات تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، اور دوسری حدیث میں ہے کہ اگر تم وبا کی بستی سے باہر ہو تو وبا کے زمانہ میں داخل نہ ہو۔(۱) کیونکہ اس میں بھی عقیدہ کی خرابی ہے کہ اگر اس بستی میں جاکر قضا وقدر کے تحت اس کی موت واقع ہوگئی تو لوگوں کا عقیدہ یہ ہوگا کہ اس بستی میں جانے سے موت واقع ہوئی ہے حالانکہ موت وحیات ہر دو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔

(۸) وانفق علی عیالک من طولک: ''طول'' کی دو تفسیریں کی گئی ہیں (۱) أی من فضل مالک یعنی اپنے زائد مال سے خرچ کرو، زائد سے مراد وہ مال جو اپنے اوپر خرچ کرنے کے بعد بچے۔

(۲) ای بقدر وسعک یعنی اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرو، اِسی لئے بیوی کا نفقہ شوہر کے حال کے مطابق ادنیٰ اوسط وغیرہ واجب ہوتا ہے۔

(۹) ولا ترفع عنهم عصاک: پہلے جملہ سے شبہ ہوسکتا تھا کہ اہل وعیال پر وسعت کے ساتھ خرچ کرنے سے وہ عیش وعشرت میں نہ پڑ جائیں اس لئے فرمایا کہ اتنا عیش نہ دو کہ وہ بے ادب ہوجائیں بلکہ اسلامی آداب ان کو سکھاؤ، اور اگر تادیب کے لئے مارنے کی ضرورت پیش آئے تو اس سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔

(۱۰) واخفهم فی الله: اور ان کو اللہ کے بارے میں ڈراتے رہو، تاکہ ان کے قلوب میں اللہ کا خوف پیدا ہوجائے اور شریعت کے اتباع کا جذبہ ان کے اندر آجائے۔

۵۶ / ۱۲: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: إِنَّمَا النِّفَاقُ كَانَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَمَّا الْيَوْمَ فَإِنَّمَا هُوَ الْكُفْرُ أَوِ الْإِيْمَانُ. (رواہ البخاری)(۲)

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ نفاق کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا، اب دو ہی صورتیں ہونگی یا کفر ہوگا یا ایمان۔ (بخاری)

(۱) بخاری ۱/ ۴۹۴، رقم: ۳۴۷۳ ولفظه: الطاعون رجس أرسل علی طائفة من بنی اسرائیل وعلی من کان قبلکم، فإذا سمعتم بأرض فلا تقدموا علیه وإذا وقع بارض وأنتم بها فلا تخرجوا فرارا عنه.

(۲) أخرجه البخاری فی کتاب الفتن، باب إذا قال عند قوم شیئاً ثم خرج فقال بخلافه ۲/ ۱۰۵۴ برقم (۶۸۳۱)

تشریح حدیث

احوال حذیفہؓ:

حذیفہ بن یمان العبسی جلیل القدر صحابی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب اور راز دار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منافقین کے نام اور احوال بتا دیئے تھے، اس لئے ان کو ''صاحبَ سرِّ رسول الله صلى الله عليه وسلم'' کہا جاتا ہے، حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ اگر کسی کے جنازہ میں حذیفہؓ کو دیکھتے تو خود بھی شریک ہوتے ورنہ شریک نہ ہوتے، آپ فاتحِ ایران میں سے ہیں، مدائن جو ایران کا دارالسلطنت تھا اس میں ایوان کسری کے پاس آپ کی قبر ہے، ۳۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ (۱)

کیا نفاق اور منافقین آج بھی پائے جاتے ہیں؟

انما النفاق كان على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم: ایک مرتبہ حضرت حذیفہؓ کے سامنے نفاق کا تذکرہ آیا تو انھوں نے فرمایا کہ نفاق کا حکم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا اور اب یا تو کفر ہے یا ایمان۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نفاق کا حکم یہ تھا کہ منافقین پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوتے تھے مسلمانوں کی طرح ان کے جان و مال محفوظ رہتے تھے حالانکہ عنداللہ وہ کافروں سے بدتر تھے: ''اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۲)'' اور یہ حکم چند مصلحتوں کی وجہ سے تھا:

(۱) تکثیر سواد مسلمین، یعنی کفار ان کو بھی مسلمان سمجھتے تھے، اور اس سے مسلمانوں کی جماعت میں ظاہراً اضافہ ہوتا تھا، اس وقت میں اس کی ضرورت بھی تھی کہ کفار مسلمانوں کی تعداد زیادہ دیکھ کر حملہ آور ہونے کی ہمت نہ کرتے تھے۔

(۲) انکو مانوس کرنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ اخلاق کریمانہ سے پیش آتے اسی وجہ سے ان میں سے بہت سے لوگ صدق دل سے ایمان بھی لے آئے۔

(۳) دفع سوء ظن، کہ اگر ان کو قتل کیا جاتا تو کفار بدگمان ہوتے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو بھی

---

(۱) المرقاة ۱ / ۲۲۱.

(۲) من سورة النساء: ۱۴۵.

نہیں بخشا ہے۔

لیکن اب چونکہ اسلام کا غلبہ ہوگیا اور یہ مصلحتیں باقی نہیں رہیں، لہٰذا اب اگرکسی کے بارے میں علامات سے معلوم ہوجائے کہ وہ کفریہ عقائد دل میں چھپاتا ہے تو اس شخص کو قتل کردیا جائے گا اوراس کومنافق نہیں بلکہ زندیق وملحد کہا جائے گا، لہٰذا حضرت حذیفہ کے قول کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی شخص اب دل میں کفرنہیں چھپا سکتا ہے، اورنفاق سرے سے ختم ہوگیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نفاق کا وہ نرم حکم جودورنبوی میں تھا اب باقی نہیں رہا، اب ایسے اشخاص پرکفرکا حکم جاری ہوگا، لہذا اس حدیث میں **انما النفاق** کی تقدیر ہے: **انما حکم النفاق الخ**

زندقہ والحاد کا مفہوم اوراس کا حکم:

یہ زندقہ والحادکفرکی بدترین صورت ہے، ارتداد سے بھی بدتر، اسی لئے اس کا حکم مرتد سے بھی سخت ہے، مرتد اگرگرفتاری کے بعدتوبہ کرلے تو اس کوچھوڑ دیا جائے گا، لیکن جوزندیق وملحد اپنے زندقہ والحادکا داعی ہو اورگرفتاری کے بعدتوبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی، بلکہ توبہ کے باوجود اس کوقتل کیا جائے گا، البتہ اگرگرفتاری سے قبل توبہ کرلے یا اپنے زندقہ والحاد کا داعی نہوتو پھراس کوتوبہ کرلینے کی صورت میں چھوڑ دیا جائے گا، اورزندقہ والحاد کی علامت یہ ہے کہ اظہار اسلام کے ساتھ ضروریات دین میں کوئی ایسی تاویل کرتا ہو جواس کواس کے معروف معنی سے ہٹادے۔[1]

باب في الوسوسة

ربط ومناسبت:

ماقبل میں کبائر ونفاق کا بیان تھا، کبائر ونفاق کا سبب وسوسہ ہی ہے، اس لئے اب وسوسہ کو بیان کررہے ہیں، نیز نفاق فعل قلبی ہے اوروسوسہ بھی فعل قلبی ہے، فعل قلبی ہونے کے اعتبار سے بھی دونوں میں مناسبت ہے، وسوسہ سے متعلق چند مباحث ہیں:

(۱)وسوسہ کے لغوی معنی:

وسوسہ بروزن بعشرة، باب فَعْلَلَةٌ کا مصدر ہے بمعنی ہلکی آواز کا آنا، دل میں کسی خیال یابات کا آنا،

(۱) شامی ۳ / ۳۸۳–۳۸۴ وجواهر الفقه ۱ / ٦٣–٦٨.

لفظِ ''وسوسہ'' مصدری معنی میں بھی بولا جاتا ہے اوراسمی معنی میں بھی اس کا اطلاق کیاجاتا ہے، اسمی معنی ہیں: صوتِ خفیّ (یعنی ہلکی آواز)(۱)

(۲)وسوسہ کے اصطلاحی معنی:

برے خیالات کواصطلاح میں ''وسوسہ'' کہاجاتا ہے، یہ وسوسہ کبھی شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور کبھی نفس کی طرف سے، علماء نے دونوں کے مابین فرق یہ بیان کیا ہے کہ بار بار کسی برائی کاخیال آنا نفس کی طرف سے ہوتا ہے اور مختلف گناہوں کا خیال شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ (۲)

(۳)الہام کا مفہوم اوراس کی حجیت:

وسوسہ کا مقابل ''الہام'' ہے، نیکی کے خیال کو''الہام'' کہاجاتا ہے،حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا الہام حجت شرعیہ ہے اورامتی کا الہام حجت شرعیہ نہیں ہے، البتہ علماء فرماتے ہیں کہ الہام اگرموافقِ شرع ہو تواس سے تائید کافائدہ ہوگا۔(۳)

(۴) خیالات کی مختلف صورتیں اوران کے احکام:

انسان کے دل پر جوخیالات گزرتے ہیں، خواہ اچھے ہوں یابرے،ان کی پانچ قسمیں ہیں (۱)ہاجس (۲)خاطر(۳)حدیث النفس (۴)ہم (۵)عزم۔

ھاجس: کوئی خیال دل میں آوے اورفوراً ختم ہوجائے۔

خاطر: کوئی خیال دل میں آوے اورذراٹھہرے،مگراس سے قبل کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں سوچا جائے وہ ختم ہوجائے۔

حدیث النفس: کوئی خیال دل میں آئے اوراتنی دیرٹھیرے کہ اس کے کرنے نہ کرنے کے بارے میں تردد ہونے لگے اس کے بعدختم ہوجائے۔

ھم: خیال دل میں آوے اوراس کے انجام دینے کا رجحان پیدا ہوجائے پھرختم ہوجائے۔

(۱)اللمعات ۱ / ۳۱٤.

(۲)اللمعات ۱ / ۳۱٤.

(۳)المرقاۃ ۱ / ۲۲۲.

عزم: یعنی کوئی خیال دل میں آوے پھراس کے انجام دینے کا پختہ ارادہ کرلیا جائے۔

ان میں سے پہلی تین قسمیں غیراختیاری ہونے کی وجہ سے معاف ہیں، چوتھی قسم ''ہم'' ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ہم کا تعلق سیئہ سے ہوتو وہ معاف ہے اوراگر حسنہ سے تعلق ہوتو اس پرایک نیکی لکھی جاتی ہے خواہ اس پرعمل نہ کرسکے،اس امت پرحق تعالیٰ شانہ کا یہ احسان ہے کہ ہمّ سیئہ کو معاف قراردیا گیا اور ہمّ حسنہ پراجرعطا کیا جاتا ہے، پانچویں قسم عزم ہے عزم کا تعلق سیئہ سے ہوتو اس پرگناہ لکھا جاتا ہے اگرچہ عمل نہ کیا ہومگر صرف عزم کا گناہ لکھا جاتا ہے نہ کہ عمل کا، اورحسنہ سے تعلق ہوتو بغیرعمل کے بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔

بعض علماء نے عزم سیئہ کو ہمّ سیئہ کی طرح معاف کہا ہے لیکن جمہوراس پرمواخذہ کے قائل ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں تصریح ہے:''وَلٰكِنْ يُؤَا خِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ''(۱) نیز ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادمروی ہے''إذا الْتَقَى الْمُسْلِمانِ بِسَيْفَيْهِما فالقاتلُ والمقتولُ في النّارِ'' یعنی جب دومسلمان تلوار سے لڑیں تو قاتل ومقتول ہردوجہنم میں جائیں گے،صحابہ نے کہا کہ قاتل کا جہنم میں جانا معقول ہے مگرمقتول جہنم میں کیوں جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا''إنّه كان حريصاً علىٰ قتلِ صاحِبِه'' کہ وہ بھی اپنے مقابل کے قتل کا حریص تھا اوراس کا عزم کئے ہوئے تھا''(۲) اس روایت میں صراحت ہے کہ مقتول معصیت کے عزم کی وجہ سے جہنم رسید ہوا۔(۳)

علاجِ وسوسہ:

اگروسوسے اوربرے خیالات آویں تو آئندہ روایات میں اس کے کئی علاج بتائے گئے ہیں: (۱) تعوذ پڑھے (۲) آمنت باللہ ورسولہ کہے (۳) بائیں جانب تھوک دے تاکہ شیطان ذلیل ہواوربھاگ جائے (۴) مجلس سے اٹھ جائے یعنی اپنی ہیئت کوبدل دے (۵) عدم التفات الی الوسوسہ یعنی وسوسہ کی جانب توجہ نہ کرے (۶) عدم مواخذہ وامید اجریعنی اس امرکا استحضارکرے کہ وسوسہ پرمواخذہ نہیں ہے اوراجروثواب کی امید رکھے۔(۱)

(۱) من سورة البقرة: ۲۲۵.

(۲) أخرجه البخاري: الإيمان /وإن طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما (۱/ ۹(۳۱)، و(۶۸۷۵) و(۷۰۸۳) ومسلم: الفتن/إذا التقى المسلمان ......(۲/ ۳۸۹(۲۸۸۸)

(۳) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۲۲.

(٤) مرقاة المفاتيح ۱/ ۲۲۳.

الفصل الأول

۵۷ / ۱: عن أبی ھریرۃؓ قال: قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "إِنَّ اللّٰہَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي مَاوَسْوَسَتْ بِہٖ صُدُورُھَامَالَمْ تَعْمَلْ بِہٖ أَوْتَتَکَلَّمْ" (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے لوگوں کے ان وسوسوں کو معاف کردیا ہے جوان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اوران کو زبان پر نہ لائیں۔ (بخاری ومسلم)

شرح حدیث

وساوس معاف ہیں:

اس حدیث میں امت سے وسوسہ کے معاف ہونے کا بیان ہے کہ جب تک اس پرعمل نہ کرے یااس کاتکلم نہ کرے وہ معاف ہے، اوراگر وسوسہ کے مطابق عمل کرلیا جبکہ وہ ازقبیل عمل ہو یازبان سے تلفظ کیا اگروہ ازقبیل قول ہوتو پھرمعاف نہیں، بلکہ قابل گرفت ہے۔

کیاوساوس کی معافی اس امت کی خصوصیت ہے؟

ان اللہ تجاوز عن امتی: اس روایت سے معلوم ہوتاہے کہ وسوسہ کا معاف ہونا اس امت کی خصوصیت ہے، امم سابقہ سے وسوسہ معاف نہ تھا،لیکن علی الاطلاق ایسانہیں ہے، بلکہ وسوسہ کی غیراختیاری صورتیں سب امتوں میں معاف تھیں،قرآن کریم میں عام ضابطہ بیان کیا گیاہے:"لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّاوُسْعَھَا" (۲) یعنی اللہ تعالیٰ کسی کوبھی اس کی وسعت سے زیادہ کا پابندنہیں کرتا،لہٰذا"ہاجس""خاطر" اور"حدیث النفس" وسوسہ کی یہ اقسام ثلثہ امم سابقہ سے بھی معاف تھیں اور"عزم" کسی سے بھی معاف نہیں ہوا، امتِ محمدیہ کی خصوصیت"ہم" کا معاف ہوناہے،"ہم" میں اختیار پایاجاتاہے اورجانب فعل کوترجیح

(۱)أخرجہ البخاري فی کتاب العتق، باب الخطاء والنسیان فی العتاقۃ(۲۵۲۸)وفي کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق والکرہ(۵۲۶۹)وفي کتاب الأیمان والنذور باب إذا حنث ناسیا فی الأیمان(۶۶۶۴) ومسلم فی کتاب الإیمان، باب تجاوز اللہ عن حدیث النفس والخواطر بالقلب لم تستقر(۲۰۱، ۲۰۲)

(۲)من سورۃ البقرۃ:۲۸۶۔

ہوجاتی ہے اس طور پر کہ اگر اول وہلہ میں جبکہ ہاجس کا مرحلہ تھا اس کو دفع کر دیتا اور اپنے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کر دیتا تو ہم کے مرحلہ تک نوبت نہ پہنچتی، پس درجۂ ہم میں ایک نوع کا اختیار پایا جاتا ہے اس کے باوجود معاف قرار دیا گیا ہے، یہ اس امت کی خصوصیت ہے۔

ما وسوست به صدرها: ''صدر'' سے مراد قلب ہے، محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے، پھر راجح یہ ہے کہ صدر مرفوع ہے اور وسوست کا فاعل ہے (۱) بعض نے اس کو منصوب پڑھا ہے مفعول بہ ہونے کی وجہ سے، اس وقت وسوست کا فاعل لفظ ''امت'' ہوگا اور وسوست حدثت کے معنی میں ہوگا، لیکن اول ضبط راجح ہے اس لئے کہ وسوسہ عموماً لازم استعمال ہوتا ہے۔

تنبیہ: یہاں مشکوۃ شریف کے ہندی نسخوں میں ''صدرها'' مفرد کے صیغہ کے ساتھ تحریر ہے، جو کہ تصحیف ہے، صحیح ''صدورها'' جمع کے صیغہ کے ساتھ ہے، بخاری وغیرہ میں جمع کے صیغہ کے ساتھ ہی وارد ہے۔(۲)

۵۸ / ۲: وَعَنْهُ قَالَ: جَاءَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم اِلَى النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم، فَسَأَلُوْهُ: إِنَّا نَجِدُ فِيْ أَنْفُسِنَامَايَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ! قَالَ: أَوَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ، قَالَ: ''ذَاکَ صَرِيْحُ الْإِيْمَانِ'' (رواہ مسلم)(۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے چند حضرات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (وسوسے) پاتے ہیں کہ جن کو زبان پر لانا بھی ہم برا سمجھتے ہیں، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کیا واقعی تم ایسا پاتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تو کھلا ایمان ہے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی وسوسہ کا اور اس کے معاف ہونے کا بیان ہے نیز اس بات کا بیان ہے کہ بہت

(۱) المرقاۃ۱ / ۲۲۲۔
(۲) بخاری شریف ۱ / ۳۴۳۔
(۳) أخرجه مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان ۱ / ۷۹۔

سے صحابہ کرامؓ کو بھی وسوسے آتے تھے۔

صحابۂ کرام کی وساوس کی شکایت اور آپ علیہ السلام کا جواب:

جاء ناس من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم : حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں: کہ کچھ صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے نفس میں ایسی باتیں پاتے ہیں کہ ہم ان کو زبان پر لانا بھی بڑا گناہ سمجھتے ہیں، مثلاً اللہ کی ذات کے بارے میں وسوسہ کا پیدا ہونا، یہ وسوسہ کہ قیامت آئے گی یا نہیں؟ جنت ودوزخ برحق ہے یا نہیں؟ وغیرہ، ایک حدیث میں ہے کہ ہمارے دل میں ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ہم کو کوئلہ بن جانا پسند ہے لیکن ان چیزوں کو زبان پر لانا گوارا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تو صریح ایمان ہے۔

ذاک صريح الايمان: اس کا مشار الیہ کیا ہے؟

(۱) بعض نے کہا کہ مشار الیہ وساوس ہیں یعنی یہ وساوس صریح ایمان کی علامت ہیں۔ (۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اس کا مشار الیہ "وجدان" ہے جو "وجدتموه" فعل کا مصدر ہے، فعل کی دلالت مصدر پر ہوتی ہے۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ مشار الیہ "تعاظم" ہے جو "یتعاظم" فعل کا مصدر ہے یعنی اس وسوسہ کو برا سمجھنا صریح ایمان ہے۔ (۳)

مگر سب صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ وساوس کا آنا ایمان کی علامت ہے، اس لئے کہ چور خالی گھر میں داخل نہیں ہوتا ہے، چنانچہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جس نماز میں وسوسہ نہ آئے وہ یہود ونصاریٰ کی نماز ہے، (۴) یعنی اطمینان سے نماز پڑھنے کا موقعہ شیطان انہی کو دے سکتا ہے مؤمنوں کو تو وہ قدم قدم پر بہکاتا ہے، دوسرے یہ کہ کافر شخص اس قسم کے وساوس کو اچھا سمجھتا ہے اور انہی کا معتقد

(۱) المرقاة ۱ / ۲۲۵.

(۲) اللمعات ۱ / ۳۱۶.

(۳) اللمعات ۱ / ۳۱۶.

(٤) المرقاة شرح المشكاة ۲۱ / ۱۳۶، ط: مكتبه امدايه، ملتان.

ہوتا ہے، لہذا جوان کو برا سمجھ رہا ہے تو یہ اس کے مومن ہونے کی دلیل ہے۔(۱)

٥٩ / ٣ :وَعَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم : "يَأۡتِي الشَّيۡطَانُ أَحَدَكُمۡ، فَيَقُوۡلُ: مَنۡ خَلَقَ كَذَا؟ مَنۡ خَلَقَ كَذَا؟ حَتّٰى يَقُوۡلَ: مَنۡ خَلَقَ رَبَّكَ؟ فَإِذَا بَلَغَهُ، فَلۡيَسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ وَلۡيَنۡتَهِ" (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ :حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے بعض آدمیوں کے پاس شیطان آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا؟ اور اس چیز کو کس نے پیدا کیا؟ یہاں تک کہ وہ یوں کہتا ہے کہ تیرے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب آدمی اس حد تک پہنچ جائے تو اس کو چاہئے کہ اللہ سے پناہ مانگے اور (اس سلسلہ میں تفکر سے) رک جائے۔(بخاری ومسلم)

٦٠ / ٤: وَعَنۡهُ قَالَ: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم : لَايَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوۡنَ حَتّٰى يُقَالَ : هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الۡخَلۡقَ، فَمَنۡ خَلَقَ اللّٰهَ؟ فَمَنۡ وَجَدَمِنۡ ذٰلِكَ شَيۡئًا؟ فَلۡيَقُلۡ: آمَنۡتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ. (متفق عليه)

ترجمہ :اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ لوگ باہم سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا (یعنی دل میں وسوسہ آئیگا) کہ اس تمام کائنات کو اللہ نے پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ پس جس شخص کے دل ودماغ میں اس قسم کا کوئی خیال ووسوسہ پیدا ہو تو وہ یہ کہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا۔ (بخاری ومسلم)

شرح حدیث

خدا تعالیٰ کی پیدائش کا وسوسہ اور اس کے متعدد علاج:

ان دونوں حدیثوں میں وسوسوں کی تفصیل مذکور ہے کہ انسان کے قلب میں کس قسم کے وسوسے پیدا

(۱) اللمعات ۱ / ۳۱٦.

(۲) أخرجه البخاري ، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ۱ / ٤٦٣ برقم ۱۳۷۰، ومسلم: كتاب الإيمان ، باب بيان الوسوسة في الايمان الخ ۱ / ۷۹.

ہوتے ہیں، پھران کا علاج بتایا گیاہے، وہ تفصیل یہ ہے کہ شیطان بعض لوگوں کے پاس آتا ہے اور ذہن میں سوال ڈالتاہے کہ فلاں چیز کوکس نے پیدا کیا؟ فلاں چیز کوکس نے پیدا کیا؟ پھرخودہی اس کا جواب سکھاتا ہے کہ اللہ نے پیدا کیا، اس طرح مختلف چیزوں کے متعلق سوال ڈالتا ہے اور ہرسوال کا جواب سجھاتا ہے کہ اللہ نے پیدا کیا، جب آدمی کا یہ ذہن بن جاتاہے کہ ہرچیز تخلیق کے مرحلہ سے گذری ہے اور قانونِ فطرت ہے کہ ہرچیز کوپیدا کیا گیاہے تواچانک ذہن میں یہ سوال پیدا کرتاہے کہ پھراللہ کوکس نے پیدا کیا؟ العیاذ باللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وسوسوں کے کئی علاج بیان فرمائے۔

(۱)تعوذ پڑھے:

فلیستعذ بالله: آدمی جب اس حدتک پہنچ جائے تو تعوذ پڑھے، کیونکہ شیطانی تصرف کے وقت حق تعالیٰ شانہ نے قرآن میں یہی طریقہ تعلیم فرمایاہے ''وَاِمَّایَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ'' (۱) کہ اگرشیطان تمہارے دل میں برائی کا خیال ڈالے تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو، وجہ اس کی یہ ہے کہ شیطان کا مکراگرچہ بڑاہے، مگراللہ کے سامنے اس کا مکرضعیف وہیچ ہے: اِنَّ کَیْدَالشَّیْطَانَ کَانَ ضَعِیْفًا. (۲)

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شیطان اوراس کے وسوسوں کی مثال اس کتے کیسی ہے جوگھر کے دروازہ پرکھڑاہو،گھر کے مالک کا ایک دوست اس سے ملنے کے لئے آتاہےتووہ کتااس پربھونکتاہے،اس وقت تین صورتیں ہوسکتی ہیں(۱)اس کتے سے مقابلہ کیاجائے، اس میں کامیابی کا امکان کم ہے اورخطرہ زیادہ ہے، (۲) خائف ہوکر وہاں سے واپس آجائے، اس وقت مقصد میں ناکام رہے گا ملاقات سے محرومی رہے گی (۳) اس دوست اورمکان کے مالک کوآواز دے، وہ آئے گا اورکتے کو ڈانٹ کرہٹادے گا،اس شکل میں کتے سے بھی حفاظت رہے گی اورمقصد بھی حاصل ہوجائے گا، دوست سے ملاقات ہوجائے گی، یہی صورت یہاں ہے کہ بندہ جب کثرت عبادت اورذکرومراقبہ کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہ کاقرب حاصل کرنا چاہتاہےتو اس وقت عموماً وساوس شیطانی اس کوگھیرلیتے ہیں تاکہ وہ مایوس ہوکر عبادت ذکروغیرہ کوچھوڑ بیٹھے، اس وقت بندہ تعوذ پڑھے اورشیطان کے مقابلہ میں اللہ سے مددچاہے، اللہ تعالیٰ شانہ شیطان کوذلیل اورناکام بنادے گا، شیطان راستہ سے ہٹ جائے گا اوربندہ کووصالِ خداوندی

(۱)من سورۃ الاعراف: ۲۰۰.

(۲)من سورۃ النساء: ۷٦.

حاصل ہوجائے گا۔

تفکر چھوڑ دے:

ولینتہ: دوسرا علاج بیان کیا کہ ان تفکرات سے رک جائے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی خیال کا آنا تو غیر اختیاری چیز ہے لیکن اس سے دوسری طرف ذہن منتقل کرلینا اختیاری چیز ہے، اس لئے ذہن کو وہاں سے ہٹالے اور دلائل سے اس کا جواب نہ دے، کیونکہ شیطان دلائل کو توڑ دے گا اور آدمی شک وشبہ میں مبتلا ہوجائے گا۔

ایک عالم کو جنگل میں شیطان ملا، شیطان نے پوچھا کہ بتاؤ تمہارا ایمان قوی ہے یا عامی شخص کا، عالم نے کہا میرا، اس لئے کہ میرا ایمان استدلالی ہے اور عامی آدمی کا ایمان تقلیدی ہے، شیطان عالم صاحب کو ایک عامی شخص کے پاس لے گیا جو کلہاڑے سے لکڑی کاٹ رہا تھا، شیطان نے اس عامی شخص سے سوال کیا کہ اللہ ایک ہے یا دو؟ اس نے کہا کہ ایک ہے، شیطان نے کہا اگر میں دلیل سے دو ثابت کردوں تو؟ اس عامی شخص نے کہا کہ میں کلہاڑے سے تیرے دو ٹکڑے کردونگا، شیطان نے مولانا صاحب سے کہ کہ تمہاری دلیل کا جواب تو دے سکتا ہوں، مگر اس کا جواب نہیں دے سکتا، معلوم ہوا کہ عامی کا ایمان قوی ہے۔(۱)

لایزال الناس یتساء لون: یعنی آپس میں ایک دوسرے سے سوال کریں گے یا لوگ خود ہی اپنے دل سے سوال کریں گے۔

(۳) آمنت باللہ ورسلہ کہے:

آمنت باللہ ورسلہ: دفع وسوسہ کا یہ تیسرا علاج ہے، بعض نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس طرح کے وساوس کا آنا کفر ہے، لہٰذا تجدید ایمان کے لئے آمنت باللہ ورسلہ کہے، ملاعلی قاریؒ نے اس قول کی تردید فرمائی اور فرمایا کہ یہ کفر نہیں، البتہ اس سے قلب میں ایک طرح کی تاریکی پیدا ہوتی ہے، قلب میں جلاء اور روشنی پیدا کرنے کے لئے آمنت باللہ ورسلہ کہنا چاہئے۔(۲)

بعض علماء نے فرمایا کہ آمنت باللہ ورسلہ کہنا شیطان کی تردید کے لئے ہے کہ وہ ہمیں دلائل کی

(۱) ملفوظات فقیہ الامت ۱/٦۵۔

(۲) المرقاۃ ۱/۲۲۷.

بحث میں ڈال کر گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، آمنت باللہ کا حاصل یہ ہے کہ ہم اللہ ورسول کے حکم کو بغیر دلیل کے مانتے ہیں اور دلائل کی بحث میں نہیں پڑتے۔(۱)

۶۱ / ۵: وَعَنِ بنِ مسعودٍؓ قال: قال رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: "مَامِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهُ مِنَ الْجِنِّ وَقَرِيْنُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ" قَالُوْا: وَإِيَّاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: "وَإِيَّايَ" وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ، فَلَايَأْمُرُنِيْ إِلَّابِخَيْرٍ. (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نہیں ہے تم میں سے کوئی شخص مگر اس پر ایک ساتھی جنات (شیاطین) میں سے مقرر کیا گیا ہے اور ایک ساتھی ملائکہ میں سے مقرر کیا گیا ہے اس پر صحابہؓ نے عرض کیا: کہ یا رسول اللہ کہ وہ ''قرین من الجن'' آپ کے اوپر بھی مقرر ہے فرمایا کہ ہاں میرے اوپر بھی مقرر ہے، لیکن اللہ نے میری اس کے خلاف مدد فرمائی پس وہ مجھے حکم نہیں دیتا مگر خیر کا۔

تشریح حدیث

ہر انسان کے ساتھ شیطان اور فرشتہ کا پیدا ہونا:

اس روایت میں وسوسہ اور الہام کا بیان ہے اور بتایا گیا ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا کون ہے اور الہام کرنے والا کون ہے؟ روایت کا حاصل یہ ہے کہ ہر انسان کا ایک ساتھی جن یعنی شیطان ہے اور ایک ساتھی فرشتہ، جب انسان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے، تو شیطان کا بھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان کے بچہ کو اس انسان پر مقرر کردیا جاتا ہے اس کو ''قرین الانسان من الجن'' کہا جاتا ہے اور اس کا لقب ''وسواس'' ہے، اسی کے ساتھ انسان پر ایک فرشتہ بھی مقرر کردیا جاتا ہے اس کو ''قرین الانسان من الملائکہ'' کہا جاتا ہے اور اس کا لقب ''ملہم'' ہے، دل میں جو برائی کا خیال آتا ہے وہ ''وسواس'' کی طرف سے ہوتا ہے اور جو نیکی کا خیال آتا ہے وہ ملہم کی طرف سے ہوتا ہے، اور یہ صورت حال ہر شخص کے ساتھ ہے، صحابہ نے سوال کیا کہ کیا یہ شیطان آپ

(۱) اللمعات ۱ / ۳۱۹۔

(۲) أخرجه مسلم فی "كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب تحريش الشيطان الخ ۲ / ۳۷۶"

کے اوپر بھی مقرر ہے؟ فرمایا کہ ہاں میرے اوپر بھی مقرر ہے، لیکن اللہ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی اور وہ میرا تابعدار ہوگیا پس وہ مجھ کو حکم نہیں دیتا مگر خیر اور بھلائی کا۔

فأسلم: اس صیغہ کو دو طریقوں پر ضبط کیا گیا ہے: (۱) باب افعال سے ماضی معروف واحد غائب کا صیغہ ہو، اس صورت میں دو ترجمہ ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ وہ شیطان میرا تابعدار ہوگیا ہے، جیسا کہ بعض روایات میں وارد "فاستسلم" کے لفظ سے بھی معلوم ہوتا ہے[1] دوسرا ترجمہ: وہ شیطان مسلمان ہوگیا۔(۲)

سوال: شیطان تو مسلمان نہیں ہوسکتا؟ اس کے حق میں گمراہی مقدر ہوچکی ہے تو پھر **فأسلم** کا کیا مطلب ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ حکم تو ابوالشیاطین ابلیس کیلئے ہے، اس کی ذریت میں سے کوئی مسلمان ہوجائے تو یہ ممکن ہے اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے۔(۳)

(۲) باب سمع سے مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہو، اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ میں اس سے محفوظ رہتا ہوں، سفیان ابن عیینہ نے دوسرے ضبط کو اور قاضی عیاض نے اول کو اختیار کیا ہے۔(۴)

٦٢ / ٦: وعن أنسٍ قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ. (متفق علیہ)(٥)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا پھرتا ہے جیسے رگوں میں خون گردش کرتا رہتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

(١) اکمال المعلم٨ / ٣٥٠.

(٢) اللمعات ١ / ٣٢٠.

(٣) اللمعات٦ / ٣٢٠-٣٢١.

(٤)إكمال المعلم بفوائد مسلم ٨ / ٣٥٠ ط دارالوفاء مصر

(٥)أخرجه مسلم في كتاب السلام، باب ان يستحب لمن رأى خالياً بأمرأة وكانت زوجته أومحرما له أن يقول هذه فلانة ليدفع ظن السوء به٢ / ٢١٦.

ملحوظه: قدعزاصاحب المشكاة خطيب التبريزى هذا الحديث إلى الشيخين، ولكن ليس هذا الحديث بموجود في صحيح البخارى من طريق انسؓ بل هو موجود من طريق صفية بنت حُي زوجة الرسول صلى الله عليه وسلم، ١ / ٤٦٤ برقم: ٣١٧٥.

تشریح حدیث

شیطان کا جسم میں خون کی طرح دوڑنا:

اس حدیث پاک میں شیطان کے وسوسہ کا اور انسان کے اوپر اس کے کمال قدرت وتصرف کا بیان ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ نے شیطان کو انسان کے اوپر تصرف کی کامل قدرت اور اختیار دیا ہے، اس کے وساوس دائمی ہیں، موت تک ہیں، اس سے غافل نہ ہونا چاہئے۔

حدیث کا شان ورود:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، ازواج مطہرات میں سے حضرت صفیہؓ ملاقات کے لئے مسجد میں آپ کے پاس حاضر ہوئیں، جب وہ واپس جانے لگیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو رخصت کرنے کے لئے مسجد کے دروازہ تک تشریف لائے، وہاں قریب میں دو صحابی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ یہ میری بیوی صفیہ ہیں، انہوں نے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کون بدگمانی کرسکتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ بات ارشاد فرمائی کہ ٹھیک ہے لیکن شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے اور کوئی بھی وسوسہ وخیال پیدا کرسکتا ہے۔(۱)

شیطان کے دوڑنے کا مطلب:

مجری الدم: ''مجری'' کونسا صیغہ ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں اور اسی پر اس کا مطلب موقوف ہے:

(۱) مصدر میمی ہے، اس وقت یہاں ادات تشبیہ ''کاف'' محذوف ہوگا اور منصوب بنزع الخافض ہوگا، جریِ شیطان مشبہ اور جریِ دم مشبہ بہ ہوگا اور وجہ شبہ میں کئی احتمال ہیں: ایک یہ کہ وجہ شبہ کمالِ قدرت ہو کہ جیسے خون انسان کے اندر ہر جگہ موجود ہے اور تمام اعضاء میں گردش کرتا ہے، اسی طرح شیطان کو بھی انسان پر مکمل قدرت دی گئی ہے، دوسرے یہ کہ وجہ شبہ عدمِ شعور اور عدم احساس ہو یعنی جیسے انسان کو اپنے اندر خون کے دوڑنے کا احساس نہیں ہوتا ایسے ہی شیطان کے چلنے کا اور اس کے تصرف کا احساس نہیں ہوتا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تشبیہ نہ ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو۔(۲)

---

(۱) أخرجه أبو داؤد في كتاب الصوم، باب المعتكف يدخل البيت لحاجته ۱/۳۳٤، وفي كتاب الأدب ،باب في حسن الظن ۲/۶۸۲.

(۲) مرقاة المفاتيح ۱/۲۲۹.

(۲) مجری ظرف مکان ہے، بمعنی جاری ہونے کی جگہ اور جاری ہونے کی جگہ خون کی رگیں ہیں تو مطلب ہوگا کہ شیطان انسانی رگوں میں واقعۃً وحقیقۃً چلتا ہے۔

(۳) مجری ظرف زمان ہے، بمعنیٰ جاری ہونے کا زمانہ ومدت، یعنی شیطان انسان میں دوڑتا ہے خون کے جاری رہنے کے زمانہ تک، اورخون کے جاری رہنے کا زمانہ پوری زندگی ہے، مطلب یہ ہوا کہ انسان کے اندر شیطانی وساوس کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

۶۳ / ۷: وَعَنْ أَبِيْ هريرةؓ قال: قَالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم "مَامِنْ بَنِيْ آدَمَ مَوْلُوْدٌ إِلَّا يَمَسُّهُ الشَّيْطَانُ حِيْنَ يُوْلَدُ فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ غَيْرَمَرْيَمَ وَإِبْنِهَا" (متفق علیہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: بنی آدم کے یہاں جوبھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چھوتا ہے جس کی وجہ سے بچہ چیخ اٹھتا ہے لیکن حضرت مریم اوران کے بیٹے (عیسی علیہ السلام) کو شیطان نے نہیں چھویا۔ (بخاری ومسلم)

وعنه: قالَ قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "صِيَاحُ الْمَوْلُوْدِ حِيْنَ يَقَعُ نَزْغَةٌ مِنَ الشَّيْطَانِ" (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ بچے کا چیخنا اوررونا جس وقت کہ وہ پیدا ہوتا ہے شیطان کے چونکا لگانے کی وجہ سے ہے۔ (بخاری، مسلم)

تشریح حدیث

پیدائش کے وقت شیطان کا بچہ کو چونکا مارنا:

ان دونوں حدیثوں میں شیطان کے ایک خاص وقت کے تصرف کا بیان ہے اور وہ ہے پیدائش کا

(۱) أخرجه البخاري فی ثلاثة مواضع: "كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ۱ / ۴۶۴ برقم ۳۱۸۰ و"كتاب الانبياء، باب قوله تعالى واذكر فى الكتاب مريم ......الخ" ۱ / ۴۸۸ برقم ۳۳۱۶ وكتاب التفسير، باب منه آيات، ومسلم كتاب الفضائل، باب فضائل عيسى عليه السلام ۲ / ۲۶۵.

(۲) أخرجه البخاري، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ۱ / ۴۶۴.

وقت، بنی آدم کی ولادت کے وقت شیطان بچہ کو چونکا مارتا ہے، اسی وجہ سے بچہ روتا ہے، البتہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے مستثنیٰ رہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مریم کی والدہ حضرت حنہ علیہا السلام نے حضرت مریم کی پیدائش کے وقت ان کے لئے شیطان مردود سے محفوظ رہنے کی دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ شانہ نے اس دعاء کو قبول فرمایا سورۃ آل عمران میں اس کا تذکرہ ہے:

''اِذْقَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَافِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّراً فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَاوَضَعَتْ، وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم ''(۱) یعنی وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے کہا تھا کہ: یارب! میں نے نذر مانی ہے کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اسے ہر کام سے آزاد کر کے تیرے لئے وقف رکھوں گی، میری اس نذر کو قبول فرما، بے شک تو سننے والا ہے ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پھر جب ان سے لڑکی پیدا ہوئی تو وہ حسرت سے کہنے لگیں: یارب یہ تو مجھ سے لڑکی پیدا ہوگئی ہے، حالانکہ اللہ کو خوب علم تھا کہ ان کے یہاں کیا پیدا ہوا ہے، اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہوتا، میں نے اس کا نام مریم رکھدیا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے حفاظت کے لئے آپ کی پناہ میں دیتی ہوں۔

اس لئے مریم اور ان کی ذریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو شیطان نے چونکا نہیں مارا، ان کے علاوہ جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اس کو چونکا مارتا ہے۔

اس پر سوال ہوتا ہے کہ حضرت مریم مسِ شیطانی سے کیسے محفوظ ہوئیں حالانکہ ان کی والدہ نے حسب تصریح قرآن ان کی ولادت کے بعد دعا کی تھی، جیسا کہ آیت مذکور سے معلوم ہوا؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱) عیسیٰ علیہ السلام محفوظ رہے ہیں حنہ کی دعا سے اور مریم اللہ کے فضل سے محفوظ رہیں۔

(۲) فلماوضعتها سے قرب وضع مراد ہے یعنی وقت ولادت سے کچھ پہلے انھوں نے دعا کی تھی، اس لئے اس دعا کی برکت سے حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام دونوں محفوظ رہے، ملا علی قاری نے

(۱) من سورۃ آل عمران: ۳۵-۳۶.

اس جواب کوترجیح دی ہے۔(۱)

إلاّیمسه الشیطان : ایک حدیث میں ''طعن'' اورایک روایت میں ''مس'' کا لفظ ہے''مس وطعن'' سے کیامراد ہے؟ اس میں دوقول ہیں: (۱)اس سے مراد غیرمحسوس طریقہ سے وسوسہ ڈالنا ہے (۲)بعض نے طعن بالید مرادلیا ہے یعنی حقیقۃ ہاتھ سے چونکہ مارتا ہے وہوالراجح۔

شیطان کا چونکا اور حضرات انبیاء علیہم السلام

یہاں شراح کے درمیان یہ بحث آئی ہے کہ بوقت ولادت مس شیطانی سے محفوظ ہونا حضرت مریم اورعیسی علیہما السلام کی خصوصیت ہے یاحضور صلی اللہ علیہ وسلم اوردیگرانبیاء علیہم السلام بھی اس چونکے سے محفوظ رہے؟

(۱) اکثر علماء فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام شیطان کے اس تصرف سے محفوظ ہوتے ہیں بالخصوص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس مس سے محفوظ رہے،شیخ عبدالحق دہلویؒ نے فرمایاہے کہ متکلم اپنے کلام سے عموماً مستثنی رہتا ہے لہذا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس سے محفوظ رہے۔

اشکال ہوتا ہے کہ پھرحضرت مریم وعیسی علیہم السلام کی روایت میں تخصیص کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت حنہ نے جو دعا کی تھی وہ قبول ہوئی ، ماعدا کی نفی کرنا مقصودنہیں ہے۔

(۲)اوربعض علماء کی رائے ہے کہ یہ استثناءصرف مریم اورابن مریم کے لئے ہے،جیسا کہ حدیث کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے پس شیطان حضرات انبیاء علیہم السلام کوایذا تو پہنچاسکتا ہے البتہ وسوسہ نہیں ڈال سکتا۔

پھرسوال ہوتا ہے کہ اگریہی بات ہے تو اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہونا ثابت ہوگا؟

جواب: یہ فضیلت جزئی ہے اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوکلی فضیلت حاصل ہے، افضلیت کا فیصلہ مجموعۂ صفات سے ہوتا ہے، ایسا ہوسکتا ہے کہ مفضول میں بعض صفات افضل کے مقابلہ میں زیادہ پائی جائیں، جیسے ملائکہ میں عدم جوع وعدم عطش جیسی ملکوتی صفات پائی جاتی ہیں اورانبیاء میں یہ صفات نہیں ہیں،

(۱)المرقاۃ ۱/ ۲۳۱.

مگر مجموعۂ صفات کی رو سے انبیاء علیہم السلام ملائکہ سے افضل ہیں۔

٦٥ / ٩: وعن جابرؓ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم اِنَّ إِبْلِيْسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ يَفْتِنُوْنَ النَّاسَ فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيُ أَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ: فَعَلْتُ كَذَاوَكَذَا، فيقول: مَاصَنَعْتَ شَيْئاً، قَالَ: ثُمَّ يَجِيُ أَحَدُهُمْ فَيَقُوْلُ مَاتَرَكْتُهُ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اِمْرَأَتِهِ قَالَ: فَيُدْنِيْهِ مِنْهُ، وَيَقُوْلُ، نِعْمَ أَنْتَ قَالَ الْأَعْمَشُ: أُرَاهُ قَالَ "فَيَلْتَزِمُهُ" (رواہ مسلم) (۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ابلیس اپنا تخت پانی (سمندر) پر رکھتا ہے پھر وہاں سے اپنی فوجوں کو روانہ کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو فتنہ اور گمراہی میں مبتلا کریں، ابلیس کی فوجوں میں اس کا سب سے مقرب وہ ہوتا ہے جو سب سے بڑا فتنہ انداز ہو، ان میں سے ایک واپس آکر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو فلاں گناہ میں مبتلا کیا، ابلیس اس کے جواب میں کہتا ہے: تو نے کچھ نہیں کیا، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ: پھر ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے کہ: میں نے (ایک بندہ کو گمراہ کرنا شروع کیا اور) اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑا جب تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی نہ ڈلوادی، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: ابلیس یہ سن کر اس کو اپنے قریب کرلیتا ہے اور کہتا ہے کہ: تو نے بڑا کام کیا (حدیث کے ایک راوی) اعمشؒ کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ انہوں (میرے استاذ ابوسفیان طلحہ بن نافع) نے حضرت جابرؓ سے فیلتزمہ (پس ابلیس اس کو گلے لگالیتا ہے) کے الفاظ نقل کئے تھے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

شیطان کا اپنے کارندوں سے کارگزاری لینا اور طلاق وتفریق سے خوش ہونا:

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کو گناہوں پر آمادہ کرنا اور ان کو گمراہی میں مبتلا کرنا شیطان

(۱) أخرجه مسلم، كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب تحريش الشيطان الخ ۲ / ۳۷۶.

اوراس کی ذریت کا باقاعدہ مشغلہ اورمشن ہے، چنانچہ صبح کے وقت ابلیس اپنا عرش پانی پر بچھاتا ہے اوراپنے کارندوں کو انسانوں کو بہکانے کے لئے بھیجتا ہے، شام کے وقت پھر تخت پانی پر بچھاتا ہے اوران کی کارگذاری سنتا ہے، چھوٹے شیاطین اپنے اپنے کئے ہوئے کام بتاتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے کہ میں نے فلاں کونماز سے روک دیا شیطان کہتا ہے: ماصنعتَ شیئا کہ تونے کوئی بڑا کام نہیں کیا، سب سے اسی طرح کہتا رہتا ہے، اخیر میں ایک شیطان آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے فلاں میاں بیوی میں جھگڑا کرادیا حتی کہ ان میں تفریق کرادی اورشوہر نے بیوی کو طلاق دے دی، شیطان اس چیلے کو قریب کرتا ہے اوراس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ واقعی تو نے بڑا کام کیا ہے، راوی کہتے کہ میرا ظن غالب یہ ہے کہ حضرت جابرؓ نے یہ بھی کہا تھا کہ شیطان اس سے معانقہ کرتا ہے، معلوم ہوا کہ انسانوں کو بہکانے کا شیاطین کا باقاعدہ مشغلہ ہے۔

طلاق سے بے انتہاء خوش ہونے کی وجہ:

سوال ہوتا ہے کہ شیطان طلاق پر اتنا خوش کیوں ہوتا ہے؟ حالانکہ طلاق فی نفسہ مباح ہے؟

جواب: طلاق اگرچہ فی نفسہ مباح ہے اورظاہر میں یہ معمولی برائی ہے لیکن عنداللہ مباحات میں سب سے زیادہ مبغوض ہے، کیونکہ طلاق اپنے اندر بڑے مفاسد لئے ہوئے ہے، تفریق کے بعد بیوی اپنے میکہ پہنچ جاتی ہے، اپنے گھر والوں کے سامنے شوہر کی برائیاں بیان کرتی ہے، جوغیبت ہے، نیز بہت سی ایسی ناروا چیزیں بھی شوہر کے متعلق کہتی ہے جوواقعۃً اس میں نہیں ہوتیں، یہ بہتان ہے، اس طرح عورت اوراس کے گھر والے غیبت اور بہتان دونوں قسم کے گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں، یہی حال شوہر اوراس کے خاندان والوں کا ہوتا ہے، پھر دونوں خاندان کے تعلقات منقطع ہوجاتے ہیں، سلام کلام بند ہوجاتا ہے، جس پرروایات میں سخت وعیدیں آئی ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ جن دومسلمان بھائیوں کے درمیان تین دن سے زیادہ سلام کلام بند ہو یہ موجب اثم ہے[1] پیرو جمعرات کو اللہ کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں سب کی مغفرت کردی جاتی ہے سوائے ان کے جن کا باہم سلام کلام بند ہو، ان کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے ''دَعُوْهُمَا حتی یصطلحا'' ان کو چھوڑے رکھو جب تک یہ آپس میں صلح نہ کرلیں[2] اگراسی حال میں

(۱) رواہ ابوداؤد، بحوالہ مشکوۃ ص ٤٢٨.

(۲) رواہ مسلم، بحوالہ مشکوۃ ص ٤٢٩.

دونوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو وہ جہنم میں جائے گا[1] وغیرہ۔

پھر مرد وعورت دونوں کے ساتھ جذبات لگے ہوئے ہیں، مرد کہیں اپنا منہ کالا کرتا ہے اور عورتک ہیں اور، اس کے نتیجہ میں بہت سی مرتبہ ''ولدالزنا'' کا وجود ہوتا ہے، جس سے معاشرہ میں بہت سی خرابیاں پھیلتی ہیں، نیز اولاد کے حقوق ضائع ہوتے ہیں، وہ اچھی تربیت سے محروم ہوجاتے ہیں اور غلط راستہ پر چل پڑتے ہیں، غرضیکہ شیطان نے تفریق کراکر گویا ایک خاردار درخت لگادیا جس کی ہر شاخ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں، اس لئے ابلیس طلاق وتفریق پر سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔

اشکال: بعض روایات میں ہے کہ شیطان زنا پر زیادہ خوش ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں روایتوں کا محمل الگ الگ ہے، ابلیس کے سامنے جس دن طلاق وتفریق کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس پر زیادہ خوش ہوتا ہے اور جس روز زنا کا بھی تذکرہ ہو اس دن زنا پر زیادہ خوش ہوتا ہے۔

عن جابر: جابر نام کے دو صحابی ہیں: جابر بن عبداللہ اور جابر بن سمرہ ''جابر'' مطلق بولا جائے تو جابر بن عبداللہ مراد ہوتے ہیں، اس روایت کے راوی وہی ہیں۔

ان ابلیس یضع عرشه علی الماء: علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حقیقت پر محمول ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا ہے کہ بعض اہل اللہ نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے، مشکوۃ جلد ثانی میں ابن صیاد کا قصہ آئے گا،[2] اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سوال کے جواب میں کہ تجھے کیا نظر آتا ہے؟ کہا تھا کہ میں پانی پر تخت دیکھتا ہوں آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تجھے شیطان کا تخت سمندر پر نظر آتا ہے۔

ثم یبعث سرایاه: ''سرایا'' جمع سریة، وہ لشکر جو زیادہ سے زیادہ چار سو افراد پر مشتمل ہو۔ (٣)

حتی فرقت بینه وبین امرأته: یہاں تفریق سے مراد حقیقۃً تفریق وعلیحدگی بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے مابین طلاق واقع کرادی اور بغیر طلاق وعلیحدگی کے محض دوری اور بعد بھی مراد ہوسکتا ہے کہ دونوں میں ناراضگی پیدا کرادی، یہ ناراضگی بھی بہت سے فتنوں اور فسادات کی موجب ہوتی ہے۔ (٤)

---

(١) رواه احمد وابوداؤد بحواله مشكوة ص٤٢٨.

(٢) مشكاة المصابيح، كتاب الفتن باب قصة ابن صياد ٢/٤٧٨۔

(٣) فتح الإله شرح المشكاة١/٤١٠.

(٤) المرقاة ١/٢٣٢.

نِعْمَ أنت: اس میں دواحتمال ہیں: (ا) فعل مدح ہواصل عبارت ہوگی: نعم الولد أنت (تو میرا کتنا اچھا بچہ ہے) اس صورت میں ''انت'' مخصوص بالمدح ہوگا (۲) یہ نعم حرف ایجاب ہے اور انت مبتداء ہے اوراس کی خبر محذوف ہے، پوری عبارت اس طرح ہے: أي أنت صنعت شيئاعظيما کہ ہاں تو نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ (۱)

قال الأعمش أراه: ''اراه'' کی ضمیر مفعول کا مرجع ابوسفیان طلحہ بن نافع المکی ہیں، یہی حضرت جابر سے نقل کرنے والے ہیں اوراعمش کے استاذ ہیں اورمطلب یہ ہے کہ اعمش فرماتے ہیں کہ ابوسفیان نے حضرت جابر سے ''فیلتزمہ'' بھی نقل کیا تھا،اس کے مرجع کے بارے میں اور بھی احتمالات ہیں جن کو عربی شرحوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ (۲)

یہ راوی کی دیانت داری کی بات ہے کہ جن الفاظ کا یقین نہیں تھا ان کو اراہ (صیغۂ ظن سے) بیان فرمایا۔

٦٦ / ١٠: وعنه قال قال رسو لُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم ''إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ مِنْ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّوْنَ فِيْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ، وَلٰكِنْ فِي التَّحْرِيْشِ بَيْنَهُمْ'' (رواہ مسلم) (۳)

ترجمه: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ جزیرۂ عرب میں نمازی (مسلمان) اس کی پرستش کریں لیکن ان کے درمیان لڑائی کرانے میں کوشش کرتا رہے گا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

شیطان کی جزیرۂ عرب میں بت پرستی سے مایوسی اور باہم لڑانے کی کوشش:

اس حدیث میں بھی وساوس شیطانی کا بیان ہے، کہ شیطان لوگوں کو آپس میں لڑانے اوران میں جھگڑا کرانے کے لئے ایک کودوسرے کے خلاف اکساتا اور وسوسے ڈالتا ہے، اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب وعجم میں بت پرستی غالب تھی، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت

(۱) المرقاة ١ / ٢٣٣.

(۲) المرقاة ١ / ٢٣٢.

(۳) أخرجه مسلم ''كتاب صفات المنافقين واحكامهم، باب تحريش الشيطان'' ٢ / ٣٧٦.

صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغام ہدایت دے کر مبعوث فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کفر وشرک سے نکالا، چنانچہ آپ کی محنت کی برکت سے لوگوں نے بت پرستی کو چھوڑ دیا اور تقریباً پورا جزیرۃ العرب موحد بن گیا، اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پیش گوئی فرمائی کہ شیطان اس بات سے تو مایوس ہوگیا ہے، کہ مسلمان جزیرۃ العرب میں بت پرستی میں مبتلا ہوں، جزیرۃ العرب میں لوگ توحید و اسلام پر قائم رہیں گے، البتہ شیطان ان کو باہم لڑاتا رہے گا۔

"ان یعبده" شیطان کی عبادت سے مراد بت پرستی ہے، شیطان اس کا حکم دینے والا اور وسوسہ ڈالنے والا ہے، اس لئے شیطان کی طرف نسبت کی گئی ہے۔

"المصلون" اس سے المسلمون مراد ہے، یہاں صلاۃ بول کر ایمان مراد لیا گیا ہے کیونکہ نماز ایمان کا اعلی رکن ہے۔

"التحریش" بمعنی بعض کو بعض کے خلاف بھڑکانا، لڑائی کرانا، یعنی شیطان مسلمانوں میں باہم رقابتیں ڈال کر ان کو لڑاتا رہے گا، مسلمانوں میں باہم اختلافات اور تنازعات جو پیش آتے رہتے ہیں وہ اسی شیطانی تحریش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ایک سوال وجواب:

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب میں ارتداد پھیل گیا تھا اور بہت سے لوگ کفر میں مبتلا ہوگئے تھے تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی کس طرح درست ثابت ہوئی کہ آئندہ جزیرۂ عرب میں بت پرستی نہیں ہوگی؟

جواب یہ ہے کہ کچھ لوگ مرتد تو ہوئے تھے، لیکن اس کی بناء زکوۃ کا انکار کرنا تھا بت پرستی میں وہ بھی مبتلا نہیں ہوئے تھے (۱) مگر یہ جواب زیادہ معقول نہیں ہے اس لئے کہ شیطان کا مقصد کفر میں مبتلا کرنا ہے شکل اس کی جو بھی ہو، بت پرستی ضروری نہیں، لہذا صحیح جواب یہ ہے کہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جس طرح کفر کا غلبہ اور شیوع تھا اب آئندہ اس طرح کفر وشرک کا شیوع وغلبہ نہیں ہوگا، پس اگر کچھ لوگ مرتد ہوجائیں تو یہ حدیث کے منافی نہیں ہوگا۔

---

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۳۳.

جزیرۃ کا مفہوم اور جزیرۃ العرب کا مصداق:

جزیرۃ العرب: یہ ’’جزر‘‘ سے ہے بمعنی ہٹنا، مفعول کے معنی میں ہے، ’’جزیرہ‘‘ کے معنی ہیں زمین کا وہ خشک حصہ جس کے چاروں طرف پانی ہو، عرب کے تین طرف پانی ہے نہ کہ چار طرف، اس لئے عرب کو جزیرہ نما (نما بمعنی مثل ومشابہ) کہا جاتا ہے، عرب کے شمال میں ملک شام واقع ہے جو پانی سے خالی ہے البتہ تین جانب سے پانی کا احاطہ ہے، وہ اس طرح کہ عرب کی مشرقی جانب میں خلیج فارس اور بحر عمان واقع ہے، مغربی جانب میں بحیرۂ قلزم اور نہر سویز ہے، جنوب میں بحر ہند واقع ہے، شمال میں ملک شام ہے ادھر سمندر نہیں ہے۔ (۱)

جزیرۃ العرب کا مصداق کیا ہے؟ اس میں متعدد اقوال ہیں:

(۱) امام مالک نے فرمایا کہ اس سے مراد مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور یمن ہے۔ (۲)

(۲) بعض نے کہا کہ اس کی لمبائی عدن سے عراق تک اور چوڑائی جدہ سے اطراف شام تک ہے۔ (۳)

(۳) بعض نے کہا کہ اس کا مصداق نجد، تہامہ، حجاز اور یمن اور عروض ہے۔ (۴)

(۴) بعض نے کہا ہے کہ دس لاکھ سے تیرہ لاکھ مربع میل تک جزیرۃ العرب کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

جزیرۃ العرب کی وجہ تخصیص:

مذکورہ حکم میں جزیرۃ العرب کی تخصیص اس لئے ہے کہ وہ مہبط وحی اور مرکز دین وشریعت ہے، پس سارے عالم میں کفر وشرک کا غلبہ ہوسکتا ہے مگر جزیرۂ عرب دین وشرع کا مرکز ہونے کی وجہ کفر وشرک کے غلبہ سے محفوظ و مامون رہے گا۔ (۵)

---

(۱) شرح المشکاۃ للطیبی ۱/ ۲۲۵.

(۲) وشرح المشکاۃ للطیبی ۱/ ۲۲۵.

(۳) شرح البخاری لابن بطال ۵/ ۳٤٦.

(٤) عمدۃ القاری ۳/ ٥١٥.

(٥) شرح الطیبی ۱/ ۲۲۵.

الفصل الثاني

٦٧ / ١١: عن ابن عباسؓ أن النبيَ صلى الله عليه وسلم جاءَهُ رَجُلٌ، فقال: إِنِّي أُحَدِّثُ نَفْسِي بِالشَّيْءِ لأَنْ أَكُونَ حُمَمَةً أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ أَتَكَلَّمَ بِهِ قَالَ: "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِي رَدَّ أَمْرَهُ إِلَى الْوَسْوَسَةِ" (رواه ابوداود) (١)

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا (یارسول اللہ!) میں اپنے اندر ایسا براخیال پاتاہوں کہ مجھے جل کر کوئلہ بن جانا زیادہ پسند ہے مگران چیزوں کوزبان پرلانا گوارانہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اس خیال کووسوسہ کی حدتک رکھاہے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

انی احدث نفسی بالشیٔ: ایک شخص نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے ایسے وسوسے آتے ہیں کہ مجھے کوئلہ بن جانا پسند ہے لیکن میں ان چیزوں کو زبان پرلانا گوارانہیں کرتا،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ صورت وسوسہ کی ہے اوروسوسہ شرعاً معاف ہے، اللہ کافضل اوراحسان ہے کہ اس نے اس معاملہ کوصرف وسوسہ کی حدتک رکھا۔

رد أمره:اس ضمیر کے مرجع میں دواحتمال ہیں: (ا)اس کا مرجع آنے والاشخص ہو،معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کافضل اوراحسان ہے کہ اس شخص کے اس معاملہ کو وسوسہ کی حدتک محدود رکھا،عمل وتکلم نہ کرایا ورنہ وہ شخص کفرمیں مبتلا ہوجاتا۔ (٢)

(٢) ضمیر کامرجع شیطان ہواور امر "مکر" کے معنی میں ہو،چنانچہ بعض روایات میں **کیدہ** کالفظ آیاہے، (٣) اس صورت میں معنی ہونگے کہ تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں کہ جس نے شیطان کے مکرکووسوسہ کی طرف پھیردیا، حاصل وہی ہوا کہ مبتلاء کفرہونے سے حفاظت فرمائی۔

(١) أخرجه أبو داود، كتاب الأدب،باب في رد الوسوسة ٢ / ٦٩٧.

(٢) شرح الطيبي ١ / ٢٢٦.

(٣) (المصدر السابق)

شیطان کی بہکانے کی کوششیں اور حضرت معاویہ کا واقعہ:

علماء نے فرمایا کہ شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ اولاً کفر کا وسوسہ ڈالتا ہے، بندہ اس میں اطاعت نہ کرے تو کبائر کا وسوسہ ڈالتا ہے، پھر صغائر کا وسوسہ ڈالتا ہے، پھر عمل مفضول کا وسوسہ ڈالتا ہے، افضل عمل سے روکنے کی بہرحال کوشش کرتا ہے، مثلاً دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ نفل نماز کھڑے ہوکر پڑھنا کوئی ضروری نہیں، بیٹھ کر پڑھ لینا کافی ہے چنانچہ آدمی بیٹھ کر پڑھ لیتا ہے اور کھڑے ہوکر پڑھنا جو افضل ہے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کی ایک مرتبہ تہجد فوت ہوگئی، چونکہ اس سے قبل کبھی تہجد فوت نہیں ہوئی تھی اس لئے بہت رنج وافسوس ہوا، حتی کہ سارادن روتے روتے گذاردیا، جب اگلی رات سوئے تو تہجد کے وقت ایک شخص نے آپ کو بیدار کیا کہ اٹھ کر تہجد پڑھ، حضرت معاویہؓ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے بیدار کرنے والے سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا کہ میں شیطان ہوں، حضرت معاویہؓ نے پوچھا کہ تمہارا کام تو لوگوں کو نماز کے وقت سلانا ہے نہ کہ جگانا؟ شیطان نے کہا: آپ کو اس بحث میں پڑنے کی حاجت نہیں، آپ تہجد پڑھئے، حضرت معاویہؓ نے اصرار کیا؟ ان کے اصرار پر شیطان نے کہا کہ گذشتہ رات میں نے آپ پر غفلت طاری کرکے آپ سے تہجد فوت کرادی، لیکن آپ اس کے افسوس میں دن بھر روتے رہے، جس سے آپ کے اس قدر درجات بلند ہوئے کہ تہجد پڑھنے پر بھی اتنے بلند نہ ہوتے، پس چال الٹی پڑگئی، لہذا آج میں آپ کو بیدار کرنے کے لئے آیا ہوں تاکہ آپ کے درجات زیادہ بلند نہ ہوں،⁽۱⁾ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ شیطان آخری درجہ میں افضل عمل سے ہٹا کر مفضول میں لگا دیتا ہے۔

۶۸ / ۱۲: وَعَنِ ابنِ مَسْعُوْدٍؓ قال: قال رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إِنَّ لِلشَّيْطَانِ لَمَّةً بِابْنِ آدَمَ، وَلِلْمَلَكِ لَمَّةً، فَأَمَّا لَمَّةُ الشَّيْطَانِ فَإِيْعَادٌ بِالشَّرِّ، وَتَكْذِيْبٌ بِالْحَقِّ، وَأَمَّا لَمَّةُ الْمَلَكِ فَإِيْعَادٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْحَقِّ، فَمَنْ وَجَدَ ذٰلِكَ؛ فَلْيَعْلَمْ أَنَّهُ مِنَ اللّٰهِ؛ فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ وَمَنْ وَجَدَ الْأُخْرَىٰ؛ فَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ثُمَّ قَرَأَ: "اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ" (رواه الترمذی)⁽۲⁾ وقال: هذا حديث غريب.

(۱) اصلاحی خطبات ۶ / ۴۲.

(۲) أخرجه الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب من سورة البقرة ۲ / ۱۲۸.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیشک ہر انسان پر ایک تصرف تو شیطان کا ہوا کرتا ہے اور ایک تصرف فرشتہ کا، شیطان کا تصرف یہ ہے کہ وہ برائی پر ابھارتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے اور فرشتہ کا تصرف یہ ہے کہ وہ نیکی پر ابھارتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے، لہٰذا جو شخص یہ کیفیت (نیکی پر ابھارنے کی) پائے اس کو جان لینا چاہئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو شخص دوسری کیفیت (یعنی شر پر ابھارنا اور شیطان کی وسوسہ اندازی) اپنے اندر پائے تو اس کو چاہئے کہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ طلب کرے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شریفہ پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے) شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور گناہ کا حکم کرتا ہے۔ (ترمذی، اور امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث غریب ہے)

تشریح حدیث

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندر دو چیزیں تصرف کرنے والی ہیں، ایک فرشتہ اور ایک شیطان۔ جس کی کچھ تفصیل اس سے قبل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں بھی آچکی ہے۔

لمہ کے معنی اور اس کی اقسام وجہات:

''لمہ'' بمعنی الالقاء فی القلب، مراد اس سے تصرف ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ لمہ چار قسم کا ہوتا ہے:

(۱) لمۂ حقانی، کہ اللہ براہ راست بندہ کے قلب میں کوئی بات القاء فرمادے (۲) لمۂ نفسانی، برے تصرف کا باعث نفس ہو (۳) لمۂ ملکی، القاء خیر فی القلب فرشتہ کے واسطہ سے ہو (۴) لمۂ شیطانی، برا تصرف شیطان کی طرف سے ہو، ان چاروں لموں کا اثر قلب پر ہوتا ہے اول کا اثر قلب کے اوپر والے حصہ پر ہوتا ہے اور ثانی کا اثر قلب کے نیچے والے حصہ پر، اور ثالث کا اثر داہنی جانب، اور رابع کا اثر بائیں جانب میں ہوتا ہے، اسی لئے وسوسہ آنے پر بائیں جانب تھوکنے کا حکم ہے۔(۱)

فاما لمة الشيطان: یعنی شیطان کا تصرف یہ ہے کہ وہ انسان کو شر اور برائی پر اکساتا ہے، حق کی بات کی تکذیب یا اس کی عدم تعمیل پر ابھارتا ہے اور فرشتہ کا تصرف یہ ہوتا ہے کہ وہ خیر اور بھلائی کے امور پر

(۱) اللمعات ۱ / ۳۳۲-۳۳۴ وقد ذكرهنا أقساماً أخر.

ابھارتا ہے اور حق کی تصدیق وتعمیل کے جذبات پروان چڑھاتا ہے۔

وعدہ، وعید اور ایعاد:

فإيعاد باشر : اس مادہ کے تین لفظ ہیں وعدہ، وعید اور ایعاد، وعدہ کا اطلاق امور خیر میں ہوتا ہے اور وعید کا امور شر میں، اور ایعاد لفظ مشترک ہے، خیر وشر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ یہاں خیر وشر دونوں کے لئے بولا گیا ہے، شر سے مراد کفر وشرک اور کبائر وغیرہ ہیں۔ (۱)

فمن وجد ذلك الخ : جب انسان کے قلب میں خیر کے جذبات پیدا ہوں تو ان کو منجانب اللہ سمجھ کر اللہ کا شکر بجالانا چاہئے اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کرنی چاہئے اور جب دل میں برے خیالات پیدا ہوں تو ایسے وقت تعوذ پڑھنا چاہئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر یہ آیت تلاوت فرمائی: **اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلاً.** (۲) کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اس آیت کریمہ سے حدیث کے مضمون کی تائید ہورہی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور استشہاد اس کو پڑھا۔

حدیث کی نوعیت اور اس کا درجہ:

وقال: هذا حديث غريب: مصنف فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کے بارے میں فرمایا ہے کہ: یہ حدیث غریب ہے، ''غریب'' وہ حدیث کہلاتی ہے کہ جو صرف ایک سند وطریق سے مروی ہو، اس کی کوئی دوسری سند موجود نہ ہو، یا اس کے متن میں ایسا لفظ ہو جس کو دوسرے رواۃ نے نہ بیان کیا ہو، لیکن غریب کا مطلب ضعیف نہیں ہوتا، حدیث غریب ہونے کے باوجود صحیح ہوسکتی ہے، چنانچہ امام ترمذی نے اس کو غریب ہونے کے باوجود صحیح قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے: ہذا حدیث حسن صحیح غریب، اور یہ غریب اس لئے ہے کہ اس میں ایک راوی ابوالاحوص ہیں، تنہا وہی اس کو مرفوع حدیث کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) اللمعات ۱/ ۳۳۰.

(۲) من سورة البقرة: ۲۶۸.

(۳) امام ترمذیؒ نے حدیث شریف نقل کرنے کے بعد فرمایا: ''هذا حديث حسن صحيح غريب وهو حديث أبي الأحوص لانعرفه مرفوعا إلا من حديث أبي الأحوص'' (ترمذی ۲/ ۱۲۸)

٦٩ / ١٣: وعن أبي هُريرةؓ أَنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: لايَزَالُ النَّاسُ يَتَسَاءَلُوْنَ حَتّٰى يُقَالَ هٰذَا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ؟ فَإِذَا قَالُوْا ذٰلِكَ فَقُوْلُوْا: اَللّٰهُ أَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ كُفُواً اَحَدٌ، ثُمَّ لِيَتْفُلْ عَنْ يَسَارِهٖ ثَلاثًا. وَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. (رواہ ابوداود)[1] وسنذكر حديث عمرو بن الأحوص في باب خطبة يوم النحر إن شاء الله تعالى.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگ باہم سوال کرتے رہیں گے، حتی کہ کہا جائے گا (یعنی شیطانی وسوسوں کی صورت میں ان کے اندر اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہیں گے) کہ جب ہر چیز کو اللہ نے پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہ سوال پیدا ہو تو کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے اور کوئی اس کا ہمسر اور جوڑ نہیں، پھر اپنی بائیں طرف تین مرتبہ تھتکاردو اور شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو (ابوداود) (صاحب مشکوۃ فرماتے ہیں) کہ عمرو بن احوص کی روایت (جس کو صاحب مصابیح نے یہاں نقل کیا تھا) ہم اس کو خطبۂ یوم النحر کے باب میں نقل کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔ (کیونکہ وہ روایت اسی باب سے متعلق ہے)

تشریح حدیث

دفع وساوس کا ایک اور علاج:

ان احادیث کا حاصل پہلے گذر چکا ہے کہ شیطان اللہ کی ذات وصفات کے بارے میں وسوسہ ڈالتا رہتا ہے یہاں اس کا علاج بتایا گیا ہے کہ ان وسوسوں کے وقت سورۂ اخلاص **قل هو الله أحد** پڑھو، اور تعوذ پڑھ کر بائیں جانب تھوک دو۔

لایزال الناس یتساء لون: اس سوال کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ بعض اشخاص بعض سے سوال کریں گے تحقیق کے لئے، یا لوگ اپنے دلوں سے سوال کریں گے یعنی ان کے دل ودماغ میں اس قسم کا سوال بار بار آئے گا، دونوں صورتیں اس کا مصداق ہیں، اس صورت حال کا علاج بتایا گیا کہ اس وقت سورۂ اخلاص

(١) أخرجه ابو داود في كتاب السنة، باب في الجهمية ٢ / ٦٤٨.

پڑھو، سورۂ اخلاص میں اللہ کی تحمید تنزیہ اور تقدیس مذکور ہے کہ وہ اس بات سے منزہ اور پاک ہے کہ اس کو جنا جائے ، اور تعوذ پڑھو کہ اس میں شیطان کے مقابلہ کے لئے حق تعالیٰ شانہ سے استمداد ہے۔

وسنذکر حدیث عمرو بن الاحوص : اس موقعہ پر مصابیح السنہ میں ایک اور حدیث تھی، لیکن وہ کتاب الایمان کے زیادہ مناسب نہیں تھی بلکہ خطبہ یوم النحر کے زیادہ مناسب تھی، اس لئے علامہ خطیب تبریزیؒ نے اس کو وہاں ذکر کیا ہے، شروع کتاب میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ صاحب مشکوۃ نے مصابیح السنۃ میں اس قسم کے تغیرات کئے ہیں۔

الفصل الثالث

۷۰ / ۱۴: عن أنسؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم: لَنْ يَبْرَحَ النَّاسُ يَتَسَاءَ لُوْنَ، حَتّٰى يَقُوْلُوْا: هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ شَيْئٍ ،فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ ؟ (رواه البخاری) ولمسلم قال: قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اِنَّ أُمَّتَکَ لایَزَالُوْنَ يَقُوْلُوْنَ: مَاكَذَا ؟ مَاكَذَا؟ حَتّٰى يَقُوْلُوْنَ: هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ؟(۱)

ترجمه : حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگ باہم پوچھ تاچھ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ کہنے لگیں گے کہ اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا تو اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ (بخاری) اور مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ آپ کی امت کے لوگ پہلے یوں کہیں گے: یہ کیا ہے؟ یہ کیسے ہوا؟ (یعنی مخلوقات کے بارے میں تحقیق و تجسس کریں گے) اور پھر آخر میں یوں کہیں گے کہ تمام چیزوں کو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟

تشریح حدیث

اس حدیث کا بھی مضمون گذر چکا ہے، مسلم شریف میں یہ حدیث حدیث قدسی کے طور پر مروی ہے، ''ما کذا'' سے مراد یہ ہے کہ لوگ خِلقت کے بارے میں سوال کرتے رہیں گے، اور سوال کا یہ سلسلہ دراز ہوگا

(۱) رواه البخاري في كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة، باب مايكره من كثرة السؤال ۲ / ۸۳(۷۲۹٦)
ومسلم في كتاب الإيمان، باب بيان الوسوسة في الإيمان ۱ / ۷۹(۲۱۷)

حتی کہ حق جل وعلا تک نوبت پہنچے گی۔

۷۱ / ۱۵: وعن عثمانَ بنِ أبی العاصِؓ قال: قُلْتُ: یارسول الله ! إنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ حَالَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ صَلٰوتِیْ وَبَیْنَ قِرَاءَ تِیْ یُلَبِّسُهَا عَلَيَّ، فَقَالَ: رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی الله علیہ وسلم : ذَاکَ شَیْطَانٌ یُقَالُ لَهٗ خِنْزَبٌ، فَإِذَا أَحْسَسْتَهٗ فَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْهُ، وَاتْفُلْ عَلٰی یَسَارِکَ ثَلاثاً، فَفَعَلْتُ ذٰلِکَ فَأَذْهَبَهُ اللّٰهُ عَنِّيْ. (رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے مروی ہے: انھوں نے فرمایا: میں نے عرض کیا :یارسول اللہ! میرے اورمیری نماز وقراءت کے درمیان شیطان حائل ہوجاتا ہے اورنماز کومیرے اوپر مشتبہ کرتا رہتا ہے ،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ ایک شیطان ہے جس کو" خنزب" کہاجاتا ہے پس جب تم اس کومحسوس کروتوتم اس شیطان مردود سے خدا کی پناہ مانگو اور بائیں طرف تین مرتبہ تھتکاردو، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ شانہ نے اس کو مجھ سے دور کردیا۔(مسلم)

تشریح حدیث

احوال عثمانؓ:

عثمان بن ابی العاص قبیلہ ثقیف کے ہیں، ابوعبداللہ کنیت ہے، یہ قبیلہ سب سے اخیر میں مسلمان ہوا، یہ لوگ ۱۰ھ میں مسلمان ہوئے، اس وقت عثمان بن ابی العاص کی عمر ۱۹سال کی تھی، لیکن سمجھدار بہت تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طائف کا عامل مقرر کردیا تھا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں اورحضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں وہاں کے عامل رہے، پھرحضرت عمرؓ نے ان کوعمان اور بحرین کا گورنر بنادیا، اس کے بعد بصرہ میں مقیم ہوگئے اور وہیں حضرت معاویہؓ کے دور میں ۵۰ھ یا ۵۱ھ میں انتقال فرماگئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ارتداد پھیلا، اس وقت ثقیف قبیلہ نے بھی ارتداد کاارادہ کیا توحضرت عثمان ابن العاص نے ہی ان کو یہ کہکر سمجھایا: یامعشرَ ثقیفٍ کنتم آخرَ الناس إسلاماً فلا تکونوا أوَّلَهم ردةً کہ تم لوگ سب سے اخیر میں اسلام لائے، اب سب سے پہلے مرتد مت بنو۔

(۱) أخرجه مسلم، کتاب السلام، باب التعوذ من شیطان الوسوسة فی الصلوة ۲ / ۲۲۴.

ان کے یہ نصیحت فرمانے پر یہ قبیلہ ارتداد سے رک گیا۔ (۱)

خِنۡزَب نامی شیطان کا نماز میں حائل ہونا اوراس سے حفاظت کی تدبیر:

ان الشيطان قدحال بيني: حضرت عثمان بن العاص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شیطان میری نماز کے درمیان حائل ہوتا ہے یعنی نماز شروع کرنے نہیں دیتا، یا اثناء نماز میں حائل ہوتا ہے اور قرأت میں خلل ڈالتا ہے نیز خشوع سے نماز نہیں پڑھنے دیتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کو تسلیم کیا اور فرمایا کہ اس شیطان کا نام "خنزب" ہے۔

خنزب: بروزن درہم بمعنی **الجری علی المعاصی** برائی پر جری اور دلیر۔

فاذا احسسته فتعوذ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ایسا ہوتو اس وقت تعوذ پڑھو اور تین مرتبہ بائیں جانب تھوک دو، راوی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ نے اس کیفیت کو ختم فرمادیا۔

نماز میں تھوکنے کا حکم:

حنابلہ کے یہاں یہی حکم ہے کہ نماز میں شیطانی وسوسہ آوے تو نماز میں ہی بائیں جانب تین مرتبہ تھوک دے، ان کے مذہب کے مطابق اس سے نماز میں کوئی خلل نہیں ہوگا قالہ ابن القیم۔ (۲)

اورحضرات احناف اس کو بعد فراغ الصلاۃ پر محمول کرتے ہیں، کیونکہ اگر نماز میں ایسا کرے گا تو عمل کثیر ہوجائے گا جو کہ مفسد صلوۃ ہے، اگر نماز میں تھوکنا چاہے تو تین مرتبہ متوالیاً نہ تھوکے بلکہ متفرقاً تھوکے، نیز اگر مسجد کا فرش پختہ ہوتو تھوک کو اپنے کپڑے میں لے، فرش پر نہ تھوکے۔

۷۲/۱٦: وعن القاسمِ بنِ محمدٍ: أَنَّ رَجُلاً سَأَلَهُ فَقَالَ: إِنِّي أَهِمُ فِيْ صَلاتِيْ فَيَكْثُرُ ذٰلِكَ عَلَيَّ، فَقَالَ لَهُ: اِمْضِ فِيْ صَلاتِكَ، فَإِنَّهُ لَنْ يَذْهَبَ ذٰلِكَ عَنْكَ حَتّٰى تَنْصَرِفَ وَأَنْتَ تَقُوْلُ مَاأَتْمَمْتُ صَلاتِيْ. (رواه مالک)(۳)

ترجمه: حضرت قاسم بن محمدؒ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ: مجھے اپنی نماز میں وہم ہوتا رہتا ہے اور یہ مجھے بکثرت پیش آتا ہے، قاسم بن محمد نے فرمایا: تم اپنی نماز پوری کرو،

(۱) الإصابة ۳/۴۲۲-۴۳۲ (۵۴۴۲)

(۲) اعلام الموقعين ۴/۲۱۸.

(۳) أخرجه مالک فی المؤطا، کتاب الصلوة، باب العمل فی السهو ۱/۳۵.

اس لئے کہ وہ شیطان تم سے جب ہی دور ہوگا کہ تم اپنی نماز پڑھ کر ہٹ جاؤ اور کہو کہ ہاں میں نے اپنی نماز پوری نہیں کی۔ (مالک)

تشریح حدیث

احوال قاسم بن محمدؒ:

قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ کبار تابعین میں سے ہیں، بڑے علم وفضل کے مالک تھے، مدینہ طیبہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں، یحی بن سعید نے فرمایا کہ: ہم نے مدینہ میں ان سے افضل کسی کو نہیں پایا، ۱۰۱ھ میں وفات ہوئی۔(۱)

چونکہ یہ تابعی ہیں ہیں اسلئے ان کی یہ حدیث ''مقطوع'' کہلائے گی، جو حدیث وروایت تابعی کی جانب منسوب ہو اس کو ''حدیث مقطوع'' کہتے ہیں۔

نماز میں وساوس آنے کا ایک علاج:

اس حدیث میں بھی نماز میں وسوسہ آنے کا ایک علاج مذکور ہے، قاسم بن محمدؒ سے کسی نے شکایت کی کہ نماز میں مجھے وہم بہت ہوتا ہے۔

قاسم بن محمد نے اس کا یہ علاج بتایا کہ: اس وہم کی طرف توجہ نہ کرو، بلکہ نماز میں دھیان جمائے رکھو اور نماز کے بعد شیطان کو کہو کہ ہاں میں نے ناقص نماز پڑھی ہے تیرے کہنے سے میں نماز کو مکمل نہیں کروں گا ، اللہ تعالیٰ شانہ میری ناقص نماز کو ہی قبول فرمائے گا، اس طرح شیطان کی مخالفت کرنے سے شیطان مایوس ہوکر پیچھا چھوڑ دے گا، اس کے وسوسے ختم ہوجائیں گے۔

آج بغیر کہنی دھوئے نماز پڑھیں گے!

نماز میں وساوس اور شیطانی دخل اندازی کا خاتمہ اسی صورت سے ممکن ہے کہ وساوس شیطانی کی جانب توجہ نہ کی جائے اور محض وسوسہ کی بنیاد پر نماز کا اعادہ نہ کیا جائے، ورنہ آدمی وہم کا مریض بن جائے گا اور شیطان اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا، بعض بزرگوں کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان کو دوران

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۳۹.

وضو کہنی کے خشک رہ جانے کا وسوسہ ہوا، انہوں نے دوبارہ اس کو دھولیا، پھر وسوسہ ہوا تو یہ کہہ کر کھڑے ہوگئے کہ: آج بغیر کہنی دھوئے نماز پڑھیں گے، حضرت کی یہ بات دفعِ وسواس کے لئے تھی جو اسی حدیث سے ماخوذ تھی۔

مگر علماء نے فرمایا کہ: یہ اس وقت ہے جب کہ ظن غالب نماز کی تکمیل کا ہو، اگر ظن غالب یہ ہے کہ نماز پوری نہیں ہوئی ہے تو پھر تکمیل لازم ہوگی، یہی حکم دوسرے اعمال کا ہے۔

فیکثر ذالک: اس کو تین طرح سے ضبط کیا گیا ہے: (۱) یکثر صیغہ معروف کے ساتھ ہو بروزن یکرم (۲) صیغہ مجہول کے ساتھ (۳) یکبر بالباء الموحدہ، پہلی صورت میں معنی یہ ہیں کہ یہ وہم مجھے کثرت سے ہوتا ہے، صیغۂ مجہول ہو تو معنی ہونگے کہ یہ وہم میرے اوپر کثرت سے ڈالا جاتا ہے، اور باء موحدہ کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی ہونگے: یہ وہم مجھے شاق ودشوار گزرتا ہے، قرآن کریم کی آیت ”کَبُرَتْ کَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ“(۱) میں کبرت اسی معنی میں مستعمل ہے۔(۲)

باب الإیمان بالقدر

ماقبل میں مطلق ایمان کا بیان تھا، ایمان بالقدر یہ مطلق ایمان کا جزو ہے، گویا کل کے بعد جزو کو بیان کیا جارہا ہے، یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ماقبل میں عام کا بیان تھا یہاں خاص کو بیان کیا جارہا ہے پس یہ **تخصیص بعدالتعمیم** ہے۔

مسئلہ تقدیر کی اہمیت ونوعیت:

سوال: اس جزو کو مستقل باب میں کیوں بیان کیا جارہا ہے؟ ایمان بالقدر مطلق ایمان کا ایک حصہ ہے لہذا کتاب الایمان کا جو عنوان پیچھے سے چلا آرہا ہے اسی کے تحت اس کی روایات کو لایا جاسکتا تھا، مستقل باب کی ضرروت نہیں تھی؟

جواب یہ ہے کہ: ایمان بالقدر مہتم بالشان مسئلہ ہے، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کو مستقل باب میں بیان کیا جارہا ہے، اس مسئلہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے امت میں مختلف فرقے پیدا ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ

(۱) من سورۃ الکهف: ۵.

(۲) اللمعات ۱: ۳۳۷.

علیہ وسلم تقدیر کے بارے میں گفتگو سے منع فرمایا کرتے تھے؛ اسی لئے تقدیر کے بارے میں عقلاً گفتگو کرنا درست نہیں ہے، ہاں نصوص میں تقدیر کے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا مذاکرہ صحیح ہے اس کی ممانعت نہیں ہے۔

ملا علی قاریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ سے کسی نے سوال کیا: **اخبرني عن القدر** ؟ تو فرمایا: **طريق مُظْلِمٌ لاتَسْلُكْهُ** کہ وہ ایک تاریک راستہ ہے اس پر مت چلو، اس شخص نے دوبارہ یہی سوال کیا تو فرمایا **بحرٌ عميقٌ لاتَلِجْهُ** کہ وہ ایک گہرا دریا ہے اس میں مت داخل ہو، سائل نے تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو فرمایا: **سِرُّ اللّٰهِ قَدْخَفِيَ عَلَيْكَ لاتُفَتِّشْهُ** کہ وہ اللہ تعالیٰ شانہ کا ایک راز ہے اس کی تفتیش مت کر،(۱) ملا علی قاریؒ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ تقدیر اللہ کا راز ہے اس کا علم نہ ملک مقرب کو دیا گیا ہے اور نہ نبی مرسل کو، مسئلۂ تقدیر عقل کی حد سے باہر ہے اس لئے آدمی اس کی کنہ وحقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔(۲)

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ نے انسان کو جو قوتیں (بصر، سمع، مال وغیرہ) عطا فرمائی ہیں ان کی ایک حد مقرر ہے، اس حد تک وہ قوت کام کرتی ہے اس سے آگے نہیں، مثلاً اللہ کی عطا کردہ ایک قوت بینائی ہے، اس سے بیس گز کے فاصلہ کی چیز کو پڑھا جاسکتا ہے اس سے دور کی چیز کو نہیں پڑھا جاسکتا، یہی حال قوت سماعت کا ہے، ایک شخص قوی وتندرست ہے وہ ایک کوئٹل کا پتھر اٹھا سکتا ہے اس سے زیادہ کا نہیں، ایک شخص مالدار ہے وہ ایک ہیرا خرید سکتا ہے دو ہیرے نہیں خرید سکتا، غرضیکہ انسان کی ہر قوت ایک حد تک کام کرتی ہے اس سے آگے نہیں، اسی طرح قویٰ انسانی میں ایک قوت عقلیہ ہے اس کی بھی منجانب اللہ ایک حد ہے، اس حد کے اندر کی چیزوں کو عقل سمجھتی ہے، حد سے باہر کی چیزوں کو نہیں سمجھ سکتی، مسئلۂ تقدیر عقل کی حد سے باہر کی چیز ہے اس لئے اس مسئلہ کو عقل سے نہیں سمجھا جاسکتا، بلا سمجھے ہی اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

اس باب سے متعلق چند مباحث ہیں: قضاء وقدر کے لغوی واصطلاحی معنی، قضاء وقدر میں فرق، ایمان بالقدر کا مفہوم، ایمان بالقدر پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات، مسئلہ تقدیر اور اختلاف امت، ایمان بالقدر کے فوائد، اقسام تقدیر، کتابت تقدیر کے مراحل واوقات۔

---

(۱) مرقاة المفاتيح ۱ / ۲٤٠.

(۲) المصدر السابق.

قضاوقدر کے لغوی واصطلاحی معنی:

''قدر'' بفتح الدال کے لغوی معنی ہیں: تجویز کرنا، اندازہ کرنا اور ''قضا'' کے لغوی معنی ہیں: فیصلہ کرنا، اور تجویز اور اندازہ کے مطابق کام انجام دینا، پس وضعاً قدر مقدم ہے اور قضاء مؤخر، اور قضاوقدر کے اصطلاحی معنی ہیں: عالم میں جو امور واشیاء موجود ہیں یا جو آئندہ وقوع پذیر ہونگی وہ سب اپنے وقوع کے اوقات وکیفیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور اس کی تجویز وفیصلہ کے مطابق واقع ہوتی ہیں۔(۱)

قضاوقدر میں فرق:

بعض نے کہا کہ دونوں مترادف ہیں اور بعض نے فرق کیا ہے کہ قضا نام ہے حکم کلی اجمالی کا جو ازلی ہے اور قدر نام ہے اس حکم کلی کے اپنی تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ وقوع کا، اور بعض نے اس کے برعکس کہا ہے کہ: قدر نام ہے اجمالا کسی کام کے اندازہ کرنے کا اور قضاء نام ہے اندازہ کے مطابق اس کو وقوع پذیر کرنے کا، یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن کریم میں یہ الفاظ اسی معنی ومفہوم میں استعمال ہوئے ہیں:

ارشاد باری ہے: ''قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَئٍ قَدْرا ''(۲) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے، ''اِنَّا كُلَّ شَئٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَر ''(۳) یعنی ہم نے ہر چیز کو اندازہ کر کے پیدا کیا ہے، نیز ارشاد ہے: فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ،(۴) یعنی ہم نے سات آسمان پیدا فرمائے۔

ایمان بالقدر کا مفہوم:

ایمان بالقدر یہ ہے کہ اس بات کا پختہ یقین رکھا جائے کہ جو کچھ ہو چکا یا ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب اللہ کے علم محیط میں پہلے سے تھا، اور اب بھی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم ازلی کے مطابق ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھا پھر اللہ کی قدرت کاملہ کے تحت اللہ کے ارادہ ومشیت سے تمام امور انجام پاتے ہیں(۵) جیسے انجینئر ایک مکان بنانا چاہے تو اس کا ایک خاکہ ذہن میں تیار کرتا ہے، پھر اسی ذہنی خاکہ کے مطابق کاغذ پر

(۱) فتح الإله ۱/ ۴۲۳، والمرقاۃ ۱/ ۲۴۰.

(۲) من الطلاق: ۳.

(۳) من القمر: ۴۹.

(۴) من السجدة: ۱۲.

(۵) المرقاۃ ۱/ ۲۴۰.

نقشہ بناتا ہے، پھر اس نقشہ کے مطابق معماروں کو حکم دیتا ہے، تو اللہ کے علم ازلی میں بھی اس کائنات کا نقشہ موجود تھا، پھر اس کو لوح محفوظ میں لکھا، پھر اسی لکھے ہوئے کے مطابق تمام امور اپنے اپنے وقتوں میں انجام پاتے ہیں۔

مسئلہ تقدیر کی ایک واضح مثال:

مسئلہ تقدیر کی مثال ایسی ہے جیسے ٹرین کا ایک نظام الاوقات (ٹائم ٹیبل) ہوتا ہے جو اسٹیشن ماسٹر کو معلوم ہے اس نے بلیک بورڈ پر اپنے علم کے مطابق ٹرین پہنچنے کے اوقات لکھے کہ یہ ٹرین فلاں وقت فلاں اسٹیشن پر پہنچے گی، ایک گھنٹہ میں اتنی مسافت طے کرے گی اور یہاں کے اسٹیشن پر فلاں وقت پہنچے گی، غرضیکہ ٹرین کا مکمل نظام الاوقات مرتب ہو کر سامنے آ گیا، آپ دیکھتے ہیں کہ وہ گاڑی ٹھیک اسی نظام کے مطابق چلتی ہے اور وقت پر اسٹیشن پہنچتی ہے جس طرح کہ لکھا گیا تھا، لیکن یہ نظام الاوقات کا مقرر ہو جانا اس گاڑی کو نہیں چلاتا بلکہ ٹرین کا ڈرائیور اپنے اختیار سے چلاتا ہے بلیک بورڈ پر وقت لکھے جانے سے ڈرائیور کا اختیار سلب نہیں ہوا، اسی طرح لوح محفوظ میں انسان کی تقدیر لکھے جانے سے انسان مجبور نہیں ہوا، تقدیر لکھے جانے کے باوجود انسان کی زندگی کی یہ گاڑی اپنے کسب واختیار سے سفر کر رہی ہے، بس فرق یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کا علم کامل اور محیط ہے اس لئے جو لکھ دیا اس سے تخلف نہیں ہوتا، برخلاف محکمہ ریلوے کے کہ ان کا علم ناقص ہے ان کو نہیں معلوم کہ آگے کوئی رکاوٹ پیش آئے گی یا نہیں؟ اس لئے اس میں بہت سی دفعہ تخلف ہو جاتا ہے، لہذا ہر انسان کی زندگی کا پورا نظام الاوقات بھی من جانب اللہ اسی طرح مرتب ہے اور ہر انسان اسی کے حساب سے اعمال وافعال انجام دیتا ہے، مگر سب کچھ اپنے اختیار سے ہی کرتا ہے پس نہ انسان بالکل آزاد ہے کہ اپنی تقدیر بھی خود بناتا ہو کما قال بہ القدریۃ اور نہ وہ بالکل مجبور ہے کہ خود کوئی اختیار نہ رکھتا ہو کما قال بہ الجبریہ۔

ایمان بالقدر پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات:

اس مسئلہ پر کچھ اشکالات کئے گئے ہیں:

(۱) اشکال: مسئلہ تقدیر انسان کو مجبور محض بناتا ہے کیونکہ جب یہ عقیدہ ہوگا کہ سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے اور ہر چیز مقدر ہے تو بندہ مجبور ہوا، پھر جزا اور سزا بھی نہیں ہونی چاہئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام چیزوں کا خلق ضرور اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، مگر اللہ نے انسان کو قوت

ارادہ اور کسب کا اختیار دیا ہے، اگر انسان برائی کرے گا تو اپنے اختیار سے کرے گا اس پر سزا کا مستحق ہوگا، اسی طرح نیکی کرے گا تو اپنے اختیار سے کرے گا اس پر اس کو اجر ملے گا، اسی کسب اور اختیار کی وجہ سے انسان مکلّف ہے، انسان کا با اختیار ہونا اور مجبور نہ ہونا بدیہی چیز ہے جس کو جانور بھی سمجھتا ہے، چنانچہ کوئی شخص کسی جانور کو لاٹھی سے مارے تو وہ جانور مارنے والے سے انتقام لیتا ہے نہ کہ لاٹھی سے، کیونکہ جانور بھی اس بات کو سمجھتا ہے کہ لاٹھی مجبور اور انسان مختار و متصرف ہے۔

(۲) اشکال: مسئلہ تقدیر انسان میں کم ہمتی پیدا کرتا ہے اس لئے کہ انسان جب یہ سوچے گا کہ جو مقدر میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے تو اسباب اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے نتیجہ میں ہمت کم اور حوصلہ پست ہوجائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے تقدیر پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اسباب کو اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اسباب اور مسببات بھی مقدر ہیں، جب آدمی سبب کو اختیار کرے گا تو وہ کم ہمت نہیں ہوگا اگر ایک سبب سے کامیابی نہ ملی تو دوسرے سبب کو اختیار کرے گا، کیونکہ وہ یہ سوچے گا کہ ممکن ہے اللہ نے میرے لئے دوسرے سبب میں کامیابی رکھی ہو، اسی طرح تیسرے اور چوتھے سبب کو اختیار کرے گا بالآخر اس کو کسی نہ کسی سبب سے کامیابی مل جائے گی، ہاں جس شخص کا ایمان تقدیر پر نہیں ہے وہ سبب کو ہی اصل سمجھتا ہے، اگر سبب اختیار کرنے کے باوجود اس کو کامیابی نہ ملی تو وہ کم ہمت ہوجائے گا آگے کوشش چھوڑ دے گا، پس کم ہمتی تو عدم ایمان بالقدر سے ہے نہ کہ ایمان بالقدر سے۔

مسئلہ تقدیر اور اختلافِ امت:

مسئلہ تقدیر اور افعال عباد کے خلق میں اختلاف ہے، خلافت راشدہ کے زمانہ تک امت اس مسئلہ میں متفق تھی، صحابہ کے اخیر دور میں ایک شخص پیدا ہوا معبد جہنی، اس نے سب سے پہلے تقدیر کا انکار کیا اور کہا کہ معاملات اچانک وقوع پذیر ہوتے ہیں، پہلے سے وہ اللہ کے علم میں نہیں ہوتے، اس نے اس کے لئے ''الامــــر أنف'' (کہ معاملہ یکا یک اور اچانک ہوتا ہے) کی تعبیر اختیار کی، پھر ایسے لوگوں کا باقاعدہ ایک فرقہ بن گیا، جو فرقۂ قدریہ کے نام سے موسوم ہوا، اب تقدیر کے بارے میں امت میں چار فرقے ہیں: قدریہ، معتزلہ، جبریہ اور اہل السنّت والجماعت، اول الذکر تینوں فرقے افراط و تفریط کا شکار ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کے مذہب میں اعتدال ہے۔

(۱)قدریہ:

یہ فرقہ تقدیرِ الٰہی کا منکر ہے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ کوئی چیز ازل سے طے نہیں، نہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے افعال پہلے مقرر کئے اور نہ ہی اس کو پہلے سے بندوں کے افعال کا علم ہے، بلکہ جب افعال وحوادث واقع ہوتے ہیں اسی وقت اللہ تعالیٰ کو ان کا علم ہوتا ہے، جیسا کہ بندوں کو بھی اسی وقت پتہ چلتا ہے جس کو یہ ''الامر انف'' سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ہر معاملہ نو پید ہوتا ہے پہلے سے معلوم ومقدر نہیں ہوتا۔

نیز ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف اعیان (شجر، حجر، ارض، سماء وغیرہ) کا خالق ہے، افعال کا نہیں، بندے اپنے افعال اختیاریہ کے خود خالق ہیں، اگر اللہ خالق افعال ہوتو بندہ مجبور ہوجائے گا پھراس کو احکام کا مکلّف بنانے میں تکلیف مالایطاق لازم آئے گا، اور ایسی صورت میں انزال کتب وارسال رسل سب بے کار ہوجائے گا، ان کے نظریہ کے مطابق چونکہ انسان کی تقدیر پہلے سے طے نہیں بلکہ ہرانسان اپنی تقدیر گویا خود بناتا ہے اس لئے ان کو ''قدریہ'' کہتے ہیں۔

اس فرقہ کے نظریات باطل اور قرآن وسنت کی تصریحات کے خلاف ہیں، قرآن میں صاف طور پر یہ فرمایا گیا ہے: ''اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ''[1] دوسری جگہ ارشاد ہے: ''قُلْ لَاۤ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعاً وَّلَاضَراًّ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ ''[2] کہ آپ فرمادیجئے کہ میں اپنی جان کے لئے نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں مگر وہ ہی جو اللہ چاہے، ''اِنَّکَ لَاتَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ ''[3] یعنی بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے اس کو جسے آپ چاہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں جسے وہ چاہتے ہیں، یہ سب آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان کو مکمل اختیار اور قدرت حاصل نہیں۔

(۲)جبریہ:

ان لوگوں نے افراط وغلو سے کام لیا ہے کہ سب کچھ اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے بندہ کو کوئی قدرت اور اختیار حاصل نہیں ہے، بندہ مجبور محض ہے، مگر یہ مذہب عقلاً وشرعاً باطل ہے کیونکہ بے شمار کام بندہ اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے۔

---

(۱)من القمر: ٤٩.

(۲)من الأعراف: ١٨٨.

(۳)من القصص: ٥٦.

(۳)معتزلہ:

معتزلہ نے کہا کہ افعالِ عباد دوقسم کے ہیں: افعال خیر اور افعال شر، افعال خیر کا خالق اللہ ہے اور افعال شر کا خالق خود بندہ ہے، ان کا کہنا ہے کہ افعال شر کا خالق اللہ کوقرار دیا جائے تو اللہ کی طرف شر اور قبیح کی نسبت کرنا لازم آئے گا اور یہ اللہ کی شان تعظیمی کے خلاف ہے۔

(۴)اہل السنّت والجماعت:

اہل سنت والجماعت راہ اعتدال پر ہیں کہ تمام اشیاء اللہ کے علم میں ازل سے ہیں، پھر ہر چیز اپنے وقت پر اللہ کی قدرت کے تحت اس کی مشیت وارادے سے وجود میں آتی ہے، ہاں بندہ کواختیار اور قوتِ کسب دی گئی ہے اسی وجہ سے بندہ مکلّف ہے اور چونکہ بندہ اپنے کسب واختیار سے افعال انجام دیتا ہے اس لئے اس کے کسب کی نوعیت کے لحاظ سے اس کوثواب وعذاب ہوتا ہے، پس اللہ تعالیٰ شانہ خالقِ افعال ہیں اور بندہ کاسب افعال، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خلق کی نسبت اپنی جانب کی ہے: ''وَاللّٰـــهُ خَلَقَكُمْ وَمَاتَعْمَلُوْنَ ''(۱) یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھی پیدا فرمایا اور ان اعمال کوبھی پیدا کیا جوتم انجام دیتے ہو،اورکسب کی نسبت انسان کی طرف فرمائی ہے: ''لَهَامَاكَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّاكَسَبْتُمْ''(۲)

اور خلق اورکسب میں فرق بھی ہے وہ یہ کہ خلق میں ایجاد فعل بغیر واسطۂ آلہ کے ہوتا ہے اورکسب آلہ کے ذریعہ ہوتا ہے، جیسے نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کوآگ میں ڈالا، یہ نمرود کی طرف سے فعلِ حرق کا کسب تھا ابراہیم علیہ السلام کے لئے، لیکن جلنے کے فعل کا متحقق ہونا اللہ کے اختیار میں ہے نہ کہ بندہ کے، چنانچہ اللہ نے آگ کوحکم دیا ''یَانَارُكُوْنِیْ بَرْداً وَّسَلاماً ''(۳) کہ اے آگ ٹھنڈی ہوجا اور ابراہیم کے لئے سلامتی والی بن جا،تو آگ نے انہیں نہیں جلایا۔

فوائد ایمان بالقدر:

تقدیر پر ایمان لانے کے بہت سے فائدے ہیں:

(۱)من الصافات: ۹٦.

(۲)من البقرة: ۱۳٤و ۱٤۱.

(۳)من سورة الأنبياء: ٦۹.

(۱)معرفتِ مرتبہ، بندوں کے مراتب اللہ کے یہاں لکھے ہوئے ہیں، فرشتے ان مراتب کو دیکھ کر بندوں کے لئے حسب مرتبہ دعا کرتے ہیں۔

(۲)تقدیر پر ایمان لانے سے آدمی میں تکالیف برداشت کرنے کا مادہ پیدا ہوتا ہے، اگر کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ یہ مصیبت میرے مقدر میں تھی یہ تو آنی ہی تھی، بخلاف کافر کے کہ وہ مصیبت پر پوری زندگی پچھتاتا رہتا ہے، مثلاً کسی کا بیٹا سفر میں گیا اور حادثہ میں اس کا انتقال ہوگیا تو یہ سوچ سوچ کر اپنے غم کو تازہ کرتا رہتا ہے کہ اگر میرا بیٹا سفر میں نہ جاتا تو نہ مرتا، بخلاف مومن کے کہ وہ اس وقت صبر کرتا ہے۔

(۳)اس سے شکر کی توفیق ملتی ہے جب کوئی نعمت ملتی ہے تو مومن سوچتا ہے کہ یہ نعمت میرے مقدر میں اللہ کے یہاں لکھی ہوئی تھی، اللہ نے اپنے فضل سے یہ نعمت مجھے عطا فرمائی، اس لئے بندہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

(۴)اس سے آدمی میں شجاعت پیدا ہوتی ہے کہ موت وحیات سب مقدر ہے تو پھر ڈرنا نہیں چاہئے اور بزدلی نہیں دکھانی چاہئے، بخلاف کافر کے کہ وہ بزدل ہوتا ہے، معرکہ میں ٹھہرنا اس کو مشکل ہوتا ہے کہ کہیں موت نہ آجائے۔

تقدیر کی قسمیں:

تقدیر کی دو قسمیں ہیں: تقدیر معلق اور تقدیر مبرم، مبرم: وہ تقدیر جو قطعی ہو، جس میں تغیر وتبدل کا احتمال نہ ہو، اور تقدیر معلق یہ ہے کہ کسی چیز کو کسی فعل پر معلق کر کے لکھا گیا ہو کہ بندہ فلاں طاعت کریگا تو یہ مصیبت نہیں آئے گی، مشہور حدیث ''لایرد القدر الا الدعاء'' میں قدر سے یہی تقدیر معلق مراد ہے۔

اللہ کے علم ازلی میں ہر چیز مبرم ہے البتہ لوح محفوظ میں بعض چیزوں کو معلق کر کے لکھا جاتا ہے۔

کتابت تقدیر کے مراحل واوقات:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ تقدیر کے ادوار وزمانے مختلف ہیں جو یہ ہیں:

(۱)ازل میں جب اللہ کے سوی کچھ نہ تھا حق تعالیٰ شانہ نے اس وقت کائناتِ عالم کا خاکہ تیار کیا۔

(۲) آسمان وزمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل لوح محفوظ میں تقدیر لکھی گئی، یہ علم ازلی کی نقل واندراج ہے۔

(۳) تخلیق آدم کے وقت ان کی پشت سے ان کی تمام نسل کو نکالا گیا اور کچھ کو جنتی اور کچھ کو جہنمی قرار دیا گیا۔

(۴) استقرار حمل کے وقت بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ انسان آئندہ کیا کیا کام کرے گا، اس کی عمر کتنی ہوگی اور اس کا رزق کتنا ہوگا؟

(۵) دنیا میں کوئی حادثہ یا واقعہ پیش آنے سے پہلے بھی تقدیر کو لکھا جاتا ہے۔(۱)

الفصل الاول

۷۳ / ۱: عن عبدِاللّٰہ بن عمروؓ قالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم "كَتَبَ اللّٰهُ مَقَادِيْرَ الخَلائِقِ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضَ بِخَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ" قَالَ: وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى المَاءِ. (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ شانہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے اور فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ شانہ کا عرش پانی پر تھا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

تقدیر لکھے جانے کا وقت:

اس حدیث میں تقدیر کے لکھے جانے کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوقات کی تقدیر لکھ دی تھی، پس یہ تقدیر کے مذکورہ بالا مراحل میں سے دوسرے درجہ کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کی تردید بھی ہوجاتی ہے جو تقدیر کے منکر ہیں۔

تقدیر لکھنے کی کیفیت:

كتب الله: اللہ کے لکھنے کی کیا کیفیت ہوئی اس میں علماء کے متعدد اقوال ہیں:

---

(۱) رحمة الله الواسعة ۱/ ٦٦٨.

(۲) أخرجه مسلم كتاب القدر، باب حجاج آدم وموسى عليه السلام ۲/ ۳۳٥.

(۱) بعض نے کہا کہ اس سے مراد فرشتوں کو لکھنے کا حکم دینا ہے پس آمر ہونے کے اعتبار سے اللہ کی طرف نسبت کی گئی ہے، جیسے "بنی الأمیر المدینة" میں امیر کی طرف بناء کی نسبت اسی معنی لحاظ سے ہے۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ اللہ نے قلم اور لوح محفوظ میں ایسا تعلق پیدا فرمادیا کہ خود بخود کتابت ہوگئی۔ (۲)

(۳) بعض نے کہا کہ اللہ نے قلم کو حکم دیا کہ لکھ، قلم نے کہا کہ: کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ لکھ، چنانچہ قلم نے سب کچھ لکھ دیا۔ (۳)

(۴) بعض نے کہا ہے کہ اس سے لکھنا مراد نہیں بلکہ تعیین اور طے کرنا مراد ہے۔(۴)

مقادیر الخلائق: "مقادیر" مقدار کی جمع ہے اور مقدار تقدیر کے معنی میں ہے۔(۵)

بخمسین ألف سنة: اس پر یہ اشکال ہے کہ جب اس وقت آسمان وزمین اور چاند وسورج نہیں تھے، جن سے وقت کا اندازہ ہوتا ہے، پھر پچاس ہزار سال کا اندازہ کیونکر لگایا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ تحدید کے لئے نہیں، بلکہ محض تکثیر کے لئے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ آسمان وزمین کی پیدائش سے بہت قبل ایسا ہوا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ وقت کی تعیین کے لئے سورج وچاند اور دن ورات کی حاجت انسانوں کو ہے، اللہ تعالیٰ کو ان کی حاجت نہیں۔

وکان عرشه علی الماء: یہ جملہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے اصلاً یہ متشابہات میں سے ہے اس کے معنی میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ یہ جملہ مجاز ہے اللہ کی قدرت کاملہ اور سلطنت تامہ سے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے آسمان وزمین کی پیدائش سے قبل تقدیر لکھی اس طرح کہ اس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ (۶)

(۲) بعض نے کہا کہ پانی سے مراد سمندر کا پانی ہے اور عرش حقیقۃ سمندر کے پانی پر تھا۔(۷)

---

(۱) لمعات التنقیح ۱ / ۳٤۱.

(۲) مرقاة المفاتیح ۱ / ۲٤۰ وشرح المشکاة للطیبی ۲ / ۵۲۹.

(۳) مرعاة المفاتیح ۱ / ۳۸۳.

(٤) لمعات التنقیح ۱ / ۳٤۱.

(٥) فتح الاله ۱ / ٤۲۳.

(٦) لمعات التنقیح ۱ / ۳٤۳.

(۷) لمعات التنقیح ۱ / ۳٤۳.

(۳) بعض نے کہا کہ اللہ نے ایک خاص قسم کا پانی پیدا فرمایا تھا اس پر عرش تھا۔ (۱)
(۴) بعض نے کہا کہ عرش فرشتے کے کاندھے پر تھا اور فرشتہ پانی پر کھڑا تھا۔ (۲)
(۵) بعض نے کہا کہ عرش اوپر ہی تھا لیکن پانی وعرش کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی اس لئے کہدیا کہ عرش پانی پر تھا۔ (۳)

الحاصل مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اس وقت ان کے سواء کچھ اور موجود نہ تھا۔

۷۴ / ۲: وَعَنِ ابنِ عُمرؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "كُلُّ شَئٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزُ وَالْكَيْسُ" (رواہ مسلم) (۴)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر چیز تقدیر سے ہوتی ہے یہاں تک کہ ناکارہ ہونا اور ہوشیار ہونا بھی۔ (مسلم)

تشریح حدیث

عجز وکیس بھی مقدر ہیں:

اس حدیث میں صراحۃً تقدیر کا بیان ہے کہ ہر شے تقدیر کے تحت ہے یہاں تک کہ عجز اور کیس بھی، یعنی جملہ احوال وکیفیات اللہ کے یہاں مقدر اور طے شدہ ہیں۔

حتیالعجزو الکیس: "عجز" اور "کیس" رفع اور جر دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے[۵] یہ دونوں افعالِ عباد کا منشاء ہیں عجز کی بنیاد پر بندوں سے بے کار اعمال صادر ہوتے ہیں اور کیس بمعنی ہوشیاری اس سے اچھے اعمال صادر ہوتے ہیں، یہ بتانا مقصود ہے کہ جب بندوں کے افعال کا منشا بھی مقدر ہے تو خود افعال تو بدرجۂ اولی مقدر ہوں گے۔

بعض علماء نے فرمایا کہ: عجز وکیس میں ضدین کی نسبت نہیں، بلکہ عجز کی ضد قوت وقدرت ہے اور

(۱) فتح الباری ۱۳ / ۴۸۸.
(۲) فتح الباری ۱۳ / ۴۸۸.
(۳) شرح المشکاۃ للطیبی ۱۱ / ۳۶۰۰ (۵۶۹۸)
(۴) أخرجه مسلم كتاب القدر، باب كل شئ بقدر ۲ / ۲۳۶.
(۵) فتح الإله ۱ / ۴۲۶، المرقاة ۱ / ۲۴۱، المرعاة ۱ / ۳۸۴.

کیس کی ضد بلادۃ وحمق ہے، یہاں یہ دونوں بھی مطلوب ہیں اوران کی ضد یعنی قدرت وحمق بھی مطلوب ہیں، یعنی بندہ کے ہرقسم کے اوصاف واعمال قضاوقدر کے ماتحت ہیں۔

قدریہ اورمعتزلہ کی تردید:

پس اس حدیث سے قدریہ اورمعتزلہ ہردو کی تردید ہوجاتی ہے، قدریہ کی اس معنی کرکہ وہ تقدیر کے منکر ہیں جبکہ اس حدیث میں تمام چیزیں تقدیر کے تحت بتائی گئی ہیں اورمعتزلہ کی اس معنی کرکہ وہ شراور برائی کا خالق انسان کوقرار دیتے ہیں جبکہ اس حدیث میں ''عجز'' جو ازقبیل شر ہے اس کوبھی تقدیر الٰہی کے تحت بتایا گیا ہے۔(۱)

۷۵ / ۳: وَعن أبی هریرةؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم : اِحْتَجَّ آدَمُ وَمُوسىٰ عِنْدَ رَبِّهِمَا، فَحَجَّ آدَمُ مُوسَىٰ؛ قَالَ مُوسىٰ: أَنْتَ آدَمُ الَّذِي خَلَقَکَ اللّٰهُ بِيَدِهٖ وَنَفَخَ فِيکَ مِنْ رُوْحِهٖ، وَأَسْجَدَ لَکَ مَلا ئِکَتَهٗ، وَأَسْکَنَکَ فِیْ جَنَّتِهٖ، ثُمَّ أَهْبَطْتَ النَّاسَ بِخَطِيْئَتِکَ إِلٰى الْأَرْضِ؟ قَالَ آدَمُ: أَنْتَ مُوسٰى الَّذِیْ إِصْطَفَاکَ اللّٰهُ بِرِسَالَتِهٖ وَبِکَلامِهٖ، وَأَعْطَاکَ الْأَلْوَاحَ فِيهَا تِبْيَانُ کُلِّ شَيْئٍ، وَقَرَّبَکَ نَجِيًّا، فَبِکَمْ وَجَدْتَ اللّٰهَ کَتَبَ التَّوْرَاةَ قَبْلَ أَنْ أُخْلَقَ؟ قَالَ مُوسٰى: بِأَرْبَعِيْنَ عَاماً قَالَ آدَمُ: فَهَلْ وَجَدْتَ فِيْهَا ''وَعَصىٰ آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: اَفَتَلُوْمُنِیْ عَلیٰ أَنْ عَمِلْتُ عَمَلاً کَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ أَنْ اَعْمَلَهٗ، قَبْلَ اَنْ يَخْلُقَنِیْ بِأَرْبَعِيْنَ سَنَةً؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''فَحَجَّ آدَمُ مُوْسىٰ'' (رواہ مسلم)(۲)

ترجمہ : حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت آدم اورحضرت موسیٰ علیہما السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے مناظرہ کیا، اورحضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پرغالب آگئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ وہی آدم ہیں جن کوخدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، آپ میں اپنی روح پھونکی تھی، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اوراپنی جنت میں آپ کورکھا تھا، پھرآپ نے اپنی غلطی کی وجہ سے لوگوں کوزمین پر

(۱)التعليق الصبيح ۱ / ۷۶.

(۲)أخرجه مسلم كتاب القدر، باب حجاج آدم وموسى عليهما السلام ۲ / ۳۳۵.

اتروادیا، آدم علیہ السلام نے کہا تم وہی موسیٰ ہو جن کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسالت اور ہم کلامی کے لئے منتخب فرمایا تھا اور آپ کو وہ تختیاں دی تھیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا اور آپ کو سرگوشی کے لئے مقرب بنایا تھا، آپ کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ عزوجل نے میری پیدائش سے کتنے عرصہ پہلے تورات کو لکھ دیا تھا؟ موسی علیہ السلام نے فرمایا ''چالیس سال پہلے'' آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم نے تورات میں (یہ لکھا ہوا) نہیں پایا ''وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی'' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں، حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم مجھ کو میرے اس عمل پر ملامت کرتے ہو جس کو اللہ نے میری پیدائش سے چالیس سال پہلے میرے لئے (تقدیر میں) لکھ دیا تھا، حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اس دلیل سے آدم علیہ السلام موسی علیہ السلام پر غالب آگئے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث میں تقدیر کا بیان ہے، حضرت آدم علیہ السلام وموسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ ہوا، آدم علیہ السلام احتجاج بالتقدیر کی وجہ سے غالب آگئے، پس تقدیر برحق ہے۔

حضرت آدم وموسی علیہما السلام کے مابین مناظرہ:

احتج آدم وموسی عند ربهما : حضرت آدم وموسی علی نبینا وعلیہما الصلوۃ والسلام کے درمیان محاجہ یعنی مناظرہ ومکالمہ ہوا جس کی ابتدا موسی علیہ السلام کی طرف سے ہوئی، موسی علیہ السلام نے آدم علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ وہی آدم ہیں جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور اپنی روح پھونکی اور اللہ نے آپ کو مسجود ملائکہ بنایا اور آپ کو جنت میں ٹھیرایا، آپ نے سب لوگوں کو اپنی خطا کی وجہ سے جنت سے

ملحوظة: قد عزا التبريزى هذا الحديث إلى مسلم فقط وقد أخرجه البخاري أيضاً في خمسة مواضع(١) كتاب الانبياء، باب وفاة موسى عليه السلام وذكره بعد ١ /٤٦٣، برقم ٣٢٩٦،(٢) وكتاب التفسير، باب قوله تعالى: فلايخرجنكما من الجنة فتشقى ٢ /٦٩٣، برقم ٤٥٥٢، (٣)وفيه أيضاً،باب قوله تعالى واصطنعتك لنفسى ٢ /٦٩٢، برقم ٤٥٥٠، (٤) كتاب القدر، باب تحاج آدم وموسى عندالله تعالىٰ ٢ /٩٧٩ برقم ٦٣٦١، (٥) كتاب التوحيد ،باب قوله الله تعالى وكلم الله موسى تكليما ٢ /١١١٩ برقم ٧٢١٤، وأبوداود أيضاً، كتاب السنة، باب فى القدر ٢ /٦٤٦، والترمذى كتاب القدر، باب (بلاترجمه) ٢ /٣٤وابن ماجه فى المقدمه، باب فى القدر ١ /٩.

نکالا اور زمین پر اتار دیا، آپ نے ہمیں خسارہ ونقصان میں واقع کیا، آپ سے اکل شجرہ کا قصور نہ ہوتا تو ہم خسارہ ونقصان میں مبتلا نہ ہوتے، آدم علیہ السلام نے موسیٰ کی نعمتوں کو شمار کرایا کہ آپ وہی موسی ہیں جن کو اللہ نے اپنی نبوت ورسالت کے لئے منتخب فرمایا اور اپنی ہم کلامی سے نوازا، اللہ نے آپ کو توریت کی تختیاں دیں جس میں ہر چیز کی وضاحت تھی، آپ یہ بتایئے کہ میری تخلیق سے کتنے روز قبل توریت کو لکھا گیا، موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ: چالیس سال پہلے، آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ: توریت میں یہ مضمون تھا''وعصى آدم ربه فغوى''؟ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ہاں توریت میں یہ مضمون تھا، آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ: تم مجھے ایسے عمل پر ملامت کررہے ہو جو میری پیدائش سے پہلے ہی میرے حق میں لکھا جاچکا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دلیل سے آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے، اور حضرت موسی علیہ السلام نے مزید کچھ نہ کہا۔

مقام ووقت مناظرہ:

یہ مناظرہ کہاں اور کب ہوا؟ اس میں شراح کے مختلف اقوال ہیں:

(۱) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی حیات میں اللہ سے دعا کی تھی کہ میں آدم علیہ السلام سے ملنا چاہتا ہوں اللہ نے آدم علیہ السلام کو زندہ کیا، اس وقت یہ محاجہ ہوا۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ عالم ارواح میں ہوا۔(۲)

(۳) بعض نے کہا یہ مناظرہ دونوں کا عالم برزخ میں ہوا، برزخ موت کے بعد سے نفخ صور تک کا وقت کہلاتا ہے۔(۳)

(۴) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ خواب میں ہوا، اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی اور حجت ہوتا ہے۔(۴)

---

(۱) لمعات التنقیح ۱ / ۳۴۵.

(۲) نفس المصدر.

(۳) مرعاة المفاتیح ۱ / ۳۸۵.

(۴) نفس المصدر.

(۵) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ قیامت میں ہوگا۔ (۱)

(۶) بعض نے کہا کہ یہ مناظرہ ومکالمہ روحانی ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روح جب آسمان پرگئی اورحضرت آدم علیہ السلام کی روح سے ملاقات ہوئی اس وقت یہ مکالمہ ہوا، علامہ ابن عبدالبر اور علامہ قابسی کی یہی رائے ہے۔(۲)

خلق الله بيده :''بیدہ'' متشابہات میں سے ہے جس پر بلا کیف ایمان لانا چاہئے یا پھراس سے اللہ کی قدرت مراد ہے۔

ونفخ فيک من روحه:''روح'' کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف شرافت کے لئے ہے، جیسے بیت اللہ۔

واسجدلک ملائکته:یہ سجدہ سجدۂ تعظیمی تھا، جوپچھلی امتوں میں جائز رہاہے،سجدۂ عبادت نہ تھا۔

مسئلہ عصمت انبیاء:

وعصى آدم ربه فغوى:اس روایت میں آدم علیہ السلام کی طرف عصیان کی نسبت کی گئی ہے حالانکہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں، مناسب معلوم ہوتاہے کہ: عصمت انبیاء کی کچھ تفصیل یہاں آجائے، امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس مسئلہ پر مفصل اورمنقح بحث فرمائی ہے وہ لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا تعلق چار چیزوں سے ہوتاہے:

(۱) عقائد، اس میں حضرات انبیاء سے خطاءنہیں ہوسکتی۔

(۲) تبلیغ احکام، اس میں بھی ان حضرات سے سرمو خطانہیں ہوتی وہ حضرات تبلیغ کا حق ادافرماتے ہیں۔

(۳) فتاوی واجتہاد، اس میں لغزش ہوسکتی ہے، لیکن گناہ اس پربھی نہیں ہوتا، بلکہ امتی سے بھی اجتہادی خطا معاف ہوتی ہے اوراس پرمواخذہ نہیں ہوتا، البتہ انبیاء اورامتی کے اجتہاد میں فرق یہ ہے کہ نبی سے اگرخطاء اجتہادی ہوجائے تو من جانب اللہ ان کومتنبہ کردیاجاتاہے، امتی سے اگرخطا ہوتو اس کومتنبہ نہیں کیاجاتا جیسے اسارائے بدرکاواقعہ کہ اس میں لغزش ہوئی، جس پرمتنبہ کیاگیا:''مَاكَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ أَسْرٰى...... الخ''(۳)

---

(۱) فتح الباری ۱۱ / ۵۶۱.

(۲) مرعاة المفاتيح ۱ / ۳۸۵.

(۳) من سورة الأنفال: ۶۷.

(۴) آداب واخلاق حضرات انبیاء علیہم السلام سے اس میں عمداً لغزش نہیں ہوتی سہواً ہوسکتی ہے مگراس کومعصیت نہیں کہا جاتا بلکہ اس کو لغزش وزلت قدم کہا جاتا ہے۔ (۱)

آدم علیہ السلام سے جو خطاء ہوئی وہ اجتہادی تھی حق تعالیٰ شانہ نے ایک درخت کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ''لاتَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ'' (۲) اس نہی میں اشارہ حسی درخت کے ایک فرد کی طرف تھا، اس سے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اس مخصوص درخت سے اکل کی ممانعت کی گئی ہے، اس کی جنس کے دوسرے درختوں سے ممانعت نہیں کی گئی، اس لئے انہوں نے اس جنس کے دوسرے فرد سے کھالیا حالانکہ مقصود باری تعالیٰ تمام جنس کی ممانعت کرنا تھا، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اشارہ ایک فرد کی طرف ہوتا ہے اور مراد مکمل جنس ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ میں سونا لیا اور ایک ہاتھ میں ریشم اور فرمایا ''إن هذين حرام على ذكور أمتي (۳)'' اس میں اشارہ فرد کی طرف تھا لیکن مراد پوری جنس تھی، اسی طرح آدم علیہ السلام نے یہاں یہ سمجھا کہ ممانعت صرف فرد کے متعلق ہے حالانکہ مکمل جنس کی ممانعت تھی اس لئے یہ اجتہادی خطا ہوئی۔

بعض نے کہا کہ ''لاتقربا'' میں نہی تحریمی نہیں تھی، بلکہ تنزیہی تھی، لیکن اس کے باوجود ''عصی'' کا لفظ استعمال کیا گیا، یہ **حسنات الابرار سیئات المقربین** کے قبیل سے ہے۔

گناہ کرکے تقدیر کا سہارا لینا:

فحج ادم موسیٰ: اس مکالمہ میں حضرت آدم علیہ السلام نے احتجاج بالتقدیر کیا جس کی وجہ سے آپ حضرت موسیٰ پر غالب آگئے، اس پر سوال ہوتا ہے کہ معصیت کے لئے احتجاج بالتقدیر جائز نہیں ہے ورنہ عاصی اور گنہ گار لوگ تقدیر کا سہارا لے کر کہیں گے کہ ہمیں نہ ٹوکو اور ملامت مت کرو، کیونکہ یہ گناہ ہماری تقدیر کا حصہ بن چکا تھا، ظاہر ہے کہ یہ اعتذار درست نہیں ہے، پھر حضرت آدم نے احتجاج بالتقدیر کیوں کیا؟ اس سوال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اعتراض اس وقت کیا تھا جب کہ آدم اپنی خطا ولغزش سے توبہ

(۱) التفسير الكبير للامام الرازى ۳/ ۴۵۵.

(۲) من سورة البقرة: ۳۵.

(۳) سنن أبي داود (۴۰۵۷)، والنسائي (۵۱۴۴) وابن ماجه (۳۵۹۵)

کر چکے تھے اور توبہ کے بعد خطا پر ملامت صحیح نہیں ہے، لہٰذا ان کا احتجاج بالتقدیر درست تھا، اسی لئے وہ غالب شمار ہوئے۔(۱)

(۲) ان کا یہ مکالمہ ارتفاع تکلیف کے بعد ہوا یعنی وصال کے بعد عالم بالا میں، وہاں تقدیر کو عذر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔(۲)

(۳) احتجاج بالتقدیر کی دوصورتیں ہیں: (الف) اجتراء علی المعاصی کے لئے (گناہوں پر جری ہونے کے لئے) (ب) اپنے قلب کو تسلی دینے کے لئے کہ مومن سے جب خطا صادر ہوتی ہے تو قلب کو بہت زیادہ اضطراب اور غم لاحق ہوتا ہے، اس اضطراب کو رفع کرنے کے لئے اور غم کو ہلکا کرنے کے لئے احتجاج بالتقدیر درست ہے، آدم علیہ السلام کا احتجاج اسی قبیل سے تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں۔(۳)

۷۶ / ٤: وعن ابنِ مسعودٍؓ قَالَ: حدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ: إِنَّ خَلْقَ اَحَدِكُمْ يُجْمَعُ فِيْ بَطْنِ أُمِّهٖ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذلكَ، ثُمَّ يَبْعَثُ اللّٰهُ إِلَيْهِ مَلَكاً بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: فَيَكْتُبُ عَمَلَهُ، وَأَجَلَهُ وَرِزْقَهُ، وَشَقِيٌّ أَوْسَعِيْدٌ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ الرُّوْحُ، فَوَالَّذِيْ لاإِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَايَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلاَّ ذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَايَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا، إِلَّاذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا. (متفق علیہ)(۴)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: صادق ومصدوق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کی تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ (پہلے) اس کا مادۂ خلق (نطفہ) ماں کے پیٹ (رحم) میں چالیس دن تک جمع رہتا ہے پھر اتنے ہی

(۱) شرح النووی علی مسلم ۲ / ۳۳۵.

(۲) شرح النووي علی مسلم۲ / ۳۳۵.

(۳) مرقاة المفاتيح ۱ / ۲٤۳.

(٤) أخرجه البخاري في أربعة مواضع، كتاب بدء الخلق، باب ذكر الملائكة ۱ / ٤٥٦ برقم ۱۳۰٤، و"كتاب الأنبياء باب خلق آدم وذريته وقول الله تعالىٰ واذقال ربک للملائكة إني جاعل في الأرض خليفة ۱ / ٤٦۹، برقم ۳۲۲۲، وكتاب القدر، باب في القدر ۲ / ۹۷٥ برقم ٦۳٤۲، وكتاب التوحيد، باب قوله تعالىٰ "ولقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين ۲ / ۱۱۱۰ برقم ۷۱٥٤"ومسلم "كتاب القدر"باب كيفية خلق الأدمي في بطن أمه الخ ۲ / ۳۳۲.

دنوں یعنی چالیس دن میں جما ہوا خون ہوجاتا ہے پھر اتنے ہی دنوں یعنی چالیس دن میں وہ گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، پھر (چوتھے اربعین میں) اللہ سبحانہ وتعالی ایک فرشتہ بھیجتے ہیں وہ فرشتہ چار باتیں اس کے بارے میں لکھتا ہے: اس کا عمل، اس کی موت کا وقت، اس کے رزق (کی مقدار) اور اس کا بد بخت اور نیک بخت ہونا، پھر اسی اربعین میں نفخ روح ہوتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تم میں سے بعض آدمی جنتیوں کے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا غالب آتا ہے اور پھر وہ دوزخیوں والے کام کرنے لگتا ہے اور (ان اعمال بد کے سبب) دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے اور تم میں کا بعض آدمی دوزخیوں والے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ہاتھ ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ تقدیر کا لکھا ہوا غالب آتا ہے اور وہ جنتیوں والے اعمال کرنے لگتا ہے (اور ان اعمال حسنہ کے سبب) جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث پاک میں غلبۂ تقدیر کا بیان ہے کہ سعید وشقی ہونا مقدر ہے اور تقدیر کا لکھا ہوا غالب آتا ہے، پس اس حدیث سے بھی قدریہ اور معتزلہ ہردو کی تردید ہوجاتی ہے اور یہ مراحل تقدیر میں سے جو ابتداء بحث میں ذکر کئے گئے تھے چوتھے مرحلہ کا بیان ہے۔

انسان کی تخلیق کے مراحل:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں تخلیق انسان کے مراحل بیان فرمائے کہ اس کی ماں کے رحم میں باپ کے نطفے کو چالیس دن تک نطفہ کی صورت میں جمع رکھا جاتا ہے اس کے بعد اربعین ثانی میں علقہ یعنی خون بستہ ہوجاتا ہے۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ اربعین اول میں نطفہ نطفہ ہی رہا کیا اس میں تغیر نہیں آیا؟ جواب یہ ہے کہ نطفہ پہلے چالیس دن تک نطفہ ہی رہا تا کہ اس کے اندر خمیر پیدا ہو یعنی آئندہ پیش آنے والے انقلابات وتغیرات کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔

پھر تیسرے چلہ میں گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے، ملا علی قاری فرماتے ہیں کہ اسی تیسرے چلہ میں اعضاء اور شکل وصورت بنتے ہیں، پھر چوتھے اربعین میں اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتے ہیں جو چار باتیں لکھتا ہے اس کا عمل، اس کی عمر، اس کا رزق اور شقی ہونا یا سعید ہونا، اور اسی میں پھر نفخ روح ہوتا ہے، علماء نے لکھا ہے کہ چوتھے چلہ میں دس دن گذرنے پر جب بچہ چار ماہ دس دن کا ہو جاتا ہے اس وقت نفخ روح ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفات: صادق ومصدوق:

هو الصادق المصدوق: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صفتیں عبد اللہؓ بن مسعود نے ذکر کی ہیں مصدوق ہونا اور صادق ہونا، ''مصدوق'' ایسا شخص جس کو سچی باتیں بتائی جاتی ہوں اور پہنچائی جاتی ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آسمان سے سچی باتیں آتی تھیں، ''صادق'' سچ بولنے والا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے احکام بتائے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، بعض نے کہا کہ مصدوق مُصدَّق کے معنی ہے یعنی جس کی تصدیق کی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتوں کی تصدیق کی گئی ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ نے یہ دو صفات بطور فخر کے یا بطور استلذاذ کے ذکر فرمائی ہیں۔(۱)

یجمع فی بطن أمه: راوی حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے اس روایت کی تفسیر میں منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ نطفہ جب رحم میں پہنچتا ہے تو اللہ کو اگر تخلیق بشر منظور ہوتی ہے تو مادہ منویہ عورت کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتا ہے، ایک چلہ اسی حال میں گذرتا ہے پھر وہ مادہ عروق اور رگوں سے رحم میں اتر جاتا ہے اور رحم کی حرارت سے اس میں تغیر ہونے لگتا ہے حتی کہ دوسرے چلہ میں دم بستہ بن جاتا ہے۔(۲)

متعدد مراحل میں تخلیق کی وجہ:

أربعین یوما......الخ: بچہ کی پیدائش تدریجاً ہوتی ہے حالانکہ حق تعالیٰ شانہ دفعۃً پیدا فرمانے پر بھی قادر ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تاکہ انسان اپنی حالت پر غور کرے کہ کن مراحل سے گذر کر وہ خوبصورت ذی شعور انسان بنا، اپنی پچھلی حالت ذہن میں ہوگی تو بڑائی اور تکبر میں مبتلا نہ ہوگا، یہ تدریج تخلیق کی ایک بڑی وجہ ماں کے حال پر ترحم بھی ہے کہ بچہ جب آہستہ آہستہ بڑھے گا تو ماں کی قوت برداشت بھی آہستہ آہستہ بڑھے گی پھر ماں کو بچہ کا سنبھالنا آسان ہو جائے گا۔

---

(۱) فتح الإله ۱/۴۳۱.

(۲) شرح المشکاة للطیبي ۱/۲۳۷.

تقدیر سے متعلقہ چار باتوں کی کتابت اوراس کی نوعیت:

ثم یبعث الله إلیه ملكاً: پھراس کی تقدیر سے متعلقہ ان چار باتوں کو لکھنے کے لئے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے اللہ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، اور بعض علماء نے فرمایا کہ یہ چار باتیں مؤکل بالرحم (محافظِ حمل) فرشتہ ہی لکھتا ہے اور بھیجنے سے مراد امر یعنی اس کو حکم دینا ہے۔

یہ چار باتیں کہاں لکھی جاتی ہیں؟ اس میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام مجاہد نے فرمایا فرشتہ ایک کاغذ میں لکھتا ہے اور ایک تعویذ سا بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے جو لوگوں کو نظر نہیں آتا، جیسا کہ ارشاد ہے: ''وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِيْ عُنُقِهٖ ''(۱) اور ہر شخص کے عمل کا انجام ہم نے اس کے گلے سے چمٹا دیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر چاروں باتیں لکھی جاتی ہیں۔

(۳) ہتھیلی میں ان باتوں کو لکھا جاتا ہے۔

سوال وجواب:

ثم ینفخ فیه الروح: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تقدیر لکھی جاتی ہے پھر نفخ روح ہوتا ہے جبکہ بیہقی کی ایک روایت سے اس کا عکس ثابت ہوتا ہے؟(۲)

جواب: یہ حدیث راجح ہے، کیونکہ یہ روایت شیخین کی ہے۔

سوال: جب ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے تو اب چار باتوں کو لکھے جانے کے کیا معنیٰ؟

جواب: کتابت تقدیر کے مختلف مراحل ہیں: (۱) کتابت سابقہ (۲) کتابت متوسطہ (۳) کتابت لاحقہ، اول سے مراد لوح محفوظ کی کتابت اور ثانی سے مراد ہر شخص کے مقدرات کو ممتاز کرنے کے لئے نفخ روح سے قبل کی کتابت ہے اور کتابت لاحقہ سے مراد سال بھر کے مقدرات کو لیلۃ القدر میں بھی لکھا جانا ہے اس روایت میں کتابت متوسطہ کا ذکر ہے،(۳) ابتداء بحث میں بھی یہ بات آچکی ہے۔

(۱) من سورة إسراء: ۱۳.

(۲) المرقاة شرح المشكاة ۱/ ۲٤۸.

(۳) المرقاة ۱/ ۲٤۷.

سوال: اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰دن کے بعد تقدیر لکھی جاتی ہے اور بعض روایات میں ۴۲ دن کے بعد تقدیر کا لکھا جانا وارد ہے، ملاعلی قاری نے بحوالہ صحیح مسلم اس روایت کو ذکر کیا ہے،(۱) اس کے دو جواب ہیں:

(۱) ابن مسعودؓ کی روایت راجح ہے اس لئے کہ یہ متفق علیہ ہے۔

(۲) اختلاف جنین پر محمول ہے، کہ بعض بچوں کی تقدیر ۴۲ دن کے بعد لکھی جاتی ہے اور بعض کی ۱۲۰دن کے بعد۔

تقدیر غالب آ کر رہتی ہے:

حتی مایکون بینه وبینها الاذراع: مطلب یہ ہے کہ بندہ کا عمومی حال تو یہ ہے کہ سعید ہے تو اس کی زندگی نیکی والی گذرتی ہے نیکی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے اور شقی ہے تو شقاوت والے اعمال پر رہتا ہے انہیں پر مرتا ہے، البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی بھر ایمان واعمال صالحہ پر رہا حتی کہ ظاہری اعمال کے لحاظ سے جنت کے نہایت قریب ہوجاتا ہے لیکن تقدیر میں اس کا شقی ہونا لکھا ہے، پس اس کی تقدیر اس پر غالب آتی ہے اور اخیر میں کفر ومعاصی میں مبتلا ہوجاتا ہے اور کفر ومعاصی پر ہی مرتا ہے اور جہنم میں داخل ہوتا ہے، کبھی اسکا عکس ہوتا ہے کہ زندگی بھر اہل جہنم کے اعمال (کفر ومعاصی) پر رہا مگر اس کا جنتی ہونا مقدر ہوتا ہے، بالآخر اس کی تقدیر اس پر غالب آتی ہے، جب اس کی زندگی ہاتھ بھر رہ جاتی ہے تو جنتیوں کے اعمال (ایمان واعمال صالحہ) میں لگ جاتا ہے اسی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے حالات خواہ کتنے ہی اچھے ہوں عجب میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے،(۲) اسی لئے حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ: میں اپنے آپ کو ہر مسلمان سے بدتر سمجھتا ہوں حالاً اور کافر سے بدتر سمجھتا ہوں مالاً، کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال معلوم نہیں، ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے سنایا تھا کہ گنگوہ میں ایک بنیا تھا، مسجد کے پڑوس میں اس کا مکان تھا، وہ مسجد کے چراغ کے لئے ہر جمعرات کو

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۴۷.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۲۴۹.

تیل دیا کرتا تھا، ایک مرتبہ جمعہ کے روز مسجد میں آیا اورلوگوں سے کہا کہ مسلمان ہونا چاہتا ہوں مجھے کلمہ پڑھاؤ، اس کوکلمہ پڑھایا گیا، اس کے بعد اس نے پنجوقتہ نمازیں پابندی کے ساتھ پڑھنی شروع کیں، آئندہ ہفتہ جب جمعہ کا دن آیا اس نے جمعہ کی نماز پڑھی اوراس کا انتقال ہوگیا، اس واقعہ سے اس حدیث کا مطلب خوب واضح ہوجاتا ہے۔

قوله: ليعمل بعمل أهل النار: معلوم ہوا کہ جہنم کا داخلہ صرف تقدیر کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ سبب کے درجہ میں اس کا مدار اعمال پر بھی ہوتا ہے لہذا انسان کے جیسے اعمال ہوں گے ویسا اس کے حق میں فیصلہ ہوگا۔

۷۷/ ۵: وعَنْ سَهْلِ بنِ سَعْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ النَّارِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَيَعْمَلُ عَمَلَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَإِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ" (متفق عليه)(۱)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعدؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ بندہ جہنمیوں والے کام کرتارہتا ہے حالانکہ وہ جنتیوں میں سے ہوتا ہے اورجنتیوں والے کام کرتارہتا ہے حالانکہ وہ جہنمیوں میں سے ہوتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ اعمال کا اعتبارآخری حالت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال سہل بن سعد:

نام سہل بن سعد الساعدی الانصاری، کنیت ابوالعباس ہے، ان کا نام پہلے حزن تھا بمعنی مشکل چیز، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام سہل سے بدل دیا اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عمر میں برکت کی دعافرمائی تھی، چنانچہ ان کی عمر نوے سال سے زیادہ ہوئی، ۹۱ھ میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا، ایک قول کے مطابق مدینہ میں یہ آخری صحابی ہیں (۲)

(۱) أخرجه البخاري في أربعة مواضع ، كتاب الجهاد، باب لايقول فلان شهيد ۱/ ٤٠٦، برقم ۲۸۱۱، وأيضا "كتاب المغازى وباب غزوة خيبر ۲/ ٦٠٤ برقم ٤٠٤٩، و ۲/ ٦٠٥، برقم ٤٠٥٤، وأيضا "كتاب الرقاق، باب الأعمال بالخواتيم ومايخاف منها ۲/ ۹۷۷، برقم ٦٣٥٤ وكتاب الإيمان، باب بيان غلظ تحريم قتل الانسان الخ ۱/ ۷۲ ومسلم ، كتاب القدر، باب كيفيه خلق الآدمى فى بطن أمه الخ ۲/ ۳۳٤.

(۲) الإصابة ۳/ ۱٦٧.

اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے:

اس حدیث کا بھی مضمون حدیث سابق کی طرح ہے کہ اچھے اور برے اعمال میں انسان کی آخری حالت معتبر ہوتی ہے، خاتمہ کے وقت میں ایمان واعمال ہوں تو جنت کا ورنہ جہنم کا مستحق ہوتا ہے، خواتیم ''خاتمۃ'' کی جمع ہے، اس کا موصوف محذوف ہے: ای الحالة الخاتمة یعنی آخری حالت۔

فوائد حدیث:

اس روایت سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) فرقۂ قدریہ اور معتزلہ کا رد ہوا کیونکہ جب جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے تو اعمال بھی مخلوق ومقدر ہیں، اور بندہ تقدیر کے مطابق آخری وقت میں اچھے یا برے اعمال کی طرف لوٹتا ہے۔

(۲) اعمال صالحہ پر مواظبت کی ترغیب ثابت ہوئی، تاکہ یہ اعمال صالحہ آخری حالت تک برقرار رہیں۔

(۳) آدمی کو عجب وتکبر میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا بندہ کو علم نہیں ہے۔

(۴) اللہ کا اپنے بندوں پر کمال تصرف ثابت ہوا۔

(۵) کسی کو حتمی طور پر جنتی یا جہنمی کہنا درست نہیں ہے، کیونکہ آخری حالت کا علم نہیں ہے۔

۷۸ / ٦: وعن عائشةؓ قَالَتْ: دُعِيَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِلٰى جَنَازَةِ صَبِيٍّ مِنَ الأَنْصَارِ، فَقُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! طُوْبٰى لِهٰذَا عُصْفُوْرٌ مِنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ، لَمْ يَعْمَلِ السُّوْءَ، وَلَمْ يُدْرِكْهُ فَقَالَ: أَوَغَيْرُذٰلِكَ يَاعَائِشَةُ! إِنَّ اللهَ خَلَقَ لِلْجَنَّةِ أَهْلاً، خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ أَصْلاَبِ آبَائِهِمْ، وَخَلَقَ لِلنَّارِ أَهْلاً، خَلَقَهُمْ لَهَا وَهُمْ فِيْ أَصْلاَبِ آبَائِهِمْ. (رواه مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک انصاری بچہ کے جنازہ کے لئے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا میں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بچہ کے لئے خوشحالی ہے یہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے، جس نے کوئی برا کام نہیں کیا اور نہ برائی کے

(۱) أخرجه مسلم في كتاب القدر، باب معنى كل مولود يولد على الفطرة وحكم موتى أطفال الكفار وأطفال المسلمين ۲ / ۳۳۷.

زمانہ(بلوغ) کو پایا،آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ! کیااس کے سوا کچھ اورنہیں ہوسکتا؟ (یعنی اس کے جنتی ہونے کا جزم ویقین نہ کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے کچھ لوگوں کو پیدافرمایا جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے اورجہنم کے لئے بھی کچھ لوگوں کوپیدافرمایا جب کہ وہ اپنے باپوں کی پشت میں تھے۔(مسلم)

تشریح حدیث

احوال حضرت عائشہؓ:

آپ ام المؤمنین ہیں اورازواج مطہرات میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کے والد حضرت ابوبکرؓ اوران کی والدہ ام رومان بنت عامر بن عویمر ہیں،ہجرت سے سات سال قبل ولادت ہوئی،سات سال کی عمر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا،نوسال کی عمر میں رخصتی ہوئی،اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت صرف ۱۸سال کی عمرتھی،مگراس قلیل عرصہ میں بہت سے علوم حاصل کیئے حتی کہ علماءفرماتے ہیں کہ ثلث دین تنہاانہیں کے واسطے سے امت کوپہنچاہے، ان کا شمار فصحاءعرب میں ہوتاہے، آپ اشعارِعرب اورمحاورۂ عرب سے بھی واقف تھیں،اور۵۷ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال ہوا، ان کی مرویات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے۔(۱)

بچوں کی نجات کے بارے میں حضرت عائشہؓ کے ایک خیال کی اصلاح:

دعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی جنازة الخ: ایک انصاری بچہ کا انتقال ہواحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کونماز جنازہ پڑھانے کے لئے بلایا گیا،حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ بچہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے، بچہ کو چڑیاکے ساتھ تشبیہ دی یاتو گناہوں سے معصوم ہونے اورغیرمکلّف ہونے میں یاپھرجس طرح چڑیاہرجگہ گھومتی پھرتی ہے اسی طرح یہ بچہ جنت میں جانے کے بعد جنت میں جہاں چاہے گا گھومے گا،حضرت عائشہؓ نے پھراپنی بات کومدلل کیا کہ اس نے نہ برائی کی اورنہ برائی کا زمانہ پایا کہ بالغ ہونے سے پہلے ہی وفات پاگیا،پس یہ جنتی ہے۔

أوغیر ذلک: اس میں ہمزہ استفہامیہ ہےاورواؤ عاطفہ ہےاوردرمیان میں ایک فعل محذوف ہے

(۱)سیر أعلام النبلاء ۲/۱۳۸-۲۰۰، والإصابة ۷/۱۸۷-۱۹۰.

تقدیر عبارت اس طرح ہے:اتعتقدین ماقلت؟ والحق غیر ذلک ۔یعنی جو تم نے کہا کیا تمہیں اس پر جزم ہے حالانکہ حق کچھ اور ہے، وہ یہ کہ یقینی طور پر کسی شخص کو جنتی نہ کہا جائے کیونکہ اللہ نے لوگوں کے جنتی وجہنمی ہونے کا فیصلہ اس وقت کر دیا تھا جب کہ وہ اپنے آباء کی صلب میں تھے۔(۱)

ایک اشکال اوراس کے جوابات:

اس روایت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اطفال مسلمین کا جنتی ہونا یقینی نہیں ہے، حالانکہ ان کا جنتی ہونا علماء کے درمیان متفق علیہ ہے، امام نوویؒ نے نیز ابن حجر مکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم نہیں دیا گیا تھا کہ اطفال مسلمین جنتی ہیں یہ علم بعد میں حاصل ہوا۔

(۲) اطفالِ مسلمین کا جنتی ہونا اجمالی طور پر متفق علیہ ہے لیکن تعیین کے ساتھ اور یقینی طور پر کسی خاص شخص کے بارے میں بچہ ہو یا بڑا جنتی ہونے کا حکم لگانے سے آپ علیہ السلام نے منع فرمایا کہ یہ بات احتیاط کے خلاف ہے، نیز سامعین کو اس قائل شخص کے متعلق اس کے اس طرح حکم لگانے سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ گویا وہ اپنے آپ کو عالم الغیب سمجھ رہا ہے۔(۲)

(۳) بچہ کا جنت میں جانا والدین کے مؤمن ہونے پر موقوف ہے اور والدین کا حال معلوم نہیں کہ ان کا انجام کیا ہو، پس حتمی حکم لگانا درست نہیں۔

اس حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ہوا، کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کا جنتی یا جہنمی ہونا دنیا میں آنے سے قبل مقدر کر رکھا ہے۔(۳)

۷۹ / ۷: وَعَنْ عليٍّ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم "مَامِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الْجَنَّةِ" قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَفَلَانَتَّكِلُ عَلٰى كِتَابِنَا وَنَدَعُ الْعَمَلَ؟ قَالَ: "اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَاخُلِقَ لَهٗ؛ أَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ السَّعَادَةِ، وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الشَّقَاوَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ الشَّقَاوَةِ،

(۱)المرقاة ۱ / ۲۵۱.

(۲)المرقاة ۱ / ۲۵۱.

(۳)المرقاة ۱ / ۲۵۱.

ثُمَّ قَرَأَ "فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى" الآية، (متفق عليه)(۱)

ترجمه: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کا ٹھکانا اللہ تعالی نے جنت اور دوزخ میں لکھ دیا ہے، (یعنی یہ متعین ہو چکا کہ کون لوگ جنتی ہیں اور کون لوگ جہنمی ہیں) صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! کیا ہم اپنے نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کرلیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم عمل میں لگے رہو، اس لئے کہ جو شخص جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسے اس کے لئے آسان کر دیا جاتا ہے، جو شخص نیک بختوں میں سے ہوتا ہے اس کے لئے نیک بختی کے اعمال آسان کر دیئے جاتے ہیں اور جو شخص بدبختوں میں سے ہوتا ہے اس کے لئے بدبختی کا عمل آسان کر دیا جاتا ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ) پھر جس نے اللہ کے راستہ میں مال دیا اور تقوی اختیار کیا اور اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کے لئے آسان کر دیں گے ایسی خصلت جو راحت ویسر (دخول جنت) کا ذریعہ بنجائے"

تشریح حدیث

تعارف حضرت علیؓ:

حضرت علیؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہیں، ابوالحسن کنیت ہے، بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، ایمان لانے کے وقت ان کی عمر علی اختلاف الاقوال ۸ یا ۱۰ یا ۱۵ سال کی تھی، تمام غزوات میں شریک رہے سوائے غزوۂ تبوک کے، کہ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل وعیال کی حفاظت کے لئے ان کو مدینہ طیبہ میں چھوڑ دیا تھا، منافقین نے ان سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو

(۱) أخرجه البخاري في تسع مواضع، كتاب الجنائز، باب موعظة المحدث عندالقبر، ۱/۱۸۲، برقم ۱۳٤٦، وكتاب التفسير، باب قوله فأما من أعطى واتقى ۲/۷۳۷، برقم ٤۷۵۵ وباب قوله وصدق بالحسنى ۲/۷۳۸، برقم ٤۷۵٦، وكتاب الأدب، باب الرجل ينكت الشئ بيده إلى الأرض ۲/۹۱۸ برقم ۵۹۷٦ وكتاب القدر، باب قوله وكان أمر الله قدراً مقدوراً ۲/۹۷۷ برقم ٦۳۵۲، وكتاب التوحيد، باب قوله ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر ۲/۱۱۲۷ برقم ۷۲۵۱، ومسلم كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه وكتابة رزقه الخ ۲/۳۳۳ برقم ۲٦٤۷.

کمزور سمجھ کر عورتوں میں چھوڑ دیا ہے؟ اس پر ان کو جوش آیا اور چل دیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے اور عرض کیا کہ آپ نے مجھے کمزور سمجھ کر چھوڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اما ترضیٰ ان تکونَ منّی بمنزلۃِ ھارونَ مِنْ موسیٰ'' کہ تمہارا میرے بعد میں یہاں رہنا ایسا ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر جانے کے وقت اپنے بھائی حضرت ہارون کو چھوڑا تھا۔

اکثر غزوات میں جھنڈا ان ہی کے ہاتھ میں رہتا تھا، نہایت شجاع اور بہادر تھے، آپ کے مناقب اور فضائل اس قدر کثرت سے وارد ہیں کہ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ حضرات صحابہ میں جس قدر مناقب وفضائل حضرت علیؓ کے بارے میں ہیں اتنے کسی اور صحابی کے بارے میں وارد نہیں ہیں، غزوۂ خیبر کے موقعہ پر ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں صبح کو جھنڈا اس شخص کے ہاتھوں میں دونگا جو اللہ ورسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ ورسول اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے ہاتھ پر یہ قلعہ فتح ہوگا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس دن کے سوا کبھی مجھے امارت کی طلب نہیں ہوئی، لیکن صبح کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو جھنڈا عطا فرمایا، آپ کی خلافت چار سال نو مہینے چند ایام رہی، ۱۷ر رمضان ۴۰ھ میں ایک خارجی شخص عبدالرحمٰن بن ملجم نے نماز کی حالت میں ان کو زخمی کیا اور تین دن بعد کوفہ میں ان کی وفات ہوگئی، حضرت حسنؓ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔(۱)

تقدیر کے بعد عمل کی کیا ضرورت؟ اس خیال کی اصلاح:

مامنکم من احد إلاوقد کتبمقعدہ من النار ومقعدہ من الجنۃ: شراح نے فرمایا کہ یہاں ''واوٗ'' اَوْ کے معنی میں ہے ورنہ معنی درست نہیں ہوں گے، چنانچہ بعض روایات میں ''اَوْ'' کا لفظ ہی آیا ہے، اور بعض نے کہا کہ واوٗ کو اصل معنی (جمع کے معنی) میں لینا بھی صحیح ہے، کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے ہر شخص کا ٹھکانہ جنت میں بھی بنایا ہے اور جہنم میں بھی، پھر وہ جیسا عمل کرتا ہے اسی کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک جگہ میں اس کو رکھا جاتا ہے۔

افلانتکل وندع العمل: صحابہ نے عرض کیا کہ جب جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے تو ہم تقدیر پر بھروسہ کرکے عمل کو چھوڑ دیں، کیونکہ ہمارا عمل اللہ کے فیصلہ کو بدل نہیں سکتا، پھر عمل کا کیا فائدہ؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) الإصابۃ ٤ر ٤٦٤.

نے فرمایا کہ اعمال میں لگے رہو، کیونکہ آدمی جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا اسی کے اعمال اس کے لئے آسان کردیئے جاتے ہیں، پس سابقہ قضاء وقدر ترک عمل کا باعث نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر چہ جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے مگر اس کا ظاہری سبب اعمال ہیں اور دنیا دارالاسباب ہے لہٰذا اسباب بھی ضروری ہیں، پس اپنے اختیار سے سعادت کی علامات اور سعادت کے اعمال میں مشغول رہو تا کہ سعادت والے اعمال پر خاتمہ ہو۔

۸۰/۸: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم "إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظَّهُ، مِنَ الزِّنَا، أَدْرَكَ ذٰلِكَ لامَحَالَةَ، فَزِنَا الْعَيْنِ النَّظَرُ، وَزِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ، وَالنَّفْسُ تَمَنّٰى وَتَشْتَهِيْ، وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ وَيُكَذِّبُهُ" (متفق علیہ)(۱)

وفي روايةٍ لِمُسْلِمٍ قَالَ: "كُتِبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ نَصِيبُهُ مِنَ الزِّنَا، مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لامَحَالَةَ، الْعَيْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظَرُ، وَالْأُذُنَانِ زِنَاهُمَا الاسْتِمَاعُ، واللِّسانُ زِنَاهُ الْكَلامُ، وَالْيَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ، وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا، وَالْقَلْبُ يَهْوٰى ويَتَمَنّٰى وَيُصَدِّقُ ذٰلِكَ الْفَرْجُ وَيُكَذِّبُهُ"

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے مقدر میں زنا کا کچھ حصہ لکھدیا ہے (پھر جس کے مقدر میں جتنا لکھا جاچکا ہے) وہ ضرور اس کا ارتکاب کرے گا، آنکھوں کا زنا نامحرم کی طرف دیکھنا ہے اور زبان کا زنا شہوت کی باتیں کرنا ہے اور نفس آرزو وخواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس آرزو اور خواہش کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب (بخاری ومسلم)

اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ آدمی کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصہ لکھ دیا گیا ہے اس کو وہ ضرور عمل میں لائے گا آنکھوں کا زنا (نامحرم عورتوں کی طرف) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (شہوت انگیز) باتیں سننا ہے اور زبان کا زنا (شہوت کی) باتیں کرنا ہے اور ہاتھ کا زنا نامحرم عورت

(۱) أخرجه البخاري في موضعين: كتاب الاستيذان، باب زنا الجوارح دون الفرج ۲/۹۲۲ برقم ۶۰۰۲، وكتاب القدر، باب قول الله تعالىٰ وحرام على قرية أهلكناها انهم لايرجعون ۲/۹۷۸، ومسلم كتاب القدر، باب قدر على ابن آدم حظه من الزنا وغيره ۲/۳۳۶ برقم ۲۶۵۷

کو برے ارادہ سے پکڑنا ہے اور پاؤں کا زنا (بدکاری کی طرف) جانا ہے اور دل خواہش وآرزو کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق وتکذیب کرتی ہے۔

تشریح حدیث

گناہ اور اسباب گناہ بھی مقدر:

اس حدیث میں بھی اعمال کے مقدر ہونے کا بیان ہے کہ بندوں کے اعمال تقدیر کے ماتحت ہیں، چنانچہ فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کے حق میں زنا کا جو حصہ مقدر فرمادیا ہے وہ ضرور اس کا مرتکب ہوتا ہے۔

علماء نے فرمایا ہے کہ زنا کی دو قسمیں ہیں: (۱) حقیقی (۲) حکمی، زنا حقیقی تو ہے عضو مخصوص کو عضو مخصوص میں داخل کرنا اور زنا حکمی؛ مقدماتِ زنا واسباب زنا ہیں، مثلاً آنکھ سے غیر محرم کو دیکھنا یا زنا سے متعلق گفتگو کرنا یا مقام زنا کی طرف چلنا یا قلب سے غیر محرم کی تمنا وخواہش کرنا، یہ تمام زنا حکمی ہیں۔

اس حدیث کے مطابق حقیقی وحکمی ہر طرح کا زنا مقدر ہے، البتہ حق تعالیٰ شانہ نے بندہ کو بااختیار پیدا کیا ہے بندہ جو کرتا ہے اپنے اختیار سے کرتا ہے پس مکلّف ہونے کے لحاظ سے انسان پر لازم ہے کہ حقیقی وحکمی ہر دو طرح کے زنا سے بچے، ہر دو کا ارتکاب حرام ہے، البتہ حکمی زنا صغائر میں شمار ہے اور حقیقی زنا کبائر میں داخل ہے۔

سوال: یہاں حدیث میں ابن آدم کے عموم میں حضرات انبیاء علیہم السلام داخل ہیں یا نہیں؟

جواب: بعض نے کہا کہ انبیاء علیہم السلام داخل نہیں ہیں، کیونکہ انبیاء معصوم ہیں، اور بعض نے کہا کہ ابن آدم کے عموم میں سب داخل ہیں، لیکن دلائل عصمت کی وجہ سے وہ اس سے خارج ہوں گے، دونوں قولوں کا حاصل ایک ہی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے یہ حکم نہیں ہے، پس ''ابن آدم'' سے مراد جنس آدم ہے نہ کہ جمیع افراد۔

والفرج یصدق ذلک: ''ذالک'' کے مشار الیہ میں دو احتمال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ اس کا مشار الیہ اخیر جملہ ہے یعنی تمنائے قلب اور خواہش قلب کہ ہر آدمی کے

قلب میں غیرمحرم کی خواہش ہوتی ہے، لیکن یہ خواہش کچی ہے یا پکی، اس کی تصدیق شرم گاہ کرتی ہے کہ اگر زنا میں مبتلا ہوگیا تو مطلب یہ ہے کہ خواہش سچی تھی اوراگر زنا سے بچارہا تو مطلب یہ کہ خواہش زنا کچی تھی۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''ذلک'' کا مشار الیہ مذکورہ تمام جملے ہیں یعنی یہ سب مقدماتِ زنا ہیں، انسان کا نفس زناء حقیقی کی جوکبیرہ گناہ ہے تمنا کرتا ہے اب آگے آدمی زنا میں مبتلا ہوجائے تو گویا شرم گاہ نے ان گناہوں کے کبیرہ ہونے کی تصدیق کردی ورنہ یہ گناہ صغیرہ کی حدتک محدود رہیں گے۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ تقدیر الٰہی انسان کا مکمل احاطہ کئے ہوئے ہے، اورصرف معروف گناہ یاعبادات ہی مقدرمن اللہ نہیں ہیں بلکہ ان کے مقدمات اورعوامل بھی مقدرمن اللہ ہیں۔

۸۱ / ۹: وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ ؓ أَنَّ رَجُلَيْنِ مِنْ مُزَيْنَةَ قَالا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأَيْتَ مَايَعْمَلُ النَّاسُ الْيَوْمَ وَيَكْدَحُوْنَ فِيْهِ؟ أَشَيْءٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ مِنْ قَدْرٍسَبَقَ، أَوْفِيْمَا يَسْتَقْبِلُوْنَ بِهِ مِمَّا أَتَاهُمْ بِهِ نَبِيُّهُمْ وَثَبَتَتِ الْحُجَّةُ عَلَيْهِمْ؟ فَقَالَ: ''لا، بَلْ شَيْئٌ قُضِيَ عَلَيْهِمْ وَمَضٰى فِيْهِمْ، وَتَصْدِيْقُ ذٰلِكَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ: وَنَفْسٍ وَمَاسَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا'' (رواہ مسلم) (۱)

ترجمہ: حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ قبیلہ مزینہ کے دوشخص (آپ علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں) حاضرہوئے اورعرض کیا یارسول اللہ! ہمیں یہ بتایئے کہ آج (دنیامیں) لوگ عمل کرتے ہیں اوراعمال کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کیایہ وہی چیز ہے جس کا فیصلہ ہوچکاہے اورنوشتۂ تقدیربن چکاہے، یایہ عمل ان افعال میں سے ہے جو(لوگوں سے) آئندہ (زمانہ میں صادر) ہونے والے ہیں اورجن کوانکے نبی لیکرآئے ہیں (اورجن کے ذریعہ) لوگوں پرحجت قائم ہوئی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ وہی شے ہے جس کا فیصلہ ہوچکاہے اورنوشتہ تقدیربن چکاہے اوراس کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے: ''وَنَفْسٍ وَّمَاسَوّٰهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا'' یعنی قسم ہے انسانی جان کی اوراس کی جس نے اس کوسنوارا، پھراس کے دل میں بدی اورنیکی کی بات ڈالدی۔

(۱) أخرجه مسلم، كتاب القدر، باب كيفية خلق الآدمي الخ ۲ / ۳۳۴.

تشریح حدیث

احوال عمران بن حصین:

عمران بن حصین نام ہے، ابونجید کنیت ہے، فقہاء اور اجلۂ صحابہ میں سے ہیں، یہ اپنے والد کے ہمراہ خیبر کے سال ۷ھ میں مسلمان ہوئے اور متعدد غزوات میں شریک ہوئے، اخیر میں بصرہ میں رہنے لگے تھے اور وہیں ۵۲ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ (۱)

تقدیر کے بارے میں دولوگوں کا سوال اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب:

ان رجلين من مزينة : قبیلۂ مزینہ کے دو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا یارسول اللہ یہ بتائیں کہ لوگ جو اعمال اور کدو کاوش کرتے ہیں، اعمال اچھے ہوں یا برے، تو کیا یہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے اور ازل میں وہ تقدیر میں لکھے جا چکے ہیں یا قضاء وقدر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ ان اعمال کا صدور لوگوں سے آئندہ زمانہ میں اپنی طرف سے ایجاد کے طور پر ہوتا ہے، ماضی کی قضاء وقدر ان صدور کا باعث نہیں، کیونکہ اللہ نے حضرات انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ اعمال صالحہ کا حکم دیں اور اعمال قبیحہ سے روکیں، اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعمال انسانوں کی ایجاد ہیں پہلے سے مقدر نہیں ہیں، اگر مقدر ہوتے تو نواہی سے روکنے اور اوامر کا حکم دینے کی ضرورت نہ تھی، وہ افعال حسبِ تقدیر لوگوں سے خود بخود صادر ہوتے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ یہ اعمال پہلے سے مقدر ہیں، جیسا کہ اس کی تصدیق اس آیت سے ہوتی ہے: ''**وَنَفْسٍ وَّمَاسَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَافُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا**'' اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نفس اور اس کے تسویہ پر فجور وتقویٰ کے الہام کو متفرع کیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ نفس انسانی کے پیدائش کے وقت ہی فجور وتقویٰ بھی مقدر اور طے ہو چکا تھا، اور اسی کے حساب سے انسان اچھے وبرے اعمال انجام دیتا ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال ہوگا کہ جب بدی اور نیکی ابتداء آفرینش ہی میں مقدر کر دی گئی تو پھر انبیاء کی بعثت بے سود ہوئی، کیونکہ جو مقدر ہوا ہے وہی واقع ہوا ہوگا، پس انبیاء علیہم السلام کے انذار وتبشیر کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کو منجانب اللہ کسب اور اختیار عطا کیا گیا ہے اچھے یا برے کام کو اپنے

(۱) سير أعلام النبلاء ۲/ ۵۰۸، والإصابة ٤/ ۷۹.

اختیار سے انجام دیتا ہے اس لئے اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا بالکل بجا اور مفید ہے اور یہ تقاضۂ عقل وشرع انتہائی ضروری ہے۔

تشریح الفاظ:

(یکدحون فیه)ای یسعون فی تحصیله بجهد ،محنت اورمشقت سے کام کوانجام دینا (أشئ قضی علیهم)''شئ'' مبتدامحذوف کی خبر ہے، وہ مبتدا''ہو''ضمیر ہے، (من قدرسبق)''من'' تعلیلیہ ہے یعنی وہ اعمال بندوں سے سابق تقدیر کی وجہ سے صادرہوتے ہیں(أو فیما یستقبلون به)''الاستقبال بالعمل'' آئندہ زمانہ میں کسی کام کوانجام دینا، تقدیرعبارت یہ ہے: اوهوشئ کائن فیما یستقبلون به.

۸۲ / ۱۰: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ:قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! إِنِّیْ رَجُلٌ شَابٌّ، وَأَنَا أَخَافُ عَلٰی نَفْسِیَ الْعَنَتَ، وَلاأَجِدُ مَاأَتَزَوَّجُ بِهِ النِّسَاءَ ، کَأَنَّهٗ یَسْتَأْذِنُهٗ فِیْ الاخْتِصَاءِ، قَالَ: فَسَکَتَ عَنِّیْ، ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِکَ، فَسَکَتَ عَنِّیْ، ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِکَ، فَسَکَتَ عَنِّیْ، ثُمَّ قُلْتُ مِثْلَ ذٰلِکَ، فَقَالَ النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم ''یَاأَبَاهُرَیْرَةَ! جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا أَنْتَ لَاقٍ، فَاخْتَصِّ عَلٰی ذٰلِکَ أَوْذَرْ'' (رواہ البخاری) (۱)

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! میں ایک جوان مرد ہوں اور میں اپنے نفس سے ڈرتا ہوں کہ میں بدکاری میں مبتلا نہ ہوجاؤں اور میرے اندر اتنی استطاعت نہیں ہے کہ کسی عورت سے شادی کرلوں، گویا حضرت ابو ہریرہؓ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خصی ہونے کی اجازت چاہ رہے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ: یہ سن کر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، میں نے دوبارہ پھروہی عرض کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھرخاموش رہے، میں نے پھرعرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھرسکوت اختیارفرمایا، میں نے پھراسی طرح عرض کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابو ہریرہ! قلم تقدیرخشک (لکھ کرفارغ) ہوچکا ہے ان اعمال سے جوتم سے صادر ہونے والے ہیں، پس جب یہ بات ہے توتم خصی ہوجاؤ یاخصی ہونے کوترک کردواس سے فرق نہیں پڑتا۔ (بخاری)

(۱) أخرجه البخاري فی کتاب النکاح،باب مایکره من التبتل والخصاء ۲ / ۷۵۹، برقم ٤٨٨٥، وکتاب القدر، باب جف القلم علی علم الله ۲ / ۹۷٦قبل رقم ٦٣٤٤ تعلیقاً.

تشریح حدیث

تقدیر؛ تدبیر سے نہیں ٹل سکتی:

قلت یارسول الله!انی رجل شاب الخ: ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں جوان ہوں اور زنا میں مبتلا ہونے کا خوف ہے اور مال میرے پاس ہے نہیں کہ نکاح کرلوں، کیونکہ ابوہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے تھے جنھوں نے کسب کو چھوڑ کر اپنے آپ کو تحصیل علم کے لئے وقف کردیا تھا، ابوہریرہؓ کے شاگرد فرماتے ہیں کہ ان کا مقصد خصی ہونے کی اجازت مانگنا تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ سکوت اختیار فرمایا، کہتے ہیں کہ میں نے دوبارہ سوال کیا پھر سکوت اختیار فرمایا، اسی طرح کئی مرتبہ سوال کیا، آپ نے ہر مرتبہ سکوت فرمایا، چوتھی مرتبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو گناہ تم سے سرزد ہونے والا ہے وہ مقدر میں لکھا جاچکا ہے قلمِ تقدیر اس کو لکھ کر خشک ہوچکا ہے۔

جفافِ قلم کنایہ ہے فراغت عن الکتابت سے (۱) یعنی قلمِ تقدیر اس گناہ کو لکھ کر فارغ ہوچکا ہے، لہٰذا خصی ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، جو مقدر ہے وہ ہر صورت میں واقع ہوگا، معلوم ہوا کہ بندوں کے اچھے و برے سب اعمال مقدر ہیں، لہٰذا معتزلہ کے خیال کی تردید ہوئی۔

فاختص علی ذلک: یہ موضع حال میں ہے **فاختص حال کون فعلک اوترکک واقعاً علی ماجف القلم.** (۲)

اور یہ امر اباحت واجازت کے لئے نہیں بلکہ زجر وتوبیخ کے لئے ہے، اور معنی یہ ہیں کہ جب سب اعمال مقدر ہوچکے ہیں تو خصی ہونے سے فائدہ کیا ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے آیت کریمہ ''**اعملوا ماشئتم**'' میں امر برائے توبیخ ہے۔

۸۳/۱۱: وعن عبدِاللّٰهِ بنِ عَمرٍوؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "إِنَّ قُلُوْبَ بَنِيْ آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصَرِّفُهُ كَيْفَ يَشَاءُ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ الله صلى الله عليه وسلم "اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّف

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۵۹.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۲۵۹.

قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ" (رواہ مسلم) (۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان (اس طرح ہیں) جیسے ایک دل ہے، اس کو وہ جس طرح چاہتا ہے پھیر دیتا ہے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ آپ دلوں کے پھیرنے والے ہیں ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

قلوبِ انسانی رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ انسان کا قلب بھی اللہ کے قبضے میں ہے، بندہ کے اعمال وافعال میں اصل قدرت اور اصل مشیت حق تعالیٰ شانہ کی ہے، اعضاء وجوارح کو کسی کام کے کرنے کا قلب حکم دیتا ہے اور تمام انسانوں کے قلوب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں مثل ایک قلب کے، اللہ ان کو جدھر چاہے پھیر دیتا ہے۔

ان قلوب بنی آدم کلها: اس عموم میں اولیاء وانبیاء کرام بھی داخل ہیں، ہر شخص کے دل پر اللہ کی حکومت اور اس کا قبضہ ہے، جس سے کسی کا استثناء نہیں ہے۔

یہاں سوال ہوتا ہے کہ انسان کے تمام ہی اعضاء وجوارح اللہ کے قبضے میں ہیں، پھر قلب کی تخصیص اعضاء انسانی میں کیوں فرمائی گئی؟

جواب: یہ ہے کہ قلب اہم عضو ہے اسی پر ایمان وکفر کا مدار ہے قلب کے تقاضہ سے ہی اعضاء وجوارح سے افعال کا صدور ہوتا ہے اس لئے قلب کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا، پس باقی اعضاء اس حکم میں بطریق اولی داخل ہیں، لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے تمام اعضاء وجوارح حتی کہ قلب بھی اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہے اللہ ان میں جو چاہے تصرف فرماتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قلب کے علاوہ باقی اعضاء ایسے ہیں جن پر دوسرا شخص قبضہ کر سکتا ہے لیکن قلب

(۱) أخرجه مسلم، كتاب القدر، باب تصريف الله تعالى القلوب كيف يشاء ۲/ ۳۳۵.

ایک ایسا عضو ہے جس پر کوئی دوسرا شخص قبضہ نہیں کرسکتا اور اللہ کی ذات ایسی قدرت والی ہے کہ اس کا قبضہ دل پر بھی ہے، پس قدرتِ الٰہی کے اظہار کے لئے قلب کی تخصیص کی گئی۔

متشابہات کے بارے میں جمہور امت کا موقف:

بین اصبیعین من أصابع الرحمن : یہ جملہ متشابہات میں سے ہے، اس لئے کہ اصابع ذی جسم شخص کی ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ جسم سے منزہ ہیں، متشابہات دو طرح کے ہیں: (۱) ایک وہ جو قابل تاویل نہیں، مثلاً حروف مقطعات، (۲) دوسرے وہ جن کی تاویل ہوسکتی ہے۔

پھر اس نوع ثانی کے بارے میں امت میں دو جماعتیں ہیں: مفوّضین ومؤوّلین؛ مفوضین وہ حضرات ہیں جو ایسے متشابہات پر بلا کیف ایمان رکھتے ہیں، قابل تاویل ہونے کے باوجود ان کی کوئی تاویل نہیں کرتے، اور مؤولین وہ ہیں جو ان کلمات کا اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان مفہوم بیان کرتے ہیں، علماء متقدمین مفوضین میں سے ہیں، چنانچہ امام مالک سے منقول ہے: **له يدٌ لا كأيدينا وله رِجلٌ لا كأرْجلنا** کہ اللہ کے ہاتھ و پیر ہیں مگر ہمارے ہاتھوں و پیروں کے مثل نہیں۔

لیکن پھر بعد میں فرق ضالہ نے ان متشابہات کا غلط استعمال کیا اور اپنے فاسد عقائد ان سے ثابت کرنا چاہے، چنانچہ مجسّمہ نامی فرقہ اسی جیسی نصوص کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ہونے کا قائل ہوا، اس لئے حضرات متأخرین نے ایسے الفاظ وکلمات کی تاویل کی اور ان کا ایسا مفہوم بیان کیا کہ جو اللہ کے شایان شان بھی ہو اور ان فرق ضالہ کے عقائد بھی اس سے ثابت نہ ہوں، چنانچہ یہاں ''اصابع'' سے مراد اللہ کا قبضہ وقدرت لیا گیا، اسی لئے یہ ترجمہ کیا گیا کہ بندوں کے قلوب اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہیں کیونکہ حسًّا بھی جس پر قبضہ کیا جاتا ہے اس کے لئے یہی تعبیرات اختیار کی جاتی ہے، کہا جاتا ہے **فلان بين اصبعي أُقلّبه كيف شئتُ** یعنی فلاں میری انگلیوں میں ہے جس طرح چاہوں میں اس کو پلٹ سکتا ہوں، مطلب یہ کہ مجھے اس پر مکمل قابو وقدرت حاصل ہے۔ (۱)

اصبعین: علماء مؤولین کے مطابق تثنیہ کے صیغہ سے اشارہ ہے اللہ کی دو قسم کی صفات کی طرف

(۱) المرقاة ١ / ٢٦٠، لمعات التنقيح ١ / ٣٦٢.

یعنی صفات جلالی اور صفات جمالی، اللہ کی صفت جلالی کا مظہر جہنم ہے اس کے اثر سے انسان فسق وفجور میں مبتلا ہوتا ہے اور صفت جمالی کا مظہر جنت ہے اس کے اثر سے بندہ ایمان وطاعت میں مشغول ہوتا ہے، بعض نے کہا کہ اس سے اشارہ ہے دولموں کی طرف ایک لمہ ملکی اور دوسرے لمہ شیطانی کہ انسان کے قلب پر لمہ ملکی وشیطانی دونوں کا تصرف ہوتا ہے، اور فرشتہ اور شیطان اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، دونوں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔(۱)

کقلب واحد : اس تشبیہ سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جس طرح قلب واحد پر تصرف کرنا ظاہراً آسان ہے اسی طرح اللہ کے لئے تمام قلوب پر تصرف کرنا آسان ہے وہ جس کے قلب کو جدھر چاہے پھیر سکتا ہے۔(۲)

ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اللهم مصرف القلوب الخ : چونکہ اللہ تعالیٰ کو تمام انسانوں کے قلوب پر مکمل تصرف واختیار ہے، وہ قلوب کو جدھر چاہے پھیر دے، طاعات کی طرف یا معاصی کی طرف، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ مضمون بیان کرنے کے بعد یہ دعاء فرمائی اور امت کو تعلیم دی کہ وہ اللہ سے اپنے قلوب کو طاعات کی جانب پھیرنا مانگا کریں، کیونکہ اگر وہ معاصی کی جانب پھیر دے تو کسی کو اس سے پوچھنے کی مجال نہیں۔(۳)

۸۴/۱۲: وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَ قال : قال رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم مَامِنْ مَوْلُوْدٍ إِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّ دَانِهٖ أَوْيُنَصِّرَانِهٖ أَوْيُمَجِّسَانِهٖ، كَمَاتُنْتِجُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ؟ ثُمَّ يَقُوْلُ: فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَالنَّاسَ عَلَيْهَا لاتَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ'' (۴) (متفق علیہ) (۵)

(۱) اللمعات ۱/ ۳٦۳.

(۲) اللمعات ۱/ ۳٦٤.

(۳) اللمعات ۱/ ۳٦٤.

(٤) الروم: ۳۰.

(٥) أخرجه البخاری، فی خمسة مواضع ، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه وهل یعرض علی الصبی الاسلام الخ ۱/ ۱۸۱ برقم ۱۳٤۲، ۱۳٤۳، وکتاب الجنائز ،باب ماقیل فی اولادالمشرکین ۱/ ۱۸٥ برقم ۱۳٦۹ وکتاب التفسیر، باب قوله لاتبدیل لخلق الله ۲/ ۷۰٤برقم ٤٥۸۹، وکتاب القدر، باب الله اعلم بماکانوا عاملین ۲/ ۹۷٦برقم ٦۳٤۷، ومسلم کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة الآیه .

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، جس طرح ایک چوپایہ صحیح سالم بچہ جنتا ہے، کیا تم اس میں کوئی نقص محسوس کرتے ہو؟ پھر انھوں نے (ابوہریرہؓ نے) یہ آیت تلاوت فرمائی: لاتبدیل الآیۃ (ترجمہ) اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت پر چلو جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی، یہی بالکل سیدھا راستہ ہے۔

تشریح حدیث

بچوں کا وصفِ خلقت اور والدین کے ماحول کا اثر:

اس حدیث پاک میں بھی تقدیر کا بیان ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہر بچہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے یعنی اگر بچے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے بری صحبت نہ ملے تو وہ عقل وشعور آ جانے کے بعد اسلام پر قائم رہے گا اور اللہ کی وحدانیت کا قائل ہوگا؛ لیکن ہوتا یہ ہے کہ بہت سی مرتبہ بچہ کو صحیح ماحول نہیں ملتا، اس کے والدین یہودیت نصرانیت وغیرہ کسی دوسرے مذہب پر ہوتے ہیں تو وہ بچہ کو اپنے رنگ میں ڈھال لیتے ہیں اور اس کو اپنی طرح یہودی نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں، گویا کہ اس کی فطرت میں نقص پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ بچہ زیغ وضلال سے سالم اور صحیح فطرت پر پیدا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو ایک مثال سے واضح فرمایا کہ دیکھو جانور کے جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو صحیح سالم ہوتا ہے پھر لوگ اس میں نقص پیدا کر دیتے ہیں، چنانچہ اہل عرب بچے کا تھوڑا سا کان کاٹ دیتے تھے اور عقیدہ یہ ہوتا تھا کہ اب یہ نظر بد سے محفوظ رہے گا، پس جس طرح جانور کے بچہ میں یہ تغیر اور نقص بعد میں پیدا ہوتا ہے اسی طرح بعض بچے بھی اصل فطرت پر پیدا ہونے کے بعد گھر کا ماحول خراب ہونے کی وجہ سے بگڑ جاتے ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور خاص مویشیوں کی مثال اس لئے بیان کی کہ اہل عرب مویشی پالتے تھے اور وہ مویشیوں کے حالات سے خوب واقف تھے اس لئے مویشیوں کی مثال سے وہ مضمون کو اچھی طرح سمجھ لیں گے، اس کے بعد راوی نے اس حدیث کی تائید میں یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لاتَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ الآیة.

فطرت کا مفہوم ومصداق:

یولد علی الفطرة: فطرت پر پیدا ہونے کی شرح میں دو قول ہیں:

(۱) قبول حق کی استعداد وصلاحیت پر پیدا ہونا جس کو فطرت سلیمہ کہتے ہیں۔

(۲) دین اسلام پر پیدا ہونا، اس قول کی دلیل کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ ترمذی کی روایت میں ''ملت'' کا لفظ وارد ہوا ہے اور شریعت میں ملت کا مصداق ملت اسلام ہوتا ہے، نیز راوی حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے حدیث کی تائید میں یہ آیت کریمہ فطرة الله التی الخ پڑھی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس فطرت پر قائم رہو جس پر اللہ نے تم کو پیدا کیا اور ظاہر ہے کہ بندوں کو ایمان پر قائم رہنے کا حکم ہے معلوم ہوا کہ فطرت سے فطرت ایمان مراد ہے۔

اور اول قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ اسلام ایک کسبی اور اختیاری چیز ہے جس کے اختیار کرنے پر بندوں کو ثواب ملتا ہے اور اس کے ترک پر جہنم کا استحقاق ہوتا ہے، اگر فطرت سے ملت اسلام مراد ہو تو مطلب ہوگا کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے گویا کہ اسلام غیر کسبی اور غیر اختیاری چیز ہے اور غیر اختیاری چیز پر ثواب کا استحقاق نہیں ہوتا اور نہ اس کے ترک پر عذاب ہوتا ہے، حالانکہ اسلام کا کسبی اور اختیاری چیز ہونا متفق علیہ امر ہے، دوسری دلیل ان حضرات کی یہ ہے کہ کافر کا نابالغ بچہ دنیوی احکام میں غیر مسلم ہوتا ہے کہ اگر اس کا انتقال ہو جائے تو مسنون طریقے سے اس کو کفن دفن نہیں کیا جاتا، نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے نہ اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے، اگر یہ مسلمان پیدا ہوا ہے تو پھر اس کی نماز جنازہ بھی ہونی چاہئے مسنون طریقہ پر کفن دفن بھی ہونا چاہئے؟ جو نہیں ہوتا، دلائل کی رو سے پہلا قول ہی راجح ہے۔(۱)

ایک اشکال وجواب:

یہاں اشکال یہ ہے کہ بمقتضاء حدیث ہر بچہ فطرت سلیمہ پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ وخضر کے واقعہ

(۱) اللمعات ۱ / ۳۶۵.

میں حضرت خضر نے جس بچے کو قتل کیا تھا اس کے متعلق حدیث میں **طبع کافراً** کے الفاظ آئے ہیں کہ وہ کافر پیدا ہوا تھا۔(۱)

اس کے دو جواب دیئے گئے ہیں: (۱) یہ بچہ حدیث **کل مولود** کے حکم سے مستثنیٰ ہے کہ وہ فطرۃً کافر تھا۔

(۲) حضرت خضر والی حدیث میں ''طُبع'' بمعنیٰ ''قُدر'' ہے کہ اس بچے کا کافر ہونا مقدر تھا یعنی وہ اس صفت اور حالت کے ساتھ پیدا ہوا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا اور بڑا ہوا تو وہ کافر ہوگا۔

لاتبدیل لخلق الله : میں ''لا'' صورۃً نفی ہے لیکن معنیً نہی ہے، اور معنی یہ ہیں کہ منجاب اللہ بچہ کی خلقۃً جو صفت وفطرت ہے اس میں تبدیلی نہ کرو، ایسا کرنے سے گناہ کے مستحق بنوگے۔(۲)

کماتنتج البهیمة: ''تنتج'' انتاج سے ہے بمعنی جننا، معروف ومجہول دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، مگر راجح معروف کا صیغہ ہے، ''جـــمـعـــاء'' بمعنی سلیم الاعضاء، یعنی جس کے تمام اعضاء موجود ہوں، ''جدعاء'' بمعنی کان کٹا ہوا، اس کا مرادی ترجمہ ہے نقص۔

ثم یقول فطرة الله الخ : ظاہراً متبادر ہوتا ہے کہ یہ استشہاد بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمایا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت ابوہریرہؓ کا کلام ہے، جیسا کہ بعض طرق میں ''**ثم یقول ابوهریرة**'' کی تصریح وارد ہے۔

۸۵ / ۱۳: وعن أبي موسى الأشعريؓ قَالَ : قَامَ فِينَا رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِخَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ لايَنَامُ، وَلايَنْبَغِيْ لَهُ أَنْ يَنَامَ، يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ، وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّوْرُ، لَوْكَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهِ مَاانْتَهَىٰ إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ'' (رواہ مسلم)(۳)

ترجمه: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور پانچ باتیں ارشاد فرمائیں: اللہ تعالیٰ شانہ سوتا نہیں اور سونا اس

(۱) رواه أبوداؤ في كتاب السنة، باب في القدر ۲ / ۶۴۷ لفظه: وكان طبع يوم طبع كافراً.

(۲) اللمعات ۱ / ۳۶۶.

(۳) أخرجه مسلم في الإيمان، باب قوله تعالى ولقد انزلنا نزلة أخرى الاية.

کی شان کے مناسب بھی نہیں ہے، وہ ترازو کو بلند و پست کرتا ہے، دن کے عمل سے پہلے رات کے عمل اور رات کے عمل سے پہلے دن کے عمل اس کے پاس پہنچا دیئے جاتے ہیں، اور اس کا حجاب نور ہے، اگر وہ اس کو کھولدے تو اس کی ذاتِ پاک کا نور مخلوقات کی حدنگاہ تک تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر کردے۔ (مسلم شریف)

تشریح حدیث

پانچ باتیں:

اس حدیث میں پانچ جملے ہیں، ایک جملہ تقدیر سے متعلق ہے اس لئے اس حدیث کو باب الایمان بالقدر کے تحت لایا گیا ہے، حق تعالیٰ شانہ کی عظمت اور جلالتِ شان کو بتانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ باتیں بیان فرمائیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کو نیند کی احتیاج نہیں:

ان اللہ لاینام: اللہ سوتا نہیں ہے اور اس کے لئے سونا مناسب بھی نہیں ہے، ''لَاتَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَانَوْمٌ'' یعنی نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اس لئے کہ مشہور ہے النوم أخت الموت کہ نوم اور موت دونوں غفلت میں برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ موت و غفلت سے منزہ ہے، نیز حیوان سوتا ہے تاکہ اس کی تکان زائل ہوجائے اور اللہ تکان و تکاسل سے بھی منزہ ہے اسی لئے جنت میں نوم نہیں ہے کیونکہ اہل جنت کو تکان نہیں ہوگی، نیز نوم محدثات کا خاصہ ہے اور اللہ کی ذات قدیم ہے۔

(۲) رزق کی تنگی و کشادگی اللہ کے قبضہ میں:

یخفض القسط ویرفعه: یہ دوسرا جملہ باب کے مناسب ہے کہ اللہ قسط کو کبھی بلند کرتا ہے اور کبھی پست۔

''قسط'' کے معنی میں کئی احتمال ہیں: (۱) حصہ اور حصہ سے مراد ہے رزق کہ وہ بھی حیوان کا حصہ ہوتا ہے، پس حدیث کے معنی ہوئے کہ حق تعالیٰ شانہ رزق کو کبھی پست اور کبھی بلند فرما دیتا ہے رزق پست کرنے سے مراد رزق میں تنگی اور بلند کرنے سے مراد رزق میں وسعت پیدا فرمانا ہے۔ (۱)

(۱) اللمعات ۱ / ۳۷۱.

(۲) عدل وانصاف اس صورت میں ترجمہ ہوگا کہ اللہ عدل وانصاف کو کبھی پست کرتا ہے اور کبھی بلند یعنی کبھی ظالم بادشاہ مقرر کرتا ہے اور کبھی عادل حکمراں عطافرماتا ہے اور ایسا عموماً بندوں کے اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے، مشہور مقولہ ہے: اعمالکم عمالکم. جیسے تمہارے اعمال ہونگے ویسے ہی تمہارے اوپر حکمراں ہونگے۔(۱)

(۳) بعض نے کہا کہ قسط کے معنی میزان وترازو کے ہیں جوآلۂ عدل ہے، معنی یہ ہیں کہ اللہ میزان کو کبھی پست اور کبھی بلند کرتا ہے، پھر میزان کی مراد میں مذکورہ دونوں احتمال ہوں گے میزان رزق کا یا میزان عدل کا، اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ میزانِ عمل مراد ہو، اور میزانِ عمل کو بلند کرنے کا مطلب عمل صالح کی توفیق دینا اور پست کرنے سے مراد سلبِ توفیق ہے۔(۲)

(۳و۴) بندوں کے اعمال کی صبح وشام پیشی:

یرفع إلیه عمل اللیل ......الخ: یہ تیسرا اور چوتھا جملہ ہے کہ بندوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں صبح وشام پہنچائے جاتے ہیں صبح اور شام فرشتوں کی ڈیوٹی بدلتی ہے، جنکی ڈیوٹی پوری ہوتی ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں اپنے پاس محفوظ اعمال لے کر بارگاہِ الٰہی میں پہنچتے ہیں، ''رفع عمل لیل قبل عمل النهار'' کنایہ ہے سرعتِ رفع سے کہ صبح وشام کے احکام بارگاہ الٰہی میں بہت جلد پیش ہوتے ہیں، یہ ایک جملہ دو جملوں کے قائم مقام ہے۔(۳)

(۵) اللہ وبندہ کے درمیان حجابِ نور کی حیلولت:

حجابه النور : یہ حدیث کا آخری جملہ ہے کہ اللہ کا حجاب نور ہے، اسی لئے دنیا میں ان فانی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ نہیں سکتے: ''لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْأَبْصَار ''یعنی نگاہیں اس کو پا نہیں سکتیں اور وہ تمام نگاہوں کو پالیتا ہے۔

حجاب دو قسم کا ہوتا ہے: حجاب ظلمت اور حجاب نور، حجاب ظلمت یہ ہے کہ رائی ومرئی کے درمیان کوئی حسی حائل (دیوار وغیرہ) موجود ہو، اس کی وجہ سے شی مرئی نظر نہ آوے، دوسری قسم حجاب کی حجاب نور ہے

(۱) اللمعات ۱ / ۳۷۱.
(۲) اللمعات ۱ / ۳۷۱.
(۳) اللمعات ۱ / ۳۷۲.

اس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں کوئی حسی حائل نہیں ہے، البتہ مرئیٰ کا نور غایت درجہ کا ہے اور رائی کی قوت باصرہ کمزور ہے، اس کے حق میں وہ غایت درجہ کا نور ہی حجاب کے درجہ میں ہوجاتا ہے، جیسے چمگادڑ پرندہ کو دن میں نظر نہیں آتا کیونکہ اس کی بینائی کمزور ہے اور سورج کی روشنی بہت زیادہ ہے، اس لئے وہ سورج کی طرف دیکھ نہیں پاتا، اسی طرح اللہ اور بندوں کے درمیان حجاب ظلمت نہیں ہے بلکہ اللہ سراپا نور ہے اور ہماری بینائی کمزور ہے، اس کا سراپا نور ہونا بندوں کے لئے حجاب بن گیا ہے، **حجابه النور** کا مطلب یہی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے نور کی ہلکی سی تجلّی دکھائی وہ اس کو برداشت نہ کرسکے اور بیہوش ہوکر گر گئے۔ (۱)

لو كشفه لاحرقت سبحات وجهه: اللہ نے اپنی ذات کو نور کے پردہ میں رکھا ہے اگر وہ نور کے پردہ کو ہٹادے تو اس کی ذات کے انوارات تمام مخلوق کو جلاکر خاک کردیں۔ (۲)

"**سبحات**" سبحۃ کی جمع ہے بمعنی تسبیح، ملائکہ جب اللہ کے نور کو دیکھتے ہیں تو تسبیح پڑھتے ہیں، رؤیتِ نور سبب ہوتا ہے تسبیح کا، پس نور سبب اور تسبیح مسبب ہے، یہاں مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے۔ (۳)

٨٦ / ١٤: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "يَدُاللّٰهِ مَلأَى لاتَغِيْضُها نَفَقَةٌ، سَحَّاءُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، أَرَأَيْتُم مَاأَنْفَقَ مُذْخَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ؟ فَإِنَّهُ، لَمْ يَغِضْ مَافِيْ يَدِهِ، وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ، وَبِيَدِهِ الْمِيْزَانُ يَخْفِضُ وَيَرْفَعُ" (متفق علیہ) (۴)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: "يَمِيْنُ اللّٰهِ مَلأَي قَالَ ابْنُ نُمَيْرٍ: ملآنُ، سَحَّاءُ لايَغِيْضُهَا شَيْءٌ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ"

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(١) اللمعات ١ / ٣٧٢–٣٧٣۔

(٢) المرقاة ١ / ٢٦٥۔

(٣) فتح الإله ١ / ٤٥٤.

(٤) أخرجه البخاري في خمسة مواضع: كتاب التفسير، باب وكان عرشه على الماء ٢ / ٦٧٧ برقم ٤٤٩٧، والنفقات، باب فضل النفقة على الاهل وقوله ويسئلونك ماذا ينفقون ٢ / ٨٠٥ برقم ٥١٤٣، والتوحيد، باب قوله تعالى لماخلقت بيدى ٢ / ١١٠٢ برقم ٧١١٣ والتوحيد، باب وكان عرشه على الماء وهورب العرش العظيم الخ ٢ / ١١٠٣ برقم ٧١٢٠، والتوحيد، باب قول الله تعالى يريدون ان يبدلوا كلام الله ٢ / ١١١٦ برقم ٧١٩٥، ومسلم، كتاب الزكاة، باب الحث على النفقة وتبشير المنفق بالخلف ١ / ٣٢٢ برقم ٩٩٣.

اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، رات دن خرچ کرنا بھی اس میں کمی پیدا نہیں کرتا کیا تم نہیں دیکھتے ہو؟ کہ جب سے اس نے زمین وآسمان کو پیدا فرمایا اور جبکہ اللہ کا عرش بھی پانی پر تھا کتنا خرچ کیا ہے؟ لیکن (اتنا زیادہ) خرچ کرنے کے باوجود جو کچھ اس کے ہاتھ میں ہے (یعنی اس کا خزانہ) اس میں کمی نہیں ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے جسے وہ بلند وپست کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

اور مسلم کی روایت ہے ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا داہنا ہاتھ بھرا ہوا ہے اور ابن نمیر کی روایت میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، رات اور دن خرچ کرنا بھی اس کے خزانہ میں کمی نہیں کرتا۔

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی کئی جملے ہیں، ان میں سے ایک جملہ باب کے مناسب ہے: ''**بیدہ المیزان یخفض ویرفع** '' اس لئے اس روایت کو تقدیر کے بیان میں لایا گیا۔

اللہ کی سخاوت اور کثرتِ عطاء:

یداللہ ملأی: اس میں اللہ کی سخاوت اور کثرت عطا کا بیان ہے کہ اللہ کے خزانے بھرپور ہیں انمیں خرچ کرنے سے کمی نہیں آتی۔

''ملأی'' صیغۂ صفت مونث ہے، اس کا مذکر ملآن ہے، ید متشابہات میں سے ہے، متاخرین کے یہاں ید سے مراد محل عطاء یعنی اللہ کے خزانے ہیں۔

لاتغیضها نفقة: خرچ کرنے سے ان خزانوں میں کوئی کمی نہیں آتی۔

سحاء اللیل والنهار : حق تعالیٰ شانہ رات دن بہت خرچ کرتا ہے، ''سحاء'' ''سح'' سے ماخوذ ہے بمعنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے کی طرف کثرت سے بہانا، اوپر سے؛ بھاری چیز بھی آسانی سے گرائی جاسکتی ہے اور وافر مقدار میں گرائی جاسکتی ہے، اس لئے ''سحاء'' کے معنی ہوئے بہت خرچ کرنے والا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ شانہ کے بے نہایہ خزانے اور اس کی کثرتِ عطاء کی طرف توجہ دلائی کہ غور کرو کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کو پیدا کرنے کے وقت سے برابر اپنی مخلوق پر خرچ کرتا آرہا ہے، لیکن اس کے باوجود اب تک اس کے خزانے میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی ہے۔

وفی روایة لمسلم: مسلم شریف کی روایت میں ''یمین'' کا لفظ وارد ہوا ہے، سخی شخص عطاء وبخشش عموماً داہنے ہاتھ سے کرتا ہے، اس لئے یہاں موقعۂ سخاوت میں اللہ کے لئے یمین کا لفظ لایا گیا ہے نہ کہ یسار سے تقابل کے طور پر، یسار میں یمین کے مقابلہ ضُعف ہوتا ہے اور حق تعالیٰ ہرطرح کے ضعف سے منزہ ہے اس لئے اللہ کی طرف یسار کی نسبت نہیں ہوتی، ایک حدیث میں فرمایا گیا ''کلتا یدیه یمین'' (۱)

قال ابن نمیر: ملآن: ایک راوی عبداللہ بن نمیر ہیں انہوں نے ملآن صیغہ مذکر نقل کیا ہے، امام نووی نے فرمایا کہ یہ غلط ہے کیونکہ ان کے سوا تمام رواۃ نے صیغہ تانیث کے ساتھ روایت کیا ہے، علامہ طیبی نے فرمایا کہ صیغہ مذکر کو از روئے نقل وروایت غلط کہیں تو کوئی نزاع نہیں، لیکن اس وجہ سے غلط کہنا درست نہیں کہ ''ید'' مؤنث معنوی ہے اور ملآن مذکر کا صیغہ ہے پس ملآن صیغہ مذکر کی اس سے مطابقت نہیں ہے، غلط کہنے کی یہ وجہ اس لئے درست نہیں کیونکہ ید سے مراد اللہ کا احسان وانعام ہے پس ید کا لفظ معنی کے لحاظ سے مذکر ہے۔ (۲)

وبیده المیزان: اور اسی کے قبضہ میں ترازو ہے جس کو وہ پست وبلند کرتا رہتا ہے، یہ جملہ اس سے پہلے والی حدیث میں بھی آچکا ہے اس میں بھی وہی احتمالات جاری ہوں گے جو وہاں تھے، اسی جملہ کی وجہ سے یہ حدیث اس باب کے تحت ذکر کی گئی ہے۔ کمامر

۸۷ / ۱۵: وعنه قال: سُئِلَ رسولُ اللّٰه صلی الله علیه وسلم عَنْ ذَرَارِیِّ الْمُشْرِکِیْنَ، قَالَ: ''اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا عَامِلِیْنَ'' (متفق علیہ) (۳)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے بارے میں سوال کیا گیا: (کہ وہ مرنے کے بعد دوزخ میں جائیں گے یا جنت میں؟) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: اللہ بہتر جانتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہتے تو کیا عمل کرتے۔ (بخاری ومسلم)

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲٦۷.

(۲) المرقاۃ ۱ / ۲٦۷، وفتح الإله ۱ / ٤٥۷.

(۳) أخرجه البخاری فی موضعین، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین ۱ / ۱۸۵ برقم ۱۳٦۸ و کتاب القدر، باب الله اعلم بما کانوا عاملین ۲ / ۹۷٦ برقم ٦۳٤٦.

ومسلم، کتاب القدر، باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة وحکم موت أطفال الکفار ۲ / ۳۳۷.

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی تقدیر کا اور اللہ کے علم کا بیان ہے، مشرکین کی نابالغ اولاد جونابالغی کی حالت میں مرجائے وہ جنتی ہوگی یا جہنمی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا کہ: اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اگروہ زیادہ حیات پاتے تو کیا عمل کرتے، پس اسی لحاظ سے اللہ ان کے ساتھ معاملہ فرمائیں گے، اس روایت سے ثابت ہوا کہ ہر فرد بشر کا جنتی یا جہنمی ہونا مقدر ہے۔

حکم اطفال مشرکین:

نابالغ اولاد اگرمسلمانوں کی ہوتو وہ ماں باپ کے تابع ہوکر جنت میں داخل ہوگی، یہ متفق علیہ ہے، اور نابالغ اولاد اگر مشرکین کی ہوتو اگراس کے والدین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو بھی وہ اولاد خیرالوالدین کے ضابطہ کے تحت جنت میں جائے گی، البتہ اگروالدین دونوں کے دونوں مشرک وکافر ہوں تو اس میں روایات بہت مختلف ہیں، اس لئے علماء کے بھی مختلف اقوال ہوگئے ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ وہ اہل جنت کے خادم ہوں گے، گویا کہ تبعاً جنتی ہوں گے۔

(۲) بعض نے کہا کہ اصل فطرت کا اعتبار کرتے ہوئے وہ جنت میں جائیں گے گویا اصالۃً جنتی ہوں گے۔

(۳) بعض نے کہا کہ وہ ماں باپ کے تابع ہوکر جہنم میں جائیں گے۔

(۴) بعض نے کہا کہ اس سلسلے میں توقف کرنا چاہئے، جمہور فقہاء ومحدثین اسی کے قائل ہیں اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

(۵) بعض نے کہا کہ ان کا فیصلہ ان کے بارے میں اللہ کے علم کے مطابق ہوگا جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہوا۔

(۶) بعض نے کہا کہ وہ اعراف میں رہیں گے، اعراف جنت وجہنم کے درمیان ایک میدان ہے جو نہ جنت ہے نہ جہنم۔

(۷) بعض نے کہا کہ وہ بہائم کے حکم میں ہوں گے اورمٹی بن جائیں گے۔

(۸) بعض نے کہا کہ ان کا امتحان لیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا کہ جہنم میں جاؤ؛ اس وقت ان میں سے جو اطاعت کریں گے ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا اور جو تابعداری نہیں کریں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔

(۹) بعض نے کہا کہ ان کا فیصلہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہوگا۔(۱)

الله أعلم بما كانوا الخ: اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد مشرکین کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم پر محول کردیا، مذکورہ اقوال میں سے پانچواں قول اسی معنی پر مبنی ہے اور یہی متبادر معنی اس کے اوپر ذکر کئے گئے، لیکن علامہ خطابی نے اس معنی کو وہم کہا ہے اور فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے آباء کے تابع ہوکر کافر ہیں اس لئے جہنمی ہیں، کیونکہ اللہ جانتے ہیں کہ اگر وہ زندہ رہتے اور بڑے ہوتے تو کفر ہی کے کام کرتے۔(۲)

الفصل الثانی

۸۸/۱۶: عَنْ عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِؓ قال قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم "إِنَّ أَوَّلَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمُ، فَقَالَ لَهُ، أُكْتُبْ، قَالَ: مَاأَكْتُبُ؟ قَالَ: أُكْتُبِ الْقَدْرَ فَكَتَبَ مَاكَانَ وَمَاهُوَ كَائِنٌ إِلَى الأَبَدِ" (رواه الترمذی) (۳) وقال: هذا حديث غريب إسناداً.

ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامتؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہ عزوجل نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا فرمایا وہ قلم تھا پھر اس قلم سے کہا کہ لکھ، قلم نے کہا (یا اللہ!) کیا لکھوں؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: تقدیر لکھ، پس قلم نے ان چیزوں کو لکھا جو اب تک ہوچکی ہیں اور ان چیزوں کو لکھا جو آئندہ ہونے والی ہیں، امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

---

(۱) فتح الباری ۳/۳۰۱-۳۰۲، المرقاة ۱/۲۶۸، اللمعات ۱/۳۷۶-۳۷۷.

(۲) بذل المجهود، كتاب السنة، باب ذراري المشركين ۱۳/۱۲۷.

(۳) أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب بدون ترجمة ۲/۳۸ والتفسير، باب من سورة نون ۲/۱۶۹.

تشریح حدیث

قلم؛ اولین تخلیق اور اس بارے میں متعارض احادیث میں تطبیق:

اس حدیث پاک میں قلمِ تقدیر کی تخلیق اور کتابتِ تقدیر کا بیان ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ حق تعالی شانہ نے سب سے پہلے قلمِ تقدیر کو پیدا فرمایا ہے، مخلوقات میں اول کیا چیز ہے؟ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں ایک روایت تو یہی ہے کہ اول مخلوق قلم ہے اور ایک حدیث میں ہے: ''**اول ماخلق الله العقل**'' کہ اللہ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا، اور ایک روایت میں ہے''**اول ماخلق الله نوری**'' کہ اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا، ایک حدیث میں ہے''**ان اول ماخلق روحی**'' اور ایک حدیث میں ہے''**ان اول ماخلق العرش**'' اور بھی بعض چیزوں کے متعلق اول مخلوق کا لفظ وارد ہوا ہے، اول مخلوق ظاہر ہے کہ کوئی ایک شئ ہوگی، پھر متعدد چیزوں کے لئے یہ لفظ بولنا کیوں کر صحیح ہے؟

ملاعلی قاریؒ نے جواب دیا کہ اول کی دو قسمیں ہیں: اول حقیقی اور اول اضافی، اول حقیقی وہ شئ جس کو حقیقۃً وواقعۃً سبقت حاصل ہو کہ اس سے قبل کوئی شئ پیدا نہ کی گئی ہو، اور اول اضافی وہ چیز جس کو حقیقۃ سبقت حاصل نہ ہو البتہ دوسری شئ کی طرف نظر کرتے ہوئے اس کو سبقت حاصل ہو، تخلیق میں اولیت حقیقیہ حاصل ہے نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور باقی چیزوں میں اول سے اول اضافی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ ان اشیاء میں سے ہر شئ اپنی اپنی جنس کے اعتبار سے اول مخلوق ہے، پس قلم جو کہ اشجار کی جنس سے ہے وہ اپنی جنس کے اعتبار سے اول مخلوق ہے اور عقل جو اجسام لطیفہ میں سے ہے وہ اجسام لطیفہ میں اول مخلوق ہے اور عرش جو اجسام کثیفہ میں سے ہے وہ اجسام کثیفہ میں اول مخلوق ہے۔(۱)

ماکان وماهو كائن الى الأبد: اس جملہ کی دو تفسیریں ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ''ماکان'' سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی چیزیں اور''ماهو كائن'' سے مراد آپ کے زمانے اور اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔(۲)

(۲) بعض نے کہا کہ''ماکان'' سے تخلیق قلم سے پہلے کی چیزیں اور''ماهو كائن'' سے تخلیق قلم کے

---

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۶۹ — ۲۷۰.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۲۶۹.

بعد کی چیزیں مراد ہیں، تخلیق قلم سے پہلے ہوا وعرش وغیرہ کو پیدا کیا جاچکا تھا۔(۱)

"الأبــد" یہ مقابل ہے ازل کا، ازل: وہ زمانہ جس کی کوئی ابتداء نہ ہو اور ابد: وہ زمانہ جس کی کوئی انتہاء نہ ہو اور دونوں کو جامع لفظ "سرمد" ہے۔

اس پر اشکال ہے کہ ابد تو غیر متناہی زمانہ کو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں امور بھی غیر متناہی ہوں گے اور غیر متناہی امور کو لکھنا اور ضبط کرنا محال ہے پھر قلم نے ان کو کیسے لکھ دیا؟ جواب یہ ہے کہ غیر متناہی امور کو ضبط کرنا بندوں کے لئے تو محال ہے لیکن اللہ کے لئے آسان ہے، اپنی قدرت کو اللہ کی قدرت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

۸۹ / ۱۷: وَعَنْ مُسْلِمِ بنِ يَسَارٍ، قَالَ : سُئِلَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عَنْ هٰذِهِ الآيَةِ "وَإِذْأَخَذَرَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ"الآية، قَالَ عُمَرُ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُسْأَلُ عَنْهَا فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ، ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَه بِيَمِيْنِه، فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ ذُرِّيَةً، فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلاءِ لِلْجَنَّةِ، وَبِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ يَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ مَسَحَ ظَهْرَهُ فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ، ذُرِّيَّةً، فَقَالَ: خَلَقْتُ هٰؤُلاءِ لِلنَّارِ، وَبِعَمَلِ أهْلِ النَّارِ يَعْمَلُوْنَ، فَقَالَ رَجُلٌ فَفِيْمَ الْعَمَلُ يارسول اللّٰه؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : إِنَّ اللّٰهَ إِذَاخَلَقَ الْعَبْدَ لِلْجَنَّةِ؛ اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِحَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أَعْمَالِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُدْخِلُهُ بِهِ الْجَنَّةَ، وَإِذَا خَلَقَ الْعَبْدَ لِلنَّارِ، اِسْتَعْمَلَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى يَمُوْتَ عَلٰى عَمَلٍ مِنْ أعْمَالِ أَهْلِ النَّارِفَيُدْخِلُهُ بِهِ النَّارَ.(رواه مالک، والترمذی، وابوداود.(۲)

ترجمه: مسلم بن یسارؒ سے مروی ہے کہ: حضرت عمر فاروقؓ سے اس آیت "وَإِذْأَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" (کی تفسیر) کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انہوں نے فرمایا کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ سبحانہ وتعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو

(۱)المرقاۃ ۱ / ۲۶۹.

(۲)أخرجه مالک فی المؤطا. کتاب القدر ص ۳۶۲، وأبوداوٗد، کتاب السنة، باب فی القدر ۲ / ۶۴۷ والترمذی فی کتاب التفسیر، باب من سورة الأعراف ۲ / ۱۳۸.

پیدافرمایا، پھران کی پشت پرداہنا ہاتھ پھیرا اور اس میں سے ان کی اولاد نکالی اور فرمایا میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیا اور یہ لوگ اہل جنت کے ہی اعمال اختیار کریں گے، پھردوبارہ اپنا ہاتھ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت پرپھیرا اوراس میں سے ان کی اولاد نکالی اورفرمایا کہ میں نے ان کوجہنم کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ لوگ جہنمیوں والے اعمال اختیار کریں گے، یہ سن کرایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! پھرعمل کی کیاضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ شانہ کسی بندہ کوجنت کے لئے پیدافرماتے ہیں تو اس سے جنتیوں کے ہی اعمال کراتے ہیں یہاں تک کہ وہ بندہ جنتیوں کے اعمال میں سے کسی عمل پروفات پاتاہے اس کی وجہ سے اللہ اس کو جنت میں داخل فرماتا ہے اورجب کسی بندہ کودوزخ کے لئے پیدافرماتے ہیں تو اس سے دوزخیوں کے سے اعمال کراتے ہیں یہاں تک کہ وہ اہل دوزخ کے اعمال میں سے کسی عمل پرمرجاتاہے اللہ تعالیٰ اُسے ان اعمال کی بناپرجہنم میں ڈال دیتاہے۔ (مؤطامالک، ترمذی، ابوداود)

تشریح حدیث

ذریۃ آدم کا استخراج اوران کی تقدیر طے کئے جانے کا واقعہ:

اس حدیث میں ایک آیت کی تفسیر ہے، اسی کے ضمن میں اس بات کا بیان ہے کہ جنتی جہنمی ہونا مقدرہے، وہ آیت شریفہ یہ ہے: "وَإِذْأَخَذَرَبُّکَ مِنْ بَنِیْ آدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ" (۱) مسلم بن یسار فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے اس آیت کی تفسیر معلوم کی گئی توانہوں نے فرمایا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کاسوال کیا گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا تھاکہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اوراپنا داہنا ہاتھ ان کی پشت پرپھیراتو اس سے ان کی اولادنکلی، ایک دوسری حدیث میں یہ بھی ہے کہ داہنی طرف سے نکلنے والی اولاد کی پیشانیوں پرنورتھا، حق تعالیٰ شانہ نے ان کے متعلق ارشادفرمایا کہ میں نے ان کو جنت کے لئے پیدا کیاہے، پھردوبارہ ان کی پشت پرہاتھ پھیرااس سے بھی ذریت نکلی، لیکن ان پرنورنہیں تھا، ان کے متعلق فرمایا کہ میں نے ان کوجہنم کے لئے پیدا کیاہے، اس پرایک شخص نے سوال کیا اوربعض روایات میں ہے کہ خودحضرت عمرؓ نے سوال کیا کہ "پھرعمل کی کیاضرورت ہے؟ آنحضرت

(۱) من سورۃ الاعراف رقم الآیۃ:۱۷۲۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت وجہنم کی طرح اعمال بھی مقدر ہیں کہ جوشخص اہل جنت میں سے ہوتا ہے وہ اہل جنت کے اعمال میں لگارہتاہے اور اسی پراس کی موت آتی ہے، اسی طرح اہل جہنم کا حال ہے، توگویا کہ اعمال شقی وسعید ہونے کی علامات ہیں اور اعمال اختیار کی چیز ہیں پس اپنے اختیار سے اچھی علامات اوراعمال خیرمیں مصروف ہونا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ آیت مذکورہ اورحدیث کے معنی میں مطابقت نہیں ہے، کیونکہ آیت کامفہوم یہ ہے کہ ذریت کوبنی آدم کی پشت سے نکالا اورحدیث میں یہ ہے کہ ذریت کوآدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا؟

جواب: آیت کریمہ میں آدم علیہ السلام مع اولاد مراد ہیں اورحدیث شریف میں اکتفا کیاگیاہے آدم علیہ السلام پران کے اصل ہونے کی وجہ سے، اورآدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب یہ نہیں کہ تمام انسانوں کو براہ راست آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا گیا بلکہ جس ترتیب سے دنیامیں پیدائش ہوئی ہے اسی ترتیب سے واسطہ درواسطہ نکالا، یعنی آدم علیہ السلام کی صلبی اولاد کوخود آدم علیہ السلام سے نکالا اورپھراولاد آدم سے اولاد کی اولاد کونکالا، اسی طرح آخرتک ہوا، حاصل یہ کہ استخراج ذریت کی دونوں صورتیں ہوئیں بلاواسطہ اور بالواسطہ، ایک صورت کوقرآن مجید میں بیان کیا گیاہے اور اورایک کوحدیث پاک میں۔(۱)

استخراج ذریت کاعمل کہاں ہوا؟:

اس میں متعدداقوال ہیں:(۱)بعض نے کہااستخراج ذریت کاعمل آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ اورطائف کے درمیان ہوا۔

(۲)بعض نے کہا کہ وادی نُعمان جوعرفات کے قریب ہے وہاں یہ عمل ہوا،جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی صراحت ہے،جلالین شریف میں اسی کواختیارکیاہے۔(۲)

(۳)بعض نے کہا کہ استخراج ذریت جنت میں ہوا۔(۳)

---

(۱)المرقاۃ۱/۲۷۱.

(۲)جلالین شریف ۱/۱۴۴،مسند احمد(۲۴۵۵)نصہ هكذا: عن ابن عباس، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اخذالله الميثاق من ظهر آدم بنعمان،"يعني عرفة"فأخرج من صلبه كل ذريته ذرأها، فنثرهم بين يديه كالذر، ثم كلمهم قبلاً، قال: ألست بربكم الآية.

(۳)المرقاۃ ۱/۲۷۲.

(۴) بعض نے کہا کہ جنت سے اتر آنے کے بعد سرزمین ہندسرندیپ میں یہ عمل ہوا۔(۱)

ثم مسح ظهره بيمينه : مسلمان ذریت کے لئے ان کی شرافت کی وجہ سے یمین کا لفظ ذکر فرمایا اورغیر مسلم ذریت میں یہ بات نہیں اس لئے ان کے لئے مطلق ''ید'' بولا گیا۔

قدریہ، معتزلہ اورمرجیہ کی تردید:

استعمله بعمل اهل الجنة :اس سے معلوم ہوا کہ اچھے وبرے سب اعمال من جانب اللہ مقدر ہیں، لہذا اس سے قدریہ ومعتزلہ ہردوفرقوں کی تردید ہوجاتی ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اچھے وبرے اعمال کے لحاظ سے ہی انسان کا انجام متعین ہوگا، پس اس سے مرجیہ کی بھی تردید ہوجاتی ہے جواعمال کو بے فائدہ قراردیتے ہیں۔

۹۰/۱۸: وعن عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمروٌ قال: خَرَجَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَفِيْ يَدَيْهِ كِتَابَان، فَقَالَ: "أَتَدْرُوْنَ مَاهٰذَانِ الْكِتَابَانِ؟" قُلْنَا: لا، يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إلَّاأَنْ تُخْبِرَنَا فَقَالَ لِلَّذِيْ فِيْ يَدِهِ الْيُمْنٰى: هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ، ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ؛ فَلايُزَادُ فِيْهِمْ وَلايُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَداً" ثُمَّ قَالَ لِلَّذِيْ فِيْ شِمَالِهِ: "هٰذَا كِتَابٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ فِيْهِ أَسْمَاءُ أَهْلِ النَّارِ، وَأَسْمَاءُ آبَائِهِمْ وَقَبَائِلِهِمْ، ثُمَّ أُجْمِلَ عَلٰى آخِرِهِمْ، فَلايُزَادُ فِيْهِمْ وَلايُنْقَصُ مِنْهُمْ أَبَداً" فَقَالَ أَصْحَابُهُ: فَفِيْمَ الْعَمَلُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ إِنْ كَانَ أَمْرٌقَدْفُرِغَ مِنْهُ؟ فَقَالَ: "سَدِّدُوا وَقَارِبُوْا؛ فَإِنَّ صَاحِبَ الْجَنَّةِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ، وَإِنَّ صَاحِبَ النَّارِ يُخْتَمُ لَهُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ وَإِنْ عَمِلَ أَيَّ عَمَلٍ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بِيَدَيْهِ فَنَبَذَهُمَا، ثُمَّ قَالَ: فَرَغَ رَبُّكُمْ مِنَ الْعِبَادِ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ" (رواه الترمذی)(۲)

ترجمه : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے حجرہ مبارکہ) سے نکلے اورآپ کے ہاتھوں میں دوکتابیں (رجسٹر) تھیں، آپ علیہ الصلوۃ

(۱) المرقاة ۱/۲۷۲.

(۲) أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب ماجاء ان الله كتب كتابا لأهل الجنة وأهل النار ۲/۳۶.

والسلام نے فرمایا کیاتم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم نہیں جانتے آپ بتائیں تو معلوم ہوگا تو آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اس کتاب کے بارے میں جوآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں ہاتھ میں تھی فرمایا: یہ پروردگارعالم کی طرف سے وہ کتاب ہے جس میں جنتیوں کے نام ، ان کے باپوں کے نام اور ان کے قبیلوں کے نام درج ہیں، اورآخرمیں جوڑکردیا گیا ہے (مجموعی تعداد ذکر کردی گئی) نہ ان میں کسی نام کا کبھی اضافہ ہوگا اورنہ ان میں سے کوئی کبھی کم کیا جائے گا، پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب (رجسٹر) کے بارے میں جوآپ کے بائیں ہاتھ میں تھی فرمایا: اوریہ پروردگارعالم کی کتاب وہ (رجسٹر) ہے جس میں جہنمیوں کے نام، ان کے باپوں کے نام اوران کے قبیلے درج ہیں، اورآخرمیں جوڑکردیا گیا، نہ تو ان میں کبھی کسی نام کا اضافہ ہوگا اورنہ ہی کم ہوگا، (یہ سن کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! اگراس معاملہ سے فراغت ہوچکی ہے تو پھرعمل کی کیاضرورت ہے؟ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: درست عمل کو اختیارکرکے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل کرو کیونکہ جنتی کا خاتمہ جنت والوں کے سے عمل پرہوگا اگرچہ وہ (زندگی بھر) کیسے ہی عمل کرتارہاہو اورجہنمی کا خاتمہ جہنم والوں کے عمل پرہوگا اگرچہ وہ (زندگی بھر) کیسے ہی عمل کرتارہاہو (اس کے بعد) آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے دونوں ہاتھوں کوحرکت دی اوران دونوں (رجسٹروں) کوڈال دیا، پھرفرمایا کہ تمہارارب بندوں (کے متعلقہ فیصلوں) سے فارغ ہوچکاہے، ایک جماعت جنت کے واسطے ہےاورایک جماعت جہنم کے واسطے ہے۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

تقدیر کے دونوشتے:

خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي يديه كتابان : حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے پاس تشریف لائے آپ کے دونوں ہاتھوں میں دوکتابیں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے پوچھا کہ جانتے ہوکہ یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ صحابہ نے لاعلمی ظاہرفرمائی، آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داہنے ہاتھ والی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ: یہ اللہ کی طرف سے ایک کتاب ہے اوراس میں اہل جنت

کے نام ہیں، اوران کے والد کااوران کے قبیلہ کا نام ہے اورآخر میں ٹوٹل کردیا گیاہے، جونام اس میں درج ہوگئے ہیں اس میں نہ کسی ایک شخص کا اضافہ ہوسکتاہے اورنہ اس میں کمی ہوسکتی ہے، یعنی بالکل حتمی فہرست ہے، اسی طرح بائیں ہاتھ میں جوکتاب تھی اس کے بارے میں فرمایا کہ: یہ اہل جہنم کی فہرست ہے مع ولدیت وقبیلہ اوراخیر میں ان کابھی ٹوٹل کردیا گیاہے اوریہ فہرست بھی حتمی ہے، اس پرصحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ جب جنتیوں اورجہنمیوں کی باقاعدہ فہرست بن چکی ہےتو ظاہر ہے کہ ہرگز اس کے خلاف نہ ہوگا، پھرعمل کی کیاضرورت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمل کرتے رہو اور اللہ کاقرب حاصل کرنے کی سعی میں لگے رہو جوجنتی ہوتاہے(شروع میں نہ سہی تو) اخیروقت میں وہ جنت کے اعمال میں لگ جاتاہے اوراس کے نتیجہ میں جنت میں داخل ہوتاہے اورجہنمی کا خاتمہ جہنم کےعمل پرہوتاہے، خواہ زندگی میں کیسے ہی اعمال کئے ہوں، راوی کابیان ہے کہ اس کے بعدحضورصلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ نیچے کرلئے اورفرمایا کہ تمہارا رب اب بندوں کی طرف سے فارغ ہوگیاہے، ایک فریق کے لئے جنت کا فیصلہ فرماچکاہے اورایک فریق کیلئے جہنم کا۔

ماھذان الکتابان: ملاعلی قاریؒ وغیرہ شراح نے فرمایا کہ یہ دونوں کتابیں حسی تھیں اور واقعۃً وحقیقۃً حضورصلی اللہ علیہ وسلم کو اہل جنت وجہنم کی فہرست عطاء کی گئی تھی، حضرات انبیاء کرام سے بطورمعجزہ خرق عادت چیزیں صادرہوتی ہیں پس یہ بھی اسی قبیل کی ایک چیزتھی، اوربعض نے کہا کہ حقیقۃً کوئی کتاب اور فہرست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کونہیں دی گئی تھی بلکہ یہ کلام تمثیلی ہے،حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین کو یہ باورکرایاکہ اللہ نے اہل جنت و اہل جہنم کی فہرست بنادی ہے اورتم یوں سمجھو کہ ان میں سے ایک فہرست میرے داہنے ہاتھ میں ہے اورایک بائیں ہاتھ میں ہے، یہ کلام تمثیلی ہے یا حقیقی اور واقعی فہرست تھی دونوں باتیں ہوسکتی ہیں کوئی استبعادنہیں ۔(۱)

ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بيديه: یہاں ’’قال‘‘ ’’حرک‘‘ کےمعنی میں ہے، کیونکہ ’’قال‘‘ کےمعنی اپنے متعلقات کے اعتبارسے بدلتے رہتے ہیں،قال بیدہ، ہاتھ سے پکڑا، قال برجلہ، پیرسے چلا۔(۲)

(۱)المرقاۃ ۱/ ۲۷۲، واللمعات ۱/ ۳۷۳.

(۲)اللمعات ۱/ ۳۸۶.

فنبذهما: اس ضمیر کامرجع کیا ہے؟ اگر حسی کتابیں تھیں تو مرجع وہ کتابیں ہونگی اور ڈالنے سے مراد ہاتھوں کو اوپر کی طرف حرکت دے کران کو غائب کر دینا ہوگا، اور اگر کتابیں تمثیلی تھیں تو اس وقت مرجع دونوں ہاتھ ہوں گے کہ مثال بیان کرتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے، پھر بعد التمثیل دونوں ہاتھوں کو نیچے یعنی اپنی حالت پر کرلیا۔

سـددوا: تسدید بمعنٰی کسی چیز کو بالکل سیدھا اور درست کرنا یعنی درست اعمال کرتے رہو، افراط و تفریط نہ کرو۔

قـاربوا: اس سے مراد یہ ہے کہ اگر افضل عمل نہ کرسکو تو اس کے قریب عمل کو اختیار کرو، اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد ہے اللہ کا قرب حاصل کرو، اور یہ ''سددوا'' کا ثمرہ ہے کہ اعمال کو درست کرنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوگا۔

زندگی کا محاسبہ کرتے رہئے!

اس حدیث سے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوئی کہ آدمی کو اپنے اعمال واخلاق کی فکر ہونی چاہئے، بالخصوص اخیر عمر میں بہت خیال رکھنا چاہئے اور جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی رہے اعمال میں بھی اضافہ ہونا چاہئے بندہ ہر دن محاسبہ کرے کہ کل کے مقابلہ میں آج میرے اعمال اور نیکیوں میں اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ اگر ترقی دیکھے تو اللہ کا شکر ادا کرے، اور خدانہ کرے اگر تنزلی دیکھے تو خائف ہو اور توبہ واستغفار کرے۔

امام غزالیؒ کی ایک فکر انگیز نصیحت:

امام غزالی کے ایک شاگرد نے ان کو خط لکھا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمائیں، امام غزالیؒ نے فرمایا: بیٹا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں امت کے لئے بہت نصیحتیں موجود ہیں، پس الگ سے کسی نصیحت کی حاجت نہیں، چنانچہ انہوں نے اس خط میں ایک حدیث تحریر فرمائی جس کا مضمون یہ ہے کہ اگر بندہ کی ایک ساعت اور ایک گھڑی بھی اس مقصد کے علاوہ میں صرف ہوجائے جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے تو یہ آدمی کے لئے باعث حسرت ہے اور بندہ کا غیر مفید امور میں مشغول ہونا علامت ہے اس بات کی کہ اللہ نے اس سے نظر عنایت پھیر لی ہے، اور جس شخص کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہوجاوے اور پھر بھی اس کی نیکیاں اس کی برائیوں پر غالب نہ آئیں تو اسے اپنے آپ کو جہنم کے لئے تیار رکھنا چاہئے، انتہی۔

کیونکہ چالیس سال عمر ہوجانے کے بعد اصلاح مشکل ہوتی ہے، پھر عادات پختہ ہوجاتی ہیں لہٰذا محاسبہ کرنا چاہئے کہ آج میری حالت کل کے مقابلے میں بہتر ہوئی یا نہیں، اگر کمی محسوس کرے تو توبہ واستغفار کرے اوراس کی کمی کی تلافی کرے۔

۱۹/۹۱: وَعَنْ أَبِیْ خِزَامَةَ عَنْ أَبِیْهِ،قَالَ: قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَرَأیتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْهَا، وَدَوَاءً نَتَدَاوَی بِهٖ، وَتُقَاةً نَتَّقِیْهَا، هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدْرِاللّٰهِ شَیْئاً؟ قَالَ: هِیَ مِنْ قَدْرِاللّٰهِ"(رواہ احمد، والترمذی، وابن ماجہ)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوخزامہ اپنے والد محترم (حضرت یعمرؓ) سے نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے (والد محترم نے) عرض کیا: یارسول اللہ! بتایئے کہ وہ جھاڑ پھونک جو ہم کراتے ہیں، وہ دوا، جس کے ذریعہ ہم علاج کرتے ہیں اوروہ حفاظتی چیز (ڈھال وزرہ وغیرہ) جس کے ذریعہ ہم اپنا بچاؤ کرتے ہیں کیا یہ چیزیں تقدیر الٰہی کو ٹال دیتی ہیں؟ حضورصلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ چیزیں تقدیرالٰہی میں شامل ہیں۔(احمد وترمذی وابن ماجہ)

تشریح حدیث

احوال:ابوخزامہؓ:

ابوخزامہ(بکسرالخاء المعجمۃ) کنیت ہے بعض نے کہا کہ ان کا نام زید ہے، ان کے والد کا نام **یَعْمر** ہے، قبیلہ بنوسعد کے تھے، اس لئے السعدی کہلائے ہیں، بعض نے ان کو صحابی کہا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تابعی ہیں، ہاں ان کے والد یَعْمَر صحابی ہیں۔(۲)

علاج اوراس سے شفاء بھی مقدر من اللہ:

ابوخزامہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ کوئی وظیفہ یاورد جس کے ذریعہ ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں یادوا جس سے علاج کرتے ہیں یابچاؤ کی چیزیں

(۱)أخرجه أحمد فی مسنده۳/ ۴۲۱ برقم ۱۵۵۱۰، ۱۵۵۱۱، ۱۵۵۱۲، ۱۵۵۱۳، والترمذي،فی کتاب الطب، باب ماجاء فی الرقی والأدویة ۲/ ۲۷، والقدر، باب ماجاء لاترد الرقی والدواء من قدرالله شیئاً ۲/ ۳۶ برقم ۳۱۴۸ وابن ماجه فی المقدمه، کتاب السنة، باب فی القدر ۱/ ۹.

(۲)التقریب(۸۰۷۷)الإصابة ۶/ ۷۲،۵/ ۵۰۰.

(ڈھال وغیرہ) جن سے بچاؤ اختیار کرتے ہیں کیا یہ چیزیں تقدیر کو ٹال سکتی ہیں؟ مقصد یہ تھا کہ اگر نہیں ٹال سکتیں تو ان کا اختیار کرنا بے کار اور لغو ہے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ چیزیں بھی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں، یعنی مثلاً جس طرح بیمار ہونا مقدر میں لکھا ہے اسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ یہ شخص علاج کرائے گا یا نہیں؟ اس علاج سے فائدہ ہوگا یا نہیں ہوگا؟ اسی طرح جھاڑ پھونک کے ذریعے بیماری دور ہوگی یا نہیں، علی ہذا القیاس، پس جس کے مقدر میں ان کے اختیار کرنے سے شفاء لکھی ہوتی ہے اس کو شفاء ہو جاتی ہے اور جس کے مقدر میں شفاء نہیں لکھی ہوتی ہے اس کو شفاء نہیں ہوتی ہے، لہذا ان کا اختیار کرنا بے سود نہیں ہے، پس جس طرح تقدیر کے بھروسہ اعمال کا ترک مناسب نہیں اسی طرح اسباب کا ترک بھی مناسب نہیں۔

رقی نسترقیها: "رقی" "رقیۃ" کی جمع ہے، جیسے "ظلم" "ظلمۃ" کی جمع ہے بمعنی منتر۔

جھاڑ پھونک کا حکمِ شرعی:

اس جملہ سے جھاڑ پھونک کا جواز معلوم ہوتا ہے چنانچہ جھاڑ پھونک چند شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

(۱) جھاڑ پھونک کے الفاظ صحیح ہوں، (۲) ان الفاظ کے معانی معلوم ہوں اس لئے کہ اگر ان الفاظ کے معنی معلوم نہ ہوں تو یہ احتمال ہے کہ ان کے معنی کفر و شرک کے بنتے ہوں، (۳) تعویذ کو موثر بالذات نہ سمجھے بلکہ صرف سبب کے درجہ میں جانے، (۴) تعویذ کا مقصد جائز ومباح ہو، [1] تفصیل آگے آئے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

تقاۃ نتقیها: "تقاۃ" اصل میں "وقاۃ" تھا، تعلیل کے بعد "تقاۃ" ہوگیا، بمعنی آلۂ حفاظت جیسے ڈھال، زرہ وغیرہ۔

۹۲ / ۲۰: وَعَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ: خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی الْقَدْرِ، فَغَضِبَ حَتّٰی احْمَرَّ وَجْهُهٗ، حَتّٰی کَأَنَّمَا فُقِئَ فِیْ وَجْنَتَیْهِ حَبُّ الرُّمَّانِ، فَقَالَ: أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ؟ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَیْکُمْ؟! إِنَّمَا هَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ حِیْنَ تَنَازَعُوْا فِیْ هٰذَا الْأَمْرِ، عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ، عَزَمْتُ عَلَیْکُمْ أَنْ لَاتَنَازَعُوْا

(۱) شامی زکریا ۹ / ۵۲۳.

فِيْهِ.(رواه الترمذی)[1] وروی ابن ماجه [2] نحوه عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: (ایک مرتبہ) حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے حال یہ کہ ہم تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ کررہے تھے (یہ دیکھ کر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا جیسے انار کا دانہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں میں نچوڑ دیا گیا ہو، اور فرمایا کیا تمھیں اسی بات پر مامور کیا گیا ہے؟ اور کیا میں تمھارے درمیان اسی لئے مبعوث کیا گیا ہوں؟ سوائے اس کے نہیں کہ تم سے پہلے (بعض امتوں کے لوگ) اسی وقت ہلاک ہوئے جبکہ وہ اس معاملہ میں بحث ومباحثہ کرنے لگے تھے، میں تم کو عہد دیتا ہوں کہ آئندہ پھر کبھی اس مسئلہ میں بحث ومباحثہ مت کرنا، (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اسی طرح کی روایت اس سند سے نقل فرمائی ہے: عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده.

تشریح حدیث

مسئلہ تقدیر میں عقل لڑانے کی ممانعت:

خرج علینا رسول الله صلی الله علیه وسلم الخ: ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کررہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے، ہماری یہ حالت دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت غصہ آیا حتی کہ چہرہ مبارک سرخ ہوگیا ایسا محسوس ہورہا تھا گویا انار کا دانہ رخساروں پر نچوڑ دیا گیا، اور فرمایا کہ کیا اسی کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لئے میں بھیجا گیا ہوں؟ اور فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے، لہٰذا میں عہد دیتا ہوں کہ تم اس میں بحث نہ کرو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ تقدیر کا مسئلہ بہت دقیق بلکہ ادق ہے، کوئی بھی انسان اس کی کنہ تک نہیں پہنچ

(۱) أخرجه الترمذی فی "القدر" باب ماجاء من التشدید فی الخوض فی القدر ۲/ ۳۴.

(۲) أخرجه ابن ماجه في المقدمة ۱/ ۹.

سکتا، اسی لئے ''سلامتی بر کنار است'' پر عمل ہو اور اس بارے میں زیادہ کھود کرید کی کوشش نہو، جو کچھ تقدیر کے سلسلہ میں احادیث میں آ گیا ہے اس کو تسلیم کیا جائے، اگر اس مسئلہ کو محض عقل کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو سابقہ امم کی طرح گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہو گا۔

''عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده'' اس سند کا حل اور درجہ:

یہ ترمذی کی روایت ہے اور ابن ماجہ نے اس کو دوسری سند سے ذکر کیا ہے، وہ سند یہ ہے: **عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده الخ** کتب حدیث میں اس سند کی روایات کثرت سے آئی ہیں، البتہ حضرات شیخین نے بخاری و مسلم میں اس سند کی روایات کو نہیں لیا ہے، اس سند کا حکم کیا ہے؟ اس کو سمجھنا ہے، اس کے راویوں کا مکمل سلسلہ اس طرح ہے: **عمرو بن شعیب بن محمد بن عبدالله بن عمرو بن عاص**، اور اس کی مختصر تعبیر ہے: **عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده**، اس میں **عن ابیه** اور **عن جده** دونوں جگہ ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ اور اب اور جد کا مصداق کیا ہے؟ یہ قابل غور ہے، یہ تو متعین ہے کہ '' **ابیه** '' کی ضمیر عمرو کی طرف راجع ہے اور ''اب'' کا مصداق شعیب ہیں، اور ترجمہ یہ ہے: عمرو نقل کرتے ہیں اپنے باپ یعنی شعیب سے، لیکن **عن جده** میں اختلاف ہے کہ اس کی ضمیر بھی عمرو کی طرف راجع ہے یا شعیب کی طرف؟ اس میں دونوں قول ہیں:

(۱) **عن جده** کی ضمیر کا مرجع اگر عمرو ہو تو جد سے مراد محمد ہوں گے یعنی عمرو بن شعیب نقل کرتے ہیں اپنے والد شعیب سے اور شعیب نقل کرتے ہیں عمرو کے دادا محمد بن عبداللہ بن عمرو سے، اور محمد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں، حالانکہ محمد صحابی نہیں، بلکہ تابعی ہیں گویا کہ تابعی کے بعد یہاں کوئی راوی ساقط ہے، پس اس سند کی حدیث کو مرسل کہا جائے گا اور شیخین نے صحیحین میں مرسل روایات کو نہیں لیا ہے، لیکن یہ احتمال مرجوح ہے۔

(۲) **عن جده** کی ضمیر کا مرجع شعیب ہوں اور جد سے مراد عبداللہ بن عمرو صحابی ہوں، یعنی عمرو بن شعیب نقل کرتے ہیں اپنے والد شعیب سے اور وہ نقل کرتے ہیں اپنے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی سے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے، اس صورت میں صحابی رسول کا واسطہ مذکور ہونے کی وجہ سے یہ سند متصل ہوگی، کیونکہ عبداللہ بن عمرو صحابی ہیں۔

(۳) ایک تیسرا قول اس بارے میں اور موجود ہے، وہ یہ کہ بعض محدثین جیسے ابن حبان ابن عدی اور یحیٰ القطان نے اس سند کو بھی منقطع کہا ہے کیونکہ شعیب کے استاذ ان کے والد محمد ہیں نہ کہ عبداللہ، لیکن وہ ان کو ذکر نہ کرکے اپنے دادا عبداللہ کی طرف نسبت کرتے ہیں پس یہ سند منقطع ہوئی، اس لئے ابن حبان اور ابن عدی اس سند کو حجت نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ یہ سند ایک صورت میں مرسل اور ایک صورت میں منقطع ہے۔

لیکن اکثر محدثین جیسے حضرت امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی، امام بخاری اور امام نووی اس سند کو حجت مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جدہ کی ضمیر شعیب کی طرف راجع ہے اور شعیب کا اپنے دادا عبداللہ بن عمرو سے سماع ثابت ہے، امام ترمذی نے جامع ترمذی باب ماجاء فی زکوۃ مال الیتیم میں ثبوت سماع کی تصریح کی ہے، وہ فرماتے ہیں: **وشعیب قد سمع من جدہ عبداللہ بن عمرو** ، نیز حافظ ذہبی اور بہت سے محدثین نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ شعیب کے استاذ ان کے والد محمد نہیں، بلکہ ان کے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی ہیں، کیونکہ شعیب کے بچپن میں ان کے والد محمد کا انتقال ہوگیا تھا اور شعیب کی تربیت ان کے دادا عبداللہ بن عمرو صحابی نے کی ہے، انھوں نے ہی ان کو علم سکھایا ہے، پس درمیان میں کوئی راوی ساقط نہیں ہے اور یہ سند متصل ہے، یہی بات راجح ہے، اس لئے کہ حدیث کی بہت سی کتابوں میں کمافی ابی داؤد والنسائی سند ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: **عن عبداللہ بن عمرو عن أبیہ عن جدہ عبداللہ بن عمرو** ، الغرض عندالجمہور یہ سند متصل اور معتبر ہے۔

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ سند متصل ہے تو پھر شیخین اپنی صحیحین میں اس سند کی روایات کیوں نہیں لیتے؟

اس کے دو جواب ہیں، (۱) اگر چہ راجح یہی ہے کہ جد سے مراد عبداللہ بن عمرو ہیں لیکن دوسرا بھی احتمال ہے، اس وجہ سے شیخین نے اس سند کو نہیں لیا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو کے پاس احادیث کا ایک صحیفہ تھا جس کا نام انھوں نے ''صحیفۂ صادقہ'' رکھا تھا، ان کے پاس سے یہ صحیفہ ان کے ورثہ میں منتقل ہوتا رہا، حتی کہ وہ صحیفہ شعیب کے پاس آیا، شعیب روایات کو بسا اوقات استاذ سے نقل کرنے کے بجائے اس صحیفہ سے نقل کرتے تھے، صحیفہ سے نقل کرنے کو محدثین کے یہاں روایت بطریقہ ''وِجادہ'' کہا جاتا ہے، جو انقطاع کے حکم میں ہے، اس لئے حضرات شیخین

نے صحیحین میں اس سند سے روایات کی تخریج نہیں فرمائی، لیکن چونکہ ائمہ فن نے ثبوت سماع کی صراحت کی ہے تو انقطاع نہیں رہا، اسی لئے جمہور اس سند کو حجت اور معتبر مانتے ہیں، گو شیخین نے صحیحین میں اس سند کو قبول نہ کیا ہو۔(۱)

۹۳ / ۲۱: وَعَنْ أَبِي مُوسىٰؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قُبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيْعِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ بَنُوْ آدَمَ عَلٰى قَدْرِ الْأَرْضِ، مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ وَالْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ وَبَيْنَ ذٰلِكَ، وَالسَّهْلُ وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ"(رواه احمد والترمذی وأبو داود)(۲)

ترجمه: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا فرمایا جس کو تمام زمین سے جمع کیا تھا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد زمین کے مطابق پیدا ہوئی کہ ان میں سے کچھ سرخ ہیں، کچھ سفید ہیں اور کچھ سیاہ ہیں اور کچھ ان کے درمیان یعنی سانولے ہیں، اسی طرح ان میں سے کچھ نرم طبیعت ہیں اور کچھ سخت طبیعت والے ہیں اور اسی طرح کچھ اخلاق حسنہ والے ہیں اور کچھ اخلاق رذیلہ والے ہیں۔(احمد، ترمذی، ابوداود)

تشریح حدیث

الوان وطبائع کا اختلاف بھی مقدر من اللہ:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ انسانوں میں الوان وطبائع کا اختلاف بھی تقدیر کے ماتحت ہے، حدیث کا مضمون یہ ہیکہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا جو تمام روئے زمین سے لی گئی تھی، اور چونکہ مٹی مختلف طرح کی ہوتی ہے اس لئے انسان بھی مختلف طبیعتوں اور رنگوں کے پیدا ہوئے۔

(۱) المرقاة ۱ / ۲۷۸.

(۲) أخرجه أبو داؤد فی السنة، باب فی القدر ۲ / ۶۴۴، والترمذی فی التفسير، باب من سورة البقرة ۲ / ۱۲۴ واحمد ٤ / ٤٠٠ برقم ١٩٥٩٧ و ١٩٥٩٨ و ٤ / ٤٠٦، برقم ١٩٦٥٩.

مــن جـمـیـع الأرض : اس سے زمین کے وہ مقامات مراد ہیں جن پر لوگ بستے ہیں، زمین کی مٹی مختلف صفات کی ہوتی ہے، سفید، سیاہ، سرخ اور ان کے بین بین ، باطنی اوصاف کے لحاظ سے بھی مٹی کئی طرح کی ہوتی ہے، کسی جگہ کی مٹی نرم کہیں کی سخت کہیں کی پاک اور کہیں کی ناپاک، آدم علیہ السلام کے خمیر میں ہر قسم کی مٹی شامل تھی، اس لئے یہ خاکی صفات آدم علیہ السلام میں اور پھر ان کی اولاد میں منتقل ہوئیں، جس شخص میں جس قسم کی مٹی کا غلبہ ہوا اسی کی صفت اس شخص میں نمایاں ہوئی، اسی لئے بعض اشخاص کا رنگ سفید ہوتا ہے اور بعض کا سیاہ، اور بعض میں دوطرح کے رنگ کی آمیزش ہوتی ہے، اسی طرح بعض کی طبیعت میں نرمی ہوتی ہے اور بعض میں سختی نیز بعض اچھی طبیعت کے ہوتے ہیں اور بعض بری طبیعت کے، گویا الوان وطبائع کا یہ اختلاف تقدیر کے ماتحت ہے۔(۱)

السهــل: نرم زمین، اس سے مراد ہے نرم طبیعت کے لوگ ، الــحــزن: سخت زمین اس سے سخت طبیعت کے لوگ مراد ہیں، الـخبیث، رائحہ کریہہ والی چیز، اس سے مراد ہے شریر کافر، الـطیب، رائحہ طیبہ والی چیز، اس سے مراد خیر وصلاح والا مومن ہے، الوان میں تین رنگ اصل ہیں: احمر، ابیض اور اسود، باقی رنگ مثلاً سانولا پن وغیرہ ان الوان ثلث کی آمیزش سے بنتے ہیں، جس کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بین ذالک سے اشارہ فرمایا ہے۔

۹٤ / ۲۲: وَعَـنْ عَبدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: ’’سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسـلـم يَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهُ فِيْ ظُلْمَةٍ، فَأَلقىٰ عَلَيْهِم مِنْ نُوْرِهٖ، فَمَنْ أَصَابَهُ، مِنْ ذٰلِکَ النُّوْرِ اهْتَدَى، وَمَنْ أَخْطَأَهُ ضَلَّ ،فَلِذٰلِکَ أَقُوْلُ: جَفَّ الْقَلَمُ عَلىٰ عِلْمِ اللّٰهِ‘‘(رواه أحمد والترمذی)(۲)

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمادیا اور پھر اس پر اپنا کچھ نور ڈالا چنانچہ جس کو اس نور میں سے کچھ مل گیا وہ راہ یاب ہوگیا اور جو اس نور سے علیحدہ رہا وہ

(۱) المرقاة ۱ / ۲۷۹، واللمعات ۱ / ۳۸۹.

(۲) أخرجه الترمذی فی الإیمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة ۲ / ۹۳، وأحمد ۲ / ۱۷٦ برقم ٦٦٤٤ و۲ / ۱۹۷ برقم ٦٨٥٤.

گم ہوگیا، اس لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قلم اللہ کے علم پر خشک ہوگیا (یعنی جس کو جو کچھ پیش آنا ہے وہ اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے، اب اس میں تغیر وتبدل ممکن نہیں ہے) (احمد، ترمذی)

تشریح حدیث

تخلیق انسانی کی کیفیت اوراس کے اثرات:

یہاں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ انسان کا ہدایت یافتہ ہونا اور گمراہ ہونا من جانب اللہ مقدر اور طے شدہ ہے، اسی کے لحاظ سے انسانی دنیا میں ہدایت یا گمراہی پر رہتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: کہ اللہ نے اپنی مخلوق جن وانس کو اریکی میں پیدا فرمایا، پھر ان پر اپنا نور ڈالا وہ نور جس کو حاصل ہوا وہ دنیا میں ہدایت یافتہ ہوا اور جس کو وہ نور حاصل نہ ہوسکا وہ دنیا میں آکر گمراہ ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ قلمِ تقدیر لوگوں کی تقدیر لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔

نور وظلمت کی مراد:

نور اور ظلمت سے کیا مراد ہے اس میں تین قول ہیں:

(۱) علامہ طیبی نے کہا کہ ظلمت سے مراد انسان کی نفسانی خواہشات اور قوت بہیمیہ ہے جس کا مادہ ہر شخص کے اندر رکھا گیا ہے اور نور سے مراد ہے: قوت عقلیہ اور قوت ملکیہ، پس مطلب یہ ہوا کہ انسان نفسانی خواہشات اور بہیمانہ صفات کے ساتھ پیدا ہوا، لیکن اس کے ساتھ اس کو عقل وشعور بھی عطاء کیا گیا، پس جو عقل وشعور کو صحیح استعمال میں لاتا ہے وہ راہ یاب ہوجاتا ہے اور جو اس کو صحیح استعمال نہیں کرتا وہ نفسانی خواہشات سے مغلوب ہوکر گمراہ ہوجاتا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ ظلمت سے مراد جہالت اور نور سے مراد اللہ کی معرفت ہے، جس شخص کو معرفت کا کچھ حصہ حاصل ہوا وہ دنیا میں راہ یاب ہوا، اور جو اس نور معرفت سے محروم رہا وہ گمراہ ہوگیا۔(۱)

(۳) ظلمت سے مراد اخلاق ذمیمہ: حرص، حسد اور کبر وغیرہ ہیں اور نور سے مراد: ہدایت اور اخلاقِ رذیلہ کو دور کرنے کی توفیق ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ جس انسان کو اخلاق رذیلہ دور کرنے کی توفیق مل جاتی ہے

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۲۷۶.

وہ راہ یاب ہوجاتا ہے، اور جس کو یہ توفیق نہیں ملتی وہ گمراہ ہوجاتا ہے۔(۱)

اشکال: اس حدیث کے مطابق انسان کو ظلمت میں پیدا کیا گیا حالانکہ دوسری حدیث میں ہے: ''مامن مولود إلا یولد علی الفطرۃ'' دونوں حدیثوں کے مضمون میں تعارض ہے، کیونکہ فطرت سے مراد نور اسلام ہے، اور ظلمت اور نور میں تعارض ظاہر ہے؟

جواب: ظلمت سے نفس امارہ کی تاریکی اور فطرت سے قبول حق کی استعداد مراد ہے اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اللہ نے انسان کے اندر نفس امارہ کے ساتھ قبول حق کی استعداد پیدا فرمائی ہے، انسان روحانیت ونفسانیت دونوں سے مرکب ہے، پس جو شخص فطری صلاحیت کو کام میں لاکر نفس امارہ کو مغلوب کرتا ہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔(۲)

۹۵ / ۲۳: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یُکْثِرُأَنْ یَقُوْلَ: ''یَامُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ! ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ'' فَقُلْتُ: یَانَبِیَّ اللّٰہِ!آمَنَّابِکَ وَبِمَا جِئْتَ بِہٖ، فَھَلْ تَخَافُ عَلَیْنَا؟ قَالَ: نَعَمْ،إِنَّ الْقُلُوْبَ بَیْنَ اِصْبَعَیْنَ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰہِ، یُقَلِّبُھَا کَیْفَ یَشَاءُ'' (رواہ الترمذی وابن ماجہ)(۳)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت یہ دعاء فرمایا کرتے تھے کہ اے دلوں کے پھیرنے والے (پروردگار) میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ چنانچہ میں نے (ایک دن) عرض کیا کہ: اے اللہ کے نبی! ہم آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان لاچکے ہیں تو کیا (اس کے بعد بھی) آپ کو ہمارے بارے میں (گمراہی کا) خوف وخدشہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں دراصل (بندوں کے) قلوب اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں، وہ جس طرح چاہتے ہیں ان کو الٹتے پلٹے ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۸۰۔

(۲)المرقاۃ ۱ / ۲۸۰.

(۱)أخرجہ الترمذی فی الإیمان القدر، باب ماجاء أن القلوب بین اصبعی الرحمن ۲ / ۳۶ وابن ماجہ، کتاب الدعاء، باب دعاء الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ۲ / ۲۷۲.

تشریح حدیث

ہدایت وضلالت کا مقدر من اللہ ہونا اور ہدایت پر ثابت قدمی کی ایک دعا:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ لوگوں کے قلوب اللہ کے قبضہ وقدرت میں ہیں، وہ جب چاہے انکو ہدایت یا ضلالت کی جانب پھیر سکتا ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کثرت سے مانگا کرتے تھے، ''یامقلب القلوب ثبت قلبي علی دینک''
حضرت انسؓ جانتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعا فرمانا امت کی تعلیم کے لئے تھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں اور آئندہ کے خطرات سے محفوظ ہیں، اس لئے حضرت انسؓ نے امت کے حوالہ سے دریافت کیا کہ ہم آپ پر اور آپ کی شریعت پر ایمان لا چکے ہیں، کیا آپ پر ایمان لانے کے بعد بھی آپ کو ہماری گمراہی کا خوف ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! کیونکہ بندوں کے قلوب اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان میں ہیں وہ ان کو جس طرح چاہے پھیر دیتا ہے اس لئے ہمہ وقت یہ دعا کرتے رہنا چاہئے۔
بین اصبعین: علامہ ابن العربی نے فرمایا کہ بندوں کے قلوب پر اللہ کا کامل قبضہ وقدرت ہے اس کو حسی مثال سے سمجھانے کے مقصد سے ''بین اصبعین'' کی تعبیر اختیار کی گئی کہ جس طرح انسان کی انگلیوں کے درمیان جو چیز ہوتی ہے اس میں تصرف کرنا انسان کے لئے آسان ہوتا ہے، اسی طرح اللہ رب العالمین کے لئے بندوں کے قلوب میں کامل تصرف کرنا آسان ہے۔(۱)

روایت کے الفاظ کے فرق کی وضاحت

من اصابع الله: اسی نوع کی روایت ماقبل میں بھی آئی البتہ اس میں من اصابع الرحمن کا لفظ تھا اور یہاں من اصابع اللہ کے الفاظ ہیں، الفاظ کا فرق اسلئے ہے کہ ماقبل کی روایت میں یہ مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے از خود بیان کیا، کوئی سوال اس کا باعث نہیں ہوا، اور حسب تصریح حدیث ''إن رحمتي سبقت غضبي'' اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے، اس لئے اس مضمون کی ادائیگی میں ''من اصابع الرحمن'' کے الفاظ تکلم فرمائے، زیر نظر روایت میں نوعیت جدا ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل ایک دعا ''یامقلب القلوب ثبت قلبي علی دینک'' صحابہؓ کے سامنے پڑھی، اس دعا کو سن کر حضرات صحابہؓ پر خوف طاری ہوا، اور ان کو اپنے اوپر خطرہ محسوس ہوا، اس کا استفسار انہوں نے

(۱) تحفة الأحوذي (۲۱٤۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سلسلہ میں صحابہؓ کے اس خوف اور فکر کو صحیح قرار دیا اور اس خوف کی تائید کرتے ہوئے مذکورہ مضمون ارشاد فرمایا، تائید خوف کی وجہ سے یہ مقام مقام ہیبت وجلال ہے اس لئے یہاں اسم جلالہ ''من اصابع الله'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔(۱)

٩٦ / ٢٤: وَعَنْ أَبِيْ مُوْسَى قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثَلُ الْقَلْبِ كَرِيْشَةٍ بِأَرْضِ فَلاةٍ يُقَلِّبُهَا الرِّيَاحُ ظَهْراً لِبَطْنٍ. (رواہ احمد)(۲)

ترجمه: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دل کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پَر کھلے میدان میں پڑا ہو جس کو ہوائیں اوپر نیچے الٹ پلٹ کر رہی ہوں۔(احمد)

تشریح حدیث

قلوب کے اللہ کے قبضہ میں ہونے کی ایک تمثیل:

اس حدیث میں بھی یہی بیان کیا گیا کہ لوگوں کے قلوب اللہ کے قبضے میں ہوتے ہیں جن کو وہ جب چاہے ہدایت یا ضلالت کی جانب پھیر سکتا ہے، قلب کی اس ناپائیدار کیفیت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حسی مثال سے سمجھایا کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی پَر ہو جو چٹیل میدان میں پڑا ہو، اور ہوا چل رہی ہو تو ہوا اس پر کو کبھی ادھر لے جاتی ہے اور کبھی ادھر، یہ پَر اس ہوا کے سامنے بے بس وبے سہارا اس کے اشارہ پر الٹتا پلٹتا رہتا ہے، اسی طرح قلوب اللہ کے سامنے بے بس وبے سہارا ہوتے ہیں، اللہ جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے، خیر سے شر کی طرف اور شر سے خیر کی طرف جب اور جیسے چاہے پھیر دیتا ہے۔

فلاة: ''ارض'' کی صفت ہے، بمعنی چٹیل میدان، **فلوات** اس کی جمع ہے، **ظهراً**: اوپر والا حصہ، **بطن**: نیچے والا حصہ اور ''لبطن'' میں ل بمعنی الی ہے جیسے مُنَادِياً يُّنَادِيْ لِلْإِيْمَانِ میں لام الی کے معنی میں ہے۔(۳)

(۱) المرقاة ج ۱ ص ۲۸۱.

(۲) أخرجه احمد ٤ / ٤٠٨ برقم ١٦٩٧٧.

(۳) المرقاة ۱ / ۲۸۳.

۹۷ / ۲۵ وَعَنْ عَلِیٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لایُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُؤْمِنَ بِأَرْبَعٍ یَشْھَدُ أَنْ لاإِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَأَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ، وَیُؤْمِنُ بِالْمَوْتِ، والبعث بعد الموتِ وَیُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ"(رواہ الترمذی، وابن ماجہ)(۱)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے: (۱) اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ گواہی دے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھ کو حق (دین اسلام) لیکر بھیجا ہے، (۲) موت پر ایمان لائے (۳) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لائے، (۴) تقدیر پر ایمان لائے، (ترمذی، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

چار باتوں پر ایمان کا حکم:

اس حدیث پاک میں چار باتوں پر ایمان لانے کا مطالبہ فرمایا اور بتایا کہ ان امور پر ایمان کے بغیر بندہ مؤمن شمار نہیں ہوگا: (۱) اللہ کی الوہیت اور وحدانیت پر ایمان لانا، یعنی اللہ کے معبود ہونے کو تسلیم کرے اور اس کو ایک مانے، (۲) اس بات پر ایمان لائے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے (۳) موت پر ایمان لائے، اور موت کے بعد پھر زندہ ہونے پر ایمان لائے۔

موت پر ایمان لانے کا مطلب:

سوال یہ ہے کہ موت پر ہر آدمی کا یقین ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں، پھر موت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مقصد یہ ہے کہ موت وحیات کو اللہ کے قبضے میں جانے کہ وہ جب تک چاہتا ہے بندہ کو زندہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے مار دیتا ہے، فلاسفہ کی طرح فساد مزاج کو موت کی علت نہ سمجھے، فساد مزاج موت کا سبب تو ہوسکتا ہے لیکن علت نہیں، اس لئے کہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا

(۱) أخرجہ الترمذی فی کتاب القدر، باب ماجاء فی الإیمان بالقدر خیرہ وشرہ ۲/ ۳۶ وابن ماجہ فی القدر، باب فی القدر ۱/ ۹.

اچانک انتقال ہوتا ہے کسی طرح کا فسادِ مزاج نہیں ہوتا، اور بہت سے لوگ سخت بیمار ہوجاتے ہیں ان میں فساد مزاج ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ عرصہ تک زندہ رہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ موت کا وقوع یا عدم وقوع دراصل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، پس اس پر ایمان رکھا جائے۔

(۴) اور تقدیر پر ایمان لائے، یہی جملہ باب کے مناسب ہے، اس کی وجہ سے یہ حدیث یہاں ذکر کی گئی۔

۹۸ / ۲۶ وعن ابن عباسؓ قال: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "صِنۡفَانِ مِنۡ أُمَّتِيۡ لَيۡسَ لَهُمَا فِي الۡإِسۡلَامِ نَصِيۡبٌ: الۡمُرۡجِئَةُ وَالۡقَدَرِيَّةُ" (رواه الترمذى وقال هذا حديث غريب) (۱)

ترجمہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری امت میں دو فرقے ایسے ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے: (۱) مرجئہ (۲) قدریہ، امام ترمذی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

تشریح حدیث

فرقۂ مرجئہ وقدریہ کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں:

اس حدیث میں اور آگے چند احادیث میں تقدیر کی تکذیب کرنے والوں کے لئے وعید بیان کی گئی ہے، فرمایا کہ میری امت میں دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے: مرجئہ اور قدریہ، علامہ طیبی نے کہا کہ مرجئہ سے مراد "فرقۂ جبریہ" ہے، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے اور سب اعمال تقدیر کے موافق وقوع پذیر ہوتے ہیں، اس لئے دخول جنت کے لئے صرف ایمان کافی ہے، اعمال کی ضرورت نہیں، اعمال تو بندہ سے اللہ ہی کراتا ہے۔ (۲)

کیا یہ فرقے کافر ہیں؟

ليس لهما فی الاسلام نصيب: جب اسلام میں ان کا کوئی حصہ نہیں تو کیا یہ کافر ہیں؟ علامہ تورپشتیؒ

(۱) أخرجه الترمذي في ابواب القدر، باب ماجاء فی القدرية ۲ / ۳۶۔

(۲) شرح المشكاة للطيبی ۱ / ۲۸۱۔

نے فرمایا کہ اس جیسی احادیث کی بناپر بعض علماء نے ان کودائرہ اسلام سے خارج اور کافر کہاہے لیکن جمہورعلماء اور محققین ان پر کفر کا حکم نہیں لگاتے، بلکہ بدعتی ہونے کا حکم لگاتے ہیں،جیسا کہ ''من امتی'' کے لفظ سے بھی ان کا اہل اسلام سے ہونا معلوم ہوتاہے، ملاعلی قاریؒ نے ابن حجر مکی کے حوالہ سے لکھاہے کہ سلف صالحین ان کوکافرنہیں کہتے تھے، بلکہ ان کے ساتھ مسلمانوں جیسابرتاؤ کرتے تھے، ان کے اندر شادی بیاہ کرتے تھے، ان کی نماز جنازہ پڑھتے تھے، ان کی تدفین مسلمانوں کے قبرستان میں کرتے تھے، اس لئے کہ انھوں نے تقدیر کا انکارتاویل کے ساتھ کیاہے، ان کا مقصد کفراختیار کرنانہیں ہے، انھوں نے حق کوتلاش کرنے کے لئے اجتہاد کیا جس میں ان سے خطاہوئی، اس کی وجہ سے وہ فاسق اورگنہ گار قرار پائے اوراجتہادی خطااس وقت معاف ہوتی ہے جب اجتہاد مسائل فرعیہ میں ہو، ان لوگوں نے مسائل اعتقادیہ میں اجتہاد کیاجواجتہاد کا محل نہیں ہیں، ان میں اجتہاد قابلِ مواخذہ ہے۔(۱)

سوال ہوگا کہ جب ان پر کفر کا حکم نہیں ہے تو حدیث کا کیاجواب ہوگا؟ حدیث میں توصراحۃ کہا گیاہے کہ اسلام میں ان کا کوئی حصہ نہیں؟اس کے دوجواب ہیں:

(۱) نصیب سے مرادنصیب کامل ہے کہ اسلام میں ان کا کامل حصہ نہیں ہے، چنانچہ ایک حدیث میں جوامام ابونعیم نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہےاس میں ان کے بارے میں یہ الفاظ مروی ہیں: **صنفان من امتي لاتنالهم شفاعتي يوم القيامة: المرجئةُ والقدريةُ** (الحلية) اس سے واضح ہے کہ **ليس لهما نصيب في الاسلام**، کامقصود انکوکلی طور پر اسلام سے خارج قرار دینانہیں ہے، بلکہ کمال اسلام کی نفی مقصود ہے، کیونکہ اس حدیث میں آپ علیہ السلام نے ان کے بارے میں صرف یہ فرمایا ہے کہ ان کو بروز قیامت میری شفاعت کا استحقاق نہیں ہوگا اورمحض اتنی بات سے کفرلازم نہیں آتا۔

(۲) یہ حکم بطورزجروتوبیخ ہے یعنی ان کا نظریہ ایساخطرناک ہے کہ وہ ان کو دائرہ اسلام سے خارج کرکے کفرتک پہنچاسکتاہے۔

مرجئہ اورقدریہ کی وجہ تسمیہ:

المرجئة: ارجاء سے ہے بمعنیٰ موخر کرنا، پیچھے ہٹانا، یہ فرقہ بندہ کودرجۂ اختیار سے پیچھے ہٹاتاہے،

(۱) المرقاة ۱/ ۲۸۳.

یا پھر یہ فرقہ اعمال کو ان کے شرعی درجہ سے پیچھے ہٹاتا ہے اور اہمیت نہیں دیتا، اس لئے ان لوگوں کا ''مرجئہ'' نام رکھا گیا اور یہاں اس سے مراد ''فرقۂ جبریہ'' ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا۔

القدرية: اس سے مراد وہ فرقہ ہے جو تقدیر کا منکر اور ''الأمر أنف'' کا قائل ہے یعنی جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان از خود کرتا ہے، پہلے سے کچھ مقدر نہیں ہے۔

سوال: یہ ہے کہ فرقہ قدریہ تو تقدیر کا انکار کرتا ہے تو پھر اس کا نام قدریہ کیوں رکھا گیا جبکہ اس لفظ کے ظاہر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقدیر کو تسلیم کرتا ہے؟

جواب: ان کا یہ نام **تسمية الشي باسم ضده** کے قبیل سے ہے، یا وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بندہ کے لئے زیادہ قدرت واختیار ثابت مانتے ہیں، اس لئے قدرت کی طرف نسبت کرکے ان کو ''قدریہ'' کہا گیا۔

حدیث کا درجہ:

وقال هذا حديث غريب: ''غریب'' یہاں ضعیف کے معنی میں ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس کی یہ حدیث از روئے سند ضعیف ہے، جیسا کہ امام ترمذی کی اپنی سنن میں بیان کردہ تفصیل سے ظاہر ہے، البتہ یہ حدیث حضرت ابن عباس کے علاوہ دیگر صحابہ سے بھی مروی ہے اس لئے بحیثیت مجموعی یہ حدیث ''حسن'' کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے، اس لئے امام ترمذیؒ نے اس پر ''حسن غریب'' ہونے کا حکم لگایا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک طریق کی رو سے غریب یعنی ضعیف ہے اور مجموعۂ طرق کے لحاظ سے حسن ہے، لیکن مصنف خطیب تبریزی نے چونکہ یہاں ابن عباسؓ کے حوالہ سے یہ حدیث نقل کی ہے اور ابن عباسؓ کے طریق سے یہ ضعیف ہے اس لئے مصنفؒ نے اس پر صرف ''غریب'' ہونے کا حکم لگایا۔

۹۹ / ۲۷ وعن ابن عمرؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ''يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ خَسْفٌ وَمَسْخٌ، وَذٰلِكَ فِي الْمُكَذِّبِيْنَ بِالْقَدْرِ'' (رواه ابوداود، وروى الترمذي نحوه)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: میری امت میں زمین میں دھنس جانا اور صورتوں کا مسخ ہو جانا بھی ہوگا

(۱) أخرجه أبو داود، كتاب السنة، باب لزوم السنة ۲ / ۶۳۲ والترمذي في القدر، باب بدون ترجمة ۲ / ۳۸۔

اور یہ عذاب ان لوگوں پر ہوگا جو تقدیر کے منکر ہیں۔ (ابوداود) اورامام ترمذی علیہ الرحمہ نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

تشریح حدیث

منکرین تقدیر کے لئے عذاب کی وعید:

اس حدیث میں منکرین قدر کے لئے وعید کا بیان ہے اور''امت'' سے امت اجابت مراد ہے، مطلب یہ کہ میری امت میں خسف ومسخ کا عذاب ہوگا، جوخاص طور پر تقدیر کی تکذیب کرنے والوں پر نازل ہوگا، ''خسف'' کے معنی زمین میں دھنسا دینا اور''مسخ'' کے معنی بدتر صورت میں بدل جانا مثلاً انسان کا بندر بن جانا۔

ایک تعارض اوراس کا حل:

سوال یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ: میری امت میں خسف ومسخ کا عذاب نہیں ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے حق میں اس کی دعا فرمائی تھی اور وہ قبول ہوئی؟

اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) یہ جملہ''یکون فی امتی الخ ''قضیۂ فرضیہ ہے جیسے لو کان فیھما آلھۃ ......الخ یعنی اگر میری امت میں خسف ومسخ کا عذاب ہوتا تو وہ مکذبین تقدیر میں ہوتا۔(۱)

(۲) خسف ومسخ کی نفی کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب زمانے سے ہے اور اثبات کا تعلق قرب قیامت سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے آپ کے قریبی زمانہ میں امت اس عذاب سے محفوظ رہے گی ، البتہ جب قیامت قریب آجائے گی اور زمانہ نبوت دور ہوجائے گا اس وقت تقدیر کی تکذیب کرنے والوں میں یہ عذاب آسکتا ہے، گویا نفی واثبات دونوں کا زمانہ جداجدا ہے اس لئے تعارض نہیں ہے، تعارض کے لئے اتحاد زمان ضروری ہے۔(۲)

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۸۵، واللمعات ۱ / ۳۹۶.

(۲) المرقاۃ ۱ / ۲۸۵.

(۳) بعض نے کہا کہ نفی عمومی عذاب کی ہے کہ یہ عذاب امت میں عمومی طریقے پر نہیں آئے گا جیسے امم سابقہ میں ہوا، اس امت میں مخصوص افراد اور مخصوص اقوام میں یہ عذاب آ سکتا ہے۔(۱)

(۴) بعض نے کہا جن روایات میں اس عذاب کا اثبات ہے اس سے خسف و مسخ باطنی مراد ہے کہ خسف سے ذلت اور مسخ سے قلب کی تاریکی مراد ہے، اور معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ ایسے لوگوں کو ذلیل فرمائے گا، ان کے قلوب تاریک ہو جائیں گے اور قلوب سے رحمت و معرفت نکل جائے گی، قساوت، جہالت اور تکبر دل میں سما جائے گا۔(۲)

وروى الترمذي نحوه: اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ترمذی نے بھی کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے، اس کا مضمون یہ ہے کہ: ایک شخص نے عبداللہ بن عمرؓ کے پاس کسی کے ذریعہ اپنا سلام بھیجا، مگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو یہ اطلاع پہنچی تھی کہ وہ سلام بھیجنے والا تقدیر کا منکر ہے چنانچہ آپ نے اس کے سلام کا جواب دینے سے انکار فرمایا اور یہ حدیث سنائی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے: **يكون في هذه الأمة أو في أمتي خسف أو مسخ أو قذف في أهل القدر**، اس میں خسف اور مسخ کے ساتھ ''قذف'' (پتھروں سے ہلاک کرنا) کی بھی وعید ہے، یہ حدیث آگے فصل ثالث میں آ رہی ہے۔

۱۰۰/ ۲۸ وعنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "اَلْقَدَرِيَّةُ مَجُوْسُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، إِنْ مَرِضُوْا فَلَا تَعُوْدُوْهُمْ وَإِنْ مَاتُوْا فَلَا تَشْهَدُوْهُمْ" (رواہ أحمد، وأبو داود)(۳)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فرقۂ قدریہ اس امت کے مجوس ہیں، اگر یہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت مت کرنا اور اگر مر جائیں تو جنازہ میں شریک مت ہونا۔ (رواہ احمد)

(۱) المرقاة ۱/ ۲۸۵.

(۲) المرقاة ۱/ ۲۸۵.

(۳) أخرجه ابو داود، كتاب السنة، باب في القدر ۲/ ٦٤٤ واحمد ۲/ ۸٦ برقم ٥٥٨٦.

تشریح حدیث

منکرین تقدیر کے ساتھ میل جول کی ممانعت:

اس حدیث پاک میں بھی مکذبین قدر کے ساتھ میل جول رکھنے سے منع فرمایا گیا تا کہ ان کے فاسد خیالات اور گمراہ کن عقائد کا اثر نیک طبیعت اور خوش عقیدہ لوگوں پر نہ پڑے، چنانچہ فرمایا کہ: فرقۂ قدریہ اس امت کے مجوس ہیں، پس اگر وہ بیمار ہوجائیں تو ان کی عیادت نہ کرو اور اگر مرجائیں تو ان کے جنازے میں شرکت نہ کرو، شراح نے فرمایا کہ یہاں قدریہ سے مراد معتزلہ ہیں، معتزلہ کو تشبیہ دی گئی ہے مجوس کے ساتھ تعدد خالق کا عقیدہ رکھنے میں، مجوس تعدد الٰہ کے قائل تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ الٰہ دو ہیں ایک خالق خیر اور ایک خالق شر، خالق خیر کا نام ہے: یزداں اور خالق شر کا نام: اہرمن ہے، معتزلہ بھی تعددِ خالق کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ افعال خیر کا خالق اللہ اور افعال شر کا خالق خود بندہ ہے، اس لئے معتزلہ مجوس کے مشابہ ہوئے۔(۱)

إن مرضوا فلاتعادوهم......الخ: جو حضرات قدریہ (معتزلہ) کو کافر کہتے ہیں ان کے یہاں یہ نہی حقیقت پر محمول ہے اور جو ان کو کافر نہیں مانتے ان کے یہاں یہ نہی زجر و توبیخ کے طور پر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو چیزوں کی تخصیص اس لئے فرمائی کہ: یہ حقوق فرض کفایہ کے قبیل سے ہیں اور ان حالات میں آدمی کو ان چیزوں کی احتیاج بھی ہوتی ہے، پس جب احتیاج کے باوجود فرض کفایہ کی قبیل کے حقوق کی ادائیگی سے روک دیا گیا تو دیگر حقوق کی ادائیگی سے بدرجۂ اولی روکا جائے گا۔

۱۰۱ / ۲۹ وَعَنْ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم لَاتُجَالِسُوْا أَهْلَ الْقَدْرِ، وَلَاتُفَاتِحُوْهُمْ. (رواه ابوداود)(۲)

ترجمه: حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قدریہ کے پاس اٹھنا بیٹھنا مت کرو، اور نہ ان کو اپنا حاکم بناؤ (دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے) کہ ان سے سلام و کلام میں ابتداء نہ کرو۔

(۱) المرقاة ۱ / ۲۸۵.

(۲) أخرجه أبو داود، كتاب السنة، باب في ذراري المشركين ۲ / ٦٤٩.

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی مکذبین بالقدر کے لئے زجروتوبیخ ہے کہ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا نہ رکھا جائے اور میل جول نہ کیا جائے۔

ولاتفاتحوهم:اس کے معنی میں کئی احتمال ہیں:(۱) یہ **فتاحة**(بضم الفاء وکسرہا) سے ماخوذ ہو بمعنی حکومت یعنی ان کو حاکم نہ بناؤ۔(۱)

(۲) یہ ماخوذ ہو **فتح** سے بمعنی ابتداء کرنا آغاز کرنا، پھر آغاز کا تعلق کس چیز سے ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں: ایک یہ کہ ابتداء بالسلام نہ کرو کہ یہ بدعتی ہیں، اور اگر وہ سلام کریں تو جواب دینا واجب نہیں، دوسرے معنی یہ ہیں کہ ابتداء بالکلام نہ کرو، بدعتی کو ابتداء بالسلام وبالکلام کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر اس کی اصلاح مقصود ہو، یا یہ سلام اور کلام اس کی توبہ کا ذریعہ بنے تو مستحب ہوگا۔(۲)

(۳) علامہ مظہرؒ نے فرمایا کہ معنی یہ ہیں کہ ان سے مناظرہ میں ابتداء نہ کرو کہ وہ عقلیات کے ماہر ہوتے ہیں اور چرب زبان ہوتے ہیں وہ تمہیں شک میں مبتلا کردیں گے لہذا حتی الامکان ان کے ساتھ مناظرہ سے احتراز کرو۔(۳)

۱۰۲ / ۳۰ وَعَنْ عَائِشَةَؓ قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم:سِتَّةٌ لَعَنْتُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهِ وَكُلُّ نَبِيٍّ يُجَابُ:اَلزَّائِدُ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ، وَالْمُكَذِّبُ بِقَدْرِ اللّٰهِ، وَالْمُتَسَلِّطُ بِالْجَبَرُوْتِ لِيُعِزَّمَنْ أَذَلَّهُ اللّٰهُ وَيُذِلَّ مَنْ أَعَزَّهُ اللّٰهُ، وَالْمُسْتَحِلُّ لِحَرَمِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَحِلُّ مِنْ عِتْرَتِيْ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ، وَالتَّارِكُ لِسُنَّتِيْ"(رواه البيهقى فى"المدخل"ورزين فى كتابه)(٤)

ترجمه:حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: چھ شخص ایسے ہیں جن پر میں لعنت بھیجتا ہوں اور اللہ نے بھی ان کو ملعون قرار دیا ہے اور ہر نبی کی

(١)المرقاة ١ / ٢٨٦.
(٢)المرقاة ١ / ٢٨٦.
(٣)المفاتيح شرح المصابيح ١ / ٢١٣.
(٤)هذا الحديث موجود في شعب الإيمان للبيهقي، برقم ٤٠١٠ وأيضاً أخرجه الترمذي، كتاب القدر، باب بدون ترجمة برقم ٢١٥٤ كمافي بعض النسخ ولايوجد في النسخة الهندية ولافي تحفة الأشراف.

دعا قبول ہوتی ہے:

(۱) کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا، (۲) تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والا، (۳) وہ شخص جو زبردست اقتدار پر قابض ہو جائے پھر ایسے شخص کو عزت دے جس کو اللہ نے ذلیل کیا ہو اور اس شخص کو ذلیل کرے جسکو اللہ تعالیٰ نے عزت وعظمت سے نوازا ہے، (۴) وہ شخص جو حرام امور کو حلال سمجھے، (۵) وہ شخص جو میری اولاد سے وہ چیز حلال جانے جو اللہ نے حرام کی ہے (۶) وہ شخص جو میری سنت کو چھوڑ دے۔ (بیہقی، رزین)

تشریح حدیث

چھ لوگوں پر اللہ کی لعنت:

اس حدیث میں مکذب قدر پر لعنت کا بیان ہے، حدیث کا مضمون یہ ہے کہ چھ اشخاص ایسے ہیں کہ میں ان پر لعنت کرتا ہوں اور اللہ بھی لعنت کرتا ہے، اور ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے، پس ان کے حق میں کی گئی لعنت ضرور ان پر پڑ کر رہے گی، وہ چھ اشخاص یہ ہیں:

(۱) الزائد فی کتاب اللہ: علماء نے فرمایا کہ زیادتی فی کتاب اللہ کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) الفاظ میں زیادتی کرے، یہ کفر ہے (۲) معنی میں زیادتی کرے، پھر اس کی دو صورتیں ہیں: (۱) اس زیادتی کی وجہ سے شریعت کے کسی حکم کا انکار لازم آئے، یہ بھی کفر ہے، (۲) شرعی حکم کا انکار تو لازم نہ آئے لیکن وہ زیادتی کتاب وسنت کے خلاف ہو تو یہ بدعت ہے۔

قراءت شاذہ کا حکم:

ابن حجر مکی نے فرمایا کہ الفاظ میں زیادتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کو قراءت شاذہ کے ساتھ بحیثیت قرآن کریم پڑھا جائے، کیونکہ شاذ قراءت کی حیثیت حدیث اور خبر واحد کی ہوتی ہے نہ کہ قرآن کی، کیونکہ قرآن میں تواتر ضروری ہے اور قراءت شاذہ میں تواتر نہیں ہوتا ہے، البتہ شاذ قرأت کو تفسیر کے طور پر یا کسی حکم کی وضاحت کے طور پر ذکر کرنا درست ہے۔ (۱)

(۱) فتح الإله ۱/ ۴۷۹.

(۲) المكذب بقدر الله: یہ جملہ باب کے مناسب ہے، یعنی تقدیر کا انکار کرنے والا۔

(۳) المتسلط بالجبروت: یعنی لوگ اس کو حاکم بنانا نہیں چاہتے لیکن وہ طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہو جائے اور زبردستی حاکم بن جائے، ''لیعز'' میں لام عاقبت کے معنی میں ہے کہ ایسے لوگ عموماً باعزت کو ذلیل اور ذلیل کو باعزت بناتے ہیں۔(۱)

(۴) المستحل لحرم الله: ''حَرَم'' بفتحتین مسجد حرام اور اس کے آس پاس کی جگہ کو کہتے ہیں یعنی حرم میں جو باتیں حرام ہیں ان کو حلال سمجھنے والا کہ حرم میں وہ کام کرے جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے مثلاً وہاں شکار کرنا، وہاں کا درخت کاٹنا، وہاں بغیر احرام کے داخل ہونا وغیرہ، دوسرا ضبط الحرم بضمتین ہے یعنی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنے والا، ترجمہ اسی ضبط کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔

(۵) المستحل من عترتی الخ: ''عترة'' بمعنیٰ اولاد، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ اولاد مراد ہے جو حضرت فاطمہ کے واسطے سے چلی آرہی ہے جن کو ''سادات'' کہا جاتا ہے اس جملہ کے دو مطلب ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا ادب احترام توقیر و تعظیم لازم ہے، پس جو شخص سادات میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائے ان کی بے حرمتی کرے اس پر اللہ و رسول کی لعنت ہے، اس وقت ''مِنْ عترتی'' میں من ابتدائیہ ہوگا۔

(۲) سادات کے حق میں گناہ کی شدت بیان کرنا مقصود ہے کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھنا گناہ ہے لیکن اگر سادات میں سے کوئی ایسا کرے تو اس کو گناہ زیادہ ہوگا، اس وقت ''مِنْ'' بیانیہ ہوگا۔

(۶) التارک لسنتی: ترک سنت کی دو صورتیں ہیں، (۱) کاہلی کی وجہ سے ہو تو یہ کبھی کبھار معفو عنہ ہے اور اس کی عادت بنالینا گناہ ہے (۲) بطور استخفاف ہو کہ سنت کو حقیر سمجھ کر ترک کرے یہ کفر ہے۔(۲)

۱۰۳ / ۳۱ وَعَنْ مَطَرِبْنِ عُكَامِسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم: ''إِذَاقَضَى اللّٰهُ لِعَبْدٍأَنْ يَمُوْتَ بِأَرْضٍ جَعَلَ لَهُ إِلَيْهَا حَاجَةً'' (رواه احمد، والترمذی)(۳)

(۱) المرقاة ۱ / ۲۸۸.

(۲) اللمعات ۱ / ۴۰۱.

(۳) أخرجه الترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء أن النفس حيث ماكتب لها ۲ / ۳۶، واحمد ۵ / ۲۲۷ برقم ۲۲۰۳۴، ۲۲۰۳۵.

ترجمہ: حضرت مطر بن عکامسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی موت کو کسی زمین میں مقدر کردیتا ہے تو اس زمین میں اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی ضرورت پیدا کردیتے ہیں (تاکہ وہ وہاں جائے اور مرجائے) (احمد، ترمذی)

تشریح حدیث

احوال مطر بن عکامس:

مطر بن عکامس نام ہے اور ''اسلمی'' نسبت ہے، کوفیین میں شمار ہوتے ہیں، بعض نے ان کی صحابیت کا انکار کیا ہے، لیکن راجح یہ ہے کہ صحابی ہیں، البتہ قلیل الروایۃ ہیں اور ان سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے، چنانچہ امام ترمذی نے کہا کہ: ''**ولانعرف لمطر بن عکامس عن النبی صلی الله علیه وسلم غیر هذا الحدیث**''(۱)

جائے موت بھی مقدر:

اس حدیث میں تقدیر کا بیان ہے کہ جائے موت بھی مقدر ہے چنانچہ اللہ جب کسی بندے کی کسی زمین میں موت مقدر فرمادیتے ہیں تو وہاں اس کی کوئی ضرورت اور حاجت پیدا فرمادیتے ہیں وہ اپنی اس ضرورت کی تکمیل کے لئے وہاں جاتا ہے اور مرجاتا ہے، حدیث کے اس مضمون میں آیت کریمہ ''وَمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ'' کی طرف اشارہ ہے، بعض روایات میں ہے کہ آدمی جہاں کی مٹی سے پیدا ہوتا ہے وہیں اس کی موت ہوتی ہے۔

۱۰۴ / ۳۲ وعن عائشةؓ قَالَتْ: قُلْتُ: يَارُسُوْلَ اللّٰهِ! ذَرَارِيُّ الْمُؤمِنِيْنَ؟ قَالَ: "مِنْ آبَائِهِمْ" فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بِلاعَمَلٍ؟ قَالَ: اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَاكَانُوْ عَامِلِيْنَ" قُلْتُ: فَذَرَارِيُّ الْمُشْرِكِيْنَ؟ قَالَ: "مِنْ آبَائِهِمْ" قُلْتُ: بِلاعَمَلٍ؟ قَالَ: اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَاكَانُوْا عَامِلِيْنَ"(رواه ابوداود)(۲)

(۱)الإصابة ۶ / ۱۰۱.

(۲)أخرجه ابوداود، کتاب السنة، باب فی ذراری المشرکین ۲ / ۶۴۸.

ترجمہ :حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ!(جنت وجہنم کے سلسلہ میں) مسلمان بچوں کا کیا حکم ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اپنے باپوں کے تابع ہیں، (یعنی وہ اپنے آباء کے تابع ہونے کی وجہ سے جنت میں ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ بغیر کسی عمل کے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ بچے کیا عمل کرنے والے تھے، میں نے پھر معلوم کیا کہ مشرکین کی اولاد کا کیا حکم ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ بھی اپنے باپوں کے تابع ہیں، میں نے پوچھا بغیر کسی عمل کے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ شانہ ہی زیادہ جانتے ہیں وہ بچے کیا کرنے والے تھے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

اطفال مؤمنین اور اطفال مشرکین کا حکم:

حضرت عائشہؓ نے اطفال مومنین ومشرکین کے بارے میں سوال کیا کہ ان کا کیا حکم ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت اور دوزخ کے سلسلہ میں اپنے آباء کے تابع ہوں گے، اس پر حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا کہ یارسول اللہ بلاعمل کے ہی یہ جنت اور دوزخ میں جائیں گے؟ تو فرمایا کہ اللہ زیادہ جانتے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر کیا اعمال کرتے یعنی اللہ بخوبی جانتے ہیں کہ اطفال مومنین بڑے ہوتے تو ایمان واعمال کو اختیار کرتے، لہٰذا وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے، اسی طرح اطفال مشرکین کے متعلق بھی اللہ کو معلوم ہے کہ وہ بڑے ہوتے تو کفروشرک میں مبتلا ہوتے، پس وہ جہنم کے مستحق ہیں، عام شراح نے اس جملہ کے یہی معنی تحریر فرمائے ہیں۔(۱)

اس حدیث سے اطفال مومنین کا جنتی ہونا معلوم ہوا اور ان کا یہ حکم گذشتہ حدیث ''**عصفور من عصافیر الجنۃ**'' کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ اس حدیث کی تشریح کے ذیل میں ذکر کیا جاچکا ہے، فلیراجع۔

نیز اس حدیث سے اطفال مشرکین کا جہنمی ہونا معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ان کے متعلق ایک قول یہی ہے، ان کے بارے میں دیگر متعدد اقوال اور راجح قول کی تعیین سب ماقبل میں گذر چکا ہے۔

علامہ توربشتیؒ نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان فرمایا کہ من آبائھم میں اطفال مشرکین کا حکم دنیوی

(۱) المرقاۃ ۱/ ۲۹۰.

مذکور ہے کہ دنیوی احکام میں اسلام اور کفر کے لحاظ سے وہ اپنے والدین کے تابع ہونگے اور اللہ اعلم بما کانوا عاملین میں حکم اخروی کا بیان ہے کہ وہ اللہ کے علم کے مطابق جنت یا جہنم میں جائیں گے، لیکن پہلا مطلب ظاہر ہے، اسی کو قاضی بیضاویؒ نے اختیار کیا ہے۔(۱)

۱۰۵ / ۳۳ وعن ابن مسعودؓ قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْؤُدَةُ فِي النَّارِ" (رواه ابوداود والترمذي)(۲)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: زندہ بچی کو دفن کرنے والی عورت اور وہ بچی جس کو دفن کیا گیا ہے دونوں جہنم میں ہوں گے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

زندہ درگور کرنے کی سزا:

الوائدة: وئدٌ سے اسم فاعل مؤنث ہے، یہ باب ضرب سے آتا ہے، اس کے معنی ہیں: زندہ بچے کو قبر میں دفن کرنا، زمانۂ جاہلیت میں عرب میں زندہ بچہ کو بالخصوص لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا رواج تھا، اور اس کی صورت یہ ہوتی کہ جب عورت کو دردِ زہ ہوتا تو ایک دایہ آتی اور گڑھا کھودتی، عورت اس پر بیٹھتی دایہ بچہ کی منتظر رہتی، اگر لڑکا پیدا ہوتا تو دایہ اس کو اٹھا لیتی اور اگر لڑکی ہوتی تو اس کو گڑھے میں چھوڑ دیتی، پس یہ دایہ "وائدہ" ہوگئی اور "موؤودة" وہ بچی کہلائے گی جس کو زندہ درگور کیا گیا ہے، حدیث کے حکم کے مطابق یہ دونوں جہنمی ہیں۔(۳)

سوال ہوتا ہے کہ "وائدہ" کا جہنمی ہونا تو صحیح ہے کہ اس نے قتل نفس کیا ہے، لیکن "موؤدۃ" جہنمی کیوں ہے؟ وہ تو بے قصور ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ مشرکین کی نابالغ اولاد ہے، لہٰذا اپنے والدین کے تابع ہوکر وہ بھی جہنمی ہوگی جیسا کہ اولاد مشرکین کے بارے میں ایک قول یہی ہے، جو اوپر حدیث میں بھی آیا ہے، اسی بنا پر اس حدیث

(۱) تحفة الابرار ۱/ ۱۰۳ — ۱۰٤.

(۲) أخرجه أبوداود، كتاب السنة، باب فى ذرارى المشركين ۲/ ٦٤٩.

(۳) المرقاة ۱/ ۲۹۱.

کو باب الایمان بالقدر میں لایا گیا ہے کہ جنتی وجہنمی ہونا مقدر ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہ بچی جہنمی نہیں ہے جیسا کہ مشکوۃ جلد ثانی میں روایت ہے لہٰذا اس حدیث میں تاویل ہوگی وہ یہ کہ ''الـمـوؤدۃ'' ''الـمـوؤدۃ لھـا'' کے معنی میں ہیں بحذف الصلۃ، یعنی وہ عورت جس کی وجہ سے بچے کو زندہ دفن کیا گیا یعنی بچے کی ماں وہ جہنم میں جائے گی، اس لئے کہ وہ اس فعل حرام پر راضی تھی اور وہ بھی قتل ناحق میں شریک تھی، یہی معنی راجح ہیں، یعنی دایا اور بچے کی ماں دونوں جہنمی ہیں۔(۱)

الفصل الثالث

۱۰۶ / ۳۴ عَـنْ أَبِی الدرداءؓ قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ''إِنَّ اللّٰـهَ عَزَّوَجَلَّ فَرَغَ إِلٰى كُلِّ عَبْدٍ مِنْ خَلْقِهٖ مِنْ خَمْسٍ: مِنْ أَجَلِهٖ، وَعَمَلِهٖ، وَمَضْجَعِهٖ، وَأَثَرِهٖ، وَرِزْقِهٖ'' (رواہ احمد)(۲)

تــرجـمــہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ اپنی مخلوق میں سے ہر ایک بندہ کے متعلق پانچ باتیں (لکھکر) فارغ ہوچکے ہیں (۱) اس کی موت (کہ کب آئے گی) (۲) اس کے نیک وبداعمال، (۳) اس کے لیٹنے کی جگہ، (۴) اس کی واپسی کی جگہ، (۵) اسکا رزق۔ (احمد)

تشریح حدیث

احوال ابوالدرداء:

آپ کا نام عویمر ابن عامر الأنصاری الخزرجی ہے اور بقول بعض عامر نام ہے اور عویمر لقب ہے، ابوالدرداء کنیت ہے، بدر کے دن اسلام قبول کیا اور پھر احد وغیرہ میں شریک ہوئے، حضور علیہ السلام نے ان کو ''حکیم امتی'' کے اعزاز سے نوازا، درداء آپکی بیٹی کا نام تھا، ان کی طرف منسوب ہوکر ابوالدرداء کنیت پڑی، ۳۲ھ میں دمشق میں حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ان کی وفات ہوئی، وہ دمشق کے قاضی بھی تھے۔(۳)

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۹۱.

(۲) أخرجه احمد ۵/ ۱۹۷ برقم ۲۱۷۷ و ۲۱۷۷۱.

(۳) الإصابة ٤ / ٦٣٢.

مقدر من اللہ پانچ امور:

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر بندہ کے لئے تقدیر میں پانچ چیزیں لکھی جاچکی ہیں: (۱) اس کی موت کب آئے گی، (۲) اس کا عمل بھی لکھا جاچکا ہے، (۳،۴) ''مضجع'' اور ''اثر'' بھی طے ہے (۵) رزق بھی طے کیا جاچکا ہے کہ کس قدر ملے گا۔

''مضجع'' اور ''اثر'' کی دو تفسیریں ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ ''مضجع'' سے مراد سکون وقرار اور ''اثر'' سے چلنا پھرنا اور حرکت کرنا ہے کہ اس بندہ کو دنیا میں کتنا سکون میسر آئے گا اور کتنی محنت کرے گا۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''مضجع'' سے مراد یہ ہے کہ اس کی قبر کہاں ہوگی اور کہاں موت آئیگی، اور ''اثر'' سے اس کا اخروی ٹھکانہ مراد ہے یعنی اس کی جائے موت اور جائے دفن اور جنت وجہنم میں سے جو بھی اس کا ٹھکانہ ہے وہ پہلے سے مقدر ہو چکا ہے، ترجمہ اسی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے۔(۱)

۱۰۷/ ۳۵ عن عائشةؓ قالت: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْءٍ مِنَ الْقَدْرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْأَلْ عَنْهُ"(رواه ابن ماجه)(۲)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جو شخص تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کرے گا قیامت میں اس سے باز پرس ہوگی اور جو شخص (تقدیر پر ایمان لا کر اس سلسلہ میں) بحث ومباحثہ نہیں کرے گا وہ اس مواخذہ سے بچ جائے گا۔(ابن ماجہ)

تشریح حدیث

تقدیر میں رائے زنی کرنے والے سے باز پرس:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ عقلی دلائل کے ذریعہ تقدیر کے بارے میں بحث نہیں کرنی چاہئے کیونکہ تقدیر کے بارے میں مناقشہ ومباحثہ بہت سی مرتبہ گمراہی کا ذریعہ بنجاتا ہے، البتہ نصوص میں اس

(۱) المرقاة ۱/ ۲۹۲.

(۲) أخرجه ابن ماجة في المقدمة، ۱/ ۹.

بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے اس کی تشریح وتوضیح کی جاسکتی ہے، جو شخص تقدیر کے بارے میں تکرار ومباحثہ کرے گا اس سے قیامت کے دن باز پرس ہوگی کیونکہ بذریعہ عقل بحث عن التقدیر منہی عنہ ہے، اسلئے اس سے باز پرس ہوگی کہ اس سلسلہ میں بحث کیوں کی؟ اور جو شخص اپنی زبان بند رکھے گا اور بغیر بحث ومباحثہ کے تقدیر پر ایمان لائے گا وہ اس باز پرس سے محفوظ رہے گا۔

۱۰۸ / ۳۶ وَعَنِ ابْنِ الديلمي رحمه الله تعالى قَالَ: أَتَيْتُ أُبَيَّ بنَ كَعْبٍ، فَقُلْتُ لَهُ: قَدْ وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ شَيْءٌ مِنَ الْقَدْرِ، فَحَدِّثْنِي لَعَلَ اللّٰهَ أَنْ يُذْهِبَهُ مِنْ قَلْبِيْ، فَقَالَ: لَوْ أَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ عَذَّبَ أَهْلَ سمٰوَاتِهٖ وَأَهْلَ أَرْضِهٖ؛ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ، وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْراً لَهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ وَلَوْ أَنْفَقْتَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ، وَتَعْلَمَ أَنَّ مَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ، وَأَنَّ مَا أَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ؛ قَالَ: ثُمَّ أَتَيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بنَ مَسْعُوْدٍ، فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ، قَالَ: ثُمَّ أَتَيْتُ حُذَيْفَةَ بنَ الْيَمَانِ، فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ أَتَيْتُ زَيْدَ بنَ ثَابِتٍ فَحَدَّثَنِيْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَ ذٰلِكَ. (رواه احمد، وأبو داود وابن ماجه)(۱)

ترجمه ومفهوم: ابن دیلمیؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: میں حضرت ابی بن کعبؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شبہ پیدا ہوگیا ہے مثلاً (یہ کہ جب تمام چیزیں نوشتہ تقدیر کے مطابق ہیں تو پھر ثواب وعذاب کیسا) آپ مجھے کوئی ایسی بات بتائیں جسکی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے دل سے اس شبہ کو دور کردے (یہ سن کر) حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ (صاف صاف سن لو) اگر اللہ تعالیٰ شانہ تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں کو عذاب دینے لگے تو وہ اس عذاب دینے میں ظالم نہیں ہوگا (کیونکہ ظلم تو کہتے ہیں دوسرے کی ملک میں تصرف کرنے کو اور یہاں یہ بات نہیں ہے، تمام مخلوق اللہ کی بنائی ہوئی ہے اس کی اپنی چیز ہے وہ اس میں جو چاہے تصرف کرے) اور اگر بجائے

(۱) أخرجه احمد في مسنده، رقم الحديث: (۲۱۵۸۹، ۲۱۶۱۱، ۲۱۶۵۳) وابو داود في سننه في باب القدر. (۴۶۹۹) ابن ماجة في المقدمة، باب في القدر ۱ / ۹.

عذاب کے سب کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمائے تو یہ اللہ کا معاملہ اور اس کی رحمت ان کے اعمال خیر سے بدرجہا بہتر ہوگا، اور اگر تو احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کے لئے خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہیں فرمائیں گے جب تک تو تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا (اور ایمان بالقدر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم یہ جان لو) کہ جو چیز تجھ کو پہنچی ہے (مصیبت یا راحت، غمی یا خوشی) ممکن نہیں تھا کہ وہ نہ پہنچتی اور جو چیز تجھ کو نہیں پہنچی تو نہیں ممکن تھا کہ وہ شی تجھ کو پہنچتی (مطلب یہ کہ جو کچھ ہوا وہ ضرور ہونا تھا) ''ولو مت علی غیر هذا'' اگر تو اس عقیدہ کے خلاف دوسرے عقیدہ پر مرے گا تو جہنم میں جائے گا۔

ابن دیلمیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی یہ بات سن کر میں (مزید اپنے اطمینان کے لئے) عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں (وہی سوال لے کر) حاضر ہوا تو انہوں نے بھی بعینہ یہی جواب دیا، اسی طرح میں پھر حذیفہ بن یمانؓ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی یہی جواب ارشاد فرمایا اور پھر اخیر میں زید بن ثابتؓ کے پاس گیا انہوں نے اسی طرح کی بات مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرکے بیان فرمائی۔ (احمد، ابوداود، ابن ماجہ)

تشریح حدیث

احوال ابن دیلمی:

ان کے نام میں کئی قول ہیں، صاحب مشکوۃ نے اپنے رسالہ اسماء الرجال میں ضحاک بن فیروز بتایا ہے، ''دیلم'' مشہور پہاڑ ہے، ان کے قبیلے کے لوگ اس پہاڑ کے قریب آباد تھے، اس لئے ''دیلمی'' کہلاتے ہیں، ان کے والد فیروز دیلمی صحابی ہیں اور نجاشی کے بھانجے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے کامیابی کی دعا دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخیر حیات میں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا اس کو فیروز دیلمیؓ نے ہی قتل کیا تھا، اس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض الوفات میں پہنچی تو آپ نے فرمایا تھا: قَتَلَه الرجلُ الصالحُ فیروزُ فَازَ فیروزُ۔(۱)

ابن الدیلمی تابعی کا مسئلہ تقدیر کے بارے میں مختلف صحابہ سے استفسار:

ابن الدیلمی تابعیؒ کو مسئلہ تقدیر کے بارے میں کچھ شبہات تھے، ان کے حل کے لئے وہ مختلف صحابہ

(۱) المرقاۃ ۱ / ۲۹۴.

کرام کے پاس تشریف لے گئے، حسن اتفاق یہ ہوا کہ تمام صحابہ نے یکساں جواب مرحمت فرمایا جو یہاں حدیث میں مذکور ہے، ترجمہ سے اس کا مفہوم ظاہر اور واضح ہے۔

عذبهم وهو غير ظالم لهم الخ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ پر بندوں کا کوئی حق واجب نہیں، گو بندے حکم الٰہی پر کاربند ہوں، اہل سنۃ کا یہی مسلک ہے، جبکہ معتزلہ اللہ پر اس کے وجوب کے قائل ہیں، جس کی اس سے تردید ہوتی ہے۔

۱۰۹ / ۳۷ وعن نافعؓ أَنَّ رَجُلاً أَتَى ابنَ عُمَرؓ فقالَ: إِنَّ فُلاناً يُقْرِئُ عَلَيْكَ السَّلامَ، فَقَالَ: إِنَّهُ بَلَغَنِيْ أَنَّهُ ، قَدْ أَحْدَثَ، فَإِنْ كَانَ قَدْأَحْدَثَ فَلا تُقْرِءْهُ مِنِّي السَّلامَ، فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ أَوْفِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ خَسْفٌ وَمَسْخٌ أَوْقَذْفٌ فِيْ أَهْلِ الْقَدْرِ" (رواه الترمذى، وأبوداود، وابن ماجه ، وقال الترمذى: هذا حديث حسن صحيح غريب)(۱)

ترجمہ: حضرت نافعؒ سے مروی ہے کہ: ایک شخص حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ: فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ: اس شخص نے دین میں کوئی نئی بات نکالی ہے، اگر واقعی اس نے دین میں کوئی نئی بات پیدا کی ہے تو میری طرف سے جواب میں اسے سلام نہ پہنچانا، اس لئے کہ میں نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: میری امت میں یا یہ فرمایا کہ اس امت میں اہل قدر (تقدیر کے منکرین) میں زمین میں دھنس جانا اور صورت کا مسخ ہو جانا یا پتھر برس جانا یہ عذاب ہوں گے، (ترمذی، ابوداود، ابن ماجہ) اور امام ترمذی نے فرمایا کہ یہ حدیث حسن صحیح وغریب ہے۔

تشریح حدیث

احوال نافع:

نافع: عبداللہ بن عمرؓ کے غلام تھے، کبار تابعین میں سے ہیں، امام مالک کے استاذ ہیں، امام مالک

(۱) أخرجه الترمذى فى سننه فى ابواب القدر (۲۱۵۲) وأبوداود، في كتاب السنة، باب فى القدر ۲/ ۶۴۶ وابن ماجه فى المقدمة، باب فى القدر ۱/ ۸.

فرماتے ہیں کہ جب میں نافع عن ابن عمر کی سند سے کوئی روایت سنتا ہوں تو اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ یہ حدیث کسی اور سے سنوں یا نہ سنوں، یعنی ان سے سماع کے بعد کسی اور سے سماع کی احتیاج نہیں رہتی، اسی لئے ائمہ حدیث نے ''مالک عن نافع عن ابن عمر'' اس سند کو ''اصح الاسانید'' قرار دیا ہے۔

ایک منکر تقدیر اور حضرت ابن عمرؓ کا اس کے ساتھ طرز عمل:

اس حدیث پاک میں مکذبین بالقدر کے لئے وعید ہے اور ایک واقعہ بھی مذکور ہے، جس کا اجمالی بیان پہلے بھی آ چکا ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ فلاں نے آپ کو سلام کہا ہے، آنے والا حسین بن عبدالرحمٰن تھا جو کوفہ سے آیا تھا اور فلاں سے مراد معبد جہنی ہے جو فرقۂ قدریہ کا بانی ہے، معبد جہنی نے حسین سے کہا تھا کہ تم مدینہ جا رہے ہو وہاں اگر کسی صحابی سے ملاقات ہو تو ان کو میرا سلام کہنا، حسین مدینہ طیبہ آئے یہاں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ملاقات ہوئی تو حسین نے ان کو معبد جہنی کا سلام پیش کیا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو معبد کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ تقدیر کا انکار کرتا ہے، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ اس نے ایک بدعت ایجاد کی ہے، اگر واقعہ ایسا ہی ہے تو میری طرف سے اس کو سلام نہ کہنا، پھر انہوں نے ایک حدیث مرفوع سنائی جس میں منکرین قدر کے لئے عذاب کی وعید بیان کی گئی ہے، نیز حضرت عبداللہ بن عمر نے اس کے سلام کو قبول نہیں کیا، اس سے معلوم ہوا کہ بدعتی کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں، الا یہ کہ اس کی اصلاح مقصود ہو۔

حدیث کا درجہ اور ''حسن صحیح غریب'' کا اجتماع:

وقال الترمذی: هذا حديث حسن صحيح غريب: یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ایک سند کو بیک وقت حسن، صحیح اور غریب قرار دینا کیونکر درست ہے؟ اور یہ متضاد صفات ایک ہی سند میں کیسے مجتمع ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث دراصل متعدد اسانید سے مروی ہے جن میں سے کوئی حسن، کوئی صحیح اور کوئی غریب ہے، پس یہ علیحدہ علیحدہ اسانید کے لحاظ سے حکم لگایا گیا ہے، نہ کہ ایک سند کے لحاظ سے۔

> ۱۱۰ / ۳۸ وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: سَأَلَتْ خَدِيجَةُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم عَنْ وَلَدَيْنِ مَاتَا لَهَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: ''هُمَا فِي النَّارِ'' قَالَ: فَلَمَّا رَأَى الْكَرَاهَةَ فِي وَجْهِهَا قَالَ: ''لَوْ رَأَيْتِ مَكَانَهُمَا

لَأَبْغَضْتِهِمَا"قَالَتْ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فَوَلَدِيْ مِنْکَ؟ قَالَ: "فِي الْجَنَّةِ" ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الْمُؤْمِنِيْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ وَأَوْلَادَهُمْ فِي النَّارِ"ثُمَّ قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ . (رواه احمد)(۱)

ترجمہ : حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ: حضرت خدیجہؓ نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اپنے ان دوبچوں کے بارے میں جوزمانۂ جاہلیت میں (اسلام سے پہلے) مرگئے تھے؟آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا:وہ دونوں بچے جہنم میں ہیں،حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ:جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے چہرہ کا رنگ (اپنے بچوں کے بارے میں یہ سن کر) بدلا ہوا (رنجیدہ) دیکھاتو فرمایا کہ: اگرتم ان بچوں کے ٹھکانے اوران کے حال کو دیکھوکہ وہ کس طرح خدا کی رحمت سے دور ہیں تو تم کو ان بچوں سے نفرت ہوجائے، پھرحضرت خدیجہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ! میری وہ اولاد جوآپ سے پیداہوئی ہے (قاسم اورعبداللہ)ان کا کیا حال ہے؟آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ جنت میں ہیں،اس کے بعدآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:"وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ اَلْحَقْنَابِهِمْ ذُرِّيَّتَهِمْ" (۲)یعنی جولوگ ایمان لائے اوران کی اولادنے ایمان کے ساتھ ان کا اتباع کیا تو ہم ان کی اولادکو جنت میں انہیں کے ساتھ رکھیں گے۔(احمد)

تشریح حدیث

احوال ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰؓ:

خدیجہ بنت خویلدبن اسد القرشیہ،انہوں نے پہلے ابو ہالہ بن زرارہ سے نکاح کیا، ان کے فوت ہونے کے بعدعتیق بن عائذ سے نکاح ہوا،پھران کے بعدآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا، پہلے دوشوہروں سے دوبچے بھی پیداہوئے،لیکن نابالغی کی حالت میں ان کاانتقال ہوگیا،انہی کے بارے میں اس حدیث میں استفسار کیا گیاہے،حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمرچالیس

(۱)أخرجه أحمد۱/۱۳۴برقم:۱۱۳۱.

(۲)من الطور:۲۱.

سال تھی جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۲۰ یا ۲۵ سال تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً حضرت خدیجہؓ سے نکاح کیا اور جب تک وہ حیات رہیں اس وقت تک کسی اور سے نکاح نہیں فرمایا، حضرت ابراہیم کے علاوہ آپ کی تمام اولاد انہی کے بطن سے پیدا ہوئی، حضرت ابراہیم: ماریہ قبطیہ سے تولد ہوئے، حضرت خدیجہؓ علی الاطلاق سب سے پہلے ایمان لانے والی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غم گسار، معاون اور مددگار تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی، ان کی وفات کے بعد ہمیشہ ان کو یاد فرمایا کرتے تھے، ۶۵ سال کی عمر میں ہجرت سے ۴ یا ۵ سال قبل وفات ہوئی اور مقام حجون میں تدفین ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھوں سے ان کو دفنایا، اس وقت تک نماز جنازہ مشروع نہیں ہوئی تھی۔(۱)

حضرت خدیجہؓ کا اپنے بچوں کے ٹھکانے کے بارے میں استفسار:

اس حدیث میں بھی اولاد مؤمنین اور اولاد مشرکین کے جنتی یا جہنمی ہونے کا بیان ہے، جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے دو بچوں کے بارے میں سوال کیا، جو سابق شوہروں سے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ دونوں جہنم میں ہیں، اس سے حضرت خدیجہؓ کو غم ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم ان کی جگہ دیکھ لو تو تم بھی ان سے نفرت کرنے لگو، کیونکہ انکے ٹھکانے اور ان کے احوال سے اگر تمھیں آگاہی ہوجائے تو تمھیں ان کا عنداللہ مبغوض ہونا معلوم ہوجائے گا اور جو اللہ کا مبغوض ہوتا ہے مؤمن کامل اس سے نفرت کرتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب سمجھ گئے کہ ان کے باپ اللہ کے دشمن ہیں تو باپ ہونے کے باوجود ان سے برأت کا اظہار کیا، حضرت خدیجہؓ نے سوال کیا کہ میری جو اولاد آپ سے ہے وہ کہاں ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جنت میں ہیں، پھر ضابطہ بتایا کہ مومنین اور ان کی اولاد جنت میں داخل کی جاتی ہے اور مشرکین اور ان کی اولاد جہنم میں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دلیل میں یہ آیت کریمہ بھی پڑھی:

والذين آمنوا واتبعتهم الآية.

یہاں سوال ہوتا ہے کہ آیت میں ذریت سے بالغ اولاد مراد ہے کہ مومن اولاد کا درجہ جنت میں کم ہوا تو ان کو والدین کے درجہ میں پہنچا دیا جائے گا، پھر اس آیت سے حدیث کی تائید کیسے ہوگی؟ کیونکہ حدیث

(۱) الإصابة ۸/ ۱۰۳، والمرقاة ۱/ ۲۹۷.

نابالغ اولاد سے متعلق ہے؟

جواب یہ ہے کہ: ذریت میں یہاں بالغ ونابالغ دونوں قسم کی اولاد داخل ہے اس لئے آیت کریمہ سے استشہاد درست ہے۔

۱۱۱ / ۳۹ وَعَنْ أَبِی هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهُ، فَسَقَطَ عَنْ ظَهْرِهِ كُلُّ نَسَمَةٍ هُوَخَالِقُهَا مِنْ ذُرِّيَّتِهِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَجَعَلَ بَيْنَ عَيْنَیْ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْهُمْ وَبِيْصاً مِنْ نُوْرٍ، ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلٰى آدَمَ، فَقَالَ: أَيْ رَبِّ!مَنْ هٰؤُلَاءِ؟ قَالَ ذُرِّيَّتُکَ، فَرَأٰى رَجُلاً مِنْهُمْ فَأَعْجَبَهُ وَبِيْصُ مَابَيْنَ عَيْنَيْهِ، قَالَ: أَيْ رَبِّ! مَنْ هٰذَا؟قَالَ: دَاوُدُ، فَقَالَ: أَيْ رَبِّ! كَمْ جَعَلْتَ عُمْرَهُ؟ قَالَ: سِتِّيْنَ سَنَةً، قَالَ رَبِّ زِدْهُ مِنْ عُمْرِیْ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَلَمَّا انْقَضٰى عُمْرُ آدَمَ إِلَّا اَرْبَعِيْنَ جَاءَهُ مَلَکُ الْمَوْتِ، فَقَالَ آدَمُ: أَوَلَمْ يَبْقَ مِنْ عُمْرِیْ أَرْبَعُوْنَ سَنَةً؟ قَالَ اَوَلَمْ تُعْطِهَا اِبْنَکَ دَاوُدَ؟ قال:فَجَحَدَ آدَمُ، فَجَحَدَتْ ذُرِّيَّتُهُ، وَنَسِیَ آدَمُ فَأَكَلَ مِنَ الشَّجَرَةِ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهُ، وَخَطَأَ آدم وَخَطَأَتْ ذُرِّيَّتُهُ. (رواه الترمذی)(۱)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا پس ان کی پشت سے وہ تمام روحیں نکل پڑیں جن کو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ شانہ قیامت تک پیدا کرنے والے تھے، اللہ نے ان میں سے ہر انسان کی دو آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھی، پھران سب کو حضرت آدم علیہ السلام کے روبرو پیش کیا (ان سب کو دیکھ کر) حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا: پروردگار یہ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا یہ تمہاری اولاد ہیں، حضرت آدم علیہ السلام نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان کی چمک ان کو بہت اچھی لگی، پوچھا پروردگار یہ کون ہے؟ فرمایا داود (علیہ السلام) ہیں، آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب؟ آپ نے ان کی عمر کتنی مقرر کی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال، حضرت آدم علیہ السلام نے

(۱)أخرجه الترمذی فی التفسير، من سورة الأعراف ۲ / ۱۳۸ برقم ۳۰۷۶.

عرض کیا: میرے پروردگار میری عمر میں سے چالیس سال ان کو دے کر ان کی عمر میں اضافہ کر دیجئے، راوی فرماتے ہیں کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر پورا ہونے میں چالیس سال باقی رہ گئے تو موت کا فرشتہ ان کے پاس آیا، حضرت آدم علیہ السلام نے فرشتہ سے کہا کہ: کیا ابھی میری عمر میں چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا، آپ نے اپنی عمر میں سے چالیس سال اپنے بیٹے داود کو نہیں دیئے تھے؟ حضرت آدم علیہ السلام نے انکار کیا اسی وجہ سے ان کی اولاد بھی انکار کرتی ہے اور آدم علیہ السلام بھول گئے (کہ انہوں نے شجرۂ ممنوعہ کو کھالیا) اس کی وجہ سے ان کی اولاد بھی بھولتی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نے خطاء کی تھی اس لئے ان کی اولاد بھی خطاء کرتی ہے۔ (ترمذی)

تشریحِ حدیث

حضرت آدم علیہ السلام کی عمر تبدیل کئے جانے کا واقعہ:

اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی عمر تبدیل کئے جانے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا گیا اور ان کو بصورت انسان ظاہر کیا گیا البتہ جسم وجثہ میں وہ چیونٹی کے برابر تھے، ہر شخص کی پیشانی پر نور کی چمک رکھی، یہ فطرت سلیمہ کا نور تھا، آدم علیہ السلام نے سب پر نظر ڈالی تو ایک شخص کی پیشانی کا نور زیادہ اچھا لگا پوچھا کہ اے اللہ یہ کون ہے؟ ارشاد ہوا کہ: داود، آدم علیہ السلام نے پوچھا ان کی عمر کتنی ہے؟ ارشاد ہوا کہ: ساٹھ سال، آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ: میری عمر میں سے چالیس سال ان کو دیدیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر جب آدم علیہ السلام کی عمر سے چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت تشریف لائے، آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا میری ابھی چالیس سال عمر باقی نہیں؟ تو ملک الموت نے عرض کیا کہ آپ نے اپنی عمر کے چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دیدیئے تھے؟ آدم علیہ السلام نے انکار کیا جس کے اثر سے ان کی ذریت میں بھی انکار کا مادہ آگیا کہ بیٹا باپ کے نقش قدم پر ہوتا ہے: الولَدُ سِرٌّ لأبیه.

اشکال: أفضل الخلائق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو سب سے زیادہ نور آپ کی پیشانی پر ہونا چاہئے تھا، داود علیہ السلام کی پیشانی پر زیادہ نور کیوں تھا؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱)حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی کا نور ہی سب سے زیادہ تھا، لیکن آدم علیہ السلام کی نظر اول وہلہ میں داود علیہ السلام پر پڑی، اس لئے ان کے بارے میں مذکورہ واقعہ پیش آیا۔

(۲) زیادہ نور حضرت داود علیہ السلام کی پیشانی پر ہی تھا لیکن داود علیہ السلام کی یہ فضیلت جزئی تھی اورآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجموعی وکلی فضیلت حاصل ہے، اوراس جزئی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ: آدم میں نبوت وخلافت دونوں جمع تھیں آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے پیغمبر جو دونوں کے جامع تھے وہ داوٗد علیہ السلام ہیں، اسی لئے انکو اپنی عمر میں سے کچھ سال بھی انھوں نے عنایت فرمائے۔

تقدیر معلق میں تبدیلی ممکن:

پھر عمر میں اضافہ کا ہونا تقدیر کا دوسرا مرتبہ ہے جس کو تقدیر معلق کہا جاتا ہے، اس میں تغیر ہوسکتا ہے، اول مرتبہ جو علم ازلی اور تقدیر مبرم کا ہے اس میں تغیر نہیں ہوتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ ان کی عمر اصلاً سو سال ہوگی، اور وہ سو سال ہی ہوئی۔

سوال: مشکوۃ جلد ثانی میں یہی واقعہ مذکور ہے[۱] لیکن اس میں مضمون یہ ہے کہ داود علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے ان کو ساٹھ سال عنایت فرمائے، جبکہ یہاں حدیث میں اس کا برعکس ہے؟

جواب(۱): یہ روایت راجح ہے کہ ان کی اصل عمر ساٹھ سال کی تھی۔

(۲) بعض علماء نے ان میں یہ تطبیق دی ہے کہ داود علیہ السلام کی عمر چالیس سال تھی آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے اولاً بیس سال کا اضافہ کرایا تو ان کی عمر ساٹھ سال ہوگئی، آدم علیہ السلام نے ان کے حق میں اس عمر کو بھی کم سمجھا اس لئے پھر چالیس سال کا اضافہ اور کرایا، تو مجموعی اضافہ ساٹھ سال ہوا اور دو مرحلوں میں ہوا۔

فسقط عن ظهر كل نسمة الخ: ''نسمة'' ن اور س کے فتحہ کے ساتھ، جمع: نَسَمْ بمعنی جاندار مخلوق، ''وبیصا'' بمعنی چمک۔

۱۱۲ / ۴۰ وَعَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِؓ، عَنِ النَّبِیِّ صلی الله علیه وسلم قَالَ: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ حِیْنَ خَلَقَهٗ، فَضَرَبَ كَتِفَهُ الْیُمْنٰی، فَأَخْرَجَ ذُرِّیَّةً بَیْضَاءَ كَأَنَّهُم الذَّرُّ، وَضَرَبَ

(۱)مشکوۃ، باب السلام ص: ۴۰۰.

كَتِفَهُ الۡيُسۡرَى فَأَخۡرَجَ ذُرِّيَّةً سَوۡدَاءَ كَأَنَّهُمُ الۡحُمَمُ، فَقَالَ لِلَّذِيۡ فِيۡ يَمِيۡنِهٖ: إِلَى الۡجَنَّةِ وَلاأُبَالِيۡ، وَقَالَ لِلَّذِيۡ فِيۡ كَتِفِهِ الۡيُسۡرَى: إِلَى النَّارِ وَلاأُبَالِيۡ"(رواه احمد)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس وقت اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو ان کے داہنے مونڈھے پر ہاتھ مارا تو اس سے سفید اولاد نکلی چیونٹیوں کے مانند، پھر بائیں مونڈھے پر ہاتھ مارا تو اس سے سیاہ اولاد نکلی کوئلہ کے مانند، پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے دائیں طرف والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جنتی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں اوران (آدم علیہ السلام) کے بائیں مونڈھے والی اولاد کے بارے میں فرمایا کہ یہ جہنمی ہیں اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ (احمد)

تشریح حدیث

مخلوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا کامل اختیار:

اس حدیث پاک میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ جنتی وجہنمی ہونا سب مقدر ہے، اور یہ کہ اللہ اپنی مخلوق کے بارے میں ہرطرح کے فیصلہ اورتصرف کا مختار ہے۔

كأنهم الذّر: ذال کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی چیونٹیاں، "الحمم" حاء کے ضمہ اورمیم کے فتحہ کے ساتھ، حممۃ کی جمع، بمعنی کوئلہ۔(۲)

ولاأبالي: مقصد یہ ہے کہ ان کو جنت میں بھیجنا میرے لئے کوئی بڑی چیز نہیں ہے، میرے لئے سب آسان ہے، اسی طرح جہنم میں جانے والوں کو بھی کوئی پرواہ نہیں یعنی کسی کے سوال کا کوئی خوف نہیں، قرآن کریم میں ہے: "**لَايُسۡئَلُ عَمَّايَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡئَلُوۡنَ**"(۳) کہ وہ جو کچھ کرتا ہے وہ اس کا جوابدہ نہیں اور لوگوں کو انہیں جواب دینا پڑے گا، اس حدیث میں دراصل حق تعالیٰ شانہ نے اپنی بے نیازی کو بتایا ہے کہ اس کو نہ جنت میں جانے والوں کی پرواہ ہے اورنہ جہنم میں جانے والوں کی، اور یہ سب پہلے مقدر ہو چکا ہے، اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ پر بندوں کا کوئی حق واجب نہیں، جیسا کہ پہلے آچکا ہے۔

(۱) أخرجه أحمد٦/ ٤٤١برقم ٢٧٥٢٨.

(۲)اللمعات١/ ٤١٠.

(۳)من سورة الأنبياء:٢٣.

سوال یہ ہے کہ ''کأنه الحُمَم '' سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں جانب والوں کا رنگ کالا تھا حالانکہ ماقبل کی حدیث میں آیا کہ ہر شخص کی پیشانی پر نور تھا یعنی فطرت سلیمہ کا؟

جواب: یہ ہے کہ رنگ کا کالا ہونا اور پیشانی پر نور کا ہونا دونوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ فطرت سلیمہ تو اللہ تعالیٰ نے سب کو دی ہے خواہ وہ داہنی جانب سے نکلنے والے ہوں یا بائیں جانب سے۔

۱۱۳ / ٤١ وَعَنْ أَبِيْ نَضْرَةَ ؓ أَنَّ رَجُلاً مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صلَّى اللّٰه عليه وسلم: يُقَالُ لَهُ: أَبُوْعَبْدِاللّٰهِ دَخَلَ عَلَيْهِ أَصْحَابُهُ، يَعُوْدُوْنَهُ، وَهُوَيَبْكِيْ، فَقَالُوْا لَهُ: مَايُبْكِيْكَ؟ اَلَمْ يَقُلْ لَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم :''خُذْمِنْ شَارِبِكَ ثُمَّ أَقِرَّهُ حَتّٰى تَلْقَانِيْ؟'' قَالَ بَلٰى، وَلٰكِنْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلَّى اللّٰه عليه وسلَّم يقول: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَبَضَ بِيَمِيْنِهِ قَبْضَةً وَأُخْرىٰ بِالْيَدِالْأُخْرىٰ وَقَالَ: هٰذِهِ لِهٰذِهِ، وَهٰذِهِ لِهٰذِهِ، وَلاأُبَالِيْ وَلاأَدْرِيْ فِيْ أَيِّ الْقَبْضَتَيْنِ أَنَا.(رواه أحمد)(۱)

ترجمہ :حضرت ابونضرہ ؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک شخص جن کا نام ابوعبداللہ تھا ان کے پاس ان کے چند ساتھی ان کی عیادت کے لئے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ: ابوعبداللہ رو رہے ہیں،انھوں نے کہا کہ: آپ کو کیا چیز رلا رہی ہے؟ کیا آپ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشادنہیں فرمایا تھا کہ: تم اپنے لب (مونچھوں کے)بال پست کرو اور اسی پر قائم رہو یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو، ابوعبداللہؓ نے کہا کہ ہاں! لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ بزرگ وبرتر نے اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی میں لوگوں کی ایک جماعت لی اوردوسرے ہاتھ میں ایک جماعت لی اور فرمایا کہ یہ داہنے ہاتھ کی جماعت جنت کے لئے ہے اور دوسرے ہاتھ والی جماعت جہنم کے لئے ہے اور مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، یہ کہکر ابوعبداللہ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ: میں کس مٹھی میں تھا(یعنی داہنی مٹھی میں یا بائیں مٹھی میں اس لئے رو رہا ہوں)(احمد)

(۱)أخرجه احمد ٥ / ٦٨ برقم ٢٠٦٨٧.

تشریح حدیث

تعارف ابونضرۃ:

ابونضرہ بن منذر بن مالک العبدی تابعی ہیں، بصرہ کے رہنے والے ہیں، حسن بصری کے کچھ دنوں کے بعد وفات ہوئی ہے، عبداللہ بن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابوسعیدؓ الخدری سے روایات سنی ہیں، ابراہیم تیمی، قتادہ اورسعید بن یزید انکے تلامذہ میں ہیں۔(۱)

ایک صحابی کا اپنے انجام سے ڈرنا:

ایک صحابی جن کی کنیت ابوعبداللہ تھی، بیمار ہوگئے تو ان کے احباب جوصحابہ تھے ان کی عیادت کے لئے گئے تو وہ رونے لگے، ان کے احباب نے کہا کہ تم کیوں رو رہے ہو؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اپنی مونچھوں کو پست کرو اوراسی پر قائم رہو اور مجھ سے حوض کوثر پر آ کر ملنا، مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کوحسن خاتمہ کی اور جنت کی بشارت دی تھی اس لئے صحابہ نے ان کوتسلی دی، انھوں نے کہا کہ ہاں یہ بات تو ہے لیکن میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا ہے کہ اللہ نے کچھ لوگوں کو داہنی مٹھی میں لیا اور کچھ لوگوں کو دوسری مٹھی میں لیا اور فرمایا کہ یہ مٹھی والے جنت کے لئے ہیں اوردوسری مٹھی والوں کے متعلق فرمایا کہ یہ جہنم کے لئے ہیں اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے، ابوعبداللہ نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس وقت کس مٹھی میں تھا، میں اسی غم میں رو رہا ہوں۔

مونچھیں کاٹنے کا حکم اورطریقہ:

خذ من شاربک ثم أقر :یعنی اپنی مونچھیں کاٹا کرو اور پابندی کے ساتھ یہ عمل انجام دیتے رہو، مونچھیں کاٹنا اور ان کوہونٹوں سے متجاوز نہ ہونے دینا مسنون اور اعمال فطرۃ میں سے ہے، البتہ کاٹنے کی کیفیت کیا ہو؟ حلق کیاجائے یا قصر یعنی باریک کاٹا جائے؟ راجح یہ ہے کہ حلق کے بجائے ان کوخوب پست اورچھوٹا کرلیا جائے۔اس کی تفصیل مع دلائل کتاب الطہارۃ میں آرہی ہے۔(۲)

تلقانی:اس سے حوض کوثر پر یا آخرت کے کسی اور مقام پر ملنا مراد ہے، اس سے سنت پرعمل کی اہمیت

---

(۱)میزان الاعتدال ۸/ ۱۸۱،المرقاۃ ۱/ ۳۰۱.

(۲)شامی۲/ ۲۰٤.

وفضیلت ظاہر ہے، عامل بالسنۃ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں خصوصی اکرام فرمائیں گے۔

سوال: جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حوض کوثر پر ملنے کی بشارت سنادی تھی تو ان کا جنتی ہونا ثابت ہوگیا اور یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ اہل جنت والی مٹھی میں تھے، پھرانہوں نے ''**ولاادری في أی القبضتين أنا**'' کیوں کہا؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حسن خاتمہ کی بشارت دی تھی لیکن ایک قید لگائی تھی کہ مونچھوں کو پست رکھنا اور اسی پر ثابت قدم رہنا تو ان کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ معلوم نہیں میں اپنی زندگی میں صحیح معنی میں اس پر ثابت قدم رہ سکا یا نہیں؟

(۲) اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دی تھی لیکن ان پر خوف کا غلبہ ہوا کہ اللہ کو اس کے خلاف پر بھی قدرت ہے تو غلبۂ خوف کی وجہ سے ''**لاأدري في اى القبضتين أنا**'' کہا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ پر غلبۂ خوفِ خداوندی:

اور اس طرح کے واقعات ان جلیل القدر صحابہ کے بھی منقول ہیں جن کو مطلقاً جنت کی بشارت مل چکی تھی، ان پر جب خوف کا غلبہ ہوتا تو وہ حضرات پرندہ ہونے کی اور بعض گھاس کا تنکا ہونے کی تمنا کرتے، نیز حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب بادل آتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوجاتے چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا، تا آنکہ بادل برسنے لگے یا ختم ہوجائے، حضرت عائشہؓ نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ قوم عاد بھی بادل کو دیکھ کر خوش ہوئے تھے اور کہا تھا: ''**هذا عارض ممطرنا**'' کہ یہ بادل ہمیں سیراب کرے گا، حالانکہ وہی بادل ان کے لئے عذاب کا سامان بنا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خوف ہوتا کہ کہیں یہ بادل عذاب خداوندی کو لئے ہوئے نہ ہو، حالانکہ قرآن کریم کا وعدہ آگیا ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ عذاب نازل نہیں فرمائے گا ''**وما كان الله ليعذبهم الخ**''، مگر جب اللہ کے خوف کا غلبہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہ کی شان بے نیازی سے ڈرتے کہ بہرحال وہ مالک ارض وسماء ہے اور شانِ بے نیازی رکھتا ہے، پس وہ جو چاہے کرسکتا ہے، کسی کو اس کے سامنے جنبش لب کی اجازت نہیں۔

۱۱۴ / ۴۲ وَعَنِ ابنِ عَبَّاسٍؓ عن النبي صلى الله عليه وسلم قَالَ: أَخَذَ اللهُ الْمِيثَاقَ مِنْ ظَهْرِ آدَمَ بِنَعْمَانَ يَعْنِي عَرَفَةَ فَأَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهِ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَأَهَا، فَنَثَرَهُمْ

بَیْنَ یَدَیْهِ کَالذَّرِّ، ثُمَّ کَلَّمَهُمْ قُبُلاً قَالَ "أَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوْا بَلٰی شَهِدْنَا أَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَةِ إِنَّا کُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِیْنَ اَوْتَقُوْلُوْا إِنَّمَا اَشْرَکَ آبَاءُنَا مِنْ قَبْلُ وَکُنَّا ذُرِّیَّةً مِنْ بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِکُنَا بِمَافَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ" (رواه أحمد)(۱)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ شانہ نے عرفات کے قریب مقام نعمان میں حضرت آدم علیہ السلام کی اس اولاد سے جوان کی پشت سے نکلی تھی عہد لیا، چنانچہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی تمام اولاد کو نکالا جن کو (ازل سے ابد تک) پیدا کرنا تھا اور ان سب کو چیونٹیوں کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پھیلا دیا، پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے ان سے روبرو گفتگو فرمائی اور فرمایا کہ: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نے کہا: کیوں نہیں! یقیناً آپ ہمارے رب ہیں ہم شہادت دیتے ہیں (آپ کے رب ہونے کی) پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا (یہ شہادت میں نے تم سے اس لئے لی ہے کہ) تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے غافل وناواقف تھے یا تم کہنے لگو کہ ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے شرک کیا تھا اور ہم ان کے بعد ان کی اولاد سے ہیں، آپ ہمیں اس چیز کی وجہ سے کیوں ہلاکت میں ڈالتے ہیں جو باطل لوگوں نے (جرم) کیا۔ (احمد)

تشریح حدیث

عہد الست کا بیان:

اس حدیث میں عہد الست کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے عرفات کے قریب وادی نعمان میں آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت کی ارواح کو نکالا اور ان کو عقل عطا فرمائی، پھر ان سے اپنی ربوبیت کے بارے میں سوال کیا انہوں نے اس خداداد عقل سے معاملہ کی حقیقت کو سمجھ کر اقرار کیا کہ واقعی آپ ہمارے رب ہیں ہم آپ کی ربوبیت اور وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں اور ہم اس پر گواہ بھی بنتے ہیں۔

اس عہد کی وجہ اللہ نے یہ بیان فرمائی کہ اختیار شرک پر قیامت میں مواخذہ ہو تو یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس توحید سے غافل تھے یا یوں نہ کہنے لگو کہ ہم شرک میں اپنے آباء واجداد کے تابع تھے کہ اصل قصور تو ان

(۱) أخرجه أحمد ۱/ ۲۷۲ برقم ۲۴۵۵.

کا تھا اور اولاد اور نسل تو عقائد وخیالات میں اپنے آباؤ اجداد کے تابع ہوتی ہے اسلئے ہم بے خطا ہیں، لہٰذا ہمیں سزا نہ ہونی چاہئے، جب ان سے یہ عہد واقرار لے لیا گیا تو ان کے لئے اب عذر کا جواز نہیں رہے گا۔

بنعمان: ''نعمان'' ظمأن کے وزن پر ہے یہاں راوی نے اس کی تفسیر عرفہ سے فرمائی ہے، مگر یہ عرفات کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ عرفات کے برابر میں ایک وادی کا نام ہے۔(۱)

عہد جب یاد نہیں تو اس کے لینے کا کیا فائدہ؟

سوال ہوتا ہے کہ اس عہد کا فائدہ کیا ہوا جبکہ دنیا میں یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا؟ جواب یہ ہے کہ اگر چہ یہ عہد یاد نہیں رہا لیکن حضرات انبیاء کرام اور ان کے قائم مقام علماء اس کی یاددہانی کراتے رہے ہیں اور کوئی معتبر آدمی کسی بات کی یاددہانی کرادے تو وہ چیز خود اپنے سننے کے درجے میں ہو جاتی ہے۔

پھر سوال ہوتا ہے کہ انبیاء نے جب یاددہانی کرائی ہے تو مدار ان کی یاددہانی پر ہوا پھر عہد لینے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ عہد لینے کا فائدہ یہ ہوا کہ بھولی ہوئی چیز کو یاد کرنا آسان ہوتا ہے از سرنو یاد کرنے کے مقابلہ میں، اسی لئے وحدانیت اور ربوبیت کا مسئلہ آدمی جلدی قبول کر لیتا ہے، رسالت کو دیر میں قبول کرتا ہے، تجربہ بھی اس کا شاہد ہے، علاوہ ازیں حضرات مفسرین نے یہ صراحت فرمائی ہے کہ بہت سے لوگوں کو عہد الست یاد تھا جیسے حضرت علی، حسن بصری وغیرہ۔(۲)

''بلیٰ'' کی جگہ اگر ''نعم'' کہد یا جاتا:

اس موقعہ پر حضرت عبداللہ ابن عباس سے ایک علمی نکتہ منقول ہے وہ فرماتے تھے کہ عہد الست میں اگر لوگ بجائے ''بلیٰ'' کے ''نعم'' کہتے تو سب کافر ہوتے، کیوں کہ ''نعم'' ماقبل کی تاکید کرتا ہے ماقبل میں نفی ہو تو نفی کی تاکید کرتا ہے اور اثبات ہو تو اثبات کی تاکید کرتا ہے، برخلاف ''بلیٰ'' کے کہ وہ نفی کی نفی کے لئے آتا ہے اور نفی کی نفی اثبات ہے، اس لئے ''ألست بربكم'' کے جواب میں اگر لوگ ''نعم'' کہتے تو مطلب یہ ہوتا کہ ہاں تو ہمارا رب نہیں ہے اور یہ کفر ہے۔(۳)

---

(۱)الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد الشیبانی ۱/۳۳.

(۲)معارف القرآن ٤/١١٥.

(۳)روح المعانی ٥/٩٤.

۱۱۵ / ٤٣ وَعَنْ أُبَيِّ بن كعبٍؓ فِيْ قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ: "وَإِذْ اَخَذَرَبُّکَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ" قَالَ جَمَعَهُمْ فَجَعَلَهُمْ أَزْوَاجاً، ثُمَّ صَوَّرَهُمْ فَاسْتَنْطَقَهُمْ، فَتَكَلَّمُوْا، ثُمَّ أَخَذَ عَلَيْهِمُ الْعَهْدَ وَالْمِيْثَاقَ، "وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" قَالُوْا: بَلٰى: قَال فَإِنِّيْ أُشْهِدُعَلَيْكُمُ السَّمٰوٰتِ السَبْعَ وَالْأَرْضِيْنَ السَبْعَ، وَأُشْهِدُعَلَيْكُمْ أَبَاكُمْ آدَمَ أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ: لَمْ نَعْلَمْ بِهٰذَا، اِعْلَمُوْا أَنَّهُ لاإِلٰهَ غَيْرِي، وَلارَبَّ غَيْرِيْ، وَلاتُشْرِكُوْا بِيْ شَيْئاً، إِنِّيْ سَأُرْسِلُ إِلَيْكُمْ رُسُلِيْ يُذَكِّرُوْنَكُمْ عَهْدِيْ وَمِيْثَاقِيْ، وَأُنْزِلُ عَلَيْكُمْ كُتُبِيْ، قَالُوْا: شَهِدْنَا بِأَنَّكَ رَبُّنَا وَإِلٰهُنَا لارَبَّ لَنَا غَيْرُكَ، وَلاإِلٰهَ لَنَا غَيْرُكَ، فَأَقَرُّوْا بِذٰلِكَ، وَرُفِعَ عَلَيْهِمْ آدَمُ عَلَيْهِ السَّلامُ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، فَرَأَى الْغَنِيَّ وَالْفَقِيْرَوَحَسَنَ الصُّوْرَةِ وَدُوْنَ ذٰلِكَ فَقَالَ: رَبِّ لَوْلا سَوَّيْتَ بَيْنَ عِبَادِكَ! قَالَ: إِنِّيْ أَحْبَبْتُ أَنْ أُشْكَرَ، وَرَأَى الأَنْبِيَاءَ فِيْهِمْ مِثْلَ السُّرُجِ عَلَيْهِمِ النُّوْرُ، خُصُّوْا بِمِيْثَاقٍ آخَرَ فِي الرِّسَالَةِ وَالنُّبُوَّةِ، وَهُوَ قَوْلُهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: وَإِذْأَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ إِلٰى قَوْلِهِ "عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمْ" كَانَ فِيْ تِلْكَ الأَرْوَاحِ، فَأَرْسَلَهُ إِلٰى مَرْيَمَ عَلَيْهَا السَّلامُ فَحُدِّثَ عَنْ أُبَيّ: أَنَّهُ دَخَلَ مِنْ فِيْهَا. (رواه أحمد)(۱)

ترجمہ: حضرت ابی بن کعبؓ سے "واذاخذربک الآیۃ" (یادکرواس وقت کو جب تمہارے پروردگار نے اولاد آدم کی پشتوں سے انکی اولاد نکالی) اس آیت شریفہ کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے اولاد آدم کو جمع فرمایا، پھران کو جوڑے بنایا، پھران کی شکل وصورت عطاء فرمائی، اوران کو گویائی عطافرئی، پس انھوں نے گفتگو کی، پھران سے عہد و پیمان لیا اورپھران کوخودان کے اوپر گواہ قراردے کر پوچھا: کیامیں تمہارارب نہیں ہوں؟ اولاد آدم نے کہا: کیوں نہیں! یقیناً آپ ہمارے رب ہیں، پھراللہ تعالی شانہ نے فرمایا: میں ساتوں آسمانوں اورساتوں زمینوں کوتمہارے سامنے گواہ بناتاہوں اورتمہارے باپ آدم کوبھی گواہ قراردیتاہوں، تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اس سے ناواقف تھے، اس وقت تم اچھی طرح جان لو، نہ تو میرے سواکوئی معبود ہے اور نہ ہی میرے سواکوئی پروردگار ہے اورمیرے ساتھ کسی کوشریک

(۱)أخرجه أحمد في مسنده: ٥ / ١٣٥ (٢١٢٧٠)

نہ قرار دینا، میں تمہارے پاس عنقریب اپنے رسول بھیجوں گا، جو تمہیں میرے عہدو پیمان یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں نازل کرونگا (یہ سن کر) اولاد آدم نے کہا، ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہمارے رب ہیں اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوانہ تو کوئی ہمارا پروردگار ہے اور نہ ہی آپ کے سوا کوئی ہمارا معبود ہے چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد نے اس کا اقرار کیا، اور حضرت آدم علیہ السلام کو ان کے اوپر بلند کر دیا گیا جس سے وہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے، آدم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کی اولاد میں امیر بھی ہیں اور فقیر بھی اور خوبصورت بھی اور بدصورت بھی، یہ دیکھ کر انہوں نے عرض کیا: پروردگار! آپ نے تمام بندوں کو یکساں اور برابر کیوں نہ بنایا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے حضرات انبیاء علیہ السلام کو دیکھا جو چراغوں کی طرح تھے اور ان پر نور تھا، ان سے رسالت ونبوت کے سلسلہ میں خصوصی عہد و پیمان لیا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا قول ہے **واذاخذنا من النبیین میثاقھم ومنک ومن نوح وإبراھیم وموسی عیسی بن مریم الخ**: ان روحوں کے درمیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے، چنانچہ ان کی روح کو اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بھیج دیا، حضرت ابی بن کعب سے نقل کیا گیا کہ یہ روح حضرت مریم علیہا السلام کے منھ کی طرف سے ان کے جسم میں داخل ہوئی۔ (احمد)

تشریح حدیث

احوال ابی بن کعب:

ابی بن کعب الانصاری الخزرجی، ابو المنذر وابوالطفیل کنیت ہے، اقرأ الصحابہ ہیں، کاتب وحی ہیں، جلیل القدر صحابی ہیں اور حفاظ صحابہ میں سے ہیں، بدر اور اس کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو "سید الانصار" کہا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ ان کو اپنے زمانہ میں "سید المسلمین" کہا کرتے تھے ۱۹ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔(۱)

عہد الست کا تفصیلی واقعہ:

حضرت ابی بن کعب نے آیت کریمہ **واذاخذربک من بنی آدم** ......الخ کی تفسیر فرمائی، جس

(۱) الإصابة ۱ / ۳۵.

میں عہد الست کا بیان ہے البتہ اس تفسیر میں ماقبل کی روایات کے بہ نسبت کچھ چیزیں زائد ہیں ان کی وضاحت یہ ہے:

جعلهم ازواجاً :اس سے مراد بعض کو مذکر اور بعض کو مونث بنانا ہے یا مختلف اصناف: غریب، امیر، خوبصورت اور بدصورت بنانا ہے، آگے غنی اور فقیر کا بیان اس کی تفسیر ہے۔

رفع عليهم آدم عليه السلام: آدم علیہ السلام کو ایک بلند جگہ بٹھایا گیا انہوں نے بعض کو غنی بعض کو فقیر بعض کو خوبصورت اور بعض کو بدصورت دیکھا، اس سے ان کو تعجب ہوا، انہوں نے حق تعالیٰ شانہ سے سوال کیا کہ اے اللہ تو نے اپنے بندوں کے درمیان برابری کیوں نہیں فرمائی؟ کہ سب غنی ہوتے کوئی فقیر نہ ہوتا، سب خوبصورت ہوتے کوئی بدصورت نہ ہوتا، اللہ نے حکمت بیان فرمائی کہ میں نے چاہا کہ میرا شکر ادا کیا جائے، اگر درجات کا تفاوت نہ ہوتا تو بندے اللہ کا شکر ادا نہ کرتے، درجات کے تفاوت کی وجہ سے اللہ کا شکر ادا کیا جائے گا، چنانچہ غنی جب فقیر کی عسرت وتنگی کو دیکھے گا تو اپنی خوشحالی پر اللہ کا شکر ادا کریگا، فقیر جب مال کی وجہ سے آنے والے فتنوں کو دیکھے گا اور خود کو ان سے محفوظ پائیگا تو اپنے فقیر ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرے گا، خوبصورت اپنے جمال پر شکر ادا کرے گا اور بدصورت شخص حسن و جمال کی وجہ سے آنے والے فتنوں کو دیکھے گا اور اپنے آپ کو ان سے محفوظ پائے گا تو اللہ کا شکر ادا کرے گا۔

ورای الانبياء فيهم مثل السرج: ''السرج'' ''سراج'' کی جمع ہے، بمعنی چراغ۔

آدم علیہ السلام نے اپنی ذریت میں انبیاء کرام کو چراغ کی طرح منور دیکھا، چونکہ انبیاء علیہم السلام منبعِ ہدایت ہوتے ہیں اس لئے ہدایت کا نور ان پر نظر آیا۔

انبیاء کرام سے لئے گئے ایک عہد کا تذکرہ:

خصوا بميثاق آخر الخ: وہاں عالم ارواح میں انبیاء کرام سے بھی ایک عہد لیا گیا جس کا اجمالی بیان اس آیت میں ہے: **واذاخذنا من النبيين ميثاقهم ومنك......الخ** اور اس کی تفصیل دوسری آیت میں ہے جو یہ ہے: **وإذ أخذ الله ميثاق النبيين لماآتيتكم من كتب وحكمة ......الخ** انبیاء سے باہمی تصدیق وتعاون کا عہد بھی لیا گیا یعنی اگر ایک نبی کے زمانہ میں دوسرے بھی آ جائیں تو وہ ایک

دوسرے کی تصدیق کریں مدد کریں، غرضیکہ ان سے باہم تعاون و تناصر کا عہد بھی لیا گیا۔

اس عہد کے بعد ان ارواح کو ان کے آباء کی پشتوں میں پہنچا دیا گیا، عیسیٰ کی روح بھی ان ارواح میں تھی، ان کی روح کو بواسطہ جبرئیل حضرت مریم کے منہ میں پھونک دیا گیا کیونکہ ان کی پیدائش بلاواسطہ باپ حضرت مریم کے بطن سے ہونا تھی۔

فحدث عن أبي: حُدِّث صیغہ مجہول ہے اور مطلب یہ ہے کہ: حضرت ابی بن کعب نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح حضرت مریم کے منھ کے راستہ سے ان میں داخل کی گئی۔

١١٦ / ٤٤ وعَن أبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ : بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَرَسُوْلِ الله صلی الله علیه وسلم: نَتَذَاکَرُ مَایَکُوْنُ، إِذْقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم : إِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَکَانِهِ فَصَدِّقُوْهُ، وَإِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَیَّرَعَنْ خُلُقِهِ فَلَاتُصَدِّقُوْابِهِ، فَإِنَّهُ یَصِیْرُإِلٰی مَاجُبِلَ عَلَیْهِ" (رواه أحمد)(١)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے کہ: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے آئندہ ہونے والی چیزوں کا مذاکرہ کررہے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہماری باتوں کو سن کر) فرمایا جب تم سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو اسے سچ مان لو، لیکن جب تم یہ سنو کہ کسی شخص کی عادت بدل گئی تو اس کی تصدیق نہ کرو (یعنی اس کا اعتبار نہ کرو) اس لئے کہ انسان اسی چیز کیطرف لوٹتا ہے جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔ (احمد)

تشریح حدیث

عادات واخلاق میں تبدیلی ناممکن:

اس حدیث میں بھی تقدیر کا بیان ہے کہ لوگوں کی عادات واخلاق بھی تقدیر کے ماتحت ہیں اور جو تقدیر میں درج کیا گیا وہ ایسا پختہ ہے کہ اس میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئندہ زمانے میں ہونے والی

(١) أخرجه أحمد ٦ / ٤٤٣ برقم ٢٧٥٣٩.

چیزوں کا تذکرہ کررہے تھے کہ کائنات میں جوکچھ واقع ہوتا ہے وہ ان چیزوں میں سے ہے جن کا واقع ہونا علم الٰہی میں پہلے سے طے ہو چکا ہے، یا ایسی چیز ہے جو کسی سبب کے پیش آنے سے فوری طور پر وجود میں آتی ہے، ماضی کے قضا وقدر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں یہ سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس کی تصدیق کرو اور اگر کسی شخص کے متعلق یہ سنو کہ اس کی عادت بدل گئی ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو، کیونکہ آدمی اسی خصلت کی طرف لوٹتا ہے جس پر اس کی تخلیق ہوئی ہے، غرض یہ بتانا ہے کہ ہر شئی مقدر ہے حتی کہ آدمی کے عادات واخلاق بھی مقدر ہیں، ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

بجبل زال عن مكانه: پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹ جانا ممکن ہے، چنانچہ بنی اسرئیل کے زمانہ میں ایسا ہو بھی چکا ہے، قرآن کریم میں ہے ''وَاِذْنَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ......الخ '' وہ وقت یاد کرو جب ہم نے ان پر پہاڑ ایسے اٹھالیا تھا جیسا کہ وہ کوئی سائبان ہو، پس پہاڑ کا اپنی جگہ سے ہٹنا ممکنات میں سے ہے، لیکن آدمی کی خصلت کا بدلنا ممکن نہیں۔

عادات واخلاق کی درستگی کا مفہوم ومطلب:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کے اخلاق نہیں بدلتے، حالانکہ قرآن وحدیث میں اخلاق کو سنوارنے کا حکم ہے، قرآن کریم میں ہے: ''قد افلح من تزکی '' جس نے اپنے آپ کو پاکیزہ بنالیا وہ کامیاب ہوگیا، اور حدیث میں ہے: ''حسنوا أخلاقكم'' وغیر ذالک من النصوص، یعنی اپنے اخلاق اچھے بناؤ، پس جب اخلاق میں تبدیلی ممکن نہیں ہے تو پھر اخلاق کے تزکیہ اور تحسین کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اور حضرات صوفیاء اس کے لئے ریاضتیں اور مجاہدے کیوں کراتے ہیں؟ اس سوال کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) اصل خلقت کے اعتبار سے آدمی میں اچھے اخلاق بھی ہوتے ہیں اور برے بھی، شریعت کی جانب سے حکم اس بات کا ہے ان میں اعتدال پیدا کیا جائے اور اسی اعتدال کا نام خلق حسن ہے اور اعتدال لانا آدمی کے اختیار میں ہے، اس لئے حسن اخلاق کا مکلّف بنایا گیا ہے۔(۱)

(۲) قرآن وحدیث میں جو اخلاق کے سنوارنے کا حکم ہے تو اس سے اصل مقصود جبلی اخلاق کا ازالہ

(۱) المرقاة ۱/۳۰۹.

نہیں، بلکہ امالہ یعنی ان کے رخ کو پھیرنا مقصود ہوتا ہے جبکہ حدیث میں ازالہ کی نفی کی گئی ہے، مثلاً ایک شخص کے اندر غصہ ہے وہ اس کا ازالہ کرنا چاہے اس کے مادہ کو ختم کرنا چاہے تو ختم نہیں کرسکتا البتہ ریاضت مجاہدہ اورمشق سے اس کے رخ کو پھیرا جاسکتا ہے، بایں طور کہ جس غصہ کا مظاہرہ اہل وعیال اور مسلمانوں پر کیا کرتا تھا ان کے ساتھ تو نرمی اور ترحم کا برتاؤ کرے اور غصہ جہاد کے موقعہ میں کفار اوراعداء اسلام پر اتارے، حق تعالیٰ شانہ نے حضرات صحابہ کی قرآن کریم میں یہی شان بیان فرمائی ہے''**والذین معه اشداء الخ**''، اسی طرح سخاوت اور بخل کہ جن مواقع میں خرچ کرنا عنداللہ پسندیدہ ہے وہاں سخاوت کو اختیار کرے، جہاں خرچ کرنا ممنوع اورعنداللہ ناپسند ہے وہاں بخل سے کام لے، مؤمنین کے ساتھ تواضع برتے اور کفار سے جہاد کے وقت بڑائی اور دلیری کا مظاہرہ کرے۔

۱۱۷ / ۴۵ وَعَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، قَالَتْ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! لَايَزَالُ يُصِيْبُكَ فِيْ كُلِّ عَامٍ وَجَعٌ مِنَ الشَّاةِ الْمَسْمُوْمَةِ الَّتِيْ أَكَلْتَ قَالَ: ''مَاأَصَابَنِيْ شَيْءٌ مِنْهَا إِلَّا وَهُوَ مَكْتُوْبٌ عَلَيَّ وَآدَمُ فِيْ طِيْنَتِهِ''(رواه ابن ماجه)(۱)

ترجمه:حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ: آپ نے جو زہر آلود بکری کھائی تھی (جو خیبر میں ایک یہودی عورت نے کھلائی تھی) ہر سال اس کی وجہ سے آپ کو بیماری اور تکلیف لاحق ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی وجہ سے جو چیز (اذیت) مجھکو پہنچتی ہے وہ میرے لئے اسی وقت لکھدی گئی تھی جب کہ آدم اپنی مٹی کے اندر تھے۔(ابن ماجہ)

تشریحِ حدیث

احوال ام سلمہؓ:

ام المؤمنین ہیں، ازواج مطہرات میں بڑے مرتبہ والی ہیں، نام: ہند بنت ابی امیہ ہے، والد کا نام حذیفہ اوربقول بعض سہل تھا، جو''زاد الراکب'' کے لقب سے مشہور تھے، کیونکہ وہ نہایت سخی تھے، اورجس قافلہ میں چلتے اس کے تمام سواروں کے خوردونوش اپنے ذمہ لے لیا کرتے، پہلے ابوسلمہ کے نکاح میں تھیں،

(۱)أخرجه ابن ماجه في الطب، باب السحر ۲ / ۲۵۳.

ان کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں، مدینہ ہجرت کرکے جانے والی عورتوں میں سب سے پہلی عورت ہیں جو مدینہ میں داخل ہوئیں، ۵۹ھ میں وفات ہوئی، اور جنت البقیع میں مدفون ہیں، کل عمران کی ۸۴ سال ہوئی۔ (۱)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر دینے کا واقعہ اور اس کے اثرات:

ایک یہودیہ عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے ایک سازش رچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور چند صحابہ کی دعوت کی، اس موقعہ پر اس نے بکری ذبح کی اور اس میں زہر ملادیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ تشریف لائے اور کھانا شروع کیا، تو جبرئیل علیہ السلام نے آکر بتایا کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے، آپ اور آپ کے ساتھی اس کو نہ کھائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور صحابہ کو بھی روک دیا، البتہ ایک دولقمہ زہر آلود آپ علیہ الصلوۃ والسلام تناول فرماچکے تھے جس سے زہر کا اثر جسم میں پہنچ گیا، اس کے اثر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر سال کوئی نہ کوئی بیماری لاحق ہوتی تھی جو آپ کے لئے سخت اذیت کا سبب بنتی، علماء نے صراحت فرمائی ہے کہ مرض الوفات میں بھی اس کا اثر تھا اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتبۂ شہادت بھی نصیب ہوا ہے۔

یہ تکالیف میرا مقدر ہیں:

بہرحال ہر سال اس زہر کی وجہ سے آپ کو جو امراض پیش آتے اس پر ام سلمہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اظہار افسوس کیا کہ ہر سال کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس زہر کی وجہ سے جو بیماری اور تکلیف مجھے پہنچتی ہے وہ میرے مقدر میں اس وقت لکھ دی گئی تھی جب آدم علیہ السلام اپنے خمیر میں ہی تھے، یعنی تخلیق آدم علیہ السلام سے قبل، لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، معلوم ہوا کہ احوال وامراض وغیرہ بھی من جانب اللہ مقدر اور طے ہیں۔

و آدم فی طینتہ: علامہ طیبیؒ نے کہا کہ یہ تقدیر سابق کی مثال ہے تعیین وقت مقصود نہیں ہے، کیونکہ آدم کا اپنے خمیر میں ہونا بھی تقدیر کی ایک چیز ہے نہ کہ خارج تقدیر شی۔ (۲)

(۱) تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو: الاصابة ۸/ ۱۵۰.

(۲) شرح المشكاة للطيبي ۱/ ۳۰۲.

(٤) باب إثبات عذاب القبر

عذاب قبر کے اثبات کا بیان

الفصل الأول

قبر میں عذاب یا ثواب کا مسئلہ ایمانیات کا ایک اہم مسئلہ ہے اسی لئے مصنفؒ نے اس کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کیا ہے، اس بارے میں چند باتیں عرض ہیں:

ماقبل سے مناسبت:

(۱) ماقبل میں ایمان بالقدر کا بیان تھا اور ایمان بالقدر اللہ تعالیٰ کی کئی صفات کو مستلزم ہے خصوصاً علم وقدرت کو، پس جب اللہ شانہ کو ہر چیز کا علم ہے اور ہر چیز پر قدرت بھی ہے تو وہ برے اعمال پر سزا دینے پر بھی قادر ہے اور سزا کی ایک صورت عذاب قبر بھی ہے۔

(۲) تقدیر کا مسئلہ مشہور اختلافی مسئلہ ہے ایسے ہی عذابِ قبر کے مسئلہ میں بھی اختلاف مشہور ہے، ان دو وجہوں کی بنا پر ایمان بالقدر کے بعد عذاب قبر کو بیان کیا۔

عنوان پر اشکال اور اس کے جوابات:

اس ترجمہ پر اشکال ہے کہ اس باب کے تحت دو قسم کی روایات ہیں، بعض میں عذاب قبر کا ذکر ہے اور بعض میں راحتِ قبر کا، تو ترجمہ میں بھی دونوں کا تذکرہ ہونا چاہئے محض عذاب قبر کا عنوان کیوں قائم کیا؟ اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) عذاب قبر سے بچنے کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے عذاب قبر کا عنوان قائم کیا گیا ہے کیونکہ عذاب قبر سے بچنا دفعِ مضرت کے قبیل سے ہے اور راحت قبر جلبِ منفعت کے قبیل سے ہے اور قاعدہ ہے کہ دفعِ مضرت اولی ہے جلبِ منفعت سے۔

(۲) فقہاء ومحدثین کی اصطلاح میں عذابِ قبر سے مراد احوال برزخ ہوتے ہیں اور احوال برزخ میں عذاب وراحت دونوں داخل ہیں لیکن عذاب کو راحت پر غلبہ دیا گیا ہے اس لئے کہ راحت مومن مطیع کو حاصل ہوگی اور عذاب فاسقین وکافرین کو ہوگا اور ان کی تعداد زیاد ہے **وقليل من عبادي الشكور**، پس

معذَّ بین کی کثرت کی وجہ سے عذاب کو اسکے مقابل پر غلبہ دیا گیا۔

(۳) بعض نے کہا کہ قبر فی نفسہ مقام وحشت ہے، جب آدمی اس کا نام سنتا ہے تو گھبرا جاتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہے اس لئے وہاں کے احوال کو عذاب سے تعبیر کیا۔

(۴) بعض نے کہا کہ منکر نکیر جب مردے کے پاس آتے ہیں تو اول وہلہ میں ہر آدمی ان سے ڈرتا ہے اور تکلیف محسوس کرتا ہے، تو یہ بھی ایک قسم کا عذاب ہے اس لئے عذاب قبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قبر کا مفہوم:

قبر کے دو معنی ہیں ایک حقیقی: یعنی وہ گڑھا جس میں مردہ مدفون ہوتا ہے، دوسرے مجازی: یعنی عالم برزخ، موت کے بعد سے دوبارہ زندہ ہونے تک کے زمانہ کو ''برزخ'' کہا جاتا ہے، عرفاً وشرعاً قبر سے اس کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں الا یہ کہ مجازی معنی پر کوئی قرینہ موجود ہو، انتقال کے بعد انسان کی روح عالم برزخ میں چلی جاتی ہے اور جسم دنیا میں رہتا ہے، خواہ گڑھے میں ہو یا جل کر راکھ ہوگیا ہو یا ڈوب گیا ہو یا کسی درندہ نے کھالیا ہو، اس دنیاوی جسم کے ساتھ برزخ میں موجود روح کا تعلق قائم کر کے اللہ تعالیٰ ہر دو کو تکلیف وراحت کا احساس کراتا ہے۔(۱)

مسئلۂ عذاب قبر:

اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ کافر کے لئے عذاب قبر اور مومن کے لئے راحت قبر برحق ہے، قدمائے معتزلہ بھی اس کو تسلیم کرتے تھے لیکن متاخرین معتزلہ، اسی طرح مرجئہ، روافض اور خوارج نے اس کا انکار کیا ہے اور اس زمانہ میں منکرین حدیث جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں وہ بھی اس کے منکر ہیں، ان کا یہ موقف نصوص شرعیہ کے خلاف ہے کیونکہ قرآن وسنت کی بے شمار نصوص جیسا کہ آئندہ آرہا ہے، اس کے ثبوت پر دال ہیں، اسی لئے بہت سے علماء نے ایسے لوگوں کو جو عذاب قبر کے منکر ہیں کافر قرار دیا ہے، البتہ راجح قول کے مطابق منکرینِ عذاب قبر پر کافر ہونے کا حکم نہیں، بلکہ وہ فاسق وگمراہ ہیں، اس لئے کہ وہ تاویلاً منکر ہیں اور ضابطہ ہے: ''المؤوِّل لایکفر''

(۱) لمعات التنقیح ۱/۴۱۷۔

عذاب قبر کا ثبوت:

عذاب قبر کا ثبوت قرآن کریم سے بھی ہے اور احادیث متواترہ سے بھی، البتہ قرآن کریم سے ثبوت عبارۃ النص کے طور پر نہیں بلکہ دلالۃ النص کے طور پر ہے، قرآن کی کئی آیات عذاب قبر کے برحق ہونے پر دال ہیں۔

(۱) مثلاً آل فرعون کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ''اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةَ أَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ [۱]''، یعنی آگ ان لوگوں کے سامنے صبح وشام پیش کی جاتی ہے اور جس دن قیامت آئے گی تو حکم ہوگا کہ سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔ اس آیت میں دو عذابوں کا تذکرہ ہے ایک قیامت کا عذاب اور ایک قیامت سے پہلے کا عذاب اور یہی عذاب قبر ہے۔

(۲) قوم نوح کے بارے میں اللہ نے فرمایا ''مِمَّا خَطِيْئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَأُدْخِلُوْا نَارًا [۲]'' یعنی ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے ہی انہیں غرق کیا گیا، پھر آگ میں داخل کیا گیا، اس آیت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ مرنے کے معاً بعد ان کو آگ میں داخل کیا گیا کیونکہ دخول نار کا ترتب غرق وہلاکت پر فاء کے ذریعہ کیا گیا ہے اور فاء جس کا مدلول بعدیتِ متصلہ ہے یعنی قومِ نوح ادھر پانی میں غرق ہوئی اور ادھر آگ میں داخل کی گئی، ظاہر ہے کہ یہ قیامت سے پہلے برزخی عذاب ہے جو عذابِ قبر ہے، عذاب جہنم تو میدان حشر کے بعد ہوگا۔ [۳]

کیفیت عذاب قبر:

جو حضرات عذاب قبر کو برحق مانتے ہیں ان کا عذاب قبر کی کیفیت میں اختلاف ہے۔

(۱) محمد بن جریر کرامی نے کہا کہ عذاب قبر صرف جسم کو ہوگا روح کو نہیں اس لئے کہ روح یا تو اعلیٰ علیین میں یا اسفل سافلین یعنی سجین میں ہوتی ہے، اس لئے عذاب روح سے متعلق نہیں ہوتا، مگر یہ قول صحیح نہیں ہے۔

(۲) علامہ ابن حزم ظاہری اور دیگر بعض علماء نے کہا کہ عذاب قبر روح کو ہوگا جسم کو نہیں، یہ قول بھی

---

(۱) من سورة المؤمن: ٤٦.

(۲) من سورة نوح: ٢٥.

(۳) المرقاة ١ / ٣١٠.

نصوص کے خلاف ہے۔

(۳) جمہور فرماتے ہیں کہ عذاب قبر جسم وروح دونوں کو ہوگا کیوں کہ مرنے کے کچھ دیر بعد روح کو جسم میں لوٹادیا جاتا ہے۔

مدت عذاب قبر:

اس کی کوئی صراحت احادیث میں نہیں ہے، بعض علماء نے کہا کہ مومن کامل کو دائمی راحت اور کافر کے لئے دائمی عذاب ہوگا اور مومن فاسق کے لئے عارضی یعنی کچھ وقت کے لئے عذاب قبر ہوگا پھر وہ عذاب ہٹادیا جائے گا۔[1]

اشکالات برعذاب قبر:

عذاب قبر کے منکرین نے اس پر چند اعتراضات کئے ہیں:

(۱) ایک اعتراض یہ ہے کہ مرنے کے بعد بعض مرتبہ بدن انسانی محفوظ نہیں رہتا، کبھی مرنے والے کی لاش کو جلادیا جاتا ہے، کبھی جانور کھاجاتا ہے کبھی اس کے ذرات کو سمندر میں بہادیا جاتا ہے، پس جب جسم کے اجزاء محفوظ نہیں تو اس کو کس طرح عذاب دیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس اعتراض کی بنا ایک غلط خیال پر ہے کہ قبر محض ایک گڈھے کا نام ہے اور عذاب وثواب کا مدار بدن انسانی کے ڈھانچے پر ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ یہاں قبر سے مراد عالم برزخ ہے جیسا کہ گزرا، اور عذاب وثواب کا مدار اللہ کے علم کامل وقدرت کاملہ پر ہے، مرنے والا اگرچہ زمین میں دفن نہ ہو، اس کو جلادیا جائے یا کوئی جانور کھاجائے؛ لیکن بہرحال وہ عالم برزخ میں ہے نیز اس کے ذرات جسم خواہ کہیں ہوں خشکی میں ہوں سمندر میں ہوں یا کسی اور جگہ ہوں، حق تعالیٰ شانہ کو اپنے علم کامل کی بناء پر معلوم ہے کہ اس کا کونسا ذرہ کہاں ہے اور اپنی قدرت کاملہ کی وجہ سے وہ ان ذرات سے عذاب کا تعلق قائم کرنے پر قادر ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر قبر کو کھودا جائے تو وہاں مردہ پڑا نظر آتا ہے لیکن عذاب وراحت کچھ نظر نہیں آتا؟

---

(۱) النبراس، مطبوعه انار کلی، لاهور ص ۳۱۵.

اس کا جواب یہ ہے کہ عالمِ برزخ کے احوال عالم دنیا سے مختلف ہیں ، دنیا کے قُوٰی سے احوال برزخ نظر نہیں آتے اس کے لئے برزخی قُوٰی ضروری ہیں، خود عالم دنیا میں بہت سی چیزوں کا وجود ہے لیکن وہ ہمیں نظر نہیں آتیں، پس موجود ہونے کے لئے نظر آنا ضروری نہیں، مثلاً جنات وفرشتے موجود ہیں لیکن نظر نہیں آتے، جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سنانے آتے تھے اور صحابہ کو پاس ہونے کے باوجود جبرئیل نظر نہ آتے، سر کادرد نظر نہیں آتا، دودھ میں مکھن ہوتا ہے مگر نظر نہیں آتا، ایک شخص کے پیٹ میں درد ہے لیکن نظر نہیں آتا، بیہوش آدمی پر کیا حالات گذرتے ہیں دوسرے کو پتہ نہیں چلتا وغیرہ۔

اقسامِ عالم اور ان کے احوال:

بعض علماء نے اس کی تفصیل بیان کی کہ عالم تین ہیں (۱) عالمِ دنیا، (۲) عالمِ برزخ (۳) عالمِ آخرت، آدمی کے پیدا ہونے سے مرنے تک کا زمانہ عالم دنیا ہے، اور مرنے کے بعد سے نفخ صور تک کا زمانہ عالم برزخ ہے اور نفخ صور سے قیامت اور اس کے بعد تک کا وقت عالم آخرت ہے، ان تینوں عالموں کے احوال مختلف ہیں، عالم دنیا میں تکلیف وراحت کا تعلق اصالۃً جسم کے ساتھ ہوتا ہے، اور تبعاً روح سے ہوتا ہے، جسم کے واسطے روح تک اس کا اثر جاتا ہے، اور عالم برزخ میں اس کا عکس ہوتا ہے کہ راحت وتکلیف کا تعلق اصالۃً روح سے اور تبعاً جسم سے ہوتا ہے اور عالم آخرت میں راحت وتکلیف کا تعلق جسم وروح دونوں سے برابر ہوتا ہے، عالم برزخ کی مثال خواب کی سی ہے کہ خواب دیکھنے والا اپنے آپ کو کبھی راحت میں اور کبھی زحمت میں دیکھتا ہے، کبھی اچھے مناظر دیکھتا ہے کہ عمدہ کھانا کھا رہا ہے اچھی جگہوں کی سیر کر رہا ہے، کبھی خوفناک منظر دیکھتا ہے کہ شیر اس کا تعاقب کر رہا ہے اژدہا پیچھے دوڑ رہا ہے، اس نوع کے مختلف حالات دیکھتا ہے لیکن جو شخص اس کے برابر میں بیٹھا ہوتا ہے اس کو ان حالات کی مطلق خبر نہیں ہوتی یہی حال قبر میں مردہ کا ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتا کہ اس پر کیا گذر رہی ہے۔[1]

اخفائے عذاب قبر کی وجہ اور ایک عورت کا عبرتناک واقعہ:

عذاب قبر کو مخفی رکھنے کی بڑی وجہ ایمان بالغیب ہے، اگر عذاب قبر دکھایا جاتا تو ایمان بالغیب نہ رہتا بلکہ ایمان

(۱) المرقاة ۱/ ۳۱۰، واللمعات ۱/ ۴۱۸۔

بالمشاہدہ ہو جاتا، حالانکہ اللہ کو بندوں سے ایمان بالغیب مطلوب ہے، البتہ بعض مرتبہ مصلحت کی وجہ سے عبرت کے لئے کچھ حالات دکھا دیئے جاتے ہیں، ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے سنایا تھا کہ اب سے پچیس سال قبل پاکستان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت کا انتقال ہوا جب اس کے جنازہ کو قبر میں اتارا گیا تو ایک ازدہا آیا اور اس کا کفن پھاڑ کر اس کا منہ کھول کر اس کی زبان پکڑ لی، لوگوں نے اس کے لئے دیر تک استغفار کیا اور ایصال ثواب کیا تو وہ ازدہا ہٹ گیا، لوگوں نے اس عورت کے شوہر سے وجہ معلوم کی تو اس نے بتایا کہ اور کوئی وجہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ اتنی بات ہے کہ یہ میرے ساتھ زبان درازی کیا کرتی تھی، اس نوع کے واقعات بربناء مصلحت گاہے گاہے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

۱۱۸ / ۱ عَنِ الْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ "اَلْمُسْلِمُ إِذَا سُئِلَ فِي الْقَبْرِ، يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ": "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ"

وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ نَزَلَتْ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ، يُقَالُ لَهُ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ: رَبِّيَ اللّٰهُ، وَنَبِيِّي مُحَمَّدٌ" (متفق علیه)

ترجمه: حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس وقت مسلمان سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد کا "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ" کہ اللہ تعالیٰ شانہ ان لوگوں کو ثابت قدم رکھتا ہے جو ایمان لاتے ہیں مضبوط قول کے ذریعہ دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں، اور ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت "يثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت" عذاب قبر کے بیان میں نازل ہوئی ہے، (چنانچہ قبر میں مردہ سے) سوال کیا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال براء بن عازب:

حضرت براء بڑے صحابی ہیں، یہ اوران کے والد دونوں کو شرفِ صحبت حاصل ہے، ابوعمارۃ اورابوعمرو کنیت ہے، جنگ بدر میں کم سنی کے باعث شریک نہیں ہوسکے اس کے بعد احد وغیرہ میں شریک رہے، کل چودہ یا پندرہ غزوات میں شرکت کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ۱۸؍سفر کئے، مقام ریٔ کو ۲۴ھ میں انہوں نے ہی فتح کیا تھا، اور جنگ جمل وصفین میں حضرت علیؓ کے ہمراہ تھے، کوفہ میں ۲۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔(۱)

''القول الثابت'' کی مراد اوراس کی برکت وفضیلت:

اس حدیث میں ایک آیت کی تفسیر ہے ''يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ'' اس آیت میں ''قول ثابت'' سے مراد کلمہ شہادت اور ''آخرت'' سے مراد قبر ہے جیسا کہ مذکورہ روایت میں اس کی صراحت آگئی، معنی یہ ہیں کہ کلمہ طیبہ جب مومن کے قلب میں راسخ ہوجاتا ہے تو اس کی برکت یہ ہوتی ہے کہ کیسے ہی صبر آزما حالات کیوں نہ ہوں مومن کے ایمان میں اور پائے استقامت میں ذرہ برابر تزلزل واقع نہیں ہوتا، اورآخرت میں ثابت قدم رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ کلمہ کی برکت سے قبر میں فرشتوں کے سوالات کا صحیح جواب دیتا ہے۔

قبر میں کتنے سوالات ہوتے ہیں؟

اس حدیث میں میت سے کئے جانے والے سوال کا تذکرہ ہے، میت سے اصل تین سوال ہوتے ہیں، من ربک، مادینک، ماتقول في هذا الرجل، بعض روایات میں ان تینوں سوالوں کو جمع کیا گیا ہے اور بعض میں دو سوالوں کا تذکرہ ہے اور بعض میں محض ایک سوال کا، جیسا کہ اس حدیث میں ایک ہی سوال مذکور ہے، اسی طرح سوال وجواب کے الفاظ بھی مختلف منقول ہیں، الفاظ کا یہ اختلاف، اختلافِ راوی پر محمول ہے کہ رواۃ نے روایت بالمعنی کی، اس لئے ان کے الفاظ میں اختلاف ہوا، یا اختلافِ اشخاص پر

(۱) الإصابة ۱ / ۲۱۳ – ۲۱۴.

محمول ہے کہ کسی مردہ سے سوال کرتے ہوئے یہ الفاظ اور کسی سے دوسرے الفاظ استعمال کئے، اس لئے یہ تعارض کی بات نہیں ہے۔

قبر کے سوال سے مستثنیٰ افراد:

پھر کچھ حضرات منکر نکیر کے سوال سے مستثنیٰ ہیں ان سے قبر میں سوال نہیں ہوتا، مختلف روایات میں ایسے متعدد حضرات بتائے گئے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) انبیاء علیہم السلام، البتہ سید ابوشجاع نے بعض علماء کا قول لکھا ہے کہ ان سے تبلیغ کے متعلق سوال ہوتا ہے (۲) شہید (۳) اسلامی سرحد کی حفاظت کرنے والا (۴) مؤذن (۵) جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں وفات پانے والا (۶) بچوں کے بارے میں دونوں قول ہیں ایک یہ کہ ان سے سوال نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ ان سے بھی سوال ہوتا ہے۔ (۱)

قبر میں سوال کس زبان میں ہونگے؟

پھر قبر میں یہ سوالات کس زبان میں ہوتے ہیں؛ اس میں علماء کا اختلاف ہے: (۱) بعض نے کہا کہ سریانی زبان میں ہوتے ہیں (۲) بعض نے عربی زبان میں کہا ہے لیکن راجح ثانی قول ہے۔ (۲)

۱۱۹ / ۲: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِيْ قَبْرِهِ وَتَوَلّٰى عَنْهُ أَصْحَابُهُ إِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ أَتَاهُ مَلَكَانِ فَيُقْعِدَانِه فَيَقُوْلَانِ: مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ ؟فَأَمَّا الْمُؤمِنُ فَيَقُوْلُ: أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ، فَيُقَالُ لَهُ: اُنْظُرْإِلىٰ مَقْعَدِکَ مِنَ النَّارِ، قَدْ أَبْدَلَکَ اللّٰهُ بِهٖ مَقْعَداً مِنَ الْجَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيْعاً، وَأَمَّا الْمُنَافِقُ وَالْكَافِرُفَيُقَالُ لَهُ: مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِيْ هٰذَا الرَّجُلِ؟فَيَقُوْلُ: لاأَدْرِيْ!كُنْتُ أَقُوْلُ مَايَقُوْلُ النَّاسُ!فَيُقَالُ له: لادَرَيْتَ وَلاتَلَيْتَ، وَيُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً، فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيْهِ غَيْرَالثَّقَلَيْنِ"

(۱) شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور للسیوطی ص۱۴۸۔

(۲) السؤال بالعربية أوبالسريانية كذافي الفتاوى الحديثية. ص۷.

(متفق عليه ولفظه للبخاری)(۱)

ترجمہ:حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب بندہ کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اوراس کے اعزہ واحباب واپس آنے لگتے ہیں تو وہ (مردہ) ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے اوراس کے پاس (قبر میں) دوفرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر پوچھتے ہیں کہ تو اس شخص (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ اس کے جواب میں مومن بندہ کہتا ہے کہ: میں اس بات کی گواہی دیتاہوں کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اوراس کے رسول ہیں، پھراس بندہ سے کہا جاتا ہے کہ: تو جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھ، اس کے بدلہ تجھے اللہ نے جنت میں ٹھکانہ دیا ہے چنانچہ وہ مردہ دونوں مقام (جنت ودوزخ) دیکھتا ہے، اور جو مردہ منافق یا کافر ہوتا ہے اس سے بھی یہی سوال کیا جاتا ہے کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تو کیا کہتا تھا؟ وہ اس کے جواب میں کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا، جواورلوگ کہتے تھے وہی میں بھی کہتا تھا، اس سے کہاجاتا ہے کہ نہ تو نے تحقیق کرکے جانا اورنہ اہل تحقیق کی اتباع کی، یہ کہکر اس کو لوہے کے گرزوں سے مارا جاتا ہے کہ اس کے چیخنے چلانے کی آواز سوائے جنوں اورانسانوں کے قرب وجوار کی تمام چیزیں سنتی ہیں۔(بخاری ومسلم، الفاظ بخاری کے ہیں)

تشریحِ حدیث

قبر میں سوال وجواب اورراحت وعذاب:

اس حدیث میں قبر میں مومن کو راحت پہنچنے اورکافر ومنافق کو عذاب ہونے کا بیان ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قبر مومن کے لئے راحت وآرام کی جگہ ہے، مومن بندہ منکر نکیر کے سوالات کا صحیح جواب دے کر نجات پاجاتا ہے اورراحت اورنعمتوں میں رہتا ہے اورکافرومنافق جواب نہیں دے پاتا اس لئے وہ

(۱) أخرجه البخاري في موضعين: كتاب الجنائز، باب الميت يسمع خفق النعال ۱/۱۷۸، برقم ۱۳۲۳ وباب ماجاء في عذاب القبر ۱/۱۸۴، برقم ۱۳۵۸.

ومسلم "كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه الخ ۲/۳۸۶.

دائمی عذاب میں گرفتار ہوجاتا ہے اوراس کے عذاب وتکلیف کا سلسلہ قبر سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔

مسئلۂ سماع موتی:

انہ لیسمع قرع نعالھم : اس جملہ سے معلوم ہوا کہ مردہ کے اردگرد جولوگ ہوتے ہیں مردہ ان کے جوتوں کی آواز اوران کی گفت وشنید کوسنتا ہے، اس لئے یہاں ''مسئلہ سماع موتی'' زیربحث آتا ہے کہ مردہ قبرمیں سنتا ہے یانہیں؟ یہ مسئلہ صحابہؓ کے زمانہ سے ہی علماء کے درمیان مختلف فیہ چلاآرہاہے اوراس میں دونوں قسم کی آراء ہیں:

(۱) حضرت عائشہؓ اوربہت سے صحابہؓ اس کے قائل ہیں کہ مردہ نہیں سنتا ہے، ان کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے: ''وَمَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْر [۱]'' اسی طرح ایک جگہ وارد ہے: إِنَّكَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتٰى [۲] البتہ جن چیزوں کا سننا حدیث میں مذکور ہے ان کو یہ حضرات بھی بلاتاویل تسلیم کرتے ہیں، مثلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قبرشریف میں لوگوں کے صلاۃ وسلام کوسننا اورجواب دینا، یہ حدیث سے ثابت ہے، اس پرسب متفق ہیں۔

(۲) حضرت عمر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اوراکثر علماء سماعِ موتی کے قائل ہیں، ان کے بھی کئی دلائل ہیں، بلکہ علامہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ سماع موتی کے بارے میں روایات تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں، چند روایات یہ ہیں:

(۱) یہی حدیث کہ مردہ اپنے ساتھیوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی قبرپرجاتا ہے اورسلام کرتا ہے تو مردہ اس کا جواب دیتا ہے اوراس کو پہچانتا ہے۔ [۳]

(۳) جنگ بدرمیں ستر کافر مارے گئے، اوران کی لاشوں کوایک کنویں میں ڈال دیا گیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں کے پاس تشریف لے گئے اوران سے خطاب کیا کہ اللہ نے ذلت وعذاب کا تم سے جووعدہ کیا تھا اس کوتم نے سچا پالیا یانہیں؟ اس پرحضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان کوخطاب کرنے کا

---

(۱) من سورة الفاطر: ۲۲.

(۲) من سورة النمل: ۸۰.

(۳) رواه ابن عبدالبرعن ابن عباس مرفوعاً كماذكره ابن كثير في تفسيره ۳/ ۵۷۵.

کیافائدہ؟ یہ تو مردے ہیں سنتے نہیں ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان سے زیادہ نہیں سنتے ہو، بس فرق یہ ہے کہ یہ جواب نہیں دے سکتے۔ (۱)

(۳) بعض علماء نے جانبین کے دلائل پر نظر کرتے ہوئے یہ تطبیق بیان فرمائی کہ سماع موتی جزئی طور پر مشیتِ الٰہی سے ثابت ہے یعنی ایسا نہیں کہ مردہ اپنے طور پر ہر بات کو سنتا ہو، البتہ حق تعالیٰ شانہ میت کو کوئی چیز سنانا چاہے تو اس کو سن لیتا ہے، صاحب روح المعانی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، ہمارے اکابر میں حضرت گنگوہیؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ، اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی اسی کے قائل ہیں، یہی قول راجح ہے، کیونکہ یہ اوفق بالنصوص ہے، حق تعالیٰ نے اپنے ماسوی سے اسماع کی نفی فرمائی ہے جبکہ بہت سی چیزوں کا سماع ثابت ہے، اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ سماعِ موتی مشیت الٰہی سے جزئی طور پر ہوتا ہے۔ (۲)

قبرستان میں جوتے پہننے کا مسئلہ:

''قرع نعالهم'' ان الفاظ سے فقہاء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ قبرستان میں جوتے پہن کر جانا جائز ہے۔ (۳)

منکر اور نکیر اور بیک وقت متعدد اموات سے سوال کی نوعیت:

أتاه ملکان: مردہ کے پاس دو فرشتے آتے ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہتے ہیں، جیسا کہ آئندہ روایت میں تصریح آرہی ہے۔

اشکال: قبر میں سوال کے لئے منکر نکیر مقرر ہیں، حالانکہ دنیا میں ایک وقت میں متعدد افراد مرتے ہیں، پس محض یہ دونوں ایک وقت میں سب لوگوں سے کیسے سوال کر لیتے ہیں؟

اس کا جواب بعض نے یہ دیا ہے کہ منکر نکیر فرشتوں کی جماعت کا نام ہے، اور اس جماعت میں بہت سے فرشتے ہیں جو سب اسی کام پر مقرر ہیں اور بعض نے کہا کہ منکر و نکیر فرشتوں کی جماعت کے امیر ہیں اور ان کے ماتحت ہزاروں فرشتے ہیں، پس ہر شخص کے پاس علیحدہ فرشتے آتے ہیں جیسا کہ ہر شخص کے اعمال

(۱) أخرجه البخاري في المغازي، باب قتل أبي جهل ۲ / ۵٦٥ برقم ۳۸۳٤.

(۲) مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: معارف القرآن ٦ / ٧٦٤-٧٦٦ (النمل: ۸۰)

(۳) المرقاة ۱ / ۳۱۳ واللمعات ۱ / ٤۲۱.

لکھنے کے لئے الگ الگ فرشتے مقرر ہیں۔

قعود وجلوس میں فرق:

فیقعدانه: بعض روایات میں ''**فیجلسانه**'' آیا ہے امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ: قعود وجلوس دونوں مترادف ہیں،[۱] اور علامہ تورپشتی نے فرمایا کہ: یہ دونوں لفظ جب تقابل کے طور پر مذکور ہوں تو ان میں فرق ہوتا ہے کہ قعود مقابل ہے قیام کا اور جلوس مقابل ہے اضطجاع کا، یعنی آدمی کھڑا ہو پھر بیٹھے تو اس بیٹھنے کو ''قعود'' سے تعبیر کہا جاتا ہے اور لیٹا ہو پھر اٹھ کر بیٹھے تو اس بیٹھنے کو ''جلوس'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی لئے بعض نے کہا کہ **فیجلسانه** اولی ہے، کیونکہ مردہ قبر میں لیٹا ہوا ہوتا ہے فرشتے آکر بٹھاتے ہیں[۲] مگر ملا علی قاری نے فرمایا کہ زیادہ روایات میں **فیقعدانه** آیا ہے، جس کا تقاضہ قیام سے قعود کی طرف آنا ہے، بعض علماء نے ان دونوں لفظوں کی تطبیق بیان کی ہے کہ مردہ فرشتوں کو دیکھ کر گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے پھر فرشتے اس کو بٹھاتے ہیں اس صورت میں **فیجلسانه** اور **فیقعدانه** دونوں درست ہیں۔[۳]

قبر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال وجواب کی نوعیت:

ماکنت تقول فی هذا الرجل الخ: یہ تیسرا سوال ہے یہاں پہلے دو سوال مذکور نہیں ہیں، **لمحمد** ''**الرجل**'' کی تفسیر ہے، بعض نے کہا کہ یہ تفسیر راوی یعنی حضرت انسؓ کی طرف سے ہے، اور بعض نے کہا کہ ان کے علاوہ اور کسی راوی نے یہ تفسیر کی ہے، اس کو محدثین کی اصطلاح میں ادراج کہتے ہیں اور یہ اضافہ مدرج کہلاتا ہے، سید جمال الدین نے کہا کہ: یہ تفسیر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر راوی کی طرف سے تفسیر ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ درود ہوتا، اسی طرح نبی یا رسول کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی فرمائی ہے، پھر فرشتہ کا بغیر کسی تعظیمی لفظ کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''رجل'' سے تعبیر کرنا اس لئے ہے تاکہ میت فرشتہ کے تعظیمی لفظ سے جواب کو نہ سمجھ لے۔[۴]

---

(۱) المرقاة ۱/۳۱۳.

(۲) شرح المشكاة للطيبي ۱/۳۰۵.

(۳) المرقاة ۱/۳۱۳.

(٤) شرح المشكاة للطيبي ۱/۳۰۵-۳۰٦، فتح الإله ۱/۵۰۸.

سوال: ہذا اسم اشارہ قریب کے لئے آتا ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود ہوتے ہیں؟
جواب: اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، (۱) بعض نے کہا کہ مردے کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مثالیہ پیش کی جاتی ہے، اوراس صورتِ مثالیہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔
(۲) بعض نے کہا کہ: میت اور روضۂ اقدس کے درمیان جو حجابات ہیں وہ ہٹادیئے جاتے ہیں، میت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نظر آتے ہیں پھر آپ کی طرف اشارہ حسیہ کیا جاتا ہے۔
(۳) بعض نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور معجزہ کے مردے کے پاس خود تشریف لاتے ہیں۔
(۴) ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ: ''الرجل'' پر الف لام عہد ذہنی کا ہے اور معہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کامل فی الرجلیت ہیں، اس لئے اس وقت مردے کے ذہن میں خود بخود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تصور آجاتا ہے۔[1]

لاأدری! کنت أقول مایقول الناس: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں لفظ کافر ومنافق دونوں کہتے ہیں، لیکن ملاعلی قاریؒ فرماتے ہیں کہ ''لاادری'' کافر کہتا ہے یا پھر وہ خاموشی اختیار کرتا ہے اور کنت اقول منافق کا قول ہے کیونکہ وہ بطور تقیہ کے دنیا میں کلمہ کا اقرار کرتا تھا اس لئے اس کو جواب کے الفاظ کا استحضار نہ ہوگا۔[2]

لادریت ولاتلیت: ''تلیت'' ''تلایتلو تُلُوًّا'' سے ہے بمعنی کسی کے پیچھے چلنا، اتباع کرنا، اصل میں ''تلوت'' تھا ''دریت'' کی مناسبت کی وجہ سے ''تلیت'' کردیا گیا، مطلب یہ ہے کہ نہ تو نے خود تحقیق کی کہ حق کیا ہے اور غیر حق کیا ہے، اور نہ اہل تحقیق کا اتباع کیا، اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر خود محقق نہ ہو لیکن اہلِ تحقیق کا اتباع کرلے تب بھی وہ نجات پاجائے گا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص مجتہد نہیں اس پر مجتہد کی تقلید کرنا واجب ہے۔

مطارق: مِطْرَقَةٌ کی جمع ہے بمعنی ہتھوڑا، گُرز، اس کو جمع لایا گیا ہے حالانکہ وہ ایک ہی ہوگا، وجہ یہ ہے کہ وزنی اور بھاری ہونے کی وجہ سے وہ ایک کئی گرزوں کے قائم مقام ہوگا۔[3]

---

(۱) المرقاة ۱/۳۱۳.
(۲) المرقاة ۱/۳۱٤.
(۳) فتح الإله ۱/۵۰۹.

یسمعهامن یلیه : اس پراشکال ہے کہ یہاں ''یسمعها من یلیه '' کہا اور آئندہ حدیث میں آرہاہے کہ اس کی چیخ کومشرق ومغرب کی تمام مخلوق سنتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بعید کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، قریب کی مخلوق بھی سنتی ہے اور بعید کی بھی، اس لئے دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے، اسی طرح ذوالعقول بھی سنتے ہیں اور غیرذوی العقول بھی، مگر ''من'' ذوی العقول کا صیغہ اس لئے لایا گیا ہے کہ یہاں ملائکہ کوغیر ملائکہ پرغلبہ دیا گیاہے۔(۱)

غیر الثقلین: ثقلین سے انسان اور جنات مراد ہیں کیونکہ یہ اپنے گناہوں کی وجہ سے زمین پر بوجھ ہیں۔بعض نے کہا کہ انہوں نے احکام شرعیہ کے بوجھ کو اٹھایاہے اس لئے ان کوثقلین کہاجاتاہے۔(۲)

۱۲۰ / ۳ وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عُمَرؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''إِنَّ اَحَدَكُمْ إِذَا مَاتَ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهٗ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ، إِنْ كَا نَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، وَإِنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَمِنْ أَهْلِ النَّارِ، فَيُقَالُ: هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى يَبْعَثَكَ اللّٰهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ''(متفق عليه)(۳)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم میں سے کوئی مرجاتاہے تو قبر کے اندرصبح وشام اس کا ٹھکانہ اسکے سامنے پیش کیاجاتاہے اگروہ جنتی ہوتاہے تو جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتاہے، اوراگروہ جہنمی ہوتاہے توجہنم میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جاتاہے اوراس سے کہا جاتاہے کہ یہ تیراٹھکانہ ہے (اس کا انتظار کر) یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شانہ تجھے وہاں پہنچادے گا۔(بخاری ومسلم)

(۱)فتح الإله ۱ / ۵۰۹.

(۲)فتح الإله ۱ / ۵۰۹.

(۳) أخرجه البخاري في ثلثة مواضع: كتاب الجنائز،باب الميت يعرض عليه مقعده بالغداة والعشى ۱ / ۱۸٤برقم ۱۳٦۳، وأيضاً كتاب بدأالخلق، باب ماجاء في صفة الجنة وأنها مخلوقة ۱ / ٤٥۹، وأيضاً كتاب الرقاق، باب سكرات الموت۲ / ۹٦٤.ومسلم كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب عرض مقعد الميت من الجنة اوالنار عليه الخ ۲ / ۳۸۵.

تشریحِ حدیث

قبر میں صبح وشام ٹھکانہ کا پیش ہونا:

اس حدیث میں بھی احوال برزخ کا بیان ہے کہ مرنے والا جنتی ہو یا جہنمی قبر میں ہر روز اس کا ٹھکانہ صبح وشام اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

غداۃ و عشِیّ سے کیا مراد ہے؛ اس میں کئی اقوال ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ جس دن انتقال ہوا اس دن کی صبح وشام مراد ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ اس سے ہر دن کی صبح وشام مراد ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ نہار کے طرفین بول کر جمیع وقت اور دوام مراد لیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ قبر میں مردہ اپنے جنت یا جہنم کے ٹھکانہ کو ہر وقت دیکھتا ہے۔[1]

۱۲۱ / ٤: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ يَهُودِيَّةً دَخَلَتْ عَلَيْهَا، فَذَكَرَتْ عَذَابَ الْقَبْرِ، فَقَالَتْ لَهَا: أَعَاذَكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَسَأَلَتْ عَائِشَةُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، فَقَالَ: "نَعَمْ، عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ" قَالَتْ عَائِشَةُ: فَمَارَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدُ صَلّٰى صَلاةً إِلَّا تَعَوَّذَ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ. (متفق عليه)[2]

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی عورت ان کے پاس آئی اور اس نے عذاب قبر کا ذکر کیا اور پھر اس نے حضرت عائشہ سے کہا: عائشہ! اللہ تعالیٰ تمھیں عذاب قبر سے محفوظ رکھے، حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب قبر کا حال معلوم کیا، آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا: "ہاں قبر کا عذاب حق ہے" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز پڑھی ہو اور عذاب قبر سے پناہ نہ مانگی ہو"۔ (بخاری و مسلم)

(۱) المرقاة ۱ / ۳۱٦.

(۲) أخرجه البخاری "كتاب الجنائز، باب جاء في عذاب القبر ۱ / ۱۸۳ و مسلم" "كتاب المساجد و مواضع الصلاة" (باب استحباب التعوذ من عذاب القبر ۱ / ۲۱۷)

تشریح حدیث

عذاب قبر برحق ہے:

ایک یہودیہ عورت نے حضرت عائشہؓ کے یہاں آ کر کسی چیز کا سوال کیا حضرت عائشہؓ نے اس کی حاجت پوری کردی تو اس نے دعا دی ''أَعَاذَكِ اللّٰهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ '' حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا قبر میں عذاب ہوتا ہے؟ اور یہودیہ عورت کا واقعہ بتایا، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا علم نہیں دیا گیا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سن کر گھبرائے، کمافی روایۃ الطحاوی[1] اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عذاب قبر کا علم دیا گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: '' نَعَمْ عَذَابُ الْقَبْرِ حَقٌّ''

یہاں اختصار ہے، مسند احمد کی روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت عائشہؓ کے سوال کے جواب میں آپ علیہ السلام نے یہ فرمایا ''كَذَبَتْ يهودُ؛ وهم على اللهِ عزوجل أكْذَبُ ولاعذابَ دونَ يومِ القيامةِ [2]'' کہ یہود نے جھوٹ کہا اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بہت زیادہ جھوٹی باتیں منسوب کرنے والے ہیں قیامت کے عذاب سے پہلے کوئی عذاب نہیں ہے اور مسلم شریف کی روایت میں ہے: وانماتفتنُ يهودُ کہ قبر میں یہود کو عذاب ہوتا ہے، [3] اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی عذاب قبر کا علم دیا گیا چنانچہ اس کے بعد آپ علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: نعم عذاب القبر حق، الحاصل یہودیہ کے عذاب قبر کے تذکرہ کے بعد آپ کو عذاب قبر کا علم دیا گیا اور پھر آپ نے اس کی ہولنا کی کے پیش نظر اس سے پناہ مانگنا شروع کی۔

ملا علی قاریؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اہتمام سے معلوم ہوا کہ کسی کو بھی اللہ کے عذاب سے اپنے کو مامون نہیں سمجھنا چاہئے۔[4]

---

(١)المرقاة ١/٣١٧، وكذافي رواية مسلم ١/٢١٧فارتاع رسول الله صلى الله عليه وسلم.

(٢)مسند احمد (٢٤٥٢٠)

(٣)مسلم ١/٢١٧.

(٤)المرقاة ١/٣١٧-٣١٨.

کیا کافرہ عورت سے پردہ ہے؟

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان عورت کے لئے کافر عورت سے پردہ نہیں ہے، احناف کا یہی مذہب ہے، ہاں اگر کافر عورت آوارہ ہو اور اس سے اندیشہ ہو کہ وہ مسلمان عورت کے حسن و جمال اور اوصاف کو اجنبیوں کے سامنے بیان کرے گی تو ایسی عورت سے پردہ ضروری ہوگا، شوافع کے یہاں مسلمہ کے لئے کافرہ سے پردہ ہے، یہ حدیث احناف کی دلیل ہے، شوافع اس میں تاویل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے پردہ میں ہی بات کی ہوگی، حالانکہ روایات میں پردہ کا تذکرہ نہیں ہے، ملا علی قاری نے فرمایا کہ ازواج مطہرات کا نساء کفار سے پردہ کرنا ثابت نہیں ہے۔[1]

۱۲۲ / ۵: وَعَنْ زَيْدِ بنِ ثَابِتٍؓ قَالَ: بَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَائِطٍ لِبَنِي النَّجَّارِ عَلٰى بَغْلَةٍ لَهُ وَنَحْنُ مَعَهُ، إِذْ حَادَتْ بِهٖ فَكَادَتْ تُلْقِيْهِ، وَإِذَا أَقْبُرٌ سِتَّةٌ أَوْ خَمْسَةٌ فَقَالَ: مَنْ يَعْرِفُ أَصْحَابَ هٰذِهِ الْأَقْبُرِ؟ قَالَ رَجُلٌ: أَنَا، قَالَ: "فَمَتٰى مَاتُوْا؟" قَالَ: فِي الشِّرْكِ فَقَالَ: "إِنَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ تُبْتَلٰى فِيْ قُبُوْرِهَا، فَلَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوْا لَدَعَوْتُ اللّٰهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِيْ أَسْمَعُ مِنْهُ" ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَقَالَ: تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ" قَالُوْا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ النَّارِ، قَالَ: "تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ" قَالُوْا نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، قَالَ: تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ" قَالُوْا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَهَرَ مِنْهَا وَمَابَطَنَ، قَالَ: "تَعَوَّذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ" قَالُوْا: نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ. (رواه مسلم)[2]

ترجمه: حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے کہ ایک دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی نجار کے باغ میں اپنے خچر پر سوار تھے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے کہ اچانک خچر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرادے، اچانک چھ یا پانچ قبریں نظر آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا میں

(۱) المرقاة ۱ / ۳۱۷.

(۲) أخرجه مسلم، "كتاب الجنة وصفة نعيمها، باب عرض مقعد الميت من الجنة أو النار عليه وإثبات عذاب القبر والتعوذ منه ۲ / ۳۸٦.

جانتاہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کب مرے ہیں؟ اس شخص نے عرض کیا شرک کی حالت میں مرے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ امت اپنی قبروں میں آزمائی جاتی ہے (یعنی ان لوگوں پر ان کی قبروں میں عذاب ہورہاہے) اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دوگے تو میں ضرور اللہ سے یہ دعاء کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر کی آواز سنوادے جس کو میں سن رہاہوں، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا ہم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا: ہم عذاب قبر سے پناہ مانگتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ظاہری وباطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا: ہم ظاہری وباطنی فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگو، صحابہؓ نے عرض کیا ہم دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

احوال زید بن ثابت:

زید بن ثابت انصاری الخزرجی مشہور کاتب وحی صحابی ہیں، غزوۂ بدر کے موقع پر ان کی عمر صرف ۱۱ رسال تھی اس لئے غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوسکے تھے، ان کی پہلی شرکت غزوۂ خندق میں ہوئی، اہلِ روم کے خطوط سریانی زبان میں ہوتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہود سے ان کا ترجمہ کراتے تھے، لیکن ان کی ترجمانی پر اعتماد نہیں ہوتا تھا اور ان سے مضمون میں تبدیلی کردینے کا اندیشہ رہتا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ سریانی زبان سیکھیں، چنانچہ انھوں نے بہت جلد سریانی زبان سیکھ لی، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں آپ کے حکم سے انہوں نے ہی قرآن کو پہلی مرتبہ یکجا کیا تھا، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں بھی جمع قرآن کا فریضہ انہوں نے ہی انجام دیا تھا، ۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔(۱)

(۱) الإصابة ۲/ ۲۳۸–۲۳۹.

عذاب قبر کی ہولنا کی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنونجار کے ایک باغ میں سے گزرے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر سوار تھے، خچر بدکنے اور شوخی کرنے لگا، حتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گرنے کے قریب ہوگئے، وہاں پانچ چھ قبریں تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم کیا کہ ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے؟ ایک شخص نے کہا جی ہاں (میں جانتا ہوں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ لوگ کب مرے؟ انہوں نے کہا کہ شرک کی حالت میں (یعنی اسلام کی آمد سے پہلے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ امت عذاب قبر میں مبتلا کی جاتی ہے اور اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ تم مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ تم کو بھی عذاب قبر سنادے جس کو میں سن رہا ہوں، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور جہنم، عذاب قبر اور دجال کے فتنہ سے پناہ طلب کرنے کا حکم دیا۔

کیا عذاب قبر اس امت کے ساتھ خاص ہے؟

إن هذا الأمة تبتلى في قبورها : بعض علماء نے اس جملہ سے استدلال کیا ہے کہ عذاب قبر اس امت کے ساتھ خاص ہے، حکیم ترمذی اور علامہ بن عبدالبر اسی کے قائل ہیں، لیکن علامہ ابن قیمؒ نے اس قول کی تردید کی ہے اور فرمایا کہ احادیث میں سابق امتوں سے عذابِ قبر کی نفی نہیں کی گئی ہے اور بعض علماء نے اس سلسلہ میں توقف فرمایا ہے۔ (۱)

ان مختلف اقوال میں سے راجح قول یہی ہے کہ عذاب قبر اس امت کے ساتھ خاص نہیں ہے، چنانچہ اوپر جو حدیث آئی ہے اس میں یہودیہ نے حضرت عائشہؓ کو جو "**اَعاذکِ اللہ من عذاب القبر**" کے الفاظ میں دعاء دی وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عذاب قبر میں پچھلی امتیں بھی مبتلا رہی ہیں اور ان کو بھی اس سے ڈرایا گیا تھا، اور ان **هذه الامة** میں امت سے جنس انسان مراد ہے۔ (۲)

فلو لا أن لاتدافنوا الخ : یعنی قبروں میں ہونے والے عذاب کو سن کر اس قدر خوف ودہشت میں مبتلا ہوجاتے کہ اپنے مردوں کو جنگلات وبیابان میں ڈال دیتے اور ان کو دفن نہ کرتے، یہ مطلب نہیں کہ

---

(۱) التمهيد لابن عبدالبر ۲۲ / ۲۵۳، نوادر الاصول فی احادیث الرسول ۳ / ۲۲۷، الروح لابن القیم ص ۷۶، ۸۷.

(۲) المرقاۃ ۱ / ۳۱۸.

عذاب قبر دفن پر موقوف ہے۔[۱]

تعوذوا باللہ من الفتن ماظھر منھا وما بطن : یہاں فتن سے مراد یا گناہ ہیں یعنی ظاہری و باطنی گناہ، ظاہری گناہ وہ ہیں جو ظاہر اعضاء سے صادر ہوتے ہیں جیسے جھوٹ غیبت، قتل سرقہ وغیرہ اور باطنی گناہ وہ ہیں جو قلب سے متعلق ہوں جیسے شرک، کفر، ریا، حسد، تکبر وغیرہ، یا فتن سے فتنہ کے معروف معنی مراد ہیں یعنی آزمائش اس معنی کے لحاظ سے فتنہ کی دو قسمیں ہیں، ظاہری فتنہ اور باطنی فتنہ، ظاہری فتنہ وہ ہے جس کے اسباب معلوم اور ظاہر ہوں اور باطنی فتنہ وہ ہے جس کے اسباب مخفی اور نا معلوم ہوں۔[۲]

الفصل الثانی

۱۲۳/۶: عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا أُقْبِرَ الْمَیِّتُ أَتَاهُ مَلَكَانِ أَسْوَدَانِ أَزْرَقَانِ، یُقَالُ لِأَحَدِهِمَا: اَلْمُنْكَرُ، وَلِلْآخَرِ: اَلنَّكِیْرُ فَیَقُوْلَانِ: مَاكُنْتَ تَقُوْلُ فِیْ هٰذَا الرَّجُلِ؟ فَیَقُوْلُ: هُوَ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ، فَیَقُوْلَانِ: قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُوْلُ هٰذَا، ثُمَّ یُفْسَحُ لَهُ فِیْ قَبْرِهِ سَبْعُوْنَ ذِرَاعاً فِی سَبْعِیْنَ، ثُمَّ یُنَوَّرُ لَهُ فِیْهِ، ثُمَّ یُقَالُ لَهُ: نَمْ، فَیَقُوْلُ: أَرْجِعُ إِلٰى أَهْلِیْ فَأُخْبِرُهُمْ فَیَقُوْلَانِ: نَمْ كَنَوْمَةِ الْعَرُوْسِ الَّذِیْ لَا یُوْقِظُهُ إِلَّا أَحَبُّ أَهْلِهِ إِلَیْهِ حَتّٰى یَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذٰلِكَ، وَإِنْ كَانَ مُنَافِقاً قَالَ: سَمِعْتُ النَّاسَ یَقُوْلُوْنَ قَوْلاً فَقُلْتُ مِثْلَهُ لَا أَدْرِیْ، فَیَقُوْلَانِ: قَدْ كُنَّا نَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُوْلُ ذٰلِكَ، فَیُقَالُ لِلْأَرْضِ: اِلْتَئِمِیْ عَلَیْهِ، فَتَلْتَئِمُ عَلَیْهِ، فَتَخْتَلِفُ أَضْلَاعُهُ، فَلَا یَزَالُ فِیْهَا مُعَذَّباً حَتّٰى یَبْعَثَهُ اللّٰهُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذٰلِكَ" (رواه الترمذي)[۳]

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب مردے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس کالے رنگ کے نیلی آنکھوں والے دو فرشتے

(۱) التعلیق الصبیح ۱/۱۰۹۔

(۲) المرقاة ۱/۳۱۹۔

(۳) أخرجه الترمذي "کتاب الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر ۱/۲۰۵"

آتے ہیں جن میں سے ایک کو ''منکر'' اور دوسرے کو ''نکیر'' کہتے ہیں وہ دونوں اس مردہ سے پوچھتے ہیں کہ تو اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ اگر وہ شخص مؤمن ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، (یہ سنکر) دونوں فرشتے کہتے ہیں کہ: ہم جانتے تھے کہ تو یقیناً یہی کہے گا، اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے اور قبر میں روشنی کردی جاتی ہے اور اس مردہ سے کہا جاتا ہے کہ سوجا، مردہ کہتا ہے کہ (میں چاہتا ہوں) اپنے اہل وعیال میں واپس چلا جاؤں، تاکہ ان کو اپنے اس حال سے باخبر کردوں، فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ تو اُس دلہن کی طرح سوجا جس کو صرف وہی شخص جگا سکتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے محبوب ہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ شانہ اس کو اس جگہ سے اٹھائے گا (قیامت میں) اور اگر وہ مردہ منافق ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو جو کچھ کہتے ہوئے سنا تھا وہی میں کہتا تھا، لیکن میں (اس کی حقیقت کو) نہیں جانتا، منافق کا (یہ جواب سن کر) فرشتے کہتے ہیں: ''ہم جانتے تھے کہ یقیناً تو یہی کہے گا، اس کے بعد زمین کو حکم دیا جاتا ہے کہ تو اس شخص پر مل جا، چنانچہ زمین اس مردہ پر سمٹ جاتی ہے اور اس کو اس طرح دباتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں بائیں طرف اور بائیں پسلیاں دائیں طرف نکل جاتی ہیں اور وہ اسی طرح ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو (قیامت میں) اسی جگہ سے اٹھائے۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

منکر اور نکیر کی ہیئت اور ان کا میت سے سوال وجواب:

اس حدیث پاک میں قبر میں منکر نکیر کے آنے اور مومن وکافر بندوں سے سوال کرنے کا اور ان کے راحت وعذاب کا ذکر ہے، یہ فرشتے نہایت خوفناک شکل میں آتے ہیں، ان کا رنگ کالا اور آنکھیں نیلی ہوتی ہیں ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے، مومن بندہ ان کے سوالات کا صحیح جواب دیتا ہے تو وہ کامیاب قرار پاتا ہے اور اس کو بے فکری کی نیند سلا دیا جاتا ہے، کافر اور منافق صحیح جواب نہیں دے پاتے لہٰذا ان کی قبر کو حد درجہ تنگ کردیا جاتا ہے اور وہ قیامت تک کے لئے عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

إذا اقبر المیت : ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ یہ قید غالبی ہے؛ ورنہ اگر کسی کو جلادیا جائے یا درندہ اس کو کھالے اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔(۱)

أزرقان: ''ازرق'' وہ شخص جس کی آنکھیں نیلی ہوں، ان کی آنکھیں نیلی اس لئے ہوتی ہیں تاکہ مردہ ان سے ڈرے کیونکہ ایسے شخص سے فطری طور پر ڈرلگتا ہے بالخصوص اہل عرب اس صفت والے شخص کو نہایت ہیبت ناک سمجھتے تھے، اہل عرب کی دشمنی اس زمانے میں اہل روم سے تھی اوراہل روم کی آنکھیں نیلی ہوا کرتی تھیں، اوربعض نے کہا کہ اس سے خوفناک اورڈراؤنی شکل میں آنا مراد ہے اور بقول بعض اس سے ان کا اندھے بن کرآنا مراد ہے، کما قال اللہ تعالیٰ: وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقاً'' (طٰہٰ:۱۰۲) کہ قیامت کے دن ہم مجرموں کو اندھابنا کر اٹھائیں گے، جوشخص اندھا ہواس کی شکل سے بھی فی الجملہ خوف محسوس ہوتا ہے، اوررحم کی امید بھی نہیں ہوتی۔

نیز یہ فرشتے مومن کے پاس بھی ڈراؤنی شکل میں آتے ہیں تاکہ اس کا امتحان ہو۔(۲)

المنکر والآخر النکیر : المنکر اسم مفعول ہے انکار سے، جس کے معنی ہیں کسی کو نہ جاننا، اورنکیر بروزن فعیل مفعول کے معنی میں ہے جو نِکر بالکسر سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں غیر معروف ہونا ''نَکِر الرجل'' اس وقت کہا جاتا ہے جب اس شخص کو کوئی نہ پہچانے، دونوں الفاظ سے مراد ہے: اجنبی شخص۔

عمدۃ القاری میں ہے کہ ان دونوں فرشتوں کی تخلیق دیگر فرشتوں نیز جانداروں میں سے کسی کے بھی مشابہ نہیں ہے بلکہ ان کی خلقت الگ نوعیت کی ہے، دیکھنے والوں کو ان میں ذرا بھی انسیت محسوس نہیں ہوتی، اللہ نے ان کو عالم برزخ میں مسلمانوں کی تعظیم اورکافروں کی ذلت کے لئے پیدا کیا ہے۔(۳)

یہ دونوں فرشتے میت کے لئے غیر مانوس واجنبی ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ''منکر نکیر'' کہا جاتا ہے بعض نے کہا کہ گنہ گاروں سے سوال کرنے والے فرشتوں کے نام منکر نکیر ہیں اورفرمانبرداروں سے سوال وجواب کرنے والے فرشتوں کے نام'' مبشر وبشیر'' ہیں۔(۴)

---

(۱)المرقاۃ ۱/۳۱۹-۳۲۰.

(۲)المرقاۃ۱/۳۲۰.

(۳)عمدۃ القاری ج۱ ص۱۹۸،المرقاۃ ۱/۳۲۰.

(٤)تحفة الاحوزی ص ۱۵۵ ج٤ بحوالہ فتح الباری،اللمعات ۱/٤۳۰.

أشهد أن لا إله إلا الله: منکر نکیر کے سوال کا جواب دینے کے بعد مومن کلمہ پڑھتا ہے کیونکہ یہ جواب کا تتمہ ہے، بعض نے کہا کہ مردہ کلمہ پڑھتا ہے فخر وتلذذ کے طور پر کہ میں تو ایمان والا ہوں[1] یہاں صرف ایک سوال کا تذکرہ ہے ورنہ اصل تین سوالات ہوتے ہیں، قرآن وحدیث کا اسلوب یہی ہے کہ ایک واقعہ کو کبھی تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے اور کبھی اختصار کے ساتھ۔

قد کنا نعلم أنک تقول هذا: سوال یہ ہے کہ فرشتوں کو پہلے سے کیسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص یہ جواب دے گا؟

جواب: فرشتوں کو پہلے سے معلوم ہونے کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ حق تعالیٰ شانہ ان کو مطلع فرمادیتا ہو کہ یہ شخص صحیح جواب دے گا، یا فرشتے مومن مردے کی پیشانی پر سعادت کے آثار اور نورِ ایمان کو دیکھ کر پہچان لیتے ہوں[2] وغیر ذلک۔

العَروس: اس کا اطلاق مذکر ومؤنث دونوں پر ہوتا ہے، قرینۂ مقام سے اس کی مراد متعین کی جاتی ہے، یہاں مؤنث یعنی دلہن کے معنی میں ہے۔[3]

سبعون ذراعاً: بعض نے کہا کہ اس سے کثرت مراد ہے تحدید نہیں کیونکہ دوسری حدیث میں ''مدبصره'' تاحد نگاہ وارد ہوا ہے۔(۴)

إلا أحب أهله إليه: اس سے مراد اس کا شوہر ہے، مطلب یہ ہے کہ بس اب عیش سے رہو، سوجاؤ، گھر والوں کو مطلع کرنے کی فکر نہ کرو۔(۵)

التئمي عليه: یہ التئام سے صیغۂ امر ہے بمعنی انضمي واجتمعي یعنی مل جا، ایک ہوجا، مراد یہ ہے کہ اس پر تنگ ہوجا اور اس کو بھینچ دے، چنانچہ اس کے بعد قبر اس کو ایسا بھینچتی ہے کہ مردہ کی دونوں جانب کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔(۶)

---

(۱) المرقاة ۱/ ۳۲۰.

(۲) فتح الإله ۱/ ۵۱۶.

(۳) طیبی طاب الله ثراهُ ۱/ ۳۱۳.

(۴) طیبی ۱/ ۳۱۳، المرقاة ۱/ ۳۲۱.

(۵) طیبی ۱/ ۳۱۳.

(۶) المرقاة ۱/ ۳۲۳.

اضلاعه: یہ "ضلع" کی جمع ہے بمعنی پسلی۔

مؤمنِ فاسق کا حال:

سوال: مومن مطیع قبر میں سوالات کے صحیح جواب دیدیتا ہے اور کافر ومنافق نہیں دے پاتے، جیسا کہ اس حدیث میں مذکور ہے، لیکن مومنِ فاسق کا کیا حال ہوگا؟ وہ منکر نکیر کے سوالات کا جواب دے سکے گا یا نہیں؟

جواب: احادیث میں بربناء مصلحت اس کی صراحت نہیں ہے کہ مؤمن فاسق منکر نکیر کے سوالات کا جواب دے سکے گا یا نہیں؟ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ: مومن فاسق رجاء وخوف کے درمیان میں رہے، وہ جب یہ دیکھے گا کہ مؤمن مطیع صحیح صحیح جواب دیدیتا ہے تو مطیع بننے کی سعی کرے گا اور جب یہ سوچے گا کہ کافرومنافق جواب نہیں دے پاتے اور میں کافر نہیں ایمان والا ہوں تو اللہ کی رحمت کا امیدوار رہے گا، البتہ علماء نے فرمایا ہے کہ اس بارے میں وارد احادیث کے مجموعے سے ظاہر یہی ہے کہ مؤمن اگرچہ فاسق ہو تو وہ مؤمن عادل کی طرح صحیح صحیح جواب دیدیتا ہے اور قبر میں اس کو حسب حال راحت بھی حاصل ہوگی اور اگر مستحق عذاب ہوا تو عذاب بھی ہوسکتا ہے اور اللہ معاف بھی کرسکتا ہے، پس اس کا معاملہ بین بین ہے۔(۱)

۱۲۴ / ۷: وَعَنِ الْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قَالَ: "يَأْتِيهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهِ، فَيَقُوْلَانِ لَهُ، مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ رَبِّيَ اللّٰهُ، فَيَقُوْلَانِ لَهُ: مَادِيْنُكَ؟ فَيَقُوْلُ: دِيْنِيَ الإِسْلَامُ، فَيَقُوْلَانِ: مَاهٰذَالرَّجُلُ الَّذِيْ بُعِثَ فِيْكُمْ؟ فَيَقُوْلُ: هُوَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَيَقُوْلَانِ لَهُ: وَمَايُدْرِيْكَ؟ فَيَقُوْلُ: قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَآمَنْتُ بِهٖ وَصَدَّقْتُ، فَذٰلِكَ قَوْلُهُ: "يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ" الآية، قَالَ: فَيُنَادِيْ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ: أَنْ صَدَقَ عَبْدِيْ فَأَفْرِشُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَأَلْبِسُوْهُ مِنَ الْجَنَّةِ، وَافْتَحُوْا لَهُ بَاباً إِلَى الْجَنَّةِ، فَيُفْتَحُ قَالَ: فَيَأْتِيْهِ مِنْ رَوْحِهَاوَطِيْبِهَا، وَيُفْسَحُ لَهُ فِيْهَا مَدَّبَصَرِهٖ.

وَأَمَّا الْكَافِرُ فَذَكَرَمَوْتَهُ، قَالَ: وَيُعَادُ رُوْحُهُ فِيْ جَسَدِهٖ، وَيَأْتِيْهِ مَلَكَانِ، فَيُجْلِسَانِهِ فَيَقُوْلَانِ: مَنْ رَبُّكَ؟ فَيَقُوْلُ: هَاهْ هَاهْ، لَاأَدْرِيْ! فَيَقُوْلَانِ لَهُ: مَادِيْنُكَ؟

(۱) ملاحظہ ہو: الدر المنضود ۶ / ۵۳۴.

فَیَقُوۡلُ: ھَاہُ ھَاہُ لاأَدۡرِیۡ! فَیَقُوۡلانِ مَاھٰذَا الرَّجُلُ الَّذِیۡ بُعِثَ فِیۡکُمۡ؟ فَیَقُوۡلُ: ھَاہُ ھَاہُ لاأَدۡرِیۡ! فَیُنَادِیۡ مُنَادٍ مِنَ السَّمَاءِ: أَنۡ کَذَبَ فَأَفۡرِشُوۡہُ مِنَ النَّارِ، وَأَلۡبِسُوۡہُ مِنَ النَّارِ، وَافۡتَحُوۡا لَہٗ بَاباً إِلَی النَّارِ، قَالَ: فَیَأۡتِیۡہِ مِنۡ حَرِّھَا وَسَمُوۡمِھَا، قَالَ وَیُضَیَّقُ عَلَیۡہِ قَبۡرُہٗ حَتّٰی تَخۡتَلِفَ فِیۡہِ أَضۡلاعُہٗ، ثُمَّ یُقَیَّضُ لَہٗ أَعۡمٰی أَصَمُّ، مَعَہٗ مِرۡزَبَۃٌ من حدیدٍ، لَوۡضُرِبَ بِھَا جَبَلٌ لَصَارَتُرَاباً، فَیَضۡرِبُہ بِھَا ضَرۡبَۃً یَسۡمَعُھَا مَابَیۡنَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ إِلَّا الثَّقَلَیۡنِ، فَیَصِیۡرُتُرَاباً، ثُمَّ یُعَادُ فِیۡہِ الرُّوۡحُ" (رواہ احمد، وابوداود)[1]

ترجمہ: حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: قبر میں مردے کے پاس دوفرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر اس سے پوچھتے ہیں کہ تیرارب کون ہے؟ وہ جواب دیتاہے: "میرارب اللہ ہے" پھرفرشتے پوچھتے ہیں: "تیرادین کیاہے؟" وہ جواب میں کہتاہے"میرادین اسلام ہے"اس کے بعد فرشتے اس سے سوال کرتے ہیں: "جوشخص اللہ کی طرف سے تمہارے پاس بھیجا گیاتھا،وہ کون ہے؟ وہ کہتاہے: کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، پھرفرشتے اس سے پوچھتے ہیں" یہ تجھے کس نے بتایا"؟ وہ کہتاہے"میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھی، اس پرایمان لایا اوراس کی تصدیق کی؛ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی مطلب ہے اللہ تعالیٰ شانہ کے اس قول کا"یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت الآیۃ"یعنی اللہ تعالیٰ شانہ ان لوگوں کوثابت قدم رکھتاہے جوایمان لائے۔(اخیرآیت تک)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: پھرآسمان سے ایک پکارنے والا پکارکر کہتاہے: میرے بندہ نے سچ کہا،لہٰذا اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ اوراس کو جنت کالباس پہناؤ اوراس کے واسطے جنت کی طرف ایک دروازہ کھولدو، چنانچہ جنت کی طرف دروازہ کھول دیاجاتاہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے پاس جنت کی ہوائیں اورخوشبوئیں آتی ہیں اورحد نظرتک اس کی قبرکوکشادہ کردیاجاتاہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر کی موت کا ذکرفرمایا کہ اس کی روح اس

(۱)أخرجہ ابوداود، کتاب السنۃ ،باب فی المسألۃ فی القبروعذاب القبر ۲/۶۵۳، وأحمد ۴/۲۸۷برقم ۱۸۵۵۷، ۱۸۵۵۸، ۱۸۵۵۹.

کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اوراس کے پاس دوفرشتے آتے ہیں جواس کو بٹھاکر پوچھتے ہیں: تیرارب کون ہے؟ وہ کہتاہے: ہاہ ہاہ، میں نہیں جانتا، پھروہ پوچھتے ہیں: تیرادین کیاہے؟ وہ کہتاہے: ہاہ ہاہ، میں نہیں جانتا، اس کے بعدوہ پوچھتے ہیں: یہ شخص کون ہے جو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) تم میں بھیجا گیاتھا؟ وہ کہتاہے: ہاہ ہاہ، میں نہیں جانتا، پھرآسمان سے ایک پکارنے والا پکارکر کہتاہے''یہ جھوٹاہے، اس کے لئے آگ کابستر بچھاؤ، آگ کالباس اسے پہناؤ اوراس کے واسطے آگ کی طرف ایک دروازہ کھولدو''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چنانچہ دوزخ سے گرم ہوائیں اورلوئیں اس کے پاس آتی رہتی ہیں، اورفرمایاکہ قبراس کے لئے تنگ کردی جاتی ہے یہاں تک کہ ادھرکی پسلیاں ادھراورادھرکی پسلیاں اِدھرنکل آتی ہیں پھراس پرایک اندھابہرا فرشتہ مقررکردیاجاتاہے جس کے پاس لوہے کاایسا گُرز ہوتاہے کہ اسکواگر پہاڑپرمارا جائے تو وہ مٹی ہوجائے، وہ فرشتہ اس گرز سے اس طرح مارتاہے کہ (اس کے چیخنے کی آواز) مشرق سے مغرب تک تمام مخلوقات سنتی ہیں مگرجن وانس نہیں سنتے اوراس مارنے سے وہ مردہ مٹی ہوجاتاہے اس کے بعد پھراس کے اندرروح لوٹادی جاتی ہے۔(احمد وابوداود)

تشریح حدیث

احوالِ قبرکاتفصیلی تذکرہ:

اس حدیث پاک میں بھی راحت قبراورعذاب قبرکابیان ہے اورقبرکے تینوں سوالوں کاتذکرہ ہے یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے راوی براء بن عازبؓ ہیں، لیکن یہاں اس کا ابتدائی حصہ حذف کردیاگیاہے یہ مفصل روایت کتاب الجنائز میں آرہی ہے، اس حدیث کے ابتدائی حصہ میں مومن وکافرکے مرنے کامفصل حال بیان کیاگیاہے، کہ مومن کی روح آسانی کے ساتھ نکالی جاتی ہے، آسمانوں میں اس کی روح کا استقبال کیا جاتاہے، اورکافر کی روح نہایت سختی کے ساتھ نکالی جاتی ہے، اس کی روح کے لئے آسمانوں کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں، یہ ابتدائی حصہ یہاں باب کے مناسب نہ تھا کیونکہ زیرنظر باب کا مقصداحوال قبرکو بیان کرناہے،اس لئے اس کا ابتدائی حصہ حذف کرکے **یاتیہ ملکان** سے روایت شروع کی گئی جس میں احوال قبرکابیان ہے۔

ماهذا الرجل: یہاں ''ما'' ''من'' کے معنی میں ہے یا یہ حذفِ مضاف کے ساتھ ہے: ''ای **ماوَصفُ هذا الرجل أرسولٌ هو؟**'' یعنی اس شخص کا کیا حال ہے؟ کیا یہ رسول ہیں؛ **یاما اعتقادک فیه؟** یعنی اس شخص کے بارے میں تیرا کیا عقیدہ ہے؟(۱)

فأفرشوه من الجنة: فا عاطفہ اور افرشوا باب افعال سے صیغۂ امر ہے، بمعنی بستر بچھانا، جنت میں داخلہ تو قیامت میں ہوگا لیکن اس کی کچھ نعمتیں قبر سے ہی ملنی شروع ہوجاتی ہیں۔

فیأتیه من روحها وطیبها: روح راء کے فتحہ کے ساتھ بمعنی ہوا۔(۲)

مَدَّ بصره: ''مد'' میم کے فتحہ کے ساتھ، بمعنی فاصلہ، ''**مدبصره**'' کے معنی ہیں: نگاہ پڑنے کی حد تک کا فاصلہ، منتہائے نظر۔

ایک تعارض اور اس کا حل:

اس مضمون کی سابق روایت میں **سبعون ذراعاً** ستر ہاتھ کشادگی کا ذکر تھا اور یہاں منتہائے نظر کشادگی کا بیان ہے جو بظاہر تعارض ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں(۱) سبعون ذراعاً سے تحدید مراد نہیں بلکہ کثرت توسیع مراد ہے، اصل کثرتِ توسیع کو بیان کرنا مقصود ہے اس کثرت توسیع کو مختلف الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ روایات کا یہ اختلاف، اختلافِ اشخاص پر محمول ہے کہ بعض مؤمن بندوں کے لئے ستر ہاتھ اور بعض کے لئے منتہائے نظر کشادگی کی جاتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ ستر ہاتھ کی کشادگی قبر میں ہوتی ہے اور منتہائے نظر کشادگی جنت میں ہوتی ہے، اس صورت میں ''فیها'' کی ضمیر کا مرجع جنت ہوگا۔(۳)

هاه هاه: یہ کلمۂ تحیر وحسرت ہے۔

فینادي منادمن السماء: یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی آواز ہوتی ہے، یا اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے فرشتہ کی آواز ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ **لاأدری** کہنے میں جھوٹا ہے کیونکہ دنیا میں مشرق سے مغرب تک

---

(۱) فتح الإله ۱ / ۵۱۸.

(۲) المرقاة ۱ / ۳۲۳.

(۳) المرقاة ۱ / ۳۲٤.

دین اسلام کی شہرت تھی، مگر اس نے ازراہ عناد تسلیم اور قبول نہیں کیا۔ (۱)

فیأتیه من حرها وسمومها: "حر" بمعنی گرمی، "سموم" گرم ہوا جمع سمائم۔ (۲)

أعمی أصمّ: سوال ہوتا ہے کہ وہ فرشتہ بہرہ اور اندھا کیوں ہوتا ہے؟

اس کے دو جواب ہیں:

(۱) وہ فرشتہ اندھا بہرا ہوتا ہے تا کہ وہ مردے کی حالت کو دیکھ نہ پائے اور اس کی چیخ بھی نہ سن سکے۔ (۳)

(۲) بعض نے کہا کہ: اندھا و بہرا ہونا کنایہ ہے بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ مارنے سے۔ (۴)

مرزبته: میم کے کسرہ، زا کے فتحہ اور باء کی تشدید کے ساتھ ہے، بمعنی گرز، ہتھوڑا، گھن۔

۱۲۵ / ۸: **وَعَنْ عُثْمَانَؓ أَنَّهُ كَانَ إِذَا وَقَفَ عَلٰى قَبْرٍ بَكٰى حَتّٰى يَبُلَّ لِحْيَتَهُ، فَقِيلَ لَهُ: تَذْكُرُ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ فَلا تَبْكِيْ، وَتَبْكِيْ مِنْ هٰذَا؟! فَقَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنْزِلٍ مِنْ مَنَازِلِ الآخِرَةِ، فَإِنْ نَجَامِنْهُ فَمَابَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ، وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَابَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ" قَالَ: وَقَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَارَأَيْتُ مَنْظَراً قَطُّ إِلاَّ وَالْقَبْرُ أَفْظَعُ مِنْهُ"** (رواه الترمذي، وابن ماجه (۵) وقال الترمذی هذا حدیث غریب)

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ جب وہ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ اپنی داڑھی کو (آنسوؤں سے) تر کر دیتے، ان سے کہا گیا کہ آپ جب جنت وجہنم کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور قبر کی وجہ سے روتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ: حضرت نبی کریم

(۱) فتح الإله ۱ / ۵۱۹.

(۲) فتح الإله ۱ / ۵۲۰.

(۳) اللمعات ۱ / ۴۳۳.

(۴) المرقاة ۱ / ۳۲۵.

(۵) أخرجه الترمذی "کتاب الزهد، باب بدون ترجمه، وقبله باب ماجاء فی ذکر الموت، ۲ / ۵۷ وابن ماجه، کتاب الزهد، باب ذکر القبر والبلی ۲ / ۳۱۵"

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے جس نے اس منزل سے نجات پائی بعد کے مراحل اس کے لئے آسان ہیں اور جو شخص اس سے نجات نہ پاسکا اس کے لئے اس کے بعد کے مراحل اور سخت ہیں، حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی منظر قبر سے زیادہ سخت اور بھیانک نہیں دیکھا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، اور ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث غریب ہے)

تشریحِ حدیث

حضرت عثمان غنیؓ کا قبر کے خوف سے رونا:

اس حدیث پاک میں بھی مردہ کی نوعیت کے لحاظ سے قبر کے مقام راحت اور مقام تکلیف ہونے کا بیان ہے، حضرت عثمانؓ کا حال یہ تھا کہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ ان کی ڈاڑھی مبارک تر ہو جاتی، کسی نے پوچھا کہ آپ جنت و جہنم کے تذکرے سے اس قدر نہیں روتے جتنا قبر کے تذکرہ سے روتے ہیں، انھوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: قبر آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے، جو اس سے نجات پا گیا اس کے لئے بعد کی منزلیں بھی آسان ہوں گی، کیونکہ راحت و نجات کا ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے معاف کر دیا ہے، اور جو یہاں نجات نہ پاسکا اس کے بعد کے مراحل اس کے لئے اور سخت ہوں گے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ قبر سے زیادہ ہیبت ناک کوئی منظر نہیں دیکھا۔

سوال: حضرت عثمانؓ تو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں پھر وہ قبر کو دیکھ کر کیوں روتے تھے؟

جواب: یہ ہے کہ جنت کی بشارت کے باوجود ان پر خوف کا غلبہ ہوتا تھا کہ اللہ کو اس کے خلاف پر بھی قدرت ہے، اللہ تعالیٰ شانہ بے نیاز ہے اس کی شان بے نیازی کی وجہ سے اللہ کے مقرب بندے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہتے ہیں، بعض نے کہا کہ عذاب قبر دخول جنت کے منافی نہیں ہے یہ ممکن ہے کہ قبر میں کچھ عذاب ہو اور پھر جنت کا داخلہ نصیب ہو جائے۔(۱)

(۱) المرقاۃ ۱ / ۳۲۶.

قبر؛ آخرت کی اولین منزل:

القبر أول منزل من منازل ا لآخرة: آخرت میں بہت مراحل اور منازل ہیں مثلاً منزل میزان، منزلِ صراط، منزل جنت وجہنم وغیرہ، قبران منزلوں میں پہلی منزل ہے۔

وان لم ينج منه فمابعده اشد منه: اس قاعدہ سے وہ گنہ گار مؤمن مستثنی ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کے عوض محض قبر میں کچھ تکلیف دے کر آخرت میں عذاب نہیں دیں گے، اس کو قبر میں کچھ تکلیف دینے کا مقصد آخرت کے لئے پاک کرنا ہوگا۔(۱)

قبر؛ سب سے خوفناک منظر:

والقبر أفظع منه: قبر کا منظر سب سے زیادہ ہولناک اور خوفناک ہے، دراصل بندہ ایسے حالات سے پہلی مرتبہ دوچار ہوگا اور پہلی مصیبت بہت سخت معلوم ہوتی ہے، اس لئے ایسا کہا گیا، ورنہ بعد کی منزلیں اور بھی سخت اور خوفناک ہیں۔

١٢٦ / ٩: وَعَنْهُ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ، فَقَالَ: "اِسْتَغْفِرُوْا لأَخِيْكُمْ، ثُمَّ سَلُوْا لَهُ بِالتَّثْبِيْتِ، فَإِنَّهُ الآنَ يُسْأَلُ" (رواه أبوداود)(۲)

ترجمہ: حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کی تدفین سے فارغ ہوجاتے تو قبر کے پاس کھڑے ہوکر فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی دعاء کرو اس لئے کہ اب اس سے سوال کیا جائے گا۔(ابوداود)

تشریح حدیث

تدفین کے بعد میت کے لئے استغفار ودعا:

اس حدیث میں منکر نکیر کے سوال کا اجمالی تذکرہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معمول کا بیان ہے کہ

(۱) المرقاة ١ / ٣٢٦.

(۲) أخرجه أبوداود، كتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للميت في وقت الإنصراف ٢ / ٤٥٩.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا کرو، مثلاً ان الفاظ میں دعا کی جائے ''اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْهُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ'' چنانچہ دفنِ میت کے بعد میت کے لئے استغفار کرنا اور کچھ دیر قبر پر ٹھہرنا سنت ہے، حضرت عمرو بن عاصؓ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے دفن کرنے کے بعد اتنی دیر قبر پر ٹھہرنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا جائے، پھر بہتر یہ ہے کہ یہ استغفار و دعا ہاتھ اٹھائے بغیر ہو، ہاتھ اٹھانے میں صاحب قبر سے مانگنے کا شبہ ہوتا ہے، لیکن اگر ہاتھ اٹھا کر کرنا ہو تو قبر کی طرف پشت اور قبلہ کی طرف رخ کر کے اس کے لئے استغفار اور دعا کی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ میں ایسا ہی کیا تھا۔ (۱)

ایصالِ ثواب کا حکم:

استغفروا لأخيكم: اس سے معلوم ہوا کہ زندہ لوگوں کی دعا سے مردہ کو فائدہ ہوتا ہے، اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے، معتزلہ مسئلہ اہداء اور ایصالِ ثواب کو تسلیم نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے ''لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی (۲)'' یعنی انسان کو صرف اس کی اپنی کوشش کا بدلہ ملے گا، لہٰذا زندہ کا عمل مردے کے کام نہیں آئے گا، جواب یہ ہے کہ سعی کی دو قسم ہیں (۱) سعی ایمانی (۲) سعی عملی، آیت شریفہ میں سعی سے سعی ایمانی مراد ہے، سعی عملی نہیں، اور مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی دوست عزیز قریب وغیرہ اگر ایمان والا نہیں ہے تو تمہارے ایمان سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا البتہ جو حضرات ایمان والے ہیں ان کا حکم یہ ہے کہ ایک کے عمل سے دوسرے کو فائدہ ہوسکتا ہے جیسا کہ یہاں احیاء کو اموات کے لئے استغفار کا حکم اسی لئے دیا ہے کہ اس سے اموات کو فائدہ ہوتا ہے۔

البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ عبادات دو قسم کی ہوتی ہیں بدنی و مالی، عبادت مالی کا ثواب تو سب کے یہاں پہنچتا ہے، عبادت بدنی کے ثواب پہنچنے میں اختلاف ہے، احناف وحنابلہ فرماتے ہیں کہ عبادت مالی وبدنی دونوں کا ثواب پہنچتا ہے اور شوافع و مالکیہ کے یہاں عبادت بدنی کا ثواب نہیں پہنچتا ہے حتی کہ تلاوت قرآن کا ثواب بھی نہیں پہنچتا، کیونکہ تلاوت بھی عبادت بدنی ہے، لیکن ان کے یہاں اس سے

(۱) فتح الباری، کتاب الدعوات، باب الدعاء مستقبل القبلة ۱۱ / ۱۴۴.

(۲) من سورة النجم: ۳۹.

دعاء کا استثناء ہے، دعاء اگرچہ بدنی عبادت ہے، مگر شوافع و مالکیہ کے یہاں بھی دعاسے میت کو فائدہ ہوتا ہے۔ (۱)

مسئلۂ تلقین موتیٰ:

بعض شوافع نے اس حدیث سے مسئلۂ تلقین مستنبط کیا ہے جس کا تعلق بعدالدفن سے ہے، اس کی تفصیل ایک دوسری حدیث میں ہے وہ یہ کہ حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعدالدفن میت کو تلقین کا حکم دیا کہ ایک شخص قبر کے سر کی طرف کھڑا ہو اور مردے کو پکارے یـــا فـلان بـن فـــلانة! یعنی والدہ کی طرف نسبت کر کے پکارے تو مردہ اس کو سنتا ہے لیکن جواب نہیں دیتا ہے، پھر دوسری مرتبہ کہے تو مردہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، پھر تیسری مرتبہ کہے تو اس شخص سے مردہ کہتا ہے کہ اے اللہ کے بندے تو مجھ سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ پھر اس کے بعد کہے کہ تیرا رب اللہ ہے، تیرا دین اسلام ہے، تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسی طرح دوسرے عقائد سکھائے جائیں، اس طرح کرنے کی وجہ سے جب منکر نکیر آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کو تو جوابات بتائے جارہے ہیں، تو واپس چلے جاتے ہیں، علامہ سیوطیؒ نے جمع الجوامع میں ابن عساکر کے حوالہ سے اس روایت کو ذکر کیا ہے،(۲) مگر چونکہ اس حدیث کی سند مضبوط نہیں اس لئے اکثر حنفیہ اس طرح کی تلقین میت کے قائل نہیں اور ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ تلقین میت انکے یہاں غیر مستحسن ہے۔(۳)

۱۲۷/۱۰: وَعَنْ أَبِیْ سَعِیْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: "لَیُسَلَّطُ عَلَی الْکَافِرِ فِیْ قَبْرِہٖ تِسْعَۃٌ وَتِسْعُوْنَ تِنِّیْناً، تَنْھَسُہٗ وَتَلْدَغُہٗ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَۃُ، لَوْأَنَّ تِنِّیْناً مِنْھَا نَفَخَ فِی الْأَرْضِ مَاأَنْبَتَتْ خَضِراً" (رواہ الدارمی وروی الترمذي نحوہ(۴) وقال: "سبعون" بدل تسعة وتسعون)

(۱) کتاب الروح لابن القیم ص ۱۲۲.

(۲) جمع الجوامع، الهمزة مع الذال، رقم الحديث: ۱۷۰۰/۲۶۱۵.

(۳) فتاوی ہندیہ ۱/۱۰۰، مراقی الفلاح علی الطحطاوی ص ۳۰۶، مظاہر حق جدید ۱/۱۹۷.

(٤) أخرجه الترمذي، كتاب صفة القيامة، باب بدون ترجمه ۲/۷۲ والدارمي "باب في شدة عذاب أهل النار ۲/۷۸۷ برقم ۲۸۵۷"

ترجمہ: حضرت ابوسعیدؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: کافر کے اوپر اس کی قبر میں ننانوے ازدہے مسلط کئے جاتے ہیں، جو اس کو قیامت تک کاٹتے اور ڈستے رہتے ہیں، اگر ان میں سے ایک اژدہا زمین پر پھنکار ماردے تو زمین (کبھی) سبزہ نہ اُگائے (دارمی) اور ترمذی نے بھی اسی قسم کی روایت نقل کی ہے لیکن اس میں بجائے ننانوے کے ستر کا عدد ہے۔

تشریح حدیث

قبر میں کافر پر ننانوے سانپوں کا مسلط ہونا:

اس حدیث میں کافر کے لئے عذاب قبر کا بیان ہے کہ کافر پر قبر میں ننانوے اژدہے مسلط کئے جاتے ہیں جو اس کو کاٹتے اور ڈستے رہتے ہیں۔

تنینا: بروزن سکّیت بڑا سانپ جس میں زہر بہت زیادہ ہو: **حية عظيمة كثيرة السم**.(۱)

ننانوے کی وجہ تخصیص:

تسعة وتسعون: اس عدد کی اصل وجہ اللہ ہی کو معلوم ہے، البتہ بعض نے کہا کہ اللہ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے دنیا میں ایک رحمت کو اتارا ہے اسی ایک رحمت کا اثر ہے کہ والدین اپنی اولاد سے اولاد والدین سے بھائی بھائی وغیرہ سے باہم الفت ومحبت رکھتے ہیں اور یہ الفت ومحبت جانوروں میں درندوں میں بھی پائی جاتی ہے، ننانوے رحمتوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنین کی مغفرت کے لئے استعمال کرے گا، پس جو شخص کافر ہے وہ اللہ کی ننانوے رحمتوں کا بھی منکر ہے، اس لئے ہر رحمت کے مقابلہ میں اس پر ایک اژدہا مسلط کیا جائے گا۔(۲)

بعض نے کہا کہ مشہور روایت کے مطابق اللہ کے ننانوے نام ہیں **ان لله تعالىٰ تسعة وتسعين اسماً الحديث** کافر نے اللہ کا انکار کیا گویا کہ اس نے ننانوے صفات کا انکار کیا تو ہر صفت کے انکار کی وجہ سے ایک اژدہا مسلط کیا جائے گا۔(۳)

---

(۱) المرقاة ۱/۳۳۰، واللمعات ۱/۴۳۶.
(۲) المرقاة ۱/۳۲۸.
(۳) المرقاة ۱/۳۲۸.

ایک تعارض کا حل:

سوال: یہاں ننانوے اژدھوں کا بیان ہے اور ایک حدیث میں ستر اژدہوں کا ذکر ہے؟ پس دونوں حدیثیں بظاہر معارض ہیں؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) ستر والی روایت ضعیف ہے اور یہ روایت راجح ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ سبعین سے مراد کثرت ہے اور اس کی مقدار ننانوے ہے، پس دونوں کی مراد ایک ہوئی۔

(۳) بعض نے کہا کہ یہ اختلاف اشخاص پر محمول ہے، چنانچہ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ۹۹ والی روایت کافر متبوع کے لئے اور ستر والی روایت کافر تابع کے لئے ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ستر کا اور پھر بعد میں ننانوے کا علم دیا گیا اور عدد قلیل عدد کثیر کے منافی نہیں ہوتا ہے۔

(۵) بعض نے کہا کہ دونوں عددوں سے کثرت مراد ہے۔[1]

تنهسه وتلدغه :- یہ دونوں فعل باب فتح یفتح سے ہیں، بعض نے ان کو مترادف کہا ہے، اور بعض نے فرق بیان کیا ہے کہ زور سے کاٹا جائے لیکن زہر کم ہو یہ ''نہس'' اور کاٹنا کم ہو البتہ زہر زیادہ چڑھے یہ ''لدغ'' ہے جس کا اردو ترجمہ ڈسنا ہے۔[2]

ماأنبتت خضراً: یعنی وہ ایسا خطرناک سانپ ہوتا ہے کہ اگر اس کی پھنکار اور حرارت زمین پر پہنچ جائے تو زمین پر کبھی ہریالی پیدا نہ ہو، اللہ حفاظت فرمائے، جن مقامات میں میزائیل گرادیا جاتا ہے وہاں اس کا مشاہدہ خوب ہوتا ہے۔

الفصل الثالث

۱۲۸ / ۱۱: عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلٰى سَعْدِ بنِ مُعَاذٍ حِيْنَ تُوُفِّيَ، فَلَمَّا صَلّٰى عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَوُضِعَ

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۲۹، واللمعات ۱/ ۴۳۸، والتعلیق الصبیح ۱/ ۱۱۲.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۳۲۸.

فِيْ قَبْرِهٖ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ، سَبَّحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،فَسَبَّحْنَا طَوِيْلاً، ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا، فَقِيلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! لِمَ سَبَّحْتَ ثُمَّ كَبَّرْتَ؟ قَالَ:"لَقَدْ تَضَايَقَ عَلَى هٰذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهٗ حَتّٰى فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ"(رواه أحمد)(۱)

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ حضرت سعد بن معاذؓ کی وفات ہونے پر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ان کے جنازہ میں گئے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ سے فارغ ہوگئے اور حضرت سعدؓ کو قبر میں اتار کر قبر کی مٹی برابر کردی گئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ کہا، ہم بھی دیر تک تسبیح پڑھتے رہے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر کہی تو ہم نے بھی تکبیر کہی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ: یارسول اللہ! آپ نے تسبیح کیوں پڑھی اور پھر تکبیر کیوں کہی؟ فرمایا ''اس بندۂ صالح پر اس کی قبر تنگ ہوگئی تھی، پھر اللہ نے (ہماری تسبیح وتکبیر کی وجہ سے) اسے کشادہ فرمادیا۔(احمد)

تشریحِ حدیث

احوال جابرؓ:

ان کا پورانام جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام الانصاری السلمی ہے، ابوعبداللہ ابوعبدالرحمان اور ابومحمد کئی کنیتیں بیان کی گئی ہیں، بیٹے اور باپ دونوں صحابی ہیں، حضرت جابر کثیر الروایہ صحابہ میں شمار ہوتے ہیں، جنگ بدر اور اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے، فرماتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۱/غزوات کئے جن میں سے ۱۹/میں میں بھی شریک ہوا، اور بعض نے جنگ بدر واحد میں ان کی شرکت سے انکار کیا ہے، البتہ اس کے بعد کے غزوات میں شریک رہے، مسجد نبوی میں ان کا مستقل حلقۂ درس تھا، جس میں لوگ شریک ہوکر فیضیاب ہوتے تھے، اخیر عمر میں نگاہ کمزور ہوگئی تھی ،۹۴/سال کی عمر میں ۷۴ھ میں اور بقول بعض ۷۸ھ میں انتقال ہوا، بعض حضرات نے کہا ہے کہ مدینہ میں سب سے اخیر میں انہی کی وفات ہوئی یعنی صحابہ میں، مگر یہ مرجوح ہے، صحیح یہ ہے کہ مدینہ میں سب سے اخیر میں وفات پانے والے صحابی سہل بن سعد ہیں۔(۲)

---

(۱)أخرجه أحمد ۳ / ۳٦۰برقم ۱٤۹۱٦و۳ / ۳۷۷ برقم ۱٥۰۷۱.

(۲)الإصابة ۱/ ٥٤٦.

سعد بن معاذ اوران پرقبر تنگ ہوجانے کاواقعہ:

سعد بن معاذؓ انصار کے قبیلۂ اوس کے سردار تھے، قبیلۂ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ تھے، سعد بن معاذ قدیم الاسلام صحابی ہیں اسلام لانے کے بعد برابر اسلام کی خدمت کرتے رہے، غزوۂ بدراوراحد میں شریک ہوئے، غزوۂ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر مامور تھے، ۴ھ میں غزوۂ خندق ہوا جس میں قبائل عرب مدینہ پر چڑھ آئے تھے اور مسلمانوں کو نرغہ میں لے لیا تھا، یہودِ بنوقریظہ نے مسلمانوں سے کیا ہوا عہد توڑ کر مشرکین کا ساتھ دیا محاصرہ اس قدر شدید تھا کہ اہل ایمان کو ایسا محسوس ہورہا تھا گویا قلوب کھنچ کر گلے میں آگئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی خیرخواہی کے لئے ایک بات سوچی کہ ہم مدینہ کی کچھ کھجوروں پر کفار سے صلح کرلیں جس سے مسلمانوں کو اس محاصرہ سے نجات مل جائے اس پر سعد بن معاذ نے پوچھا کہ: یارسول اللہ کیا یہ من جانب اللہ حکم ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: نہیں! ایسی کوئی بات نہیں، یہ میرا مشورہ ہے اس پرانھوں نے عرض کیا کہ: ہم ان کفار کو ایک کھجور بھی نہیں دیں گے واللہ! زمانۂ جاہلیت میں بھی ان کفار مکہ کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جبراً ہم سے ایک کھجور بھی لیجائیں، اب تو اللہ جل شانہ نے ہمیں اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا، اب ہم اپنا مال ان کے حوالہ کریں، یہ ناممکن ہے، لہٰذا ہم ان کا مقابلہ تلواروں سے کریں گے، ان کی اس رائے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے چنانچہ مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی، اس جنگ میں حضرت سعد بن معاذ کو ایک زخم لگا تھا، کچھ مدت کے بعد وہ زخم ہرا ہوا اور اسی میں وہ شہید ہوئے، جب ان کی تدفین ہوئی تو اس وقت یہ واقعہ پیش آیا جو یہاں حدیث میں مذکور ہے۔

لقد تضايق على هذا العبد الصالح: حضرت سعد بن معاذ جلیل القدر صحابی ہیں اس کے باوجود وہ قبر کی تنگی کا شکار ہوئے، اس کے مختلف اسباب ووجوہات بیان کی گئی ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ وہ جلیل القدر صحابی تھے لیکن ان کے یہاں مویشی زیادہ تھے، اس کی وجہ سے ممکن ہے کہ پیشاب کی چھینٹیں آجاتی ہوں اور عذاب قبر پیشاب سے نہ بچنے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے، مگر یہ کوئی مضبوط بات نہیں ہے۔

(۲) بعض نے کہا کہ یہ عذاب قبر نہیں، بلکہ ضغطۂ قبر ہے اور یہ تھوڑی دیر کے لئے ہر شخص کو پیش

آتا ہے، مومن کے ساتھ قبر کا یہ معاملہ بطورِ محبت کے ہوتا ہے، لیکن سعد بن معاذ کے حق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضغطہ کو بھی بڑا سمجھا، اس لئے تسبیح پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسبیح کی برکت سے وہ رفع ہوا۔

معتزلہ کی تردید:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قبر میں ہر شخص کو ابتلاء پیش آسکتا ہے، حضرت سعد بن معاذ جیسے جلیل القدر صحابی بھی کسی نہ کسی درجہ میں اس میں مبتلا ہوئے، البتہ حضرات انبیاء علیہم السلام اس قسم کے ابتلا سے بھی محفوظ رہتے ہیں، دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایصالِ ثواب سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے، جیسا کہ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مسلک ہے، پس معتزلہ کی اس سے تردید ہوجاتی ہے۔

۱۲۹ / ۱۲ : وَعَنِ ابنِ عُمَرَؓ قَالَ: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذَا الَّذِیْ تَحَرَّکَ لَہُ الْعَرْشُ، وَفُتِحَتْ لَہ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وَشَھِدَہ سَبْعُوْنَ أَلْفاً مِنَ الْمَلائِکَۃِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّۃً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْہُ" (رواہ النسائی)(۱)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ (سعد بن معاذؓ) وہ شخص ہیں جن کے لئے عرش ہلنے لگا اور ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور ان کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے، تحقیق کہ ان کی قبر تنگ کی گئی پھر کشادہ کی گئی۔ (نسائی)

تشریح حدیث

آسمانوں پر حضرت سعد بن معاذ کا استقبال:

یہ حدیث ایک طرح سے گذشتہ حدیث کا تکملہ ہے، اس میں حضرت سعد بن معاذ کی فضیلت اور آسمانوں پر ان کا استقبال بیان کیا گیا ہے جب ان کی وفات ہوئی تو عرش خوشی سے جھومنے لگا، آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور ان کے جنازہ میں ستر ہزار فرشتے حاضر ہوئے۔

(۱) أخرجه النسائي، كتاب الجنائز، باب ضمة القبر وضغطته ۱ / ۲۸۹ برقم ۲۰۵۵.

”وفتحت له ابواب السماء“ آسمان کے دروازوں کا کھلنا ملائکہ کے اترنے اورروح کے اوپر چڑھنے کے لئے تھا۔(۱)

تحرک له العرش: اس کا یہ ہلنا خوشی کی وجہ سے تھا اس لئے کہ مومنین کاملین کی ارواح عرش کے نیچے ہوتی ہیں، عرش خوشی کی وجہ سے جھومنے لگا کہ ایک پاک روح ہماری طرف آرہی ہے،(۲) اور بعض نے کہا کہ ان کے انتقال پر عرش کا ہلنا رنج وغم کی وجہ سے ہوا کہ نیک بندوں کے انتقال پر آسمان وزمین بھی روتے ہیں جبکہ کفار کی موت پر آسمان وزمین نہیں روتے، چنانچہ فرعون اورآل فرعون کے بارے میں قرآن میں ہے” فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمَ السماء والأرض(۳) کہ نہ ان پرآسمان رویا اور نہ زمین“

۱۳۰/ ۱۳: وَعَنْ أَسْمَاءَ بِنْتِ أَبِيْ بَكْرٍؓ قَالَتْ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطِيْباً، فَذَكَرَ فِتْنَةَ القَبْرِ الَّتِيْ يُفْتَنُ فِيْهِ الْمَرْءُ فَلَمَّا ذَكَرَ ذٰلِكَ، ضَجَّ الْمُسْلِمُوْنَ ضَجَّةً. (رواه البخاری هکذا(۴) وَزَادَ النَّسَائِيُّ :)(۵) حَالَتْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ أَنْ أَفْهَمَ كَلَامَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا سَكَنَتْ ضَجَّتُهُمْ، قُلْتُ لِرَجُلٍ قَرِيْبٍ مِنِّيْ: أَيْ بَارَكَ اللّٰهُ فِيْكَ! مَاذَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ آخِرِ قَوْلِهٖ؟ قَالَ: قَالَ قَدْ أُوْحِيَ إِلَيَّ أَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِي الْقُبُوْرِ قَرِيْباً مِنْ فِتْنَةِ الدَّجَّالِ“

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ: ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اورقبر کے فتنہ کا ذکر فرمایا جس میں انسانوں کو مبتلا کیا جاتا ہے، جب آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اس کا ذکر کیا تو مسلمان چیخ چیخ کررونے لگے (بخاری نے اس کو اسی طرح روایت فرمایا ہے) اور (نسائی نے مزید یہ بیان فرمایا ہے) کہ وہ چیخنا حائل ہوگیا میرے اوراس بات کے درمیان کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سمجھ سکوں، جب یہ چیخنا

(۱)اللمعات ۱/ ٤٤٠.

(۲)فتح الإله ۱/ ٥٢٤.

(۳)من سورة الدخان : ۲۹.

(٤)أخرجه البخاری فی الجنائز، باب ماجاء فی عذاب القبر ۱/ ۱۸۳ برقم ۱۳۵۷.

(٥) والنسائی فی الجنائز، باب التعوذ من عذاب القبر ۱/ ۲۹۰.

چلانا بند ہوگیا تو میں نے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے پوچھا ”اللہ تمہیں برکت عطا فرمائے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا؟ اس شخص نے کہا کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مجھ پر وحی آئی ہے کہ تم قبروں کے اندر فتنہ میں مبتلا کئے جاتے ہو اور یہ فتنہ فتنۂ دجال کے قریب قریب ہوگا“

تشریح حدیث

احوال اسماء بنت ابوبکر:

آپ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی ہیں، مکہ ہی میں سترہ لوگوں کے بعد اسلام لے آئی تھیں اور حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں، ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپی زاد بھائی حضرت زبیرؓ سے ہوا، انہی سے عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے، جب عبداللہ بن زبیر کو حجاج نے سولی دی اس وقت حضرت اسماء کی عمر سو (۱۰۰) سال تھی، اور ایک دانت بھی نہیں ٹوٹا تھا، اور ہوش وحواس بالکل درست تھے، ان کا لقب ”ذات النطاقین“ ہے اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ ہجرت کے لئے تشریف لے جانے لگے اس وقت توشۂ سفر باندھنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی تو انہوں نے اپنا کمر بند نکالا اور اس کے دو ٹکڑے کئے، ایک سے اپنے ازار کو باندھا اور دوسرے سے توشہ کو، اس وجہ سے ان کو ”ذات النطاقین“ کہا گیا، نطاق بمعنی ازار بند، نطاقین اسی کا تثنیہ ہے، ہجرت سے ستائیس سال قبل پیدا ہوئی تھیں اور ۷۳ھ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے سولی دیئے جانے کے ۲۰؍روز بعد انتقال ہوا۔(۱)

فتنۂ قبر؛ فتنۂ دجال سے قریب قریب فتنہ:

حضرت اسماء کہتی ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اس میں عذاب قبر کا تذکرہ فرمایا، اس کی وجہ سے سامعین کی چیخیں نکل گئیں، نسائی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی چیخ کی وجہ سے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری بات نہ سن سکی، پھر جب سکون ہوا تو میں نے اپنے قریبی شخص سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخیر میں کیا فرمایا؟ اس نے بتایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں فتنۂ قبر میں مبتلا کیا جاتا ہے اور یہ فتنہ دجال کے فتنہ کے قریب قریب (خطرناک) ہے۔

(۱) الاصابہ ۷/ ۱۰–۱۱.

فذکر فتنة القبر: یعنی قبر کے عذاب اور وہاں کے ابتلاء وآزمائش کا تذکرہ کیا۔
ضج المسلمون ضجة: ''ضج یضج'' باب ضرب سے ہے بمعنی چیخنا، چیخ وپکار کرنا۔
قریب مني: قریب سے رشتہ داری کے لحاظ سے بھی قریب مراد ہوسکتا ہے اور بیٹھنے کے لحاظ سے بھی۔[1]

۱۳۱ / ۱۴۳: وَعَنْ جَابِرٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا أُدْخِلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا، فَيَجْلِسُ يَمْسَحُ عَيْنَيْهِ، وَيَقُوْلُ: دَعُوْنِيْ أُصَلِّي. (رواوہ ابن ماجہ)[2]

ترجمہ: حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب مردہ (مومن) کو قبر کے اندر دفن کردیا جاتا ہے تو اس کے خیال میں غروب آفتاب کا وقت لایا جاتا ہے چنانچہ وہ مردہ آنکھوں کو ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا ہے اور کہتا ہے مجھے چھوڑ دو تاکہ میں نماز پڑھ لوں'' (ابن ماجہ)

تشریح حدیث

قبر میں مؤمن کی بےفکری:

اس حدیث پاک میں مومن کی راحت قبر اور اس کی بےفکری کا بیان ہے کہ قبر میں جب فرشتے مؤمن کے پاس آئیں گے تو اس کو یہ محسوس ہوگا کہ عصر کا وقت ہے اور سورج غروب ہونے کے قریب ہے تو وہ بیٹھے گا اور آنکھیں ملتے ہوئے کہے گا کہ چھوڑو مجھے نماز پڑھنے دو، مطلب یہ ہے کہ جو شخص سچا پکا مسلمان ہے اور دنیا میں نماز کا پابند ہوتا ہے وہ قبر میں بےفکر ہوتا ہے اور فرشتوں سے نماز پڑھنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نیند سے بیدار ہوا ہوں اور سورج غروب ہونے والا ہے۔

مثلت له الشمس: ''مثلت'' ''صُوِّرَت'' کے معنی میں ہے یعنی سورج ڈوبتے وقت کی تصویر اس کے سامنے لائی جاتی ہے۔

سوال: میت کو غروب شمس ہی کا خیال کیوں ہوتا ہے؟

(۱) فتح الإله ۱ / ۵۲۵.

(۲) أخرجه ابن ماجه في الزهد، باب ذكر القبر والبلى ۲ / ۳۱۶.

جواب: اس میں دنیا سے کوچ کرنے کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کی زندگی بمنزلہ دن کے ہے، گویا اب اس کی زندگی کا دن غروب ہورہاہے، دنیا کی زندگی ختم کرکے اب یہ مسافر آخرت ہو چکا ہے، بعض نے کہا کہ اس میں صلوۃ عصر کی اہمیت کی طرف اشارہ ہے: جیسا کہ آیت کریمہ ''حافظوا علی الصلوات والصلوۃ الوسطی'' میں صلوۃ عصر کی اہمیت بتائی گئی ہے۔[1]

۱۳۲ / ۱۵: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ الْمَيِّتَ يَصِيْرُ إِلَى الْقَبْرِ فَيَجْلِسُ الرَّجُلُ فِيْ قَبْرِهٖ غَيْرَ فَزِعٍ وَلَامَشْغُوْبٍ، ثُمَّ يُقَالُ: فِيْمَ كُنْتَ؟ فَيَقُوْلُ: كُنْتُ فِي الْإِسْلَامِ، فَيُقَالُ: مَاهٰذَا الرَّجُلُ؟ فَيَقُوْلُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جَاءَنَابِالْبَيِّنَاتِ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ، فَصَدَّقْنَاهُ فَيُقَالُ لَهٗ: هَلْ رَأَيْتَ اللّٰهَ؟ فَيَقُوْلُ: مَايَنْبَغِيْ لِأَحَدٍ أَنْ يَرَى اللّٰهَ، فَيُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً قِبَلَ النَّارِ، فَيَنْظُرُ إِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضاً، فَيُقَالُ لَهٗ: اُنْظُرْإِلٰى مَاوَقَاكَ اللّٰهُ، ثُمَّ يُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً قِبَلَ الْجَنَّةِ، فَيَنْظُرُ إِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَافِيْهَا، فَيُقَالُ لَهٗ: هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الْيَقِيْنِ كُنْتَ، وَعَلَيْهِ مُتَّ، وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى، وَيَجْلِسُ الرَّجُلُ السُّوْءُ فِيْ قَبْرِهٖ فَزِعاً مَشْغُوْباً فَيُقَالُ لَهٗ: فِيْمَ كُنْتَ؟ فَيَقُوْلُ: سَمِعْتُ النَّاسَ يَقُوْلُوْنَ قَوْلاً فَقُلْتُهٗ، فَيُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً قِبَلَ الْجَنَّةِ، فَيَنْظُرُ إِلٰى زَهْرَتِهَا وَمَافِيْهَا، فَيُقَالُ لَهٗ: اُنْظُرْإِلٰى مَاصَرَفَ اللّٰهُ عَنْكَ، ثُمَّ يُفَرَّجُ لَهٗ فُرْجَةً إِلَى النَّارِ، فَيَنْظُرُ إِلَيْهَا يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضاً، فَيُقَالُ لَهٗ: هٰذَا مَقْعَدُكَ عَلَى الشَّكِّ كُنْتَ، وَعَلَيْهِ مُتَّ، وَعَلَيْهِ تُبْعَثُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى. (رواه ابن ماجه)[2]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مردہ قبر کے اندر پہنچتا ہے تو (نیک) بندہ قبر کے اندر اس طرح اٹھکر بیٹھ جاتا ہے کہ نہ تو وہ خوف زدہ ہوتا ہے اور نہ وہ گھبرایا ہوا، پھراس سے پوچھا جاتا ہے کہ: تم کس دین پر تھے؟ وہ کہتا ہے کہ: میں دین اسلام پر تھا، پھراس سے پوچھا جاتا ہے: یہ شخص (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ شانہ کے رسول ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے پاس سے ہمارے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لیکر آئے ہیں اور ہم نے ان کی تصدیق

(۱) المرقاۃ ۱ / ۳۳۲.

(۲) أخرجه ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر القبر والبلى ۲ / ۳۱۵.

کی ہے، پھراس سے سوال کیا جاتا ہے کہ کیا تو نے اللہ تعالیٰ شانہ کو دیکھا ہے؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، اس کے بعد اس کے لئے ایک روشن دان دوزخ کی طرف کھولا جاتا ہے اوروہ ادھر دیکھتا ہے اورآگ کے شعلوں کو اس طرح بھڑکتا ہوا پاتا ہے گویا اسکی لپٹیں ایک دوسرے کو کھارہی ہیں، اوراس سے کہا جاتا ہے اس چیز کو دیکھ جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے بچایا ہے، پھراس کے لئے ایک کھڑکی جنت کی طرف کھول دی جاتی ہے وہ جنت کی تروتازگی اوران چیزوں (نعمتوں) کو دیکھتا ہے جو اس میں ہیں، پھراس سے کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے کیونکہ دنیامیں تو یقین پرتھا اور یقین پرہی مرا،اوراسی حالت میں تجھے قیامت کے دن اٹھایا جائے گا انشاء اللہ اور بدکار بندہ اپنی قبرمیں خوف زدہ اور گھبرایا ہوا اٹھ کر بیٹھتا ہے، پس اس سے پوچھا جاتا ہے: تو کس دین میں تھا؟ وہ کہتا ہے: میں نہیں جانتا پھراس سے پوچھا جاتا ہے: یہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟ وہ کہتا ہے: میں لوگوں کو جوکچھ کہتے ہوئے سنتا تھا وہی میں کہتا تھا، اس کے بعد اس کے لئے بہشت کی طرف ایک روشن دان کھول دیا جاتا ہے جس سے وہ جنت کی تروتازگی اوراس کی چیزوں کو دیکھتا ہے پھراس سے کہاجاتا ہے اس چیز کی طرف دیکھ جسے اللہ تعالیٰ نے تجھ سے پھیرلیا ہے پھراس کے لئے جہنم کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے، اوراس سے کہاجاتا ہے کہ یہ تیرا ٹھکانہ ہے تو دنیامیں شک (کفر) پرتھا اسی پر تیری موت آئی، اوراسی پرتو اٹھایا جائے گا انشاء اللہ۔ (ابن ماجہ)

تشریح حدیث

احوال قبر کا تفصیلی بیان:

اس حدیث پاک میں مومن کی راحت قبراور کافر کے عذاب قبر کا تفصیلی بیان ہے، مؤمن بندہ جب قبرمیں پہنچتا ہے تو وہ بیٹھتا ہے اوربے خوف وخطر رہتا ہے، فرشتے اس سے پوچھتے ہیں تو کس مذہب پرتھا تو وہ کہتا ہے کہ میں اسلام پرتھا، پھرحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو وہ اس کا بھی صحیح جواب دیتا ہے، پھراس سے پوچھا جاتا ہے کیا تو نے اللہ کو دیکھا ہے؟ تو وہ جواب دیتا ہے کہ اللہ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا پھراس کو جہنم دکھائی جاتی ہے، اوراس کے بعد جنت تاکہ مصیبت کے بعد نعمت کی قدر ہوجائے،

اوراگر کافر ہوتا ہے تو وہ ان سوالات سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے اس کو اولاً جنت اور پھر جہنم دکھائی جاتی ہے تاکہ نعمت کو دیکھ لینے کے بعد مصیبت بھاری معلوم ہو، اوراس کے آلام میں اضافہ ہو جائے۔

ولا مشغوب: ''شغب'' سے ہے بمعنی فتنہ بھڑکانا، ہنگامہ کرنا، مطلب یہ ہے کہ وہ فتنہ وہنگامہ آرائی (عذاب وسختی) سے محفوظ ومامون ہوگا۔(۱)

یحطم بعضها بعضا: ''یحطم'' باب ضرب سے ہے بمعنی ایک دوسرے کو دھکیلنا کھانا۔

باب الاعتصام بالكتاب والسنة

(کتاب وسنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کا بیان)

ترجمۃ الباب کا مفہوم اوراس کی ضرورت:

''الاعتصام'' باب افتعال کا مصدر ہے، مجرد میں اس کا مصدر ''عصم'' ہے جو متعدی ہے معنی ہیں: روکنا، مزید فیہ میں پہنچ کر لازم ہوگیا اور معنی ہوگئے رکنا، لازم پکڑنا، کسی چیز سے چمٹ جانا، اور ایک معنی ہیں: کسی چیز پراعتماد کرنا، اس لحاظ سے ترجمہ (عنوان) کے معنی ہونگے: کتاب وسنت پراعتماد کرنے کا بیان اور پہلے لحاظ سے معنی ہونگے: کتاب وسنت کو لازم پکڑنے کا بیان، یعنی ان کی تعمیل واتباع کا بیان، یہاں دونوں معنی مراد ہیں اور دونوں ہی مطلوب ہیں۔

حضرات صحابہ کے زمانہ میں اس ترجمہ کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ وہ تو قرآن وسنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہی تھے، ان کے بعد امت مسلمہ میں فرق ضالہ پیدا ہوئے اورانہوں نے اپنے عقائد کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا، ان کی تردید کے لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرات متکلمین کو پیدا فرمایا، متکلمین نے ان کے دلائل عقلیہ کا جواب دیا اورامت کو یہ باور کرایا کہ عقائد کے ثبوت کے لئے دلائل عقلیہ کی ضرورت نہیں، بلکہ عقائد کے باب میں کتاب وسنت پراعتماد ہونا چاہئے، اس کے بعد حضرات مصنفین بھی اپنی کتابوں میں یہ ترجمہ قائم کرنے لگے، گویا یہ عنوان فرقِ ضالہ کی تردید کے لئے ہے۔

ربط از ماقبل:

(۱) ماقبل میں ایمان بالقدر اور عذاب قبر کا بیان تھا اوران دونوں میں امت کے فرقِ ضالہ کا اختلاف

(۱) فتح الإله ۱/۵۲۸.

ہے،اس لئے اب یہ باب قائم کر کہتا یا کہتقدیر کا مسئلہ ہو یا عذاب قبر کا مدار کتاب اور سنت پر ہونا چاہئے۔
(۲)اس باب میں عقائد باطلہ کی تردید کی جائے گی جس سے ایمانی عقائد نکھر کر سامنے آئیں گے لہٰذا ایمان کے ساتھ اس کی مناسبت باعتبار ضد کے بھی ہوگی۔

سنت کا مفہوم اور اقسام:

بالکتاب و السنة: کتاب سے مراد قرآن کریم اور سنت کے معنی طریقہ، مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کے اقوال اور احوال ہیں۔ (۱)

سنت کی دو قسمیں ہیں: سنت ہدی سنت زائدہ۔

(۱)سنت ہدی: وہ کام جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عبادت کیا ہو، جیسے جماعت کی نماز اور اذان واقامت، اس کا ترک مکروہ اور موجب اساءت ہے۔

(۲) سنت زائدہ: وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عادت کے کیا ہو، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کی سیرت لباس میں اور نشست و برخاست میں وغیرہ۔(۲)

بدعت کے لغوی اور شرعی معنی ومصداق:

سنت کی ضد بدعت ہے، یہاں اکثر روایات میں بدعت کی تردید بھی کی گئی ہے،لہٰذا بدعت کا مفہوم اور اس کی تفصیل بھی معلوم ہونی چاہئے۔

بدعت کے لغوی معنی ہیں: نئی چیز، اسی سے قرآن کریم میں ہے: ''بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْض'' (آسمان وزمین کو بلانمونہ پیدا کرنے والا) سابق نمونہ کے بغیر جو چیز وجود پذیر ہوگی وہ نئی ہی ہوگی۔

اور اصطلاح شرع میں اس کی متعدد تعریفات کی گئی ہیں:

(۱)علامہ جرجانی نے اپنی کتاب ''التعریفات'' میں بدعت کی یہ تعریف کی ہے ''البدعة هي الأمرُ المُحدَثُ الذی لم یکنْ علیه الصحابةُ والتابعونَ ولم یکن ممَّا اقْتضاه الدلیلُ الشرعيُّ (۳)''

---

(۱)فتح الإله ۱/ ۵۳۰.

(۲)ردالمحتار ۱/ ۷۰.

(۳) کتاب التعریفات للجرجانی ص:۳۷.

یعنی بدعت وہ نوایجاد کام ہے جس کو نہ صحابہؓ نے کیا ہو نہ تابعین نے اور نہ کسی شرعی دلیل نے اس کا تقاضہ کیا ہو۔

(۲) اور علامہ شاطبیؒ کے الفاظ یہ ہیں: "البدعةُ طريقةٌ في الدين مخترعةٌ تُضاهي الشريعَة، يُقصَد با لسلوک عليها المبالغةُ في التعبد لله سبحانه، ويُقصَد مايُقصَد بالطريقةِ الشرعيةِ [1]"

یعنی بدعت؛ دین میں گھڑے ہوئے اس طریقہ کا نام ہے جو شریعت کے مشابہ ہو اور اس پر چلنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مبالغہ ہو اور شرعی طریقہ سے جو مقصود ہوتا ہے وہی اس سے بھی مقصود ہو۔

بدعت کی ان تعریفات سے قدرِ مشترک کے طور پر واضح ہے کہ کسی امر کے بدعت ہونے کے لئے بطورِ خاص تین امور ضروری ہیں:

(۱) وہ امر نوایجاد کردہ ہو، نوایجاد کا مطلب یہ ہے کہ قرون اولی میں اس کی اصل موجود نہ ہو، نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح اس کا ثبوت ہو، نہ صحابۂ کرام سے اور نہ تابعینِ عظام سے، پس جس امر کا قرون اولی میں کسی بھی طرح ثبوت ہو وہ بدعت نہیں ہوگا۔

(۲) وہ نو ایجاد کردہ امر امورِ دین سے متعلق ہو، پس دنیوی امور میں اگر کوئی امر ایجاد کیا جائے گا تو وہ نہ ممنوع ہے اور نہ بدعت، اسی لئے آجکل جو ضرورت واستعمال کی نئی نئی چیزیں وجود پذیر ہورہی ہیں وہ سب جائز اور مباح ہیں، ان کا استعمال بدعت وممنوع نہیں۔

(۳) اس نوایجاد کردہ امر سے فی نفسہ تعبد وثواب مقصود ہو، لہذا دین میں اگر کوئی امر ایجاد کیا جائے تاکہ اس سے دین کی اعانت وحفاظت ہو اور دین کو تقویت ملے یا خود انسان میں دین کی رغبت پیدا ہو، فی نفسہ اس امر کو تعبد وثواب سمجھ کر نہ کیا جائے تو وہ بدعت نہیں کہلائے گا، چنانچہ دینی ادارے اور ان کا نصاب ونظام، خانقاہیں اور ان میں اذکار وریاضات کا اہتمام اور تبلیغی جماعت اور اس میں ماہانہ یا سالانہ مخصوص ایام میں گھر سے نکل کر دین سیکھنے وسکھانے کی پابندی، ان میں سے کسی پر بھی بدعت کا اطلاق نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی امر فی نفسہ تعبد وثواب سمجھ کر نہیں کیا جاتا، بلکہ کسی کا مقصود دین کی اعانت وحفاظت اور اس کی تقویت ہے اور کسی کا مقصود اپنے اندر دین کی رغبت وتشویق۔

ان امور کی روشنی میں غور کیا جائے تو عید میلاد النبی، تیجہ، چہلم اور برسی، متبرک راتوں میں مخصوص

(۱) الاعتصام للشاطبي ۱ / ۴۳، ت أبوعبيدة مشهور بن حسن آل سلمان، ط مكتبة التوحيد بيروت.

طریقہ سے نمازوں کی ادائیگی، کھانے پر فاتحہ خوانی اور اہل بدعت کے یہاں درود وسلام کے مروجہ طریقے یہ سب بدعت ہوں گے، کیونکہ مذکورہ اموران میں متحقق ہیں، چنانچہ نہ قرون اولی میں انکا کوئی ثبوت ہے، اوران کو دین کا حصہ بھی سمجھا جاتا ہے نیز بذات خود عبادت وثواب سمجھ کر انجام دیا جاتا ہے۔

بدعت کے مفاسد:

بدعت بہت خطرناک چیز ہے اوراس میں بڑے مفاسد ہیں، علماء نے فرمایا ہے کہ بدعتی کو عموماً توبہ کی توفیق نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس کو دین سمجھ کر کرتا ہے، نیز فرمایا کہ بدعتی سنت سے محروم رہتا ہے اور بدعتی ایک اعتبار سے مدعی نبوت ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ ایک کام کو، کارثواب بتاتا ہے، حالانکہ یہ نبی کا کام ہے کہ وہ امورِ دین کی نشان دہی کرے۔(۱)

بدعت کے اقسام:

بدعت کی دوقسمیں ہیں: بدعت حقیقیہ اور بدعت وصفیہ۔

بدعتِ حقیقیہ وہ ہے: جس کی اصل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو اوراس کو دین سمجھ کر کیا جائے مثلاً رہبانیت اختیار کرنا، عیدمیلا دالنبی منانا وغیرہ۔

اور بدعتِ وصفیہ وہ ہے جس کی اصل قرآن وسنت میں موجود ہو، لیکن اس کی کوئی خاص ہیئت وکیفیت، مقدار، طریقہ اور وقت ثابت نہ ہو، لوگوں نے اپنی طرف سے ان امور کو گھڑلیا ہو، جیسے نماز جنازہ کے بعد اجتماعی دعاء کرنا، تیجہ وچالیسواں کرنا۔

بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ کی بحث:

بہت سے اہل علم جن میں ہمارے اکابر بھی شامل ہیں فرماتے ہیں کہ بدعت کی دوقسمیں اور ملتی ہیں:

(۱) حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: ''من ابتدع في الإسلام بدعة یراها حسنة، زعم أن محمدا صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالة'' کہ: جس نے کسی بدعت کا ارتکاب کیا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) خائن تصور کیا، یعنی اس نے یہ خیال کیا کہ خیر کی بعض ایسی باتیں بھی ہیں جن کو (نعوذ باللہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپایا تھا وہ ہم پر منکشف ہوئی ہے، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کامل عطا کیا گیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''الیوم اکملت لکم دینکم الآیة'' پس جو کام اس وقت دین نہیں تھا وہ آج بھی دین نہیں ہوسکتا۔ (الاعتصام للشاطبي ۱/۶۴-۶۵)

(۱)بدعتِ حسنہ (۲)بدعتِ سیئہ۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ نے فرمایا کہ: ان دونوں قسموں میں امتیاز کے لئے اصول یہ ہے کہ دین کے نام پر جو نیا کام کیا جارہا ہے تو دیکھا جائے گا کہ اس کام کا باعث وداعی قرون مشہود لہا بالخیر میں موجود تھا یا نہیں؟ اگر موجود تھا اس کے باوجود اس زمانے میں وہ امر اختیار نہیں کیا گیا تو اس کو بدعت سیئہ کہا جائے گا اور اگر اس کا سبب وداعی اس زمانہ میں نہیں تھا بلکہ بعد میں متحقق ہوا تو وہ بدعت حسنہ ہے، بدعت سیئہ کی مثال تیجہ، چالیسواں، دسواں وغیرہ، اس کا مقصد اور سبب ایصال ثواب ہے، یہ سبب اس زمانے میں بھی موجود تھا کہ اس زمانے کی اموات بھی ایصال ثواب کی حاجتمند تھیں، مگر اس زمانہ کے لوگوں نے اس کو اختیار نہیں کیا، اس لئے یہ بدعت سیئہ ہے، بدعت حسنہ کی مثال موجودہ مدارس وخانقاہوں کا قیام ہے اس کا داعی وسبب علوم اسلامیہ کی حفاظت ہے، اس زمانے میں خیر کا غلبہ ہونے کی وجہ سے یہ ضرورت مسجد کی تعلیم سے مکمل ہوجاتی تھی، اب شر کا غلبہ ہے لوگ عام طور پر دنیا کے علوم وفنون پر توجہ دیتے ہیں، دینی تعلیم کی طرف توجہ بہت کم ہے، علم دین کی تحصیل کے لئے موانع بھی بہت ہیں، ان حالات نے اس بات کا تقاضہ کیا کہ امت میں علم وعمل کے بقاء وتحفظ کے لئے باقاعدہ ادارے (مدارس وخانقاہ) قائم کئے جائیں تاکہ لوگ اس طرف متوجہ ہوں اور یکسوئی کے ساتھ علم وعمل میں پختگی پیدا کرنے کا ان کو موقع ملے۔ (۱)

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے بدعت کی اس تقسیم کو تسلیم نہیں کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بدعت ہمیشہ سیئہ ہی ہوتی ہے، حسنہ نہیں ہوتی کما ورد فی الحدیث ”وکل بدعة ضلالہ (۲)“ ہر بدعت گمراہی ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ جن امور کے پائے جانے کی وجہ سے کوئی چیز بدعت ہوتی ہے اگر وہ کسی امر میں موجود ہوں تو وہ بالاتفاق لازمی طور پر سیئہ ہوگی، اور جس میں وہ امور متحقق نہ ہوں اور قرون اولیٰ میں اس کو اختیار نہ کرنے کے باوجود اب ضرورۃً اس کو اختیار کیا جائے تو از روئے شرع وہ بدعت نہیں؛ مگر لغۃً اس کو

(۱)امدادالفتاوی ۵ / ۲۹۱، جواهر الفقه ۱ / ۴۵۸ — ۴۵۹.

(۲)مسلم شریف ۱ / ۳۸۴، فتاوی رشیدیه ص ۱۵۵، کتاب العلم، ارشادات مجدالف ثانیؒ، انتخاب مفتی محمود اشرف عثمانی ص ۱۱۳.

بدعت کہا جاتا ہے کہ ماضی میں اس کا وجود نہیں تھا اور پھر حسن نیت ومقصد کے پیش نظر اس پر حسنہ کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، پس بدعت کے حسنہ وسیئہ ہونے کا یہ اختلاف لفظی ہے، حقیقی نہیں۔(۱)

الفصل الاول

۱۳۳ / ۱: عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ" (متفق علیہ)(۲)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

بدعت مردود ہے:

اس حدیث میں بدعت کی تردید ہے کہ جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی چیز ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے وہ رد ہے، مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کامل اور مکمل ہو چکا ہے اب اگر کوئی شخص اسلام میں کسی ایسی چیز کو ایجاد کرے جس کا ثبوت کتاب وسنت سے نہ ہو وہ شئی مردود وباطل ہے اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا امام نوویؒ نے اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ: یہ روایت جوامع الکلم میں سے ہے، اور یہ اسلام کے قاعدوں میں سے عظیم قاعدہ ہے اور بدعات کی تردید کے لئے صریح نص ہے۔(۳)

ھذا: اس سے دین اسلام کی طرف اشارہ ہے، "ھذا" سے محسوس ومبصر چیز کی طرف اشارہ ہوتا ہے دین اسلام بھی اپنے دلائل وبراہین کے اعتبار سے شئی مبصر ومحسوس کے درجہ میں ہے۔(۴)

(۱)امدادالفتاوی ۵ / ۲۹۱.

(۲)أخرجه البخاري في "كتاب الصلح"باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود ۱ / ۳۷۱ برقم ۲۶۱۹.
ومسلم في الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ورد محدثات الأمور ۲ / ۷۷.

(۳)نووی ۲ / ۷۷.

(٤)شرح المشكاة للطيبي ۱ / ۳۲۳، وفتح الإلٰه ۱ / ۵۳۱.

فھــــو رد: اس ضمیر کے مرجع میں کئی احتمال ہیں: (۱) اس کا مرجع احداث ہو، یعنی بدعت کا ایجاد کرنا مردود ہوگا اور اس احداث کی اجازت نہیں۔

(۲) اس کا مرجع **مـالیـس منه** ہے یعنی اس بدعت اور امرِ مُحدَث کو دین میں داخل نہیں کیا جائے گا، دلائل کے ذریعہ اس کا بدعت ہونا ثابت کر کے اس کو رد کردیا جائے گا، اور یہ فریضہ علماءِ اسلام انجام دیں گے۔

(۳) ہو ضمیر کا مرجع **مَــــــنْ** ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ بدعتی شخص مردود ہے، یعنی اسے اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوگا۔(۱)

۱۳٤ / ۲ : ''وَعَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: أَمَّابعد، فَإِنَّ خَیْرَالْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ، وَخَیْرَ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ، وَشَرُّالْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، وَکُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ'' (رواہ مسلم)(۲)

تــرجمه : حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ: حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ خطبہ میں) ارشاد فرمایا: بہرحال حمد وصلوۃ کے بعد، بیشک سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے، اور سب سے بہتر طریقہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور سب سے بدترین چیز وہ ہے جس کو (دین میں اپنے طور پر) ایجاد کیا گیا ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

کتاب وسنت کی فضیلت اور بدعت کی شناعت:

اس حدیث میں تین جملے ہیں: پہلے جملہ میں کتاب اللہ کی عظمت کا بیان ہے دوسرے میں سنت کی اہمیت اور تیسرے جملہ میں بدعت کی تردید مذکور ہے، اس لحاظ سے حدیث کے تینوں جملے باب کے مناسب ہیں کیونکہ ترجمۃ الباب ان تین اجزاء پر مشتمل ہے، کتاب، سنت اور رد بدعت۔

أمابعد : فصل خطاب ہے اس کا استعمال سب سے پہلے داؤد علیہ السلام نے کیا تھا، مزید تفصیل خطبۂ کتاب میں آچکی ہے۔

---

(۱) طیبی طاب الله ثراہ ۱ / ۳۲۳–۳۲٤، وفتح الإله ۱ / ۵۳۱.

(۲) أخرجه مسلم في الجمعة، باب تخفیف الصلاۃ والخطبة ۱ / ۳۸٤.

سوال: یہ کلمہ دوکلاموں کے درمیان فصل کرنے کے لئے لایا جاتا ہے؛ حالانکہیہاں اس سے پہلے کوئی کلام نہیں ہے بلکہ یہاں سے کلام کی ابتدا کی گئی ہے اور ابتداء کلام اس کا محل نہیں ہے؟

جواب: یہاں روایت مختصر ہے اصل یہ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ وعظ ونصیحت فرمارہے تھے تو خطبہ میں حمد وصلاۃ کے بعد'' امابعد'' کہا پس یہ کلمہ اثناء کلام میں واقع ہوا، نیز چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث دوران خطبہ ارشاد فرمائی تھی اس لئے آج بھی اس کو خطبہ میں پڑھا جاتا ہے۔(۱)

فإنخير الحديث الخ :الحديث؛ معنی میں ہے: **مايتحدث** بہ اور **مايتكلم به** کے اس لئے اس کامرادی ترجمہ ہے:'' کلام'' اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کا کلام تمام کلاموں میں افضل ترین کلام ہے، الفاظ کی فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بھی افضل ہے اور معنی کی جامعیت کے لحاظ سے بھی، کیونکہ قرآن کریم میں ایسے اصولِ کلیہ آگئے ہیں جن سے دنیاوآخرت کی تمام ضرورت کی چیزوں میں رہنمائی کی گئی ہے۔(۲)

وخير الهدى : اس میں الف لام استغراقی ہے، کیونکہ مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین اور آپ کے طریقہ کی فوقیت کو ثابت کرنا ہے تمام ادیان اور تمام سیرتوں پر، اور یہ معنی اسی وقت حاصل ہونگے جب الف لام کو استغراق کا قرار دیں۔(۳)

وشـرالأمور : سب سے بدترین امر دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنا ہے، اور دین میں نوایجاد کردہ چیز گمراہی ہے، اور اس کا موجد وعامل ہدایت سے محروم ہے۔

۱۳۵ / ۳:وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ، مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ، وَمُبْتَغٍ فِي الإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِئٍ مُسلِمٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيْقَ دَمَهُ''(رواه البخاري)(۴)

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد

(۱)المرقاة ۱ / ۳۳۷.

(۲)المرقاة ۱ / ۳۳۷.

(۳)المرقاة ۱ / ۳۳۷.

(٤)أخرجه البخاري، كتاب الديات، باب من طلب دم امرء بغير حق ۲ / ۱۰۱٦ برقم ٦٦١٧.

فرمایا کہ: اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض تین لوگ ہیں (۱)حرم میں ناجائز کام کرنے والا (۲) اسلام میں جاہلیت کے طریقہ کو تلاش کرنے والا (۳) کسی مسلمان کے ناحق خون کا طلبگار تاکہ اس کو بہائے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

مبغوض ترین تین لوگ:

اس حدیث پاک میں تین قسم کے لوگوں کو عنداللہ سب سے مبغوض بتایا گیا ہے:

(۱) **ملحدفي الحرم**: الحاد کے معنی ہیں: درستگی سے ہٹ جانا اور باطل کی طرف مائل ہونا، یعنی حرم میں ایسا کام کرنا جو وہاں حرام ہے مثلاً آفاقی شخص کا بغیر احرام کے حرم میں داخل ہونا، وہاں شکار کرنا، وہاں کی گھاس اور درخت کو کاٹنا، یہ تمام امور ناجائز ہیں اور یہ سب الحاد فی الحرم ہے۔ (۱)

(۲) **مبتغ في الإسلام**: مسلمان ہونے کے باوجود جاہلیت کے طور طریقوں کو رواج دینے والا، زمانۂ جاہلیت میں بہت ساری رسوم جاری تھیں مثلاً نوحہ کرنا، بدفالی لینا، مصیبت میں حد سے تجاوز کرنا اور خاندان کی ناحق حمایت کرنا وغیرہ، یہ جاہلیت کے رسوم ورواج تھے، اسلام کی برکت سے یہ رسوم ختم ہوئیں، اب اگر کوئی شخص ان رسوم کو زندہ کرے اور مسلمانوں میں ان کو رائج کرے وہ شخص اللہ تعالیٰ کو نہایت مبغوض ہے اسی طرح اس میں وہ بھی داخل ہے جو غیروں کی تہذیب اور طرز زندگی کو اپنائے اور ان کی تقلید کرے۔ (۲) حدیث کا یہی جملہ باب کے مناسب ہے۔

(۳) **مطلب دم امرئ**: یعنی کسی مسلمان کو ناحق قتل کرنا، "مطلب" اصل میں مُتْطَلِبْ تھا، تا کا طا میں ادغام کیا گیا ہے، صرف کا قاعدہ ہے کہ باب افتعال میں ف کلمہ کی جگہ ط ہو تو تاء افتعال کو ط سے بدل کر ط کا ط میں ادغام کر دیا جاتا ہے۔ (۳)

ایک سوال وجواب:

سوال: کیا یہ تینوں شخص کافر سے بھی بدتر ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، پھر ان کو ابغض الناس کیوں

(۱) شرح المشكاة للطيبي ۱ / ۳۲۷.

(۲) فتح الإله ۱ / ۵۳۶.

(۳) المرقاة ۱ / ۳۳۸-۳۳۹.

کہا گیا؟

جواب یہ ہے کہ: **الناس** سے گناہ گار مسلمان مراد ہیں، جمیع الناس مراد نہیں ہیں، تقدیر عبارت ہے:

إن أبغض عصاة المسلمين.(۱)

(۳) ''**يهريق**'' اصل میں یریق تھا، ماضی اس کا اراق ہے، ہمزہ کو ہاء سے بدل دیا گیا۔(۲)

١٣٦ / ٤: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:'' كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبىٰ'' قِيْلَ: وَمَنْ أَبىٰ؟ قَالَ: ''مَنْ أَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ أَبىٰ'' (رواه البخاری)(۳)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی مگر وہ شخص جس نے انکار کیا، پوچھا گیا: وہ شخص کون ہے جس نے انکار کیا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری فرمانبرداری کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا (وہ جنت میں داخل نہ ہوگا) (بخاری)

تشریح حدیث

نجات کے لئے اطاعتِ نبوی ضروری:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے کہ نجات کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا اعتصام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ضروری ہے، مضمون یہ ہے کہ میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا، عرض کیا گیا کہ ''من أبی'' سے کون مراد ہیں؟ فرمایا کہ: جو میری نافرمانی کرے، وہ من ابی میں داخل ہے۔

---

(۱) المرقاة ۱ / ۳۳۸.

(۲) (يهريق) بفتح الهاء ويسكن......من هراق الماء اذاصبه، والأصل أراق قلبت الهمزة هاء، وفيه لغة أخرى وهي إهراق بفتح الهمزة وسكون الهاء. (المرقاة ۱ / ۳۳۹)

(۳) اخرجه البخاری فی الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم، ۲ / ۱۰۸۱، رقم الحديث: (۶۹۸۸)

كل أمتي يدخلون......الخ : امت کی دوقسمیں ہیں: امت دعوت اورامت اجابت، یہاں امت کے مصداق میں دونوں احتمال ہیں، اگرامت دعوت مراد ہوتو ''الامن أبی ''میں ''اباء'' سے کفرمراد ہوگا اور دخول جنت میں عموم ہوگا خواہ دخول اولی ہو یا ثانوی، اورامت اجابت بھی مراد ہوسکتی ہے اس وقت ''إلا من أبی ''میں ''اباء'' سے فسق مراد ہوگا اوراس وقت دخول جنت سے دخول اولی مراد ہوگا۔(۱)

۱۳۷ / ۵: وَعَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ : جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ، فَقَالُوْا: إِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلاً فَاضْرِبُوْالَهُ مَثَلاً، قَالَ بَعْضُهُمْ: إِنَّهُ نَائِمٌ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوْا: مَثَلُهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَاراً وَجَعَلَ فِيْهَا مَأْدُبَةً وَبَعَثَ دَاعِيًا، فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ، وَأَكَلَ مَعَهُ مِنَ الْمَأْدُبَةِ، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ فَقَالُوْا: أَوِّلُوْهَالَهُ يَفْقَهُهَا، قَالَ بَعْضُهُمْ : إِنَّهُ نَائِمٌ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوْا: اَلدَّارُالْجَنَّةُ، وَالدَّاعِيْ مُحَمَّدٌ فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّداً فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ، وَمَنْ عَصَى مُحَمَّداً فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ، وَمُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَيْنَ النَّاسِ.(رواه البخاري)(۲)

ترجمہ : حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ فرشتے آئے، اس وقت آپ علیہ الصلوۃ والسلام سوئے ہوئے تھے فرشتوں نے آپس میں کہا کہ تمہارے اس ساتھی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک مثال ہے اس کوان کے سامنے بیان کرو، دوسرے فرشتہ نے کہا وہ توسوئے ہوئے ہیں (لہٰذا بیان کرنے سے کیافائدہ؟) ان میں سے بعض نے کہا بیشک ان کی آنکھیں سورہی ہیں لیکن دل بیدار ہے پھرانھوں نے کہا ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے گھر بنایا اورلوگوں کی ضیافت کے لئے دسترخوان لگایااور لوگوں کو بلانے کے لئے ایک آدمی بھیجا پس جس نے بلانے والے کی بات کو مان لیا وہ گھر میں داخل ہوگا دسترخوان (کی نعمتوں) سے کھائے گا اورجس نے بلانے والے کی بات کونہیں مانا وہ نہ گھر میں داخل ہوگا، اورنہ دسترخوان (کی نعمتوں) سے کھائے گا، یہ سن کرفرشتوں نے آپس میں کہا اس مثال

(۱)طیبی ۱ / ۳۲۷–۳۲۸.

(۲)أخرجه البخاري، كتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم ۲ / ۱۰۸۱ برقم۶۹۸۸.

کی وضاحت کریں تاکہ یہ سمجھ لیں، بعض فرشتوں نے کہا کہ بیان کرنے سے کیا فائدہ؟ وہ تو سوئے ہوئے ہیں، دوسروں نے کہا بیشک آنکھیں سوئی ہوئی ہیں لیکن دل تو بیدار ہے، اور پھر انھوں نے وضاحت کی کہ'' گھر سے مراد جنت ہے اور بلانیوالے سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پس جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کی، اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں'' (بخاری)

تشریح حدیث

اطاعت نبوی کے ضروری ہونے کی ایک مثال سے تفہیم:

اس حدیث پاک میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے اور سنت کی اطاعت کے ضروری ہونے کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے۔

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوئے ہوئے تھے اس وقت کچھ ملائکہ آپ کے پاس حاضر ہوئے، ترمذی کی روایت میں ہے کہ یہ حضرت جبرئیل ومیکائیل علیہم السلام تھے [1] اس لحاظ سے تثنیہ کا صیغہ ہونا چاہئے تھا مگر ان دونوں کی تعظیم کے لئے جمع کا لفظ لایا گیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے ہمراہ دیگر فرشتے بھی ہوں۔

ان فرشتوں میں باہم گفتگو شروع ہوئی کہ تمہارے ان صاحب کی ایک مثال ہے اس کو بیان کرو، بعض روایات میں ہے کہ قائل جبرئیل علیہ السلام تھے، اس پر میکائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ: یہ تو سوئے ہوئے ہیں پھر مثال کیوں کر سمجھیں گے، جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ'' **ان العین نائمة والقلب یقظان**'' ان کی آنکھ سوئی ہوئی ہے دل بیدار ہے، اس پر میکائیل نے یہ مثال بیان کی کہ: ایک سخی آدمی نے ایک اچھا مکان بنایا، اس میں دسترخوان لگایا اور اس پر قسم قسم کے کھانے چنے گئے، پھر اس سخی نے ایک شخص کو لوگوں کو بلانے کے لئے بھیجا کہ اس مکان کی طرف آویں اور یہاں کی نعمتیں حاصل کریں، اس داعی نے لوگوں کو

(۱) ترمذی شریف ۲/۱۱۳، (۲۸۶۰) لفظه: إني رأيت في المنام كأن جبريل عند رأسي، وميكائيل عند رجليَّ الحديث.

دسترخوان پر آنے کی دعوت دی، دعوت پہنچنے کے بعد لوگ دو قسم کے ہوگئے، بعض نے اس داعی کی بات کا اعتبار کیا، وہ حاضر ہوئے اور مکان میں داخل ہوکر کھانوں سے محظوظ ہوئے، اور بعض لوگوں نے اس داعی کی بات کا اعتبار نہیں کیا اور یوں کہنے لگے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص بلا کسی غرض کے لوگوں کی منفعت کے لئے مکان بناوے اور اپنی بلا کسی غرض کے لوگوں پر نعمتوں کا فیضان کرے یہ بات سچی معلوم نہیں ہوتی، چنانچہ انہوں نے داعی کی تکذیب کی اور اس کے بلانے سے حاضر نہیں ہوئے، اسی لئے یہ لوگ مکان کے داخلہ سے اور وہاں کی نعمتوں سے محروم رہے۔

پھر ملائکہ نے باہم کہا کہ اس مثال کی توضیح کرو، تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سمجھ لیں اس فرشتہ نے کہا کہ یہ سوئے ہوئے ہیں، دوسرے فرشتہ نے پھر وہی کہا کہ انکا قلب بیدار ہے، اس پر پہلے فرشتہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "دار" سے مراد جنت، اور صاحب دار، یعنی رجل کریم سے مراد اللہ تعالیٰ شانہ اور کھانوں سے مراد نعمائے جنت ہیں اور داعی سے مراد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لہذا جن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا جانا اور آپ کی اطاعت کی، وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور وہاں کی نعمتوں سے منتفع ہوں گے، اور جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور آپ کی اطاعت سے منہ موڑا وہ جنت سے اور اس کی نعمتوں سے محروم رہیں گے ترمذی کی ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ان نافرمانوں کو سزا بھی دی جائے گی، [1] اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔

اس مثال سے واضح ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و پیروی ضروری ہے اور وہی شخص کامیاب ہوگا جو آپ کی اتباع و پیروی کرے گا، ورنہ ناکام و نامراد ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام کی ایک خصوصیت:

إن العين نائمة و القلب يقظان : نوم العین ویقظۃ القلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دیگر انبیاء کی بڑی فضیلت اور خصوصیت ہے، ان کی آنکھیں سو جاتی تھیں جس کی وجہ سے چیزیں نظر نہیں آتی تھیں، مگر قلب بیدار اور مستعد رہتا تھا اور سونے کی حالت میں بھی قلب کا ادراک جاری رہتا تھا، اسی لئے حضرات انبیاء کا خواب وحی ہے اور ان کی نوم ناقض وضو نہیں ہوتی۔

(۱) ترمذي شريف ۲ / ۱۱۳، لفظ: ومن لم يجبه عاقبه أو عذبه.

سوال: فرشتہ نے "ان العين نائمة" کا مضمون پہلے بتادیا تھا تو اس کے اعادہ کی کیا ضرورت رہی؟
جواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس منقبت عظیمہ کو سامعین کے قلوب میں اچھی طرح مستحضر کرنے کے لئے مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔(۱)

۱۳۲ / ٦: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: جَاءَ ثَلاثَةُ رَهْطٍ إِلٰى أَزْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا أُخبِرُوْا بِهَا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا. فَقَالُوْا: أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَقَدْ غَفَرَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَاتَأَخَّرَ؟!

فَقَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَداً، وَقَالَ الآخَرُ: أَنَا أَصُوْمُ النَّهَارَ أَبَداً وَلاأُفْطِرُ وَقَالَ الآخَرُ: أَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَاءَ فَلا أَتَزَوَّجُ أَبَداً، فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ فَقَالَ: "أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ، وَأَتْقَاكُمْ لَهٗ، لٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ، وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ" (متفق عليه)(۲)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ: تین شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال دریافت کریں، جب ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال بتایا گیا تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کو گویا کم سمجھا اور آپس میں کہا: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں ہماری کیا حیثیت ہے؟ اللہ تعالی نے ان کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردیئے ہیں، ان میں سے ایک نے کہا: اب میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا، دوسرے نے کہا: میں دن میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا، تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کرونگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا تم لوگوں نے

(۱) المرقاة ۱ / ۳٤۱.

(۲) أخرجه البخاري في النكاح، باب الترغيب في النكاح لقوله تعالى فانكحوا ماطاب لكم من النساء ۲ / ۷۵۷ برقم ٤۸۷۲ ومسلم، كتاب النكاح، باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه إليه ووجد مؤنة ۲ / ٤٤۱ برقم ۱٤۰۱.

ایسا ایسا کہا ہے ''خبردار! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم میں سب سے زیادہ تقوی اختیار کرنے والا ہوں، لیکن (اس کے باوجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں (رات میں) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے) لہٰذا جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ (بخاری و مسلم)

تشریح حدیث

اتباعِ سنت اصل ہے:

اس حدیث پاک میں بھی اعتصام بالسنۃ کا بیان ہے کہ وہی عبادت دین ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر ہو جو عبادت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ ہو وہ دین نہیں ہے۔

مضمونِ حدیث یہ ہے کہ: بعض صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رات کے معمولات معلوم کرنے کا شوق ہوا، یہ چیز ازواج مطہرات سے معلوم ہوسکتی تھی، چنانچہ صحابہؓ میں سے تین حضرات ان کے پاس آئے حضرت علی، عثمان بن مظعون اور عبداللہ بن رواحہ، اور بعض روایات میں بجائے عبداللہ بن رواحہ کے مقداد بن اسود کا نام ہے جو حضرت علی کے دوست تھے۔ (۱)

بہرحال ازواج مطہرات نے رات کی عبادت بتائی، ان لوگوں کا گمان تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پوری رات عبادت کرتے ہوں گے لہٰذا انہوں نے اس عبادت کو کم سمجھا، لیکن بدگمان نہیں ہوئے بلکہ آپس میں کہا ''أين نحن من النبي صلى الله عليه وسلم''

اس جملہ کے دو مطلب ہوسکتے ہیں: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں آپ بخشے بخشائے ہیں، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ عبادت کی ضرورت نہیں، لیکن ہمیں عبادت زیادہ کرنی چاہئے۔

(۲) ہماری عبادت کی کیا حیثیت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے مقابلے میں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ شانہ کے سب سے زیادہ مقرب ہیں، ہماری زندگی بھر کی عبادت آپ کی دو رکعت

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۴۲.

کے برابر بھی نہیں ہوسکتی، اس لئے ہمیں زیادہ عبادت کرنی چاہئے۔(۱)

چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں پوری رات عبادت کیا کروں گا، دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا، تیسرے نے کہا کہ: میں عورتوں سے علیحدہ رہونگا کبھی نکاح نہیں کروں گا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے ازواج مطہرات نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تینوں کے پاس تشریف لے گئے اوران سے فرمایا کہ: تم نے ایسی ایسی بات کہی ہے، خبردار! میں تم میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اورسب سے زیادہ تقوے والا ہوں، اس کے باوجود میں روزہ بھی رکھتا ہوں اورافطار بھی کرتا ہوں، میں رات میں نماز بھی پڑھتا ہوں اورسوتا بھی ہوں اورمیں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، پس جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ ہم میں سے نہیں، یعنی ہمارے طریقہ پر نہیں۔

رھط: بمعنیٰ جماعت اس کا اطلاق تین سے دس تک کے عدد پر ہوتا ہے، اسی کے قریب لفظ نفر ہے اس کا اطلاق تین سے نوتک کے عدد پر ہوتا ہے جیسا کہ مرقاۃ میں ہے، یہاں ثلثه رھط سے تین اشخاص مراد ہیں۔(۲)

کانھم تقالوھا: یہ باب تفاعل سے ماضی جمع مذکر غائب کا صیغہ ہے، اصل **تقالل یتقالل تقاللاً** ہے، ادغام کی وجہ سے ''**تقالوھا**'' ہوگیا معنی ہیں: کم سمجھنا۔(۳)

وقد غفر الله له ماتقدم من ذنبه: یہاں ''ذنب'' سے خلاف اولی کام مراد ہے، اس لئے کہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام معصوم ہیں، بعض نے کہا کہ یہ جملہ عربی زبان میں محاورہ ہے عصمت کو بیان کرنے کے لئے، لہذا اس جملہ کے صادق آنے کے لئے ذمہ میں گناہ ہونا ضروری نہیں ہے اس صورت میں معنی ہونگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو معصوم ہیں، ہمارا یہ حال نہیں ہے، اس لئے ہمیں زیادہ عبادت کی ضرورت ہے، یہ بہتر مطلب ہے، ابن حجر مکیؒ نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں مغفرت کے معنی ہوتے ہیں: ان کے اوران کے گناہوں کے درمیان حائل قائم کردینا تا کہ ان سے معصیت کا صدور نہ ہو، اورانبیاء علیہم السلام کے

---

(۱)طيبي ۱/ ۳۳۱.

(۲)المرقاة ۱/ ۳٤۲.

(۳)أي: وجدوها قليلة، طيبي ۱/ ۳۳۱.

علاوہ میں مغفرت کا مطلب ہوتا ہے ان کے اوران کے گناہوں کی سزا کے درمیان حائل قائم کردینا تاکہ گناہوں پر سزا نہ ہو۔(۱)

انی لأخشاکم لله: خشية کے معنی ہیں: الخوف مع التعظيم یعنی کسی سے ڈرنا قلب میں اس کی عظمت ہونے کے ساتھ، جیسے بیٹا باپ سے اور شاگرد استاذ سے ڈرتا ہے کہ یہاں نرا خوف نہیں ہوتا بلکہ والد کی اور استاذ کی عظمت بھی قلب میں ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی خشیت سب سے زیادہ تھی اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اس لئے اللہ کی سب سے زیادہ عظمت آپ کے قلب مبارک میں تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس بات کو زیادہ جانتے تھے کہ اللہ کو عبادت کا کونسا طریقہ پسند ہے۔(۲)

فمن رغب عن سنتي فليس مني: سنت سے اعراض دو طرح ہوتا ہے: (۱) بطریقۂ انکار واہانت یہ کفر ہے اس وقت لیس منی اپنے اصل معنی میں ہوگا کہ وہ اسلام سے خارج ہے (۲) بطریقۂ تکاسل وغفلت، یہ مذموم ہے، مگر کفر نہیں اس وقت لیس منی کے معنی ہونگے کہ وہ میرے کامل طریقے پر نہیں ہے۔(۳)

۱۳۸/۷: وَعَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: صَنَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئاً، فَرَخَّصَ فِيْهِ، فَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؛ فَخَطَبَ فَحَمِدَ اللّٰهَ، ثُمَّ قَالَ: مَابَالُ أَقْوَامٍ يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْئِ أَصْنَعُهُ؟! فَوَاللّٰهِ إِنِّيْ لَأَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ، وَأَشَدُّهُمْ لَهُ خَشْيَةً" (متفق عليه)(۴)

ترجمه: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کیا اور اس کام میں لوگوں کو رخصت عطا فرمائی؛ لیکن کچھ لوگوں نے اس رخصت سے اجتناب کیا، جب

(۱) فتح الإله ۱/۵٤۲، والمرقاة ۱/۳٤۲.

(۲) تحفة الأبرار للبيضاوي ۱/۱۲۳.

(۳) طيبي ۱/۳۳۲.

(٤) أخرجه البخاري في موضعين، كتاب الأدب، باب من لم يواجه الناس بالعتاب ۲/۹۰۱ برقم ۵۸٦۳. وفي الاعتصام بالكتاب والسنة، باب مايكره من التعمق والتنازع ۲/۱۰۸٤ برقم ۷۰۰۸، ومسلم في كتاب الفضائل، باب علمه صلى الله عليه وسلم بالله تعالىٰ وشدة خشيته ۲/۲٦۱.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمدوثنا کے بعد فرمایا: لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اس چیز سے اجتناب کر رہے ہیں جسے میں کر رہا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں اللہ کو ان سے زیادہ جانتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

تشریحِ حدیث

رخصتوں میں بھی نبی علیہ الصلوۃ والسلام کا اتباع پسندیدہ:

اس حدیث کا مضمون حدیث سابق کی طرح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی مرضی کو زیادہ جاننے والے ہیں، اس لئے آپ کا طریقہ ہی لائق اتباع ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی معاملہ میں رخصت پرعمل کریں تو امت کے لئے بھی وہی بہتر ہے۔

مضمونِ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی عمل کیا اور اس میں عزیمت کے بجائے رخصت پرعمل کیا، وہ کیا عمل تھا؟ ابن بطالؒ نے کہا کہ: وہ روزہ دار کے لئے بوسہ کا معاملہ تھا، اور علامہ ابہری نے کہا کہ: وہ چیز افطار فی صوم السفر تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے سفر پر تھے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور گرمی عروج پر تھی، بہت سے صحابہؓ شدتِ عطش کی وجہ سے نڈھال ہوگئے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ افطار فرمادیا اور صحابہ نے بھی افطار کرلیا؛ لیکن بعض صحابہ نے افطار نہیں کیا اور عزیمت کو اختیار کیا، انہوں نے یہ سوچا کہ یہ فعل کمال کے منافی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا افطار فرمانا بیان جواز کے لئے ہے،[1] جب یہ خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا، اور اللہ تعالیٰ کی حمدوثنا بیان کی اور پھر فرمایا کہ: لوگوں کا عجیب حال ہے کہ میں نے جو عمل کیا بعض لوگ اس سے اجتناب کر رہے ہیں، حالانکہ میں اللہ کی مرضی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہوں اور سب سے زیادہ اس سے خشیت رکھتا ہوں، جب میں نے اس موقعہ پر رخصت کو اختیار کیا تو لوگوں کا رخصت پرعمل کرنا ہی اللہ کو محبوب ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ: اللہ رخصت پرعمل کرنے کو بھی پسند فرماتا ہے جیسا کہ عزیمت پرعمل کو پسند

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۴۵.

فرماتا ہے کیونکہ رخصت پرعمل میں اپنی کمزوری وعاجزی کا اللہ کے سامنے اقرار ہے، اور یہ چیز اللہ کو بہت پسند ہے۔(۱)

۱۳۹ / ۸: وَعَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ: قَدِمَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يُؤَبِّرُوْنَ النَّخْلَ، فَقَالَ: "مَاتَصْنَعُوْنَ؟" "قَالُوْا: كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ: "لَعَلَّكُمْ لَوْلَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْراً" فَتَرَكُوْهُ، فَنَقَصَتْ قَالَ: فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ: "إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ أَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِيْ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ. (رواه مسلم)(۲)

ترجمہ: حضرت رافع بن خدیجؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ: جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے اس وقت مدینہ منورہ کے لوگ کھجور کے درختوں میں تابیر کیا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا "یہ تم کیا کرتے ہو"؟ اہل مدینہ نے عرض کیا "ہم ایسا ہی کرتے آئے ہیں" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید بہتر ہو چنانچہ لوگوں نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنکر) اسے چھوڑ دیا مگر اس سال پھل کم آیا۔

راوی کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے اس کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بھی ایک انسان ہوں، لہٰذا میں جب تمھیں ایسی بات کا حکم دوں جو تمہارے دین سے متعلق ہو تو اسے اختیار کرو اور جب کوئی بات تمھیں اپنی رائے سے بتاؤں تو (سمجھ لو) میں بھی ایک انسان ہوں۔(مسلم)

(۱) رواه البزار في مسنده برقم (۵۹۹۸) عن عبدالله بن عمر، ولفظه: إن الله تبارك وتعالىٰ يحب أن تؤتى رخصه كمايحب أن تؤتى عزائمه أو كمايكره أن تؤتى معصيته، وكذا أخرجه وغيره من البيهقي وابن حبان وابن أبى شيبه وأحمد بن حنبل والطحاوي وغيره.

(۲) أخرجه مسلم، كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا دون ماذكره صلى الله عليه وسلم من معايش الدنيا على سبيل الراي ۲ / ۲۶۴. (۱) مرقاة ۱ / ۳۴۵.

تشریحِ حدیث

احوال رافع بن خدیج:

رافع بن خدیج انصاری اوسی ہیں، دادا کا نام بھی رافع ہے، ابوعبداللہ اور ابوخدیج کنیت ہے، والدہ کا نام حلیمہ بنت مسعود ہے، غزوہ بدر میں کم سنی کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے، باقی سب غزوات میں شریک رہے، مدینہ میں اپنی قوم وخاندان کے سردار تھے، غزوۂ احد میں ایک معمولی سازخم لگا، اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں قیامت کے دن تمہارے لئے گواہ بنوں گا، چنانچہ اس وقت تو وہ زخم اچھا ہوگیا، مگر پھر عبداللہ بن مروان کے زمانہ میں وہ زخم ہرا ہوا اور اسی میں ۷۳ھ میں ۸۶ سال کی عمر میں ان کی شہادت ہوئی۔ (۱)

تابیرِ نخل اور دنیوی امور میں آپ کے اتباع کا حکم:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کی تفصیل بتائی گئی کہ وہ کب ضروری ہے اور کب ضروری نہیں؟ وہ یہ کہ: اگر امور دینیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی حکم دیں تو اس کا اعتصام ضروری ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ وہ حکم منجانب اللہ وحی ہوتا ہے اور اگر دنیا کے کسی معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رائے سے کوئی بات فرمائیں تو اس کا اعتصام لازم نہیں ہے جیسا کہ اس حدیث میں مذکور واقعہ سے ظاہر ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اہل مدینہ کا گزر بسر کھجوروں پر تھا جیسے ہمارے یہاں گیہوں پر ہے، ان کو مہینوں روٹی نہیں ملتی تھی، کھجور کھانے پر اکتفا کیا کرتے تھے، مدینہ طیبہ میں کھجور کے باغات بہت تھے، اہل مدینہ ان کی کاشت کے بہت ماہر تھے، کھجور کی پیداوار کے بڑھانے کا ایک طریقہ ان کے یہاں تابیرِ نخل تھا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ کھجوروں کے درختوں میں مذکر ومؤنث دونوں ہوتے ہیں مذکر ومؤنث کا اختلاط کرایا جائے تو کھجور زیادہ پیدا ہوتی ہیں، اختلاط کی صورت یہ ہے کہ: مذکر کھجور کے شگوفے کو مؤنث کھجور کے شگوفے میں داخل کیا جاتا ہے، یہ ایک قسم کا جماع ہوگیا، اسی کو "تابیر نخل" کہا جاتا ہے، اس سے کھجوروں کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔

---

(۱) الإصابة ۲ / ۱۴۱ - ۱۴۲.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کو دیکھا کہ :وہ تابیر کرتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ یہ جاہلیت کی رسم ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگرایسا نہ کرو تو ممکن ہے اس میں خیر ہو، چنانچہ صحابہؓ نے اس سال تابیر نہیں کی، لیکن اس سال پھل کم آئے، صحابہؓ نے اس کا تذکرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ جاہلیت کی رسم نہیں، بلکہ من جانب اللہ تکثیرِ ثمرہ کا سبب ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں بھی انسان ہوں اگر میں دنیوی معاملہ میں جس کا دین سے تعلق نہ ہو اپنی رائے سے بطور مشورہ کوئی حکم دوں تو اس میں خطا کا احتمال ہے اس میں اتباع لازم نہیں ہے، البتہ دینی امور میں اتباع لازم ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ذاتی معاملات میں اگر کوئی بات ارشاد فرماتے تو صحابہؓ معلوم کرتے کہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ؟ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم ہونا بتاتے تو اس کا اتباع لازم سمجھتے، مشورہ میں اتباع کو لازم نہ سمجھتے۔

معلوم ہوا کہ اعتصام دینی امور میں لازم ہے مشورہ کی چیزوں میں نہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل توجہ امور دینیہ کی طرف تھی دنیوی امور کی طرف آپ زیادہ توجہ نہ فرماتے۔

''انتم اعلم بامر دنیا کم'' کا صحیح مفہوم اور ایک غلط نظریہ کی تردید:

اس حدیث کے بعض طرق میں ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم'' بھی وارد ہوا ہے[1] جس سے بعض اباحت پسند افراد نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شرعی احکامات کی پابندی صرف عقائد وعبادات کی حد تک محدود ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فقط ان ہی چیزوں کی تعلیم واصلاح کے لئے ہوئی تھی، معاملات، معاشرت اور سیاسیات ان سب میں انسان آزاد ومختار ہیں، شریعت کے مکلّف اور پابند نہیں، لہذا ان امور ومعاملات کو اپنی عقل اور حالات کے تقاضہ کے مطابق جس طرح چاہے انجام دیا جاسکتا ہے، نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں اگر کچھ صادر ومنقول بھی ہے تو وہ محض شخصی رائے ہے، کوئی واجب العمل حکم نہیں، کیونکہ آپ نے فرمادیا ہے: ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم''۔

(۱) مصابیح ج۱ ص۱۵۲ رقم ۱۰۸: در المعارفه بیروت.

لیکن اس حدیث سے یہ استدلال سراسر مغالطہ اورفریب ہے، اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ انسان عقائد وعبادات کے ماسوا تمام امور ومعاملات میں آزاد ومختار ہیں، اس لئے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ احادیث مبارکہ کا مجموعہ اورحضرات صحابہ کی زندگی کا مکمل تعامل اس نقطۂ نظر کی پرزورنفی اورتردید کرتا ہے، آپ کی احادیث جیسے عقائد وعبادات کو بیان کرتی ہیں ایسے ہی ان میں معاملات، معاشرت اور سیاسیات کے بارے میں بھی واضح ہدایات ذکر کی گئی ہیں، اوردین کی بیشتر بلکہ تین چوتھائی تعلیمات وہ ہیں جو انہی شعبوں سے متعلق ہیں، حضرات محدثین وفقہاء نے باضابطہ ان تعلیمات کے ایک ایک جزء کو واضح کیا ہے، اورصحابۂ کرام کی پوری زندگی اس کی گواہ ہے، وہ زندگی کے ہرشعبہ میں حضوراکرم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی ہدایات کی بھرپوراتباع کرتے اور کرواتے تھے، ترمذی شریف میں حضرت عمرؓ کا معمول نقل کیا گیاہے کہ وہ بازارمیں گشت کرتے ارو دوکانداروں سے استفسارکرتے کہ انہوں نے معاملات کا شرعی علم حاصل کیاہے؟ جولاعلمی کا اظہار کرتا اس کوبازارومنڈی سے یہ کہہ کر ہٹادیا کرتے: ’’لایَبِعْ فی سوقنا الامن تفقہ في الدین‘‘[1] یعنی ہمارے بازارمیں صرف وہی خرید وفروخت کرے جس نے دین کا علم حاصل کیا ہو۔

ظاہر ہے کہ اگر دنیوی امورومعاملات شرعی پابندیوں سے آزاد ہیں تو پھرحضرت عمرؓ کا ان سے لاعلمی کی بناء پر بازار سے دوکان ہٹوانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ: یہ جملہ تابیرنخل یعنی کھجورکی پیداوارمیں اضافہ کی ایک صورت کے بارے میں وارد ہواہے، پس اس کا مطلب فقط اتنا ہے کہ پیداوار میں اضافہ کی صورتوں سے تم زیادہ واقف ہو، میں نہیں، اسی طرح دیگر پیشے وحرفتیں اورطریقہائے کاروبار ہیں ان کی عملی تفصیلات سے بھی میں زیادہ باخبرنہیں ،واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ نبیؐ اوررسولؐ کی لائن کی چیزنہیں ہے، پس آپ نے جوفرمایا بجافرمایا، مگراس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس سے جملہ دنیوی امورومعاملات میں ہرطرح کی آزادی حاصل ہوگئی ہے اوراب نبی علیہ السلام کی جانب سے اس بارے میں دی گئی ہرہدایت وتعلیم ناقابل عمل ہوگئی ہے بالکل غیرمعقول بلکہ حماقت ہے، آپ علیہ السلام کا یہ فرمان ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی حاکم کے سامنے رعایا کے پیشے اورطریقہائے کاروبار زیربحث ہوں اوروہ دورانِ بحث یہ کہدے کہ: میں ان کی انجام دہی کے طریقوں سے زیادہ واقف نہیں، ظاہر ہے کہ حاکم کے اس کہنے کا یہ نتیجہ نہیں نکالا جائے گا کہ اب ان امورومعاملات میں کبھی اس کا کوئی

(۱) ترمذي شریف، کتاب الصلوۃ، باب ماجاء فی فضل الصلوۃ علی النبي صلی اللہ علیہ وسلم ۱ / ۱۱۰.

حکم نافذ نہیں ہوگا، بیشک وہ ان کی انجام دہی کے عملی طریقوں سے ناواقف ہے مگر پھر بھی وہ اس کے دائرۂ اختیار میں رہیں گے، اوران کے بارے میں اس کی ہدایات وفرامین واجب العمل ہوں گے، ہرملک کا حاکم پیشوں اورکاروبار کی عملی تفصیلات سے ناواقف ہی ہوتا ہے،مگران کے بارے میں اس کے احکامات واجب التنفیذ ہوتے ہیں، پس آپ علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ فرمان بھی اسی تناظر میں وارد ہوا ہے۔

اوراس مفہوم کی تائید خود حدیث کے الفاظ سے ہوتی ہے، آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ''علم'' کا لفظ استعمال کیا ہے، جس کے معنی پختہ اورکامل معرفت کے ہیں، اس کے علاوہ اس کا کچھ اورمفہوم نہیں، پس اس کا مطلب فقط یہ ہے کہ صنعت وکاروبار کا گہرا وپختہ علم اوراس کی اندرونی وعملی تفصیلات سے مکمل واقفیت تم لوگوں کوزیادہ ہے، اس جملہ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں کہ جس سے یہ مفہوم ہوکہ اس کے ذریعہ دنیوی تمام امورومعاملات میں کلی آزادی دیدی گئی ہے اوروہ نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے دائرہ اختیار سے باہر ہوگئے ہیں۔واللہ اعلم

۱۴۰/ ۹: عَنْ أَبِي مُوسىٰ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ،قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ مَابَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتىٰ قَوْماً، فَقَالَ: يَاقَوْمِ!إِنِّي رَأَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ، وَإِنِّي أَنَا النَّذِيْرُ الْعُرْيَانُ! فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ، فَأَطَاعَهُ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهِ فَأَدْلَجُوْا، فَانْطَلَقُوْا عَلىٰ مَهَلِهِمْ فَنَجَوْا، وَ كَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ فَأَصْبَحُوْا مَكَانَهُمْ، فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَأَهْلَكَهُمْ وَاجْتَاحَهُمْ، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ أَطَاعَنِي فَاتَّبَعَ مَاجِئْتُ بِهِ، وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِي وَكَذَّبَ مَاجِئْتُ بِهِ مِنَ الْحَقِّ''(متفق عليه)[1]

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اوراس چیز (دین وشریعت) کی مثال جسے دیکر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اس شخص کی سی ہے جوایک قوم کے پاس آیا اورکہا:اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لشکر کو دیکھا ہے اورمیں ننگا (بے غرض) ڈرانے والا ہوں، لہٰذاتم اپنی نجات کاراستہ تلاش کرلو، چنانچہ اس

(۱)أخرجه البخاري في موضعين ''كتاب الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم'' ۲/ ۱۰۸۱برقم ۶۹۹۱.وأيضا''كتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصي ۲/ ۹۵۹برقم ۶۲۳۳.ومسلم في الفضائل، باب شفقته صلى الله عليه وسلم على أمته الخ ۲/ ۲۴۸.

قوم میں سے ایک جماعت نے اس کی فرمانبرداری کی چنانچہ وہ لوگ رات کے اول حصہ میں چلدیئے اوراطمینان سے چلتے رہے، انہوں نے (دشمن سے) نجات پالی،اورایک جماعت نے اس کو جھٹلایا اور صبح تک اپنے گھروں میں رہی، صبح کولشکر نے آ کر ان کو پکڑلیا، اور ہلاک کرڈالا، اور جڑ سے ختم کردیا، پس یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے میری فرمانبرداری کی اور جو احکام میں لایاہوں ان کی پیروی کی، اور مثال ہے اس شخص کی جس نے میری نافرمانی کی اور جو حق کی بات (یعنی دین وشریعت) میں لیکر آیاہوں اس کی تکذیب کی۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

اطاعت نبوی کی ضرورت اوراس کی ایک اورمثال سے تفہیم:

اس حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اوراپنی تعلیمات کی مثال بیان فرمائی ہے۔

مثال یہ ہے کہ اہل عرب قبائلی لوگ تھے اکثر قبائل جنگل میں رہتے تھے، ان میں باہم لڑائیاں بہت ہوتی تھیں،ایک قبیلہ دوسرے پرحملہ آور ہوتا، وہ لوگ عموماً شب کے اخیر حصہ میں اچانک حملہ کرتے، جس قبیلہ پرحملہ ہونے والا ہے اگراس قبیلہ کا کوئی شخص دشمن کو دیکھ لیتا تو اپنی قوم کومطلع کرتا،ان حالات میں ایک شخص اپنی قوم سے کہتاہے کہ میں نے دشمن کواپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، وہ تمہارے اوپر حملہ آوار ہونے والاہے، اورمیں تم کو صحیح خبردے رہاہوں، اس خبر دینے میں تم مجھے جھوٹا نہ سمجھو، مجھے محض تمہاری ہمدردی مقصود ہے،تم چونکہ دشمن کا مقابلہ نہیں کرسکتے اس لئے یہاں سے نکل جاؤ اوردوسری محفوظ جگہ پہنچ کراپنی جان بچاؤ یہ بات سن کر اس کی قوم میں دوگروہ ہوگئے،بعض نے اس کی بات کا اعتبارکیا، چنانچہ رات کے اول حصے ہی میں اپنے مال واسباب کے ساتھ نکل گئے اورمحفوظ جگہ پہنچ گئے، یہ لوگ نجات پاگئے، اوربعض نے اس کی تکذیب کی اور یہ سوچا کہ اگردشمن آیا بھی تو ہم اسی وقت بھاگ جائیں گے،لیکن صبح ہی صبح معمول کے مطابق دشمن نے ان پرحملہ کیا کہ ان کو بھاگنے کا بھی موقع نہیں ملا اوردشمن نے ان سب کو ہلاک کردیا۔

یہی حال آپ کا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کومبعوث فرمایا،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کوکفروشرک چھوڑنے کی دعوت دی اورجہنم سے اورقیامت کے ہولناک مناظر سے ڈرایا، یہ دعوت پہنچنے

کے بعد امت میں دوقسم کے لوگ ہوئے، بعض نے آپ کوسچا جانا اورایمان لے آئے اورآپ کا اعتبار کیا اورنجات پاگئے اوربعض نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی، آپ کی بات کاانکارکیا اورایمان نہ لائے حتی کہ موت نے ان کوآدبوچا اورجہنم میں داخل ہوکرقسم قسم کے عذاب میں مبتلا ہوگئے۔

''نذیرعریان'' کامفہوم اوراس کی اصل:

أنا النذير العريان : یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے، جوشخص بلاکسی غرض ولالچ کے مبالغہ کے ساتھ کسی ناگہانی اوردہشت ناک امرسے اپنی قوم کوڈرائے اس کو''نذیرعریان'' کہاجاتاہے، اس کی اصل یہ ہے کہ جاہلیت میں ایک قبیلے نے اپنا ایک جاسوس دوسرے قبیلے میں بھیجا، ان لوگوں نے اس کو پکڑلیا اوراس کو ننگاکرکے مارا، اسی حال میں وہ وہاں سے بھاگا اوراپنے قبیلے میں پہنچ کران کودشمن سے ڈرانے لگا اور دشمن کے احوال بتانے لگا، یہ پہلا شخص تھا جوحقیقۃً''نذیرعریان'' تھا اس کے بعدیہی رواج ہوگیا کہ جوشخص دشمن کو دیکھ لیتا تو وہ ننگا ہوکرلوگوں کوخبردیتا، لوگ اس کومخلص سمجھ کراس کی تصدیق کرتے، پھریہ محاورہ بن گیا اس شخص کے لئے جوبے غرض ہوکراپنی قوم کوکسی دہشت ناک چیز سے ڈرائے اگرچہ وہ ننگانہ ہو۔(۱)

فالنجاء النجاء : بالمد والقصر دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں، یہ فعل محذوف کامفعول ہے اورتکرار بطورتاکید ہے ای اطلبوا النجاۃ.

فأدلجوا: یہ دُلْجة سے ماخوذ ہے بمعنی رات کا اول حصہ، مطلب یہ کہ رات ہی میں نکل کھڑے ہوئے، علی مهلهم بمعنی سکون اوراپنی ہیئت پرچلنا، اجتاحهم ای أهلكهم بالكلية ان کوجڑسے ختم کردیا یعنی ان کانام ونشان مٹادیا۔(۲)

۱۴۱ / ۱۰ : وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :''مَثَلِیْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَاراً، فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَاحَوْلَهَا ، جَعَلَ الْفَرَاشُ وَهٰذِهِ الدَّوَابُ الَّتِیْ تَقَعُ فِیْ النَّارِ يَقَعْنَ فِيْهَا، وَجَعَلَ يَحْجُزُ هُنَّ وَيَغْلِبْنَهُ، فَيَتَقَحَّمْنَ فِيْهَا،فَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، وَأَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِيْهَا'' (هذه رواية البخاری ولمسلم

(۱)طيبي ۱ / ۳۳۵،وفتح الإله لابن حجرمكي۱ / ۵۵۰.

(۲)المرقاة ۱ / ۳۴۲،واللمعات ۱ / ۴۵۷.

نحوُها، وَقَالَ فِيْ آخرِهَا:) قَالَ: "فَذٰلِکَ مَثَلِيْ وَمَثَلُكُمْ، أَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ، هَلُمَّ عَنِ النَّارِ، فَتَغْلِبُوْنِّي تَقَحَّمُون فِيْهَا" (متفق عليه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری مثال اس شخص کے مانند ہے جس نے آگ روشن کی چنانچہ جب آگ نے چاروں طرف روشنی پھیلادی تو، پروانے اوردوسرے وہ جاندار جوآگ میں گراکرتے ہیں آکر آگ میں گرنے لگے، آگ روشن کرنے والے شخص نے ان کوروکنا شروع کیا (لیکن وہ نہیں رکے) اوراس (کی کوششوں) پر غالب آگئے چنانچہ زبردستی آگ میں داخل ہونے لگے، اسی طرح میں بھی تمہاری کمریں پکڑکر تمھیں آگ میں گرنے سے روکتاہوں اورتم زبردستی آگ میں گررہے ہو، یہ روایت بخاری کی ہے اورمسلم کی روایت کے آخر میں الفاظ یہ ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بالکل ایسی ہی مثال میری اورتمہاری ہے میں تمہاری کمریں پکڑے ہوئے ہوں کہ تمھیں آگ سے بچاؤں اوریہ کہتاہوں کہ میری طرف آؤ، دوزخ سے بچو میری طرف آؤ دوزخ سے بچو؛لیکن تم مجھ پر غالب آتے ہو اورآگ میں گرپڑتے ہو۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

حضوراکرم علیہ الصلوۃ والسلام کے جذبۂ خیرخواہی کی مثال:

روایت کا حاصل یہ ہے کہ حضورصلی اللہ علیہ وسلم امت پر بہت شفیق ومہربان تھے، آپ کے دل میں امت کابڑادرد تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ امت کا ہرفرد جہنم سے محفوظ ہوجائے اورجنت کا مستحق ہوجائے، اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے احکام بیان فرمائے اورحلال وحرام کو واضح فرمایااورامت کی ہدایت کے لئے بہت سعی کی، اس کے باوجودامت میں بہت سے لوگ جن کوحرام لذتوں کی

(۱)أخرجه البخاری فی موضعين: كتاب الانبياء، باب قول الله عزوجل ووهبنا لداود سليما ن نعم العبد إنه أواب ۱/۴۸۷برقم ۳۳۱۲ و"كتاب الرقاق، باب الانتهاء عن المعاصی۲/۹۶۰ برقم ۲۲۸۴.ومسلم فی الفضائل، باب شفقته صلى الله عليه وسلم على أمته ۲/۲۴۸.

عادت ہے وہ منہیات ومحرمات کی آگ میں مبتلا ہوکر اپنے آپ کو جہنم کا مستحق بناتے ہیں، اس مضمون کوحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حسی وواقعی مثال سے سمجھایا، چنانچہ فرمایا کہ میری اور میری تعلیمات کی مثال ایسی ہے جیسا یک شخص نے رات میں آگ جلائی تاکہ اندھیرا ختم ہوجائے اور ہر چیز واضح طور پر نظر آئے، آگ روشن ہوجانے کے بعد پروانے اور پسو وغیرہ جن کی عادت آگ میں گرنے کی اور آگ کو پسند کرنے کی ہے وہ آگ کی طرف بڑھنے لگے اور آگ میں گرنے لگے، آگ جلانے والے کو ان پر ترس آیا اس نے ان پروانوں کو وہاں سے ہٹایا وہ دوسری طرف سے آکر آگ میں گرنے لگے، یہ شخص وہاں سے بھی ان کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہا، غرض یہ کہ یہ شخص اپنا پورا زور صرف کررہا ہے ان کو بچانے کے لئے مگر وہ پروانے اس پر غالب آگئے اور آگ میں گرکر جل گئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تم کو جہنم سے ہٹارہا ہوں مگر تم مجھ پر غالب آرہے ہو اور میری مخالفت کرکے جہنم میں داخل ہورہے ہو۔

اقسام تشبیہ اور مضمونِ حدیث پر اس کا انطباق:

یہ ایک تمثیل ہے، تمثیل کی دو قسمیں ہیں: (۱) تشبیہ مرکب (۲) تشبیہ مفرد، تشبیہ مرکب یہ ہے کہ جانب مشبہ ومشبہ بہ دونوں میں چند چیزیں ہوں، مشبہ کے امور میں غور کرکے ان سے ایک حالت کا انتزاع کیا جائے اسی طرح مشبہ بہ کے امور سے بھی ایک حالت منتزع کی جائے پھر پہلی حالت منتزعہ کو دوسری حالت منتزعہ کے ساتھ تشبیہ دی جائے، اور تشبیہ مفرد یہ ہے کہ جانب مشبہ وجانب مشبہ بہ ہردو میں چند چیزیں ہوں، اس میں سے مشبہ کے اول جز کو مشبہ بہ کے اول جز کے ساتھ تشبیہ دی جائے، ثانی کو ثانی کے ساتھ، ثالث کو ثالث کے ساتھ [1] جیسے قرآن کریم میں ہے ''وَمَا یَسْتَوِی الأَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَلاالظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرُ [2]''

یہاں روایت میں تشبیہ مرکب بھی ہوسکتی ہے اور تشبیہ مفرد بھی، تشبیہ مرکب کی صورت یہ ہے کہ: جانب مشبہ میں تین چیزیں ہیں (۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا احکامات کو واضح فرمانا (۲) شریعت کے نور کا پھیل

(۱) مختصر المعاني، ص: ۳۳۱ ط: مکتبہ فیصل دیوبند.

(۲) من سورۃ الفاطر: ۱۹.

جانا(۳)لوگوں کا احکام کی پرواہ نہ کرکے جہنم میں گرنا، جانب مشبہ بہ میں بھی تین چیزیں ہیں (۱)استیقادِ نار (۲)اضاءت نار(۳)پروانوں کا آگ میں گرنا، مشبہ بہ کے تینوں اجزاء سے ایک حالت منتزع ہوئی وہ ہے حرص کی وجہ سے پروانوں کا آگ میں گرنا، اورمشبہ کی حالت منتزعہ ہے لوگوں کا خواہشات کی وجہ سے جہنم میں گرنا، پھر ایک حالت منتزعہ کو دوسری حالت منتزعہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یہ تمثیل مرکب ہے۔

اورتشبیہ مفرد اس طور پر ہے کہ: حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے احکاماتِ الٰہی کی شرح وتوضیح کو استیقادِ نار سے تشبیہ دی گئی ہے اور احکام شرع کی اشاعت کو اضاءتِ نار سے تشبیہ دی گئیہے اور لوگوں کے ان احکام کو نظر انداز کرکے مستحق جہنم ہوجانے کو پروانوں کے آگ میں گرجانے کے ساتھ تشبیہ دی گئیہے اور وجہ شبہ ظاہر ہے۔(۱)

الفراش: ایسے جانور جن کے پَرجسم سے بڑے ہوں، اور **الدواب** سے مراد ایسے جانور جن کے پرجسم کے مقابلہ میں چھوٹے ہوں، **حجز** جمع حجزۃ کی کمربند باندھنے کی جگہ، اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ: اس جگہ کی پکڑ مضبوط ہوتی ہے"**وأنتم تقمحون فیھا**" یہ **تقحم** سے ہے جس کے معنی ہیں انجام سوچے بغیر مشکل امور میں گھس جانا۔(۲)

ھلم عن النار: **ھلم** اسمائے افعال میں سے ہے، جو امر حاضر معروف کے معنی میں ہے، معنی ہیں: "**أبعدوا أنفسكم عن النار**" اس سے پہلے قائلاً حال محذوف ہے۔(۳)

١٤٢ / ١١: وَعَنْ أَبِيْ مُوْسٰی ، قَالَ: قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَثَلُ مَابَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيْرِ أَصَابَ أَرْضاً، فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَأَنْبَتَتِ الْكَلأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ، وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْ وَزَرَعُوْا، وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً أُخْرٰی إِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ، لَاتُمْسِكُ مَاءً، وَلَاتُنْبِتُ كَلأً، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ بِمَابَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ، وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْساً، وَلَمْ يَقْبَلْ

(١)المرقاة ١ / ٣٥٠.

(٢)اللمعات ١ / ٤٥٩–٤٦٠.

(٣)اللمعات ١ / ٤٦١.

هُدَى اللّٰهِ الَّذِىْ أُرْسِلْتُ بِهٖ"(متفق علیه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس چیز کی مثال جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجھے دیکر بھیجا ہے یعنی علم اور ہدایت کثیر بارش کے مانند ہے جو زمین پر برسی ہو، چنانچہ زمین کا بعض حصہ عمدہ تھا اس نے پانی اپنے اندر جذب کرلیا، پھر اس نے گھاس اور چارہ خوب اگایا، اور زمین کا ایک حصہ سخت تھا اس نے بارش کے پانی کو روک لیا، اللہ نے اس کے ذریعہ لوگوں کو نفع پہنچایا، چنانچہ لوگوں نے وہ پانی پیا اور پلایا اور کھیتی کو سیراب کیا، اور یہ بارش کا پانی زمین کے ایک ایسے حصہ پر بھی پہونچا جو چٹیل میدان تھا اس نے نہ پانی (اپنے اندر) روکا اور نہ گھاس اگائی، یہ (مذکورہ چیزیں) مثال ہیں اس شخص کی جس نے اللہ کے دین کو سمجھا اور اس کو نفع پہونچایا اس چیز نے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے دیکر بھیجی تھی (یعنی شریعت) پس اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور مثال ہے اس شخص کی جس نے سر نہیں اٹھایا اس چیز (میری شریعت) کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو قبول نہیں کیا جس کو دیکر میں بھیجا گیا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

تشریح حدیث

تعلیمات نبوی اور امت کی مثال:

اس حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لائی ہوئی تعلیمات کی اور اپنی قوم کی مثال بیان فرمائی ہے، اپنی تعلیمات کو بارش کے مثل اور اپنی قوم کو زمین کے مثل قرار دیا۔

کمثل الغیث الکثیر: "غیث" وہ بارش جو ضرورت کے وقت خوب برسے، اس میں اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اہم ضرورت کے وقت ہوئی، چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت پورے عالم میں گمراہی چھائی ہوئی تھی، اور لوگ جہنم کے کنارہ پر پہنچ چکے تھے، بارش جس زمین پر برستی ہے وہ تین قسم کی ہوتی ہے:

(۱) أخرجه البخاري في كتاب العلم، باب فضل من علم وعلّم ۱/۱۸ برقم ۸۰ ومسلم فی کتاب فضائل النبی صلی اللہ علیه وسلم، باب بیان مثل مابعث النبي صلى الله عليه وسلم من الهدى والعلم ۲/۲۴۷.

(۱)بعض زمین نرم ہوتی ہے اور بارش کے پانی کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے، اس کے نتیجہ میں زمین سے جانوروں کے لئے گھاس اور سبزہ اور انسانوں کے لئے طرح طرح کے غلے اور پھل پیدا ہوتے ہیں، اس زمین نے پانی سے خود بھی نفع اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا، یہ سب سے عمدہ زمین ہوتی ہے اسی کو حدیث میں ''ارض طیبہ'' فرمایا گیا ہے۔

(۲)وہ زمین جو سخت ہو اور نشیب میں واقع ہو، یہ زمین پانی کو اپنے اندر جذب تو نہیں کرتی البتہ اس کو جمع کرلیتی ہے، پھر خلق خدا اس پانی سے فیضیاب ہوتی ہے، یہ زمین پانی سے خود تو منتفع نہیں ہوئی البتہ اس نے دوسروں کو نفع پہنچایا اس کو حدیث میں ''ارض اجادب'' کہا گیا ہے۔

(۳)وہ زمین جو چٹیل میدان کی شکل میں ہو، یہ نہ پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور نہ اس کو اپنے اندر جمع کرتی ہے، اس لئے یہ زمین پانی سے نہ خود منتفع ہوئی اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا، اس کو حدیث میں ''ارض قیعان'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات آسمان سے مثل بارش کے اتریں اور لوگوں تک پہنچیں، ان تعلیمات کے پہنچنے کے بعد لوگوں کے قلوب تین قسم کے ہوئے، بعض نے اس علم کو فوراً قبول کیا ان تعلیمات پر ایمان لائے اور ان پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی سکھایا، جیسے محدثین اور فقہائے مجتہدین یہ تعلیمات نبوی سے خود بھی فیضیاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیضیاب کیا، اور بعض لوگ وہ ہیں جو ان تعلیمات پر ایمان تو لائے لیکن ان پر مکمل عمل نہیں کیا البتہ دوسروں کو سکھایا، مثلاً بے عمل علماء، اور بعض لوگ وہ ہیں جنھوں نے سرے سے ان تعلیمات کو قبول ہی نہیں کیا اور متوجہ ہی نہیں ہوئے، جیسا کہ کفار و مشرکین، یہ ''ارض قیعان'' کی طرح ہیں جو انتہائی بیکار زمین ہوتی ہے، انہوں نے اللہ کی عظیم نعمت سے نہ خود فائدہ اٹھایا نہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔

ایک اشکال وجواب:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مضمون بھی تمثیلی انداز میں بیان فرمایا، ازروئے بلاغت یہ تمثیل تمثیل مفرد ہے، اس تمثیل پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ تمثیلِ مفرد میں آحاد کا آحاد سے تقابل ہوتا ہے جیسا کہ حدیث سابق کے تحت اس کی تفصیل گذرچکی، یہاں جانب مشبہ بہ میں تین قسم کی زمینیں ہیں، ارضِ طیبہ،

ارض اجادب اورارض قیعان، لیکن مشبہ صرف دوہی بیان کیے گئے ہیں عالم باعمل اورکافر،ارض اجادب کا مقابل یعنی عالم بےعمل مذکورنہیں پھر یہ تمثیل کس طرح تام ہوگی؟

اس اشکال کے کئی جواب دیئے گئے ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ مشبہ بہ پرقیاس کرتے ہوئے ایک مشبہ کوچھوڑ دیا گیا ہے مخاطب خودسمجھ لے گا کہ جب مشبہ بہ تین چیزیں ہیں تو مشبہ میں بھی تین چیزیں ہونگی پس فہمِ مخاطب پراعتماد کرکے ایک مشبہ کو ذکرنہیں کیا گیا۔(۱)

(۲) اس طرز بیان میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عالم بےعمل اس لائق ہی نہیں کہ اس کا ذکر کیاجائے، پس یہ ایسے عالم کے لئے تنبیہ بھی ہوگئی۔(۲)

(۳) علامہ مُظہر فرماتے ہیں کہ اصل میں مشبہ دوہی ہیں: ایک قبول کرنے والے اوردوسرے قبول نہ کرنے والے، پھرقبول کرنے والوں کا ایک ضمنی جزو ہے عالم بےعمل، اسی طرح زمین کی بھی اصلاً دوقسمیں ہیں پانی کو قبول کرنے والی اورقبول نہ کرنے والی، اورارض اجادب، ارض طیبہ کاہی ضمنی جزوہے۔(۳)

الکلأ: بمعنی گھاس خواہ رطب ہویایابس، العُشْب بضم العین وسکون الشین رطب گھاس۔

۱۴۳/ ۱۲: وَعَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: تَلا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "هُوَالَّذِيْ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ، وَقَرَأَ إِلٰى: وَمَايَذَّكَّرُإِلَّا أُولُواالْأَلْبَابِ، قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَإِذَا رَأَيْتَ- وَعِنْدَ مُسْلِمٍ: رَأَيْتُمْ- الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ مَاتَشَابَهَ مِنْهُ؛ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ سَمَّاهُمُ اللّٰهُ، فَاحْذَرُوْهُمْ" (متفق علیه)(٤)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی "هُوَالَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ" اورآخرآیت

(۱) المرقاۃ ۱/ ۳۵۲.

(۲) اللمعات ۱/ ٤٦٢ - ٤٦٣.

(۳) المفاتیح شرح المصابیح ۱/ ۲۵۲.

(٤) أخرجه البخاري فی کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ آل عمران ۲/ ٦٥٢، برقم ٤٣٦٢.

ومسلم فی کتاب العلم، باب النهي عن اتباع متشابه القرآن والتحذیر من متبعیه ۲/ ٦٣٢.

''وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ''(۱) تک پڑھا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: یہ آیت پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جس وقت تو دیکھے اور مسلم کی روایت میں ہے کہ: جب تم دیکھو کہ لوگ ان آیتوں کے پیچھے پڑتے ہیں جو متشابہ ہیں تو تم سمجھو کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا نام اللہ تعالیٰ نے (کجرو یا گمراہ) رکھا ہے لہٰذا ان لوگوں سے بچتے رہو'' (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

آیات محکمہ ومتشابہ کا مفہوم اور کیفیت اعتصام:

اس روایت میں اعتصام بالکتاب کا بیان ہے، قرآن کی دو قسم کی آیات ''محکم اور متشابہ'' کے اعتصام کی کیفیت بیان فرمائی گئی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آیات دو قسم کی ہیں: محکم اور متشابہ، محکم وہ آیات جن کی مراد ایسے شخص پر بین اور ظاہر ہو جو قواعدِ عربیہ کو اچھی طرح جانتا ہو، اور متشابہ وہ آیات جن کے معنی ومراد جزماً کسی کو معلوم نہ ہوں، جیسے حروف مقطعات اور لفظ ید اور ساق وغیرہ، آیات محکمہ ام الکتاب (کتاب کی اصل) ہیں، کیونکہ جن آیات کے معنی ظاہر نہ ہوں ان کو اُن ظاہر المعنی آیات کے موافق بنایا جاتا ہے جو آیات محکمہ کہلاتی ہے، یہ اقسام کا بیان ہوا۔

کیفیت اعتصام یہ ہے کہ: محکم آیات چونکہ معلوم المراد ہوتی ہیں اس لئے عمل اور عقیدہ میں ان سے استدلال درست ہے اور متشابہ آیات غیر معلوم المراد ہیں اس لئے ان آیات کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان پر ایمان رکھا جائے اور بلحاظ معنی ان کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھا جائے، جو معنی اس کے خلاف پڑیں ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو آیات محکمات کے خلاف نہ ہو، اور ایسی تاویل صحیح نہ سمجھی جائے جو شریعت کے اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہو، مثلاً قرآنِ کریم کی محکم آیات: (اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ (۲)) وغیرہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں، اس لئے نصاریٰ کا ان کے بارے میں الوہیت اور ابنیت کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں، اب اگر کوئی شخص ان محکم آیات سے صرفِ نظر کر کے قرآن میں وارد کلمۃ اللہ اور روح منہ وغیرہ متشابہات

(۱) من سورۃ آل عمران: ۷.

(۲) من سورۃ زخرف: ۵۹.

کو لے دوڑے اور اس کے معنی وہ لے جو محکماتِ قرآنیہ اور احادیثِ متواترہ کے منافی ہوں تو یہ کجروی اور ہٹ دھرمی ہوگی۔ (۱)

حاصل یہ ہوا کہ متشابہات کا اعتصام یہ ہے کہ ان پر ایمان لائے اور ان کو محکمات کے خلاف کسی معنی پر محمول نہ کرے، اور محکم کا اعتصام یہ ہے کہ ان پر ایمان لاوے، اپنا عقیدہ وعمل محکمات کے مطابق کرے، اور اس صحیح عقیدہ وعمل پر محکمات سے استدلال بھی کرے، جو سلیم الفطرۃ لوگ ہیں ان کا عقیدہ وعمل اسی کے مطابق ہوتا ہے، اور فرق ضالہ اور کج طبع افراد محکمات سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور آیات متشابہات میں وارد الفاظ ''استوی، ید، ساق وغیرہ'' کو ظاہری معنی پر محمول کر کے اپنے فاسد عقائد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ نے ''واما الذین فی قلوبھم زیغ الخ (۲)'' میں ایسے ہی لوگوں کی مذمت فرمائی ہے، اور اس حدیث میں بھی ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا کہ ان سے علیحدہ رہو، کہیں یہ تمہیں فتنہ میں مبتلا نہ کر دیں۔

سوال: حضرت ابن عباسؓ اور امام غزالیؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں کہ راسخین فی العلم اور علماء حقہ متشابہات کے معنی جانتے ہیں، اسی لئے یہ حضرات آیت بالا میں بجائے إلا اللہ کے والراسخون فی العلم، پر وقف کرنے کے قائل ہیں، پھر یہ کہنا کیسے درست ہے کہ متشابہات کے معنی کسی کو معلوم نہیں؟

جواب: اوپر لکھا جا چکا کہ متشابہ وہ ہے جس کے معنی جزماً کسی کو معلوم نہ ہوں، ان حضرات نے متشابہات کے حتمی اور یقینی طور پر کوئی معنی بیان نہیں فرمائے، بلکہ ظن کے درجہ میں متشابہات کی تاویل بیان کی ہے، تاکہ فرقِ ضالہ آیات متشابہات کو ظاہر پر محمول نہ کر سکیں، اور مقصود ان حضرات کا بھی یہ بتانا ہے کہ نصوص متشابہ کے ظاہری معنی مراد لینا درست نہیں ہیں، متشابہات کو ظاہر پر محمول کر کے فاسد عقائد کو ثابت کرنا کجرو اور زیغ وضلال والے لوگوں کا شیوہ ہے۔ (۳)

۱۴۴ / ۱۳: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: هَجَّرْتُ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا، قَالَ: فَسَمِعَ اَصْوَاتَ رَجُلَيْنِ اِخْتَلَفَا فِيْ آيَةٍ، فَخَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ

(۱) معارف القرآن ۲ / ۳۳ط: مکتبہ نعیمیہ دیوبند.

(۲) من سورة آل عمران: ۷.

(۳) المرقاۃ ۱ / ۳۵۴.

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْرَفُ فِيْ وَجْهِهِ الْغَضَبُ، فَقَالَ: ''إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِاخْتِلافِهِمْ فِي الْكِتَابِ'' (رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ: میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ظہر کے وقت حاضر ہوا، حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کی آوازیں سنیں جو ایک (متشابہ) آیت میں اختلاف کررہے تھے (یعنی اس کے معنی میں جھگڑ رہے تھے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف لائے اس وقت آپ کے چہرۂ مبارکہ پر غصہ کے آثار نمایاں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلے کے لوگ کتابِ الٰہی میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے ہیں۔ (مسلم)

تشریح حدیث

متشابہات کے بارے میں رائے زنی ہلاکت کا سبب:

اس حدیث پاک میں بھی یہی بیان ہے کہ متشابہات کے بارے میں اختلاف اور ان سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس طرح کے اختلافات سے تفسیر بالرائے کا دروازہ کھلے گا۔

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ: ظہر کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مجلس ہوتی، بہت سے صحابہ ظہر سے پہلے ہی آجایا کرتے تھے تاکہ ظہر سے پہلے بھی اگر کوئی بات ارشاد فرمائیں تو اس سے بھی محرومی نہ رہے، عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں ایک دن میں ظہر سے پہلے آ گیا، میں نے دو شخصوں کو سنا کہ وہ ایک آیت کے بارے میں اختلاف کررہے تھے، بعض نے کہا کہ وہ آیت متشابہ تھی، اور بعض نے کہا کہ وہ کسی آیت کی تفسیر اور معنی کے بارے میں اختلاف کررہے تھے، دونوں میں سے جس کے جو سمجھ میں آرہا تھا وہ کہہ رہا تھا، ظاہر ہے کہ یہ تفسیر بالرائے کی صورت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ مبارکہ سے نکلے تو آپ کے چہرے پر غضب کے آثار تھے، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اللہ کی کتاب میں اختلاف کرنے کی وجہ سے ہی ہلاک ہوئے ہیں، مطلب یہ تھا کہ یہ چیز تمہارے لئے بھی ہلاکت اور اللہ کے غضب کے نزول کا سبب ہوسکتی ہے، لہٰذا اس سے بچا جائے۔

(۱) أخرجه مسلم في العلم، باب النهي عن اتباع متشابه القرآن ۲ / ۳۳۹.

یہاں آیت متشابہ کا اختلاف مراد ہے یا معنی میں تفسیر بالرائے کے طور پر اختلاف مراد ہے، اسی کو دینی ہلاکت کا سبب قرار دیا گیا ہے، فروع دین کے استنباط کے لئے ائمہ مجتہدین کا جو اختلاف ہوتا ہے وہ مراد نہیں ہے، اس کو تو حدیث میں رحمت قرار دیا ہے اور صحابہ کے زمانہ سے ابتک اس کے جواز پر امت کا اجماع چلا آرہا ہے۔ (۱)

ھـجّـرت: تہجیر سے ماضی کا صیغہ ہے۔ تہجیر کے معنی ہیں: ہاجرہ یعنی سخت گرمی میں جانا، اسی سے ''ھجیرۃ'' ہے، جس کے معنی ظہر کی نماز کے ہیں۔ (۲)

١٤٥ / ١٤: وَعَنْ سَعدِ بنِ اَبِیْ وَقَّاص رضی اللہ عنہ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِيْنَ فِي الْمُسْلِمِيْنَ جُرْماً مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ عَلَى النَّاسِ، فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ'' (متفق عليه) (۳)

ترجمہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کا سوال کیا ہو جو حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کرنے سے وہ حرام ہوگئی'' (بخاری ومسلم)

تشریحِ حدیث

احوال سعد بن ابی وقاص:

جلیل القدر صحابی ہیں، ابووقاص کا نام: مالک بن وہیب الزہری القرشی ہے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام صحابی ہیں، ۱۷ سال کی عمر میں مشرف باسلام ہوئے اور ایک قول میں تیسرے نمبر پر اسلام لانے والے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کے ماموں ہیں، عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، اور کثیر الروایۃ اصحاب میں سے ہیں، انھوں نے ہی اسلام میں سب سے پہلے تیر چلایا اور کسی کافر کو سب سے پہلے زخمی بھی انھوں نے ہی کیا، جس کا واقعہ یہ پیش آیا کہ یہ مکہ مکرمہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، کچھ

(۱) المرقاۃ ۱ / ۳۵٤.

(۲) طيبي ۱ / ۳٤٥، وفتح الإله ۱ / ۵٦۳.

(۳) أخرجه البخاري في كتاب الاعتصام، باب مايكره من كثرة السؤال الخ ۲ / ۱۰۸۲، برقم ٦۹۹٦.
ومسلم في الفضائل، باب توقيره صلى الله عليه وسلم وترك اكثاره سؤاله عما لاضروره إليه ۲ / ۲٦۲.

مشرکین آئے اور جھگڑنے لگے، انہوں نے ان میں سے ایک کے اونٹ کی ہڈی ماری جس سے وہ زخمی ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ سلم نے ان کے لئے دو دعائیں کیں: اَللّٰھُمَّ سَدِّدْ سَھْمَہٗ وَأَجِبْ دَعْوَتَہٗ کہ انکے نشانے کو درست کردے اور ان کی دعا قبول فرما، یہ دونوں دعائیں قبول ہوئیں، ان کا نشانہ نہایت درست ہوتا اور مستجاب الدعوات بھی تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے فداہ ابی و أمی فرمایا ہے، چار صحابہ بہادر اور دلیر شمار ہوتے تھے، جن میں سے ایک یہ تھے اور باقی تین حضرت عمرؓ، علیؓ اور زبیرؓ تھے، حضرت سعد ہی اصل فاتح فارس ہیں، فارس میں ایران، عراق، افغانستان وغیرہ علاقے آتے تھے، ۵۵ھ میں مقام عقیق میں انکا کا انتقال ہوا، وہاں سے مدینہ منتقل کیا گیا اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (۱)

بے جا سوال کی ممانعت:

اس حدیث میں بے جا سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ جس بات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سکوت کریں اس کے بارے میں بلاضرورت سوال نہیں کرنا چاہئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جب امت اپنے نبی سے بے جا سوال کرتی ہے تو اس کے متعلق سخت حکم نازل کردیتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا بقرہ کے بارے میں کہ وہ جیسا چاہے بقرہ ذبح کردیتے کام چل جاتا، مگر انہوں نے سوال در سوال کئے تو اللہ تعالیٰ بھی معاملہ سخت کرتے رہے، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی فرضیت بیان کی، اقرع بن حابسؓ نے سوال کرلیا کہ کیا حج ہر سال فرض ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال کرنا فرض ہوجاتا، جو تمام امت کے لئے سخت پریشانی کا سبب ہوتا، تو سوال ایک شخص کرتا ہے مگر حکم سب کے لئے ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے سب کو مشقت پیش آتی ہے لہٰذا بے جا سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔

بے جا سوال کی کچھ مثالیں:

بے جا سوال میں یہ بھی داخل ہے کہ: جس چیز کی تحقیق کے ہم مکلّف نہیں اس کی تحقیق میں پڑنے لگیں، مثلاً دسترخوان پر داعی سے پوچھنے لگیں کہ کیا کام کرتے ہو؟ کس طرح کے مال سے دعوت کی ہے؟

(۱) الاصابہ ۲/ ۳۲٤-۳۲٦ ط: دار الفکر بیروت.

یا بازار میں دوکاندار سے پوچھنے لگیں کہ مال چوری کا ہے یا کیسا ہے وغیرہ؟ یہ درست نہیں، یہ سوچنا چاہئے کہ جب مسلمان ہے تو حلال مال سے ہی دعوت کرے گا، اور حلال مال ہی فروخت کرے گا۔

علماء نے لکھا ہے کہ سوالات کی تین قسمیں ہیں: (۱) وہ سوال جو طلب حق کے لئے ہو، (۲) وہ سوال جو عمل نہ کرنے کے قصد سے ہو، (۳) وہ سوال جو بے فائدہ اور فضول ہو، حدیث میں دوسرے اور تیسرے قسم کے سوالات کی ممانعت ہے، پہلی قسم کے سوالات کی ممانعت نہیں، مگر اس میں بھی موقع محل اور مسئول کی طبیعت ومزاج کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۴۶ / ۱۵: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ : رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "يَكُوْنُ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالُوْنَ كَذَّابُوْنَ يَأْتُوْنَكُمْ مِنَ الْأَحَادِيْثِ بِمَالَمْ تَسْمَعُوْا أَنْتُمْ وَلاآبَاؤُكُمْ، فَإِيَّاكُمْ وَإِيَّاهُمْ، لايُضِلُّوْنَكُمْ وَلايَفْتِنُوْنَكُمْ" (رواه مسلم) [1]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے "کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ آخری زمانہ میں ایسے (فریب دینے والے) جھوٹے لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جنہیں نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء نے سنا ہوگا اس لئے ان سے بچو اور ان کو اپنے آپ سے بچاؤ تا کہ وہ تمھیں گمراہ نہ کریں اور فتنہ میں نہ ڈالیں"

تشریح حدیث

اخیر زمانہ میں جھوٹی احادیث اور غیر مستند باتوں کا شیوع:

ماقبل سے اعتصام بالسنۃ کی روایات کا سلسلہ اور اس کی ترغیب چلی آرہی ہے، تفصیل بتائی گئی کہ حدیث کا اعتصام اس وقت ہوگا جب کہ وہ صحیح اور معتبر ہو، اور اگر وہ موضوع ہو تو اس کا اعتصام نہیں ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں کچھ دجال وکذاب لوگ ہوں گے جو ایسی حدیثیں لائیں گے جن کو نہ تم نے سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء و اجداد نے، ان سے تم دور رہو تا کہ گمراہ نہ ہو جاؤ، اس لئے حدیث نبوی میں حزم واحتیاط اور تحقیق وتفتیش ضروری ہے۔

فی آخر الزمان: اس سے مراد ہے: آخر زمان هذه الأمة، معلوم ہوا کہ دور صحابہ میں ایسے لوگ

(۱) أخرجه مسلم في المقدمة، باب النهي عن الرواية عن الضعفاء والاحتياط في تحملها ۱ / ۹.

نہیں ہوں گے۔ (۱)

دجالون: دجل سے ہے بمعنی تلبیس، یعنی باطل کوحق کی شکل میں پیش کرنا گویا کہ یہ **خداعون** کے معنی میں ہے۔ (۲)

من الأحاديث: اس میں دواحتمال ہیں: (۱) اس سے مراد عقائد باطلہ اورنظریات فاسدہ ہوں، اس وقت لفظ احادیث لغوی معنی میں ہوگا (۲) اس سے مراد احادیث نبویہ ہوں یعنی احادیث موضوعہ جن کولوگوں نے گھڑا ہو۔ (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ وضع حدیث حرام ہے اورامت کا اس پر اجماع ہے، البتہ فرقۂ کرامیہ اوربعض متصوفہ کا کہنا ہے کہ فضائل اعمال میں حدیث وضع کرنا جائز ہے لیکن علماء نے اس کی سختی سے تردید کی ہے اور علی الاطلاق وضع حدیث کو حرام قراردیا ہے اوربعض نے تو ایسے شخص کو کافرکہا ہے جیسے علامہ جوینی وغیرہ۔ (۴)

دین مستند اورمعتبر افراد سے سیکھیں:

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اخیر زمانہ میں دجال، کذاب اورغیر مستند افراد احادیث اور دین وشریعت کی تعلیم واشاعت کریں گے، اورجب وہ دجال، کذاب اورغیر مستندٹھہرے تو دین کے نام پر بددینی پھیلائیں گے، امام مسلمؒ ہی نے ایک اثر ذکرکیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمندرمیں کچھ شیاطین قید کررکھے ہیں، جوقربِ قیامت وہاں سے نکل کرلوگوں کوقرآن سکھائیں گے، (۵) چنانچہ یہ فتنہ اب ظاہر ہوچکا ہے، ڈاکٹر ہویا انجینئر سب قرآن وسنت کی من مانی تشریحات پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں، علامہ ابن سیرینؒ سے منقول ہے: ''اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوا عَمَّنْ تَاْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (۶)''یعنی یہ علم شریعت

(۱) المرقاة ١ / ٣٥٦.

(۲) المرقاة ١ / ٣٥٦.

(۳) المفاتيح ١ / ٢٥٢، والمرقاة ١ / ٣٥٧.

(٤) مقدمة ابن الصلاح، النوع الحادى والعشرون، معرفة الموضوع، وتدريب الراوى للعلامة السيوطى مع شرحه تقريب النواوى ٣ / ٤٦٦، ت : محمد عوامة.

(٥) مسلم ١ / ١٠.

(٦) مسلم شريف، المقدمة، باب بيان أن الإسناد من الدين ١ / ١١ والدارمي (٤٣٣ و ٤٣٨)

دین ہے، لہٰذا غور کرلیا کرو کہ کس سے یہ علم دین حاصل کررہے ہو، مطلب یہ ہے کہ دنیا کا علم تو جس سے چاہے حاصل کرلو، اگر کسی غلط شخص سے بھی حاصل کیا تو نقصان صرف دنیا کا ہوگا، لیکن اگر علم دین کسی غلط اور غیر مستند شخص سے پڑھا تو آخرت برباد ہوگی، جس بربادی کی کوئی تلافی نہیں ہوسکے گی۔

۱۴۷/۱۶: وَعَنْـهُ قَالَ: كَانَ أَهْلُ الْكِتَابِ يَقْرَؤُوْنَ التَّوْرَاةَ بِالْعِبْرَانِيَّةِ، وَيُفَسِّرُوْنَهَا بِالْعَرَبِيَّةِ لِأَهْلِ الإِسْلَامِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لَاتُصَدِّقُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ وَلَاتُكَذِّبُوْهُمْ، وَقُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاأُنْزِلَ إِلَيْنَا" الآية۔(رواه البخاری)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اہل کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھا کرتے تھے (جو یہود کی زبان ہے) اور مسلمانوں کے لئے اس کی تفسیر عربی زبان میں کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کا یہ عمل دیکھ کر) صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے فرمایا "تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب" بلکہ صرف یہ کہو "ہم اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم پر نازل کی گئی ایمان لائے (آخر آیت تک)" (بخاری)

تشریحِ حدیث

کتب سابقہ پر ایمان اور ان کے اعتصام کی کیفیت:

اس حدیث کا ترجمہ (عنوان) کے پہلے جزء اعتصام بالکتاب سے تعلق ہے، کتاب سے قرآن کریم مراد ہے اس کا اعتصام ایمان وعمل دونوں لحاظ سے ضروری ہے، یہاں ضمناً کتبِ سابقہ کے اعتصام کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ کتبِ سابقہ کا اعتصام ان پر اجمالاً ایمان لانے کے ذریعہ کرنا ہے، ان پر نہ تفصیلی ایمان کی ضرورت ہے نہ ان کے احکام پر عمل کی، کتبِ سابقہ کا کوئی خاص حصہ یا ان کا کوئی مضمون اگر کوئی تمہارے سامنے پیش کرے تو اس خاص حصہ کی نہ تصدیق کی جائے نہ تکذیب، حدیث کا مضمون یہ ہے کہ

(۱) أخرجه البخاری فی ثلاثة مواضع: کتاب التفسیر، باب قول الله تعالىٰ: قولوا امنا بالله ومانزل إلينا ۲/۶۴۴ برقم ۴۳۰ وأيضاً کتاب الاعتصام، باب لاتسئلوا أهل الکتاب عن شئ ۲/۱۰۹۴ برقم ۷۰۶۵. وأيضاً کتاب التوحید، باب مایجوز من تفسیر التوراة وکتب الله بالعربية ۲/۱۱۲۵ برقم ۷۲۴۱.

اہل کتاب اپنی کتاب کو عبرانی زبان میں پڑھتے اور عربی میں مسلمانوں کے لئے تفسیر وترجمانی کرتے تھے، مگر چونکہ توریت وانجیل میں وہ لوگ تحریف کر چکے تھے تو اس کا جو مضمون مسلمانوں کو سنا رہے ہیں معلوم نہیں کہ منزل من اللہ ہے یا محرف ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، کیونکہ تکذیب کی صورت میں غیر محرف کی تکذیب ہوسکتی ہے اور تصدیق کی صورت میں محرف کی تصدیق ہوسکتی ہے، بس اس پر اجمالی ایمان لاؤ اور یوں کہو آمنا باللہ الخ .

البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے، وہ یہ کہ: اہل کتاب جو بیان کریں گے اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) قرآن میں اس کی تصدیق کی گئی ہو، تو اس کا ماننا لازم ہے (۲) قرآن نے اس کی تکذیب کی ہو، تو ہمارے لئے بھی اس کی تکذیب ضروری ہے (۳) قرآن نے اس کی نہ تصدیق کی ہو اور نہ تکذیب، پس ہمارے لئے بھی ایسی باتوں کا یہی حکم ہے۔

کرشن وغیرہ کو نبی قرار دینے کا حکم:

یہی حکم اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص قدیم زمانہ کی کسی شخصیت کو نبی قرار دے، جیسا کہ لوگ کرشن وغیرہ کے بارے میں کہتے ہیں، پس ہم ان کی نبوت کی نہ تصدیق کریں گے اور نہ تکذیب۔

۱۴۸ / ۱۷: وَعَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِباً أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَاسَمِعَ" (رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو (بغیر تحقیق کے) نقل کرے"

تشریح حدیث

ہر سنی ہوئی بات بیان کردینا بھی جھوٹ:

اس حدیث کا تعلق اعتصام بالسنۃ سے ہے، روایات واخبار میں حزم واحتیاط کا حکم دینا مقصود ہے، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ: آدمی ہر سنی ہوئی بات کو بیان نہ کرے، کیونکہ آدمی جس طرح صحیح بات سنتا ہے اسی طرح بہت سی مرتبہ خلاف واقعہ اور جھوٹی باتیں بھی سننے میں آتی ہیں، ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرنے میں

(۱) أخرجه مسلم في "المقدمة، باب النهي عن الحديث بكل ماسمع ۱ / ۸.

بہت سی جھوٹی باتیں بھی بیان ہوجائیں گی جس سے انسان جھوٹا شمار ہوگا، مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص جھوٹا نہیں ہے لیکن اگر اس کے اندر یہ بات ہے کہ ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرتا ہے تو اس سے وہ جھوٹوں کی فہرست میں داخل ہوجائے گا، اس لئے بغیر تحقیق کے کسی بھی بات کو بیان نہ کرے، بالخصوص حدیث نبوی میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

جب سے انٹرنیٹ اور واٹسپ وغیرہ کی بلا آئی ہے، تو بکثرت دیکھنے اور سننے میں آرہا ہے کہ لوگ اس میں ہر بات کو بلا تحقیق آگے بھیج دیتے ہیں تو ایسا کرنے والا بھی اس حدیث کی وعید میں داخل ہے۔

کفی بالمرء: اس میں باء زائد ہے اور یہ مفعول ہے، فاعل: **ان یحدث بکل ماسمع** ہے۔(۱)

۱۴۹ / ۱۸ : وَعَنِ ابنِ مَسْعُوْدٍؓ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَامِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّته قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيْ أُمَّته حَوَارِيُّوْنَ وَأَصْحَابٌ، يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ، وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالايَفْعَلُوْنَ، وَيَفْعَلُوْنَ مَالايُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ" (رواه مسلم) (۲)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھ سے پہلے کسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے مددگار اور ساتھی اس کی قوم میں سے نہ ہوں جو اس نبی کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اس کے احکام کی پیروی کرتے تھے، پھر ان (مددگاروں) کے بعد ایسے ناخلف (نالائق) لوگ پیدا ہوتے جو لوگوں سے ایسی بات کہتے جس کو خود نہ کرتے اور وہ کام کرتے جس کا انہیں حکم نہیں ملا تھا، لہٰذا تم میں سے جو شخص ان لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو شخص ان لوگوں سے اپنی زبان سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو شخص ان لوگوں سے اپنے دل سے جہاد کرے (ان کے فعل کو دل سے برا سمجھے) وہ بھی مومن ہے اور اس کے علاوہ (یعنی جو شخص ان کے خلاف اتنا بھی نہ کرسکے) اس میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے" (مسلم)

(۱) المرقاة ۱ / ۳۵۸.

(۲) أخرجه مسلم في الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر الخ ۱ / ۵۲.

تشریح حدیث

دین میں بگاڑ پیدا کرنے والوں کا تعاقب ضروری:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ نے مبعوث کیا تو اسکی امت میں کچھ خاص مددگار ہوتے تھے جو اس نبی کے طریقوں اور سنن پر اہتمام کے ساتھ عمل پیرا ہوتے۔

حدیث کا مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کو چونکہ نبی سے کام لینا منظور ہوتا ہے اس لئے اس کی امت اور قوم میں اس کے کچھ معاون ومددگار پیدا فرمادیتا ہے جو اس نبی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کے مقصد ومشن کو آگے بڑھاتے ہیں، اس کے بعد امت میں کچھ بیہودہ لوگ پیدا ہوجاتے ہیں جو اپنے آپ کو ان بڑوں کا جانشین بتاتے ہیں، جبکہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے ایسی بات کہتے ہیں جس پر خود عمل پیرا نہیں اور وہ کام کرتے ہیں جس کا ان کو حکم نہیں دیا گیا، یہ برے جانشین ہیں، حدیث کا منشا یہ ہے کہ میری امت میں بھی کچھ لوگ ایسے ہی بیہودہ ہونگے، ان نااہلوں کی بیخ کنی اور ان کی اصلاح کی کوشش ہر امتی پر لازم ہے، جو شخص ان سے ہاتھ سے مقابلہ پر قادر ہو وہ ہاتھ سے مقابلہ کرے، جو زبانی سے ان کے مکر کو روک سکتا ہو وہ زبان سے روکے، اور جو اس پر بھی قادر نہ دیا گیا، نہ ہو وہ ان کے ناشائستہ اعمال کو دل سے براجانے اور جو ان کی برائی کو دل سے بھی برا نہ سمجھے تو یہ کفر کی علامت ہے، **ولیس وراء ذلک من الایمان حبة خردل۔**

الا کان لہ في امتہ حواریون: اس پر اشکال ہے کہ کچھ انبیاء ایسے بھی جن کا ایک بھی پیروکار ومددگار نہ تھا، جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آپ کے سامنے پچھلی امتیں پیش کی گئیں تو بعض انبیاء ایسے تھے کہ ان کے ساتھ ایک دو لوگ تھے اور بعض کے ساتھ ایک بھی نہ تھا۔(۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام اکثر واغلب پر محمول ہے، اکثر انبیاء کے کچھ نہ کچھ متبع ہوتے ہیں۔

"**حواریون**" یہ لفظ **بتشدید الیاء وبتخفیف الیاء** دونوں طرح مستعمل ہے، یہ "حور" سے مشتق ہے بمعنی سفید وگورا رنگ، حضرت عیسیٰ پر بنی اسرئیل کے چند نوجوان ایمان لائے یہ یا تو شہزادے تھے اور سفید کپڑے پہنا کرتے تھے اس لئے ان کو حواری کہا گیا، اور یا یہ دھوبی تھے، لوگوں کے کپڑے صاف

(۱)مسند أبی عوانہ ۱ / ۸۵.

کرتے تھے اس وجہ سے حواری کہا گیا، یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کیا کرتے تھے اس لئے یہ لفظ انصار کے معنی میں ہوا یہاں یہی معنیٰ مراد ہیں،حواری کالفظ حضرت عیسیٰ کے ساتھیوں کا لقب تھا جیسے صحابی واصحاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو کہا جاتا ہے اس کے بعد ہر نبی کے ساتھیوں کو حواری کہا جانے لگا۔

خلوف: یہ خلف بسکون اللام کی جمع ہے،بمعنی بُرا جانشین، جیسے عدول عدل کی جمع ہے،قرآن کریم میں ہے''فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُو الصَّلٰوةَ الآية''[1] اور خلف بفتح اللام اس کے معنی ہیں: اچھا جانشین، اس کی جمع اَخلافٌ ہے۔[2]

''یقولون مالایفعلون'' کا صحیح مفہوم ومطلب:

یقولون مالایفعلون: یہ جملہ قرآن کریم میں بھی ہے، اس سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ جس بات پر عمل نہ ہو اس کو دوسروں کو بھی نہ کہا جائے، مگر یہ استدلال غلط ہے، کیونکہ اس کا حاصل تو یہ ہوا کہ نہ عمل کرو اور نہ کہو، اس کا صحیح مفہوم حضرت تھانویؒ نے بیان کیا ہے کہ یہ دعوی کی مذمت وممانعت ہے نہ کہ دعوت کی، یعنی جو کام کرتے نہیں اس کا دعوی مت کرو کہ ہم اس کو کرتے ہیں، مثلاً تہجد پڑھتے نہیں اور کہے کہ پڑھتے ہیں، یہ مراد نہیں کہ جو خود تہجد نہ پڑھے وہ دوسروں کو تہجد کی ترغیب بھی نہ دے۔

فھو مؤمن: اس کی تنوین برائے تنویع ہے اور مطلب یہ ہے کہ آخری شخص مؤمن تو ہے لیکن اس کا ایمان پہلے دونوں کے مقابلہ میں کمزور درجہ کا ہے۔

ولیس ذلک من الایمان حبة خردلٍ: تیسرے درجہ سے کم کی صورت میں ایمان کی نفی اس لئے فرمائی کہ اس نیچے کا درجہ معاصی کو برا نہ جاننا ہے اور معاصی کو برا نہ جاننا اوران کو اچھا سمجھنا نصوص کا انکار ہے جس کا کفر ہونا ظاہر ہے۔[3]

۱۵۰ / ۱۹: وَعَنْ أَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ دَعَا إِلٰى هُدىً كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً وَمَنْ دَعَا إِلٰى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ

(۱)من سورة مریم: ۵۹.
(۲)اللمعات ۱ / ۴۷۴.
(۳)طیبی ۱ / ۳۵۰.

آثَامِهِمْ شَيْئاً"(رواہ مسلم)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے (کسی کو) ہدایت کی طرف بلایا تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس کو جو اس کی پیروی کریگا، اوران کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جو کوئی کسی کو گمراہی کی طرف بلائے گا تو اس کو اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا اس کو ہوگا جو اس کی اطاعت کرے گا اوران کے گناہوں میں سے کچھ کم بھی نہ ہوگا'' (مسلم)

تشریح حدیث

اچھے کام کی دعوت کا ثواب اور برے کام کی دعوت کا گناہ:

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص ہدایت کے کسی عمل کی طرف لوگوں کو دعوت دے تو اس کی دعوت کے نتیجہ میں جتنے لوگ بھی اس ہدایت کے کام کو کریں گے جتنا اجران کو ملے گا اتنا ہی اجر وثواب تنہا دعوت دینے والے کو ملے گا، کیونکہ ان لوگوں کے عمل کے لئے اس کی دعوت سبب بنی، اگر یہ دعوت نہ دیتا تو وہ اس ہدایت کے کام کو اختیار نہ کرتے اوران عمل کرنے والوں کے اپنے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ ان عاملین کے اجر میں سے تھوڑی تھوڑی کمی کرکے داعی کو اجر دیا جائے، بلکہ ان عاملین کے مجموعی اعمال کے برابر داعی کو مستقل اجر ملے گا، یہی حال گناہ کے کام کا ہے کہ جو شخص برائی کی طرف رہنمائی کرے اور برائی کا ذریعہ بنے تو جتنا گناہ برائی کرنے والوں کو ہوگا اتنا ہی گناہ تنہا سبب اور ذریعہ بننے والے کو ہوگا، اوراس کو بھی گناہ کرنے والوں کے برابر مستقل گناہ ہوگا اور برائی کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

حضرت شیخ زکریاؒ نے اوجز المسالک میں اس روایت سے استنباط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہر طبقہ میں متقدمین کو متاخرین پر فضیلت ہوتی ہے کیونکہ ماقبل والوں کو اپنے مابعد کے لوگوں کی نیکیوں کا ثواب بھی ملتا ہے کیونکہ مابعد والوں کے حسنات کا ذریعہ ماقبل کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔(۲)

---

(۱)أخرجه مسلم في العلم، باب من سن سنة حسنة اوسيئة الخ ۲/ ۳۴۱.

(۲)أوجزا لمسالک و كذا في المرقاة ۱/ ۳۶۱، لفظه: وبه يعرف فضل المتقدمين على المتأخرين في كل طبقة.

برے کام کا موجد وداعی اگر توبہ کرلے؟

ملاعلی قاریؒ نے ابن حجر مکی کے حوالہ سے یہاں یہ بحث ذکر کی ہے کہ اگر گناہ کا موجد وداعی گناہ سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ کے بعد جولوگ اس گناہ میں مبتلا رہیں گے تو ان بعد والوں کے گناہ کے بقدر پھر بھی اس کو گناہ ملے گا یا نہیں؟

ابن حجر مکیؒ کا رجحان یہ ہے کہ توبہ کے بعد بھی اس کو گناہ ملتا رہے گا لیکن ملاعلی قاریؒ نے ان کی رائے کے برخلاف اپنا رجحان یہ بتایا کہ توبہ کے بعد یہ شخص گناہ گاروں کا شریک نہیں سمجھا جائے گا؛ کیونکہ حدیث شریف میں ہے"التائب من الذنب كمن لاذنب له[1]"نیز بہت سے لوگوں نے اسلام سے پہلے گمراہی کی بہت سی چیزیں ایجاد کی تھیں مگر ایمان قبول کرلینے کے بعد ان کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک قرار دیا گیا اور اسلام کی وجہ سے تمام گناہوں کے معاف ہونے کی ان کو بشارت سنائی گئی:"ان الاسلام يهدم ما كان قبله"[2]

١٥١ / ٢٠ : وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : "بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيْباً، وَسَيَعُوْدُ كَمَابَدَأَ، فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ"(رواه مسلم)[3]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"اسلام غربت میں شروع ہوا اور عنقریب لوٹے گا اسی حالت کی طرف جس حالت میں شروع ہوا لہٰذا غرباء کے لئے خوشخبری ہے"(مسلم)

تشریح حدیث

اسلام کا ابتدائی وآخری دور اوراس میں اسلام پرقائم رہنے والوں کی فضیلت:

اس حدیث میں اسلام کے ابتدائی دوراورآخری دورکی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ اسلام غربت کی حالت

(۱)رواه ابن ماجه في كتاب الزهد، باب ذكر التوبة ٣١٣ (٤٢٥٠)

(۲)فتح الإله لابن حجرمكى ١ / ٥٧١، والمرقاة ١ / ٣٦١ ، وقد تقدم هذا الحديث فى كتاب الايمان ، قبيل الفصل الاول .

(۳)أخرجه مسلم فى الايمان، باب بيان أن الإسلام بدأغريبا وسيعود غريباً ١ / ٨٤.

میں شروع ہوا اور اخیر دور میں پھر غربت کی حالت کی طرف لوٹ جائے گا، غربت کے ان دونوں ادوار میں جو افراد اسلام پر قائم اور جمے رہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان غرباء کے لئے خوشخبری اور پیغام مسرت ورضا ہے۔

غربت کی دو قسمیں ہیں (۱) غربت الانصار (۲) غربت المال، غربت الانصار سے مراد جس کے یارومددگار نہ ہوں، اور غربت المال سے مراد جس کے پاس مال واسباب نہ ہوں، یہاں غربت کی دونوں قسمیں مراد ہیں، ابتدا میں اسلام کے چند ماننے والے تھے، ان کے نہ یارومددگار تھے نہ کوئی ان کی پشت پناہی کرنے والا تھا، نیز وہ نادار اور تنگدست تھے، اس کے بعد اسلام پھیل گیا، مشرق سے مغرب تک اسلام کا ڈنکا بجا، دنیا کے وسائل اور مال واسباب بھی مسلمانوں کا مقدر بن گئے، حتی کہ روم وفارس کی حکومتیں اور ان کی دولت صحابہ کے قدموں میں آ گئیں اور تمام دنیا اسلام اور مسلمانوں پر رشک کرنے لگی، اخیر دور میں اس میں پھر کمی واقع ہوگی اور اسلام کے ماننے والے بے یارومددگار اور غریب ونادار رہ جائیں گے جس طرح اول زمانہ میں تھے، لیکن ان حالات میں بھی ان کی استقامت میں کمی نہ آئے گی اور وہ اسلام ودین کی حفاظت میں کسی طرح کی مداہنت برداشت نہیں کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کو خوشخبری دی: فطوبی للغربا۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ غریب کے معنی اجنبی کے ہوں یعنی اعمالِ اسلام کو شروع میں اجنبی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، جس کی وجہ سے صحابہؓ نماز بھی چھپ کر پڑھتے تھے، لوگ بیٹھ کر پیشاب کرنے کو معیوب سمجھتے تھے وغیرہ، ہر طرف اجنبیت وبے گانگی تھی، آخر دور میں یہی صورت حال لوٹ آئے گی پس اس وقت کے جو مسلمان ایسے حالات میں اسلام پر قائم رہیں گے اور اعمال اسلام انجام دیں گے ان کے لئے خوشخبری ہے۔

''بدأ'': اس کو مہموز اللام اور ناقص دونوں طرح ضبط کیا گیا ہے، ''للغربا'': یہ ''غریب'' کی جمع ہے، اس سے مراد ہے اسلام کے دورِ غربت میں اس پر قائم رہنے والے، ''طوبیٰ'': اسم تفضیل مؤنث ہے بمعنی خوشخبری اور خوش بختی۔

۱۵۲ / ۲۱: وَعَنْـهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''إِنَّ الإِيْمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِيْنَةِ كَمَاتَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا'' (متفق عليه) (۱)

(۱) أخرجه البخاري في كتاب فضائل المدينه، باب الإيمان يأرز إلى المدينه ۲۵۲/۱ برقم ۱۸۳۸.

ومسلم في الإيمان (۱/ ۵٤) باب بيان ان الإسلام بدأغريبا.

وَسَنَذْكُرُ حَدِيثَ أَبِي هُرَيْرَةَ: "ذَرُونِي مَاتَرَكْتُكُمْ"فِي كِتَابِ الْمَنَاسِكِ، وَحَدِيثَي مُعَاوِيَةَ وَجَابِرٍ: "لايَزَالُ مِنْ أُمَّتِي" وَ"لايَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي"فِي بَابِ:ثَوَابِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالىٰ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا:''ایمان مدینہ کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹتاہے''(بخاری ومسلم)

اورحضرت ابوہریرہؓ کی حدیث:''ذرونی ماترکتم''ہم کتاب المناسک میں ذکرکریں گے نیزحضرت معاویہؓاورحضرت جابرؓکی حدیثیں:''لایزال من أمتی الخ اورلایزال طائفة من أمتي'' باب ثواب هذه الأمة میں ذکرکریں گے ان شاءاللہ تعالیٰ۔

تشریح حدیث

مدینہ طیبہ؛ایمان واسلام کی پناہ گاہ:

اس حدیث پاک میں مدینہ طیبہ کی فضیلت کابیان ہے، اصولاً یہ روایت باب کے مناسب نہیں ہے اس لئے تاویل کی جائے گی کہ اسلام کاشیوع اورغلبہ مدینہ طیبہ سے ہواہے اوراسلام نام ہے کتاب وسنت دونوں کا،اس لحاظ سے باب سے مناسبت ہے۔

روایت کا مطلب یہ ہے کہ سانپ جب اپنے دشمن کا خوف محسوس کرتاہےتو تیزی سے اپنے بل میں گھس جاتاہے اسی طرح قرب قیامت میں جب مسلمانوں کوپریشان کیاجائے گا تو وہ فتنہ وفساد اورکفروشرک سے بچ کرمدینہ طیبہ میں پناہ لیں گے،بعض نے کہا کہ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کے سلسلہ میں ارشادفرمائی تھی یعنی میرے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعدتمام مسلمان مدینہ کی طرف سمٹ جائیں گے۔

لیأرز :لام تاکید کاہےاوریأرز:ارز، أرزاً سے مضارع کا صیغہ ہے، جب سانپ اپنے بل میں واپس ہوجاتاہےتو کہاجاتاہے:''أرزت الحيةُ الى جُحْرِها''مرادی ترجمہ ہے:سمٹ جانا، پناہ پکڑنا، پناہ لینا۔

وسنذكر حديث ابی هريرةؓ الخ: مصابیح السنۃ میں یہاں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث''ذرونی

ماترکتکم'' اورحضرت معاویہؓ وجابرؓ سے منقول یہ دوحدیثیں: ''لایزال من امتی'' اور''لایزال طائفة من امتی'' بھی مذکورتھیں، مگرمصنفؒ حدیث ابوہریرہؓ کو ''کتاب المناسک'' میں اورحضرت معاویہؓ وجابرؓ کی احادیث کو''باب ثواب هذه الامة'' میں ذکرکریں گے، کیونکہ ان کی مناسبت ان ابواب سے زیادہ ہے۔

الفصل الثانی

۱۵۳ / ۲۲: عَنْ رَبِيعَةَ الْجُرَشِيِّ، قَالَ: أُتِيَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيلَ لَهُ: لِتَنَمْ عَيْنُكَ، وَلِتَسْمَعْ أُذُنُكَ، وَلْيَعْقِلْ قَلْبُكَ، قَالَ: "فَنَامَتْ عَيْنِي، وَسَمِعَتْ أُذُنَايَ، وَعَقَلَ قَلْبِيْ" قَالَ: فَقِيلَ لِي: سَيِّدٌ بَنىٰ دَاراً، فَصَنَعَ فِيهَا مَأْدُبَةً، وَأَرْسَلَ دَاعِياً، فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ، دَخَلَ الدَّارَ، وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ، وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ، وَمَنْ لم يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ، وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ، وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ" قَالَ: "فَاللّٰهُ السَّيِّدُ، وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ، وَالدَّارُ الإِسْلَامُ، وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ" (رواه الدارمي)(۱)

ترجمہ: حضرت ربیعہ الجرشیؓ سے روایت ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضری دی گئی (فرشتے حاضر ہوئے) اورحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا (یعنی فرشتوں نے کہا) چاہئے کہ آپ کی آنکھیں سوجائیں اور آپکے کان سنیں اورآپ کا دل سمجھے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری آنکھیں سوگئیں اورمیرے کانوں نے سنا اورمیرے دل نے سمجھا، پھرآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے کہا گیا (یعنی مثال کے طور پرفرشتوں نے میرے سامنے بیان کیا) کہ ایک سردارنے گھربنایا اورکھانا تیارکیا پھرایک بلانے والے کو بھیجا (تاکہ وہ لوگوں کو بلائے) لہٰذا جس نے بلانے والے کی دعوت کوقبول کیا وہ گھرمیں داخل ہوا اوردسترخوان سے کھایا، اورسردار اس سے خوش ہوا، اورجس نے بلانے والے کی دعوت قبول نہ کی وہ نہ گھرمیں داخل ہوا اورنہ دسترخوان سے کھایا اورسردار اس سے ناراض ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱)أخرجه الدارمی فی "المقدمة، باب صفة النبي صلی الله علیه وسلم فی الکتب قبل مبعثه ۱/ ۱۱،برقم ۱۱"

''اس مثال میں سردار سے مراد: اللہ تعالیٰ شانہ ہیں، بلانے والے سے مراد: محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، گھر سے مراد: اسلام ہے، اور دستر خوان سے مراد جنت ہے'' (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال ربیعۃ الجرشی:

جُرش یمن کا قبیلہ تھا، جُرشی اسی کی طرف نسبت ہے، والد کا نام عمرو ہے اور بعض نے کہا کہ ''غاز'' ہے، حضرت معاویہ کے زمانے میں ملک شام کے قاضی اور بڑے فقیہ تھے، ابن ابی حاتم نے ان کے صحابی ہونے کا انکار کیا ہے، مگر راجح ہے کہ یہ صحابی ہیں، **کما ذکرہ المصنف فی الإکمال** ۶۴ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ (۱)

اس حدیث کا مضمون فصل اول میں آچکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ ملائکہ آئے تھے، انہوں نے اللہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جنت کی نعمتوں کی مثال بیان کی تھی، زیر نظر روایت میں یہی مضمون الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، یہاں الفاظ یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ چاہئے کہ آپکی آنکھ سوجائے اور کان سنے اور قلب سمجھے، ماقبل کے بہ نسبت یہاں تعبیر کچھ پیچیدہ ہے ماقبل میں یہ مضمون صیغۂ خبر (ان العین نائمۃ وغیرہ) کے ساتھ تھا جبکہ یہاں صیغۂ انشاء لایا گیا ہے البتہ معنیً بھی انشاء ہے یا نہیں؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) ایک یہ کہ جیسے لفظاً انشاء ہے معنیً بھی انشاء ہے اور خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضاء سے ہے، مقصود یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام چیزوں سے صرف نظر کریں اور ذہن ودماغ کو حاضر کر کے ہماری طرف متوجہ ہوں، آنے والی مثال کو کان اچھی طرح سن لیں اور قلب اچھی طرح سمجھ لے، الحاصل مثال سمجھانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ کو طلب کیا جارہا ہے۔

(۲) اور بعض نے کہا کہ یہ صیغہ گو لفظاً انشاء ہے لیکن معنیً خبر ہے کہ آپ کی آنکھ سوئی ہوئی ہے لیکن قلب بیدار ہے اور مثال کو سمجھ رہا ہے، پس یہ خبر ہے لیکن اس خبر کی صداقت کو بتلانے کے لئے انشا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ کہ انشاء میں کذب کا احتمال نہیں ہوتا، یہی قول راجح ہے، (۲) اس صورت میں یہ حدیث

(۱) الإصابۃ ۲ / ۱۶۴ — ۱۶۵.

(۲) المرقاۃ ۱ / ۳۶۳.

پہلی حدیث کے ہم معنی ہوجائے گی۔

چند اشکال اوران کا جواب:

اشکال: ماقبل میں یہ حدیث آئی اس میں ''دار'' کا مصداق جنت کو بتایا گیا تھا اور یہاں اسلام بتایا گیا ہے؟

جواب: یہ ہے کہ اسلام دخول جنت کا سبب ہے، یہاں سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے،لہذا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔(۱)

اشکال: ماقبل میں ''مادبہ'' سے نعمائے جنت مراد تھیں اور یہاں خود جنت مراد ہے؟ یہ ماقبل کی روایت کے خلاف ہے۔

اسکا جواب یہ ہے کہ یہاں محل بول کر حال یعنی نعمائے جنت ہی کومراد لیا گیا ہے اور بعض نے فرمایا کہ تمام جنت دسترخوان کے درجہ میں ہے، اس صورت میں بھی مراد نعماء جنت ہی ہوں گی۔(۲)

١٥٤ / ٢٣ : وَعَنْ أَبِي رَافِعٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''لاأُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِأًعَلٰى ا رِيْكَتِهِ، يَأْتِيْهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِيْ مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْنَهَيْتُ عَنْهُ، فَيَقُوْلُ: لاأَدْرِيْ، مَاوَجَدْنَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَاهُ'' (رواه احمد،وأبوداود، والترمذي، وابن ماجه، والبيهقي في دلائل النبوة)(۳)

ترجمه : حضرت ابورافعؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے مزین تخت پرسہارا لگائے ہوئے ہو، اورمیرے ان احکام میں سے جن کا میں نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے کوئی حکم اس کے

(۱)طیبي١ / ٣٥٥.

(۲)شرح المشكاة للطيبي١ / ٣٥٥.

(۳)أخرجه أبوداود فی كتاب السنة، باب فی لزوم السنة ٢ / ٦٣٥، والترمذي في كتاب العلم، باب مانهي عنه أن يقال عند حديث النبي صلى الله عليه وسلم ٢ / ٩٥.

وابن ماجه، فی كتاب السنة، المقدمه، باب تعظيم حديث الرسول صلى الله عليه وسلم ١ / ٣.

وأحمد٦ / ٨، برقم ٢٣٩١٢.

والبيهقي فی ''دلائل النبوة'' فصل في قبول الأخبار ١ / ٢٤.

پاس پہنچے، اور وہ اسے سن کر یہ کہدے کہ میں کچھ نہیں جانتا، جو کچھ ہم خدا کی کتاب میں پائیں گے بس اس کا اتباع کریں گے۔ (احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

تشریح حدیث

احوال ابورافع:

ان کا نام اسلم ہے اور بعض نے کہا کہ ابراہیم ہے اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے، پہلے حضرت عباسؓ کے غلام تھے انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا تھا، حضرت عباسؓ ایمان لائے تو اس کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابورافع نے ہی کی اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد فرمایا لیکن اس کے باوجود وہ پوری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرتے رہے، اور ۳۵ھ میں حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت سے کچھ قبل ان کی وفات ہوئی۔[1]

اہل قرآن (منکرین حدیث) کی تردید:

اس حدیث میں منکرین حدیث کا رد ہے، حجیت حدیث کی بحث میں گذر چکا ہے کہ یہ فرقہ حدیث کے حجت ہونے کو تسلیم نہیں کرتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محض پیغام رساں کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطاع ومتبوع نہیں مانتا، یہ لوگ اپنے آپ کو ''اہلِ قرآن'' کا نام دیتے ہیں، جبکہ قرآن کریم سے ہی جابجا معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف سفیر اور پیغام رساں نہیں بلکہ آپ کو مستقل مطاع ومتبوع اور تشریع وقانون سازی کا اختیار دے کر مبعوث فرمایا گیا ہے، اگر آپ کی یہ حیثیت تسلیم نہ کی جائے تو سارا قرآن معطل ہو کر رہ جائے گا، اس لئے آپ علیہ السلام نے امت کو ایسے اشخاص سے باخبر کیا ہے کہ یہ درپردہ مکمل شریعت سے انکار اور اس کی تعمیل سے فرار ہے، کیونکہ احادیث قرآن کریم کی تفسیر بھی ہیں کہ قرآنی احکام پر عمل آوری کا طریقہ وکیفیت احادیث ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے اور قرآن کریم کی تکملہ بھی ہیں کہ بہت سے احکام احادیث میں مذکور ہیں اور قرآن ان سے خاموش ہے، جیسا کہ آئندہ احادیث میں آرہا ہے۔

متكئا علي أريكته: متکأ اسم فاعل ہے اتکاء باب افتعال سے، بمعنی ٹیک لگانا، اور ''اریکۃ'' بمعنی

(۱) الإصابه ٦ / ٩١.

تخت، مسہری، اہل عرب جو صاحبِ ثروت ہوتے تھے وہ ایک خیمہ لگاتے، اس میں ایک تخت سجاتے اوراس پر تکیہ لگاکر آرام کرتے اس جملہ میں اسی کا نقشہ کھینچا ہے، اور یہ کنایہ ہے عیش وعشرت سے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے **متکأ علی اریکته** سے اس طرف اشارہ فرمایا کہ منکرین حدیث عموماً ان لوگوں میں سے ہونگے جو دین سے غافل، عیش پرست اورآزادمزاج ہوتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ان سے باخبر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا حال یہ ہوگا کہ ان کے پاس میرا کوئی حکم پہنچے گا تو وہ یوں کہیں گے کہ میں اس کونہیں جانتا اورہم صرف قرآن کا اتباع کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ تم ہرگز ایسا نہ کرنا، اوران کی روش پر نہ چلنا۔

یأتیه الأمر: یہاں امر عام ہے، ماموررات کوبھی شامل ہے اور منہیات کوبھی۔(۱)

۱۵۵ / ۲۴: وَعَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِيْ كَرِبَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَلا إِنِّيْ أُوْتِيْتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ، أَلايُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى أَرِيْكَتِهِ يَقُوْلُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَاالْقُرْآنِ، فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلالٍ فَأَحِلُّوْهُ، وَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ، وَإِنَّ مَاحَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَمَا حَرَّمَ اللّٰهُ، أَلا لايَحِلُّ لَكُمُ الْحِمَارُ الأَهْلِيُّ، وَلا كُلُّ ذِيْ نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ، وَلالُقْطَةُ مُعَاهِدٍإِلَّا أَنْ يَسْتَغْنِيَ عَنْهَا صَاحِبُهَا، وَمَنْ نَزَلَ بِقَوْمٍ فَعَلَيْهِمْ أَنْ يَقْرُوْهُ فَإِنْ لَمْ يَقْرُوْهُ، فَلَهُ أَنْ يُعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ" (رواه ابوداود، وروى الدارمي نحوه، وكذا ابن ماجة إلى قوله: "كماحرم الله")(۲)

ترجمہ: حضرت مقدام بن معدیکربؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: "آگاہ رہو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اوراس کے ساتھ اس کا مثل، خبردار! عنقریب اپنے مزین تخت پر پیٹ بھرا ایک شخص کہے گا کہ اس قرآن کو اپنے اوپرلازم جانو (یعنی فقط قرآن پر عمل کرو) اورجو چیز تم قرآن میں حلال پاؤ اس کوحلال جانو اورجس چیز کوتم قرآن مین حرام پاؤ

(۱) اللمعات ۱/ ۴۸۰.

(۲) أخرجه ابوداود، كتاب السنة، باب في لزوم السنة ۲/ ۶۳۲ والترمذى، كتاب العلم، باب مانهي عنه أن يقال عند حديث النبي صلى الله عليه وسلم ۲/ ۹۵.

وابن ماجة، كتاب السنة،المقدمه، باب تعظيم حديث رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱/ ۳.

والدارمي ۱/ ۱۵۱ برقم ۵۹۲، المقدمه،باب السنة قاضية على كتاب الله.

اس کوحرام جانو، حالانکہ جو کچھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام فرمایا ہے وہ اس کے مانند ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا، خبردار تمہارے لئے نہ پالتو گدھا حلال ہے اور نہ کچلی والے درندے، اور نہ تمہارے لئے معاہد (یعنی وہ قوم جس سے معاہدہ کیا گیا ہو) کا لقطہ حلال ہے، مگر وہ لقطہ حلال ہے جس کی پرواہ اس کے مالک کو نہ ہو، اور جو شخص کسی قوم کا مہمان ہو اس قوم پر لازم ہے کہ اس کی ضیافت کریں، اگر وہ ضیافت نہ کریں تو اس شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ ضیافت کے بقدر ان سے حاصل کرلے" (ابوداود، دارمی، اور ابن ماجہ نے "کماحرم اللہ" تک روایت کیا ہے)

تشریح حدیث

احوال مقدام بن معدیکرب:

ان کی کنیت ابوکریمہ ہے، اُن کا شمار اہل شام میں ہوتا ہے، بعض لوگوں نے ان سے کہا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی، تو انہوں نے کہا کہ: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آپ نے میرا کان بھی پکڑا تھا اور میں اپنے چچا کے ساتھ آپ کی خدمت میں پہنچا تھا اور آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے اس وقت ایک حدیث بھی سنائی تھی، ملک شام میں ہی ۸۷ھ میں وفات ہوئی اور خلق خدا نے آپ سے کافی فائدہ اٹھایا، آپ کی کل عمر مبارک ۹۱ سال ہوئی ہے۔(۱)

احادیث؛ قرآن کا مثل:

انی اوتیت القرآن ومثله معه: اس سے مراد احادیث ہیں، احادیث کو مثل قرآن کہا ہے اس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) وحی میں مماثلت مراد ہے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی کے ذریعے اتری ہیں، فرق یہ ہے کہ قرآن وحی جلی ہے اور احادیث وحی خفی، بایں معنی کہ ان کے صرف معانی اترے ہیں، ان معانی کو تعبیر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔(۲)

---

(۱) الإصابة ۵/۱۹۶.

(۲) اللمعات ۱/۴۸۱.

(۲)واجب العمل ہونے میں مماثلت مراد ہے کہ قرآن کے احکام کی طرح احادیث کے احکام بھی واجب العمل ہیں۔[1]

الایوشک رجل شبعان: ''شبعان'' پیٹ بھرا آدمی، یہ کنایہ ہے مستغنی اور بدفہم ہونے سے کہ ایسے شخص کے صحیح بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔[2]

احادیث نبویہ کے کچھ محرمات وممنوعات:

الالایحل لکم الحمار الأهلي: بہت سی چیزوں کی حرمت کا بیان قرآن میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں ہے، انہی میں سے چند کا بیان یہاں کیا گیا ہے:

(۱)حمار اُہلی:

حمار کی دو قسمیں ہیں (۱)حمار وحشی (۲)حمار اہلی، پالتو گدھا جو بار برداری کے کام آتا ہے اس کو ''حمار اہلی'' کہا جاتا ہے اور وحشی سے مراد نیل گائے ہے، حمار اہلی ابتدا میں حلال تھا، فتح خیبر کے موقعہ پر اس کی حلت منسوخ ہوگئی، تفصیل آگے آئے گی۔

(۲)ذی ناب درندہ:

ولاکل ذی ناب من السباع: ناب بمعنی نوکیلا دانت جسے کچلی کہتے ہیں، جانوروں میں جو دانتوں کے ذریعہ شکار کرتے ہیں جیسے شیر بھیڑیا، کتا وغیرہ سب حرام ہیں۔

(۳)لقطۃ معاہد

ولالقطة معاهد: ''معاہد'' وہ شخص جس نے مسلمانوں سے معاہدہ کیا ہے اور مسلمانوں نے اس کو امن دے رکھا ہے، ''لقطہ'' کے معنی گری پڑی چیز، یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر کے موقع پر ارشاد فرمائی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہود کو جلاوطن کرنا چاہتے تھے مگر ان لوگوں نے درخواست کی اور یہ کہا کہ خیبر کے باغات اور یہاں کی اراضی کے آپ مالک ہوگئے ہیں، آپ ہمیں جلاوطن نہ کریں، ہم ان باغات واراضی میں عمل اور محنت کریں گے جو پیداوار ہوگی اس کا نصف آپ ہمیں دیدیں اور نصف آپ کا ہوگا، ہم

(۱)طیبي ۱/ ۳۵۶.

(۲)طیبي ۱/ ۳۵۶–۳۵۷.

مسلمانوں کے جان و مال سے کوئی تعرض نہ کریں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے انکی درخواست کو قبول فرمالیا، ان سے امن کا اور نصف پیداوار کا معاہدہ ہوگیا، اس معاہدہ کے بعد وہ معاہد (ذمی) ہوگئے، اس وقت ان کے مناسب حال حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام بیان فرمائے، ایک حکم یہ بیان کیا کہ ان کا لقطہ تمہارے لئے حلال نہیں، الا یہ کہ وہ لقطہ معمولی چیز ہو، جیسے آج کل پچاس پیسے، ایک روپیہ وغیرہ، ایسی معمولی چیز کی تعریف (اعلان) واجب نہیں، پانے والا اس کو استعمال کرسکتا ہے، لقطہ کا مستقل باب مشکوۃ جلد اول کے اواخر میں آئے گا، وہاں لقطہ کے تفصیلی احکام ومباحث انشاء اللہ بیان ہوں گے۔

(۴) ضیافت کا وجوب:

ومن نزل بقوم فعليهم ان يقروه: یہ چوتھا حکم ہے کہ اگر کسی شخص کو کسی قوم کے یہاں ٹھہرنا پڑے تو اس قوم پر لازم ہے کہ اسکی ضیافت کریں اپنی وسعت کے بقدر، اگر ان لوگوں نے ضیافت نہیں کی تو مہمان کو اجازت ہے کہ اپنی ضیافت کے بقدر ان کے مال میں سے جس طرح چاہے چوری چھپ کے لے لے، اسی روایت کی وجہ سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور لیث بن سعدؒ اس کے قائل ہیں کہ مہمان کی ضیافت واجب ہے لیکن جمہور کے یہاں مستحب ہے واجب نہیں ہے،[1] اور ان کی طرف سے اس روایت کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

(۱) یہ حدیث منسوخ ہے، ضیافت کے واجب ہونے کا حکم ابتداء اسلام میں تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو عرب کے قبائل آپ کے پاس آتے اور امن کا معاہدہ کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے معاہدہ کو قبول کرتے اور عموماً ان سے یہ شرط لگایا کرتے تھے کہ اگر میرے صحابہ کا تم پر سے گزر ہو تو تم ان کی ضیافت کرنا، چونکہ وہاں بازار وغیرہ نہ ہوتے تھے اس لئے آپ ان سے یہ شرط لگاتے، اس معاہدہ کی وجہ سے ان پر ضیافت واجب ہوجاتی، لہٰذا ضیافت نہ کرنے کی صورت میں اپنا حق لینے کی اجازت تھی، لیکن جب اسلام کا شیوع اور غلبہ ہوگیا اور باہم انسیت ومحبت قائم ہوگئی اور لوگ خود ہی ضیافت کا اہتمام کرنے لگے تو اس ضیافت کا وجوب منسوخ ہوگیا البتہ اس کا استحبابی حکم باقی رہا۔[2]

(۲) یہ حکم مضطر پر محمول ہے کہ اضطرار کی صورت میں مہمان کی ضیافت واجب ہے، مہمان کے مضطر

(۱) المرقاة ۱/ ۳۶۸.

(۲) طيبي ۱/ ۳۵۷ – واللمعات ۱/ ۴۸۳.

ہونے کے باوجود اگر میزبان ضیافت نہ کرے تو اس کے مال سے ضیافت کے بقدر لینا جائز ہے۔(۱)

''یقروه'' باب ضرب سے ہے قری یقری قِریً بمعنی میزبانی کرنا''قراہ''اسی کا مصدر ہے۔

۱۵٦ / ۲۵: وَعَنِ الْعِرْبَاضِ بنِ سَارِيَةَ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: "أَيَحْسَبُ أَحَدُكُمْ مُتَّكِأً عَلٰى أَرِيْكَتِهٖ يَظُنُّ أَنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحَرِّمْ شَيْأً إِلَّا مَافِيْ هٰذَاالْقُرْآنِ؟ أَلَاوَإِنِّيْ وَاللّٰهِ قَدْ أَمَرْتُ وَوَعَظْتُ وَنَهَيْتُ عَنْ أَشْيَاءَ، إِنَّهَا لَمِثْلُ الْقُرْآنِ أَوْأَكْثَرُ، وَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا بِإِذْنٍ، وَلَاضَرْبَ نِسَائِهِمْ، وَلَاأَكْلَ ثِمَارِهِمْ إِذَا أَعْطَوْكُمُ الَّذِيْ عَلَيْهِمْ"(رواه ابو داوٗد وفي إسناده: أشعث بن شعبة المصّيصي، قدتكُلّم فيه)(۲)

ترجمہ: حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (خطبہ کے لئے) کھڑے ہوئے اور فرمایا: کہ کیا تم میں سے کوئی شخص اپنے مزین تخت پر تکیہ لگائے ہوئے یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں، خبردار! خدا کی قسم بلاشک میں نے بھی حکم دیا، میں نے بھی نصیحت کی اور میں نے بھی منع کیا بہت سی چیزوں سے جو مثل قرآن کے ہیں، بلکہ زیادہ ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے یہ تمہارے لئے حلال نہیں کیا کہ تم اہل کتاب کے گھروں میں اجازت حاصل کئے بغیر چلے جاؤ اور نہ تمہارے لئے ان کی عورتوں کا مارنا حلال ہے اور نہ تمہارے لئے ان کے پھلوں کا کھانا جائز ہے جبکہ وہ حق جو ان پر واجب ہے اداء کردیں (ابوداود) اور اس کی سند میں اشعث بن شعبہ مصیصی ہیں جن کے بارے میں کلام ہے (کہ وہ ثقہ ہیں یا نہیں)

تشریحِ حدیث

احوال عرباض بن ساریہ:

عرباض: عین کے کسرہ کے ساتھ ہے، کنیت ابونجیح ہے، جلیل القدر صحابی ہیں، چوتھے یا پانچویں نمبر پر اسلام لائے، اصحابِ صفہ میں سے ہیں، اور بکائین میں سے ہیں یعنی اللہ کے اشتیاق میں بہت رونے

(۱) المرقاة ۱ / ۳٦۹.

(۲) أخرجه أبوداود، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في تعشير أهل الذمة إذا اختلفوا بالتجارة ۲ / ۴۳۲.

والے تھے، بڑھاپے میں کہتے تھے: ''کَبُرَسِنِّي وَوَهَنَ عظمي فاقبضني إليك'' کہ اے اللہ میری عمر زیادہ ہوگئی، ہڈیاں کمزور ہوگئیں، پس مجھے اپنے پاس بلالے، ۵۷ھ میں وفات ہوئی، آپ کی مرویات ۳۱ ہیں۔[۱]

احادیث کے بیان کردہ احکام قرآن سے بھی زائد:

إنها لمثل القرآن أو أكثر: احادیث کے احکام قرآن کے برابر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ، مطلب یہ ہے کہ احکامِ احادیث اولاً قرآن کے احکام کے برابر تھے، لیکن ان میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا اس لئے بہ حیثیت مجموعی حدیث کے احکام زیادہ ہوگئے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔

اہل کتاب کی املاک اور عورتوں کی حرمت:

وان الله لم يحل لكم ان تدخلوا بيوت الخ: پہلی حدیث کی طرح اس حدیث میں بھی اہل خیبر کے بعض احکام بیان فرمائے گئے کہ ان کی اجازت کے بغیر ان کے مکانات میں داخل نہ ہونا، ان کی عورتوں کو نہ مارنا، بعض نے کہا کہ یہ کنایہ ہے جماع سے کہ ان کی عورتوں سے جماع جائز نہیں،[۲] کیونکہ معاہدہ کی وجہ سے وہ بہ حکم ذمی ہوگئے، ان کی عورتوں پر باندی ہونے کا حکم نہ ہوگا، اسی طرح ان کے پھلوں کو نہ کھانا کیوں کہ حربی کا مال تو جائز ہے، لیکن یہ ذمی ہوگئے ہیں پس ان کا مال حلال نہ ہوگا، البتہ اگر وہ تمہارا حق نہ دیں جو معاہدہ کی وجہ سے ان پر واجب ہے تو اپنا حق بلا اذن لینا بھی جائز ہوگا۔

۱۵۷/ ۲٦: وَعَنْهُ: قَالَ: صَلَّى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ فَوَعَظَنَامَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، ذَرَفَتْ مِنْهَاالْعُيُوْنُ، وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! كَأَنَّ هٰذِهٖ مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا، فَقَالَ ''أُوْصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَإِنْ كَانَ عَبْداً حَبَشِياً، فَإِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اِخْتِلَافاً كَثِيْراً؛ فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْاعَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ؛ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ

(۱) الإصابة ۳/ ٤٤١–٤٤٢، المرقاة ۱/ ۳٦۹.

(۲) المرقاة ۱/ ۳۷۰.

بِدْعَةٍ ضَلالَةٌ''(رواه أحمد، وأبو داود، والترمذي، وابن ماجه، إلا أنهما لم يذكرا الصلاة)(۱)

ترجمه:حضرت عرباض بن ساریہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی اور پھر ہماری طرف متوجہ ہوکر بیٹھ گئے اور ہم کونہایت مؤثر انداز میں نصیحت کی کہ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اوردلوں میں خوف پیدا ہوگیا، ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ!(ایسا معلوم ہورہا ہے) گویا یہ رخصت کرنے والے کی نصیحت ہے، لہٰذا ہم کومزید وصیت فرمادیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور (امیر) کی بات سننے اوراطاعت کرنے کی وصیت کرتا ہوں اگر چہ وہ (امیر)حبشی غلام ہو، کیونکہ تم میں سے جوشخص میرے بعدزندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا پس تم پرلازم ہے کہ تم میرے اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کے طریقہ کولازم پکڑو اوراسے خوب مضبوطی سے پکڑو اور دین میں نئی نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو، اس لئے کہ ہرنئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔(احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ)مگرترمذی اورابن ماجہ نے اس روایت میں نماز پڑھنے کا ذکرنہیں کیا۔

تشریح حدیث

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بلیغ خطاب

صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم: ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو نماز پڑھائی، بیہقی ومستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ وہ فجر کی نماز تھی(۲)''ذات یوم'' کے لفظ سے بھی دن کا واقعہ ہونا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یوم پرذات کا لفظ داخل ہوجائے تو لفظ''یوم'' نہار کے معنی کے ساتھ خاص

(۱)أخرجه أبوداود في كتاب السنة، باب في لزوم السنة ۲/ ٦٣٥، والترمذي: في كتاب العلم، باب في الأخذبالسنة واجتناب البدع ۲/ ۹٦، وابن ماجه:في كتاب السنة، المقدمة، باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين ۱/ ۵. وأحمد٤/ ۱۲٦برقم ۱۷۱۸۲، ۱۷۱۸٤، ۱۷۱۸٤.

(۲)السنن الكبرى للبيهقي ۱۰/ ۱۹۵ (۲۰۳۳۸)ط دار الكتب العلميه بيروت والمستدرك للحاكم ۱/ ۱۷٤(۳۲۹)ط دار الكتب العلميه بيروت .

ہوجاتا ہے اور فجر کی نماز دن ہی کی نمازوں میں شمار ہے۔[1]

موعظة بليغة: قاضی بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ موعظۂ بلیغہ وہ ہے جس میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں[2] علامہ تورپشتیؒ نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں، بلکہ موعظۂ بلیغہ وہ خطبہ ہے جوطویل ہواور موثر ہو، اس لئے کہ قصیر بیان مؤثر نہیں ہوتا،[3] ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ موعظہ کے بلیغ ہونے کے لئے طویل ہونا ضروری نہیں، بہت سی مرتبہ وعظ کے چند جملے بھی موثر ہوتے ہیں جب وہ دل کی گہرائی سے نکلیں، لہذا قاضی بیضاوی کی بات بھی غلط نہیں ہے۔[4]

ذرفت منها العيون: ''ذرفت'' ذال معجمہ کے ساتھ ہے، یہاں ہندی نسخہ میں زاء معجمہ کے ساتھ لکھا ہے یہ غلط ہے، باب ضرب سے ہے بمعنی بہنا۔[5]

وجلت منها القلوب: ''وجلت'' وجل یوجل باب سمع سے ہے، بمعنی خوفزدہ ہونا۔[6]

موعظة مودّع: ''مودع'' اسم فاعل کا صیغہ ہے تودیع سے، بمعنی رخصت کرنا، مطلب یہ ہے کہ جب کوئی بڑا اپنے چھوٹے کو رخصت کرتا ہے تو اس چھوٹے کے مناسبِ حال تمام مفید اور کارآمد باتیں جامع اور مؤثر انداز میں اس کو بتادیتا ہے، اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع اور مؤثر انداز اختیار فرمایا اسلئے صحابہ نے آپ سے مزید نصائح کی درخواست کی۔[7]

تقوی کی وصیت:

أوصيكم بتقوى الله الخ: تقوی کے تین درجے ہیں: (۱) **الاجتناب عن الشرك**، آدمی کفروشرک سے بچے (۲) **التقوى عن المعاصي**، گناہوں سے بچنا (۳) **التقوى عما سوى الله** یعنی

(۱) المرقاة ۱/۱۰۷ و ۳۷۱.

(۲) تحفة الأبرار ۱/۱۳۷.

(۳) كتاب الميسر للتوربشتيؒ ۱/۸۸.

(٤) المرقاة ۱/۳۷۱.

(٥) المرقاة ۱/۳۷۱۔

(٦) المرقاة ۱/۳۷۱۔

(۷) اللمعات ۱/٤۸٦.

اللہ سے دل کو پھیرنے والی ہر چیز سے بچنا، پہلا تقوی عام مؤمنین کا ہے، دوسرا خواص کا ہے اور تیسرا اخص الخواص کا ہے۔ (۱)

سمع وطاعت کی تاکید:

السمع والطاعة: امیر کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا اگرچہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، لیکن اطاعت جائز اور مباح امور میں ہوگی، معصیت میں کسی کی اطاعت درست نہیں "**لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق**"(۲)

سوال: حدیث شریف میں ہے "**الائمة من قریش**" کہ مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ قریشی شخص ہونا چاہئے پھر عبد حبشی کا بادشاہ بننا کیونکر درست ہے اور اس کی اطاعت کیسے واجب ہوگی؟ اس کے دو جواب ہیں:

(۱) امیر سے خلیفۂ اکبر مراد نہیں بلکہ سریہ وغیرہ کا امیر ہونا مراد ہے وہ کوئی بھی ہوسکتا ہے۔

(۲) حدیث **الائمة من قریش** حالت اختیاری پر محمول ہے اور مذکورہ روایت میں اضطراری حالت کا حکم بیان کیا گیا ہے، یعنی مسلمان جب اپنے اختیار سے کسی کو بادشاہ مقرر کریں تو قریشی کو مقرر کرنا چاہئے، اگر غیر قریشی خواہ عبد حبشی ہو قوت اور طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قابض ہوجائے تو اس نے جو کیا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے مگر تم پر اس کی اطاعت واجب ہے۔ (۳)

اختلافات کے ظہور کی پیش گوئی اور ایسے وقت میں امت کے لئے راہ عمل:

فسیری اختلافا کثیرا: اس میں عقائد کا اختلاف بھی داخل ہے اور سیاسی اختلاف بھی داخل ہے جس کی ابتدا حضرت عثمانؓ کے زمانہ سے ہوئی۔

فعلیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین: اس اختلاف کے زمانے میں خاص طور پر میری سنت کو اور میرے خلفاء کی سنت کو مضبوطی سے پکڑنا کیونکہ سنت کے اتباع میں فتنہ سے امن ہے، خلفائے راشدین چار ہیں ان کی خلافت علی منہاج النبوۃ تھی، ایک حدیث میں ہے "**الخلافة بعدی ثلاثون سنة**"

(۱) المرقاة ۱/ ۳۷۲.

(۲) تقدم تخریجه.

(۳) المرقاة ۱/ ۳۷٤.

کہ میرے بعد خلافت (منہاج نبوت پر) تیس سال رہے گی اور یہ تیس سال حضرت علی کی خلافت پر پورے ہوئے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ یہ خلفاء اربعہ عزیمت پر قائم رہیں گے اس لئے خصوصیت سے آپ نے ان کے اتباع کی تاکید فرمائی۔(۱)

آپ علیہ السلام کی اس نصیحت سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے جو آجکل بکثرت عام لوگوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے کہ ہر چیز میں اختلاف ہے ہم کیا کریں؟ کس کی اتباع کریں؟ آپ علیہ السلام نے اس حدیث میں واضح فرمادیا کہ اختلافات کی تو کثرت ہوگی لیکن ہر چیز میں خلفاء راشدین کا طرزعمل دیکھو اور اس کو اپناؤ، تم ہدایت پر رہوگے۔

خلفاء راشدین کے تعامل کی حجیت کی دلیل:

نیز اس حدیث سے خلفاء راشدین کے تعامل کا حجت ہونا بھی معلوم ہوتا ہے، اسی لئے اس کے اتباع وتمسک کا حکم کیا گیا ہے۔

عضوا علیها بالنواجذ: عضَّ یعضُّ عضاً، نصر سے ہے بمعنی دانتوں سے پکڑنا، "نواجذ" ناجذة کی جمع ہے بمعنی داڑھ، اوردانتوں سے پکڑنا یہ کنایہ ہے مضبوطی سے پکڑنے سے، کیونکہ جس چیز کو مضبوطی سے پکڑنا ہو اس کو دانتوں سے پکڑتے ہیں۔(۲)

ایاکم ومحدثات الامور: اس جملہ میں بدعت سے اجتناب کا حکم ہے، جس کی تفصیل ماقبل میں گزرچکی ہے۔

۱۵۸ / ۲۷: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا، ثُمَّ قَالَ: "هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ" ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطاً عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ، وَقَالَ: "هٰذِهٖ سُبُلٌ، عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ، يَدْعُوْا إِلَيْهِ" وَقَرَأَ: "وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ" الآية، (رواه احمد، والنسائي، والدارمي) (۳)

(۱) المرقاة ۱/ ۳۷۴.

(۲) اللمعات ۱/ ۴۸۷.

(۳) أخرجه أحمد ۱/ ۴۳۵ برقم ۴۱۴۲ و ۱/ ۴۶۵ برقم ۴۴۳۷ والدارمی، المقدمة، باب فی کراهية أخذ الرأي ۱/ ۷۲ برقم ۲۰۶ والنسائی فی "الکبری" کتاب التفسیر، باب قوله تعالی وإن هذا صراطي مستقيما ۶/ ۳۴۳ برقم ۱۱۱۷۴.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہمیں سمجھانے کے لئے) ایک (سیدھا) خط کھینچا اور فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کے دائیں اور بائیں چند (چھوٹے اور ٹیڑھے) خطوط کھینچے اور فرمایا یہ (بھی) راستے ہیں جن میں سے ہر ایک راستہ پر شیطان (بیٹھا ہوا) ہے جو اپنے راستے کی طرف بلاتا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْماً فَاتَّبِعُوْهُ وَلاتَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِه'' اور بے شک میرا راستہ ہے جو سیدھا ہے لہٰذا اس کی پیروی کرو (دوسرے) راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھیں اللہ کے راستہ سے جدا کردیں گے۔ (احمد، نسائی، دارمی)

تشریح حدیث

صراط مستقیم پر چلنے اور کج روی سے اجتناب کی تلقین:

اس حدیث پاک میں اعتصام بالکتاب والسنۃ دونوں کا بیان ہے اور صراط مستقیم کو اختیار کرنے کا اور گمراہوں کے راستوں سے بچنے کا حکم ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس طریقہ پر صراط مستقیم کی اور شیطان کے راستوں کی وضاحت فرمائی، چنانچہ آپ علیہ الصلوۃ السلام نے زمین پر ایک سیدھا لمبا خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ اللہ کا راستہ ہے، پھر اس کے دائیں اور بائیں دیگر خطوط کھینچے اور فرمایا کہ یہ دوسرے راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان مسلط ہے، سیدھے خط (اللہ کا راستہ) سے مراد اسلام کے عقائد اور احکام شرعیہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے متوارثاً گویا سیدھے خط کی شکل میں اب تک چلے آرہے ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ یہی ہے جو ہر طرح کے افراط تفریط غلو وانحراف سے پاک ہے، اس سیدھے خط کے دائیں اور بائیں ٹیڑھے خطوط کھینچ کر یہ بتایا کہ اس کی رضا حاصل کرنے کا اصلی راستہ تو ایک ہی ہے، لیکن دنیا میں لوگوں نے اپنے اپنے خیالات سے مختلف راستے بنا رکھے ہیں، یہ راستے لمۂ شیطانی کا نتیجہ ہیں، ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے، تم ان راستوں میں سے کسی راستہ پر نہ چلو، کیونکہ یہ راستے حقیقت میں خدا تعالیٰ تک پہنچنے کے نہیں ہیں، اسی لئے جو ان راستوں پر چلے گا وہ اللہ کے راستہ سے دور جا پڑے گا۔

فرق ضالہ کی گمراہی پر ایک لطیف اشارہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدھے خط کے دائیں جانب اور بائیں جانب جو خطوط کھینچے اس سے امت کے گمراہ لوگوں کے راستے مراد ہیں، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ امت میں مختلف فرقے اسلام کے نام پر ہی بنیں گے کیونکہ یہ خطوط خط مستوی سے ملے ہوئے ہیں، ان راستوں کو اختیار کرنے والے اگرچہ اپنے لئے صراط مستقیم پر ہونے کے مدعی ہونگے، لیکن واقعہ اور نفس الامر یہ ہے کہ خط مستوی کے لحاظ سے ان خطوط میں کجی ہے اس لئے انکار صراط مستقیم کا دعوی غلط ہوگا، یہ راستے درحقیقت افراط تفریط غلو وانحراف اور زیغ وضلال پر مشتمل ہونگے۔

تفسیر مظہری میں ہے کہ قرآن کریم نازل کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنے کا منشاء تو یہ ہے کہ لوگ اپنے خیالات (عقائد) اور اپنی خواہشات کو قرآن وسنت کے تابع کریں اور اپنی زندگیوں کو ان کے سانچہ میں ڈھالیں؛ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لوگوں نے قرآن وسنت کو اپنے خیالات اور اپنی تجویزات کے سانچہ میں ڈھالنے کی ٹھان لی، جو آیت یا حدیث اپنے نظریہ کے خلاف نظر آئی اس کی تفسیر اپنی خواہش کے مطابق کرلی، یہیں سے دوسری گمراہ کن راہیں پیدا ہوتی ہیں جو بدعات وشبہات کی راہیں ہیں، ان ہی سے بچنے کے لئے اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے۔(۱)

۱۵۹ / ۲۸: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لايُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ"(رواه فى "شرح السنة" وَقَالَ النَّوَوِيُّ فِيْ "أَرْبَعِيْنِهٖ": هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ، رَوَيْنَاهُ فِيْ "كِتَابِ الحجة" بِإِسْنَادٍ صَحِيْحٍ)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس چیز (یعنی دین وشریعت) کے تابع نہ ہوجائیں جس کو میں اللہ تعالیٰ شانہ کی جانب سے لایا ہوں،

(۱) تفسیر مظهری(عربی)۳ / ۳۰۷ ط مكتبة الرشيد باكستان .

(۲) أخرجه البغوى فى شرح السنة، كتاب الإيمان،باب رد البدع والهواء ۱ / ۱۸۵ برقم ۱۰۴ .
وأورده النووي (متن الاربعين النووية، الحديث الحادي والأربعون. هوى المؤمن) ص۲۸ .

مصنف نے اس حدیث کو ''شرح السنہ'' میں روایت کیا ہے، اور امام نوویؒ نے اپنی ''چہل حدیث'' میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے جس کو ہم نے کتاب الحجۃ میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

تشریحِ حدیث

ہوائے نفسانی کو بھی دین کے تابع کرنا ضروری:

اس حدیث میں اعتصام بالکتاب والسنۃ دونوں کا بیان ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ایمان کامل اور مکمل ہونے کے لئے خواہشات سے اجتناب اور شریعت کا مکمل اتباع ضروری ہے اور یہ اسی وقت ہوگا جب کتاب وسنت دونوں کو مضبوطی سے پکڑا جائے۔

حتي يكون هواه: ''ہویٰ'' بمعنی خواہش، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایمان اپنے میلان وخواہش سے قبول کرے، پس اگر جبر واکراہ سے اسلام لایا ہو، دل اس پر منشرح نہ ہو تو بندہ مؤمن نہیں ہوگا۔

لما جئت به: اس میں ما سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو احتمال ہیں:

(۱) عقائد مراد ہوں یعنی آدمی اپنی خواہش کو میرے لائے ہوئے عقائد کے مطابق کردے، اس وقت لایؤمن سے مطلق ایمان اور اصل ایمان کی نفی ہوگی، اس صورت میں ''ما'' کے مفہوم اور اوپر ''ہویٰ'' کی جو تفسیر بیان کی گئی ہے دونوں میں مطابقت ہو جائے گی۔

(۲) ''ما'' سے مراد عقائد، اعمال اور اخلاق تینوں کا مجموعہ ہو اس وقت نفی ایمان کامل کی ہوگی یعنی وہ شخص کامل مومن نہیں ہے جس کی زندگی کے یہ تینوں شعبے اس کے مطابق نہوں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔

علماء نے لکھا ہے کہ تینوں شعبوں میں کامل مطابقت یکدم پیدا نہیں ہوتی بلکہ دھیرے دھیرے پیدا ہوتی ہے، پس انسان اس کی مسلسل کوشش کرتا ہے، یہی حدیث کا مقصود بھی ہے، کیونکہ ''حتی'' تدریج کے لئے ہے۔ (۱)

---

(۱) طيبي طاب الله ثراه ۱/ ۳۶۵– ۳۶۶.

۱۶۰ / ۲۹ : وَعَنْ بِلَالِ بنِ الْحَارِثِ الْمُزَنِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ اَحْيَاسُنَّةً مِنْ سُنَّتِي قَدْ أُمِيْتَتْ بَعْدِيْ، فَإِنَّ لَهُ مِنَ الأَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنْ عَـمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِأَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً، وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةَ ضَلَالَةٍ لايَرْضَاهَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ، كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لايَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئاً" (رواه الترمذی وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ عَنْ كَثِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ أَبِيْهِ، عَنْ جَدِّهٖ)(۱)

ترجمہ : حضرت بلال بن الحارث المزنیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''جس شخص نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا (یعنی رائج کیا) جو میرے بعد مٹ چکی تھی (چھوڑ دی گئی تھی) تو اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس سنت پر عمل کرنے والے کو ملے گا، بغیر اس کے کہ ان (سنت پر عمل کرنے والوں) کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے، اور جس شخص نے گمراہی کی کوئی ایسی بات نکالی جس سے اللہ اور اس کے رسول خوش نہیں ہوتے تو اس کو اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا اس بدعت پر عمل کرنے والے کو ہوگا، بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کمی کی جائے (ترمذی) اور ابن ماجہ نے اس روایت کو کثیر بن عبداللہ بن عمرو سے اور کثیر نے اپنے والد عبداللہ سے اور عبداللہ نے کثیر کے دادا عمرو بن العوف سے روایت کیا ہے''۔

تشریحِ حدیث

احوال بلال بن الحارث مزنی:

ان کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے، اہل مدینہ میں سے ہیں، عقیق نامی جگہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بطور جاگیر عنایت کی تھی، اور فتح مکہ کے موقعہ پر قبیلہ ''مزینہ'' کا جھنڈا انہی کے ہاتھ میں تھا، اخیر عمر میں بصرہ منتقل ہوگئے تھے، ۶۰ھ میں اسّی سال کی عمر میں وفات ہوئی ہے۔(۲)

احیاء سنت کی فضیلت اور اختراعِ بدعت کی شناعت:

من أحيا سنة من سنتي قد اميتت بعدي: اماتت سنت یہ ہے کہ: لوگ اس سنت پر عمل کرنا چھوڑ دیں

(۱) أخرجه الترمذي في كتاب العلم، باب في الأخذ بالسنة واجتناب البدع ۹۶/۲، وابن ماجه في كتاب السنة، المقدمة في باب من أحياسنة قد أميتت ۱ / ۱۹.

(۲) الإصابة ۱ / ۲۴۵.

حتی کہ اس کا سنت ہونا بھی ذہن سے نکل جائے اوراس کا احیاء یہ ہے کہ آدمی خود بھی اس سنت پر عمل کرے اورلوگوں کو بھی اس کی دعوت دے اوراس کا ثواب بتا کر اس کی ترغیب دے حتی کہ وہ سنت رواج پا جائے تو اس کو بھی عمل کرنے والوں کے برابر ثواب ملتا رہے گا، کیونکہ یہ شخص لوگوں کے اس سنت پر عمل پیرا ہونے کا ذریعہ اور سبب بنا اور نیکی کا ذریعہ بننے والا نیکی کرنیوالے کی طرح ہوتا ہے کما مر۔(۱)

یہی بدعت کا بھی حکم ہے، جو اس کو ایجاد کرے گا اس کو اس کا گناہ ہوگا اور اس ایجاد کے بعد جو لوگ اس کو اپنائیں گے ان کا گناہ بھی اس ایجاد کرنے والے کو ہوگا۔

ایک سوال وجواب:

سوال یہ ہے کہ سنت کے مردہ ہونے سے پہلے کسی زمانہ میں اس سنت پر عمل رہا ہوگا تو ان عمل کرنے والوں کے اجر کے مثل اس شخص کو اجر ملے گا یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ: اس سنت کے متروک ہونے سے پہلے جو لوگ اس سنت کے عامل رہے ان کے عمل میں اس شخص کی کوئی کوشش شامل نہیں، اس لئے یہ شخص قبل الاماتۃ اجر کا مستحق نہیں ہوگا۔

لايرضاها الله ورسوله: یہ بدعۃ ضلالۃ کی صفت کاشفہ ہے۔

أوزارهم: وزر کی جمع ہے بمعنی گناہ۔

رواه ابن ماجة عن كثير بن عبدالله بن عمرو: اس میں عمرو سے مراد عمرو بن عوف ہیں، جو جلیل القدر صحابی ہیں اور کثیر بن عبد اللہ کو حضرت امام شافعیؒ أحد الكذابين کہا کرتے تھے۔(۲)

١٦١ / ٣١: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الدِّيْنَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْحِجَازِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا، وَلَيَعْقِلَنَّ الدِّيْنُ مِنَ الْحِجَازِ مَعْقِلَ الْأُرْوِيَّةِ مِنْ رَأْسِ الْجَبَلِ، إِنَّ الدِّيْنَ بَدَأَ غَرِيْباً وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ، فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ، وَهُمُ الَّذِيْنَ يُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ" (رواه الترمذي)(٣)

(١) المرقاة ١ / ٣٨٧.

(٢) المرقاة ١ / ٣٧٨.

(٣) أخرجه الترمذي في "الإيمان، باب ماجاء أن الإسلام بدأ غريبا" ٢ / ٩١.

ترجمہ: حضرت عمرو بن عوفؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ دین حجاز کی طرف اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح کہ سانپ اپنے بل کی طرف سمٹ آتا ہے اور دین حجاز میں اس طرح پناہ لے گا جیسے بکری پہاڑ کی چوٹی میں پناہ لیتی ہے اور دین ابتداء میں غریب تھا اور آخر میں غربت کی طرف ہی لوٹ آئے گا، پس خوشخبری ہے غریبوں کے لئے اور وہ، وہ ہیں جو (میری اس سنت) کی اصلاح کریں گے جس کو میرے بعد لوگوں نے خراب کردیا ہوگا'' (ترمذی)

تشریحِ حدیث

احوال عمرو بن عوف المزنی:

حضرت عمرو بن عوف بڑے درجہ کے صحابی ہیں، قدیم الاسلام ہیں، غزوۂ تبوک کے علاوہ تمام غزوات میں شریک ہوئے، تبوک میں اس لئے شریک نہ ہوئے کہ اس وقت ان کے پاس سواری نہیں تھی، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سواری مانگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معذرت فرمائی، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی ''وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ الآية'' حضرت معاویہ کے اخیر زمانے میں مدینہ منورہ میں ان کی وفات ہوئی ہے۔[1]

حجاز مقدس کی اہمیت اور بگاڑ کے زمانہ میں دین پر چلنے والوں کے لئے خوشخبری:

اس حدیث میں بھی اعتصام بالسنۃ کا بیان ہے اور حجاز مقدس کی فضیلت ہے، مضمون حدیث یہ ہے کہ قرب قیامت میں کفار اور ظالم و جابر لوگ بلاد اسلامیہ پر غلبہ پالیں گے اور اہل ایمان کا دین خطرہ میں پڑجائے گا، اس وقت مسلمان اپنے دین کو بچانے کے لئے حجاز اور پھر مدینہ طیبہ میں آجائیں گے وہاں ان کو پناہ ملے گی اور دین محفوظ رہے گا، نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ایسے فساد وفتن کے زمانہ میں جو دین پر قائم رہے گا اور سنتوں کا احیاء کرے گا اس کے لئے خوشخبری اور مبارکبادی ہے۔

الحجاز: عرب کی زمین دو قسم کی ہے: ایک زمین قدرتی طور پر کچھ بلندی پر واقع ہے اس کو ''نجد''

(۱) الإصابة ٤ / ٢٩٢.

کہاجاتا ہے اورایک زمین نشیب میں واقع ہے اس کو''تہامہ'' کہاجاتا ہے اوران دونوں کے درمیان کا حصہ ''حجاز'' کہلاتا ہے، حجاز کے معنی حائل کے ہیں، کہ یہ علاقہ نجد وتہامہ کے درمیان آڑ ہے، اس میں مکہ ومدینہ اوران کے آس پاس کے علاقے داخل ہیں۔

ليعقلن الدينمن الحجاز معقل الاروية: ایک بکری پالتو ہوتی ہے اورایک پہاڑی ہوتی ہے جس کو''اُرْوِيه'' کہتے ہیں، اس کی عادت ہوتی ہے کہ پہاڑ کی چوٹی میں اپنا گھر بنالیتی ہے، جب بارش آتی ہے تو وہ اپنے اس گھر میں پناہ لیتی ہے، اسی طرح گرمی اورسردی کے وقت اس گھر میں رہ کراپنا بچاؤ کرتی ہے۔[1]

''معقل'' اسم ظرف ہے، عقل يعقل عقولا؛ باب ضرب سے، بمعنی جائے پناہ۔

ایک تعارض اوراس کا حل:

اس حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ دین حجاز میں سمٹ کررہ جائے گا، اوراس سے قبل فصل اول کی آخری حدیث میں آیا تھا کہ مدینہ میں سمٹ کررہ جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اختلاف زمان پرمحمول ہے، دین اولاً سمٹ کرحجاز میں رہ جائے گا پھراورسمٹتے سمٹتے صرف مدینہ طیبہ میں رہ جائے گا۔

إن الدين بدأ غريباً: اس کامفہوم پہلے گذرچکا ہے۔

۱۶۲ / ۳۲: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ كَمَاأَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَالنَّعْلِ بِالنَّعْلِ،حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَن أَتٰى أُمَّهُ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ أُمَّتِي مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ، وَإِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ تَفَرَّقَتْ عَلٰى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً،وَتَفْتَرِقُ أُمَّتى على ثلاثٍ و سِبعِينَ ملةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِإلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً'' قَالُوْا: مَنْ هِيَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ؟ قَالَ: ''مَاأَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ''(رواه الترمذي[1]وَفِيْ رِوَايَةِ أَحْمَدَ، وَأَبِيْ دَاوُدَ[2] عَنْ مُعَاوِيَةَ: ثِنْتَان وَسَبْعُوْنَ فِي النَّارِ، وَوَاحِدَةٌ

(۱) اللمعات ۱ / ۴۹۲–۴۹۳.

(۲)اخرجه الترمذى فى أبواب الإيمان، باب ماجاء فى افتراق هذه الأمة ۲ / ۹۲.

(۳)أخرجه أبوداؤد فى كتاب السنة ، باب شرح السنة ۲ / ۶۳۱ واحمد فى مسنده (۱۶۹۳۷)، وقد رواه غير واحد من الصحابة ، منهم ابوهريرة ومعاوية بن ابى سفيان وعبد الله بن عمرو وغيرهم ، وصححه الترمذى وابن حبان (۱۴ / ۱۴۰)والحاكم (۱ / ۱۲۸)والمنذرى، والشاطبى فى الاعتصام (۲ / ۱۸۹)والسيوطى فى الجامع الصغير (۲ / ۲۰)وكذا جوده الزين العراقى فى تخريج احاديث الاحياء .

فِي الْـجَـنَّةِ، وَهِيَ الْجَمَاعَةُ، وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ فِي أُمَّتِي أَقْوَامٌ تَتَجَارَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَارَى الْكَلْبُ بِصَاحِبِه، لايَبْقَى مِنْهُ عِرْقٌ وَلامَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ"

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یقیناً میری امت پرایک زمانہ ایسا آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پرآیا تھا (دونوں میں ایسی مماثلت ہوگی) جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، حتی کہ بنی اسرائیل میں سے اگرکسی نے اپنی ماں سے اعلانیہ زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی ایسا شخص ہوگا جو یہ کام کرے گا، اوربنی اسرائیل بہترفرقوں میں تقسیم ہوگئے تھے اورمیری امت تہترفرقوں میں تقسیم ہوجائے گی اوروہ تمام فرقے جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے کہ وہ جنتی ہوگا، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کونسافرقہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جواس طریقہ پرہوگا جس پرمیں ہوں اورمیرے صحابہ ہیں، (ترمذی) اوراحمد وابوداود نے جوروایت حضرت معاویہؓ سے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: بہترفرقے جہنم میں جائیں گے اورایک فرقہ جنت میں جائے گا اوروہ فرقہ جماعت مسلمین ہے اورمیری امت میں کئی قومیں ایسی ہوں گی جن میں خواہشات (یعنی عقائد اوراعمال میں بدعات) اس طرح سرایت کرجائیں گی جس طرح ہڑک والے کتے کے کاٹے ہوئے میں ہڑک سرایت کرجاتی ہے کہ کوئی رگ اورکوئی جوڑباقی نہیں رہتا جس میں وہ سرایت نہ کرگئی ہو''

تشریح حدیث

امت محمدیہ کا بنی اسرائیل کے نقش قدم پر چلنا اور۷۳رفرقوں میں تقسیم ہونا:

یہ حدیث اعتصام بالسنۃ سے متعلق ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کو اختیارکرنے کااور اختلاف وافتراق سے بچنے کاحکم دیا، لیکن امت میں افتراق من جانب اللہ مقدرتھا اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیش گوئی فرمائی کہ: میری امت بنی اسرائیل کے نقش قدم پرچلے گی اوروہی طرز اختیارکرے گی جوبنی اسرائیل نے کیا جیسے ایک آدمی کاایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، ان میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اسی طرح یہ امت برائی میں بنی اسرائیل کے مساوی ہوگی اوران کی طرح اختلاف وتقسیم کاشکارہوگی،

بنی اسرائیل ۷۲رفرقوں میں منقسم ہوئے، میری امت ۷۳رفرقوں میں تقسیم ہوگی لیکن نجات پانے والا ایک ہی فرقہ ہوگا جو میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقے پر ہوگا۔

لیأتین: اس کا فاعل ''زمانٌ'' ہے جو مقدر ہے۔

حذو النعل بالنعل : یہ مثال عربی زبان میں دو چیزوں کی برابری ومساوات کو بیان کرنے کے لئے بولی جاتی ہے، اس کا اعراب نصب ہے مفعولِ مطلق ہونے کی بناپر، تقدیر عبارت یہ ہے: یحذو نهم حذوا مثل حذو النعل بالنعل.(۱)

اس امت میں بھی ماں سے زنا کیا جائے گا:

ان کان منهم من أتی أمه علانية :شراح حدیث نے فرمایا کہ یہاں ام سے موطوءۃ الاب یعنی سوتیلی ماں مراد ہے؛ کیونکہ حقیقی ماں سے زنا میں طبعی مانع موجود ہے،(۲) لیکن بہ تصریحِ حدیث ہر بعد والا زمانہ پہلے کے بہ نسبت زیادہ شر لئے ہوئے ہوگا، چنانچہ آج کے زمانہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ بعض لوگ اپنی حقیقی ماں سے زنا کے مرتکب ہوئے، انٹرنیٹ پر ایسے واقعات بتائے گئے، نیز تین سال قبل دہلی کے مضافات میں اسی طرح کے واقعہ کی خبر باقاعدہ اخبار میں شائع ہوئی، لہذا اس کو سوتیلی ماں پر محمول کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، اللہ تعالیٰ امت کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

سوال: بعض گناہ ایسے ہیں جو بنی اسرائیل نے کیے لیکن امت مسلمہ کے لئے وہ محال کے درجے میں ہیں جیسے قتلِ انبیاء، اسی طرح تحریف في کتاب الله اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا اور قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ لے چکے ہیں؟۔

جواب یہ ہے کہ اگر چہ یہ امت انبیاء کو قتل نہیں کرسکتی لیکن حضرات علماء وصلحاء انبیاء کے وارث ہیں اور امت نے ان کو قتل کیا ہے اور کتاب اللہ میں امت نے اگر چہ لفظی تحریف نہیں کی لیکن معنوی تحریف کی ہے، بالخصوص فرقِ ضالہ اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں یہ الگ بات ہے کہ علماء حقہ اس کو چلنے نہیں دیتے۔

افتراق کی مراد اور فرقہ بننے کی صورت:

وتفترق أمتي علی ثلاث وسبعین ملة: اس ''افتراق واختلاف'' سے مراد عقائد کا اختلاف وافتراق

(۱) طیبي ۱/ ۳۶۹.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۳۸۰.

ہے، فروع واعمال کا اختلاف مراد نہیں، اس لئے کہ اس اختلاف پر (سوائے فرقہ ناجیہ کے) دخول نار کی وعید بیان کی گئی ہے، جبکہ ائمہ مجتہدین کے اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے، مجتہد سے اگر خطا ہو جائے تب بھی وہ بہ مقتضائے حدیث ایک اجر کا مستحق ہے۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فرقے عقائد کے اختلاف سے بنتے ہیں، جو جماعت قرآن وسنت اور جماعت صحابہ سے عقائد میں مختلف ہو اس کو الگ فرقہ کہا جائے گا اور جن کے عقائد ان کے موافق ہوں وہ الگ فرقہ شمار نہیں ہوں گے، گو ان میں عملی وفروعی اختلاف پایا جاتا ہو، پس ائمہ اربعہ اوران کے متبعین الگ الگ فرقے شمار نہیں ہوں گے، کیونکہ فروع میں اختلاف کے باوجود وہ سب از روئے عقائد متحد ہیں۔

۷۳ر فرقوں کی تعیین:

یہاں شراح کے درمیان یہ بحث آئی ہے کہ اس امت میں ۷۳ر فرقے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ امت میں ۷۳ر سے بھی زیادہ فرقے ہوئے ہیں اور ۷۳ر سے کثرت مراد ہے، تحدید مقصود نہیں، بعض نے کہا کہ ۷۳ر ہی مقصود ہیں اور امت میں ۷۳ر فرقے ہوئے ہیں، پھر ہر ایک نے اپنے اپنے اعتبار سے ان کی تعیین کی ہے، ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ امت میں اصلاً آٹھ فرقے ہیں اور پھر ان میں متعدد شاخیں ہیں:

(۱) معتزلہ، پھر ان میں بیس فرقے ہیں (۲) خوارج، ان کے بھی بیس فرقے ہیں (۳) شیعہ وروافض، ان کے بائیس فرقے ہیں (۴) مرجئہ، ان میں پانچ ہیں (۵) نجاریہ، ان میں تین فرقے ہیں (۶) جبریہ (۷) مشبہہ (۸) ایک اہل سنت والجماعت، مگر یہ تعداد ظنی ہے اصل تو کثرت مقصود ہے۔(۱)

کلھم في النار: فرقۂ ناجیہ کے سوا سب جہنم میں جائیں گے، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، بلکہ اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ: ان میں جن کے عقائد حد کفر تک پہنچے ہوئے ہوں، مثلاً العیاذ باللہ قرآن کریم میں تحریف کا عقیدہ رکھتے ہوں، حضرت عائشہؓ کی برأت کو صحیح نہ مانتے ہوں وغیرہ، ایسے لوگ کفر میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مخلد فی النار ہونگے، اور جن کے عقائد کفر کی حد تک نہیں پہنچے ان پر فاسق ہونے کا حکم ہے، وہ اپنے جرم کی سزا کاٹ کر جنت میں داخل ہونگے، یہ شریعت کا اصول ہے

(۱) المرقاة ۱/ ۳۸۱.

البتہ حق تعالیٰ شانہ ان کو معاف فرمادے تو یہ امر آخر ہے، حق تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے: ویغفر مادون ذالک لمن یشاء.

فرقۂ ناجیہ کا مصداق اور نام وماٰخذ:

ماأنا علیه و أصحابی: ”ماانا علیه“ سے مراد سنت ہے، اور ”ماعلیہ اصحابی“ سے مراد اجماع صحابہ واجماع امت ہے، اور مطلب یہ ہے کہ: جو جماعت علماً اور عملاً میری سنت اور جماعت صحابہ کے طریقے پر ہوگی وہ نجات پائے گی، ”علماً“ کا مطلب یہ ہے کہ: سنت رسول اور اجماعِ صحابہ کو حجت تسلیم کیا جائے، پس جو جماعت سنت رسول کو علی الاطلاق حجت نہ مانے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، جیسا کہ اہل قرآن کا فرقہ، اور جو جماعت اجماع صحابہ کو حجت نہ مانے وہ ضال اور گمراہ ہے، اور ”عملاً“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت سنت رسول اور جماعت صحابہ کی عقائد واعمال میں پیروی کرنے والی ہو اور ان کے طریقہ کی متبع ہو، ایسے ہی لوگوں کو ”اہل السنۃ والجماعۃ“ سے موسوم کیا جاتا ہے، یہی اہل حق ہیں اور یہ نام اسی جملۂ حدیث سے ماخوذ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے جہاں فرقہ ناجیہ کا علم ہوتا ہے وہیں یہ جملہ امت کیلئے اتحاد واتفاق کا راستہ بھی بتلاتا ہے، یعنی سب جماعتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے طرزِ فکر وعمل کو اپنالیں، ظاہر ہے کہ پھر باہم کوئی اختلاف باقی نہیں رہے گا، نیز آپ علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ ارشاد موجودہ مختلف فرقوں اور جماعتوں میں حق وباطل کی شناخت وتمیز کے لئے معیار بھی ہے، اس کے ذریعہ پہچانا جاسکتا ہے کہ کونسی جماعت وفرقہ حق پر ہے اور کونسی جماعت وفرقہ باطل ہے۔

”دیوبندی“ کوئی فرقہ نہیں؟

یہاں یہ وضاحت بھی بہت مناسب ہے کہ ”دیوبندیوں“ کے نام سے جو جماعت مشہور ہے یہ الگ سے کوئی فرقہ وجماعت نہیں، بلکہ یہ اہل السنۃ والجماعۃ ہی کا ایک حصہ اور فرد ہیں، کیونکہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ فرقہ عقائد کے اختلاف سے بنتا ہے، اور اہل دیوبند کے عقائد قرآن وسنت اور جماعت صحابہ کے عین مطابق ہیں، لہٰذا دیوبندی حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کا کامل مصداق ہیں، ان کو دیوبندی فقط اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اہل السنۃ والجماعۃ کا بڑا مرکز دیوبند بنا اور اس کو ان کی ترجمانی کا شرف

حاصل ہوا، پس اسکو تسمية الشی باسم محله کہا جاسکتا ہے۔

افتراق کا سبب:

مسند احمد وابوداود میں یہ حدیث حضرت معاویہؓ سے منقول ہے، اس میں ثنتان وسبعون کے الفاظ ہیں اور جنتی فرقہ بڑی جماعت کو بتایا گیا ہے، نیز اس روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''تتجاری بهم تلک الاهواء کما یتجاری الکلب بصاحبه'' مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسے لوگ اور جماعات امت میں پیدا ہوں گی جن میں خواہشات اور بدعات اس طرح سرایت کر جائیں گی جس طرح کتے میں ہڑک سرایت کر جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ لوگوں پر جھپٹتا ہے، اس مثال سے امت میں افتراق کا سبب بھی معلوم ہو گیا کہ اس کا اصل سبب ہوگا خواہشات نفسانی، اس کی وجہ سے آدمی بدعت وگمراہی کو اختیار کرے گا، مثلاً اہل بدعت کے زمرہ میں داخل ہونے سے اس کو سرداری ملے گی، مال ودولت ہاتھ آئے گا وغیرہ اس قسم کی خواہشات اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ افتراق کی راہ پر چل پڑتا ہے۔

تتجاری: بمعنی دوڑنا، یہاں مراد ہے داخل ہونا اور سرایت کرنا۔

الاهواء: اس سے مراد ہیں خواہشات وبدعات۔

الکلب: بسکون اللام بمعنی کتا اور بفتح اللام کتے کا زہر، ہڑک، یہاں یہی مراد ہے۔(۱)

۱۶۳ / ۳۳: وَعَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''إِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِيْ - أَوْقَالَ: أُمَّةَ مُحَمَّدٍ - عَلٰى ضَلَالَةٍ، وَيَدُاللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّشُذَّفِي النَّارِ'' (رواه الترمذی)(۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ میری امت یا یہ فرمایا کہ امت محمدیہ کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت سے الگ ہے (وہ جنتیوں کی جماعت سے) الگ کر کے تنہا جہنم میں ڈالا جائے گا۔ (ترمذی)

(۱) المرقاة ۲ / ۳۸۲.

(۲) أخرجه الترمذي في كتاب الفتن، باب ماجاء في لزوم الجماعة ۲ / ۳۹.

تشریح حدیث

اجماع امت کی حقانیت، جماعت کے ساتھ تائید الٰہی کی شمولیت اوراس سے علیحدگی کی ممانعت

ماقبل میں اعتصام بالسنہ کا حکم تھا، آگے چند احادیث میں اعتصام بالجماعۃ کا حکم دیا جارہا ہے کہ بڑی جماعت کا اتباع کرو، چنانچہ اس حدیث میں فرمایا گیا کہ: اللہ امت محمدیہ کو ضلالت پر جمع نہیں کرے گا، یعنی امت محمدیہ اجماعاً واتفاقاً جو موقف اپنائیگی وہ حق ہوگا، یہ شرف صرف اس امت کو حاصل ہے، سابقہ امتوں کو یہ شرف حاصل نہ تھا۔

لایجمع أمتي أوقال امتی محمد: اس کی دوتفسیریں ہیں: (۱) بعض نے کہا کہ اس میں امت وجماعت سے علماء عاملین اورفقہائے مجتہدین مراد ہیں، عوام نہیں، یعنی کسی بھی زمانے کے علمائے عاملین وفقہائے مجتہدین گمراہی پر جمع نہیں ہوں گے، لہٰذا آدمی کو عمل وعقیدہ میں ان ہی کے ساتھ رہنا چاہئے، اسی لئے اس امت کا اجماع بھی حجت ہے، اس کی دلیل یہی حدیث ہے۔ یہی مطلب راجح ہے۔(۱)

(۲) بعض نے کہا کہ جماعت سے مراد یہ ہے کہ: مسلمانوں کی بڑی جماعت جس کو اپنا خلیفہ مقرر کرے تم بھی اس کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلو، مسلمانوں کی جماعت سے الگ نہ ہواور امور مملکت میں اسی کا اتباع کرو، دونوں مطلب درست ہیں کہ دونوں ہی مطلوب ہیں۔(۲)

علی ضلالة: بعض نے کہا کہ اس سے معصیت مراد ہے، علامہ ابہری نے کہا کہ خطا مراد ہے خواہ عمداً ہو یا بغیر عمد کے، دونوں تفسیروں کے لحاظ سے معنی یہ ہوئے کہ اساطین امت کا اتفاق معصیت اورخطاء پر نہیں ہوگا، ابن الملک نے فرمایا کہ یہاں امت سے امت اجابت مراد ہے مذکورہ حکم امت اجابت پر جاری ہے، کیونکہ قرب قیامت میں سب لوگ کافر ہونگے، لیکن ظاہر ہے کہ وہ امتِ اجابت نہ ہوگی۔(۳)

وید اللہ علی الجماعة: ''ید'' بمعنی نصرت وتائید، اللہ کی مدد ونصرت جماعت کے شامل حال ہوتی ہے، پس اللہ کی مدد سے مستفید ہونے کے لئے جماعت کے ساتھ رہنا چاہئے۔

(۱) المرقاة ۱/ ۳۸۲.

(۲) المرقاة ۱/ ۳۸۲-۳۸۳.

(۳) المرقاة ۱/ ۳۸۲-۳۸۳.

ومن شذ شذفی النار: اس میں جماعت مسلمین سے الگ ہونے والے کے لئے وعید ہے کہ جوشخص قول وعمل اورعقیدہ کے اعتبار سے ان سے الگ ہوگا تو قیامت میں اس کو اہل جنت سے الگ کرکے جہنم میں ڈال دیا جائے گا، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے: ''وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَیَتَّبِعْ غَیْرَسَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَ تْ مَصِیْراً'' اس میں عام مؤمنین سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرنے والے کو دخول جہنم کی وعید سنائی گئی۔

۱۶۴ / ۳۴: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "اِتَّبِعُوْاالسَّوَادَ الْأَعْظَمَ، فَإِنَّهُ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ"(رواه ابن ماجة من حديث أنس)[1]

ترجمه: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ''بڑی جماعت کی پیروی کرو اس لئے کہ جو جماعت سے الگ ہوا وہ تنہا آگ میں ڈالا جائے گا'' ابن ماجہ نے یہ حدیث حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔

تشریح حدیث

جماعت کے پیچھے چلنے کا حکم:

اس حدیث میں جماعت کے پیچھے چلنے کا حکم اور اس سے علیحدگی کی ممانعت کی گئی ہے۔

السواد: ''سواد'' کے اصل معنی سیاہی کے ہیں اور بڑی جماعت کو جب دور سے دیکھا جائے تو سیاہی سی معلوم ہوتی ہے، بڑی جماعت کے مصداق میں یہاں بھی وہی مذکورہ دو احتمال ہوں گے جو اس سے پہلے حدیث میں بیان کئے گئے یعنی علمائے عاملین یا خلیفۂ اکبر کو منتخب کرنے والے۔

۱۶۵ / ۳۵: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: "یٰابُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِيَ وَلَیْسَ فِيْ قَلْبِکَ غِشٌّ لِّأَحَدٍ فَافْعَلْ" ثُمَّ قَالَ: یَابُنَيَّ! وَذٰلِکَ مِنْ سُنَّتِيْ، وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِيْ فَقَدْ أَحَبَّنِيْ، وَمِنْ أَحَبَّنِيْ کَانَ مَعِيْ فِي

(۱)أخرجه الترمذی، کتاب الفتن ، باب ماجاء فی لزوم الجماعة ۲ / ۳۹وابن ماجه، الفتن، باب السواد الأعظم۲ / ۲۸۳.

الْجَنَّةِ" (رواه الترمذی)[1]

ترجمہ: حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا "اے میرے بیٹے! اگر تم ایسا کر سکو کہ صبح کرو اور شام کرو اس حال میں کہ تمہارے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہ ہو، تو ایسا کر لینا، پھر فرمایا اے میرے بیٹے! یہ میری سنت ہے، جس شخص نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا" (ترمذی)

تشریحِ حدیث

قلب کو "غش" سے پاک رکھنے کا حکم اور اس کی فضیلت واہمیت:

اس حدیث میں اعتصام بالسنہ کا بیان ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک سنت بیان فرمائی جس کا تعلق قلوب کی اصلاح سے ہے، وہ ہے اپنے دل کو سب کی طرف سے صاف رکھنا، کسی کی طرف سے کینہ نہ رکھنا، یہ نصیحت حضرت انسؓ کو فرمائی، حضرت انسؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے ان کے واسطہ سے یہ نصیحت تمام امت کے لئے ہے، چنانچہ فرمایا میرے بیٹے! اگر تو اس بات پر قادر ہو کہ تو صبح کرے اور شام کرے اس حال میں کہ تیرے قلب میں کسی کی طرف سے کینہ اور حسد نہ ہو، تو ایسا کر لینا، صبح وشام بول کر دوام اور جمیع وقت مراد لیا گیا ہے[2] کہ ہر وقت اپنے دل کو سب کی طرف سے صاف رکھو، اس سنت کو نہایت اہتمام سے اس لئے بیان فرمایا کہ معاشرہ کی اصلاح کا مدار اسی پر ہے، کیونکہ لوگ اگر اپنے قلوب کو کینہ ونفرت سے پاک رکھنے کا اہتمام کریں تو اتفاق واتحاد کی فضا قائم ہو کر صالح معاشرہ وجود میں آئے گا، پھر فرمایا کہ یہ میری سنت ہے اور اس پر صلہ اور انعام یہ ہے کہ جو میری سنت سے محبت کرے گا تو گویا اس نے مجھ سے محبت کی اور جو مجھ سے محبت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا، یہ بشارت محض سنت سے محبت پر ہے عمل بالسنہ کا درجہ ظاہر ہے کہ اس سے بھی زیادہ ہوگا، اور جنت میں ساتھ ہونے سے مراد ہمراہ داخل ہونا یا جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب رہنا ہے۔

(۱) أخرجه الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الأخذ بالسنة واجتناب البدع ۲/ ۹۶.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۳۸۴.

غَش: یہ نُصح کی ضد ہے یعنی میل، کدورت۔

١٦٦ / ٣٦: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:
"مَنْ تَمَسَّکَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ، فَلَهٗ أَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ" (رواه)(۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے میری امت میں بگاڑ کے وقت میری سنت کو تھامے رکھا اس کے لئے سو شہیدوں کا اجر ہے۔

تشریح حدیث

عام بگاڑ کے وقت عمل بالسنۃ کی فضیلت:

اس حدیث میں جہالت اور بدعت کے ماحول میں سنت پر عمل کی ترغیب اور اس کی خاص فضیلت مذکور ہے۔

عند فساد أمتي: فساد امت سے بدعت و جہالت کا غلبہ اور فسق و فجور کا شیوع مراد ہے(۲) اور اس قدر ثواب کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ماحول میں سنت پر عمل کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے جس طرح اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جان دینا بہت دشوار ہوتا ہے، پھر شہید تو ایک مرتبہ کی مصیبت اٹھا کر اللہ سے جاملتا ہے اور دنیا کے مصائب سے نجات پالیتا ہے لیکن مخالف ماحول میں سنت کا عامل اور سنت کا احیاء کرنے والا مخالفین کے طعن و تشنیع کو ہمیشہ سن سن کر برابر تکلیف میں رہتا ہے۔(۳)

---

(۱) مرقاۃ میں لکھا ہے: (رواه)بعده بياض، وألحق ميرک وغيره البيهقي في كتاب الزهد له من حديث ابن عباس، (المرقاة ١ / ٣٨٤)، وهو مخرج في الزهد الكبير للبيهقي (١١٨/١) وكذا أخرجه ابن بشر في الأمالي (٢١٨/١ و ٣٠٦/١) وابن عدي في الكامل (٩٠/٢)

وقد أخرجه الطبراني في "الأوسط" ٤ / ١١٩ برقم ٥٤١٤ وأبونعيم في "الحلية" ٨ / ٢٠٠ .عن أبي هريرة مرفوعا، ونصه: المتمسّک بسنتي عند فساد امتي له اجر شهيد، ورواه ابن بطة في الإبانة الكبرى (٣٤٤/١) عن عمر مرفوعا، ونصه: المتمسّک بسنتي عند فساد امتي له اجر خمسين شهيدا.

(٢) المرقاة ١ / ٣٨٤.

(٣) اللمعات ١ / ٤٩٨.

احکام شرعیہ کی انواع اوران کے امتثال کی کیفیت:

اس حدیث میں معنی ومضمون کے اعتبار سے احکام شرع کی پانچ قسمیں بیان فرمائیں اور ہرقسم کا جومطالبہ ہے اس کو بتایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزوں کوفرض فرمایا ہے اورکچھ آیات میں بہت سی چیزوں کی حرمت کو بیان کیا گیا ہے، نیز بہت سے احکام کی حدود مقرر کی گئی ہیں، مثلاً فرض نمازوں کی رکعات کی تعداد، فرض روزوں کی تعداد، احکام معاشرت میں جمع بین الاختین کا جائز نہ ہونا چارعورتوں سے زیادہ سے نکاح کا جائز نہ ہوناوغیرہ،اورکچھ چیزوں سے سکوت اختیارفرمایاہے لیکن بھول کی وجہ سے نہیں بلکہ مصلحت کی وجہ سے، پھرہرمضمون کامطالبہ الگ ہے کہ فرائض کو اداکیاجائے ان کو ضائع نہ کیا جائے اورمحرمات سے اجتناب کیاجائے، اورحدود مقررہ سے تجاوز نہ کیا جائے اورمسکوت عنہا اشیاء کے پیچھے مت پڑو مثلا قیامِ ساعت، آیات متشابہات، شب قدر وغیرہ۔ ان چیزوں کے متعلق نصوص میں جس قدر صراحت آگئی ہے اُس حدتک گفتگو صحیح ہے، اس حد سے متجاوز ہوکر اپنی عقل سے رائے زنی صحیح نہیں جیسا کہ ماقبل بھی آچکا ہے۔

کتاب العلم

کتاب الایمان مکمل ہوجانے کے بعد کتاب العلم کوشروع فرمارہے ہیں، اس بارے میں چند باتیں سمجھنا ضروری ہیں:

ماقبل ومابعد سے ربط:

ماقبل میں اعتصام بالکتاب والسنہ کا بیان تھا، کتاب وسنت خاص علوم میں سے ہیں، اب یہاں سے عام علوم کو بیان کیا جارہاہے، کیونکہ یہاں کتاب وسنت سے ثابت شدہ علوم فقہ اصول فقہ تفسیروغیرہ کا بھی بیان ہے، گویایہ تعمیم بعدالتخصیص کے قبیل سے ہے۔[1]

اورمابعد سے ربط یہ ہے کہ کتاب العلم کے بعد کتاب الطہارت یعنی احکام کابیان ہے اوراحکام سے پہلے علم کی اہمیت پہچاناضروی ہے اس لئے احکام کے بیان سے پہلے علم کوبیان کیا گیاہے۔

(۱) المرقاۃ ۱/ ۴۰۵.

علم کے لغوی معنیٰ:

العلم باب سمع کا مصدر ہے بمعنیٰ کسی چیز کو جاننا، اس کے قریب دوسرا لفظ ہے معرفت، علم اور معرفت میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟ راجح یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق ہے، کیا فرق ہے اس سلسلہ میں دو قول ہیں:

(۱) علم کہا جاتا ہے کلیات وجزئیات دونوں کے جاننے کو اور معرفت کہا جاتا ہے صرف جزئیات کے جاننے کو؛ اسی لئے اللہ کے لئے لفظ علم استعمال ہوتا ہے لفظ معرفت استعمال نہیں کیا جاتا ہے ورنہ وہم پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف جزئیات کا علم ہے۔(۱)

(۲) علم؛ ذات وصفات دونوں کے جاننے کا نام ہے اور معرفت؛ صرف صفات کے جاننے کو کہتے ہیں اس لئے عارف باللہ تو کہا جاتا ہے عالم باللہ نہیں بولا جاتا اس لئے کہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا۔

علم کے اصطلاحی معنیٰ:

اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ علم کی تعریف ممکن ہے یا نہیں؟ بہت سے علماء اس کو ناممکن کہتے ہیں پھر عدم امکان کے سبب میں ان کا اختلاف ہے:

(۱) امام الحرمین اور امام غزالیؒ نے فرمایا کہ: علم ایسی نظری شی ہے کہ جس کے جنس وفصل کا کسی کو پتہ نہیں ہے اور بغیر جنس وفصل کے تعریف ممکن نہیں۔

(۲) فخر الدین رازی نے فرمایا کہ: عدم امکان کا سبب علم کا انتہائی بدیہی ہونا ہے، اور بدیہی شے کی تعریف نہیں کی جاسکتی جیسے پانی۔(۲)

مگر بہت سے علماء نے اس کی تعریف کو ممکن کہا ہے، پھر تعریف میں بھی اختلاف ہے:

علامہ عینیؒ نے فرمایا کہ علم کی تعریفات میں سب سے زیادہ صحیح تعریف یہ ہے: ''أنه صفة من صفات النفس توجب تمییزاً، لایحتمل النقیض فی الأمور المعنویة''(۳) یعنی علم نفس کی صفات میں

(۱) عمدة القاری ۲/۳ مطبوعه دار الفکر بیروت.

(۲) عمدة القاری ۲/۴.

(۳) عمدة القاری ۱/۴، انظره لزاماً؛ فیه تفصیل حسن، ملاعلی قاریؒ نے فرمایا: ''العلم نور فی قلب المؤمن مقتبس من مصابیح مشكاة النبوة من الأقوال المحمدیة والأفعال الأحمدیة والأحوال المحمودیة یهتدی به إلی الله وصفاته وأفعاله وأحكامه؛ فإن حصل بواسطة البشر فهو كسبي وإلا فهو العلم اللدني المنقسم إلی الوحي والإلهام والفراسة''(المرقاة ۱/۴۰۵)

ایک ایسی صفت ہے جو امور معنویہ کے مابین ایسا امتیاز اور فرق پیدا کر دیتی ہے جس میں نقیض کا احتمال نہیں ہوتا، مطلب یہ ہے کہ علم اس صفت کا نام ہے جس کے نتیجہ میں معنوی اور غیر محسوس امور اس طور پر معلوم ہو جاتے ہیں کہ دوسرے کے ساتھ کوئی اشتباہ اور التباس باقی نہیں رہتا۔

علم کا مصداق:

یہاں جس علم کا بیان ہے اس سے شرعی و دینی علم مراد ہے، جس کا مصداق تین علوم ہیں، جیسا کہ آئندہ حدیث میں آرہا ہے: علم قرآن، علم سنت اور علم فقہ، قرآن وسنت کی اصطلاح میں "علم" سے یہی علم مراد ہوتا ہے، اسی کے جاننے والے کو "عالم دین" کہا جاتا ہے اور اس کے حاصل کرنے والے اور اس کو مقصد حیات بنانے والے کو "وارثِ انبیاء" کہا گیا ہے، دنیوی علوم وفنون جن کا مقصد دنیا اور اس کی ضروریات کی برآری اور سہولیات کا حصول ہے، وہ نہ یہاں مراد ہے اور نہ قرآن وسنت میں اس کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، ان علوم وفنون کی تحصیل واشتغال شرعی حدود میں رہتے ہوئے اگرچہ جائز ہے بلکہ از راہ ضرورت مطلوب بھی ہے، مگر قرآن وسنت میں علم کے جو فضائل ومناقب وارد ہوئے ہیں اور جس کے حصول واشتغال اور نشر واشاعت کی ترغیب دی گئی ہے وہ شریعت کا علم ہے نہ کہ دنیوی ضرورتوں کا علم، آئندہ جو احادیث آرہی ہیں ان سب کا موضوع شریعت کے علوم ہی ہیں۔

علم کی تقسیمات:

علم کی اولاً دو قسمیں ہیں: دینی اور دنیوی یہاں علم دینی کا بیان مقصود ہے، پھر علم دینی کی دو قسمیں ہیں علم تشریعی اور علم تکوینی:

(۱) تشریعی وہ علم ہے جس کا تعلق عالَم ظاہر کے ساتھ ہو اور وہ بندے کی اصلاح اور قرب الٰہی کا ذریعہ بنے جیسے قرآن وحدیث کا علم۔

(۲) علم تکوینی وہ علم ہے جس کا تعلق عالَمِ باطن کے ساتھ ہو جس سے واقعات وحالات کونیہ کا علم ہو جیسے خضر علیہ السلام کا علم، ان دونوں میں علم تشریعی کا درجہ بڑھا ہوا ہے کہ وہ قرب الٰہی کا ذریعہ ہوتا ہے۔

پھر علم تشریعی کی دو قسمیں ہیں: کسبی اور وہبی۔

(۱) کسبی وہ ہے جو محنت وکوشش سے اور استاذ کے واسطے سے حاصل ہو۔

(۲)علم وہبی وہ علم ہے: جس میں محنت وکوشش کو دخل نہ ہو، محض عطاء الٰہی پر موقوف ہو، اس کو ''علم لدنی'' بھی کہتے ہیں، جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا علم، ان کے بارے میں قرآن کریم میں ہے: ''وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْماً''[1] اوراس کے حصول کے ذریعے تین ہیں: (۱) وحی (۲) الہام (۳) فراست اور سمجھ۔

اور علم کی باعتبار انکشاف کے تین قسمیں ہیں علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔

(۱)علم الیقین وہ علم ہے: جو ترتیب مقدمات سے حاصل ہو، (۲) عین الیقین وہ علم ہے: جو مشاہدہ سے حاصل ہو (۲) حق الیقین وہ علم ہے: جو تجربہ سے حاصل ہو مثلاً کسی کو خبر ملی کہ آگ جلاتی ہے یہ علم الیقین ہے، پھر اس نے آنکھوں سے دیکھا کہ آگ کسی شئ کو جلارہی ہے یہ عین الیقین ہے، اور پھر خود اس کی انگلی جل گئی تو یہ حق الیقین ہے۔

نیز تحصیل علم کے حکم کے لحاظ سے علم کی دو قسمیں ہیں:

(۱) فرض عین: وہ علم ہے جس کا جاننا بقدر ضرورت ہر مسلمان مرد وعورت عاقل بالغ پر ضروری ہے، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے ضروری مسائل، اسی طرح عقائد، معاشرت وغیرہ کے مسائل جن پر عمل ضروری ہو اور روزمرہ کی زندگی میں جن حرام امور سے بچنا لازم ہے اس کا علم وغیرہ۔

(۲) فرض کفایہ: قدر ضرورت سے زیادہ علم حاصل کرنا فرض کفایہ ہے، جیسے عالم مفتی اور محدث بننا۔

نیز علم کی ایک تقسیم ہے: علم نافع اور علم غیر نافع:

(۱) علم نافع: وہ علم ہے جس کے مطابق عمل ہو، اور اس سے خشیتِ الٰہی پیدا ہو اور غیر نافع وہ علم ہے جس پر عمل نہو اور خوف وخشیتِ الٰہی دل میں پیدا نہ ہو، حدیث میں علم نافع کی دعا اور علم غیر نافع سے پناہ مانگی گئی ہے۔

الفصل الاول

۱۸۷ / ۱: عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْروٌ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً، وَحَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ وَلاحَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ"(رواه البخاري)[2]

(۱)من سورة الكهف: ٦٥.

(۲)أخرجه البخاري كتاب الأنبياء، باب ماذكر عن بني إسرائيل ١ / ٤٩١، الرقم ٣٣٤٢.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو، اور بنی اسرئیل سے (جو باتیں سنو) ان کو بیان کر سکتے ہو اس میں کوئی حرج نہیں، اور جو آدمی قصداً میری طرف جھوٹ کی نسبت کرے اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

تبلیغ دین کا حکم اوراس کے آداب:

اس حدیث میں تین جملے ہیں اور ہر جملہ مستقل حدیث کے درجے میں ہے:

بلغوا عني: یہ پہلا جملہ ہے اس میں علم کی تبلیغ وتعلیم کا حکم دیا گیا ہے، ''تبلیغ'' کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی انتہاء تک پہنچانا، اس کے مفہوم میں تحقیق اور ثبوت سند کے معنی بھی پائے جاتے ہیں، پس اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ میری آیات واحادیث دوسروں تک پہنچاؤ، دوسرے یہ کہ بلاتحقیق کے میری طرف سے کوئی بات بیان نہ کرو، اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر نہ کرو، حدیث میں یہ سب معانی ملحوظ ہیں۔(۱)

ولو آیة: یعنی دوسروں تک میری بات پہنچاؤ، گو ایک ہی آیت ہو، یعنی ضروری نہیں کہ تمام آیات واحادیث پہنچائی جائیں، اگر ایک آیت اور ایک بات یاد ہے تو اسی کو پہنچادو؛ کیونکہ تبلیغ کا وجوب بقدر علم ہوتا ہے۔

یہاں آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے ''ولو حدیثاً'' نہیں فرمایا، حالانکہ نشر علم کے لئے جس طرح آیات کی تبلیغ ضروری ہے اسی طرح تبلیغ احادیث بھی ضروری ہے؟

اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) اول یہ کہ تبلیغ آیت سے تبلیغ حدیث کا حکم بطریقۂ اولیٰ ثابت ہوگیا کیونکہ آیات قرآنیہ دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ تحریف سے محفوظ ہیں اس کے باوجود جب آیت کی تبلیغ کا حکم ہے تو حدیث کی تبلیغ بطریق اولی ضروری ہوگی۔(۲)

(۱)المرقاۃ ۱ / ۴۰۵.

(۲)شرح الطیبي ۱ / ۳۹۰.

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ آیات کا اہتمام زیادہ تھا تبلیغ حدیث کے مقابلہ میں، اس لئے کہ آیات قرآنیہ آپ کا معجزہ ہیں، پس منجانب اللہ جو چیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ قرار دی گئی اسکی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ زیادہ تھی، اسلئے ولو آیة فرمایا۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغِ آیات کا اہتمام زیادہ فرماتے تھے اس لئے کہ ان میں تواترلفظی ضروری ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ: یہاں آیت سے مفید بات مراد ہے اوراس کا مصداق آیات قرآنیہ بھی ہیں اوراحادیث بھی۔[1]

پھر یہاں ''آیة'' فرمایا ''کلمةً'' نہیں اس لئے کہ کلمہ بسااوقات مفید معنی نہیں ہوتا ہے۔

اسرائیلی روایات کے بیان کاحکم:

وحدثوا عن بنی اسرائیل الخ: آیات کے لئے لفظ ''تبلیغ'' استعمال کیا گیا اوراسرائیلی روایات کے لئے ''تحدیث'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہیں مطلقاً بیان کرنا خواہ سند کے ساتھ ہو یا بلا سند، کیونکہ بنی اسرائیل کی باتین سند کے ساتھ محفوظ نہیں ہیں، سند تو صرف امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی خصوصیت ہے۔

حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے شروع میں یہود نصاری کی کتب اور روایات میں غورکرنے اور ان کو بیان کرنے کی ممانعت فرمادی تھی کہ ایسا نہو کہ لوگ گمراہی کا شکارہو جائیں، پھرجب وہ اسلامی عقائد وتعلیمات میں پختہ ہوگئے تو آپ علیہ السلام نے ان کی کتب کے پڑھنے اور بیان کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی، پس ''**حدثوا عن بني اسرائيل ولا حرج** ''میں امر ترخیص واباحت کے لئے ہے، وجوب کے لئے نہیں ہے؛ البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے کہ بنی اسرائیل سے کونسی احادیث وروایات نقل کی جائیں اورکونسی نہیں، وہ تفصیل یہ ہے:

اسرائیلیات کی قسمیں:

علماء نے فرمایا کہ اسرائیلی روایات کی قسم کی ہیں:

(۱) المرقاة ۱/ ۴۰۶ .

(۱) بعض اسرائیلی روایتیں وہ ہیں جن کی قرآن وحدیث نے تصدیق فرمائی ہے جیسے ساحرین موسی کا ایمان لانا، فرعون کا غرق ہونا وغیرہ ایسی باتوں کو بیان کرنا بلاشبہ جائز ہے۔

(۲) بعض اسرائیلی روایات وہ ہیں جن کی قرآن نے تکذیب کی ہے اور قرآن میں ان کے خلاف صراحت موجود ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کا العیاذ باللہ کفر اختیار کرنا، داود علیہ السلام کا متہم بالزنا ہونا، اور موجودہ تورات میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بجائے حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ قرار دینا وغیرہ، ایسی روایات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

(۳) تیسری قسم وہ اسرئیلی روایات ہیں جن کی قرآن وسنت سے نہ تصدیق ہوتی ہے اور نہ تکذیب، قرآن وسنت ان کے بارے میں خاموش ہیں۔

ان تین اقسام میں سے پہلی اور تیسری قسم کی روایات کے بیان کی اجازت دی گئی ہے، دوسری قسم کی روایات کو بیان کرنا جائز نہیں ہے۔

ایک اشکال وجواب:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اشتغال بکتب الیہود والنصاری جائز ہے اور ماقبل کی روایت میں گزرا ہے کہ حضرت عمرؓ کو صحیفہ تورات پڑھنے سے منع فرمایا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کتابوں سے اشتغال جائز نہیں، دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں:

(۱) بنی اسرائیل کی کتب میں دو طرح کے مضامین تھے قصص وامثال اور احکام، قصص وامثال کو بیان کرنا تو جائز ہے کیونکہ ان میں عبرت وموعظت ہے، لیکن احکام کو بطور عمل نقل کرنا جائز نہیں اور حضرت عمرؓ کے نسخہ میں احکام مذکور تھے۔[۱]

(۲) ممانعت ابتدائے اسلام میں تھی خلط بالقرآن کے اندیشہ سے جبکہ حضرات صحابہ کے علم میں پختگی نہیں آئی تھی اور اسلامی احکام مقرر نہیں ہوئے تھے، جب اسلامی احکام مقرر ہوگئے اور اسرائیلی احکام پر عمل کا اندیشہ ختم ہوگیا تو ممانعت باقی نہیں رہی۔[۲]

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلاً حضرت عمرؓ کے طرز عمل پر رد تھا جس سے معلوم ہوتا تھا

(۱) یہ جواب ملا علی قاریؒ نے علامہ سید جمال الدین سے نقل فرمایا ہے، مرقاۃ ۱/۴۰۷ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند۔

(۲) المرقاۃ ۱/۴۰۷.

کہ نجات کے لئے سابقہ شرائع کی بھی ضرورت ہے، آپ نے اس کی تردید فرمائی کہ ہماری شریعت نجات کے لئے اور دینی ترقی کے لئے کافی ہے کسی اور شریعت کی حاجت نہیں۔

وضع حدیث پر وعید اور ایک باطل نظریہ کی تردید:

ومن كذب عليّ متعمداً: پہلے جملے میں تبلیغ دین کا حکم تھا، لہٰذا ممکن تھا کہ کوئی تبلیغ کے شوق میں جھوٹی اور بے سند باتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرے؛ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سخت وعید بیان فرمائی، چنانچہ فرمایا کہ جو شخص جان بوجھ کر میری طرف جھوٹی بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

عليّ: "علی" ضرر کے لئے آتا ہے اس کی بنا پر بعض صوفیاء وفرقۂ کرامیہ نے کہا کہ ایسی حدیث وضع کرنا حرام ہے جس میں دین کا نقصان ہو، لیکن دین کے فائدے کے لئے حدیث وضع کرنا جائز ہے جیسے اعمال کی فضیلت اور سورتوں کی فضیلت کے سلسلہ میں، مگر یہ موقف اور ان کا یہ استدلال درست نہیں، کیونکہ یہاں علی ضرر کے لئے نہیں، بلکہ شہرت کے لئے ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو شخص جھوٹ بات میری طرف اچھالے اور شہرت دے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، لہٰذا وضع حدیث بہر صورت حرام ہے، بلکہ علامہ شیخ ابو محمد جوینیؒ نے اس کو کفر قرار دیا ہے کیونکہ اس میں شریعت کا استخفاف ہے۔(۱)

متعمداً: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص موضوع حدیث غیر دانستہ طور پر بیان کردے تو وہ معذور سمجھا جائے گا، وہ اس وعید میں داخل نہیں ہوگا۔(۲)

فليتبوأ مقعده: یہ امر ہے لیکن معنیً خبر ہے مضمون کی صداقت کو بتانے کے لئے خبر کو انشاء سے تعبیر کیا ہے کہ جس طرح انشاء میں کذب کا احتمال نہیں ہوتا اسی طرح اس خبر میں کذب کا احتمال نہیں ہے۔(۳)

---

(۱) المرقاة ۱/۴۰۷ مطبوعه اشرفيه ديوبند.

(۲) مرعاة المفاتيح ۲/۶ مطبوعه مدار القبس للنشر والتوزيع، الرياض.

(۳) (فائدہ) من كذب عليّ متعمداً الخ مستقل حدیث ہے، ابن الصلاحؒ نے فرمایا یہ حدیث متواتر ہے اور احادیث میں اس سے زیادہ متواتر کوئی اور روایت نہیں ہے حضرات صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت اس حدیث شریف کو نقل کرتی ہے تقریباً ۶۲ صحابہؓ سے یہ حدیث مروی ہے جن میں عشرۂ مبشرہ بھی ہیں اس کے علاوہ کوئی اور ایسی روایت نہیں ہے جس کے روایت کرنے پر عشرۂ مبشرہ متفق ہوں، مرقاۃ ۱/۴۰۸ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند۔

١٨٨ / ٢: وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ وَالْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ، قَالَا: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ" (رواه مسلم)[1]

ترجمہ: حضرت سمرہ بن جندبؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص میری طرف نسبت کرکے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارے میں اس کا خیال ہو کہ وہ حدیث جھوٹی ہے تو وہ دو جھوٹے لوگوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ (مسلم)

تشریحِ حدیث

یہ حدیث دو صحابیوں سے مروی ہے، سمرۃ بن جندب اور مغیرہ بن شعبہ۔

احوال سمرہ بن جندبؓ:

آپ جلیل القدر صحابی ہیں، حلیف انصار ہیں، کثیر الروایۃ صحابی ہیں، فارس فتح ہونے کے بعد بصرہ چلے گئے تھے، جری اور بہادر تھے، ایک مرتبہ جہاد کے لئے انصار کے بچے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کئے گئے تو ایک لڑکے کو آپ نے جہاد میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی اور حضرت سمرہ کو منع کردیا، اس پر حضرت سمرہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے فلاں کو اجازت دیدی اور مجھے اجازت نہیں دی، حالانکہ اگر اس کا اور میرا مقابلہ ہو تو میں اس کو پچھاڑ دونگا، اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا مقابلہ کرایا، حضرت سمرہ نے اس کو پچھاڑ دیا، جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرہ کو بھی جہاد میں شرکت کی اجازت مرحمت فرمادی، ۵۹ھ میں بصرہ میں وفات ہوئی۔[2]

احوال مغیرہ بن شعبہ:

آپ جلیل القدر صحابی ہیں، ثقفی ہیں، غزوۂ خندق کے سال ۴ھ میں مسلمان ہوئے اور مدینہ طیبہ

(١) أخرجه مسلم، المقدمه، باب وجوب الرواية عن الثقات وترك الكذابين والتحذير من الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم ١ / ٧.

(٢) الإصابة ٢ / ٣٩٣.

کی طرف ہجرت کی اور بیعت رضوان میں شریک رہے،عرب کے ذہین لوگوں میں تھے،قبیصہ بن جابر کہتے ہیں کہ: میں مغیرہ کے ساتھ رہا، اگر مدینہ کے آٹھ دروازے ہوں اور بلاحیلہ کے ان سے نکلنا ناممکن ہوتب بھی مغیرہ آٹھوں دروازوں سے نکل سکتے تھے، ہرمشکل میں کوئی نہ کوئی راہ نکال لیا کرتے تھے، مضبوط قدوقامت رکھتے تھے، ایوان کسریٰ میں انہوں نے ہی کسری کو للکارتے ہوئے زبردست تقریر کی تھی،کوفہ میں رہنے لگے تھے اور وہیں ۵۰ھ میں بعمر ۷۰ رسال وفات ہوئی۔ (۱)

بیانِ حدیث میں حزم واحتیاط کی تاکید:

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث روایت کرنے میں حزم واحتیاط کو بیان فرمایا جسکا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی روایت کا حدیث نہ ہونا معلوم ہوتو اس کو بیان نہیں کرنا چاہئے، ورنہ بیان کرنے والا جھوٹا شمار ہوگا۔

یــــریٰ: اس میں دوضبط ہیں: یاء کے ضمہ کے ساتھ،''اراءۃ'' سے مجہول کا صیغہ ہے، اراءۃ بمعنی دکھانا، یہ ''یظن'' کے معنی میں ہوتا ہے، دوسرا ضبط یاء کے فتحہ کے ساتھ صیغہ معروف ہے جو''یعلم'' کے معنی میں ہے، یہ رأی سے ماخوذ ہے، معروف کی صورت میں معنی ہونگے کہ حدیث نہ ہونے کا یقین ہو پھر بھی اس کو حدیث کہہ کر بیان کرے وہ جھوٹا ہے اور مجہول کی صورت میں معنی یہ ہیں کہ حدیث نہ ہونے کا گمان ہو اس کے باوجود حدیث کے عنوان سے بیان کرے وہ جھوٹا ہے اول ضبط (مجہول) راجح ہے، اسلئے کہ اس میں احتیاط زیادہ ہے کیونکہ مجہول کی صورت میں مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر حدیث نہ ہونے کا گمان بھی ہو یعنی اگر اس بات کا شبہ بھی ہوجائے کہ یہ حدیث ہے یا نہیں تو بھی بیان نہیں کرنا چاہئے، ورنہ جھوٹا شمار ہوگا۔ (۲)

کذب: اس میں بھی دوضبط ہیں:

(۱) کذب صیغہ صفت کے ساتھ اس وقت ''أنہ'' کی ضمیر کا مرجع ''من'' ہوگا،جس سے مراد روایت کرنے والا ہے۔

(۲) کَذِبٌ مصدر اس وقت ضمیر حدیث کی طرف راجع ہوگی ،راجح ضبط اول ہے۔ (۳)

---

(۱) الإصابة ۵/ ۱۹۲-۱۹۴.

(۲) المرقاة ۱/ ۴۰۹.

(۳) المرقاة ۱/ ۴۰۹.

الکاذبین : ابونعیم اصفہانی نے اس کو تثنیہ کے ساتھ ضبط کیا ہے، یعنی یہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے ایک جھوٹا حدیث کو وضع کرنے والا اور دوسرا اس کو بیان کرنے والا، اور جمہور علماء نے اس کو صیغۂ جمع کے ساتھ ضبط کیا ہے یعنی یہ بیان کرنے والا جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے کہ دنیا میں بہت سارے جھوٹے ہیں ہر جھوٹا اپنی لائن سے جھوٹ بولتا ہے، یہ جھوٹی حدیث بیان کرنے والا علم کی لائن سے جھوٹ بول رہا ہے۔ (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ موضوع حدیث کو بیان کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اس پر سوال یہ ہے کہ حضرات محدثین موضوعات کو بیان کرتے ہیں تو ان حضرات کا یہ عمل کیونکر صحیح ہے؟

جواب یہ ہے کہ موضوع حدیث کو وضع کی نشان دہی کئے بغیر بیان کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وضع کی نشان دہی کر کے بیان کرنا جائز ہے، تا کہ لوگوں کو موضوع روایات کا علم ہو جائے اور وہ ان روایات پر عمل کرنے سے پرہیز کریں، حضرات محدثین موضوع روایات کو وضع کی نشاندھی کے ساتھ ہی بیان کرتے ہیں۔

۱۸۹ / ۳: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ يُرِدِاللّٰهُ بِهٖ خَيْراً يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ" (متفق عليه)(۲)

ترجمہ : حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ شانہ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطاء فرمادیتے ہیں اور میں "علم" کو تقسیم کرنے والا ہوں، دینے والا تو اللہ ہی ہے۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

احوال معاویہ بن ابی سفیانؓ:

جلیل القدر صحابی ہیں، بعثت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئے، فتح مکہ کے سال ایمان لائے، ان کے والد ابوسفیان القریشی ہیں، اور والدہ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ ہیں، بعض نے کہا کہ: حضرت معاویہؓ فتح مکہ سے

(۱) شرح النووی ۱/۷، المرقاۃ ۱/۴۰۹.

(۲) أخرجه البخاري في ثلاثة، مواضع: كتاب العلم، باب من يرد الله به خيراً يفقهه في الدين ۱/۱۶ الرقم ۷۲، وكتاب فرض الخمس، باب قول الله عزوجل فان لله خمسه وللرسول ۱/۴۳۹ الرقم ۳۰۱۶، وكتاب الاعتصام، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم لاتزال طائفة من أمتي الخ ۱/۱۰۸۷ الرقم ۷۰۱۹، ومسلم كتاب الزكاة، باب النهي عن المسئلة ۱/۳۳۳ الرقم ۱۰۳۷.

قبل عمرۃ القضاء کے موقعہ پر اپنے والد سے پہلے ہی مشرف باسلام ہوگئے تھے، مگر والد کے ڈر سے اسلام ظاہر نہیں کرتے تھے، فتح مکہ کے موقع پران کا اسلام ظاہر ہوا، ابوسفیان کے کئی بیٹے غزوۂ بدر واحد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں مشرکین کے ساتھ لڑنے کے لئے آئے ان میں سے کئی مارے بھی گئے، لیکن حضرت معاویہؓ کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں نہیں آئے، گویا کہ دل سے پہلے ہی مسلمان تھے، اسی وجہ سے آپ کو بڑا مرتبہ ملا ان کا شمار کاتبین وحی میں ہے آپ کی بہن حضرت ام حبیبہؓ ازواج مطہرات میں سے تھیں، بچپن سے ہی آپ میں آثار سیادت ظاہر تھے، فرماتے تھے کہ میں ایک مرتبہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے لئے وضوء کا پانی لے کر پہنچا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضوء کے دوران میری جانب دیکھ کر فرمایا کہ: اگر تو حاکم بنا تو اللہ کا خوف رکھنا اور عدل کرنا، فرمایا کہ: اسی وقت سے مجھے گمان ہونے لگا کہ میں حاکم بنایا جاؤں گا، حضرت عمرؓ نے ان کو ملک شام کا گورنر بنایا تھا، بعمر ۷۷ سال ماہ رجب ۶۰ھ میں ان کی وفات ہوئی، ان کے پاس حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ازار، چادر، قمیص، اور کچھ بال وناخن تھے، انھوں نے وصیت کی تھی کہ انتقال کے بعد مجھے آپ علیہ السلام کی قمیص پہنانا، چادر میں لپیٹنا، ازار پہننانا، اور میرے ناک، کان میں اور مواضعِ سجود میں بال اور ناخن رکھ دینا اور پھر ارحم الراحمین کے حوالہ کر دینا۔(۱)

فہمِ دین کا عطاء ہوجانا خیر کثیر:

اس حدیث میں فقاہت فی الدین کی ترغیب دی گئی ہے اور اس کی عظمت واہمیت کو واضح کیا گیا ہے، فقاہت اور فہم دین عظیم ترین نعمت ہے، اور اللہ کی رضاء وقرب کی علامت ہے کیونکہ کسی شخص کے بارے میں اللہ کا ارادہ کیا ہے؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا، مگر جس کو فہم دین کی دولت عطاء ہوگئی اس حدیث کے مطابق اس کے ساتھ خدا کو بالیقین خیر مطلوب ہے۔

امام محمد کو ان کی وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳ / ۱۶۲ مطبوعہ مؤسسة الرساله بیروت میں امام ذہبیؒ نے تقریباً ۴۰ صفحات میں آپکا ترجمہ لکھا ہے جو بہت مفید ترین باتوں پر مشتمل ہے من شاء فلیطالع۔

فرمایا؟ امام محمدؒ نے کہا کہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: محمد! اگر مجھے تیرے ساتھ خیر منظور نہ ہوتی تو میں تجھے دین کا فہم وعلم عطاء نہ کرتا۔(۱)

خیراً: اس میں تنوین برائے تعظیم ہے یعنی خیر عظیم اور خیر کثیر۔(۲)

یفقهه في الدین: شراح نے فرمایا کہ: یہاں لفظ فقہ علم فقہ یعنی فروعی احکام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس سے تمام علوم شرعیہ (تفسیر، حدیث، فرائض واحکام) مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو علوم دینیہ حاصل کرنے کی توفیق ملی اس کو منجانب اللہ خیر کثیر عطا کی گئی، یہی معنی راجح ہیں، معلوم ہوا کہ دین کی سمجھ عظیم ترین نعمت ہے، اس کے مقابلہ میں تمام نعمتیں ہیچ ہیں، کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی میراث ہے اور فرشتے بھی ایسے شخص کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس حدیث سے تمام لوگوں پر علماء کی فضیلت اور تفقہ فی الدین کا تمام علوم سے افضل ہونا ظاہر ہے۔(۳)

انـمـا أنا قاسم و الله یعطی: اس جملہ کا تعلق یا تو علم کے ساتھ ہے یا مال کے ساتھ، اول صورت میں یہ ایک شبہ کا جواب ہے، کسی کو یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مخزنِ علوم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو زیادہ سکھائیں گے اس کو زیادہ علم حاصل ہوگا؟ اس شبہ کا جواب دیا کہ میں مجلس میں سب کے سامنے برابر بیان کرتا ہوں، بعض لوگ اپنی خداداد فہم کی وجہ سے علم زیادہ حاصل کرلیتے ہیں گویا کہ علم کی کمی وزیادتی من جانب اللہ ہے، یہ مطلب راجح ہے۔(۴)

لیکن امام مسلمؒ نے اس حدیث کو کتاب الزکاۃ میں اور امام بخاری نے باب الخمس میں ذکر کیا ہے، اس لحاظ سے اس حدیث کا تعلق مال سے ہوا، جس کا پس منظر یہ ہے کہ غزوۂ حنین میں بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کو ملا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو انکی تالیفِ قلب کے لئے زیادہ دیا کیونکہ من جانب اللہ ایسا ہی حکم تھا، اس پر کچھ کم سمجھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ مکہ والوں کو مال زیادہ دیا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: إنـمـا انـاقـاسم و الله یعطی کہ میں تو تقسیم کرنے والا ہوں دینے والا حقیقت میں اللہ ہے، اللہ کی طرف سے جس کو جس قدر دینے کا حکم ہوتا ہے میں اسی کے مطابق دیتا ہوں۔

(۱) اعلاء السنن ۲۱/۱۱.

(۲) المرقاة ۱/۴۱۰.

(۳) المرقاة ۱/۴۱۰، فتح الباری ۱/۱۲۴.

(٤) شرح الطیبی ۱/۳۹۳. فتح الإله ۲/۵۳ مطبوعه دار الکتب العلمیه بیروت لبنان.

١٩٠ / ٤ : وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا" (رواه مسلم)(١)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسانوں کی کانیں ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں اگر وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔ (مسلم)

تشریح حدیث

فقاہت فی الدین؛ فطری صلاحیتوں میں نکھار اور ترقی کا ذریعہ:

اس حدیث پاک میں فقہ فی الدین کی ترغیب ہے اور خلقی اوصاف کے لحاظ سے لوگوں کے مختلف المرتبۃ ہونے کا بیان ہے، خلاصہ یہ ہے کہ تمام انسانوں میں کچھ نہ کچھ اچھی صفات ہوتی ہیں گو آدمی کافر ہو، اسلام لانے اور اس کی تعلیمات سے اپنے آپ کو آراستہ کرلینے سے ان صفات میں مزید نکھار اور جلا پیدا ہوجاتا ہے، اسلام میں ان صفات کا اعتبار ہے، انھیں صفات کے لحاظ سے لوگ مختلف مرتبہ کے ہوتے ہیں ایسا نہیں کہ تمام لوگوں کو ایک ہی مرتبہ کا شمار کیا جائے۔

الناس معادن : معادن، معدن کی جمع ہے، بمعنیٰ کان جہاں سونا، لوہا، تانبا وغیرہ قدرتی ذخائر نکلتے ہیں، معنی یہ ہیں کہ لوگوں کی فطری صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں جیسے کانیں مختلف ہوتی ہیں۔(٢)

سوال: الناس ذو العقل مبتدا ہے اور معادن غیر ذی العقل خبر ہے اور خبر کا مبتدا پر حمل ہوتا ہے، تو غیر ذوی العقل کا حمل ذو العقل پر ہو رہا ہے، جو جائز نہیں ہے؟

جواب یہ ہے کہ: یہ کلام تشبیہ ہے نہ کہ حقیقت، تقدیر عبارت یہ ہے: "**الناس مثل المعادن كمعادن الذهب والفضة**" اور وجہ شبہ میں دو احتمال ہیں:

(ا) ظرف ہونا جواہر نفیسہ کے لئے، کہ جس طرح کان ظرف ہوتی ہے جواہر نفیسہ کے لئے، اسی طرح

(١) اخرجه مسلم كتاب الفضائل، باب خيار الناس ٢/ ٣٠٧ الرقم: ٢٥٢٦.

(٢) كتاب الميسر للتوربشتي ١/ ٩٨ ط: مكتبه نزار المصطفى الباز، مكة المكرمة.

لوگ بھی اچھی صلاحیتوں اورعلوم لطیفہ کے لئے ظرف ہیں، نیز جس طرح سونے چاندی وغیرہ کو پگھلاکر مختلف قسم کے زیورات تیار کئے جاتے ہیں اسی طرح تعلیم وتربیت کے ذریعہ انسان کو قابل بنالیا جاتا ہے۔

(۲) دوسری وجہ شبہ تفاوت ہے کہ جس طرح کانوں کی حیثیت میں تفاوت ہوتا ہے ایسے ہی لوگوں کی صلاحیت میں بھی تفاوت ہوتا ہے، کسی شخص میں کوئی صلاحیت، کسی میں دوسری صلاحیت ہر انسان میں عموماً کوئی نہ کوئی صلاحیت ضرور رہوتی ہے، اس کارخانۂ عالم میں اللہ نے کسی کو بیکار پیدا نہیں فرمایا۔ (۱)

خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام: اس جملہ میں بتایا جارہا ہے کہ لوگوں کی مختلف صلاحیتوں اوراخلاق کا اسلام میں بھی لحاظ ہے، سب کو ایک درجہ میں شمار نہیں کیا جائے گا، بعض لوگوں میں خلقی اورفطری طور پر بہت استعداد ہوتی ہے مثلاً شجاعت، سخاوت، ذہانت، وغیرہ اعلی اوصاف ان میں ہوتے ہیں، انہی اوصاف کی وجہ سے ان کو معاشرہ میں بڑا سمجھا جاتا تھا، پھر ایسے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تو اب بھی ان کو خیار سمجھا جائے گا، بلکہ اسلام کا نور ان کے خلقی اوصاف کے ساتھ مل کر ان کو مزید بڑے درجہ والا بنادے گا، بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ پیدا کرلیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جاہلیت میں جو اپنے قبیلہ کا سردار تھا اوراس نے اسلام قبول کرلیا اوراسلام لانے کے بعد فقاہتِ دین حاصل کرلی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو ان کے قبیلہ کا سردار بناتے تھے، ہاں اگر کوئی پہلے خیار شمار ہوتا تھا اور دوسرا ادنیٰ تھا دونوں اسلام لائے لیکن صرف ادنی نے دین کا علم حاصل کیا، تو اب اس ادنی کو افضل وبرتر شمار کیا جائے گا۔ (۲)

فہم دین کی شان:

اذا فقهوا: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرف وفضیلت کا مدار فقاہت وفہم دین پر ہے نہ کہ نفسِ صفات کمالیہ پر، پس اگر کوئی شخص دورِ جاہلیت میں اعلیٰ انسانی صفات کا حامل ہونے کی وجہ سے خیار شمار کیا جاتا تھا لیکن اسلام کے سایہ میں آنے کے باوجود انہی سابقہ صفات پر اکتفاء کر کے بیٹھ جائے اور فقاہت وفہم دین حاصل نہ کرے تو پھر محض سابقہ اوصاف حمیدہ کی بناء پر وہ خیار وبرتر شمار نہیں ہوگا۔

---

(۱) شرح الطیبی ۱/۳۹٤ مطبوعه زکریا دیوبند، مرقاة ۱/٤۱۱ مطبوعه اشرفیه دیوبند، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ نے "التعلیق الصبیح" ۱/۱۴۱ میں نووجوہات تشبیہ ذکر فرمائی ہیں من شاء فلیطالع.

(۲) المفاتیح فی شرح المصابیح للمظهری الحنفی ۱/۳۰۲ مطبوعه ادارة الثقافة الإسلامية، التعليق الصبيح ۱/۱٤۱ مطبوعه مكتبه فخريه ديوبند.

١٩١ / ٥: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لاحَسَدَ إِلَّافِيْ اِثْنَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالاً فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهٖ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا" (متفق عليه)(١)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ حسد (درست) نہیں لیکن دوشخصوں کے بارے میں: ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ شانہ نے مال دیا پھراللہ تعالیٰ نے اس کوحق کے راستہ میں خرچ کرنے کی توفیق عطا کی، دوسرا وہ انسان جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دیااوروہ اس علم کے مطابق فیصلہ کرتا ہےاوردوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔(بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

دولوگوں پرحسد کی اجازت:

اس حدیث میں دوشخصوں کی فضیلت مذکورہے ان میں سے ایک وہ ہے جوعلم دین سکھانے میں مشغول رہتاہو،اسی مناسبت سے یہ حدیث یہاں آئی ہے، دوسرا وہ شخص جوخیر کے کاموں میں خرچ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، ہرکارخیر میں خوب بڑھ چڑھ کرخرچ کرتا ہے۔

حسد کامفہوم اورحسد ورشک میں فرق:

لاحسد إلافي إثنين: حسد کہتے ہیں: کسی کے پاس نعمت دیکھ کراس کے زائل ہونے کی تمنا کرنا، محققین کے نزدیک اس نعمت کے اپنی طرف منتقل ہونے کی تمنا کرنا حسد کے مفہوم میں داخل نہیں ہے، اگرچہ بعض حضرات نے انتقال کی تمنا کی بھی قید لگائی ہے،مگرراجح یہ ہے کہ یہ قید نہیں ہے، کسی کے پاس نعمت

(١) أخرجه البخاري في أربعة مواضع، كتاب العلم، باب الاغتباط في العلم والحكمة ١ / ١٧ الرقم ٧٤.

وكتاب الزكاة، باب انفاق المال في حقه ١ / ١٨٩ الرقم ١٣٩١، وكتاب الأحكام، باب أجرمن قضى بالحكمة الخ ٢ / ١٠٥٧ الرقم ٦٨٥٨ والاعتصام، باب ماجاء في اجتهاد القضاء بماانزل الله لقوله تعالى ومن لم يحكم بماانزل الله فأولئك هم الظلمون ٢ / ١٠٨٨ الرقم ٧٠٢٣.

ومسلم كتاب فضائل القرآن ومايتعلق به، باب مقتل من يقوم بالقرآن ويعلمه وفضل من تعلم حكمة من فقه أوغيره فعمل بها وعلمها ١ / ٢٧٢ الرقم ٨١٦.

دیکھ کر اپنے لئے بھی اس کے حصول کی تمنا کرنا غبطہ اور رشک کہلاتا ہے۔[1]

اشکال: حسد حرام ہے اور اللہ کی تقدیر پر اعتراض ہے پھر یہاں حدیث میں حسد کی اجازت کیسے دی گئی ہے؟ اس کے دو جواب ہیں:

(۱): یہ قضیہ نافیہ فرضیہ ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو شخصوں پر جائز ہوتا، جیسے آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں حکم کرتا کہ عورتیں اپنے شوہر کو سجدہ کریں۔[2]

(۲): یہاں حسد سے مراد غبطہ و رشک ہے جس کا بیان اوپر گذرا، یعنی کسی کے پاس نعمت دیکھ کر اس کے پاس سے زوال کی تمنا کئے بغیر اس کے مثل کی اپنے لئے تمنا کرنا، اس میں اللہ سے اس نعمت کے مثل کی اپنے لئے دعا ہے، ظاہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ جس نعمت کی تمنا ہے اگر وہ دینی ہو تو یہ تمنا مستحب ہے اور اگر دنیوی ہو تو مباح ہے، گویا کہ لفظِ حسد اپنے معنی میں نہیں ہے۔[3]

لیکن اس پر سوال ہے کہ غبطہ تو ہر چیز میں جائز ہے پھر انہی دو کے ساتھ کیوں خاص کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حصر سے ماعدا کی نفی کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ حصر کا مقصود ان دو نعمتوں کی اہمیت بیان کرنا ہے کہ غبطہ کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ دو نعمتیں ہیں۔

علی هلکته في الحق: ہلاک کرنے سے خرچ میں مبالغہ کرنا مراد ہے اور فی الحق کی قید لگا کر اسراف کو نکال دیا اور بعض نے کہا کہ اس سے مراد اخلاص کے ساتھ خرچ کرنا ہے۔[4]

۱۹۲ / ٦: وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : "إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهٗ إِلاَّ مِنْ ثَلاثَةٍ: إِلاَّ مِنْ صَدَقَةٍ جَارِیَةٍ، أَوْعِلْمٍ یُنْتَفَعُ بِهٖ، أَوْوَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْلَهٗ"(رواه مسلم)[5]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

(۱) المرقاة ۱ / ٤۱۱.

(۲) مرقاة ۱ / ٤۱۱ مطبوعه اشرفیه دیوبند.

(۳) مرقاة ۱ / ٤۱۱ مطبوعه اشرفیه دیوبند.

(٤) المرقاة ۱ / ٤۱۱.

(٥) أخرجه مسلم، کتاب الوصیة، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاته ۲ / ٤۱ الرقم: ۱٦۳۱.

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل کے ثواب کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے؛ لیکن تین اعمال کے ثواب کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے (۱) صدقہ جاریہ (۲) وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا رہے (۳) اور نیک اولاد جو مرنے کے بعد اس کے لئے دعا کرے۔ (مسلم)

تشریح حدیث

وہ اعمال جن کا ثواب بعد ازمرگ بھی جاری رہتا ہے:

اس حدیث میں کئی جملے ہیں، ان میں ایک جملہ علم سے متعلق ہے، اسی لحاظ سے باب سے مناسبت ہے، روایت کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے، جب اس دنیا سے دار آخرت کی طرف چلا جاتا ہے تو عمل کرنے کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے اس لئے ثواب کا سلسلہ بھی ختم ہوجاتا ہے، لیکن تین عمل ایسے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان پر ثواب ملتا رہتا ہے، وہ تین عمل یہ ہیں: (۱) صدقۂ جاریہ (۲) علم نافع، (۳) ولد صالح۔

(۱) من صدقة جارية: صدقۂ جاریہ وہ صدقہ ہے جس کا نفع جاری وساری رہے، مثلاً مسجد بنوانا مدرسہ بنوانا وغیرہ کہ جب تک یہ مسجد ودرسگاہ باقی اور آباد رہیں گے، اس وقت تک بانی کو ثواب ملتا رہے گا اسی طرح کنواں کھدوادیا، نل لگوایا، کہ جب تک لوگ اس کنویں یا نل سے پانی پیتے رہیں گے اس وقت تک اس کو ثواب ملتا رہے گا۔

(۲) أو علم ينتفع به: ایسا علمی کام جس کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہے مثلاً اخلاص سے دینی کتاب تصنیف کرنا، شاگردوں کا سلسلہ جاری کرنا وغیرہ۔

(۳) أو ولد صالح يدعو له: والدین کی تربیت کی وجہ سے اولاد اگر نیک بن جائے تو اولاد کے اعمال کا ثواب بلانیت کے بھی والدین کو بھی ملے گا، بعض نے کہا کہ: "یدعو لہ" کی قید احترازی ہے چنانچہ والدین کو ثواب اس وقت ملے گا جب اولاد ان کیلئے دعا کرے، لیکن جمہور کے یہاں یہ قید تحریض وترغیب کیلئے ہے، اولاد کو ترغیب دینا مقصود ہے کہ وہ اپنے والدین کے لئے دعاء کا اہتمام کرے، اگر دعا نہ بھی کرے تب بھی ولدِ صالح کے عمل کا ثواب والدین کو ملے گا، کیونکہ اولاد کے صالح بننے میں والدین کی تربیت کو دخل ہے جیسے کوئی شخص کسی کے درخت سے پھل کھاوے اور مالک کی طرف سے دلالۃً اجازت ہوتو

اس کا ثواب درخت لگانے والے کو بہر دو صورت ملتا ہے خواہ کھانے والا دعا کرے یا نہ کرے۔[۱]

ایک تعارض اوراس کا حل:

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اس سے پہلے حدیث آئی ہے کہ سنت حسنہ جاری کرنے پر جاری کرنے والے کو ثواب ملتا رہے گا گو وہ مرجائے، جبکہ یہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ صرف تین اعمال ایسے ہیں کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد جاری رہتا ہے، لہٰذا دونوں حدیثوں میں تعارض ہے؟

اس کے دو جواب ہیں: (۱)ایک یہ کہ سنت حسنہ "علم ینتفع" بہ میں داخل ہے، کیونکہ سنت حسنہ سے بھی علمی سلسلہ کی طرح لوگوں کو دینی فائدہ ہوتا ہے۔

(۲) یہاں حدیث میں جو حصر ہے وہ حصر ادعائی اور حصر اضافی ہے، جس میں ماعدا کی نفی نہیں ہوتی فلا اشکال۔[۲]

١٩٣ / ٧: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ، وَاللّٰهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقاً يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْماً سَهَّلَ اللّٰهُ لَهُ بِهِ طَرِيْقاً إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِنْ بُيُوْتِ اللّٰهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ، إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ، وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ" (رواه مسلم)[۳]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(۱) شرح مصابيح السنة لابن الملك الرومي الحنفي ١ / ١٩٣.

(٢) المرقاة ١ / ٤١٣.

(٣) أخرجه مسلم "كتاب الذكر والدعاء والتوبة والإستغفار باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر ٢ / ٣٤٥ الرقم ٢٦٩٩"

''جوشخص دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت کسی مومن سے دورکرے تو اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی مصیبتوں میں سے ایک بڑی مصیبت کودورکردیگا،اورجس شخص نے کسی مسلمان کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ شانہ دنیاوآخرت میں اسکی پردہ پوشی فرمائے گا،اوراللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کی مدد کرتا ہے جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے اورجوشخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے تو اللہ اسکے بدلہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں، اورنہیں جمع ہوتی کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر (مسجد مدرسہ وغیرہ) میں مگران پر اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے سکینہ نازل ہوتا ہے اوراللہ تعالیٰ کی رحمت ان پرچھاجاتی ہے اورفرشتے ان کواپنے گھیرے میں لے لیتے ہیں اوران کاذکراللہ تعالیٰ اس مخلوق میں کرتے ہیں جواللہ تعالیٰ شانہ کے پاس ہے، (یعنی ملائکہ میں) اورجس شخص کواس کاعمل (بڑے درجہ سے) پیچھے کردے اس کانسب اس کوآگےنہیں بڑھاسکے گا'' (مسلم)

تشریح حدیث

اس حدیث پاک میں کئی اعمال کی ترغیب وفضیلت بیان کی گئی ہے ان میں سے ایک عمل طلب علم بھی ہے اسی وجہ سے یہ روایت کتاب العلم میں لائی گئی ہے۔

کسی کی پریشانی دورکرنے کی فضیلت:

من نفس عن کربة: نفّس بمعنی ہٹانا، دورکرنا، کربة: مصیبت اورغم۔

حضرات شراح نے فرمایا کہ: پہلے کربۃً کی تنوین تقلیل وتحقیر کے لئے ہے اوردوسرے کی تعظیم کے لئے ہے، مطلب یہ ہے کہ جوشخص دنیامیں کسی کی معمولی سی مصیبت بھی دورکرے گا اللہ سبحانہ وتعالیٰ روز قیامت اس کی بڑی مصیبت دورفرمائیں گے۔(۱)

اس پراشکال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے یہاں توایک نیک عمل پردس گنا اجر ملتا ہے، ''مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا '' یہاں اس نے ایک مصیبت دورکی تو اس سے بھی ایک مصیبت ہٹادی گئی جبکہ مذکورہ آیت کاتقاضہ تو یہ ہے کہ دس مصیبتیں دورکی جاتیں؟

(۱) شرح الطیبی ۱ / ۳۹۹ مطبوعہ زکریا دیوبند.

جواب یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کی زیادتی کبھی تو کمیت کے اعتبار سے ہوتی ہے اور کبھی باعتبار کیفیت کے ہوتی ہے، یہاں زیادتی کیفیت کے لحاظ سے ہے اور معنی یہ ہیں کہ جس شخص نے دنیا میں کسی کی معمولی مصیبت دور کی آخرت میں اس کی بڑی مصیبت دور ہوگی، گویا کہ وہ ایک بڑی مصیبت دس چھوٹی مصیبتوں کے قائم مقام ہوگی۔(۱)

تنگ دست کو مہلت دینے کی فضیلت:

ومن یسر علی معسر: ''معسر'' بمعنی غریب وتنگ دست، خواہ مومن ہو یا کافر، اور ''یسّر'' سے قرض کی ادائیگی میں آسانی پیدا کرنا مراد ہے، جس کے مختلف درجات ہیں: اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ کل یا بعض قرض معاف کردیا جائے اور ادنیٰ یہ ہے کہ اس کو مہلت دیدی جائے اور اگر مہلت دی ہوتی ہے تو اس میں اضافہ کردیا جائے دونوں محمود ہیں **کماقال اللہ تعالیٰ وَاِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ وَاَنۡ تَصَدَّ قُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ.**

یعنی اگر قرض لینے والا تنگ دست ہو تو اسے وسعت حاصل ہونے تک مہلت دی جائے اور معاف کرنا تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔(۲)

ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ امم سابقہ میں ایک مالدار تھا اس نے اپنے خادم سے کہہ رکھا تھا کہ ہمارا قرض اگر کسی غنی کے پاس ہو تو اس کو مہلت دے دو، اور اگر کسی غریب پر ہے تو اس کو معاف کر دینا، جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے پاس کیا نیک عمل ہے اس نے کہا کہ اے بار الٰہ! کچھ نہیں، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ غور کرلو، اس نے کہا کہ بس اتنا تو ہے کہ میں دنیا میں تجارت کرتا تھا، میرا معمول یہ تھا کہ اپنے حق کو تنگ دست سے معاف کردیتا اور صاحبِ وسعت کو (ضرورت کے وقت) مہلت دیدیتا، اللہ نے فرمایا معاف کرنے کا میں زیادہ حقدار ہوں، چنانچہ اللہ نے اس کو معاف فرمادیا اور جنت عطا فرمادی۔(۳)

---

(۱) مرقاۃ ۱/ ۴۱۴ مطبوعہ اشرفیہ دیوبند.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۴۱۴، وھذہ الآیۃ من سورۃ البقرہ: ۲۸۰.

(۳) مشکوۃ ص ۲۴۳ بحوالہ بخاری ومسلم.

پردہ پوشی اور ستر پوشی کی فضیلت:

ومن ستر مسلما: اس جملہ کے دومطلب ہیں:

(۱) جس شخص نے کسی مسلمان کے عیب اور برائی کو چھپایااوراس کو رسوانہیں کیا تو دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ شانہ اس کی پردہ پوشی کرے گا یعنی اہلِ محشر کے سامنے اس کے عیوب کو ظاہر نہیں کرے گا،البتہ پردہ پوشی کا حکم ایسے گناہوں میں ہے جن میں لوگوں کا ضرر نہ ہو، اگراس برائی میں لوگوں کا ضرر ہے تو ایسے شخص کو اولاً تنہائی میں سمجھانا چاہئے تاکہ وہ اس برائی سے باز آئے، پھربھی نہ مانے تو اس کے بارے میں ایسے شخص کو بتایا جائے جو اس کو برائی سے روک سکے جیسے بادشاہ، قاضی وغیرہ، اس سے غیبت کی ممانعت بھی معلوم ہوئی، کیونکہ غیبت پردہ پوشی کے خلاف ہے۔

(۲) اس سے مراد کسی غریب انسان کو کپڑا پہنانا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جوشخص کسی ننگے مسلمان کے ستر کو چھپائے تو اللہ دنیا وآخرت میں اس کے عیوب چھپائے گا اور ستاری کرے گا۔(۱)

مسلمان بھائی کی مدد کی فضیلت:

والله في عون العبد: جب تک بندہ مسلمان بھائی کی مدد کا جذبہ رکھتا ہے اوراس کے لئے کوشاں رہتا ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ شانہ بھی اس بندہ کی مدد میں لگے رہتے ہیں، پس دوسروں کی مدد وتعاون کرنے سے اپنے کام بھی آسان ہوتے ہیں، ایک حدیث میں ہے: ''ارحموا مَنْ فِيْ الأرْض يرحمكم من في السماء(۲)'' اگرخودغرضی آجائے تو اللہ تعالیٰ شانہ بھی اپنا مدد کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

تحصیل علم کی فضیلت:

من سلك طريقا يلتمس فيه علما: اس جملہ میں طلب علم کی فضیلت مذکور ہے، یہی جزء باب کے مناسب ہے ''طریق'' عام ہے خواہ قریب ہو یابعید، بری ہو یابحری، ہوائی ہو یازمینی اورمشکل ہو یاآسان، ''بہ'' کی ضمیر کے مرجع میں چار احتمال ہیں:

(۱) اس کا مرجع طریق ہو یعنی اس طریق کی وجہ سے طریق جنت آسان کردے گا (۲) اس کا مرجع

(۱) اللمعات ۱/ ۵۳۱.

(۲) رواه ابو داؤد في الأدب (٤٩٤١) والترمذي في ابواب البر والصلة (١٩٢٤)

سلوک فی العلم ہو(۳) اس کا مرجع علم ہو(۴)اس کا مرجع التماسِ علم ہو یعنی طلب علم یہ احتمال راجح ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ فضیلت ہراس شخص کو حاصل ہوگی جوطلب علم کے لئے گھر سے نکل جائے خواہ اس کوعلم حاصل ہو یا نہ ہو، البتہ اخلاص ہو، مال وجاہ مقصود نہ ہو۔(۱)

وما اجتمع قوم في بيت : جولوگ علم کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہیں ان کی فضیلت بیان فرمائی کہ ان پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے، فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اورحق تعالیٰ شانہ ملائکہ کے سامنے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

''بیت'' سے مراد وہ جگہ جہاں قرآن پڑھااور پڑھایا جائے خواہ مسجد ہویامدرسہ، اور بیت کی نسبت اللہ کی طرف بطورتعظیم کے ہے،اور اس نسبت سے مساجد یہود ونصاریٰ کو نکالنا مقصود ہے کیونکہ ان میں داخل ہونا مکروہ ہے۔(۲)

يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم :علماء نے فرمایا کہ: اس میں تمام علوم شرعیہ کا پڑھناپڑھاناداخل ہے، جیسا کہ''یتدارسونہ'' سے بھی معلوم ہوتا ہے، اس لئے یہ فضیلت الفاظ کی تعلیم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

السكينة : اس سے مراد ہے: طمانینتِ قلب، جوایمان کے بعدسب سے بڑی نعمت ہے،قلبی سکون دوچیزوں سے حاصل ہوتا ہے(۱)انسان کی امیدیں لمبی نہ ہوں(۲) ماسوی اللہ کا خوف نہ ہو،اورجوحضرات اخلاص کے ساتھ پڑھتے پڑھاتے ہیں ان کے اندر یہ دونوں باتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔(۳)

نسب؛عمل صالح کے بغیر غیر مفید:

ومن بطأبه عمله : بطأ بمعنی پیچھے ہٹانا، یعنی جس شخص کواس کا عمل پیچھے کردے اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھاپائے گا۔

اس جملہ میں اعمال صالحہ کی ترغیب دی گئی ہے کہ قرب الٰہی کا حصول اعمال صالحہ سے ہوتا ہے، محض نسب سے قرب حاصل نہیں ہوتا: ''اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقَاكُمْ''، ملاعلی قاریؒ نے فرمایا کہ علمائےسلف میں اکثر

(۱)المرقاة ۱/ ۴۱۴.

(۲)اللمعات ۱/ ۵۳۱-۵۳۲.

(۳)اللمعات ۱/ ۴۳۲-۵۳۳.

لوگ ایسے تھے کہ ان کا نسب عالی نہیں تھا بلکہ اکثر موالی اورآزاد شدہ غلام تھے، مگر علم اوراعمال صالحہ کی وجہ سے سادات الامۃ اوریناببع الرحمہ بن گئے جیسے نافع غلام تھے مگرامام مالکؒ کے استاذ بن گئے، اس کے برخلاف بعض وہ لوگ جوعالی نسب تھے مگرایمان، علم اوراعمال صالحہ سے کورے تھے توزذیل بن گئے اورنسیامنسیا ہوگئے، جیسے فرعون، ابوجہل اورابولہب وغیرہ۔(۱)

۱۹۴/ ۸: وَعَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''إِنَّ اَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ، فَعَرَفَهَا، فَقَالَ: مَاعَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اسْتُشْهِدْتُ، قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُقَالَ: جَرِيْءٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ اُمِرَبِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَعَلَّمَهٗ، وَقَرَأَ الْقُرْآنَ، فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ، فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَاعَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيْكَ الْقُرْآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ؛ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ: إِنَّكَ عَالِمٌ، وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ: هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ اُمِرَبِهٖ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهٖ، فَأُتِيَ بِهٖ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ فَمَاعَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: مَاتَرَكْتُ مِنْ سَبِيْلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيْهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيْهَا لَكَ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَلٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ: هُوَ جَوَادٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ اُمِرَبِهٖ فَسُحِبَ به عَلٰى وَجْهِهٖ ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ'' (رواه مسلم)(۲)

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: کہ لوگوں میں سب سے پہلا وہ شخص جس کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا وہ ہوگا جس کو اللہ کے راستہ میں شہید کردیا گیا تھا، چنانچہ اس کو لایا جائے گا اوراللہ تعالیٰ اس کواپنی نعمتیں یاددلائے گا، چنانچہ وہ اس کو یادآجائیں گی، پھراللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ: تونے ان نعمتوں کے شکرمیں کیا کام کیا؟ تووہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں قتال کیا یہاں تک کہ مجھے شہید کردیا گیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تونے جھوٹ کہا بلکہ تونے اس لئے قتال کیا کہ تجھے بہادر کہا جائے چنانچہ وہ کہا جاچکا، پھراس کے متعلق (آگ میں ڈالے جانے کا) حکم دیا جائے گا چنانچہ منہ کے بل

(۱) المرقاة ۱/ ٤١٦.

(۲) أخرجه مسلم في كتاب الإمارة، باب من قاتل للريا و السمعة استحق النار ۲/ ١٤٠ الرقم ١٩٠٥.

گھسیٹا جائے گا حتی کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

(دوسرا) وہ شخص جس نے علم سیکھا اور سکھایا، اور قرآن پڑھا، چنانچہ اس کو بھی لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا جو اس کو یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا کام کیا؟ تو وہ کہے گا: میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور آپ کے لئے قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا، کیونکہ تو نے علم اس لیے حاصل کیا تھا تا کہ تجھ کو عالم کہا جائے، اور قرآن اس لئے پڑھا تا کہ قاری کہا جائے، چنانچہ (عالم وقاری) کہا جاچکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا، چنانچہ منہ کے بل گھسیٹا جائے گا حتی کہ اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

(تیسرا) وہ شخص ہوگا جس کو اللہ نے وسعت دی، اور ہر قسم کا مال عطا فرمایا، چنانچہ اس کو لایا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائے گا جو اس کو یاد آجائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے ان نعمتوں کے شکر میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا، کہ میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں خرچ کرنے کو تو پسند کرتا ہو اور میں نے تیری رضا کی خاطر اس میں خرچ نہ کیا ہو، اللہ فرمائے گا: تو نے جھوٹ کہا، کیونکہ تو نے ایسا اس لیے کیا تا کہ تجھ کو سخی کہا جائے، چنانچہ وہ کہا جاچکا، پھر اس کے بارے میں حکم دیا جائے گا، تو اس کو چہرے کے بل گھسیٹا جائے گا پھر اس کو آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسلم)

تشریح حدیث

اخلاص کی قدر و قیمت اور عدم اخلاص کا نقصان:

اس حدیث میں اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہر دینی کام میں اخلاص ہونا چاہئے ریا و نمود نہیں ہونا چاہئے، ورنہ آدمی کے اعمال حسنہ بھی بجائے خیر کے وبال جان بن جائیں گے، چنانچہ اس حدیث میں صراحت ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے تین اشخاص کو لایا جائے گا اور ان کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا، ایک وہ مجاہد جو اس لئے جہاد کرے تا کہ لوگ اس کو بہادر کہیں، دوسرے وہ عالم جو اس نیت سے علم حاصل کرے تا کہ لوگ اس کو عالم کہیں اور اس کی عزت اور ناموری ہو اسی طرح وہ قاری جو

اس نیت سے قرآن کریم پڑھے تا کہ اس کی شہرت ہو اور تیسرے وہ سخی جو اس نیت سے مال خرچ کرے تا کہ لوگ اس کی سخاوت کی داد دیں۔

إن أول الناس يقضى عليه يوم القيامة : اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے ان تین قسم کے لوگوں کا فیصلہ ہوگا جو یہاں مذکور ہوئے حالانکہ ایک روایت میں ہے کہ سب سے پہلے نماز کا فیصلہ ہوگا اور ایک حدیث میں ہے کہ اولاً دم کا فیصلہ ہوگا پس ان روایات میں ظاہراً تعارض ہے، اس کے دو جواب ہیں:

(۱) یہاں خلاف کا فیصلہ مراد ہے اس لئے کہ یہاں ''علیہ'' کا لفظ وارد ہوا ہے چنانچہ یہ تینوں لوگ ایسے ہیں کہ ان کے خلاف فیصلہ ہوگا اور جن احادیث میں نماز اور دم کے معاملہ کو اول فیصلہ قرار دیا گیا ہے وہاں خلاف کا فیصلہ ہونا ضروری نہیں، موافق بھی ہوسکتا ہے اور مخالف بھی۔

(۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ حقوق اللہ میں اولا نماز کا فیصلہ ہوگا اور حقوق العباد میں اولا دم وقتال کا فیصلہ ہوگا اور مخالف فیصلوں میں سب سے پہلے وہ فیصلہ ہوگا جو یہاں مذکور ہے، پس ہر ایک اپنے اپنے لحاظ سے اول ہے **فلاتعارض بينهما**.(۱)

فعرفه نعمته: یہاں شہید کے لئے لفظ ''نعمت'' واحد اور بقیہ دو اشخاص کے لئے ''**نعمه**'' جمع کا صیغہ لایا گیا ہے، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ شہید میدان جہاد میں اصلا جان کی قربانی دیتا ہے، پس اصالۃً اس کے پاس ایک نعمت ہے اس لحاظ سے اس کے لئے مفرد کا صیغہ لایا گیا اور علم ومال ہر دو کی مختلف انواع واقسام ہیں پس اس اعتبار سے ان کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا۔(۲)

حتى استشهدت قال كذبت : اس پر اشکال ہے کہ اس نے جھوٹ کہاں کہا؟ اس نے تو واقعہ بیان کیا ہے وہ واقعۃً شہید ہوا ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں اس نے اپنے قول ''**قاتلت فيك**'' سے اخلاص کا دعوی کیا ہے جس میں وہ جھوٹا ہے، پس دعوی اخلاص کی تکذیب کی جارہی ہے، نہ کہ نفس شہادت کی۔(۳)

---

(۱) اللمعات ۱/ ۵۳۴.

(۲) المرقاة ۱/ ۴۱۷.

(۳) المرقاة ۱/ ۴۱۸.

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں غلط نیت سے انسان کو کوئی مفاد حاصل ہو جائے تو ہو جائے مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

فسحب: "سحب" باب ضرب سے ہے، بمعنی زمین پر گھسٹنا۔

تعلمت العلم وعلمته وقرأت فيك: اس میں قرأتِ قرآن کو الگ سے بیان کیا گیا، یہ یا تو تخصیص بعد التعمیم ہے یا اس وجہ سے کہ قاری عموماً ریا میں زیادہ مبتلا ہوتا ہے، اس لئے اس کو علیحدہ ذکر کیا گیا۔[1]

جواد: مفرد ہے، جمع اس کی اجواد واجاود ہے، بمعنی سخی، فیاض۔

۱۹۵ / ۹: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍؓ وقَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ اللّٰهَ لايَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعاً يَنْتَزِعُهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى إِذَالَمْ يُبْقِ عَالِماً؛ إِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوْساً جُهَّالاً، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا" (متفق عليه)[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ علم کو ایسے نہیں اٹھائے گا کہ لوگوں سے اس کو نکال لے، بلکہ علم کو اس طرح اٹھائے گا کہ علماء کو اٹھا لے گا، یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہیں چھوڑے گا، تو لوگ جاہلوں کو پیشوا بنالیں گے، ان سے مسئلے معلوم کیے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوی دیں گے، چنانچہ وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری مسلم)

تشریح حدیث

علماء کی وفات جہالت کے شیوع اور قیامت کی آمد کا پیش خیمہ:

اس حدیث میں صحیح علماء کی قدر کرنے کا حکم دیا گیا کہ لوگوں کو چاہئے کہ علم حاصل کریں اور علماء کو اپنا

(۱) المرقاۃ ۱/ ۴۱۹.

(۲) أخرجه البخاري في موضعين، كتاب العلم، باب كيف يقبض العلم ۱/ ۲۰ الرقم ۱۰۰، وكتاب الاعتصام، باب مايذكر من ذم الرأي وتكلف القياس ۲/ ۱۰۸۶ الرقم ۷۰۱۴.

ومسلم كتاب العلم، باب رفع العلم وقبضه وظهور الجهل والفتن في آخر الزمان ۲/ ۳۴۰ الرقم ۲۶۷۳.

سرداروپیشوابنائیں نااہلوں سے دوررہیں، کیونکہ قربِ قیامت علم کواٹھالیاجائے گا، اورعلم کواٹھانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ اہل علم کے سینوں سے اور کتابوں کے اوراق سے علم محوہوجائے، بلکہ اس کی شکل یہ ہوگی کہ صحیح علم والے علماء وفات پاجائیں گے اورپھران کا کوئی قابل جانشین نہیں ہوگا، اس طرح علم اٹھ جائے گا، پھر جب مستند عالم نہیں ملے گا لوگ جاہلوں کوسرداربنائیں گے اوروہ بغیرعلم کے فتوی دیں گے اورخودبھی گمراہ ہوں گے اوردوسروں کوبھی گمراہ کریں گے، اس طرح دنیامیں چاروں طرف ضلالت وگمراہی عام ہوجائے گی۔

حتى اذالم يبق عالما : یہ ابقاء سے ہے اورضمیرفاعل اللہ کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالی کسی عالم کوروئے زمین پرباقی نہیں چھوڑے گا پھرایسا ہوگا، اوربخاری میں ''اذالم يبق عالم'' ''بقاء'' سے آیاہے، جس کے معنی ہیں کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہے گا پھرایسا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کی موت بہت بڑا خسارہ ہے یہ علم کا اٹھ جاناہے اورقیامت کاقریب آجاناہے۔

رؤوساً جهالاً : اس سے مرادوہ شخص ہے جس کوکوئی عہدہ دیاجائے، مگراس کی لیاقت اس میں نہ ہوگی، یہ قرب قیامت کے وقت ہوگا، چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے: ''إذَاوُسِّدَ الأمْرُ إلَى غَيرِ أهلِه فانتظر الساعة[1]'' یعنی جب معاملات نااہل کے حوالہ کئے جانے لگیں توپھرقیامت کا انتظارکرو، لہذا نااہل کوازخودبھی دینی مسائل میں رائے زنی اورفتوی دہی سے گریز کرناچاہئے، اورارباب امرکوبھی نااہلوں کے مناصب حوالہ نہ کرنے چاہئیں، ورنہ اولا ضلالت پھیلے گی اورپھرقیامت آئے گی۔[2]

١٩٦ / ١٠ : وَعَنْ شَقِيقٍ قَالَ: كَانَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ يُذَكِّرُالنَّاسَ فِيْ كُلِّ خَمِيسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَاأَبَاعَبْدِالرَّحْمٰنِ! لَوَدِدْتُّ أَنَّكَ ذَكَّرْتَنَا فِيْ كُلِّ يَوْمٍ، قَالَ: أَمَاإِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذٰلِكَ أَنِّيْ أَكْرَهُ أَنْ أُمِلَّكُمْ، وَإِنِّيْ أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَاكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا.(متفق عليه)[3]

(١)رواه البخاري في كتاب العلم، باب من سئل علما ١ / ١٤.

(٢)المرقاة ١ / ٤١٩.

(٣)أخرجه البخاري في موضعين، "كتاب العلم" باب ماكان النبي صلى الله عليه وسلم يتخولهم بالموعظة والعلم كي لاينفروا ١ / ١٦الرقم ٧١ وكتاب الدعوات، باب الموعظة ساعة بعد ساعة ٢ / ٩٩٤، الرقم ٦٤٦١، ومسلم كتاب صفة القيامة باب الاقتصاد في الموعظة (٢٨٢١)

ترجمہ: حضرت شقیقؒ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو لوگوں کو وعظ کہا کرتے تھے، ایک شخص نے ان سے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن! میری تمنا ہے کہ آپ ہم کو روزانہ وعظ کہا کریں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ: (میں ایسا اس لیے نہیں کرتا) کہ میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ تم کو اکتاہٹ میں ڈالوں، میں نصیحت کے معاملہ میں تمہارے حال کا خیال اس طرح رکھتا ہوں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے حال کا خیال رکھتے تھے ہمارے بارے میں اکتاہٹ کے خوف سے۔ (متفق علیہ)

تشریح حدیث

تعارف شقیقؒ:

یہ شقیق بن سلمہ اسدی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوگئے تھے، لیکن رویت نصیب نہیں ہوسکی، کبار تابعین میں سے تھے، حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں، حجاج کے زمانہ میں وفات ہوئی۔ (۱)

وعظ وتقریر میں مخاطبین کے نشاط کی رعایت ضروری:

اس حدیث میں وعظ وتقریر کا ادب بتایا گیا ہے کہ وعظ اس وقت کہنا چاہئے جب سامعین میں نشاط ہو اس بارے میں ان کے حال کی رعایت رکھنی چاہئے ورنہ ان پر اثر نہیں ہوگا۔

یذکر الناس فی کل خمیس: علماء نے فرمایا کہ یہ ادب وعظ کے لئے ہے، درس روزانہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ خود ابن مسعودؓ کا درس روزانہ ہوتا تھا۔

انی املکم واتخولکم: "املکم" املال سے ہے بمعنی ملال میں ڈالنا "اتخولکم" "تخول" سے ہے بمعنی نگرانی کرنا، حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے کہ: ہر کام مین اگرچہ مواظبت ومداومت مطلوب ہے مگر نشاط وچستی اور لوگوں کے مشقت میں نہ پڑجانے کا خیال بھی ضروی ہے، لہذا وعظ ونصیحت روزانہ بھی ہوسکتا ہے مگر سامعین کے نشاط کے بقدر، ورنہ ایک دن چھوڑ کر یا ہفتہ میں ایک روز۔ (۲)

---

(۱) الإصابة ۲ / ۵۲۳–۵۲۴.

(۲) فتح الباری ۱ / ۲۰۵.

١٩٧ / ١١: وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلاثاً حَتّٰى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَاأَتٰى عَلٰى قَوْمٍ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلاثاً.(رواه البخاری)[1]

ترجمه: اورحضرت انسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی بات ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ فرماتے یہاں تک کہ لوگ اس بات کو سمجھ جاتے، اورجب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جماعت کے پاس آتے اوران کوسلام کرتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

وعظ وتقریر واضح اور مفہم ہو:

اس حدیث میں علم کا ایک اورادب بتایا گیا کہ اگرکوئی اہم بات ہوتو اس کا متعدد مرتبہ تکرار کرنا چاہئے تاکہ طالبین اس کواچھی طرح سن لیں اوروہ بات ان کے قلوب میں راسخ ہوجائے۔

إذاتكلم بكلمة أعادها ثلاثا: تین مرتبہ کہتے مخاطبین کے فہم کے اعتبار سے، کہ بعض کی فہم اعلی ہوتی ہے وہ ایک مرتبہ ہی میں سمجھ جاتے ہیں،اوربعض کی فہم اوسط ہوتی ہے وہ دومرتبہ میں سمجھتے ہیں،اوربعض کی فہم ادنیٰ ہوتی ہے تین مرتبہ کہنے سے وہ بھی سمجھ جاتے ہیں۔[2]

بعض نے کہا کہ جب مجمع بڑاہوتا تب تین جہتوں میں تین مرتبہ بیان کرتے تھے،لیکن ہربات کو تین مرتبہ بیان نہ فرماتے، بلکہ یہ عادت شریفہ اہم بات سے متعلق تھی،اس لئے کہ روایات سے ثابت ہے کہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت سی باتوں کواشارہ وکنایہ میں بیان کرتے چہ جائیکہ تین مرتبہ اعادہ فرمائیں، لہٰذامذکورہ حدیث میں لفظِ کلمۃ میں تنوین تعظیم کے لئے ہے ای **كلمة مهمة عظيمة**.

سلام کا ایک ادب:

وإذاأتي على قوم فسلم عليهم: یہاں بھی تین مرتبہ سلام کرنا الگ الگ جہت کے اعتبارسے تھا،

(١)أخرجه البخاري في موضعين كتاب العلم،باب من اعاد الحديث ثلثا ليفهم ١ / ٢٠الرقم ٩٥،و"الاستيذان، باب التسليم والاستيذان ثلاثا٢ / ٩٢٣ الرقم ٦٠٠٣"

(٢)المرقاة ١ / ٤٢١.

ایک ان لوگوں کو جو سامنے ہوتے پھر دائیں جانب والوں کو اور پھر بائیں جانب والوں کو، لیکن راجح یہ ہے کہ سلام اول بطور استیذان ہوتا تھا پھر سلام تحیہ کہتے اور پھر واپسی میں سلام وداع ہوتا تھا۔ (۱)

١٩٨ / ١٢: وَعَنْ أَبِي مَسْعُوْدِ ن الأَنْصَارِيِّ رضی اللہ عنہ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّهُ أُبْدِعَ بِيْ فَاحْمِلْنِيْ، فَقَالَ: مَاعِنْدِيْ فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ أَنَا أَدُلُّهُ عَلٰى مَنْ يَحْمِلُهُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ دَلَّ عَلٰى خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِهٖ" (رواه مسلم) (۲)

ترجمہ: اور حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: میری سواری چلنے سے عاجز ہوگئی ہے، آپ مجھے سواری عنایت فرمادیجئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا میرے پاس نہیں ہے، ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ! میں ایسا شخص بتاتا ہوں جو اس کو سواری دے دے، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص کسی بھلائی کی طرف راہ نمائی کرے تو اسے بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس بھلائی پر عمل کرنے والے کو۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال ابو مسعود انصاریؓ:

مشہور صحابی ہیں، نام: عقبہ بن عمرو الانصاری ہے، قدیم الاسلام ہیں، ان کو بدری بھی کہا جاتا ہے حالانکہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے، اس لئے کہ مقام بدر میں رہتے تھے، مقام بدر میں سکونت کی وجہ سے بدری کہلاتے ہیں، حضرت علیؓ کے زمانے میں وفات ہوئی ہے۔ (۳)

خیر کی جانب رہنمائی خیر پر عمل کے مثل:

فانه أُبدع بي: ابداع کے معنی ہیں: نئی بات ایجاد کرنا، اونٹ کو اللہ تعالیٰ نے چلنے کے واسطے پیدا

(۱) المرقاة ١ / ٤٢١.

(۲) أخرجه مسلم في الإمارة، باب فضل إعانة الغازي في سبيل الله الخ ٢ / ١٣٧.

(۳) الإصابة ٦ / ٢٤٣، و ٢ / ٤٦٧ – ٤٦٨.

فرمایاہے گویا کہ چلنا اس کی دائمی عادت ہے پس اگر وہ چلنے سے عاجز آجائے تو گویا اس نے اپنی عادت کے خلاف ایک نئی بات ایجاد کی، لہٰذا اس کا ترجمہ سواری (اونٹ) کے تھکنے سے اور چلنے سے عاجز آنے سے کیا جاتا ہے۔[1]

من دل علی خیر فله مثل اجر فاعله: یہ حدیث عام ہے کہ ہر معاملہ میں دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنی چاہئے، اوران کو خیر پر ابھارنا چاہئے، اس کے مواقع کی نشاندہی کرنا چاہئے جس کا عظیم الشان فائدہ یہ ہے کہ ترغیب وتحریض کے بعد جس قدر ثواب اس عمل کے کرنے والوں کو ملے گا اسی قدر اس ترغیب دلانے والے کو بھی ملے گا، اسی حدیث کی بنا پر شریعت میں باقاعدہ اصول مقرر ہے: **الدال علی الخیر کفاعله**۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس سے تعلیم وتعلم کی فضیلت ظاہر ہے، معلم کو بھی متعلم کے ساتھ بھلائی کرنی چاہئے اور علم پر اس کی راہنمائی کرنی چاہئے اسی مناسبت سے اس روایت کو کتاب العلم میں لایا گیا ہے۔[2]

١٩٩ / ١٣: وَعَنْ جَرِيْرٍؓ قَالَ: كُنَّا فِيْ صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَجَاءَهُ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِي النِّمَارِ أَوِ الْعَبَاءِ، مُتَقَلِّدِي السُّيُوْفِ، عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ، بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ، فَتَمَعَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِمَا رَأَىٰ بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ، فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ فَأَمَرَ بِلَالاً فَأَذَّنَ، وَأَقَامَ فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ فَقَالَ: "يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ إِلٰى آخِرِ الْآيَةِ" "إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً" وَالْآيَةَ الَّتِيْ فِي الْحَشْرِ "اِتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ" تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِنْ دِيْنَارِهِ، مِنْ دِرْهَمِهِ، مِنْ ثَوْبِهِ، مِنْ صَاعِ بُرِّهِ، مِنْ صَاعِ تَمْرِهِ، حَتّٰى قَالَ: وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ قَالَ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهُ تَعْجِزُ عَنْهَا، بَلْ قَدْ عَجَزَتْ، ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتّٰى رَأَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِيَابٍ، حَتّٰى رَأَيْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ كَأَنَّهُ مُذْهَبَةٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ

(١) شرح الطيبی ١ / ٤٠٣۔

(٢) شرح الطيبی ١ / ٤٠٤۔

شَيْئٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الإِسْلامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَامِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِأَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئٌ" (رواه مسلم)(١)

ترجمہ: اورحضرت جریرؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ہم دن کے ابتدائی حصہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، ایک قوم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی یہ لوگ ننگے بدن تھے اورعبا، یاکمبل لپیٹے ہوئے تھے، اور گلے میں تلوار لٹکائے ہوئے تھے، ان میں سے اکثر بلکہ سب قبیلۂ مضر کے لوگ تھے، ان پر فاقہ کا اثر دیکھ کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے، حضرت بلالؓ کو حکم دیا تو حضرت بلالؓ نے اذان پڑھی اور تکبیر کہی اور نماز ادا کی پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور یہ آیت پڑھی: ''يٰاَيُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍاِلٰى آخِرِالآيَةِ ''یعنی ''اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا'' پوری آیت پڑھی (جس کا آخری حصہ یہ ہے:) ''اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْباً'' کہ بے شک اللہ تمہارا نگہبان ہے، اور وہ آیت پڑھی جو سورۂ حشر میں ہے: ''اِتَّقُوْا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْنَفْسٌ مَّاقَدَّمَتْ لِغَدٍ ''یعنی ''اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھ لے کہ کل (قیامت کے دن) کے لیے اس نے کیا بھیجا ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ صدقہ کرے آدمی اپنے دینار میں سے، اپنے درہم میں سے، اپنے کپڑے میں سے، اپنے گیہوں کے پیمانے میں سے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ کھجور کے ٹکڑے سے، راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری (دینار و درہم) سے بھری ہوئی ایک تھیلی لائے، (اس تھیلی کے وزن سے) قریب تھا کہ ان کا ہاتھ تھک جائے بلکہ تھک گیا تھا، اس کے بعد لوگ پے در پے (کچھ نہ کچھ) لانے لگے یہاں تک کہ میں نے غلہ اور کپڑے کے دو ڈھیر دیکھے، پھر میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس اس طرح چمک رہا تھا، جیسے چہرہ انور پر سونے کا پانی پھیر دیا گیا ہو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ جو شخص اسلام میں کسی نیک طریقے کو رائج کرے تو اس کو اسکا بھی ثواب ملے گا اور اس شخص کا ثواب

(١)أخرجه مسلم كتاب العلم باب من سن سنة حسنة أوسيئة الخ ٢/ ٣٤١ الرقم ١٠١٧ والزكاة، باب الحث على الصدقة ولوبشق تمرة أو كلمة طيبة الخ ١/ ٣٢٧.

بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے، لیکن عمل کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی، اور جس نے اسلام میں کسی برے طریقے کو رائج کیا تو اسے اس کا بھی گناہ ہوگا اور اس شخص کا بھی جو اس کے بعد اس پر عمل کرے گا، لیکن عمل کرنے والے کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی۔(مسلم)

تشریح حدیث

احوال جریر بن عبداللہؓ:

جریر بن عبداللہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کل چالیس دن قبل ایمان لائے مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ ۱۰ھ سے قبل انہوں نے اسلام قبول کیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بہت محبت تھی اور وہ بہت خوبصورت تھے حتی کہ حضرت عمرؓ ان کو یوسف زمانہ کہا کرتے تھے ۵۱ھ میں وفات پائی۔(۱)

آپ ﷺ کی اپیل پر ایک جماعت کی حاجت روائی اور آپ ﷺ کا اظہار مسرت:

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے، دن کی شروعات تھی، ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی، جس کی حالت بہت خستہ تھی، بدن پر کپڑے نہیں تھے، کمبل لٹکائے ہوئے تھے، گردن میں تلواریں پڑی تھیں، ان کی خستہ حالی کو دیکھ کر آپکو نہایت رنج ہوا، حتی کہ جب نماز کا وقت ہوا تو نماز کے بعد آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے وعظ فرمایا، جس میں آخرت کی طرف توجہ دلا کر ان لوگوں کی امداد کا حکم فرمایا ایک انصاری صحابی نے تعاون کرنے میں پہل کی پھر باقی صحابہ کرام نے اپنی اپنی حیثیت کے لحاظ سے تعاون فرمایا اور بہت کچھ جمع ہوگیا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے اس کا اجر وثواب بتلایا۔

اس واقعہ میں باب کے مناسب پہلو یہ ہے کہ اُن انصاری صحابی نے صدقہ میں سبقت کرتے ہوئے دراہم سے بھری ہوئی تھیلی پیش کی، ان کے اِس عمل کو دیکھ کر دیگر لوگ بھی صدقہ کرنے لگے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصاری کے عمل کو سراہتے ہوئے اسلام کا ضابطہ بیان فرمایا کہ جو شخص اسلام میں بہتر طریقہ

(۱) الإصابة ۱/ ۳۴۹-۳۵۱.

رائج کرے (کسی نیک کام میں سبقت کرے) اس کو اپنے عمل کا ثواب ہے اور ان لوگوں کے ثواب کے بقدر بھی ثواب ہے جو اس پر عمل کریں گے۔

استاذ اپنے تلامذہ کو علم سکھاتا ہے تو وہ بھی ایک عظیم الشان نیک کام کی بنیاد ڈالتا ہے اس لئے وہ بھی اِس فضیلت کا مستحق ہے۔

عراة: عاری کی جمع ہے بمعنی ننگے بدن۔

مجتابي النمار: ای لابس النمار یعنی اونی دھاردار لباس سے ستر کو چھپا رکھا تھا، جیسے چیتے کی کھال ہوتی ہے۔

عَبَاء، بغیر آستین کا چوغہ جو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے۔

متقلدی السیوف: یہ ان کی وجہِ غربت کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر خانہ جنگیوں میں مبتلا رہتے تھے۔

فتمعر: ای تغیر.

فأمر بلالاً فأذن: اظہر یہ ہے کہ یہ ظہر یا جمعہ کی نماز تھی ''فی صدر النہار'' اس پر قرینہ ہے۔[1]

فصلی ثم خطب: اس خطبہ سے خطبۂ جمعہ مراد لینا ضروری نہیں بلکہ وعظ ونصیحت مراد ہوسکتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں دو آیتیں پڑھیں، یہ دونوں آیتیں موقعہ کے بہت مناسب تھیں، کیونکہ پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ سب لوگ ایک آدم کی اولاد ہیں، لہٰذا ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس کرکے اس کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے، اور دوسری آیت میں آخرت یاد دلا کر اس کی تیاری کرنے کا حکم فرمایا گیا اور صدقہ کرکے پریشان حال لوگوں کی مدد کرنا آخرت کی بہترین تیاری ہے۔

تصدق رجل: یہ خبر ہے لیکن انشاء وامر کے معنی میں ہے، امر کو خبر سے تعبیر کیا نیک فالی کے لئے، گویا کہ امر کیا اور لوگوں نے عمل کیا اور پھر اس کی خبر دی گئی۔[2]

کومین: کوم کا تثنیہ ہے، بمعنی ڈھیر، جمع اکوام ہے۔

یتھلل: بمعنی چمکنا، روشن ہونا۔

مُذھبة: گویا کہ سونا ملا دیا گیا ہو۔

---

(۱) المرقاة ۱/ ۴۲۲.

(۲) شرح الطیبي ۱/ ۴۰۵.

٢٠٠ / ١٤ : وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "لاتُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْماً إِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا؛ لِأَنَّهُ أَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ" (متفق عليه[1]) وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ مُعَاوِيَةَ: 'لايَزَالُ مِنْ أُمَّتِيْ' فِيْ بَابِ ثَوَابِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالىٰ).

ترجمه : اورحضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ نہیں قتل کیا جاتا کوئی شخص ظلما مگر اس کے خون کا ایک حصہ آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) پر ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے قتل کا طریقہ نکالا۔ (بخاری ومسلم) اورحضرت معاویہ کی روایت کردہ حدیث "لایزال من أمتی" ہم انشاء اللہ "باب ثواب هذه الأمة" میں بیان کریں گے۔

تشریح حدیث

برائی کے مرتکب کا گناہ اس کے موجد کے نامۂ اعمال میں:

اس حدیث میں گزشتہ احادیث کا دوسرا پہلو مذکور ہے کہ اگرکوئی شخص برے کام کی بنیاد ڈالے گا تواسکے نقش قدم پرچلتے ہوئے بعد میں جوبھی اس برائی کا مرتکب ہوگا اس کے گناہ کے بقدر بنیاد ڈالنے والے کوگناہ ملتارہے گا، حدیث کا مضمون یہ ہے کہ قیامت تک ظلماً جتنے قتل ہونگے ان کا گناہ قابیل کو بھی ملے گا کیونکہ اسی نے سب سے پہلے ناحق قتل کیا اور ظلماً قتل کرنے کی بنیاد ڈالی جسکا واقعہ اس طرح ہے کہ:

واقعۂ ہابیل وقابیل:

ہابیل وقابیل حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، حضرت حوا کے بطن سے ایک ساتھ دو بچے پیدا ہوتے تھے، ایک لڑکا ایک لڑکی، اس وقت اختلاف بطن کو اختلاف ابوین کے قائم مقام قرار دیا جاتا تھا، اور ایک بطن کے لڑکے کا دوسرے بطن کی لڑکی سے نکاح ہوتا تھا، اور ایک بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے ولڑکی

(١) أخرجه البخاري في ثلاثة مواضع، "كتاب الأنبياء، باب خلق آدم وذريته الخ" ١ / ٤٦٩، الرقم ٣٢٢٥، والديات، باب قول الله تعالىٰ: ومن أحياها الخ ٢ / ١٠١٤ الرقم ٦٦٠٢، والاعتصام، باب من دعا إلى ضلالة الخ ٢ / ١٠٨٨ ومسلم "كتاب القسامة، باب إثم من سن القتل" ٢ / ٦٠ الرقم ١٦٧٧.

حقیقی بہن بھائی ہوتے تھے، جن کا باہم نکاح نہیں ہوسکتا تھا۔

قابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی خوبصورت تھی اوراس کا نکاح ہابیل سے ہونا تھا، مگر قابیل اپنی ہی بہن سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوا اوراس پر اصرار کرنے لگا اوراس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے بھائی ہابیل کو ظلماً قتل کیا، یہی سب سے پہلا قتل ہے، جو دنیا میں واقع ہوا، لہٰذا دنیا میں جتنے بھی قتل ہوں گے ان کے قاتلین کے ساتھ قابیل کو بھی گناہ ہوگا من سن سنة سيئة کے قاعدے کے تحت۔ (۱)

کان علی ابن آدم الأول: اس سے یہ مراد نہیں کہ قابیل حضرت آدم علیہ السلام کا پہلا اوراولین بیٹا تھا، کیونکہ ہابیل وقابیل کئی بطون کے بعد پیدا ہوئے تھے، بلکہ اول سے مراد ''اول قاتل'' ہے پس یہ اولیت باعتبار قتل کے ہے، اول کا اطلاق قتل کے اعتبار سے ہے نہ کہ ترتیب ولادۃ کے اعتبار سے۔ (۲)

الفصل الثانی

۲۰۱ / ۱۵: عَنْ كَثِيْرِبْنِ قَيْسٍ قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا مَعَ أَبِي الدَّرْدَاءِ فِي مَسْجِدِ دِمَشْقَ، فَجَاءَه رَجُلٌ فَقَالَ: يَاأَبَاالدَّرْدَاءِ! إِنِّي جِئْتُكَ مِنْ مَدِيْنَةِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَدِيْثٍ بَلَغَنِي أَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَاجِئْتُ لِحَاجَةٍ، قَالَ: فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُوْلُ مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْماً سَلَكَ اللّٰهُ بِهِ طَرِيْقاً مِنْ طُرُقِ الْجَنَّةِ، وَإِنَّ الْمَلائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضًى لِطَالِبِ الْعِلْمِ، وَإِنَّ الْعَالِمَ يَسْتَغْفِرُلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الأَرْضِ، وَالْحِيْتَانُ فِي جَوْفِ الْمَاءِ، وَإِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ، وَإِنَّ الْعُلَمَاءَ ورثَةُ الأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِيْنَاراً وَلادِرْهَماً، وَإِنَّمَا وَرَّثُوْا الْعِلْمَ فَمَنْ أَخَذَه أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ. (۳) (رواه احمد

(۱) المرقاة ۱ / ۴۲۵ ـ ۴۲۶.

(۲) الميسر للتوربشتی ۱ / ۱۰۲، وفتح الإله ۲ / ۷۱.

(۳) رواه أحمد والترمذی وابوداود وابن ماجه والدارمي، وسماه الترمذی قيس بن كثير، رواه احمد فی مسنده برقم: ۲۱۷۱۵، والترمذی فی سننه: ابواب العلم باب ماجاء فی فضل نقله علی فضل العبادة رقم: ۲۶۸۲، وابن ماجه باب كتاب الايمان فضل العماء الحديث علی طلب العلم برقم: ۲۲۳، وابوداود كتاب العلم باب الحث علی طلب العلم برقم: ۳۶۴۱، والدارمي: كتاب العلم باب فی فضل العلم والعالم الفقه برقم: ۳۵۴.

والترمذی وابوداؤد وابن ماجة والدارمی وسماه الترمذی قیس بن کثیر.)

ترجمہ : حضرت کثیر بن قیسؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: میں ایک مرتبہ حضرت ابوالدرداءؓ کے پاس ملک شام کے شہر دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر سے آپ کی خدمت میں ایک حدیث حاصل کرنے کے لئے آیا ہوں، جس کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، میں (اس کے علاوہ) کسی اور ضرورت کی وجہ سے نہیں آیا ہوں، حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جو شخص علم طلب کرنے کے لئے کوئی راستہ اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے راستہ پر چلاتا ہے، اور فرشتے طالب علم کی رضامندی کے لئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں، اور زمین وآسمان کی مخلوق اور پانی کے اندر مچھلیاں عالم کے لئے استغفار کرتی ہیں، اور عالم کو عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسے کہ چودھویں رات کے چاند کو دوسرے ستاروں پر فضیلت ہے، اور علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء علیہم السلام درہم ودنانیر کے وارث نہیں بناتے، سوائے اس کے نہیں کہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں، لہٰذا جس شخص نے علم حاصل کیا اس نے کامل اور وافر حصہ حاصل کرلیا۔ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، اور امام ترمذی نے راوی حدیث کا نام قیس بن کثیر ذکر کیا ہے)

تشریحِ حدیث

احوال کثیر بن قیس وابوالدرداء:

کثیر بن قیس تابعین میں سے ہیں اور حضرت ابوالدرداء کے شاگرد ہیں، بعض نے ان کا نام قیس بن کثیر کہا ہے، مگر راجح کثیر ہے، اور ابوالدرداءؓ مشہور صحابی ہیں، آپ کا نام عویمر اور بعض نے عامر کہا ہے، نیز ان کے والد کے نام میں بھی مختلف اقوال ہیں: عامر، مالک، ثعلبہ، عبداللہ، زید وغیرہ، حضرت ابوالدرداء نے بدر کے دن اسلام قبول کیا، جنگ احد میں شریک ہوئے اور زخمی ہوئے، حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان کو "حکیم امتی" کا لقب عطاء فرمایا تھا، حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں دمشق کے قاضی مقرر کئے گئے تھے،

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں انتقال ہوا۔[1]

علم دین کے حصول کی فضیلت:

کثیر بن قیس فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کے ساتھ دمشق کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ میں مدینہ منورہ سے ایک حدیث سننے کے لئے آیا ہوں جس کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، میری اِس آمد کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے اس پر حضرت ابوالدرداءؓ نے علم کی فضیلت پر مشتمل یہ حدیث بیان فرمائی:

من سلک طریقا یلتمس فیه علما الخ: سائل کو حضرت ابوالدرداءؓ سے کونسی حدیث سننا مطلوب تھا؟ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ یہی حدیث مطلوب تھی جس کو ان سے سننا چاہتے تھے، دوسرا یہ کہ حدیثِ مطلوب تو اس کے علاوہ تھی جس کو انہوں نے بعد میں سنایا ہوگا، لیکن یہ حدیث اس آنے والے کے عمل کی تحسین اور تبشیر کے لئے ذکر فرمائی کہ جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ طے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ سہل اور آسان فرما دیتے ہیں کیونکہ علم ذریعہ ہے عمل کا اور عمل سبب ہے دخول جنت کا۔

فی مسجد دمشق: ''دمشق'' دال کا کسرہ اور میم کا فتحہ نیز دال کا فتحہ و میم کا کسرہ دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے، ملک شام کا ایک شہر ہے،[2] خلفاء بنوامیہ نے درالسلطنت دمشق کو بنایا اور وہاں ایک عالیشان جامع مسجد بنوائی، جس کو جامع بنوامیہ اور مسجد دمشق بھی کہا جاتا ہے اسی مسجد میں حضرت ابوالدرداء بیٹھ کر درس دیتے تھے۔

مدینة الرسول صلی الله علیه وسلم: امام شافعی سے نقل کیا گیا ہے کہ مدینۃ الرسول کہنا مکروہ ہے کیونکہ رسول کے معنی قاصد کے ہیں جسکی وجہ سے یہ لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول بمعنی قاصد کے معنی میں مشترک ہے جس میں اشتباہ ہے۔[3]

---

(۱)الإصابة ٤ / ٦٢١.

(۲)معجم البلدان ٦ / ٤٦٣.

(۳)فتح الإله ٢ / ٧٢.

لیکن ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ: جب خود روایت میں اس لفظ کی صراحت آ گئی تو کوئی کراہت نہیں بالخصوص جب کہ لفظ رسول کے ساتھ درود بھی مذکور ہے تو پھر اس میں کوئی اشتباہ نہیں رہا۔(۱)

بلغني إنک تحدثه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم: ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حدیث سائل کو معلوم تھی پھر بھی انہوں نے اس قدر طویل سفر کیا اور اس حدیث کو سننے کی درخواست کی شراح نے اس کی دو وجہیں تحریر کی ہیں:(۲)

ممکن ہے کہ انہوں نے وہ حدیث اجمالاً سنی ہو پھر تفصیلا سننے کے لئے یہ سفر کیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے وہ روایت بالواسطہ سنی ہو اب براہ راست خود راوی سے سننے کے لئے سفر کیا ہو، گویا سند کو عالی کرنا مقصود تھا، سند کا عالی ہونا بھی دین کا شعبہ ہے۔

سلک الله به: ''بہ'' کے مرجع میں دو احتمال ہیں:

(۱) ضمیر کا مرجع ''من'' ہے یعنی علم کے راستے پر چلنے والا اور باء تعدیہ کے لئے ہے یعنی اللہ تعالی اس کو جنت کے راستہ پر چلائے گا۔

(۲) ضمیر کا مرجع علم ہے اور سلک سہل کے معنی میں ہے اور یہاں عائد محذوف ہے ای **سهل الله له به** اور جنت کے راستے سے مراد نیکی کا راستہ ہے، پس معنی یہ ہونگے کہ اللہ اس کے لئے علم کی وجہ سے جنت کا راستہ آسان کرے گا۔(۳)

طالب علم کی فضیلت:

وان الملائكة لتضع أجنحتها: پروں کے بچھانے سے کیا مراد ہے؟ اس میں کئی احتمال ہیں:

(۱) اس کے حقیقی معنی مراد ہیں کہ ملائکہ طالب علم کے اکرام میں اپنے پروں کو بچھاتے ہیں، اور ہمیں اگرچہ اس کا مشاہدہ نہیں ہوتا لیکن جب پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے خبر دیدی تو مشاہدہ کی ضرورت نہیں رہی، منقول ہے کہ عراق کی ایک علمی مجلس میں یہ حدیث سنائی گئی، اس میں ایک معتزلی بھی تھا، اس نے اس حدیث کا استہزاء کیا اور کہا کہ میں کل جوتے پہن کر آؤں گا تا کہ فرشتوں کے پروں کو روندوں، اگلے دن

(۱) المرقاة ۱/ ٤٢٦.

(۲) المرقاة ۱/ ٤٢٧.

(۳) المرقاة ۱/ ٤٢٧.

وہ جوتے پہن کر آیا اور زمین کو روندنے لگا تو اس کے پیروں میں کوڑھ ہوگیا[1] (اللهم احفظنامنه)

(۲) اس سے مراد یہ ہے کہ: فرشتے پَروں کو بند کر کے مجلس میں بیٹھ جاتے ہیں اوراپنی پرواز موقوف کردیتے ہیں۔

(۳) بعض نے کہا کہ وضع اجنحہ کنایہ ہے تواضع سے، جیسے آیت کریمہ ''واخفض لهما جناح الذل'' میں خفضِ جناح تواضع سے کنایہ ہے۔

(۴) بعض نے کہا کہ وضع جناح سے مراد ہے سلامی دینا اور استقبال کرنا، اس لئے کہ فرشتے اللہ کی فوج ہیں اور طالب علم مہمان، تو فرشتے اللہ کے مہمانوں کا استقبال کرتے ہیں۔

(۵) بعض نے کہا کہ وضع جناح کنایہ ہے نصرت ومدد سے کہ سفر وحضر میں فرشتے طالب علم کی مدد کرتے ہیں۔[2]

الحيتان في جوف الماء: اس سے پہلے جملہ میں ''من في الارض'' کا لفظ ہے جسمیں مچھلیاں بھی داخل ہیں، پھر بھی ان کا تذکرہ اس لئے کیا کہ ظاہر الفاظ سے یہ وہم ہو رہا تھا کہ عالم کے حق میں صرف زمین وآسمان میں بسنے والے دعا کرتے ہیں، سمندر کی مخلوق دعانہیں کرتی، لہٰذا اس وہم کو دور کردیا اور بتادیا کہ سمندر کی مخلوق بھی عالم کے لئے دعا کرتی ہے، اس لئے کہ سمندری مخلوق کو حیات کے لئے پانی ضروی ہے اور پانی علماء کی دعا سے ملے گا کیونکہ فرمایا گیا ہے: ''بهم يُمطرون وبهم يُرزقون'' یعنی اہل علم کی برکت سے بارش ہوتی ہے اور انہی کے واسطے سے رزق ملتا ہے۔[3]

عالم کی عابد پرفضیلت اور عالم وعابد سے مراد:

وان فضل العالم على العابد كفضل القمر ليلة البدر : عالم کو عابد پر ایسی فضیلت حاصل ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کو ستاروں پر، وجہ اس کی یہ ہے کہ عالم کا فیض متعدی ہے اور عابد کی عبادت کا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے جیسا کہ چاند کی روشنی اہل زمین تک پہنچتی ہے اور ستاروں کی روشنی فقط ان تک محدود ہوتی ہے۔

---

(۱) المرقاة ۱/ ۴۲۷.

(۲) اللمعات ۱/ ۵۴۶، المرقاة ۱/ ۴۲۸.

(۳) المرقاة ۱/ ۴۲۸.

اور قاضی بیضاویؒ نے تحریر کیا ہے کہ وجہ شبہ یہ ہے کہ ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں چاند سے، اور چاند روشنی حاصل کرتا ہے سورج سے، گویا کہ عُبّاد، علماء سے کسبِ فیض کرتے ہیں اور علماء آفتابِ نبوت سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔

پھر یہاں ''عالم'' سے مراد وہ شخص ہے جو فرائض وواجبات کی ادائیگی کے بعد علم میں مشغول رہتا ہو اور ''عابد'' سے مراد وہ ہے جس کو بقدر ضرورت علم حاصل ہو اور باقی اوقات عبادت میں مشغول رہتا ہو، ایسے عابد پر ایسے عالم کو فضیلت حاصل ہے، لہذا جو عالم بے عمل ہو اس کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، بلکہ اس کے لئے اس کا علم وبال جان ہے، اور جس عابد کو قدر ضرورت بھی علم حاصل نہیں وہ عابد ہی شمار نہیں اور وہ اس بحث سے خارج ہے۔(١)

علماء؛ وارثین انبیاء:

وان العلماء ورثة الانبياء: علماء باعمل انبیاء کے حقیقی وارث ہیں اور انبیاء کی میراث علم ہے، دینار ودرہم نہیں، پس انسان اگر انبیاء علیہم السلام کے وارثین میں شمار ہونا چاہے تو علم صحیح حاصل کرے، دنیا کا طالب نہ بنے، ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اہل علم کو دنیا اور اس کے مال ومتاع کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہونی چاہئے اور دنیا کے سلسلہ میں اللہ تعالی شانہ کی ذات پر توکل کرنا چاہئے۔(٢)

وارثین انبیاء ہونے کے تقاضے اور ذمہ داریاں:

یہاں اہل علم کو انبیاء علیہم السلام کا وارث کہا گیا ہے، اس میں یہ ہدایت ہے کہ اہل علم کے پیش نظر وہی مقاصد وامور ہوں جن کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے گئے، اور انبیاء علیہم السلام کے مقاصدِ بعثت کا بیان قرآن کریم میں متعدد جگہ آیا ہے:

(١) ایک جگہ ارشاد ہے: ''**اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَن**'' (النحل:١٢٥) یعنی لوگوں کو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے

(١) تحفة الابرار ١/ ٢٠٢.

(٢) المرقاة ١/ ٤٢٩.

اوران سے بہتر انداز میں مباحثہ کیجئے۔

(۲) دوسری جگہ ارشاد ہے: ''يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ'' (آل عمران:۱۶۴) یعنی یہ رسول ان کے سامنے قرآن کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اوران کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں اورانہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

(۳) نیز ارشاد ہے: ''يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتُ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ'' (الاعراف:۱۵۷) یعنی یہ رسول انہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں، حلال چیزوں کی حلت بتاتے ہیں اورحرام چیزوں کی حرمت واضح کرتے ہیں اوران سے بدعات ورسومات کوختم کرتے ہیں۔

(۴) ایک موقع پرفرمایا گیاہے: ''یاایھاالرسول بلغ ماانزل الیک من ربک'' (المائدۃ:۶۷) کہ اے رسول آپ پرآپ کے رب کی طرف سے جونازل کیاگیاہے اس کو دوسروں تک پہنچادیجئے۔

ان سب آیات سے حضرات انبیاءعلیہم السلام کے جومشاغل اوروظائف مستفادہوتے ہیں وہ اجمالاً یہ ہیں: دعوت الی اللہ، علمی مباحثہ، تلاوت قرآن، تعلیم کتاب وحکمت، تزکیہ نفوس وتربیت اخلاق، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، حلت وحرمت کے مسائل، رد رسوم وبدعات اوراحکام دین کی تبلیغ واشاعت، پس ایک حقیقی عالم دین کے مشاغل ووظائف بھی اصولاً یہی ہیں اوربحیثیت وارث انبیاء یہی اس کے امور مفوضہ ہیں۔

وسماه الترمذي قيس.....الخ : ابوالدرداءؓ کے شاگرد کانام امام ترمذی نے ''قیس بن کثیر'' ذکرکیاہے، مگرراجح یہ ہے کہ وہ کثیر بن قیس ہیں۔(۱)

۲۰۲ / ۱۶ : وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ قَالَ: ذُكِرَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلَانِ: أَحَدُهُمَا عَابِدٌ، وَالْأٰخَرُ عَالِمٌ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى أَدْنَاكُمْ، ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى

(۱) كماقال علي القاري (المرقاة ۱ / ۴۳۰)

الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَيْرَ"(رواه الترمذي [(۱)] ورواه الدارمي عن مكحول مرسلا، ولم يذكر: رجلان وقال: فضل العالم على العابد كفضلي على أدْنَاكُمْ، ثم تلاهذه الآية: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءِ، وسرد الحديث الى آخره. [(۲)]

ترجمہ : حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوآدمیوں کا تذکرہ کیا گیا، ان میں سے ایک عابد اوردوسرا عالم تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: عالم کو عابد پراس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح کہ مجھے تم میں سے ادنی شخص پرفضیلت حاصل ہے،اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: اللہ اوراس کے فرشتے اورآسمان اورزمین کی تمام مخلوق یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اورمچھلیاں بھی اس شخص کے لئے مغفرت اورخیرکی دعائیں کرتی ہیں جولوگوں کو دین کاعلم سکھاتا ہے۔(ترمذی)اوردارمی نے بھی اس کوروایت کیا ہے البتہ دارمی نے"رجلان" کا تذکرہ نہیں کیا اورکہا کہ: عالم کی عابد پرایسی فضیلت ہے جیسا کہ میری فضیلت ہے تم میں سے ادنی انسان پر، پھرآپ علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ آیت تلاوت کی:"انمایخشی اللہ من عبادہ العلماء"اوراخیر تک حدیث بیان کی۔

تشریح حدیث

اس حدیث کا مضمون ماقبل کی روایت سے ملتا جلتا ہے، چنانچہ عالم کے سلسلہ میں دوباتیں فرمائی گئیں ایک عالم کی عابد پرحددرجہ فضیلت اوردوسرے یہ کہ تمام کائنات عالم کے لئے دعاگورہتی ہے۔

ذکر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلان: یہ تذکرہ بطورِتمثیل ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ مثال کے طور پر دوشخص ہوں، ایک عالم اورایک عابد، ان میں سے کون افضل ہے؟ اس پرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی فضیلت عابد پرایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے

(۱)أخرجه الترمذی أبواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ۲/ ۹۸، الرقم ۲۶۸۵.

(۲)رواه الدارمي فی سننه: کتاب العلم، باب من قال: العلم الخشیة وتقوی الله، الرقم:۲۹۷.

ادنی پر، یاپھر بنی اسرائیل کے دوشخصوں کا تذکرہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام سے کیا گیا ایک عالم کا اور ایک عابد کا اس پر یہ فضیلت بیان فرمائی۔

أحدهما عابدو الآخر عالم: عالم سے مراد وہ شخص ہے جو عبادت ضروریہ ادا کرنے کے بعد باقی اوقات کونشرِ علم میں مشغول رکھے اور عابد سے مراد وہ شخص ہے جس کو بقدرضرورت علم ہو اور عبادات ضروریہ کو ادا کرنے کے بعد باقی اوقات نوافل میں مشغول رہے۔کمامر(۱)

کفضلي علی أدناکم: اس میں دواحتمال ہیں: (۱) کُمْ کا مصداق حضرات صحابہ ہوں یعنی ادنیٰ صحابی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسی فضیلت حاصل ہے اور ادنی صحابی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ میں بڑا فرق ہے۔(۲)

(۲) کُـمْ سے مراد تمام امت محمد یہ ہو یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسی فضیلت ادنی امتی پر حاصل ہے ویسی ہی فضیلت عالم کو عابد پر ہے، اور ایک ادنی امتی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ میں زمین وآسمان سے بھی زیادہ کا فرق ہے، اس لحاظ سے عالم کو عابد پر حددرجہ فضیلت حاصل ہوگی۔(۳)

حتی النملة فی جحرها: ''نملہ'' کا تذکرہ الگ سے کیا تاکہ یہ خشکی کی تمام مخلوق کو شامل ہوجائے اور مچھلی کا تذکرہ بھی الگ سے کیا تاکہ دریائی تمام مخلوق کو شامل ہوجائے۔(۴)

علی معلم الناس الخیر: ''خیر'' سے مرادعلمِ دین ہے کیونکہ وہ سراسر خیر ہے۔(۵)

احوال مکحول:

راه الدارمي عن مکحول مرسلا: یہ روایت امام دارمی نے مکحول سے مرسلا یعنی بلاواسطۂ صحابی روایت کی ہے، اور رجلین کا تذکرہ بھی نہیں کیا، مکحول مشہور تابعی ہیں اوساط تابعین میں ان کا شمار ہے، فقیہ شام کہلاتے ہیں، حضرات صحابہ نے جب افغانستان میں کابل کا علاقہ فتح کیا اس وقت ان کو قیدی بنایا گیا پھر

(۱) المرقاة ۱ / ۴۳۰ مطبوعه أشرفيه، ديوبند.

(۲) فتح الإله ۲ / ۷۷دارالكتب العلميه، بيروت لبنان

(۳) المرقاة ۱ / ۴۳۰.

(٤) المرقاة ۱ / ۴۳۰.

(٥) تحفة الأبرار ۱ / ۲۰٤.

انھوں نے اسلام قبول کیا اور علم حاصل کیا امام اوزاعی وزہری کے استاذ ہیں۔

علماء ہی خشیت الٰہی رکھنے والے:

إنـمایخشی الله من عباده العلماء : عالم کی فضیلت اس لئے زیادہ ہے کہ خشیت زیادہ علماء میں ہی پائی جاتی ہے، خشیت کے معنی ہیں الخوف مع التعظیم کہ آدمی جس سے ڈرے اس کی عظمت قلب میں ہو، جیسے اولاد والدین سے استاذ شاگرد سے ڈرتا ہے، علماء میں اللہ کی خشیت زیادہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ کی ذات وصفات سے واقف ہوتے ہیں اور بادشاہ سے وہی ڈرتا ہے جو اس کے احوال سے زیادہ واقفیت رکھتا ہو اور شاہی آداب کو جانتا ہو۔

۲۰۳ / ۱۸: وعَنْ أَبِي سَعِيْدِ ِالـخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَـلَّـمَ "إِنَّ الـنَّاسَ لَكُمْ تَبَعٌ، وَإِنَّ رِجَالا يَأْتُوْنَكُمْ مِنْ أَقْطَارِ الأَرْضِ يَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ فَإِذَا أَتَوْكُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِهِمْ خَيْراً" (رواه الترمذي)[1]

ترجمه : حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگ تمہارے (یعنی صحابہ) کے تابع ہیں، اور لوگ تمہارے پاس اطراف عالم سے علم دین سیکھنے آئیں گے، لہٰذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو تم ان کے ساتھ بھلائی اور شفقت کا معاملہ کرنا۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

طلبۂ دین کے ساتھ خیر خواہی کی تاکید:

اس حدیث میں حضرات صحابہؓ کو اور صحابہؓ کے واسطہ سے قیامت تک آنے والے تمام معلمین کو نصیحت ہے کہ جو لوگ ان کے پاس علم حاصل کرنے کے لئے آئیں ان کے ساتھ نرمی وشفقت کا معاملہ فرمائیں اور خیر خواہی وہمدردی کا برتاؤ کریں۔

طبقۂ تابعین اور اس کی وجہ تسمیہ:

ان الناس لكم تبع: یہ خطاب صحابہؓ کو ہے، اور مطلب یہ ہے کہ لوگ اقوال وافعال میں تمہارا اتباع

(۱) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب ماجاء في الاستيصاء لمن يطلب العلم ۲ / ۹۳.

کریں گے کیونکہ تم نے شریعت کے اقوال وافعال کو مجھ سے سیکھا ہے، تبع کے لفظ سے تابعین کی وجہ تسمیہ بھی معلوم ہوگئی کہ وہ بلاواسطہ صحابہؓ کا اتباع کرنے والے ہیں، اس لئے تابعین ہیں۔

وان رجالا یأتونکم من أقطار الارض: ''اقطار'' قطر کی جمع ہے بمعنی گوشہ، جہت، اس جملہ میں آپ علیہ السلام نے پیش گوئی فرمائی کہ دنیا کی ہرسمت سے لوگ تمہارے پاس تحصیل علم کے لئے آئیں گے، علماء نے فرمایا کہ یہ پیش گوئی سو فیصد پوری ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدینہ طیبہ دارالعلم بن گیا، اور دنیا بھر سے لوگ جوق در جوق فرداً وجماعۃً صحابہ کرام کے پاس آئے، یہاں تک کہ مدینہ کے علاوہ اگر کسی دوسری جگہ کسی صحابی کا ہونا معلوم ہوتا لوگ وہاں بھی پہنچ جاتے۔(۱)

یتفقھون فی الدین: یہ جملۂ مستانفہ ہے اور ماقبل کے جملہ کی علت ہے۔

فاستوصوا بھم: یہ استیصاء سے ہے بمعنی حسن سلوک کرنا، خیرخواہی کرنا، خیرخواہی یہ ہے کہ ان کو شفقت کے ساتھ تعلیم دیں، ان کے اوقات کو ضیاع سے بچائیں، مفید چیزیں ان کو سکھائی جائیں، اوران کی تربیت بھی کی جائے جس سے علم پر عمل کا جذبہ بھی ان میں پیدا ہو۔(۲)

٢٠٣ / ١٩: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْحَكِيْمِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا، رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَابْنُ مَاجَة،(۳) وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ: هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ وَإِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْفَضْلِ الرَّاوِيْ يُضَعَّفُ فِي الْحَدِيْثِ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: دانائی (علم) کی بات عقلمند (عالم) کا گم شدہ سامان ہے، لہٰذا جہاں اس کو پالے وہ اس کا حقدار ہے۔

اس حدیث کو امام ترمذی اورامام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے، اور امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، اوراس کی سند میں ابراہیم بن فضل نام کے ایک روای ہیں جن کی (حدیث کے سلسلے میں) تضعیف کی گئی ہے۔ (ترمذی وابن ماجہ)

(١) المرقاة ١ / ٤٣٢.

(٢) اللمعات ١ / ٥٥٣.

(٣) أخرجه الترمذي في العلم، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة ٢ / ٩٨. وابن ماجه في المقدمة.

تشریح حدیث

کلمۂ حکمت؛ دانا انسان کی متاعِ گمشدہ:

اس حدیث میں طلباء وعلماء کے لئے نصیحت ہے کہ طالب علم اور عالم کو چاہئے کہ علم اور دانشمندی کی بات جہاں بھی ملے اور جس شخص کے پاس ملے اس کو حاصل کرلے۔

الکلمة الحکمة: موصوف صفت ہے، نیز اضافت کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے یعنی **کلمة الحکمة** اس حدیث کے دو مطلب ہیں:

(۱) علم کی بات جس کے پاس بھی پاؤ اس سے حاصل کرلو چاہے وہ شخص کم درجہ کا ہو اور خواہ وہ عالم نہ ہو، اس لئے کہ علم کی بات تمہارا گم شدہ مال ہے یعنی اگر تمہارا مال گم ہوجائے اور وہ کسی ایسے شخص کے پاس ملے جو معاشرہ میں کم درجہ والا ہے تو وہاں سے تم اپنے مال کو لے لوگے اس کے پاس سے لینے میں عار محسوس نہ کروگے، اسی طرح علم کی بات تمہیں جہاں بھی ملے وہ تمہارا متاع ہے اس کو وہاں سے حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرو۔(۱)

(۲) اس میں عوام کو ہدایت ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس علمی بات ہے تو وہ اصلاً عالم کا گم شدہ مال ہے اور اس کا حق ہے، لہٰذا وہ بات عالم تک پہنچادینی چاہئے۔(۲)

اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالم دین کو ہر مفید بات کا طالب رہنا چاہئے، اور حتی الوسع اس کے حصول کی کوشش کرنا چاہئے۔

درجۂ حدیث:

وقال الترمذی هذا حدیث غریب: صاحب مشکوۃ امام ترمذی کے حوالہ سے اس حدیث کا درجہ بتارہے ہیں کہ ازروئے سند یہ حدیث ضعیف ہے، اس لئے کہ اس کی سند میں ابراہیم بن الفضل المخزومی ایک راوی ہے، جس کی تضعیف کی گئی ہے۔

---

(۱) شرح المشکاة للطیبي ۱ / ٤١٤.

(۲) المرقاة ۱ / ٤٣٣.

۲۰۴ / ۲ :وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْهٌ وَاحِدٌ أَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ أَلْفِ عَابِدٍ.(رواه الترمذی و ابن ماجه)[1]

ترجمہ:حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:ایک فقیہ، شیطان پرایک ہزارعابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

تشریح حدیث

فقیہ عالم؛ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری:

اس حدیث میں بھی عابد پر عالم کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔

فقیہ سے مراد وہ عالم ہے جس کو علومِ دینیہ میں رسوخ کا درجہ حاصل ہو اور مکائد شیطانی سے واقف ہو اور اپنی خداداد فہم وفراست سے ان مکائد سے حفاظت کی تدبیر کر سکے، چنانچہ شیطان بہت سی مرتبہ لوگوں کو راہ راست سے ہٹانے کے لئے گمراہی کا جال بچھاتا ہے، لوگ اس کو حق سمجھتے ہیں، ایسے موقعہ پر ایک فقیہ عوام الناس کو بتاتا ہے کہ یہ شیطان کا مکر اور اس کا فریب ہے لوگ صحیح بات سمجھ لیتے ہیں اور شیطان کا فریب آشکارا ہوجاتا ہے جس سے شیطان کی وہ تدبیر ناکام ہوجاتی ہے اور وہ کفِ افسوس ملتا ہوا رہ جاتا ہے، محض عبادت گذار شخص شیطان کے مکائد سے واقف نہیں ہوتا، اس لئے وہ بہت سی مرتبہ خود ہی شیطان کے جال میں پھنس جاتا ہے، چہ جائیکہ وہ دوسروں کی حفاظت کرے، اس لئے ایک فقیہ شیطان پر ہزار عبادت گذاروں سے بھی زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ:

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ ہمارے حضرت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سناتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت جیلانیؒ رات کو مراقبہ فرمارہے تھے، جس میں یہ محسوس ہوا کہ اللہ کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں، اسی حال پر سخت پیاس لگی، اوپر سے ایک ہاتھ نظر آیا جس میں سونے کا گلاس تھا، آپ نے اس کو لینا چاہا مگر یہ سوچ کر لیتے

(۱)أخرجه الترمذی فی أبواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة ۲ / ۹۷ الرقم ۲۶۸۱.

وابن ماجه فی المقدمه، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ۱ / ۲۰ الرقم ۲۲۲.

لیتے رک گئے کہ اس کا استعمال تو حرام ہے، پھر خیال ہوا کہ اللہ ہی نے حرام کیا ہے اور وہی دے رہے ہیں، اس کے بعد خیال آیا کہ نہیں پیوں گا کیونکہ شریعت محمدیہ میں نسخ نہیں، اور یہ سوچ کر لاحول پڑھا، تو شیطان بھاگ گیا، مگر جاتے جاتے ٹانگ مار گیا اور کہا کہ: تو اپنے علم کے ذریعہ بچ گیا ورنہ اس جگہ پر لا کر میں نے بہت سوں کو گمراہ کیا، حضرت نے فرمایا: خبیث! اب بھی مجھے گمراہ کرنا چاہتا ہے، میں اللہ کے فضل سے بچا نہ کہ علم کی وجہ سے۔ (۱)

من الف عابد: ''الف'' برائے تکثیر ہے، برائے تحدید نہیں۔

اس حدیث کے مطابق جس طرح علماء عاملین اور فقہاء ماہرین شیطان کے لئے سخت ہوتے ہیں اسی طرح دنیا میں شیطانی طاقتوں اور اس کے آلہ کاروں کے لئے بھی یہ حضرات ''سخت'' ہوتے ہیں، اور ظاہری اسباب و آلات سے خالی ہونے کے باوجود شیطانی قوتیں انہی کو اپنے لئے خطرہ اور اپنے مقاصد کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ کما ہو مشاہد

۲۰۵ / ۲۱ : وَعَنْ أَنَسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ، وَوَاضِعُ الْعِلْمِ عِنْدَ غَيْرِ أَهْلِهِ كَمُقَلِّدِ الْخَنَازِيْرِ الْجَوْهَرَ وَاللُّؤْلُؤَ وَالذَّهَبَ. (رواه ابن ماجه(۲) وَرَوَى الْبَيْهَقِيُّ فِيْ ''شعب الإيمان''(۳) إِلٰى قَوْلِهِ: ''مُسْلِمٍ'' وَقَالَ: هٰذَا حَدِيْثٌ مَتْنُهُ مَشْهُوْرٌ، وَإِسْنَادُهُ ضَعِيْفٌ، وَقَدْ رُوِيَ مِنْ أَوْجُهٍ كُلُّهَا ضَعِيْفٌ)

ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اور نا اہل کو تعلیم دینے والا خنزیر کے گلے میں جواہرات، موتی اور سونے کا ہار ڈالنے والے کے مانند ہے۔

اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے، اور امام بیہقیؒ نے اس کو ''شعب الایمان'' میں لفظ ''مسلم'' تک روایت کیا ہے اور فرمایا کہ اس حدیث کا متن مشہور ہے، اور اس کی سند ضعیف ہے، اور یہ حدیث مختلف سندوں سے مروی ہے، مگر وہ سب ضعیف ہیں۔

---

(۱) از ملفوظات فقیہ الامت ۲ / ۵۷۔

(۱) أخرجه ابن ماجه في المقدمة، باب فضل العماء والحث على طلب العلم ۱ / ۲۰.

(۲) ۲ / ۲۵۵ (۱۶۶۵)

تشریح حدیث

طلب علم کی فرضیت اور نااہل کو علم سکھانے کی ممانعت:

اس حدیث میں علم کا حکم بیان کیا اور معلمین کو نصیحت کی گئی ہے کہ ناقدروں کو علم نہیں سکھانا چاہئے۔

طلب العلم فریضة: ''فریضة'' کی تاء مبالغہ کے لئے ہے یعنی بڑا فرض ہے اور علم سے مراد ''علم دین'' ہے، اور معنی یہ ہیں کہ علم دین کی تحصیل ہر مسلمان پر فرض ہے، پھر علم دین کی دو قسمیں ہیں: فرض عین اور فرض کفایہ، جیسا کہ کتاب العلم کے شروع میں گزرا، فرض عین اس قدر علم ہے جس سے شرعی فرائض وواجبات کو ادا کیا جاسکے اور محرمات وممنوعات سے بچا سکے، اتنا علم ہر شخص پر نماز روزہ کی طرح فرض ہے اور ہر بستی وعلاقہ میں مکمل علم دین کے حامل شخص کا رہنا فرض کفایہ ہے، خواہ وہ انہی میں سے ہو یا باہر سے بلایا گیا ہو، فرضِ عین کو ''علم الحال'' کہا جاتا ہے یہاں یہی علم الحال مراد ہے،[1] جس کا مفہوم ہے کہ ہر شخص پر اپنی ضرورت کا علم سیکھنا لازم ہے، پس غریب پر غیر مالی فرائض، مالدار پر مالی فرائض، تاجر پر تجارت کے، ملازم پر ملازمت واجرت کے اور کسان پر کاشتکاری وزراعت کے مسائل کا سیکھنا فرض ولازم ہے۔

علی کل مسلم: ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ بعض روایات میں ''مسلمة'' کا بھی لفظ ہے[2] لیکن علامہ سخاویؒ نے فرمایا کہ اس کے کسی طریق میں یہ لفظ مذکور نہیں اگرچہ معنی صحیح ہیں[3] لہذا یہ اضافہ ثابت نہیں ہے، البتہ مراد ضرور ہے، کیونکہ بقدر ضرورت علم دین کی تحصیل عورت پر بھی فرض ہے۔

پھر ''مسلم'' سے عاقل بالغ مسلمان مراد ہے، ناعاقل اور نابالغ پر تاوقت بلوغ وشعور کچھ فرض نہیں۔

وواضع العلم عند غیر أهله: اس جملہ میں بتایا گیا ہے کہ ناقدروں کو علم نہیں سکھانا چاہئے، کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے خنزیر کے گلے میں بیش قیمت چیزوں کا ہار ڈالا جائے، ایسا کرنے میں ان چیزوں کی ناقدری ہے۔

---

(۱) المرقاۃ ۱/ ۴۳۴.

(۲) المرقاۃ ۱/ ۴۳۴.

(۳) المقاصد الحسنة ص ۴۴۲.

"غير أهله" کی مراد میں کئی اقوال ہیں:
(۱) بعض نے فرمایا کہ: نااہل سے مراد وہ شخص ہے جس میں اُس علم کے سمجھنے کی استعداد نہ ہو۔
(۲) بعض نے کہا کہ: اس سے مراد وہ ہے جو علم دین حاصل کرے دنیوی غرض کے لئے۔
(۳) بعض نے فرمایا کہ: اس سے مراد وہ شخص ہے جس میں علم کی طلب نہ ہو۔

درجۂ حدیث

وقال: هذا حديث متنه مشهور وإسناده ضعيف: یہ روایت کافی مشہور اور زبان زد عام وخاص ہے، مگر از روئے سند ضعیف ہے، اور جیسا کہ ذکر کیا گیا "مسلمة" کا اضافہ تو ثابت ہی نہیں ہے، امام بیہقیؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث متعدد سندوں سے روایت کی گئی ہے، لیکن تمام کی تمام اسانید ضعیف ہیں تاہم امام مزی نے فرمایا ہے کہ تعددِ طرق کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ کے درجے میں ہے۔[1]

٢٠٦ / ٢٢: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "خَصْلَتَانِ لايَجْتَمِعَانِ فِيْ مُنَافِقٍ: حُسْنُ سَمْتٍ وَلافقهٌ فِي الدِّيْنِ" (رواه الترمذی)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دو خصلتیں ایسی ہیں جو منافق میں جمع نہیں ہو سکتیں: ایک اچھے اخلاق اور دوسرے دین کی سمجھ۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

حسن اخلاق اور تفقہ کی ترغیب:

اس حدیث میں علم کی اور اچھے اخلاق کے حصول کی تاکید ہے، فرمایا: دو خصلتیں منافق میں جمع نہیں

(۱) وقال العلقمي فی شرح الجامع الصغير: رأيت له خمسين طريقا، جمعتها فی جزء وحكمت بصحته لكن من القسم الثاني وهو الصحيح بغيره، فقول الجزري في البداية: لاأصل له، أي ليس له أصل صحيح، وقد مثل به ابن الصلاح للمشهور الذي ليس بصحيح؛ لكن قال العراقي: قد صحح بعض الأئمة بعض طرقه هذا، وقد ألحق بعض المصنفين بآخر الحديث "ومسلمة" وليس لها ذكر فی شيئ من طرقه، المرقاة ١ / ٤٣٥.

(٢) أخرجه الترمذی فی أبواب العلم، باب فضل طلب العلم، والدارمي، أبواب العلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب فضل طلب العلم. (٢٦٤٧)

ہوتیں، اچھے اخلاق اورفقہ فی الدین، منافق کے اندران میں سے کوئی ایک خصلت تو ہوسکتی ہے لیکن دونوں جمع نہیں ہوں گی اگرایک خصلت ہوگی تو دوسری مفقود ہوگی، مقصود مومنین کوان دونوں صفتوں کے جمع کرنے کی ترغیب دیناہے، کہ ان کی سیرت واخلاق بھی عمدہ ہوں اور دین کی فہم وسمجھ بھی حاصل ہو، بالخصوص ایک عالم دین کوان دونوں صفات کاحامل ہونا چاہئے تبھی لوگ اس کے علم سے لوگ فیضیاب ہوسکیں گے۔(۱)

ولافقه في الدين: اس سے مراد ایسا علم جودل میں اثر کرخشیت پیدا کرے اورخشیت کے نتیجہ میں عمل کی توفیق ملے۔

۲۰۷/ ۲۳: وَعَنْ أَنَسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ. (رواه الترمذي والدارمي)(۲)

ترجمه: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جوشخص علم حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر سے نکلا تو وہ اللہ کے راستہ میں ہے، یہاں تک کہ (اپنے گھر) واپس لوٹے۔

تشریح حدیث

طلب علم کے لئے گھر سے نکلنے والا راہِ خدامیں:

اس حدیث میں بھی طلب علم کی فضیلت ہے کہ جوطلب علم کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو وہ جبتک واپس نہ آجائے خدا کی راہ میں ہوتا ہے جس طرح مجاہد اللہ کے راستہ میں ہوتا ہے، کیونکہ طلب علم اورجہاد دونوں میں اتعابِ نفس اورتذلیل شیطان ہے، اس لئے دونوں اللہ کے راستہ میں ہیں اوراللہ کے راستہ میں مباح اعمال پربھی ثواب ہے، پس طالب علم کا ہرعمل موجب ثواب بن جائے گا،اوراگرگھرآ کرنشرعلم میں مشغول ہوجائے تو اس کا درجہ اور بڑھ جائے گا، کیونکہ نبیوں والے کام میں مشغول ہوگیا۔

(۱) تحفة الابرار ۱/ ۲۰۶.

(۲) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب فضل طلب العلم ۱/ ۹۳ الرقم ۲۶۴۸ والدارمي في المواسته، باب البلاغ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتعليم السنن ۱/ ۱۴۶ الرقم ۵۶۷.

۲۰۸ / ۲٤: وَعَنْ سَخبَرَةَ الأزديِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ كَانَ كَفَّارَةً لِمَا مَضٰى. رواه الترمذي والدارمي[1] وقال الترمذى: هذا حديث ضعيف الإسناد، وأبوداود الراوى يضعف.

ترجمہ: حضرت سخبرۃؓ ازدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص علم حاصل کرتا ہے تو یہ (طلبِ علم) اس کے گذشتہ گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے۔

امام ترمذی نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند کمزور ہے، اَبوداود نامی راوی (جو اس حدیث کی سند میں ہیں) کی تضعیف کی گئی ہے۔ (ترمذی، دارمی)

تشریحِ حدیث

تعارف سخبرہ الازدیؓ:

ازد: یمن کا ایک قبیلہ ہے اس کی طرف نسبت ہے، ان کے صحابی ہونے میں اختلاف ہے، لیکن صاحبِ مشکوۃ نے ان کو صحابہ کی فہرست میں ذکر کیا ہے اور یہی راجح ہے، البتہ قلیل الروایۃ ہیں اور صرف یہی ایک حدیث ان سے مروی ہے۔[2]

تحصیل علم، گزشتہ گناہوں کا کفارہ:

من طلب العلم كان كفارة لمامضى: طلبِ علم گناہوں کے لئے کفارہ اس وجہ سے ہے کہ طلبِ علم حسنہ ہے اور قاعدہ ہے، **إن الحسنات يذهبن السيئات** البتہ اس سے مراد صرف صغائر ہیں، کبیرہ کی معافی کے لئے توبہ لازم ہے، یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ تحصیل علم حقوق شناسی کا اور اور توبہ کا ذریعہ ہوجاتا ہے۔

(۱) أخرجه الترمذي في أبواب العلم، باب فضل طلب العلم ۱ / ۹۳، والدارمي في المقدمة، باب البلاغ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتعليم السنن ۱ / ۱٤٦، الرقم ٥٦٧.

(۲) سخبرة الأزدى بسكون الزاى، والدعبداللـه بن سنجرة، ويقال له الأسدي (الإصابة في القسم الأول: ۲ / ۳۰) وقد ذكره علاء الدين مغلطائى فى الإنابة إلى معرفة المختلف فيهم من الصحابة" ۱ / ۲٤۳، وقال: قال ابن حبان: يقال إن له صحبة، وذكره فى الصحابة أبوعمر، والأصفهانيان، وذكره ابن الجوزي فى "تسمية أصحاب الرسول ومن رآه" تحت الاسماء المفردة في الباب من حرف السين، "التلقيح" ۱٤۸ وصنيع الحافظ فى "الإصابة" يدل على أن له حديثين.

درجۂ حدیث:

وأبـو داود الراوي يضعف: اس سے امام ابوداود صاحب سنن مراد نہیں ہیں، بلکہ اس حدیث کے رواۃ میں سے ایک راوی اسی نام کے ہیں، وہ مراد ہیں جن کی تضعیف کی گئی ہے، لہٰذا یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔(۱)

۲۰۹ / ۲۵ : وَعَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَنْ یَّشْبَعَ الْمُؤمِنُ مِنْ خَیْرٍ یَسْمَعُهُ حَتّٰی یَکُوْنَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ. (رواه الترمذي) (۲)

ترجمه : حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مؤمن ہرگز خیر (علم) سے سیر نہیں ہوتا، جس کو وہ سنے (حاصل کرے) یہاں تک کہ اس کی انتہا جنت ہو جاتی ہے۔

تشریح حدیث

حقیقی طالبِ علم کی پہچان:

اس حدیث میں حقیقی طالب علم کی نشاندہی فرمائی گئی ہے کہ حقیقی طالب علم وہ ہے جو علم سے کبھی سیراب نہ ہو، بلکہ ہمیشہ زیادتی علم کا طلبگار رہے، اور طلب علم ہی میں اس کی موت آئے، یہ معنی اس لئے ہیں کہ ''یشبع'' کا لفظ استمرار پر دلالت کرتا ہے کہ تاحیات وہ علم کی طلب میں رہا، ایسے شخص کی انتہاء اور انجام جنت ہے، پس علم کی کوئی انتہاء نہیں، لہذا تازندگی اس کی تحصیل اور اس میں اضافہ کی کوشش رہے، چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا کہ ازدیادِ علم کی دعا کیا کریں: وقل رب زدني علما.

(۱) المرقاة ۱ / ٤٣٧.

قال الترمذي: أبو داود اسمه نفيع الأعمى، يضعف في الحديث، ولانعرف معا لعبدالله من سنجرة كبير شيئ، ولالأبيه، (جامع الترمذي ۲ / ۹۳)

قال الحافظ في "التقريب" رقم ۷۱۸۱: نفيع بن الحارث أبو داود الأعمى مشهور بكنية، كوفي، ويقال له: نافع، متروك، وقد كذبه ابن معين، من الخامسة، ت ق.

(۲) أخرجه الترمذي في سننه، ابواب العلم، باب ماجاء في فضل الفقه على العبادة ۲ / ۹۸.

۲۱۰ / ۲۶ : وَعَنُ أَبِیُ هُرَیُرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنُ سُئِلَ عَنُ عِلُمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ، أُلُجِمَ يَوُمَ الُقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنُ نَارٍ، (رواه احمد وأبوداود، والترمذي ورواه ابن ماجه عن أنسؓ)[۱]

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص سے علم کے متعلق کوئی ایسی بات پوچھی گئی جس کا اس کو علم تھا مگر اس نے اس کو چھپایا تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

تشریح حدیث

کتمانِ علم پر سخت وعید:

اس حدیث میں کتمان علم پر وعید ہے کہ جس سے کوئی علمی بات معلوم کی جائے اور معلوم ہونے کے باوجود نہ بتائے تو قیامت میں اس کو آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

کیونکہ علم دین کی تحصیل کی اصل غرض لوگوں کی رہنمائی اور ان کو مرضی الٰہی سے واقف کرانا ہے، پس لوگوں سے علم چھپانا گویا ان کو خدا تعالیٰ سے دور کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اس جرم کی جو بھی سزا ہو کم ہے، کتمانِ علم کے گناہ کا تعلق منہ اور زبان سے ہے اس لئے اس کے مناسب سزا کی وعید سنائی گئی، پس اہل علم کو دین کی تبلیغ واشاعت سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

علامہ خطابی نے فرمایا کہ یہ وعید اس وقت ہے جب کسی سخت ضرورت والی چیز کے بارے میں سوال کیا جائے اور مسئول کے علاوہ اور کوئی بتانے والا نہ ہو، اور مسئول کو بھی وہ بات تحقیق سے معلوم ہو، شک وتردد نہ ہو، نیز پوچھنے والا بھی باصلاحیت ہو۔[۲]

---

(۱) أخرجه أبوداود في العلم، باب كراهية منع العلم ۲ / ۵۱۵ والترمذي فيه، باب كتمان العلم ۲ / ۹۳. وابن ماجه: في المقدمة باب من سئل عن علم فكتمه ص: ۲۳.

وأحمد في "مسنده" ۲ / ۱۶۳ الرقم ۷۵۶۱. و۲ / ۳۰۵ الرقم ۸۰۳۵ و۲ / ۴۹۵ الرقم ۱۰۴۲۵ و۲ / ۳۴۴ الرقم ۸۵۱۴ و۲ / ۳۵۳ الرقم ۸۶۲۳ و۲ / ۲۹۶ الرقم ۷۹۳۰.

(۲) المرقاة ۱ / ۴۳۸.

علماء نے فرمایا ہے کہ کتاب کا نہ دینا بھی اس میں داخل ہے، جبکہ مذکورہ امور متحقق ہوں۔ (۱)

۲۱۱ / ۲۷: وَعَنْ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ اَوْلِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ، اَوْيَصْرِفَ بِه وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ، (رواه الترمذي، ورواه ابن ماجة عن ابن عمرؓ) (۲)

ترجمہ: حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جس شخص نے علم اس لئے حاصل کیا کہ وہ علم کے ذریعہ علماء پر فخر کرے، بیوقوفوں سے جھگڑے، اورلوگوں کے چہروں کواپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کوجہنم کی آگ میں داخل کرے گا۔

تشریحِ حدیث

احوال کعب بن مالکؓ:

جلیل القدراورمشہور صحابی ہیں، ابوعبداللہ اورابوعبدالرحمٰن کنیت ہے، اوربعض نے ابوبشیر کنیت بتائی ہے، بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے، اور بدروتبوک کے سوا تمام غزوات میں شریک رہے، ان تین صحابہ میں سے ہیں جن کی توبہ پچاس دنوں کے بعد قبول ہوئی تھی، جن کے بارے میں یہ آیت شریفہ نازل ہوئی: ''وعلى الثلثة الذين خلفوا ......الخ'' ۵۰ھ میں انتقال ہوا ہے۔ (۳)

مذموم مقاصد کے لئے علمِ دین کی تحصیل پر وعید:

اس حدیث میں اوراگلی حدیث میں طلب علم میں اخلاص کی اورنیت صحیح کرنے کی تعلیم دی گئی ہے،

(۱) ملاعلی قاریؒ نے مقاصد حسنہ للسخاوی سے نقل فرمایا ويشمل الوعيد حبس الكتب عن الطالب لاسيما عند عدم التعدد والابتلاء بهذا كثير، اھ. وخصوصا كتاب الوقف،مرقاة ۱ / ۴۳۸، المقاصد الحسنه.

(۲) أخرجه الترمذي في العلم، باب ماجاء في من يطلب بعلمه الدنيا ۲ / ۹۴ وابن ماجه في المقدمة، الانتفاع في العلم والعلم به ۱ / ۲۲.

(۳) وكان أحد شعراء النبي صلى الله عليه وسلم، وهو أحد الثلاثة الذين تخلفوا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم في غزوة تبوك؛وهم كعب بن مالك، وهلال بن أميه، ومرارة بن ربيعه بجمع أوائل أسمائهم مكه، المرقاة ۱ / ۴۳۸.

کہ تحصیل علم میں رضائے الٰہی کی اوراحیاء دین کی نیت ہو، نیز اپنی ذات سے اور دوسروں سے صفت جہل دور کرنے کی نیت ہو، علماء پر علمی تفوق جتلانے کی نیت نہ ہو، جاہ اورشہرت اور بے علم افراد کوخاموش کرنا مقصود نہ ہو۔

لیجاری به العلماء: ''مجاراۃ'' سے ہے بمعنی الجری فی العدو یعنی دوڑ میں مقابلہ کرنا، مراد ہے ان پر علمی تفوق جتلانا۔

لیماری به السفهاء: ''مماراۃ'' سے ہے بمعنی بحث کرنا، حجت بازی کرنا، مراد ہے بے علموں کو خاموش کرنا، ''سفہاء'' سے مراد بے علم یا کم علم لوگ ہیں۔

اویصرف به وجوه الناس الیه: لوگوں کے چہرے اپنی جانب پھیرنے سے مراد جاہ وشہرت کا طالب ہونا ہے۔

٢١٢ / ٢٨ : وَعَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا یُبْتَغیٰ بِهٖ وَجْهُ اللّٰه، لایَتَعَلَّمُهٗ إِلَّا لِیُصِیْبَ بِهٖ عَرَضاً مِنَ الدُّنْیَا، لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّةِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" یعنی رِیْحَهَا. (رواه أحمد، وأبوداود، وابن ماجه)[1]

ترجمه: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: جوشخص اس علم کو حاصل کرے جس کے ذریعہ اللہ کی رضاوخوشنودی کوطلب کیا جاتا ہے (لیکن) وہ اس کو اس غرض سے سیکھے کہ اس کے ذریعہ سے دنیا کا مال ومتاع حاصل کرے تو قیامت کے دن وہ جنت کی خوشبوبھی نہیں پائے گا۔

تشریح حدیث

اس حدیث میں بھی جیسا کہ اوپر بتایا گیا طلب علم میں اخلاص کی تعلیم دی گئی ہے کہ علم دین کی تحصیل سے اصل مقصود رضاء الٰہی ہو، فانی دنیا کا مال ومتاع مقصود نہ ہو۔

ممایبتغی به وجه الله: اس سے مرادعلِم دین ہے، علم دنیادنیا کے لئے حاصل کرنا جائز ہے اس پر

(١) أخرجه أبوداود فی العلم، باب فی طلب العلم لغیر الله ٢/٥١٥. وابن ماجه فی المقدمة ١/٢٢، وأحمد ٢/٣٣٨ الرقم: ٨٤٣٨.

یہ وعید نہیں ہے۔ (۱)

لم یجد عرف الجنة: عرف، عین کے فتحہ اور راء کے سکون کے ساتھ ہے بمعنی خوشبو، یہ کنایہ ہے تحریمِ جنت سے، کہ ایسے شخص کو جنت نصیب نہ ہوگی، مگر اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ فسادِ نیت گناہ تو ہے لیکن کفر نہیں ہے پھر تحریم جنت کیوں ہوگا؟

اس کے کئی جواب ہیں: (۱) یہ وعید مستحل پر محمول ہے۔ (۲)

(۲) یہ وعید زجراً وتوبیخاً ہے کہ اگر اس شخص نے اپنی اصلاح نہ کی تو نیت کا فساد مفضی الی الکفر ہوسکتا ہے۔ (۳)

(۳) عدم وجدان ریح مقید ہے یوم القیامۃ کی قید کے ساتھ اور یوم قیامت کہا جاتا ہے نفخۂ اولیٰ سے دخولِ جنت ودخول جہنم تک کے زمانہ کو، اور معنی یہ ہیں کہ صحیح عالم دین کو دخول جنت سے پہلے یعنی میدان محشر میں ہی جنت کی خوشبو آنی شروع ہوجائے گی اور ایسا عالم جس کی غرض فاسد ہے میدان محشر میں اس خوشبو سے محروم رہے گا اگرچہ جنت کا داخلہ اس کو مل جائے گا۔ (۴)

٢٩/٢١٣: وَعَنِ ابنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا؛ فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيْهٍ، وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلٰى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ ، ثَلَاثٌ لَايَغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ: إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ، وَالنَّصِيْحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ، وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ، فَإِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَرَائِهِمْ" (رواه الشافعي والبيهقي في "المدخل" ورواه احمد، والترمذی، وأبوداود، وابن ماجه، والدارمي عن زيد بن ثابتؓ، إِلَّاأَنَّ الترمذي وأباداوٗد لم يذكرا "ثلاث لايغل عليهن" إلى آخره) (٥)

(١) شرح المشكاة للطيبي ١/ ٤٢١–٤٢٢.

(٢) هذا قول ابن حجر المكي كمافى فتح الإله ٢/ ٨٨ مطبوعه دار الكتب العلميه بيروت لبنان.

(٣) المرقاة ١/ ٤٤٠.

(٤) كتاب الميسر للتوربشتي ١/ ١٠٧.

(٥) أخرجه أبوداود فى "العلم" باب فضل نشر العلم ٢: ٥١٥، والترمذى فيه باب ماجاء فى حث على تبليغ السماع ٢: ٩٤ وابن ماجه فى المقدمه، باب من بلغ علما ١/ ٢١ وأحمد فى مسنده ٥: ١٨٣ الرقم ٢١٦٣٠.

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات کو سنا، اور اس کو یاد کیا، اور محفوظ رکھا، اور اس کو (جس طرح سنا بعینہ اسی طرح) لوگوں تک پہنچایا، اس لئے کہ بہت سے فقہ (علم حدیث) حاصل کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے، اور بہت سے فقہ (علم حدیث) حاصل کرنے والے اپنے سے زیادہ فقیہ کو حدیث پہنچاتے ہیں۔

اور تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے مسلمان کا دل خیانت نہیں کرتا ایک چیز عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرنا، دوسرے مسلمانوں کے ساتھ بھلائی اور خیر خواہی کرنا، تیسرے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑنا، اس لئے کہ جماعت کی دعا ان کا چاروں طرف سے احاطہ کئے رہتی ہے۔

تشریح حدیث

اصحابِ حدیث کے لئے عظیم بشارت:

اس حدیث میں حدیث کی حفاظت اور اس کی تعلیم وتبلیغ کی فضیلت کا بیان ہے، اسی کے ضمن میں تین اہم اعمال کی فضیلت مذکور ہے۔

نضر الله عبداً سمع مقالتي: "نضر" ضاء کی تخفیف اور تشدید دونوں طرح صحیح ہے "نضارة" سے مشتق ہے بمعنی چہرہ کی رونق، اسی لئے اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ اس شخص کو سرسبز اور شاداب رکھے یا اللہ اس کو تروتازہ رکھے، مطلب یہ ہے کہ حدیث میں مشغول شخص کو چہرہ کی رونق وشادابی کی نعمت حاصل ہوتی ہے، جو سکون اور طمانیت کا نشان ہوتا ہے، سفیان بن عیینہ سے منقول ہے: "ما من احد يطلب الحديث إلا وفي وجهه نضرة اى بهجة صورية أو معنوية[1]" یعنی حدیث کے طالب ہر شخص کو چہرہ کی ظاہری یا معنوی شادابی حاصل ہوتی ہے، اور بقول بعض لوگوں میں قدر ومنزلت اور برتری مراد ہے کہ لوگ اس کو عزت اور رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور بفضل الٰہی حدیث میں مشغول افراد کو یہ دونوں نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

---

(۱) المرقاة ۱/۴۴۱.

آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے اس قول فرمان میں دعاء وخبر ہر دو کا احتمال ہے اور ظاہری یا معنوی شادابی کی یہ نعمت اس لئے عطاء کی گئی کہ اس شخص نے بھی حدیث کو یاد رکھ کر اور دوسروں تک پہنچا کے گویا اس کو زندہ وشاداب رکھا۔[1]

فحفظها ووعاها: اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ طالب علم کو علوم حفظ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، ہر فن کا کوئی جامع ومختصر متن حفظ کرنے کی سعی کرنی چاہئے، ایسا کرنے سے اس فن کا اجمالی خاکہ ہمہ وقت ذہن میں رہے گا اور اس کے گہرے وباریک مسائل سمجھا آسان ہوں گے اور اس میں خوب بصیرت پیدا ہوگی۔

وأداها فرب حامل فقه غير فقيه: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث حاصل کرنے کے بعد اس کو آگے پہنچانے کا حکم دیا اور اس کے فائدہ ومقصد کو بھی واضح فرمایا، وہ یہ کہ حدیث کا اصل مقصود مسائل وتعلیمات کا استنباط ہے، جس کے لئے فقہ وفہم ضروری ہے، اور اس کا ہر شخص میں ہونا ضروری نہیں، پس ایسا ہوسکتا ہے کہ حدیث حاصل کرنے والا فقیہ وفہیم نہ ہو، یا کم فقہ اور کم فہم والا ہو، جس کی وجہ سے وہ اس حدیث سے مسائل وتعلیمات کا کما حقہ استنباط نہ کر سکے اور مقصودِ حدیث فوت ہو جائے، لہذا اس کو چاہئے کہ وہ حدیث آگے پہنچادے، عین ممکن ہے کہ جس کو آگے حدیث پہنچے گی وہ پہنچانے والے شخص کے مقابلہ میں فقیہ یا اس سے افقہ ہو اور وہ حدیث سے خوب مسائل وتعلیمات کا استخراج کرے اور مقصود حدیث حاصل ہو۔

امام ابو یوسف کے تفقہ کا ایک واقعہ:

امام ابو یوسفؒ مشہور محدث سلیمان اعمش کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، ایک عورت نے آکر سلمان اعمش سے مسئلہ معلوم کیا، انہوں نے لاعلمی کا اظہار کردیا، امام ابو یوسفؒ نے سلیمان اعمش سے کہا کہ: اجازت ہو تو مسئلہ میں بتلادوں، انہوں نے اجازت دیدی، تو امام ابو یوسفؒ نے اس عورت کو مسئلہ بتادیا، جب وہ عورت چلی گئی تو سلیمان اعمش نے امام ابو یوسفؒ سے کہا کہ: تم نے یہ مسئلہ کہاں سے بتایا؟ امام ابو یوسفؒ نے کہا کہ: فلاں حدیث سے جو آپ نے ہمیں سنائی تھی، سلیمان اعمش نے کہا: یہ حدیث تو ہمیں اس وقت سے یاد ہے جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، مگر آج تک اس مسئلہ کی طرف ہمارا ذہن نہیں گیا،[2]

(۱) المرقاۃ ۱ / ۴۴۱.

(۲) المرقاۃ ۱ / ۴۴۰–۴۴۱.

تو یہ واقعہ اس حدیث کی تصدیق اور اس کا ایک مظہر ہے۔

تین اعمال اور ان کی فضیلت ومنفعت:

ثلث لا یغل علیھن قلب مسلم: اس میں تین اعمال کی فضیلت اور منفعت بتائی گئی ہے:
(۱)عمل کو اللہ کے لئے خالص کرنا (۲)مسلمانوں کے حق میں خیر خواہی کا جذبہ رکھنا (۳)جماعت مسلمین کو لازم پکڑنا، لزوم جماعت سے مراد ہے اعتقاد اور عمل صالح، صلوۃ جمعہ اور جماعت وغیرہ میں مسلمانوں کی موافقت کرنا۔(۱)

بالخصوص یہ آخری عمل ایسا ہے کہ اس کی برکت سے انسان شیطانی مکاید سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کی دعاء جماعت کے شامل حال رہتی ہے، جس کی وجہ سے شیطانی تدبیریں اثر انداز نہیں ہوتیں۔

لا یغل: بفتح الیاء، بابِ ضرب سے ہے بمعنی کینہ وحسد پر ہونا، اور بضم الیاء باب افعال سے ہے بالضم بمعنی خیانت کرنا، یعنی ان تین اعمال پر ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا قلب خیانت نہیں کرے گا اور نہ ہی اس میں حسد وکینہ پیدا ہوگا۔(۲)

حدیث کے اول وآخر میں ربط:

سوال: حدیث کے دو جملے ہیں، اول میں تبلیغ حدیث کی فضیلت ہے اور ثانی میں تین اعمال کی فضیلت ہے دونوں چیزیں بظاہر جدا جدا ہیں پھر ان دونوں میں ربط ومناسبت کیا ہے؟

جواب: ان میں کئی ربط ہیں:

(۱)اس طرف اشارہ ہے کہ تبلیغ حدیث ایسا عمل ہے جو مذکورہ تینوں اعمال کو جامع ہے یعنی تبلیغ حدیث کا منشاء ومحرک یہی صفات وجذبات ہوتے ہیں۔

(۲)اول حصہ میں تبلیغ حدیث کی فضیلت ہے اور ثانی میں ایک حدیث ذکر کردی ہے جس سے اشارہ ہے کہ اس حدیث کی تبلیغ زیادہ ہونی چاہئے۔

(۳)یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حدیث کی تبلیغ کرنے والے کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ان صفات کو اپنے

(۱)تاریخ المشاهير از قاضی سليمان منصورپوری ص ۲۸۵.

(۲) المرقاة ۱/ ۴٤٠.

اندر پیدا کرلے، اس کے بغیر تبلیغ کا فریضہ کماحقہ اداء نہیں کیا جاسکتا۔[1]

ورواه أحمد والترمذی الخ: اس روایت کو امام احمد، امام ترمذی، امام ابوداود، امام ابن ماجہ اور امام دارمیؒ نے بھی اپنی اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے، مگر دو فرقوں کے ساتھ، ایک یہ کہ ان حضرات نے حضرت زید بن ثابت سے اس کو روایت کیا ہے جبکہ امام بیہقی اور امام شافعیؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کیا ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ امام ترمذی وامام ابوداود نے حدیث کا دوسرا جز "**ثلاث لا یغل**" کو حذف کردیا ہے، یعنی انہوں نے اختصار کیا ہے۔

٢١٤ / ٣٠: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئاً فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَهٗ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَىٰ لَهٗ مِنْ سَامِعٍ. (روه الترمذي وابن ماجه[2] ورواه الدارمي عن أبي الدرداءؓ)[3]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ (خوش وخرم) رکھے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی، اور جس طرح سنی اسی طرح دوسروں تک پہنچادی، اس لئے کہ بہت سے وہ لوگ جن کو بات پہنچائی جاتی ہے وہ سننے والے کے مقابلہ میں زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔

تشریح حدیث

اس حدیث پاک کا مضمون بھی وہی ہے جو اس سے پہلے والی روایت کا تھا۔

مصنف کے اختیار کردہ طرز پر ایک اشکال وجواب:

سوال: اس سے پہلی روایت ابن مسعودؓ سے مروی ہے اور اس روایت کے راوی بھی ابن مسعود ہی ہیں ایسے موقعہ پر مصنف لفظ عنہ سے کام چلالیتے ہیں راوی کا نام ذکر نہیں کرتے، مگر یہاں مستقلاً نام ذکر کیا ہے

(١) المرقاة ١ / ٤٤١.

(٢) أخرجه الترمذی فی "العلم" باب ماجاء فی الحث علی تبليغ السماع ٢ / ٩٤ وابن ماجه فی المقدمة، باب من بلغ علما ١ / ٢١.

(٣) أخرجه الدارمي فی المقدمة، باب الاقتداء بالعلماء ١ / ٨١ الرقم ٢٣٤.

اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب یہ ہے کہ: مصنفؒ نے ایک وہم کے دفعیہ کے لئے ایسا کیا ہے وہ یہ کہ اس سے پہلی حدیث کا اصل حوالہ تحریر فرمانے کے بعد تخریج پر مزید کلام کرتے ہوئے بتایا کہ امام احمد، ترمذی، ابوداود وغیرہ نے اس حدیث کو زید بن ثابت سے روایت کیا ہے اب اگر یہاں عنہ کا لفظ استعمال کیا جاتا تو المرجع هو القريب کی وجہ سے کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ یہ روایت زید بن ثابت سے مروی ہے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مصنفؒ نے یہاں لفظ ''عنہ'' استعمال نہ فرما کر ''وعن ابن مسعودؓ'' فرمایا۔[۱]

فبلغه كماسمعه: اس حدیث میں روایت باللفظ کی قید ہے لہٰذا جو فضیلت یہاں مذکور ہے یہ اصلاً روایت باللفظ کی صورت میں حاصل ہوگی اگرچہ روایت بالمعنی بھی جائز ہے، اور امید ہے کہ وہ بھی اس بشارت سے محروم نہ ہوگا، کیونکہ جمہور علماء کے یہاں روایت بالمعنی بھی درست ہے۔[۲]

فرب مبلغ اوعى له من سامع: اس میں ''مبلغ'' سے مراد شاگرد اور ''سامع'' سے مراد استاذ ہے، ''مبلَّغ'' لام کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول کا صیغہ ہے۔

۲۱۵ / ۳۱: وَعَنُ ابُنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوُلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ: اِتَّقُوُا الُحَدِيُثَ عَنِّيُ إِلَّامَاعَلِمُتُمُ، فَمَنُ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأُ مَقُعَدَهُ مِنَ النَّارِ. (رواه الترمذي[۳] ورواه ابن ماجه[٤] عن ابن مسعود وجابر، ولم يذكر: "اتقواالحديث عني إلاماعلمتم")

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری طرف سے حدیث بیان کرنے سے بچو، سوائے اس حدیث کے کہ جس کے متعلق تمہیں یقین ہو (کہ یہ سچ ہے) اور جس آدمی نے عمداً مجھ پر جھوٹ گھڑا اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔

(۱) المرقاة ۱ / ٤٤٣.

(۲) المرقاة ۱ / ٤٤٣.

(۳) أخرجه الترمذي في التفسير، باب ماجاء في الذي يفسر القرآن برأيه ۲ / ۱۲۳.

(٤) أخرجه ابن ماجه في المقدمه، باب التغليظ في تعمد الكذب على رسول الله صلى الله عليه وسلم. ۱ / ٥.

تشریح حدیث

بیان حدیث میں جزم وتثبت کی تاکید اور کذب بیانی پر وعید:

ماقبل میں تبلیغ حدیث کی عظیم فضیلت بیان فرمائی لیکن اس میں اندیشہ تھا کہ کوئی اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے بیان حدیث میں حد سے تجاوز کر جائے اس لئے یہاں حدیث بیان کرنے میں احتیاط کا حکم دیا گیا ہے کہ جس حدیث کا تحقیق سے حدیث ہونا ثابت ہو اسی کو بیان کیا جائے۔

من كذب علي متعمداً: یہ مستقل حدیث بھی ہے اور حدیث کا ٹکڑا بھی، اور یہ حدیث متواتر ہے، تقریباً ساٹھ صحابہ سے مروی ہے، اور اس حدیث کی تشریح کتاب العلم کے شروع میں آچکی ہے۔

۲۱۶ / ۳۱: وعنه قال: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآن بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

وفي رواية: مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. (رواه الترمذی)(۱)

ترجمه: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس کو چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنالے۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ: جس نے قرآن کی تفسیر بغیر علم کے کی اس کو چاہئے کہ وہ جہنم کی آگ کو اپنا ٹھکانا بنالے۔ (ترمذی)

۲۱۷ : ۳۲: وَعَنْ جُنْدُبٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ قَالَ فِيْ الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ" (رواه الترمذي وأبو داود)(۲)

ترجمه: حضرت جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

(۱) أخرجه الترمذي في التفسير، باب ماجاء في الذي يفسر القرآن برأيه ۲ / ۱۲۳.

(۲) أخرجه أبو داود في العلم، باب الكلام في كتاب الله بلاعلم ۲ / ۵۱۴ والترمذی ابواب التفسير، باب ماجاء في الذی يفسر القرآن برأيه ۲ / ۱۲۳.

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی ، اور وہ تفسیر (اتفاق سے) صحیح اور درست بھی ہو پھر بھی اس نے غلطی کی۔ (ترمذی وابوداود)

تشریح حدیث

تفسیر بالرائے کی ممانعت اور اس پر وعید:

ان دونوں حدیثوں میں تفسیر بالرائے کی ممانعت ہے، پہلی حدیث میں تفسیر بالرائے پر جہنم کی وعید بیان فرمائی اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ قرآن کے بارے میں اگر کوئی شخص اپنی رائے سے کچھ کہے اگر اتفاقی طور پر اس کی وہ بات صحیح بھی ہو پھر بھی اس نے خطا کی، اس لئے کہ وہ تفسیر کے اصول مقررہ سے ہٹ گیا۔

تفسیر بالرائے کامفہوم:

تفسیر بالرائے کا مطلب ہے تفسیر کے مسلمہ اصول اور تفسیر کے مآخذ کو نظر انداز کر کے ایسی تفسیر بیان کی جائے جو قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہو،، مآخذ تفسیر چھ ہیں:

ماخذ تفسیر: (۱) قرآن کریم:

تفسیر کا پہلا ماٗخذ خود قرآن کریم ہے، علماء نے لکھا ہے: ''القرآن یُفَسِّر بعضُه بعضًا'' چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے مثلاً سورہ فاتحہ کی دعا میں یہ جملہ موجود ہے: ''صراط الذین أنعمت علیهم ''یعنی ہمیں ان لوگوں کے راستہ کی ہدایت کیجئے جن پر آپ کا انعام ہوا''، اب یہاں یہ بات واضح نہیں ہے کہ وہ لوگ کون ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا؟ لیکن ایک دوسری آیت میں ان کو واضح طور پر متعین کر دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ''فأولئک مع الّذینَ أَنعَمَ اللهُ علیهم من النبیینَ والصِّدیقین والشهداءِ والصالحین [۱]'' وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالح لوگ۔

(۱) من سورة النساء: ٦٩.

چنانچہ مفسرین کرام جب کسی آیت کی تفسیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر خود قرآن کریم میں ہی کسی اور جگہ موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسی کو اختیار فرماتے ہیں۔

(۲) حدیث:

''حدیث'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث ہی اس لئے فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی صحیح تشریح کھول کھول کر بیان فرمادیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل دونوں سے یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، اور درحقیقت آپکی پوری مبارک زندگی قرآن ہی کی عملی تفسیر ہے، اس لئے مفسرین کرامؒ نے قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ زور حدیث پر دیا ہے، اوراحادیث کی روشنی میں کتاب اللہ کے معنی متعین کئے ہیں، البتہ چونکہ حدیث میں ''صحیح''، ''ضعیف'' اور ''موضوع'' ہرطرح کی روایات موجود ہیں، اس لئے محقق مفسرین اس وقت تک کسی روایت کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے جب تک وہ تنقید روایات کے اصول پر پوری نہ اترتی ہو، لہٰذا جو روایت جہاں نظر آجائے اسے دیکھ کر قرآن کریم کی کوئی تفسیر متعین کرلینا درست نہیں، کیونکہ وہ روایت ضعیف اور دوسری مضبوط روایتوں کے خلاف بھی ہوسکتی ہے، لہذا یہ معاملہ بڑا نازک ہے، اوراس میں قدم رکھنا انہی لوگوں کا کام ہے جنھوں نے اپنی عمریں ان علوم کو حاصل کرنے میں خرچ کی ہیں۔

(۳) صحابہ کے اقوال:

صحابہ کرامؓ نے قرآن کریم کی تعلیم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، اس کے علاوہ نزول وحی کیوقت وہ بہ نفس نفیس موجود تھے، اورانہوں نے نزول قرآن کے پورے ماحول اور پس منظر کا بذات خود مشاہدہ کیا تھا، اس لئے فطری طور پر قرآن کریم کی تفسیر میں ان حضرات کے اقوال جتنے مستند اورقابل اعتماد ہوسکتے ہیں بعد کے لوگوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا جن آیتوں کی تفسیر قرآن یا حدیث سے معلوم نہیں ہوتی ان میں سب سے زیادہ اہمیت صحابہ کرامؓ کے اقوال کو حاصل ہے، چنانچہ اگرکسی آیت کی تفسیر پر صحابہؓ کا اتفاق ہوتو مفسرین کرام اسی کو اختیار کرتے ہیں اوراس کے خلاف کوئی اور تفسیر بیان کرنا جائز نہیں، ہاں! اگرکسی آیت کی تفسیر میں صحابہ کرامؓ کے اقوال مختلف ہوں توبعد کے مفسرین دوسرے دلائل کی

روشنی میں یہ دیکھتے ہیں کہ کونسی تفسیر کو ترجیح دی جائے؟ اس معاملہ میں اہم اصول اور قواعد: اصول فقہ، اصول حدیث، اور اصول تفسیر میں مدون ہیں، ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

(۴) تابعینؒ کے اقوال:

صحابہؓ کے بعد تابعینؒ کا نمبر آتا ہے، یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام سے سیکھی ہے، اس لئے ان کے اقوال بھی علم تفسیر میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اگرچہ اس معاملہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ تابعینؒ کے اقوال تفسیر میں حجت ہیں یا نہیں؟ لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(۵) لغت عرب:

قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، اس لئے تفسیر قرآن کرنے کے لئے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان کے پس منظر میں چونکہ کوئی شان نزول یا کوئی اور فقہی یا کلامی مسئلہ نہیں ہوتا، اس لئے ان کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال منقول نہیں ہوئے، چنانچہ ان کی تفسیر کا ذریعہ صرف لغت عرب ہوتی ہے، اور لغت ہی کی بنیاد پر اس کی تشریح کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہو تو مختلف آراء میں محاکمہ کے لئے بھی علم لغت سے کام لیا جاتا ہے۔

(۶) تدبر اور استنباط:

تفسیر کا آخری مأخذ ''تدبر اور استنباط'' ہے، قرآن کریم کے نکات واسرار ایک ایسا بحر ناپید کنارا ہے، جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، چنانچہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اسلامی علوم میں بصیرت عطا فرمائی ہو وہ جتنا اسمیں غور وفکر کرتا ہے اتنے ہی نئے نئے اسرار ونکات سامنے آتے ہیں، چنانچہ مفسرین کرامؒ اپنے اپنے تدبر کے نتائج بھی اپنی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں، لیکن یہ اسرار ونکات اسی وقت قابل قبول ہوتے ہیں جبکہ وہ مذکورہ بالا پانچ مأخذ سے متصادم نہ ہوں، لہٰذا اگر کوئی شخص قرآن کی تفسیر میں کوئی ایسا نکتہ یا اجتہاد بیان کرے جو قرآن وسنت، اجماع، لغت یا صحابہؓ وتابعینؒ کے اقوال کے خلاف ہو یا کسی دوسرے شرعی اصول سے ٹکراتا ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں، بعض صوفیاؒ نے تفسیر میں اس قسم کے اسرار و نکات بیان کرنے شروع کئے تھے، لیکن امت کے محقق علماء نے انھیں قابل اعتبار نہیں سمجھا، کیونکہ قرآن وسنت اور شریعت کے

بنیادی اصولوں کے خلاف کسی کی شخصی رائے ظاہر ہے کہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اور ایسی ہی تفسیر جو قرآن وسنت اور اجماع امت کے خلاف اور مذکورہ بالاماٰخذ سے متصادم ہو "تفسیر بالرائے" کہلاتی ہے۔(۱)

۲۱۸ / ۳۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "اَلْمِرَاءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرٌ" (رواه أحمد وأبو داود)(۲)

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔

تشریح حدیث

جدال فی القرآن؛ کفر:

اس حدیث پاک میں جدال فی القرآن کی ممانعت فرمائی گئی ہے بلکہ اس کو کفر قرار دیا ہے۔

المراء فی القرآن: قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تکذیب کی نیت سے بعض آیات کو بعض سے ٹکرایا جائے اور آیات کا باہم تعارض ثابت کیا جائے اور پھر قرآن کریم کو یہ کہکر چھوڑ دیا جائے کہ اس متضاد اور متعارض کلام پر کیسے عمل کریں یہ کفر ہے، اس لئے کہ ترک قرآن کفر ہے، اور اگر واقعی تعارض محسوس ہو تو اسکا حل حتی الامکان تطبیق دینا یا اپنی کم علمی کا اعتراف ہے نہ کہ اس کی تکذیب اور اس کو ترک کر دینا۔(۳)

اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا کہ: اس سے مراد یہ ہے کہ کسی منصوص وقطعی حکم کو محض کسی شبہ کی بناء پر ترک کر دیا جائے اور یہ بھی کفر ہے۔(۴)

۲۱۹ / ۳٤: وَعَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ: سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْماً يَتَدَارَؤُوْنَ فِي الْقُرْآنِ فَقَالَ: "اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِهٰذَا: ضَرَبُوْا كِتَابَ اللّٰهِ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، وَإِنَّمَا نَزَلَ كِتَابُ اللّٰهِ يُصَدِّقُ بَعْضُهُ بَعْضاً فَلَاتُكَذِّبُوْا

(۱) الإتقان ۲ / ۱۸٤، معارف القرآن ۱ / ۵۰-۵۲.

(۲) أخرجه أبو داود في كتاب السنة، باب النهي عن الجدال فى القرآن ۲ / ٦۲۳. وأحمد ۲ / ٤۲٤ الرقم ۹٤۷٤.

(۳) تحفة الابرار ۱ / ۲۱۳.

(٤) التعليق الصبيح ۱ / ۱۵۵ بحواله حجة الله البالغة.

بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، فَمَاعَلِمْتُمْ مِنْهُ فَقُوْلُوْا وَمَاجَهِلْتُمْ فَكِلُوْهُ إِلَى عَالِمِهِ" (رواه أحمد وابن ماجه)(۱)

ترجمه: حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کے متعلق سنا کہ وہ قرآن کے سلسلے میں آپس میں جھگڑ رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) ارشاد فرمایا کہ: اسی وجہ سے (یعنی کتاب اللہ میں جھگڑے کے سبب) تم سے پہلے لوگ ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کے بعض کو بعض سے ٹکرایا، حالانکہ اللہ کی کتاب اس طرح نازل ہوئی ہے کہ اس کا بعض بعض کی تصدیق کرے پس تم اس کے بعض کی بعض کے ذریعہ تکذیب نہ کرو، اس کے متعلق جتنا تم کو علم ہو اتنا بیان کرو اور جس کا علم نہ ہو اس کو اس کے عالم کے حوالہ کرو۔

تشریح حدیث

غیر عالم کو قرآن کریم میں رائے زنی کی ممانعت اور اہل علم سے رجوع کی تاکید:

اس حدیث میں گذشتہ حدیث کا مضمون کچھ تفصیل و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعض حصے کو بعض کے مخالف بتایا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہو چکے ہیں، کہ انھوں نے کتاب اللہ کے بعض حصے کو بعض کے مخالف بتایا تھا، حالانکہ اللہ کی کتاب اس طرح نازل ہوئی ہے کہ بعض بعض کی تصدیق کرتی ہے، پھر فرمایا کہ اگر تمھیں کہیں تعارض نظر آ رہا ہو اس میں تطبیق کی کوشش کرو، اور اگر تمھیں اتنا علم نہیں تو اس کو اس کے عالم کے حوالے کر دو۔

يتدارؤن في القرآن: يتدارؤن باب تفاعل سے ہے اور "درأ" سے مشتق ہے بمعنی تدافع، یعنی ایک دوسرے کی بات کی تردید کرنا، مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قرآن کریم کی بعض آیات کو دوسری بعض آیات کے مخالف قرار دیکران کی تکذیب کر رہے تھے، یا یہ کہ ہر ایک اپنے نظریات قرآن کریم سے ثابت کر رہا تھا اور دوسرا قرآنِ کریم سے ہی اس کی تردید کر رہا تھا اور مقصد دونوں کا قرآنِ کریم کی تکذیب تھا، نہ

(۱) أخرجه ابن ماجه في المقدمه، باب القدر ۱/ ۹ الرقم ۸۵ وأحمد في مسنده ۲: ۱۸۵ الرقم ۶۷۴۱.

کہ احقاقِ حق اورابطالِ باطل۔

وإنما نزل كتاب الله: یعنی قرآنِ کریم کی آیات باہم متعارض نہیں بلکہ ایک دوسرے کی مؤید ہیں اگرمتعارض محسوس ہوں تو وہ ہماری کم فہمی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے رسوخ فی العلم عطافرمایاہے ان کو تعارض محسوس نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباسؓ کی تفسیرِقرآن میں مہارت:

حضرت ابن عباسؓ دفع تعارض میں بہت ماہر تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دعادی تھی ''اللهم فَقِّهْهُ في الدينِ وعَلِّمْهُ التاويلَ'' یعنی اے اللہ ان کو دین کافہم اورتفسیر کاعلم عطاءفرما، اس دعاء کا اثر یہ تھا کہ آپ ''ترجمان القرآن'' کے لقب سے مشہور ہوئے، اورقرآن کریم کی تفسیر اور اس کے حل کے لئے بڑے بڑے صحابہ آپ سے رجوع کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اُن سے لوگوں نے سوال کیا کہ: قرآن کریم کی دوآیتوں میں تعارض ہے، ایک آیت میں مشرکین کامقولہ ہے:''والله ربنا ماكنا مشركين ''اوردوسری آیت میں ہے''وَلايَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثاً''؟ پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے شرک کو چھپائیں گے اور دوسری آیت میں ہے کہ وہ اللہ سے کچھ مخفی نہیں رکھ سکیں گے؟

حضرت ابن عباسؓ نے تطبیق بیان فرمائی کہ: ابتداً اُمیدِ نجات میں وہ شرک کو چھپائیں گے اورکہیں گے''والله ربنا ماكنا مشركين '' پھراللہ تعالیٰ ان کی زبان پرمہرلگادیں گے جس کا بیان اس آیت میں ہے: فرمائیں گے''اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلِهِمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْن '' پھران کے اعضاء وجوارح ان کی بداعمالیاں بیان کریں گے، چنانچہ آخرکاروہ اقرار کرلیں گے، تو''وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَاكُنَّا مُشْرِكِيْنَ '' میں ابتداء کی بات بیان کی گئی ہے اور''وَلايَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا'' میں اخیرحالت کابیان ہے۔(۱)

اسی طرح قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:''وَمَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَااَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمَنْ نَفْسَكَ '' جس کا حاصل یہ ہے کہ اچھی حالت اللہ کی طرف سے ہوتی ہے اور بری حالت خودانسان کی پیدا کردہ ،اوردوسری جگہ ارشاد ہے:''كل من عندالله'' کہ ہرطرح کی حالت

(۱) المرقاة ۱/ ۴۵۰.

اللہ کی طرف سے ہے تو بظاہر دونوں میں تعارض ہے؟

اس میں تطبیق یہ ہے کہ ''کل من عندالله '' میں خلق وتقدیر کا بیان ہے اور مااصابک میں سبب ظاہری کو بیان کیا گیا ہے۔[1]

پس قرآن کریم میں بظاہر کچھ تعارض محسوس ہوتا ہے لیکن ذرا بھی تفکر اور تدبر سے کام لیا جائے تو وہ ختم ہوجاتا ہے۔

''فما علمتم منه فقولوا وماجهلتم فكلوه الى عالمه ''یعنی ایسے موقعہ پر یا تو خود تدبر کرو وہ تعارض حل ہوجائے گا اور اگر خود حل نہ ہوسکے تو اہل علم کے حوالہ کردو وہ اپنے علم کی روشنی میں اس کو حل کردیں گے۔

۲۲۰ / ۳۵: وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ''أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، لِكُلِّ ايَةٍ مِنْهَا ظَهْرٌ وَبَطْنٌ، وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ'' راوه في شرح السنة.[2]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: قرآن سات لغات پر نازل کیا گیا ہے، اوران میں سے ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، اور ہر حد کے لئے ایک خبر مطلع ہونے کی جگہ ہے۔(شرح السنۃ)

تشریح حدیث

اہمیت حدیث:

یہ حدیث بہت اہم ہے اور یہ متفق علیہ روایت ہے بلکہ ابن ماجہ کے علاوہ جملہ صحاح ستہ میں موجود ہے اور معناً متواتر ہے، ابن حجر مکیؒ نے فرمایا اس حدیث شریف کا جزء اول ۲۱ صحابہ سے مروی ہے، لہذا یہ حدیث لفظاً بھی متواتر ہے۔[3]

---

(۱) تحفةالابرار ۱ / ۲۱٤،والمفاتيح ۱ / ۳۲۹.

(۲) أخرجه البغوى فى شرح السنة، كتاب العلم باب الخصومة فى القرآن ۱ / ۲۱٤الرقم ۱۲۲.

(۳) فتح الإله ۲ / ۱۰٤.

اس حدیث میں بہت سی ابحاث ہیں، اَوجز المسالک میں حضرت شیخؒ نے دس بحثیں ذکر فرمائی ہیں سب سے نازک اور اہم بحث اس میں تحقیق معنی کی ہے کہ ''سبعۃ احرف'' سے کیا مراد ہے۔

قرآن کریم کا سبعۃ احرف پر نزول اور اس کی مراد:

اس میں علماء کا بہت اختلاف ہے علامہ ابن العربی نے ۳۵ اور امام سیوطی نے ۴۰ر اقوال بیان فرمائے ہیں ان میں سے مشہور اقوال یہ ہیں۔

(۱) بعض نے کہا کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے، اس کی مراد ہمیں معلوم نہیں، اس لئے کہ حرف متعدد معنی میں استعمال ہوتا ہے حرف ہجا: الف، با، تا وغیرہ، کلمہ، جہت، یہاں حرف سے کیا مراد ہے؟ معلوم نہیں۔

(۲) بعض نے کہا کہ ''سبعۃ'' کے معنی سات اور ''احرف'' سے مراد مضامین ہیں، یعنی قرآن سات قسم کے مضامین پر نازل ہوا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) عقائد (۲) احکام (۳) اخلاق (۴) قصص (۵) وعدہ (۶) وعید (۷) امثال۔

(۳) بعض نے کہا ''سبعۃ'' سے مراد سات اور ''احرف'' سے متواتر قرات مراد ہے، اور معنی یہ ہیں کہ قرآن سات متواتر قرأتوں پر نازل ہوا ہے مگر یہ قول صحیح نہیں ہے اس لئے کہ متواتر قرأت محض سات نہیں بلکہ دس ہیں، سات اس لئے مشہور ہوگئیں کہ علامہ ابن مجاہد نے اپنے ایک رسالہ میں سات کو جمع فرمایا ہے لیکن ان کا مقصود انحصار کرنا نہیں تھا۔

(۴) قاضی عیاض اور شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ ''سبعۃ'' سے مراد کثرت اور ''احرف'' سے مراد قرأت ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن بہت سی متواتر قراءتوں پر نازل ہوا ہے اور وہ دس ہیں۔

(۵) ابن جریر طبری نے فرمایا کہ اس سے قبائل عرب کی سات لغات مراد ہیں، عربی زبان ایک وسیع زبان ہے جس میں علاقائی طور پر فرق پایا جاتا ہے، جیسے اردو زبان میں علاقائی طور پر فرق ہے، قرآن کا اصل نزول لغت قریش کے مطابق ہوا تھا لیکن دیگر قبائل کے لئے اس لغت میں پڑھنا دشوار تھا، اس لئے ان کو اپنی لغات میں پڑھنے کی اجازت دی گئی، اور وہ سات قبائل یہ ہیں: (۱) قریش (۲) طی (۳) ہوازن (۴) ثقیف (۵) اہل یمن (۶) ہذیل (۷) بنو تمیم، مشہور قبائل یہی ہیں، پھر جب قرآنی زبان کا دائرہ بڑھ گیا

اورلغت قریش پر پڑھنا آسان ہوگیا تو صرف اس کو باقی رکھا گیا اور باقی کو منسوخ کردیا گیا۔

(٦) امام مالکؒ اور علامہ جزریؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد اختلاف قرات کی سات نوعیتیں ہیں اور وہ یہ ہیں:

(١) اسماء کا اختلاف، اس میں افراد، تثنیہ، جمع کا اختلاف بھی داخل ہے جیسے تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ اور ایک قرات ہے تَمَّتْ كَلِمَاتُ رَبِّكَ.

(٢) افعال کا اختلاف، جیسے رَبَّنَا بَاعَدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا اور رَبَّنَا بَاعِدْ.

(٣) وجوہ اعراب کا اختلاف، جیسے ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ اور ذِي الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ.

(٤) الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، جیسے وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ والأُنثٰى اور ایک قراءت کے مطابق صرف والذكر والأنثى ہے۔

(٥) تقدیم وتاخیر کا اختلاف، جیسے جَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ، اور ایک قرات میں جَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ.

(٦) بدلیت کا اختلاف، یعنی ایک قراءت میں ایک لفظ ہے اور دوسری قراءت میں اس کے بجائے دوسرا جیسے نُنْشِزُهَا اور دوسری قرأت میں ہے نَنْشُرُهَا۔

(٧) لہجوں کا اختلاف، اس میں مد، قصر، امالہ، تفخیم، ترقیق وغیرہ سب داخل ہیں۔ (١)

اس حدیث کی تفسیر میں یہ چھٹا قول راجح ہے، اور اس پر کوئی خاص اشکال بھی نہیں ہوتا، باقی پر کچھ نہ کچھ اشکالات ہیں۔

آیات قرآن کا ظاہر وباطن:

لكل أية منها ظهر وبطن : اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے ''ظہر وبطن'' سے کیا مراد ہے اس میں بھی کئی قول ہیں:

(١) ''ظہر'' سے مراد الفاظ اور ''بطن'' سے مراد معانی۔

(٢) ظہر سے مراد ظاہر التفسیر اور معروف المعنی آیات اور ''بطن'' سے مراد وہ آیات جن کی تفسیر خفی اور جن کا مضمون مشکل ہے۔

---

(١) شرح المشكاة للطيبي ١/ ٤٣٢، ٤٣٣، وفتح الإله ٢/ ١٠٤-١٠٩، والمرقاة ١/ ٤٥١-٤٥٦.

(۳) ''ظہر'' سے مراد ظاہری معنیٰ اوربطن سے اسرار ونکات مراد ہیں یہی قول راجح ہے۔

(۴) ''ظہر'' سے مراد وہ معانی جونفس الفاظ سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور''بطن'' سے مراد وہ دقیق احکام ومسائل جن کے لئے قوت اجتہاد چاہئے، یہ مفہوم بھی قرین قیاس ہے۔(۱)

ولکل حدمطّلع: ''مطلع'' اسم ظرف ہے، بمعنی وہ جگہ جہاں سے چڑھ کر دیکھا جائے، مراد ذریعۂ اطلاع ہے، اور''حد'' میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: **ولکل حدمنهما (ای من الظهر والبطن) مطلع**، یعنی ظاہر اور باطن میں سے ہرایک کی حد کا ایک ذریعۂ اطلاع ہے، مطلب یہ ہے کہ ظاہر اور باطن میں ہرایک کی ایک حد ہے اور ہرحد کا ایک ذریعۂ اطلاع ہے، ظاہری معنیٰ کا ذریعۂ اطلاع: ''علوم تفسیر یہ'' میں درک اور کمال ہے، اور باطنی معنیٰ کا ذریعۂ اطلاع: تزکیہ نفس اور علم پر عمل ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''**من عمل بماعلم علمه الله علم مالم یعلم**''(۲)

۲۲۱ / ۳٦: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْعِلْمُ ثَلاثَةٌ: اٰيَةٌ مُحْكَمَةٌ، أَوْسُنَّةٌ قَائِمَةٌ، أَوْفَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ، وَمَاكَانَ سِوَى ذٰلِکَ فَهُوَ فَضْلٌ.(رواه أبوداود وابن ماجه)(۳)

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: علم تین ہیں (۱) آیاتِ محکمہ (۲) سنتِ ثابتہ (۳) فریضۂ عادلہ، اوران کے علاوہ جوکچھ ہے وہ زائد ہے۔(ابوداود وابن ماجہ)

تشریح حدیث

علوم شرعیہ اوران کا مصداق:

اس حدیث میں شریعت کے بنیادی علوم بتائے گئے ہیں کہ شریعت کے بنیادی علوم تین علوم ہیں:

(۱) آیة محکمة کا علم، ''محکمات'' کی قید لگا کر متشابہات کو نکال دیا کیونکہ ان سے استدلال نہیں

---

(۱) طيبي ۱ / ٤٣٥، وفتح الإله۲ / ۱۰۹ — ۱۱۰.

(۲) المرقاة ۱ / ٤٠٤ وقد مر تخريج هذا الحديث.

(۳) أخرجه أبوداود في الفرائض، باب ماجاء في تعليم الفرائض ۲ / ۳۹۹ وابن ماجه في المقدمة، باب اجتناب الرأى والقياس ۱ / ٦ الرقم ٥٤.

کیا جاتا ہے۔

(۲)اوسنة قائمة ای معمولة بها یعنی ایسی احادیث کا علم جو معمول بہا ہوں ''قائمۃ'' کی قید سے منسوخ کو نکال دیا گیا۔

(۳)او فریضة عادلة ،انصاف کرنے والا فریضہ، اس سے مراد ہے قرآن وسنت سے مستنبط ہونے والا فقہی مسئلہ، فقہی مسئلہ کو ''فریضہ'' اس لئے کہا کہ اس پر عمل واجب ہے اوراس کے ذریعہ معاشرہ میں انصاف قائم ہوتا ہے اس لئے اس کو ''عادلۃ'' کہا، اور بعض علماء نے کہا ہے کہ ''فریضۃ عادلۃ'' سے مراد اجماع اور قیاس ہیں، کیونکہ دونوں قرآن وسنت پر ہی مبنی ہوتے ہیں، پس ان ادلۂ اربعہ کا علم اور جو علوم ان سے مستنبط ہیں یہی شرعی علوم ہیں کہ شریعت کا علم انہی سے حاصل ہوتا ہے، باقی چیزیں علوم شرعی کا مصداق نہیں۔

وماكان سوى ذلك فهو فضل :ان علوم کے علاوہ جو علوم ہیں وہ ''فضل'' ہیں یعنی منجانب شرع فی نفسہ لازم نہیں، البتہ وسیلہ ہونے کے لحاظ سے بعض علوم ضروری ہوسکتے ہیں جیسے نحو صرف معانی بیان وغیرہ۔

۲۲۲ / ۳۷: وَعَنۡ عَوۡفِ بنِ مَالِكٍ الۡأَشۡجَعِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ: لايَقُصُّ إلاأَمِيۡرٌأَوۡمَأۡمُوۡرٌ أَوۡمُخۡتَالٌ.(رواه أبوداو [1] ورواه الدارمي [2] عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده وفي روايته: "أومراء" بدل"اومختال")

ترجمه: حضرت عوف بن مالک الأشجعیؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: وعظ ونصیحت تین آدمی ہی کرتے ہیں(۱) امیر (۲)مأمور (۳)متکبر،اس حدیث کوامام اُبوداودؒ نے روایت کیا ہے۔

اورامام دارمیؒ نے اس کو ''عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده '' کے طریق سے روایت کیا ہے، اوردارمی کی روایت میں لفظ''مختال'' کے بجائے لفظ''مراء''واقع ہوا ہے''جس کے معنی ہیں ریاکار''۔(ابوداود،دارمی)

(۱)أخرجه أبوداود في العلم، باب في القصص ۲ / ۵۱۵.

(۲)أخرجه الدارمي في الرقاق، باب النهي عن القصص ۲ / ۷۷۵ الرقم ۲٦۷۷.

تشریح حدیث

ہر شخص وعظ و نصیحت کے لئے آگے نہ بڑھے:

اس حدیث میں وعظ کا ادب بتایا کہ وعظ اخلاص کے ساتھ ہونا چاہئے، اس میں ریا و نمود نہ ہو۔

لایقص: بمعنی قصہ بیان کرنا، مراد ہے وعظ کہنا نصیحت کرنا، اس لئے کہ قصہ بیانی سے مقصود نصیحت ہوتی ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تین قسم کے لوگ وعظ کہتے ہیں ان میں سے دو کے اندر اخلاص ہوتا ہے ایک میں نہیں، امیر اپنی رعایا کو وعظ کہے تو یہ اخلاص پر مبنی ہوتا ہے کیونکہ اپنی رعایا کو اور اپنے ماتحتوں کو نصیحت کرنا حاکم کے فرائض منصبی میں داخل ہے لہٰذا وہ اخلاص ہی کے ساتھ کرے گا، یا پھر وعظ کہے گا حاکم کا مامور، جیسے اسلامی حکومتوں میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا شعبہ ہوتا ہے[1] شراح نے فرمایا کہ اس دوسری قسم میں علماء بھی داخل ہیں، ''لان العلماء ورثة الانبیاء''، ان کے علاوہ جو وعظ کہتا ہے عموماً اس میں تکبر ہوتا ہے پس جو نہ امیر ہو اور نہ مامور وہ اس پر اقدام نہ کرے۔

۲۲۳ / ۳۸: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ أُفْتِيَ بِغَيْرِ عِلْمٍ كَانَ إِثْمُهُ عَلٰى مَنْ أَفْتَاهُ، وَمَنْ أَشَارَ عَلٰى أَخِيْهِ بِأَمْرٍ يَعْلَمُ أَنَّ الرُّشْدَ فِيْ غَيْرِهِ فَقَدْ خَانَهُ'' (رواه ابوداود)[2]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جس شخص کو بغیر علم کے فتوی دیا گیا تو اس کا گناہ مفتی پر ہوگا، اور جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کو ایسے کام کا مشورہ دیا جس کے بارے میں اس کو علم ہے کہ بھلائی اس کے علاوہ صورت میں ہے تو اس نے اس کے ساتھ خیانت کی۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

مفتی کو تحقیق اور مستشار کو صحیح رہنمائی کی تاکید:

اس حدیث میں مفتی اور مستشار کو نصیحت کی گئی ہے مفتی کو بلا تحقیق مسئلہ نہ بتانا چاہئے اور مستشار کو

(۱) المرقاة ۱ / ۴۵۸.

(۲) أخرجه أبو داود في كتاب العلم، باب التوقي في الفتيا ۲ / ۵۱۵.

خیر وبھلائی کی جانب ہی رہنمائی کرنی چاہئے۔

من أفتى بغير علم: ''أُفتِيَ'' فعل ماضی مجہول ہے اِفتاء سے اور ''افتاء'' باب افعال کا مصدر ہے بمعنی کسی مسئلہ کا جواب دینا، پھر اس میں تخصیص ہوئی اور صرف دینی مسئلہ کے جواب دینے کو افتاء کہا جانے لگا، مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو دینی وشرعی حکم غلط بتایا تو اس کا گناہ مفتی پر ہوگا، البتہ اگر مفتی نے صحیح حکم معلوم کرنے کے لئے حتی الوسع سعی کی پھر بھی خطا ہوگئی تو اس وقت گناہ نہیں ہوگا، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ فتویٰ دینے والا فی نفسہ اس کا اہل ہو، لیکن اگر کوئی شخص نااہل ہونے کے باوجود افتاء پر جرأت کرے تو ہر حال میں گنہگار ہوگا، اسی طرح اگر کوئی نااہل سے سوال کرے تو سائل بھی گناہ گار ہوگا۔

ومن أشار على أخيه: یعنی جس سے مشورہ طلب کیا جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ خیر والی بات کا مشورہ دے، چاہے مشورہ طلب کرنے والا دشمن ہی کیوں نہ ہو، لہذا جس پہلو میں خیر محسوس ہو اگر اس کے علاوہ دوسرے پہلو کا مشورہ دیا تو خائن شمار ہوگا۔

۲۲۴ / ۳۹: وَعَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ: إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنِ الْأُغْلُوطَاتِ. (رواه ابوداود)[1]

ترجمہ: حضرت معاویہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نادر اور پیچیدہ مسائل (کے بارے میں سوال کرنے) سے منع فرمایا۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

بے فائدہ اور پیچیدہ سوال کی ممانعت:

اس حدیث میں عوام کو نصیحت ہے کہ علماء سے سوال کرنے میں نیت استفادہ کی کریں، بے فائدہ اور پیچیدہ باتوں کا سوال نہ کیا جائے، جس سے مقصود مسئول کو ذلیل کرنا اور اپنی علمی برتری ظاہر کرنا ہو، البتہ اگر مخاطب کی فہم کو پرکھنا مقصود ہو تو پھر پیچیدہ بات کا سوال کیا جاسکتا ہے، جیسے امتحان میں ہوتا ہے، یہ چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا: ایسا درخت بتاؤ جس کے پتے نہیں جھڑتے اور جو مسلمان کے مانند ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی جواب مرحمت

(۱) أخرجه ابوداود في العلم، باب التوقي في الفتيا ۲ / ۵۱۵.

فرمایا کہ وہ: کھجور کا درخت ہے۔

شراح نے فرمایا کہ بے جا سوال ابتداءً ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ سبب ایذاء ہے اور ایذاء پہنچانا حرام ہے، نیز بے جا سوال کرنا فتنہ وعداوت کا سبب ہے اور اس میں ایک مفسدہ یہ بھی ہے کہ اپنی برتری کا اور دوسرے کے نقص کا اظہار ہے، مگر جواباً وجزاءً ایسا سوال کرنا جائز ہے "لقوله تعالیٰ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا"۔(۱)

اغلوطات: اغلوطۃ کی جمع ہے، بمعنی پیچیدہ سوال، مشکل بات، فارسی میں اس کو چیستاں کہا جاتا ہے۔

۲۲۵ / ٤٠: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَالْقُرْآنَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَإِنِّي مَقْبُوْضٌ" (رواه الترمذي)(۲)

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم فرائض (اسلام) اور قرآن سیکھو، اور دوسروں کو بھی سکھاؤ، اس لئے کہ میری روح تو قبض کرلی جائے گی۔ (ترمذی)

تشریح حدیث

تحصیلِ علم میں جلدی کرنے کی ترغیب:

اس حدیث میں جلد علم حاصل کرنے کی ترغیب ہے کہ مجھ سے علوم جلدی حاصل کرو، اس لئے کہ ایک وقت آئے گا کہ میری وفات ہوجائے گی پھر یہ موقعہ نکل جائے گا۔

تعلموا الفرائض: فرائض کی مراد میں کئی قول ہیں:

(۱) بعض نے کہا کہ اس سے مراد علم فرائض (علم میراث) ہے۔

(۲) بعض نے کہا تمام احکام ضروریہ مراد ہیں یہی قول راجح ہے۔

(۳) بعض نے کہا کہ وہ فرائض مراد ہیں جو اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں، فرائض کے ساتھ قرآن کا تذکرہ اس لئے کیا کہ قرآن تمام احکام کی بنیاد ہے۔(۱)

(۱) المرقاة ۱ / ٤٥٩.

(۲) رواه الترمذی فی سننه: کتاب الفرائض، باب ماجاء فی تعلیم الفرائض، ۲ / ۲۹.

(۳) المرقاة ۱ / ٤٥٩.

٢٢٦ / ٤١: وَعَنْ اَبِيْ الدَّرْدَاءِ قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَشَخَصَ بِبَصَرِهٖ إِلَى السَّمَاءِ، ثُمَّ قَالَ: "هٰذَا أَوَانٌ يُخْتَلَسُ فِيْهِ الْعِلْمُ مِنَ النَّاسِ حَتّٰى لَايَقْدِرُوْا مِنْهُ عَلٰى شَيْئٍ"(رواه الترمذی)(١)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اورارشاد فرمایا کہ: یہ ایسا وقت ہے جس میں علم (وحی) لوگوں کے درمیان سے اٹھالیا جائے گا یہاں تک کہ وہ اس کے کسی حصہ پر بھی قدرت نہ رکھیں گے۔

تشریح حدیث

علم کے اٹھ جانے کی پیش گوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی وفات کا اشارہ:

اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے اٹھ جانے کی پیش گوئی فرمائی ہے اور اس کی ابتدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے ہوگی۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا کہ عنقریب وہ وقت آرہا ہے جس میں لوگوں سے وحی کو اٹھالیا جائے گا، یعنی میری وفات ہوجائے گی، جس کی وجہ سے وحی کا سلسلہ بند ہوجائے گا، اور پھر ایک وقت وہ آئیگا کہ علم اور دین سارا ہی اٹھ جائے گا۔

فشخص ببصره: "شَخَصَ" باب فتح سے ہے بمعنی بلند کرنا، "اوان" بمعنی وقت، "یختلس" اختلاس سے ہے بمعنی چھین لینا، اچانک لے لینا، "العلم" اس سے مراد "وحی الٰہی" ہے۔

٢٢٧ / ٤٢: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رِوَايَةً: "يُوْشِكُ أَنْ يَضْرِبَ النَّاسُ أَكْبَادَ الْإِبِلِ يَطْلُبُوْنَ الْعِلْمَ، فَلَايَجِدُوْنَ أَحَداً أَعْلَمَ مِنْ عَالِمِ الْمَدِيْنَةِ"(رواه الترمذي، و في جامعه: قال ابن عيينة: إنه مالكُ بنُ أنس، ومثله عن عبدالرزاق وقال إسحاق بن موسى: وسمعت ابن عيينة أنه قال: هو العمري الزاهد، واسمه: عبدالعزيز بن عبدالله).(٢)

(١) أخرجه الترمذي فى العلم، باب ماجاء فى ذهاب العلم ٢ / ٩٤

(٢) أخرجه الترمذي فى العلم، باب ماجاء فى عالم المدينة ٢ / ٩٧.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ وہ وقت قریب ہے کہ لوگ اونٹوں کے جگروں کو ماریں گے (سفر کریں گے) کہ وہ علم کو تلاش کریں گے چنانچہ وہ عالم مدینہ سے بڑا کوئی عالم نہیں پائیں گے۔ (ترمذی)

اور جامع ترمذی میں ابن عیینہ سے منقول ہے کہ عالمِ مدینہ سے مراد حضرت امام مالک بن انس ہیں اور عبدالرزاق سے بھی یہی منقول ہے، اسحاق بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عیینہؒ سے یہ سنا کہ ''عالم مدینہ'' سے مراد ''عمری الزاہد'' ہیں، جن کا نام عبدالعزیز بن عبداللہ ہے۔

تشریح حدیث

مدینہ میں ایک عالم پیدا ہونے کی پیشین گوئی:

اس حدیث میں عالم مدینہ کی فضیلت مذکور ہے کہ ایک زمانہ ایسا ہوگا کہ لوگ تحصیل علم کیلئے مختلف مقامات کے لمبے لمبے سفر کریں گے لیکن ''عالم مدینہ'' سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں پائیں گے۔

عن ابی هریرة روایة: روایۃً کے صیغہ سے حدیث کا مرفوع ہونا بیان کیا جاتا ہے کہ جو مضمون بیان کیا جارہا ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے نہ کہ صحابی کا، یہاں روایۃً کہنے والے ابو ہریرہؓ کے شاگرد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے یہ مضمون بیان کیا، شاگرد کو پختہ طور پر یاد نہیں رہا کہ ان کے استاذ ابو ہریرہؓ نے اس موقعہ پر قال رسول اللہ کہا تھا یا سمعت رسول اللہ کہا اس لئے شاگرد نے احتیاط پر عمل کرتے ہوئے رفع کے صریح صیغہ کے بجائے رفع کا مفہوم ادا کرتے ہوئے ''روایۃً'' کا صیغہ استعمال کیا۔

ان یضرب الناس أکباد الأبل: ''اکباد'' کبد کی جمع ہے بمعنی جگر، اونٹوں کے جگر کو مارنے سے مراد اونٹ کو تیز چلانا ہے کہ اونٹ کو تیز چلانے کے لئے ایڑھ لگائی جاتی ہے اور وہ اس کے جگر پر لگتی ہے، جس سے وہ تیز دوڑتا ہے۔

عالم مدینہ کی مراد:

امام ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا اور فرمایا کہ: سفیان بن عیینہ نے فرمایا کہ اس سے مراد امام

مالکؒ ہیں جو امام مجتہد اور حدیث کی مشہور کتاب ''مؤطا شریف'' کے جامع ومؤلف ہیں، آپ اپنے زمانے میں مدینہ کے بڑے عالم تھے، عبدالرزاق سے بھی عالم مدینہ کا مصداق یہی نقل کیا گیا ہے۔

مگر محدث اسحاق بن موسیٰ نے ابن عیینہ سے دوسرا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد عمری الزاہد ہیں، پھر ان کی مراد میں دو قول ہیں:

(۱) ان سے مراد عبدالعزیز بن عبداللہ ہیں یہ حضرت عمرؓ کے پڑپوتے تھے اور دنیا سے بے رغبت تھے اس لئے ان کو عمری الزاہد کہا جاتا ہے۔

(۲) اس سے مراد عمر بن عبدالعزیز ہیں کہ وہ بھی والدہ کی طرف سے عمری ہیں اور وہ بھی زاہد فی الدنیا تھے، مگر یہ قول مرجوح ہے اس لئے کہ عمر بن عبدالعزیز اہل شام میں سے ہیں اور یہاں فضیلت اہل مدینہ کی مذکور ہے۔[۱]

۲۲۸ / ۴۳: وَعَنْهُ فِيمَا أَعْلَمُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ لهادِيْنَها. (رواه أبو داود)[۱]

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے جو علم حاصل ہے اس میں سے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے (نفع کے) لئے ہر صدی کے سرے پر ایسے شخص کو بھیجتا رہے گا جو اس کے دین کی تجدید کرے۔ (ابوداود)

تشریح حدیث

ہر سو سال میں مجدد کا ظہور:

اس حدیث کے راوی بھی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں اور یہ روایت ''حدیث المجددین'' کہلاتی ہے جو بہت اہم حدیث شمار ہوتی ہے، علماء نے اس پر باقاعدہ رسائل بھی لکھے ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ

(۱) المرقاة ۱ / ۴۶۱.

(۱) أخرجه أبو داود في الملاحم، باب مايذكر في قرن المأة ۲ / ۵۸۹.

علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، اور لوگوں کی عادت ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ شریعت میں نئی باتیں پیدا کرلیا کرتے ہیں، لہٰذا اصلاح امت اور حفاظت شریعت کے لئے اللہ نے علماء کو پیدا فرمایا، اسی لئے وہ انبیاء کے وارث بھی ہیں، اللہ نے مزید حفاظت کے لئے یہ بھی انتظام فرمایا کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد کو مبعوث فرماتے ہیں، جو دین وشریعت پر پڑ جانے والے صدی بھر کے گرد وغبار اور اس میں پیدا ہوجانے والی خرابیوں کو اس سے ہٹاتے ہیں اور دین کو روز اول کی طرح تروتازہ کردیتے ہیں۔

وعنه فيما أعلم: "اعلم" اس صیغہ میں تین احتمال ہیں:

(۱) واحد متکلم کا صیغہ ہے اس وقت فاعل ابو ہریرہؓ ہوں گے یعنی ان باتوں میں سے جن کو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہے ان میں سے یہ بھی ہے۔

(۲) باب افعال سے واحد غائب کا صیغہ ہے بمعنی بتانا، خبر دینا اس صورت میں اس کا فاعل ابو ہریرہؓ کے شاگرد ابو علقمہ ہونگے یعنی ان باتوں میں سے جن کی خبر ابو ہریرہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی ہے ایک بات یہ بھی ہے، اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا اور اُن باتوں میں سے جن خبر ابو ہریرہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی ایک بات یہ ہے۔

(۳) باب افعال سے مضارع مجہول متکلم کا صیغہ ہے، اور اس کا نائب فاعل ضمیر مستتر ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف راجع ہے۔ اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ "اور ان باتوں میں سے جن کی خبر ابو ہریرہؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دی گئی ایک بات یہ ہے"۔[1]

مجدد کی آمد کا وقت:

علی رأس کل مائة سنة: اس سے مراد ہے صدی کا آخری حصہ یا ابتدائی حصہ، اس میں اللہ مجدد بھیجتا ہے تاکہ صدی بھر کی خرابیاں دور ہوجائیں اور نئی صدی کی ابتداء تروتازہ اور نکھری ہوئی شریعت سے ہو، اور یہ تجدیدی کام پچاس ساٹھ سال تک جاری رہتا ہے۔[2]

مجدد کو سو سال میں بھیجا جاتا ہے اسلئے کہ سو سال میں عموماً ایک طرح کے علماء ختم ہوجاتے ہیں، بدعات رائج ہوجاتی ہیں، سنت متروک ہوجاتی ہے حتی کہ اصل دین ختم ہونے کے قریب ہوجاتا ہے پس

(۱) شرح الطیبی ۱/ ۴۴۰.

(۲) راس کا اطلاق ابتداء وانتہاء دونوں پر ہوتا ہے: مرقاۃ ۱/ ۴۶.

سوسال گزرنے پرتجدید دین اور اس کی تدوین نو کی ضرورت ہوتی ہے۔

مجدد فرد واحد یا جماعت؟

پھر بعض نے کہا کہ ساری دنیا کا مجدد ایک ہی ہوتا ہے چنانچہ دوسری صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز تھے اور امام شافعی امام غزالی اور امام سیوطی بھی اپنی اپنی صدی کے مجدد تھے، لیکن جمہور نے فرمایا کہ پوری دنیا کے لئے ایک ہی مجدد ہونا ضروری نہیں بلکہ ایک زمانے میں مختلف مقامات میں کئی کئی لوگ مجدد ہوسکتے ہیں اور دین کے مختلف شعبے ہیں، ہر شعبہ کا مجدد الگ بھی ہوسکتا ہے۔(۱)

لہٰذا جو بھی اپنے علاقے میں تجدیدی نوعیت کا کام کرے وہ مجدد ہوگا، چنانچہ برصغیر میں تیرھویں صدی کے مجدد حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی ہیں کہ انہوں نے مدارس کا سلسلہ جاری کیا ورنہ دین مٹنے کے قریب تھا، حضرت تھانوی کو بھی مجدد کہا گیا ہے۔

مجدِّدُ الفِ سنۃ:

اللہ نے دین کی مزید حفاظت کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ دس صدی میں ایک بڑا مجدد بھیجتے ہیں، اس کو ''مجدد الف سنۃ'' کہا جاتا ہے اول دس صدی کے مجدد عمر بن عبدالعزیز ہیں اور ثانی دس کے مجدد ہیں: شیخ احمد سرہندی، جن کو ''مجدد الف ثانی'' کہا جاتا ہے، آپ کے دور میں اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کے نام سے ایک نیا دین قائم کیا تھا جو خرافات کا مجموعہ تھا تو آپ نے اس کا مقابلہ کیا اور دین محمدی کی حفاظت وتجدید کا فریضہ انجام دیا۔

مجدد ہونے کا علم کیسے ہوگا؟

پھر مجدد کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنے مجدد ہونے کا دعوی کرے، بلکہ اس کو اس کا علم ہونا بھی ضروری نہیں کہ وہ مجدد ہے، اس وقت کے علماء کسی کے تجدیدی کارناموں کی وجہ سے ظن کے درجے میں اس کے بارے میں کہدیں کہ وہ مجدد ہے، بس اتنا کافی ہے۔

---

(۱) تفصیل کے ملاحظہ فرمائیں: (فتح الباری)، وجامع الأصول لابن الأثیر ۱۱ / ۳۲۰، فی حرف النون، فی کتاب النبوۃ، فی الفصل الأول من (الباب الخامس فی معجزاتہ صلی اللہ علیہ وسلم) عند شرح حدیث (تجدید الدین) وفیض القدیر للمناوي ۱ / ۱۰-۱۲.

تجدید دین سے مراد:

من یجدد لها دینها: دین کی تجدید سے مراد احیاء سنت رد بدعت اور لوگوں کو اتباع سنت کی دعوت اوران کو اصل دین کی طرف پھیرنا ہے، لہذا جوان امور کو انجام دے وہی مجدد ہوسکتا ہے۔

۲۲۹ / ٤٤ : وَعَنْ إِبْرَاهِيمَ بنِ عَبدِالرَّحْمٰنِ الْعُذْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ، وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَأْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ.(رواه البيهقي في كتاب المدخل مرسلا)[۱]

وَسَنَذْكُرُ حَدِيْثَ جَابِرٍؓ "فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ" في باب التيمم إن شاء الله تعالىٰ.

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: اس علم کو ہر آنے والی جماعت کے نیک اور ثقہ لوگ حاصل کرتے رہیں گے جو اس علم (کتاب وسنت) سے حد سے تجاوز کرنے والوں کی تحریف، اوراہل باطل کے جھوٹ اور جاہلوں کی تاویلوں کو دور کریں گے، امام بیہقی نے اس کو کتاب المدخل میں مرسلا روایت کیا ہے اور حدیث جابرؓ "فانما شفاء العی السوال" کو ہم عنقریب باب التیمم میں ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

تشریح حدیث

دین کی حفاظت کرنے والے ہر زمانہ میں:

یہ حدیث مرسل ہے اورابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری تابعی ہیں، انہوں نے بلاواسطہ صحابی اس حدیث کوحضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے اس کا مضمون بھی سابق روایت کی طرح ہے، کہ حق تعالیٰ شانہ دین وشریعت کی حفاظت علماء سے کرائے گا، پس اہل علم کا اصل مشن حفاظت دین ہونا چاہئے۔

(۱)أخرجه البيهقي فى السنن الكبرى ، باب الرجل من أهل الفقه يسأل عن الرجل من أهل الحديث فيقول كفوا عن حديثه لأنه يغلط أويحدث بمالم يسمع أو لأنه لايبصر الفتيا ۱ / ۲۰۹ .

من كل خلف عدوله: ''خلف''لام کے فتحہ کے ساتھ ہے بمعنی لائق جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ اس کے معنی نااہل جانشین کے ہوتے ہیں، چنانچہ آیت کریمہ فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ میں برے جانشینوں کے لئے لام کے سکون کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

عدول: عادل کی جمع ہے، بمعنی ثقہ و با عتماد لوگ۔

تحریف الغالین: غالین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب و سنت کو ان کے معنی مرادی سے ہٹاتے ہیں، جیسے قدریہ معتزلہ وغیرہ علماء کی کوشش کی وجہ سے ان کی معنوی تحریف کامیاب نہیں ہوتی۔

انتحال المبطلین: انتحال کہتے ہیں دوسرے کے قول یا شعر کو اپنی طرف منسوب کرنا، ظاہر ہے کہ یہ کذب ہے اس لئے انتحال کا مرادی ترجمہ جھوٹ سے ہوتا ہے، باطل پرست دین میں بھی جھوٹی باتیں داخل کریں گے، علماء حق دین سے جھوٹ کو دور کریں گے یعنی ان جھوٹی باتوں کو دین میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ (۱)

تاویل الجاھلین: جاہلین سے فرق ضالہ کے وہ لوگ مراد ہیں جو جہالت اور ناسمجھی کی وجہ سے کتاب و سنت میں بے جا تاویل کرتے ہیں علماء ان جاہلانہ تاویلوں کو چلنے نہیں دیں گے۔ (۲)

اس حدیث سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی شریعت اور دین کی حفاظت کے لئے تا قیام قیامت ایسے لوگ پیدا کرے گا جو دین و شریعت کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں گے، اور کسی کو دین میں ادنی تبدیلی کا موقعہ نہ دیں گے چنانچہ علماء اسلام نے ہر زمانہ میں یہ فریضہ اداء کیا ہے۔

الفصل الثالث

۲۳۰ / ٤٥: عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلاً قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الإِسْلَامَ، فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ''(رواه الدارمي)(۳)

(۱)شرح الطیبی ۱ / ٤٤٢.

(۲)شرح الطیبی ۱ / ٤٤٢.

(۳) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب في فضل العلم والعالم ۱ / ۱۰٦ الرقم ۳٦۰.

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: جس شخص کی موت اس حال میں آئے کہ وہ علم حاصل کررہاہوتا کہ اس کے ذریعہ اسلام کا احیاء کرے تو جنت میں اس کے اورانبیاء علیہم السلام کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔(دارمی)

تشریحِ حدیث

طالب علم کا فریضہ اور فضیلت:

اس حدیث میں مخلص طالب علم کا مقام ومرتبہ بیان کیا گیاہے، حاصل یہ ہے کہ طالب علم اور عالم دین کا فرض منصبی اسلام کا احیاء اوراسلامی تعلیمات کی تبلیغ ہے، انبیاء علیہم السلام کواسی عظیم مقصد کے لئے مبعوث کیا گیاہے،اسی لئے علماء انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں اس لئے علماء کا مقام بھی بہت بلند ہے، لیکن انبیاء کے پاس وحی آتی ہے اورعلماء کے پاس وحی نہیں آتی اس لئے ان کے درمیان ایک درجہ کا فرق رکھا گیاہے اوروہ درجہ نبوت ہے۔

حسن نام کا مصداق:

اس حدیث کے راوی حضرت حسن بصریؒ ہیں حضرات محدثین کی اصطلاح میں جب حسن مطلق بولا جائے توحسن بصری ہی مراد ہوتے ہیں،[1] اورفقہاء کے یہاں مطلق بولے جانے کے وقت حسن بن زیاد اورصحابہ میں حضرت حسن بن علی مراد ہوتے ہیں، حضرت حسن بصریؒ کی مرسل روایات بھی مقبول ہیں۔

يحيى به الاسلام: یعنی احیاء اسلام اوراحیاء دین مقصود ہو مال وجاہ مقصود نہو۔

فبينه وبين النبيين درجة واحدة: اس درجہ سے ''درجہ نبوت'' مراد ہے۔

۲۳۱/ ٤٦ : وَعَنْهُ مُرْسَلاً قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَيْنِ كَانَا فِيْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ :أَحَدُهُمَا كَانَ عَالِماً يُصَلِّيْ الْمَكْتُوْبَةَ ،ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَيْرَ، وَالآخَرُ يَصُوْمُ النَّهَارَ، وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ، أَيُّهُمَا أَفْضَلُ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَضْلُ هٰذَا الْعَالِمِ الَّذِيْ يُصَلِّيْ الْمَكْتُوْبَةَ ثُمَّ يَجْلِسُ فَيُعَلِّمُ النَّاسَ

(۱)المرقاة ۱/ ٤٦٤.

الْخَيْرَ عَلَى الْعَابِدِ الَّذِيْ يَصُوْمُ النَّهَارَ وَيَقُوْمُ اللَّيْلَ كَفَضْلِيْ عَلٰى أَدْنَاكُمْ. (رواه الدارمي)(۱)

ترجمہ: حضرت حسن بصریؒ سے بطریق مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بنی اسرائیل کے دو شخصوں کے متعلق سوال کیا گیا، جن میں سے ایک تو عالم تھا جو فرض نماز پڑھتا اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو علمِ دین کی تعلیم دیتا تھا، اور دوسرا شخص وہ تھا جو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو عبادت کرتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اس عالم کی فضیلت جو فرض نماز پڑھتا ہے اور پھر بیٹھ کر لوگوں کو علمِ دین سکھاتا ہے اس عابد پر جو دن میں روزہ رکھتا ہے اور رات میں عبادت کرتا ہے ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ شخص پر۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

اس مضمون کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ عالم کو عابد پر حد درجہ فضیلت حاصل ہے، اس لئے کہ اس کا نفع متعدی ہے اور عابد کا نفع لازم ہے، اِس حدیث میں واقعی طور پر بنی اسرائیل کے دو شخصوں (ایک عالم اور ایک عابد) کا حال بتا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا گیا، اس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عالم کی فضیلت بیان فرمائی، عالم و عابد کی مراد کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ عالم سے ایسا عالم مراد ہے جو اداءِ فرائض کے بعد باقی اوقات کو نشرِ علم میں مشغول رکھتا ہے اور عابد سے مراد وہ عبادت گذار ہے جو اداءِ فرائض کے بعد باقی اوقات میں نوافل میں مشغول رہتا ہے۔

۲۳۲ / ۳۷: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِيْهُ فِي الدِّيْنِ، إِنِ احْتِيْجَ إِلَيْهِ نَفَعَ وَإِنِ اسْتُغْنِيَ عَنْهُ أَغْنٰى نَفْسَهٗ. (رواه رزين)(۲)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: فقیہ کتنا اچھا شخص ہے کہ اگر اس کی طرف لوگوں کو (دینی) ضرورت پیش آئے تو ان کو نفع

(۱) أخرجه الدارمي في سننه، المقدمة، باب في فضل العلم والعالم ۱/۱۰۳ (۳۵۲)

(۲) رواه ابن عساكر في تاريخه (۴۵/ ۳۰۳)

پہنچاتا ہے (اس ضرورت کو پوری کرتا ہے) اوراگراس سے استغناء اختیار کیا جائے تو وہ اپنی ذات کو نفع پہنچاتا ہے۔(رزین)

تشریح حدیث

فقیہ کی شان:

اس حدیث میں فقیہ کی مدح کی گئی اوراس کی شان بتائی گئی کہ اس کے علم سے ہرحال میں فائدہ ہوتا ہے فقیہ اپنے علم پر عمل کر کے خود بھی منتفع ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے، اگرلوگ اپنی دینی ضرورتوں کے سلسلہ میں اس سے رجوع کرتے ہیں تو ان کی رہبری اوررہنمائی کر کے اپنا فریضہ انجام دیتا ہے اوراپنے آپ کو نافع بناتا ہے۔

اوراگرلوگ اس سے استغناء برتیں بایں طور کہ دین سے دورہوجائیں اوراپنی دینی ضرورتوں کو اس کے پاس نہ لیجائیں تو اس کا علم اس حال میں بھی بے کار نہیں، بلکہ وہ اس وقت بھی اپنے علم پر عمل کر کے حق تعالی شانہ کی رضاوخوشنودی حاصل کرتا رہتا ہے اوراپنی ذات کو نفع پہونچاتا رہتا ہے، حاصل یہ کہ فقیہ کسی بھی حال میں فائدہ سے خالی نہیں۔

''اغناء نفس'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جب لوگ اس سے بے نیازی برتتے ہیں تو یہ بھی ان سے بے نیازی برتتا ہے، ان سے تعلقات بڑھانے کی تمنا نہیں رکھتا اورنہ ان کے اپنے پاس آنے کی خواہش رکھتا ہے، پس حدیث کا سبق یہ ہے کہ فقیہ عالم کو لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی فکر نہیں رکھنی چاہئے، ہاں از خود جب وہ کسی رہنمائی کے خواہشمند ہوں تو وہ ضرور کرنی چاہئے۔

۲۳۳ / ٤٨: وَعَنْ عِكْرِمَةَ أَنَّ ابنَ عَبَّاسٍ قَالَ: حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً، فَإِنْ أَبَيْتَ فَمَرَّتَيْنِ، فَإِنْ أَكْثَرْتَ فَثَلاثَ مَرَّاتٍ، وَلاتُمِلَّ النَّاسَ هٰذَا الْقُرْآنَ، وَلاأُلْفِيَنَّكَ تَأْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيْثٍ مِنْ حَدِيْثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتَقْطَعُ عَلَيْهِمْ حَدِيْثَهُمْ فَتُمِلُّهُمْ، وَلٰكِنْ أَنْصِتْ فَإِذَا أَمَرُوْكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُوْنَهُ، وَانْظُرِ السَّجْعَ مِنَ الدُّعَاءِ فَاجْتَنِبْهُ فَإِنِّيْ عَهِدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابَهُ لايَفْعَلُوْنَ ذٰلِكَ.(رواه البخاري)[1]

(۱)أخرجه البخاري في كتاب الدعوات، باب مايكره من السجع في الدعاء۲ / ۹۳۸ الرقم: ٦٣٣٧.

ترجمہ: حضرت عکرمہؒ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: تم ہفتہ میں ایک مرتبہ لوگوں کو وعظ کہا کرو، اور اگر تمہیں اس سے انکار ہو (زیادہ وعظ کہنا چاہو) تو (ہفتہ میں) دو مرتبہ، اور اگر کثرت سے وعظ کہنا چاہو تو (ہفتہ میں) بس تین مرتبہ (وعظ کہو) اور تم لوگوں کو قرآن شریف سے اکتاہٹ میں مت ڈالو، اور میں تم کو اس حال میں نہ پاؤں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو تم ان کی بات کاٹ کر ان کے سامنے وعظ کہنا شروع کردو، اور ان کو اکتاہٹ میں ڈال دو، بلکہ مناسب یہ ہے کہ تم خاموش رہو، پس جب وہ تم سے وعظ کی درخواست کریں تو اس وقت ان کے سامنے وعظ کہو حال یہ کہ وہ اس کی تمنا کررہے ہوں اور تم اپنی دعاء میں قافیہ بندی سے اجتناب کرو، چنانچہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے متعلق علم ہے کہ وہ حضرات ایسا نہیں کرتے تھے۔ (بخاری)

تشریحِ حدیث

احوالِ عکرمہؒ

آپ ابن عباسؓ کے خاص شاگرد ہیں، ابوعبداللہ کنیت ہے، اور فقہاء مکہ میں شمار ہیں، یہ بربری غلام تھے، حصین عنبری نے انہیں بطور ہدیہ ابن عباس کو پیش کیا تھا، حضرت ابن عباس نے ان کی خصوصی تربیت فرمائی اور بہت محنت سے ان کو علم سکھایا، فرماتے تھے کہ میں نے چالیس سال طلب علم میں گذارے ہیں، امام شعبی فرماتے تھے کہ ہمارے زمانہ میں ان سے بڑا کتاب اللہ کا کوئی عالم نہیں تھا۔ (۱)

وعظ ونصیحت کے کچھ آداب:

عبداللہ بن عباسؓ اپنے شاگردوں کو مختلف نصیحت فرمایا کرتے تھے، یہاں عکرمہ کو کئی نصیحتیں فرمائیں، ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک بار یا دو بار وعظ کہو اور اگر تمھیں وعظ کا زیادہ ہی جذبہ ہے تو ہفتہ میں بس تین مرتبہ وعظ کہو ورنہ لوگ اکتا کر ان دینی مجلسوں میں شریک ہونا چھوڑ دیں گے۔

دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ جب لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی بات کاٹ کر وعظ مت

(۱) تهذيب التهذيب ۷ / ۲٦٤، تذكرة الحفاظ للذهبى ۱ / ۹۰.

کہو ورنہ لوگ تم سے متوحش ہونگے اور دین کی پاکیزہ باتوں سے اکتانے لگیں گے، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ تم ان کی مجلس میں خاموشی سے بیٹھ جاؤ پھر ان کو احساس پیدا ہوگا کہ یہ عالم دین ہیں ان سے دینی استفادہ کرنا چاہئے، چنانچہ جب وہ تم سے اس کی درخواست کریں تب وعظ کہو پھر وہ تمہاری بات توجہ سے سنیں گے اور اس وقت تمہارا وعظ مؤثر ہوگا۔

تیسری نصیحت فرمائی کہ دعاء میں مسجع کلام استعمال نہ کرو، اس لئے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو ایسے کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ایک سوال و جواب:

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء میں مسجع کلام استعمال فرمایا ہے اور ماثورہ دعاؤں میں بہت سی دعائیں مسجع ومقفی ہیں، مثلاً یہ دعا ہے: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَایَنْفَعُ وَقَلْبٍ لَایَخْشَعُ وَنَفْسٍ لَا تَشْبَعُ''؟

جواب: ممانعت اس وقت ہے جبکہ سجع مقصود بالذات ہو اور بہ تکلف سجع وقافیہ بندی اختیار کی جائے لیکن اگر کوئی شخص ایسا فصیح وبلیغ ہے کہ خود بخود مسجع کلام اس کی زبان پر جاری ہوجاتا ہے تو اس کے حق میں ممانعت نہیں ہے حضور علیہ الصلوۃ والسلام اسی شان کے حامل تھے۔ (۱)

اور عام لوگوں کے حق میں وجہ ممانعت یہ ہے کہ دعا کا مقصود اللہ کی طرف مکمل توجہ اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہے اگر موزون کلام استعمال کیا جائے گا تو قلب موزون کلام کی طرف متوجہ رہے گا اور حق تعالیٰ شانہ کی طرف مکمل توجہ نہیں ہوگی جس سے دعا کا اصل مقصد فوت ہوجائے گا۔ (۲)

ولاالفینک: ''الفاء'' سے ہے بمعنی پانا۔

۲۳۴ / ۴۹: وَعَنْ وَاثِلَةَ بنِ الأَسْقَعِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ فَأَدْرَكَهُ كَانَ لَهُ كِفْلانِ مِنَ الأَجْرِ، فَإِنْ لَمْ يُدْرِكْهُ كَانَ لَهُ كِفْلٌ مِّنَ الأَجْرِ. (رواه الدارمي) (۳)

(۱) طيبي ۱ / ۴۴۵.

(۲) طيبي ۱ / ۴۴۵.

(۳) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب في فضل العلم والعالم ۱ / ۱۰۳ (۳۴۳)

ترجمہ: حضرت واثلہ بن اسقعؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو انسان علم کا طالب ہو پھر وہ اس علم کو حاصل بھی کرلے تو اس کے لئے اجر کے دو حصے ہیں، اور اگر وہ اس علم کو حاصل نہ کر پائے تو اس کے لئے ایک حصہ اجر ہے۔ (دارمی)

تشریح حدیث

احوال واثلہ بن اسقع:

جلیل القدر صحابی ہیں، پورا نام: واثلہ بن عبداللہ بن الاسقع ہے، پس یہ نسبت الی الجد ہے، حضرت واثلہ غزوہ تبوک سے قبل اسلام لائے اور اس غزوہ میں شریک بھی ہوئے، اُنکا اصحاب صفہ میں شمار ہے، اخیر میں شام چلے گئے تھے، اور وہیں ۸۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا، دمشق میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔(۱)

طالبِ علم ہر حال میں فائدہ میں:

اس حدیث میں بتایا گیا کہ مخلص طالب علم کی کوشش کبھی رائیگاں نہیں جاتی، خواہ علم حاصل ہو یا نہ ہو، اگر علم حاصل ہو جائے تو اس کو دو اجر ملیں گے ایک علم پر اور ایک طلب و کوشش پر، اور اگر علم حاصل نہ ہو تو ایک اجر یعنی محنت و کوشش پر پھر بھی ملے گا، یہ ایسا ہے جیسے مجتہد کہ اگر اس کا اجتہاد درست ہو تو اس کو دوگنا اجر ملتا ہے، ایک اجتہاد کا دوسرے صحیح اجتہاد کا، اور اگر اجتہا میں خطا ہو جائے تو نفسِ اجتہاد کا اجر پھر بھی ملتا ہے۔

۲۳۵ / ۵۰: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: عِلْماً عَلِمَهُ وَنَشَرَهُ، وَوَلَداً صَالِحاً تَرَكَهُ، أَوْمُصْحَفاً وَرَّثَهُ أَوْمَسْجِداً بَنَاهُ، أَوْبَيْتاً لِابْنِ السَّبِيْلِ بَنَاهُ، أَوْنَهْراً أَجْرَاهُ، أَوْصَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ. (رواه ابن ماجة والبيهقي في شعب الإيمان)(۲)

(۱) الإصابة ۵ / ۴۳۶—۴۳۷.

(۲) أخرجه ابن ماجه في المقدمة، باب ثواب معلم الناس الخير ۱ / ۲۲ والبيهقي في شعب الإيمان، فصل في الاختيار في صدقة التطوع ۳ / ۲۴۸ الرقم: ۳۴۴۸.

ترجمه: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مومن کو مرنے کے بعد اس کے جس عمل اور جن نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، ان میں سے ایک تو علم ہے جس کو اس نے سیکھا ہو اس کی اشاعت کی ہو، اور نیک اولاد ہے جس کو اس نے مرنے کے بعد چھوڑا ہو، اور قرآن مجید ہے جس کو اس نے وارثوں کے لئے چھوڑا ہو، اور مسجد ہے جس کو تعمیر کیا ہو، اور مسافر خانہ ہے جس کو اس نے بنایا ہو، اور پانی کی نہر ہے جس کو اس نے جاری کیا ہو، اور وہ صدقہ ہے جس کو اس نے اپنی زندگی میں نکالا ہو اپنے مال سے صحت کی حالت میں، ان تمام امور کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔ (ابن ماجہ، شعب الایمان)

تشریح حدیث

وہ اعمال جن کا ثواب بعد موت بھی ملتا ہے:

حدیث کا حاصل یہ ہے کہ انسان جب مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے اس لئے ثواب کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے مگر چند چیزوں کا ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے، اشاعت علم، صالح اولاد کے اعمال، میراث میں قرآن کریم چھوڑ کر جانا، مسجد تعمیر کرنا، مسافر خانہ بنانا، نہر کھدوانا صحت وتندرستی کی حالت میں صدقہ کرنا، پہلے بھی اس مضمون کی حدیث آچکی ہے۔

اشکال: ماقبل میں اس نوع کے تین اعمال بیان کئے گئے تھے اور یہاں ایسے سات اعمال بتائے گئے ہیں؟

جواب: حقیقۃً یہاں بھی وہی تین اعمال ہیں (۱) علم (۲) ولد صالح (۳) صدقہ جاریہ، یہاں جو باقی دیگر امور مذکور ہیں وہ سب صدقۂ جاریہ کی مثالیں ہیں فتدبر۔[1]

فی صحتہ وحیاتہ: معلوم ہوا کہ صحت کی حالت میں صدقہ کرنا مرض الوفات میں صدقہ کرنے سے بہتر ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی نے اپنی صحت کے دوران مال پر حرص کے باوجود اور فقر پر اندیشہ کے باوجود نکالا ہو۔[2]

---

(۱) المرقاة ۱ / ٤٦٧.

(۲) رواه مسلم فی کتاب الزکاة، باب بیان ان افضل الصدقة صدقة الصحیح الشحیح (۱۰۳۲).

٢٣٦ / ٥١: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَقُوْلُ إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ أَوْحٰى إِلَيَّ أَنَّه مَنْ سَلَكَ مَسْلَكًا فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ سَهَّلْتُ لَهُ طَرِيْقَ الْجَنَّةِ، وَمَنْ سَلَبْتُ كَرِيْمَتَيْهِ أَثَبْتُهُ عَلَيْهِمَا الْجَنَّةَ، وَفَضْلٌ فِيْ عِلْمٍ خَيْرٌ مِنْ فَضْلٍ فِيْ عِبَادَةٍ، وَمِلَاكُ الدِّيْنِ الْوَرَعُ. (رواه البيهقي في شعب الإيمان)[1]

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے میری طرف یہ وحی بھیجی ہے: جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ اختیار کرے تو میں اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردوں گا، اور جس آدمی کی دونوں آنکھیں میں نے چھین لی ہوں تو میں اس کو ان پر "صبر کرنے کی وجہ سے" جنت کا بدلہ دوں گا۔ اور علم کے اندر زیادتی عبادت کے اندر زیادتی سے بہتر ہے اور دین کی جڑ پرہیز گاری ہے۔ (شعب الایمان)

تشریح حدیث

طلبِ علم کی فضیلت اور بینائی چلے جانے کا ثواب:

اس حدیث میں دو چیزوں کی فضیلت مذکور ہے: علم طلب کرنا اور بینائی کا سلب ہوجانا، اور دو چیزوں کی جانب متوجہ کیا گیا ہے: ایک علم میں اضافہ کی کوشش کرنا اور دوسرے پرہیز گاری اختیار کرنا، یہ حدیث حدیثِ قدسی ہے۔

من سلک مسلکا: یہ جملہ اور اس کی تشریح ماقبل میں متعدد مرتبہ گزر چکی ہے۔

ومن سلبت کریمتیہ: "کریمة" بمعنی عمدہ وبیش قیمت چیز "أثبته" یہ اثابہ سے ہے بمعنی بدلہ دینا، بینائی حق تعالیٰ شانہ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے اگر وہ ختم ہوجائے تو گویا سب کچھ ختم ہوگیا، اس عظیم نعمت کے سلب ہوجانے پر اگر بندہ صبر کرے تو حق تعالیٰ نے اس کے لئے جنت کا وعدہ فرمایا، صبر کی قید دوسری حدیث میں مذکور ہے۔[2]

---

(١) أخرجه البيهقي فى شعب الإيمان، باب في المطاعم والمشارب ٥ / ٥٤ الرقم ٥٧٥١ .

(٢) المرقاة ١ / ٤٦٩ .

حدیث کے اول وآخر میں ربط:

یہاں پہلے جملے میں طلب علم کی فضیلت ہے اور ثانی میں سلب بینائی پر صبر کی فضیلت ہے دونوں میں مناسبت یہ ہے کہ علماء عموماً راتوں کو مطالعہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہتی ہے، یا کم ازکم متاثر ہوتی ہے، اس لئے دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا شراح نے فرمایا کہ اس فضیلت میں مادرزاد اور عارضی نابینا دونوں داخل ہیں۔[1]

وفضل في علم: یعنی علم کی قبیل کی معمولی فضیلت عبادت کی قبیل کی بڑی فضیلت سے بہتر ہے، کیونکہ عبادت کا نفع لازم ہے اور علم کا متعدی ہے،لہٰذا انسان کو ہمہ وقت اضافۂ علم اور خدمتِ علم کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔

ملاک الدین الورع: ''ملاک'' بمعنی مایعتمد علیہ، جس چیز پر اعتماد کیا جائے، مرادی ترجمہ جڑ اور بنیاد سے کیا جاتا ہے، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ علم اس وقت مفید ہے جب کہ عالم کی زندگی میں تقوی ہو۔

٢٣٧ / ٥٢: وَعَنِ ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ: تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَةً مِنَ اللَّيْلِ خَيْرٌ مِنْ إِحْيَائِهَا. (رواه الدارمي)[2]

ترجمه: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: رات کی ایک گھڑی علم کا پڑھنا پڑھانا پوری رات عبادت کرنے سے بہتر ہے۔ (دارمی)

تشریح حدیث

کچھ دیر مذاکرۂ علم احیاء لیل سے افضل:

یہ حدیث موقوف ہے اس میں علمی مجلس کی فضیلت بتائی گئی ہے عبادت پر، کہ رات میں کچھ دیر علم کا مذاکرہ خواہ پڑھنا پڑھانا ہو یا تکرار ومذاکرہ ساری رات عبادت کرنے سے بہتر ہے، اس لئے کہ علم کا نفع متعدی اور عبادت کا نفع لازم ہے۔

(١) المرقاة ١ / ٤٦٨.

(٢) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب مذاكرة العلم ١ / ١٥٧ الرقم ٦١٩.

۲۳۸ / ۵۳ : وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ بنِ عَمْرٍوؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّبِمَجْلِسَيْنِ فِيْ مَسْجِدِهٖ فَقَالَ: كِلاهُمَا عَلٰى خَيْرٍ، وَأَحَدُهُمَا أَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهٖ، أَمَّا هٰؤُلاءِ فَيَدْعُوْنَ اللّٰهَ وَيَرْغَبُوْنَ إِلَيْهِ فَإِنْ شَاءَ أَعْطَاهُمْ وَإِنْ شَاءَ مَنَعَهُمْ، وَأَمَّاهٰؤُلاءِ فَيَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْهَ أَوِ الْعِلْمَ وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ أَفْضَلُ، وَإِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ. (رواه الدارمي)[1]

ترجمہ : حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسجد میں دومجلسوں کے پاس سے گذرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے متعلق فرمایا کہ یہ دونوں مجلسیں خیر پر ہیں لیکن ان میں سے ایک دوسری سے افضل ہے، بہرحال ان میں سے ایک جماعت تو وہ ہے جو اللہ سے دعاء کررہی ہے اوراس سے اپنی رغبت کا اظہار کررہی ہے، تو اگر اللہ چاہے تو ان کو دے اوراگر چاہے تو نہ دے، اور بہرحال یہ لوگ (دوسری مجلس والے) فقہ اورعلم حال کررہے ہیں اور جاہلوں کوسکھارہے ہیں تو یہ افضل ہیں اور میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی مجلس میں بیٹھ گئے۔ (دارمی)

تشریح حدیث

آپ علیہ السلام کوبحیثیت معلم مبعوث کیا گیا:

اِس حدیث کا حاصل بھی یہی ہے کہ علم کی مجلس عبادت کی مجلس سے افضل ہے کیونکہ اہل علم عبادات ضروریہ کوتو اداکرتے ہی ہیں ساتھ ساتھ ان کا اشتغال علم کے ساتھ ہے علم خودبھی سیکھتے ہیں اور ناواقفوں کوبھی سکھاتے ہیں پس ان کا نفع دوچند ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں سے اپنا زیادہ قرب بتانے کے لئے ان کے پاس تشریف رکھی اورفرمایا کہ میں معلم بنا کرہی بھیجا گیاہوں۔

۲۳۹ / ۵٤ : وَعَنْ أَبِى الدَّرْدَاءِؓ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مَاحَدُّ الْعِلْمِ الَّذِيْ إِذَا بَلَغَهُ الرَّجُلُ كَانَ فَقِيْهاً؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : مَنْ حَفِظَ عَلٰى أُمَّتِيْ أَرْبَعِيْنَ حَدِيْثاً فِيْ أَمْرِ دِيْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِيْهاً وَكُنْتُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

(۱) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب فضل العلم والعالم ۱ / ۱۰۵ الرقم ۳۵۵.

شَافِعاً وَشَهِيْداً (۱)

ترجمہ: حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ علم کی وہ مقدار کیا ہے جس کو حاصل کرنے سے انسان فقیہ ہوجائے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص میری امت کے نفع کے لئے دین سے متعلق چالیس احادیث یاد کرلے تو اللہ تعالیٰ شانہ قیامت کے دن اس کو فقیہ بنا کر اٹھائے گا اور میں قیامت کے دن اس کی سفارش کرنے والا اور اس کے (خیر پر ہونے کی) گواہی دینے والا ہوں گا۔(شعب الایمان)

تشریح حدیث

فقیہ کون؟:

اس روایت میں تبلیغ علم کی خاص صورت ذکر کی گئی ہے، روایت کا پس منظر یہ ہے کہ کتاب وسنت میں فقہ فی الدین کے فضائل اور عنداللہ اس کا بڑا اجروثواب بیان کیا گیا ہے اس کو سن کر علم کی صحیح طلب رکھنے والا شخص تمنا کرتا ہے کہ وہ بھی اس زمرہ میں داخل ہوجائے اور اس اجر کا مستحق ہوجاتے، اس لئے صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم کیا کہ علم کی وہ مقدار کیا ہے جس سے آدمی اللہ کے یہاں فقیہ شمار ہو؟ اور روز قیامت اس کا حشر فقہاء میں ہو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص میری امت کے لئے ایسی چالیس احادیث محفوظ کرے جو دین سے متعلق ہوں تو حق تعالیٰ شانہ اس کو فقیہ بنا کر اٹھائے گا اور میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا۔

من حفظ علی أمتی اربعین حدیثا: اس کی مراد میں مختلف اقوال ہیں:

(۱) امام نوویؒ نے فرمایا کہ اس سے مراد چالیس حدیثوں کو نقل کرنا اور ان کو امت تک پہنچانا ہے ان کو حفظ یاد کیا ہو یا نہ کیا ہو اور ان کے معانی کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو،

(۲) ملا علی قاریؒ نے فرمایا کہ معنی کو پہچاننا بھی ضروری ہے محض الفاظ کا یاد کرنا کافی نہیں، اس لئے کہ حدیث میں ''فقیہ'' کا لفظ وارد ہوا ہے اور فقہ کے معنی کسی شی کو جاننے اور اس کو گہرائی سے سمجھنے کے ہیں، ملا علی قاری کی یہ بات نہایت معقول ہے۔(۲)

(۱) اخرجه البيهقي في شعب الايمان ۲ / ۲۷۰ (۱۷۲۶)

(۲) المرقاة ۱ / ۴۷۱.

فی أمر دینها: اِس قید کے ذریعہ اُن اخباری روایات سے احتراز کیا گیا جن کا تعلق دین سے اعتقاداً یا عملاً نہ ہو۔ (۱)

درجۂ حدیث:

یہ حدیث اگر چہ سنداً ضعیف ہے مگر متعدد اسانید سے مروی ہونے کی وجہ سے حسن لغیرہ کا درجہ رکھتی ہے اور اس کو تلقی بالقبول بھی حاصل ہے، ہر زمانہ میں علماء ومحدثین ''الاربعین'' کے نام سے مختلف مجموعے مرتب کر کے امت میں پھیلاتے رہے ہیں۔

۲۴۰ / ۵۵: وَعَنْ أَنَسِ بنِ مَالِكٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَدْرُوْنَ مَنْ أَجْوَدُ جُوْداً؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: "اَللّٰهُ تَعَالٰى أَجْوَدُ جُوْداً، ثُمَّ أَنَا أَجْوَدُ بَنِيْ آدَمَ، وأَجْوَدُهُمْ مِنْ بَعْدِيْ: رَجُلٌ عَلِمَ عِلْماً فَنَشَرَهٗ يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمِيْراً وَحْدَهٗ أَوْقَالَ: أُمَّةً وَاحِدَةً. (۲)

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ سب سے بڑا سخی کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ: اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سب سے بڑا سخی ہے اور انسانوں میں سب سے بڑا سخی میں ہوں، اور میرے بعد سب سے بڑا سخی وہ شخص ہوگا جس نے علم سیکھا پھر اس کی اشاعت کی ایسا شخص قیامت کے دن ایک امیر یا ایک امت کی طرح آئے گا۔ (بیہقی)

تشریح حدیث

اشاعت علم میں مشغول عالم کی شان:

اس حدیث میں اس عالم کی فضیلت ہے جو نشر علم میں مشغول ہو کہ وہ روز قیامت امیر کی حیثیت

(۱) المرقاة ۱ / ۴۷۰.

(۲) اخرجه البيهقى فى شعب الايمان ۲ / ۲۸۱ الرقم ۱۷۶۷.

سے یا ایک پوری امت کی حیثیت سے اللہ کے حضور حاضر ہوگا۔

من اجود جودا: جود کے معنی ہیں: **بذل الموجود مالاً كان أوعلماً.** یعنی اپنے پاس موجود چیز خرچ کرنا خواہ وہ علم ہو یا مال۔

اللہ تعالیٰ اجود جودا: وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کو بغیر کسی غرض کے پیدا فرمایا اور پھر تمام عالم کو روزی دیتا ہے اوران کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔

ثم أنا أجود بني آدم: اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مالی سخاوت بھی سب سے بڑھی ہوئی تھی جس کے واقعات آئندہ آئیں گے، خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے در سے خالی نہیں جاتا تھا، اور علمی سخاوت کا حال یہ ہے کہ آپ نے قیامت تک کے لئے علم وہدایت کا فیضان فرمایا۔

یأتی یوم القیامۃامیر اوحدہ: یعنی یہ عالم قیامت کے دن عزت وعظمت میں اس جماعت کے مانند ہوگا جس میں ایک شخص امیر ہو اور باقی سب مامور ہوں، ظاہر ہے کہ آدمی کی عزت اور قدر جماعت میں زیادہ ہوتی ہے۔

أو أمة واحدة: اگر کسی شخص میں بہت سی خصال حمیدہ جمع ہوجائیں جوعموماً ایک جماعت میں ہوتی ہیں تو اہل عرب اپنے محاورہ میں اس کو "امۃ" سے تعبیر کرتے ہیں جیسے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے فرمایا "اِنَّ اِبراھیم کان أمة" حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر تنہا اتنے اچھے اخلاق موجود تھے، جوایک جماعت میں ہوتے ہیں، پس اس شخص کی حیثیت بھی یہی ہوگی۔ (۱)

۲۴۱ / ۵۶: وَعَنهُ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَنْهُوْمَانِ لَايَشْبَعَانِ: مَنْهُوْمٌ فِي الْعِلْمِ لَايَشْبَعُ مِنْهُ، وَمَنْهُوْمٌ فِي الدُّنْيَا لَايَشْبَعُ مِنْهَا (۲) (روى البيهقي الأحاديث الثلاثة في "شعب الإيمان" وقال: قال الإمام أحمد في حديث أبي الدرداءؓ: هذا متن مشهورٌ فيما بين الناس وليس له إسنادٌ صحيح).

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱) المرقاۃ ۱ / ۴۷۲۔

(۲) اخرجہ البیہقی فی شعب الایمان فی باب الزھد وقصر الأمل ۷/ ۲۷۱ الرقم: ۱۰۲۷۹۔

ارشادفرمایا کہ: دوحریص ایسے ہیں جو (کبھی) سیراب نہیں ہوتے، ایک علم کا حریص کہ وہ علم سے سیراب نہیں ہوتا اور دوسرا دنیا کا حریص کہ وہ دنیا سے سیراب نہیں ہوتا۔ (بیہقی)

مذکورہ تینوں احادیث امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں روایت فرمائی ہیں اور فرمایا ہے کہ: امام احمد نے حضرت ابوالدرداء کی حدیث (حفظ الاربعین) کے بارے میں کہا ہے: کہ اس کا متن مشہور ہے مگر اس کی کوئی سند صحیح نہیں ہے۔

تشریح حدیث

دوحریص افراد:

اس حدیث میں زیادتی علم کی ترغیب دی گئی ہے، حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ دوقسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی حرص تمام زندگی ختم نہیں ہوتی: ایک طالب علم کہ وہ علم سے کبھی آسودہ نہیں ہوتا: وہ علم سے جتنی سیرابی حاصل کرتا ہے اس کی تشنگی میں اسی کے بقدر اضافہ ہوتا ہے، یہی حال طالبِ دنیا کا ہے کہ وہ دنیا کی دولت سے کبھی آسودہ نہیں ہوتا، جتنی دولت حاصل ہوتی ہے اتنا ہی زیادہ اس کے لالچ اور طلب دنیا میں اضافہ ہوتا ہے اِن دونوں قسم کے لوگوں کی حرص کا سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے البتہ جیسا کہ آئندہ روایت میں آرہا ہے دنیا کی حرص مذموم اور علم کی حرص محمود ہے۔

منهومان: نَهَمٌ سے ہے، بمعنیٰ کسی چیز کی حد سے زیادہ حرص اور خواہش رکھنا۔

هـذا متن مشهور: امام احمد بن حنبلؒ نے حدیث ابی الدرداء ''من حفظ علی امتی الخ'' کے بارے میں فرمایا کہ یہ متن حدیث لوگوں میں مشہور ہے مگر اس کی کوئی سند صحیح نہیں ہے، لیکن اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ چونکہ اس کوتلقی بالقبول حاصل ہے، اور متعدد طرق واسانید سے منقول ہے اس لئے مجموعی لحاظ سے یہ حدیث حسن لغیرہ ہے۔ (۱)

---

(۱) (وليس له إسناد صحيح) قال النووي: طرقه كلها ضعيفة، وقال الحافظ ابن حجر: جمعت طرقه كلها في جزء ليس فيها طريق تسلم من علة قادحة، قال ابن حجر المكي ولذا قال النووي: واتفق الحفاظ عل أنه حديث ضعيف وإن كثرت طرقه، وقداتفق الحفاظ على جواز العمل بالحديث الضعيف في فضائل الأعمال. اهـ

وأنت خبير بأن قضية مامهدوه في فن الحديث أن الحكم عليه بالضعف إنما هو بالنظر لكل طريق على حدته، وأما بالنظر إلى مجموع طرقه فحسن لغيره فيرتقي عن درجة الضعف إلى درجة الحسن. (المرقاة ١/ ٤٧٢ وفتح الإله ٢/ ١٣٨)

۲۴۲ / ۵۷: وَعَنْ عَوْنٍ قَالَ: قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍؓ: مَنْهُوْمَانِ لایَشْبَعَانِ، صَاحِبُ الْعِلْمِ وَصَاحِبُ الدُّنْيَا، وَلایَسْتَوِيَانِ، أَمَّا صَاحِبُ الْعِلْمِ فَيَزْدَادُ رِضیً لِلرَّحْمٰنِ، وَأَمَّا صَاحِبُ الدُّنْيَا فَيَتَمَادیٰ فِي الطُّغْيَانِ، ثُمَّ قَرَأَ عَبْدُاللّٰهِ: ’’كَلَّآإِنَّ الإِنْسَانَ لَيَطْغٰى أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنٰى‘‘ قال: وَقَالَ الآخَرُ: إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ‘‘(رواه الدارمی)(۱)

ترجمه: حضرت عونؒ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: دوحریص کبھی سیر نہیں ہوتے، ایک عالم اوردوسرے دنیادار، لیکن یہ دونوں (درجہ کے اعتبارسے) برابر نہیں ہیں، بہرحال عالم تو وہ (اپنے لئے) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی زیادہ کرتارہتاہے، اوردنیادار کی سرکشی میں اضافہ ہوتارہتاہے، پھرحضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی: ’’كَلَّآإِنَّ الإِنْسَانَ لَيَطْغٰى أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنٰى ‘‘(خبردار! انسان سرکشی کرتا ہے جب کہ وہ کثرتِ مال کی وجہ سے اپنے آپ کومستغنی دیکھتاہے) عونؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوسرا استشہاد یہ آیت ہے: ’’إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءِ ‘‘(اللہ کے بندوں میں علماء ہی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں)

تشریح حدیث

اس حدیث کا مضمون ماقبل کی روایت کی طرح ہے، البتہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود پرموقوف ہے یعنی ان کاقول ہے، ماقبل میں گذرا کہ علم کے طالب اوردنیاکے طالب کی حرص کبھی ختم نہیں ہوتی لیکن دونوں کا درجہ یکساں نہیں ہے، اس کی دلیل میں حضرت ابن مسعودؓ نے دوآیتیں تلاوت فرمائیں: ایک دنیادارکی مذمت میں کہ مال کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتاہے اوریہی بے نیازی اسے خداکا نافرمان بنادیتی ہے، دوسری آیت صاحب علم کی مدح میں تلاوت کی کہ جس میں جتنازیادہ علم ہوگا اتناہی اس میں خشیت زیادہ ہوگی، اوراس کی وجہ سے اللہ کی رضا اورمحبت میں اضافہ ہوگا اس لئے صاحب دنیا مذموم اورصاحب علم محمود ہے دونوں کا درجہ برابرنہیں ہے۔

(۱) أخرجه الدارمي في المقدمه، باب فضل العلم والعالم ۱ / ۱۰۲ الرقم ۳۳۸.

۲۴۳ / ۵۸: وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أُنَاساً مِنْ أُمَّتِي سَيَتَفَقَّهُوْنَ فِي الدِّيْنِ وَيَقْرَأُوْنَ الْقُرْآنَ، يَقُوْلُوْنَ: نَأْتِي الْأُمَرَاءَ فَنُصِيْبُ مِنْ دُنْيَاهُمْ وَنَعْتَزِلُهُمْ بِدِيْنِنَا وَلَايَكُوْنَ ذٰلِكَ كَمَالَايُجْتَنٰى مِنَ الْقَتَادِ إِلَّا الشَّوْكُ كَذَالِكَ لَايُجْتَنٰى مِنْ قُرْبِهِمْ إِلَّا قَالَ مُحَمَّد بنُ الصَّبَاحِ كَأَنَّهُ يَعْنِي الْخَطَايَا. (رواه ابن ماجه)(۱)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ: میری امت میں بہت سے لوگ علمِ دین حاصل کریں گے اورقرآن پڑھیں گے اورکہیں گے کہ ہم امراء کے پاس جاتے ہیں اوران کی دنیا میں سے کچھ حاصل کرتے ہیں اورہم ان (کی برائیوں) سے علیحدہ رہتے ہیں اپنے دین کی برکت سے لیکن ایسانہیں ہوگا جس طرح خاردار درخت سے سوائے کانٹے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح امراء کی صحبت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، مگر محمد بن صباح کہتے ہیں گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ (گناہ حاصل ہوتے ہیں)۔

تشریح حدیث

اہلِ علم کوامراء اوراہل ثروت کے پاس جانے سے احتراز کی تلقین:

اس حدیث میں علماء کونصیحت فرمائی گئی کہ اپنے علم کی قدرکریں اورمال اوراقتدار کے لالچ میں دنیا داروں کے پاس نہ جائیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی کہ آئندہ زمانہ میں علم دین کے حامل کچھ لوگ مال وجاہ کے لالچ میں دنیاداروں کے پاس جائیں گے اورکہیں گے کہ ہم ان سے کچھ دنیاحاصل کرتے ہیں، لیکن ان کی صحبت کا اثراپنے دین پرنہیں پڑنے دیتے اورہم کسی گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتے۔

ولایکون ذلک: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کی یہ بات درست نہیں کیونکہ ضدین جمع نہیں ہوتے پس جس طرح خاردار درخت کے پاس سے کانٹے ہی چنے جاسکتے ہیں وہاں سے پھولوں کی

(۱)أخرجه ابن ماجه في المقدمة، باب الانتفاع بالعلم والعمل به ۱ / ۲۲–۲۳.

امید فضول ہے، اسی طرح امراء کے پاس جانے سے فتنوں اور برائیوں میں ابتلاء ضرور ہوگا وہاں سے بھلائی کی توقع لغو ہے۔

سیتفقھون في الدین: اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فقہ فی الدین کا دعوی کریں گے حالانکہ حقیقی علم ان کے پاس نہیں ہوگا، اور یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ ان کو واقعۃً فقہ فی الدین حاصل نہیں ہوگا۔[1]

ویقرء ون القرآن: قراءت قرآن کا الگ سے ذکر تخصیص بعد التعمیم کے طور پر ہے۔

لایجتنی من القتاد إلا الشوک: ''لا یجتنی'' اجتناء سے ہے بمعنی چننا، ''القتاد'' کانٹے دار درخت، ''الشوک'' کانٹا۔

لایُجْتَنٰی من قربھم إلا: یہاں مستثنی کو حذف کردیا گیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ مستثنی ایسی شی ہے جو قابل تذکرہ نہیں، محمد بن صباح نے جواس حدیث کے رواۃ میں سے ہیں انہوں نے مستثنی لفظ ''خطایا'' بتایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ امراء کے پاس جانے سے گناہوں میں ابتلاء ہوگا، لیکن اس سے بہتر یہ ہے کہ مستثنی: ''الاخسران الدنیا والآخرہ'' قرار دیا جائے اس لئے کہ ''خطایا'' کو مستثنی قرار دینے میں صرف ضرر اخروی کا بیان ہوگا، اور مذکورہ جملہ کو مستثنی قرار دینے میں دنیا وآخرت ہردو کے نقصان کا بیان ہوگا، آخرت کا نقصان تو ظاہر ہے اور دنیا کا نقصان یہ ہے کہ تملق اور سوال سے ذلت آتی ہے اور فقر کا دروازہ کھلتا ہے۔

۲٤٤ / ٥٩: وَعَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ: لَوْأَنَّ أَهْلَ الْعِلْمِ صَانُوْا الْعِلْمَ، وَوَضَعُوْهُ عِنْدَ أَهْلِهٖ لَسَادُوْا بِهٖ أَهْلَ زَمَانِهِمْ، وَلٰكِنَّهُمْ بَذَلُوْهُ لِأَهْلِ الدُّنْيَا لِيَنَالُوْا بِهٖ مِنْ دُنْيَاهُمْ فَهَانُوْا عَلَيْهِمْ، سَمِعْتُ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِداً هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ، وَمَنْ تَشَعَّبَتْ بِهِ الْهُمُوْمُ أَحْوَالُ الدُّنْيَا لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ فِيْ أَيِّ أَوْدِيَتِهَا هَلَكَ. (رواه ابن ماجه ورواه البيهقي في شعب الإيمان عن ابن عمرؓ من قوله: مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ الى آخره)[2]

ترجمه: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے: انھوں نے فرمایا کہ اگر علماء علم کی

(١) شرح الطيبي ١ / ٤٥١ – ٤٥٢، المرقاة ١ / ٤٧٣.

(٢) رواه ابن ماجه في المقدمة ١ / ٢٣ والزهد ٢ / ٣٠٢ والبيهقي في شعب الايمان ٧ / ٢٨٩، الرقم ١٠٣٤٠.

حفاظت کرتے اور علم کو اس کے اہل ہی کو سکھاتے تو وہ علم کے ذریعہ اپنے زمانہ والوں کے سردار بن جاتے لیکن انہوں نے اپنے علم کو دنیا داروں (نااہلوں) کے لئے خرچ کیا تا کہ وہ اس کے ذریعہ دنیا کو حاصل کریں تو وہ دنیا والوں کی نظر میں ذلیل ہوگئے میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص اپنی تمام فکروں کو ایک فکر یعنی آخرت کی فکر بنالے تو اللہ دنیا کی فکروں سے اس کی کفایت فرمائے گا اور جس شخص کے افکار دنیا کے احوال (بجائے آخرت کی فکر میں منحصر ہونے کے) مختلف اور متفرق ہوں تو حق تعالیٰ اس کی پرواہ نہیں فرماتے خواہ وہ کسی وادی میں ہلاک ہوجائے۔ (ابن ماجہ)

اور امام بیہقی نے ''شعب الإیمان'' میں ابن عمرؓ کے واسطہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ''**من جعل الهموم**'' سے آخر تک نقل کیا ہے۔

تشریح حدیث

اہل علم کو علم کی قدر دانی کی نصیحت:

یہ حدیث بھی موقوف ہے، عبداللہ بن مسعودؓ نے علم کی قدر دانی کے سلسلہ میں علماء کو نصیحت فرمائی کہ اگر علماء اپنے علم کی قدر کرتے اور اور جو اہل لوگ ہیں انھیں کو علم سکھاتے یعنی جن کو علم کی طلب ہے اور ان کے اندر حصول علم کی استعداد ہے ان کو علم سکھاتے دنیا کے لالچ میں بے طلب لوگوں کو سکھانے کے درپے نہ ہوتے تو لوگوں کے قلوب میں علماء کی وقعت پیدا ہوجاتی اور لوگ ان کو اپنا سردار بنالیتے، لیکن (بہت سے) علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علم کو دنیاداروں کے لئے خرچ کیا اور دنیوی اغراض حاصل کرنے کے لئے انکے دروازوں پر جاکر بغیر ان کی طلب کے ان کو علم سکھانے کی پیش کش کرنے لگے تو اس کی وجہ سے علماء ذلیل اور بے قدر ہوگئے، حالانکہ جو شخص اللہ کی رضا اور آخرت کی درستگی کو اپنا مقصد بنالے تو اس کی دنیا کی حاجتیں خود حق تعالیٰ شانہ پوری فرماتا ہے، چنانچہ اس بات کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک حدیث مرفوع سنائی جس کا مطلب اور وجہ تائید خود ترجمہ سے ظاہر ہے حاصل یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے افکار کو اپنے اوپر مسلط کرلے، فکر آخرت کو مقصود بنا کر اپنی مساعی کا محور اس کو نہ بنائے تو حق تعالیٰ شانہ اس کی پرواہ نہیں فرماتے، ایسا شخص مدد خداوندی سے محروم ہوجاتا ہے، وادی میں ہلاک ہونے سے یہی مراد ہے۔

اس میں اہل علم کو سبق ہے کہ ان کے پیش نظر اصل آخرت ہو، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دنیوی

مسائل بھی حل فرمادے گا، اور اگر وہ دنیوی مسائل کو اصل مقصود بنائیں گے اور آخرت کو نظرانداز کریں گے تو پھر نہ دنیا کا مسئلہ حل ہوگا اور نہ آخرت کا۔

٢٤٥ / ٦٠: وَعَنِ الأَعْمَشْ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: آفَةُ الْعِلْمِ النِّسْيَانُ، وَإِضَاعَتُهُ أَنْ تُحَدِّثَ بِهِ غَيْرَأَهْلِهِ. (رواه الدارمي مرسلاً)(١)

ترجمه: حضرت اعمشؒ سے (مرسلاً) روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: علم کی آفت بھولنا ہے اور اس کو ضائع کرنا یہ ہے کہ تو اس کو نااہل کے سامنے بیان کرے۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال اعمشؒ:

نام سلیمان بن مہران ہے، ان کی آنکھوں میں چندھاپن تھا اس لئے اعمش لقب پڑگیا، آپ رؤیۃً تابعی ہیں روایۃً تابعی نہیں ہیں، وکیع بن الجراح فرماتے ہیں کہ تقریباً ستر سال تک ان کی تکبیر اولی فوت نہیں ہوئی، ۶۱ھ میں پیدائش اور ۱۴۷ھ میں وفات ہوئی۔ (۲)

علم کی حفاظت کی تاکید:

اس حدیث میں علم کی حفاظت اور اس کی قدردانی کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، نسیان سے علم ختم ہوجاتا ہے، پس اس کے اسباب سے بچو، اور جو لوگ علم کے قدردان اور مشتاق ہوں ان کے سامنے ہی علم بیان کرو۔

أفة العلم النسيان: اس کا تعلق بعد التحصیل سے ہے کہ حصول علم کے بعد اس کے ئے ایک ہی آفت (مصیبت) ہے وہ ہے نسیان ورنہ قبل التحصیل تو بہت آفات (رکاوٹیں) ہیں اسی لئے کہا گیا ہے ''لكل شئ آفة وللعلم آفات'' (۳)

(١) أخرجه الدارمي في سننه ١ / ١٥٨ الرقم ٦٢٩.

(٢) سير اعلام النبلاء ٦ / ٢٢٦ — ٢٤٨ مطبوعہ بیروت.

(٣) حلية الأولياء وطبقات الأصفياء ٣ / ١٨٣.

اسباب نسیان:

پھرنسیان غیراختیاری چیز ہے لیکن نسیان کے اسباب سے بچنا اختیاری امر ہے اس لئے حدیث کا مقصد یہ ہے کہ عالم کو اسباب نسیان سے بچنا چاہئے نسیان کے اسباب متعدد ہیں جن میں بعض اسباب یہ ہیں:
(۱) کتابوں کی طرف التفات نہ کرنا (۲) قلب کا خواہشات کی طرف متوجہ ہونا (۳) ارتکاب معاصی (۴) چوہے کا جھوٹا کھانا (۵) جوں کو زندہ چھوڑ دینا (۶) ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنا (۷) کھٹا سیب کھانا (۸) دنیا کے غموں کا زیادہ ہونا (۹) تیز گرم روٹی کھانا (۱۰) براہ راست ہانڈی سے کھانا (۱۱) زیادہ ہنسا خصوصاً قبرستان میں (۱۲) کثرت مزاح، علامہ زرنوجیؒ نے تعلیم المتعلم میں ان کو تفصیل سے ذکر کیا ہے۔(۱)

٢٤٦ / ٦١: وَعَنْ سُفْيَانَ أَنَّ عُمَرَبْنَ الخَطَّابِؓ قَالَ لِكَعْبٍ: مَنْ أَرْبَابُ الْعِلْمِ؟ قَالَ: الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ بِمَايَعْلَمُوْنَ، قَالَ: فَمَاأَخْرَجَ الْعِلْمَ مَنْ قُلُوْبِ الْعُلَمَاءِ، قَالَ: اَلطَّمَعُ. (رواه الدارمي)(۲)

ترجمہ: حضرت سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب احبارؒ سے معلوم کیا کہ: صاحبِ علم کون ہیں؟ حضرت کعب احبارؒ نے جواب دیا کہ جولوگ اپنے علم کے مطابق عمل کریں، پھر حضرت عمرؓ نے کہا کہ علماء کے دل سے علم کو کیا چیز نکالتی ہے؟ کعب نے فرمایا کہ لالچ۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال سفیان ثوری:

یہ سفیان بن سعید بن مسروق ہیں، ائمہ مجتہدین میں سے ہیں، امام الحفاظ اور اپنے زمانہ کے علماء کے سرخیل علماء میں ہیں، امام مالک کے اساتذہ میں اور امام ابوحنیفہ کے معاصر ہیں، اُن پر آخرت کا خوف

(۱) ردالمحتار ۱ / ۲۲۵، تعلیم المتعلم ص ۹۴.

(۲) أخرجه الدارمي في سننه ۱ / ۱۵۱ الرقم ۵۹۰.

غالب رہتا تھا جس کی وجہ سے پیشاب کی جگہ خون آتا تھا، حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ سے افضل قرار دیتے تھے اور راجح قول کے مطابق آپ تبع تابعی ہیں، ۹۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶۱ھ میں وفات ہوئی۔ (۱)

احوال کعب احبار:

ان کا نام کعب بن ماتع الحمیری ہے، یہ یہود کے بڑے عالم تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے، البتہ ایمان حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایمان لائے، یہ توریت کے بڑے عالم وماہر تھے اس کے علوم ومعارف کثرت سے صحابۂ کرام کے سامنے بیان فرماتے تھے، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ کرام ان سے علمی باتیں معلوم کرتے رہتے تھے۔ (۲)

حقیقی عالم کا مصداق اور اہل علم کی شان کو مخدوش کرنے والی چیز:

اس حدیث میں حقیقی اہل علم کا مصداق اور ان کی شان ذکر کی گئی ہے نیز جس چیز سے اہل علم کی شان مخدوش ہوتی ہے اس کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، حقیقی اہل علم وہ ہیں جو علم کے تقاضہ پر عمل کرتے ہیں، سفیان ثوری جو اس حدیث کے راوی ہیں اور حفاظ حدیث میں شمار ہیں، فرماتے تھے کہ میں نے ہر حدیث پر کم از کم ایک مرتبہ ضرور عمل کیا ہے۔

اور جس چیز سے علماء کی شان پر دھبہ آتا ہے وہ ہے لالچ اور حرص، کیونکہ لالچ کی وجہ سے عالم کی وقعت ختم ہو جاتی ہے جس سے علم کی نفع رسانی کا سلسلہ کمزور یا منقطع ہو جاتا ہے، نورِ علم کے نکل جانے سے یہاں یہی مراد ہے۔

۲۴۷ / ۶۲: وَعَنِ الْأَحْوَصِ بنِ حَكِيمٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ: سَأَلَ رَجُلُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الشَّرِّ فَقَالَ: لاتَسْأَلُوْنِي عَنِ الشَّرِّ، وَسَلُوْنِي عَنِ الْخَيْرِ يَقُوْلُهَا ثَلاثاً، ثُمَّ قَالَ: أَلا إِنَّ شَرَّ الشَّرِّ شِرَارُ الْعُلَمَاءِ وَإِنَّ خَيْرَ الْخَيْرِ خِيَارُ الْعُلَمَاءِ. (رواه الدارمي) (۳)

(۱) سير أعلام النبلاء ۷ / ۲۲۹.

(۲) سير أعلام النبلاء ۳ / ۴۸۹.

(۳) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب التوبيخ لمن يطلب العلم لغير الله ۱ / ۱۱۰.

ترجمہ: حضرت اُحوص بن حکیم اپنے والد (حکیم) سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شر کے متعلق سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھ سے (محض) شر کے بارے میں سوال نہ کرو، بلکہ خیر کے بارے میں سوال کرو، اور یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کہی، پھر آپ نے فرمایا کہ (سنو!) برے لوگوں میں سب سے برے لوگ برے علماء ہیں اور اچھے لوگوں میں سب سے اچھے لوگ اچھے علماء ہیں۔ (دارمی)

تشریحِ حدیث

احوال احوص:

یہ تابعی ہیں اور ان کے والد صحابی ہیں، لیکن ''الاکمال'' میں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

بدترین علماء اور بہترین علماء:

لاتسئلونی عن الشر: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمت بنا کر بھیجے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ مظہر جلال بھی تھے لیکن آپ پر جمال کا غلبہ تھا لہٰذا اگر محض شر کے متعلق سوال ہوتا رہے تو غلبہ جلال کا واہمہ ہوتا حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف تھا، اس لئے ضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض شر کے بارے میں سوال سے منع فرمایا، مقصد یہ ہے کہ یا محض خیر کے متعلق سوال کرو، یا خیر وشر دونوں کے بارے میں پوچھو۔

إن شر الشر شرار العلماء: لفظ شر کبھی اسم تفضیل کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور کبھی اسم فاعل کے معنیٰ میں، یہاں اول لفظ اسم تفضیل کے معنیٰ میں اور ثانی اسم فاعل کے معنی میں ہے، اسی طرح خیر کا حال ہے۔

علماء خیر کو سب سے بہتر اور علماء سوء کو سب سے برا قرار دینے کا سبب یہ ہے کہ علماء پر عالَم کے صلاح وفساد کا مدار ہوا کرتا ہے، عالَم میں اگر صلاح ہو تو اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں میں صلاح آئے گی، اسی طرح اس کے فساد سے عالَم میں فساد پیدا ہوگا، مقولہ مشہور ہے: ''**زَلَّةُ العالِم زلةُ العالَم**'' یعنی عالِم کی لغزش سے پورا عالَم غلط راہ پر چل پڑتا ہے، پس چونکہ عالِم کا صلاح وفساد متعدی ہوتا ہے، اسلئے آپ علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ حکم لگایا۔

۲۴۸ / ۷۱: وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ قَالَ: "إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللّٰهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ: عَالِمٌ لايَنْتَفِعُ بِعِلْمِهٖ"(رواه الدارمي)(۱)

ترجمه: حضرت ابوالدرداءؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ قیامت کے دن خدا کے نزدیک مرتبہ میں سب سے براوہ عالم ہے جس نے اپنے علم سے فائدہ نہیں اٹھایا۔(دارمی)

تشریح حدیث

اللہ کے نزدیک سب سے برا انسان:

یہ روایت موقوف ہے یعنی صحابی کا قول ہے، اس روایت میں عالم بے عمل کے لئے وعید ہے کہ وہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے برا شمار ہوگا اور جاہل سے بھی زیادہ عذاب میں گرفتار ہوگا جس کی وجہ اوپر کی حدیث میں بیان ہوچکی ہے۔

۲۴۹ / ۷۲: وَعَنْ زِيَادِ بنِ حُدَيْرٍ قَالَ: قَالَ لِيْ عُمَرُ: هَلْ تَعْرِفُ مَايَهْدِمُ الإِسْلَامَ؟ قَالَ: قُلْتُ: لا! قَالَ: يَهْدِمُهٗ زَلَّةُ الْعَالِمِ، وَجِدَالُ الْمُنَافِقِ بِالْكِتَابِ، وَحُكْمُ الأَئِمَّةِ الْمُضِلِّيْنَ.(رواه الدارمي)(۲)

ترجمه: حضرت زیاد بن حدیر سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: کہ حضرت عمرؓ نے مجھ سے فرمایا: کہ کیا تم جانتے ہو کہ اسلام کو ڈھانے والی کیا چیز ہے؟ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم! حضرت عمرؓ نے فرمایا: عالم کا پھسلنا، اور منافق کا کتاب اللہ میں جھگڑنا، اور گمراہ سرداروں کے فیصلے (اسلام کی عمارت کو تباہ کردیتے ہیں)(دارمی)

تشریح حدیث

احوال زیاد بن حدیر:

آپ تابعی ہیں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے روایات سنی ہیں، کثیر العبادۃ تھے۔(۳)

(۱) أخرجه الدارمي في المقدمة، باب العمل بالعلم وحسن النية فيه ۱ / ۸۷ الرقم ۲۷۶.

(۲) أخرجه الدارمي في المقدمة، ۱ / ۸۲ الرقم ۲۱۴.

(۳) المرقاة ۱ / ۴۷۹.

اسلام کونقصان پہنچانے والی تین چیزیں:

اس حدیث میں تین ایسی چیزیں بتائی گئیں جن سے دین کونقصان پہنچتا ہے اور گویا اسلام کی عمارت منہدم ہوجاتی ہے:

(۱)یھدمه زلة العالم :یعنی عالم کا اپنے علم کے مقتضی سے پھسل جانا بالخصوص امر بالمعروف اورنہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل ہوجانا کہ پھرلوگ اسلام کے ارکانِ خمسہ کوترک کردیں گے جس سے اسلام کی عمارت منہدم ہوجائے گی۔

(۲)وجدال المنافق بالکتاب : منافق سے مراد وہ شخص ہے جوحقیقۃً بدعتی ہولیکن اپنا متبعِ سنت ہوناظاہرکرے، لوگ ایسے شخص کوتبع سنت سمجھ کر اس سے مانوس ہوجاتے ہیں اوروہ اتباع سنت کے لبادہ میں اپنے عقائد باطلہ کو پیش کرتا ہے اوران عقائدکوکتاب اللہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے،عموماً فرق ضالہ اورگمراہ لوگ یہی طرز اپناتے ہیں اس سے لوگوں کے عقیدے خراب ہوتے ہیں اور یہ اسلام کا سب سے بڑانقصان ہے۔

(۳)وحکم الأئمة المضلین : اس سے مراد امراء اورحکام ہیں وہ غیرشرعی فیصلے صادرکرتے ہیں جس سے احکامِ اسلام ضائع ہوتے ہیں۔

۲۵۰ / ۷۳: وَعَنِ الْحَسَنِؒ قَالَ: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: فَعِلْمٌ فِي الْقَلْبِ فَذَاکَ الْعِلْمُ النَّافِعُ، وَعِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَاکَ حُجَّةُ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ عَلَى ابْنِ آدَمَ.(رواه الدارمي)(۱)

ترجمہ : حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں :علم کی دوقسمیں ہیں: ایک وہ علم جودل میں (پہنچتا) یہ علم تو نفع دیتاہے اوردوسرا وہ علم ہے جو(محض)زبان پرہوتاہے، یہ علم آدمی پراللہ عزوجل کی دلیل وحجت ہے۔(دارمی)

(۱)أخرجه الدارمي في سننه ، باب التوبيخ لمن يطلب العلم لغير الله ۱ / ۱۱۴ الرقم ۳۶۱.

تشریح حدیث

علم نافع اور علم غیر نافع:

یہ روایت مقطوع ہے کیونکہ حسن بصری تابعی ہیں اور جس روایت کی سند تابعی تک پہنچے وہ محدثین کی اصطلاح میں مقطوع کہلاتی ہے کمافی کتب الاصول، حسن بصریؒ نے علم کی تقسیم فرمائی کہ علم دو قسم کا ہے: ایک علم وہ ہے جس کا اثر قلب میں پہنچتا ہے، اس کی شناخت یہ ہے کہ یہ علم آدمی کو عمل پر برانگیختہ کرتا ہے یہ علم نافع ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم نافع کی دعا مانگی ہے: **اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْأَلُکَ عِلْماً نَافِعاً۔**

دوسری قسم علم کی وہ ہے جو قلب میں نہ اترے وہ محض زبان پر رہے، یہ علم آدمی کو عمل پر نہیں ابھارتا یہ بجائے نافع ہونے کے قیامت کے روز بندہ کے خلاف حجت بنے گا اور وبال جان ثابت ہوگا، ایسے علم سے حدیث میں پناہ طلب کی گئی ہے: **اللھم اَعوذُبک من علم لاینْفَعُ.**

٢٥١ / ٧٤: وَعَنْ أَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وِعَائَیْنِ؛ فَأَمَّا أَحَدُھُمَا فَبَثَثْتُہُ فِیْکُمْ، وَأَمَّا الآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُہُ قُطِعَ ھٰذَا الْبُلْعُوْمُ، یَعْنِيْ مَجْرَی الطَّعَامِ.(رواہ البخاري)[1]

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو برتن (یعنی دو طرح کے علم) یاد کئے ہیں: ان میں سے ایک کو میں نے تمہارے درمیان پھیلا دیا ہے، اور دوسرا علم وہ ہے اگر میں اس کو بیان کروں تو میرا یہ گلا کاٹ دیا جائے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

علم کی اور دو قسمیں:

اس حدیث میں بھی علم کی تقسیم ہے، حضرت ابوہریرہؓ فرمارہے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کا علم حاصل کیا ہے ان میں سے ایک قسم کو میں نے تمہارے سامنے بیان کردیا ہے دوسری قسم کا علم ایسا ہے کہ اگر میں اس کو لوگوں کے سامنے بیان کردوں تو لوگ مجھے مار ڈالیں اور میرا گلا کاٹ دیں۔

(١) أخرجه البخاري في العلم، باب حفظ العلم ١ / ٢٣ الرقم ١٢٠.

وعائین: وعاءٌ کا تثنیہ ہے بمعنی ظرف (برتن) مراد علم ہے، کیونکہ جس طرح ظرف اپنے مظروف کا احاطہ کئے ہوئے ہوتا ہے اسی طرح علم صاحب علم کا احاطہ کئے ہوتا ہے اوراس کا محافظ ہوتا ہے۔(۱)

یہاں روایت میں اول قسم سے مرادتو شریعت کا وہ علم ہے جس کا تعلق حلال وحرام اورعقائد سے ہے، ثانی قسم سے کونسا علم مراد ہے اس میں علماء کے کئی قول ہیں:

(۱)اس سے مراد تصوف کے اسرارودقائق کا علم ہے اورمطلب یہ ہے کہ تصوف کے اسرار ورموز کی تعبیر دقیق ہوتی ہے، عوام الناس ان کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وہ ان تعبیرات سے غلط معنی سمجھ لیتے ہیں اور بیان کرنے والے کو گمراہ خیال کرکے اس کو مارنے کے درپے ہوجاتے ہیں، اس لئے میں نے اس دوسری قسم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے گریز کیا۔

(۲) اس سے مراد منافقین کے اسماء ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کو منافقین کے نام بتادیئے تھے حضرت ابوہریرۃؓ اگر ان کو ظاہر کردیتے تو قتل کردیئے جاتے۔(۲)

(۳)اِس سے مراد علم فتن یعنی فتنوں کی تفصیلات اورظالم امراء کے نام اوران کے حالات ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب چیزیں حضرت ابوہریرۃؓ کو بتائی تھیں، حضرت ابوہریرۃؓ بسا اوقات اشارۃً اس کا تذکرہ فرماتے اور ایسے حالات سے محفوظ رہنے کی دعا فرماتے، ان سے یہ دعا منقول ہے: **اعوذ بالله من رأس الستين وإمارة الصبيان** یعنی اللہ سے پناہ مانگتا ہوں ۶۰ھ (کے فتنوں) سے اور بچوں کی امارت سے، اس میں یزید بن معاویہ اوران کے بعد کے امراء کی طرف اشارہ ہے۔

۶۰ھ کے کچھ احوال:

۶۰ھ میں یزید امیر بنا اوراس کے بعد معاویہ بن یزید، مروان وغیرہ امیر مقرر ہوئے، یہ سب نوجوان اورکم علم تھے، انہوں نے عموماً ناکردنی امورانجام دیئے اوران کے زمانہ میں بڑے فتنے رونما ہوئے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور کے فتنوں سے حضرت ابوہریرۃؓ کو آگاہ کردیا تھا، اگر وہ ان فتنوں سے لوگوں کو مطلع کرتے تو فتنہ پرداز لوگ ان کو مارڈالتے، البتہ یہ اس دور سے حفاظت کی دعاء مانگتے تھے، اللہ نے

(۱)المرقاة ۱/۴۷۹.

(۲)المرقاة ۱/۴۷۹.

انکی دعا قبول فرمائی اور اس دور کے آنے سے قبل ۵۹ھ میں اُن کی وفات ہوگئی۔ [1]

مذکورہ تین احتمالات میں سے دوسرے اور تیسرے احتمال کا حاصل ایک ہی ہے، اور راجح یہی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جو علم ظاہر نہیں کیا وہ منافق لوگوں کے نام اور ظالم حکمرانوں کے اعمال تھے، انہوں نے شرعی احکام کا کوئی حصہ چھپا لیا ہو ایسا نہیں، کیونکہ اس کی اجازت نہیں، جیسا کہ اس بارے میں کتمان علم پر وعید کی حدیث خود انہوں نے روایت کی ہے۔ [2]

۲۵۲ / ۷۵: وَعَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: يٰاَيُّهَاالنَّاسُ! مَنْ عَلِمَ شَيْئاً فَلْيَقُلْ بِهٖ، وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ، فَإِنَّ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ تَقُوْلَ لِمَا لاتَعْلَمُ: اَللّٰهُ اَعْلَمُ، قَالَ اللّٰهُ تَعالىٰ لِنَبِيِّهٖ: "قُلْ مَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَاأَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" (متفق عليه) [3]

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: اے لوگو! جو شخص کسی بات کو جانتا ہو تو چاہئے کہ اس کو بیان کرے، اور جو نہ جانتا ہو تو اسے چاہئے کہ کہے "اللہ زیادہ جانتا ہے"، اس لیے کہ جس چیز کا اسے علم نہیں ہے اس کے بارے میں اللہ زیادہ جانتا ہے کہنا بھی علم کی ایک قسم ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا: "قُلْ مَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَاأَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ" (سورہ ص ۸۶)

یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ فرمادیجئے کہ میں اس قرآن پر تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ (بخاری ومسلم)

تشریح حدیث

لاعلمی کا اعتراف بھی علم کا حصہ:

یہ روایت موقوف ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اہل علم کو نصیحت فرمائی جس کا حاصل یہ کہ بے شک تبلیغ علم فضیلت وثواب کی چیز ہے، لیکن جو بات تحقیق سے معلوم ہو اسی کو بیان کیا جائے اور جو بات معلوم نہ ہو

(۱) المرقاة ۱ / ۴۷۹.

(۲) أخرجه البخاري في التفسير، باب قوله: ومآانا من المتكلفين ۲ / ۷۱۰ الرقم ۴۸۰۹ و۲ / ۷۱۴ الرقم ۴۸۲۲ ومسلم في كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب صفة القيامة والجنة والنار ۲ / ۳۷۳و۳۷۳.

(۳) فتح الباري ۱ / ۱۷۵، عمدة القاري ۲ / ۲۸۷.

اس کے متعلق کہہ دینا چاہئے کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے، بلاعلم جواب دینے کے لئے تکلف کرکے تاویل نہیں کرنی چاہئے، یہ اہل علم کی شان نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: ''قُلْ مَاأَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَّمَاأَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ''، اور اپنی لاعلمی کا اقرار بھی ایک قسم کا علم ہے، کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو معلوم ومجہول کے درمیان تمیز حاصل ہے اور یہ تمیز بھی ایک علم ہے، اگر معلوم ومجہول کے درمیان تمیز نہ ہوتو یہ جہل مرکب ہے کہ نہ اصل بات کا علم ہے اور نہ لاعلمی کا احساس ہے، اور اپنے سے علم کی نفی کرنے میں شرم نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ انسان کی جہالت اس کے علم سے زیادہ ہے: ''وَمَاأُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّاقَلِيْلاً''

واقعہ حضرت علیؓ

ایک مرتبہ حضرت علیؓ منبر پر خطبہ دے رہے تھے ایک شخص نے کسی چیز کے متعلق سوال کیا، حضرت علیؓ کو وہ بات معلوم نہ تھی تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی اس پر سائل نے کہا: جب آپ کو علم نہیں پھر منبر پر کیوں چڑھے ہو؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: میں اپنے علم کے بقدر (چند سیڑھیوں پر) چڑھا ہوں اگر اپنی جہالت کے تناسب سے اوپر کی طرف چڑھتا تو آسمان پر پہنچ جاتا (کیونکہ انسان کی جہالت اس کے علم سے زیادہ ہے)(۱)

۲۵۳ / ۷۶: وَعَنْ ابنِ سِيْرِيْنَ قَالَ: إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ؛فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ. (رواه مسلم)(۲)

ترجمه: اور ابن سیرین سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: یہ علم؛ دین ہے، لہٰذا (جب تم اس کو حاصل کرو تو) یہ دیکھ لو کہ اپنا دین کس سے حاصل کررہے ہو۔ (مسلم)

تشریح حدیث

احوال ابن سیرینؒ:

نام محمد ہے، والد کا نام سیرین ہے، حضرت انس کے غلام تھے، غلامی سے آزاد ہوئے تو بڑے عالم بنے

(۱) ذكره الزمخشري فى ربيع الأبرار، كمافى المرقاة ۱ / ۴۷۹.

(۲) أخرجه مسلم فى المقدمة ۱ / ۱۱.

اور کبار تابعین میں شمار ہوئے، تعبیر رؤیا کا بڑا ملکہ اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا لفظِ ''سیرین'' علمیت اور یاء نون زائدتان کی وجہ سے غیر منصرف ہے، ابوعلی نحوی کے نزدیک علمیت کے ساتھ یاء نون زائدتان کی وجہ سے بھی کلمہ غیر منصرف ہوجاتا ہے، الف نون ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔(۱)

مستند لوگوں سے حصول علم کی تاکید و تلقین:

یہ روایت مقطوع ہے کیونکہ تابعی کا قول ہے، اوراسمیں معتبر ومستند لوگوں سے ہی علم دین حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

فانظروا عمن تأخذون دينكم: یعنی اس پر غور کرلیا کرو کہ وہ شخص عادل وثقہ ہے یانہیں؟ اس کے عقائد واعمال درست ہیں یانہیں؟ پس اس بارے میں جو شخص قابلِ اعتماد ہو اسی سے علم حاصل کرو۔

ایک تعارض کا دفعیہ:

لیکن علماء کے مابین ایک مقولہ مشہور ہے:'' انظر إلى ماقال ولاتنظر الى من قال '' یہ مقولہ بظاہر ابن سیرین کی روایت کے خلاف ہے کیونکہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ علم کی بات کسی بھی شخص سے حاصل کی جاسکتی ہے؟ لیکن غور سے کام لیا جائے تو دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے اس لئے کہ ابن سیرین کی روایت کا مقصد یہ ہے کہ عادل وثقہ شخص سے ہی علم حاصل کرنا چاہئے اور مقولۂ مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ عادل وثقہ ہے اوراس کا عقیدہ صحیح ہے لیکن معاشرہ میں کم درجے کا شمار ہوتا ہے تو اس سے بھی علم حاصل کرو، اس سے علم حاصل کرنے میں عار محسوس نہ کرو، اسی کے لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی کہ یہ دیکھو کہنے والا کیا کہہ رہا ہے؟ اس کی بات کتنی قیمتی ہے؟ اس پر نظر نہ کرو کہ وہ کون ہے معاشرہ میں اس کا درجہ کم ہے یا زیادہ۔

۲۵۴ / ۷۷: وَعَنْ حُذَيْفَةَ قَالَ: يَامَعْشَرَ الْقُرَّاءِ! اِسْتَقِيمُوا، فَقَدْ سَبَقْتُمْ سَبْقاً بَعِيْداً، وَإِنْ أَخَذْتُمْ يَمِيناً وَشِمَالاً لَقَدْ ضَلَلْتُمْ ضَلا لاًبَعِيْداً. (رواه البخاري)(۲)

(۱) المرقاة ۱ / ۴۸۰.

(۲) أخرجه البخاري في الاعتصام، باب الاقتداء بسنن رسول الله صلى الله عليه وسلم وقول الله تعالىٰ واجعلنا للمتقين إماماً ۲ / ۱۰۸۱ الرقم ۷۲۸۲.

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: اے قاریوں کی جماعت سیدھے رہو، اس لیے کہ تم سبقت لے گئے ہو بڑی سبقت، اور اگر تم دائیں بائیں مڑ گئے تو بڑی گمراہی میں پڑ جاؤ گے۔ (بخاری)

تشریح حدیث

احوال حذیفہؓ:

آپ جلیل القدر صحابی ہیں، حذیفہ بن الیمان العبسی پورا نام ہے، ان کے والد کا اصل نام ''حِسْل'' ہے ''یمانیہ'' سے محالفت کی وجہ سے ''یمان'' کے نام سے مشہور ہو گئے، بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ اس وعدہ پر اہل مکہ نے ان کو ہجرت کی اجازت دی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منافقین کے اسماء اور آئندہ ہونے والے فتنوں واختلافات کے بارے میں بتا دیا تھا، اس لئے ''صاحب السر'' کے لقب سے نوازے گئے، حضرت علیؓ کے دور خلافت میں شہید ہوئے، اور کبار صحابہ میں سے ہیں۔[1]

اہل علم کو صحیح راہ پر استقامت کی تاکید:

اس حدیث میں حضرت حذیفہؓ نے اہل علم کو علم کے تقاضہ پر عمل کرنے کی نصیحت فرمائی اور گمراہیوں میں پڑنے سے منع فرمایا۔

استقیموا: یعنی عقائد صحیحہ، اعمال صالحہ اور علم نافع پر استقامت اختیار کرو۔

یامعشر القراء: ''قراء'' سے مراد علماء ہیں، کیونکہ اس زمانہ میں علماء کو عموماً ''قراء'' سے تعبیر کیا جاتا تھا اور اس خطاب میں دو احتمال ہیں:

(۱) یہ خطاب صغار صحابہ کو ہے، اسوقت ''سبقتم'' صیغۂ معروف ہوگا یعنی تم نے اسلام کے اول زمانے کو پایا ہے اس لئے تم سبقت لے گئے ہو، لہٰذا تمہیں استقامت ومداومت اختیار کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ پھر بعد والے بھی صحیح راستے پر رہیں گے اور ان کا ثواب تمہیں بھی ملے گا، بعض شراح نے صیغہ معروف کو ہی راجح کہا ہے۔

---

(۱) الإصابة ۱/ ٤٧٦–٤٧٧.

(۲)دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ خطاب تابعین کو ہو، اس صورت میں ''سبقتم'' کو مجہول پڑھا جائے گا یعنی تم سے پہلے ایک بڑی سبقت لی جاچکی ہے یعنی اہل استقامت تم سے پہلے گزر چکے ہیں، لہٰذا ان سے عبرت حاصل کرو اور ان کی اتباع کرو۔[1]

وإن أخذتم يمينا وشمالا: اس سے مراد اعمال وعقائد کا خراب کرلینا اور استقامت اختیار نہ کرنا ہے کہ ایسی صورت میں تم بھی گمراہ ہوگے اور بعد والے بھی تمہاری وجہ سے گمراہ ہوں گے اور ان کا گناہ تم پر ہوگا۔

۲۵۵ / ۷۸: وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "تَعَوَّذُوا بِاللّٰهِ مِنْ جُبِّ الْحُزْنِ" قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَاجُبُّ الْحُزْنِ؟ قَالَ: "وَادٍ فِيْ جَهَنَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْهُ جهنّمُ كُلَّ يَوْمٍ أَرْبَعَ مِائَةِ مَرَّةً" قِيْلَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَنْ يَدْخُلُهَا؟ قَالَ: اَلْقُرَّاءُ الْمُرَاؤُوْنَ بِأَعْمَالِهِمْ" (رواه الترمذی و كذا ابن ماجه)[2]

وَزَادَ فِيْهِ: "وَإِنَّ مِنْ أَبْغَضِ الْقُرَّاءِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالىٰ اَلَّذِيْنَ يَزُوْرُوْنَ الْأُمَرَاءَ" قَالَ الْمُحَارِبِيُّ: يَعْنِي الْجَوَرَةَ:

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم اللہ سے پناہ مانگو ''جب الحزن'' سے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جُبُّ الحُزْن (غم کا کنواں) کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: وہ جہنم کی ایک وادی ہے جس سے دوزخ (بھی) دن میں چارسومرتبہ پناہ مانگتی ہے، صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: وہ قرآن پڑھنے والے جو اپنے اعمال کو دکھاوے کے لئے کرتے تھے۔(ترمذی، ابن ماجہ)

اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ زیادتی ہے کہ: اللہ کے نزدیک مبغوض ترین وہ قاری ہیں جو امراء سے ملاقات کرتے ہیں، محاربی نے فرمایا کہ: امراء سے مراد ظالم امراء ہیں۔

(۱)المرقاة ۱ / ۴۸۱.

(۲)رواه الترمذي في سننه: أبواب الزهد، باب ماجاء في الرياء والسمعة، برقم: ۲۳۸۳، وابن ماجه: أبواب الإيمان، باب الانتفاع بالعلم والعمل به، برقم: ۲۵۶.

تشریح حدیث

ریاکاراورخوشامدی علماء کے لئے سخت وعید:

اس حدیث میں ان قراء وعلماء کے لئے وعید ہے جواپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں اورامراء کی تملق وچاپلوسی کرتے ہیں،تاکہ وہ اِس حقیر دنیا کے سیم وزرکوجمع کرلیں اورانھیں دنیا کے منصب اور عہدے حاصل ہوجائیں، ایسے لوگوں کے لئے جہنم میں ایسی وادی ہے کہ خود جہنم بھی اس وادی سے روزانہ چارسو مرتبہ پناہ طلب کرتی ہے۔

جُب الحزن: جُبٌّ: بمعنی کنواں اور''الحزن'' بمعنی غم،یعنی غم کا کنواں، جہاں غم ہی غم ہےخوشی نام کی کوئی چیزنہیں ہے۔[1]

یتعوذ منه جهنم: سوال: جہنم توغیرذوی العقول ہے پھراس کی طرف پناہ طلب کرنے کی نسبت کیوں کرصحیح ہے؟ اس کے کئی جواب ہیں:

(۱)یہ تمثیل کے طورپرہے کہ اگرجہنم انسان ہوتی تووہ اس وادی سے پناہ طلب کرتی۔

(۲)بعض نے کہاکہ: یہاں جہنم سے اہل جہنم مراد ہیں۔

(۳)بعض نے کہا: اس سے جہنم کے فرشتے مراد ہیں جن کو''زبانیہ'' کہاجاتاہے۔

(۴)بعض نے کہاکہ یہ حقیقت پرمحمول ہے اوراللہ نے جہنم کوعقل وادراک دیاہے،قرآن کریم میں حق تعالیٰ کا جہنم کوخطاب کرنا اورجہنم کا جواب دینا وارد ہے، جواس کی دلیل ہے، اللہ کا پاک ارشاد ہے: ''یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلأتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْد''[2]

اربع مائة مرة: اس عدد کی وجہ کے سلسلہ میں علماء کےمختلف اقوال ہیں:

(۱)بعض نے کہااس عدد کی وجہ ہمیں معلوم نہیں۔

(۲)بعض نے کہاکہ اس سے کثرت مراد ہےتحدید مرادنہیں۔

(۳)بعض نے کہاکہ اس وادی کے چارکونے ہیں اورجہنم اس کے ہرکونے سے سومرتبہ پناہ طلب

---

(۱)شرح الطیبی ۱/ ٤٦٢.

(۲)ق: ۳۰.

کرتی ہے۔(۱)

القراؤون المراؤن باعمالهم : یہاں بھی ''قراء'' سے مراد علماء ہیں، اور ''المراؤن'' ارائۃ سے اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے، بمعنی دکھلاوا کرنے والے، ریاکاری کرنے والے۔

وان من أبغض القراء : ابن ماجہ میں اسی حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ سب سے مبغوض علماء اللہ کے نزدیک امراء وحکام کی زیارت کرنے والے ہیں، اس کی سند میں ایک راوی ''محاربی'' ہیں انہوں نے فرمایا ہے کہ یہاں ''امراء'' سے ظالم بادشاہ مراد ہیں، لہذا جو علماء ظالم بادشاہوں سے تعلقات رکھیں اور ان کے ظلم پر نکیر نہ کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں تو وہ مبغوض ہیں، جس کی وجہ ظاہر ہے، اسی طرح اگر امراء وحکام سے ملاقات مال وجاہ کے قصد سے ہو تو یہ بھی ممنوع ہے، البتہ ضرورت کے وقت کی ملاقات اس میں شامل نہیں، اس کی اجازت ہے اور بادشاہ اگر منصف وعادل ہے تو اس کی زیارت اور ملاقات تو عبادت ہے۔

٢٥٦ / ٧٩: وَعَنْ عَلِيٍّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''يُوْشِكُ أَنْ يَّأْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ، لايَبْقٰى مِنَ الإِسْلامِ إِلَّا اِسْمُهٗ وَلايَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهٗ، مَسَاجِدُهُم عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَىٰ، عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ أَدِيْمِ السَّمَاءِ، مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ، وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ'' (رواه البيهقي في شعب الإيمان)(۲)

ترجمہ: حضرت علیؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عنقریب لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا، کہ اسلام میں سے صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا، اور قرآن میں سے صرف اس کے نقوش باقی رہیں گے، ان کی مسجدیں تو آباد ہونگی مگر ہدایت سے خالی ہونگی، ان کے علماء آسمان کے نیچے کی مخلوق میں سب سے برے ہوں گے، ان ہی میں سے فتنہ نکلے گا اور ان ہی میں لوٹ جائے گا۔ (بیہقی)

تشریح حدیث

اسلام کی روح نکل جانے اور علماء اسلام میں خرابی پیدا ہو جانے کی پیش گوئی:

اس حدیث میں قرب قیامت میں دین کے کمزور ہو جانے کی پیش گوئی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ

(۱) المرقاة ١ / ٤٨٢.

(۲) أخرجه البيهقي في شعب الايمان ٢ / ٣١١ الرقم ١٩٠٨.

ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اعمالِ اسلام کی صرف صورت باقی رہ جائے گی ان کی روح ختم ہوجائے گی، اس وقت کے علماء میں بیشتر ایسے ہونگے جوخود بھی فتنہ میں پڑنے والے اوردوسروں کوبھی فتنہ میں ڈالنے والے ہونگے۔

لایبقی من الإسلام الااسمه: یہاں اسلام سے مرادشعائر اسلام ہیں جیسے نماز،روزہ وغیرہ یہ بظاہرنظرآئیں گےمگران کی روح ختم ہوجائے گی کہ نماز سے خشوع، روزوں سے تقوی اورحج سے عشق الہی ختم ہوجائے گا،کمال اسلام باقی نہیں رہے گا۔(۱)

ولایبقی من القرآن الارسمه: ''رسم'' بمعنی ظاہر،اس سے مرادقرآن کے الفاظ ہیں کہ لوگ الفاظ کی طرف زیادہ توجہ دیں گے اورمعانی میں غوروفکرنہیں کریں گے اوراحکام کا اتباع نہیں کریں گے، حالانکہ اصل مقصودتو تدبراورعمل ہے۔(۲)

مساجدهم عامرة وهي خراب: ''عامر'' بمعنی آباداور''خراب'' بمعنی ویران،یعنی مسجدوں میں نقش ونگارخوب ہوگا لیکن ان کوآبادکرنے والے کم ہونگے، نمازی کم ہوں گے، یانمازی توہونگے لیکن اخلاص سے خالی ہوں گے۔(۳)

علماء هم شر من تحت اديم السماء: ''أديم السماء'' یعنی آسمان کی نچلی سطح، یہ علماءفتنہ پرداز ہونگے اپنے مفاد کی خاطرلوگوں کو برانگیختہ کریں گے، پھروہی لوگ کسی بات پران کے مخالف ہوکر انھیں کے خلاف جدوجہدکریں گے، اسی اعتبار سے ایسے علماء کومخلوق میں سب سے براکہا۔(۴)

من عندهم تخرج الفتنة: یعنی علماء اپنے مفاد کے لئے فتنہ پردازلوگوں کومیدان میں اتاریں گے۔

وفيهم تعود: وہ فتین لوگ کسی بات پرناراض ہوکران علماء کے خلاف جدوجہدکریں گے اس لحاظ سے گویافتنہ انھیں میں لوٹ گیا۔(۵)

---

(۱)المرقاة ۱/۴۸۳.

(۲)المرقاة ۱/۴۸۳.

(۳)المرقاة ۱/۴۸۳.

(۴)شرح الطيبي ۱/۴۶۳.

(۵)شرح الطيبي ۱/۴۶۳.

۲۵۷ / ۸۰: وَعَنْ زِيَادِ بنِ لَبِيْدٍؓ قَالَ: ذَكَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئاً ،فَقَالَ: "ذَاكَ عِنْدَ أَوَانِ ذَهَابِ الْعِلْمِ" قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ يَذْهَبُ الْعِلْمُ وَنَحْنُ نَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَنُقْرِئُهُ أَبْنَاءَ نَا ، وَيُقْرِؤُهُ أَبْنَاؤُنَا أَبْنَاءَ هُمْ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ؟ فَقَالَ: "ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ زِيَادُ! إِنْ كُنْتُ لأَرَاكَ مِنْ أَفْقَهِ رَجُلٍ بِالْمَدِيْنَةِ! أَوَلَيْسَ هٰذِهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى يَقْرَؤُوْنَ التَّوْرَاةَ وَالإِنْجِيْلَ لايَعْمَلُوْنَ بِشَيْءٍ مِمَّا فِيْهِمَا؟ !" (رواه أحمد وابن ماجه، وروى الترمذي عنه نحوه[1] وكذا الدارمي عن أبي أمامة). [2]

ترجمہ : اور حضرت زیاد بن لبیدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی (خوف ناک) چیز کا ذکر فرمایا، پھر فرمایا: کہ یہ اس وقت ہوگا جبکہ علم جاتا رہے گا، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ! علم کس طرح جاتا رہے گا؟ حالانکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں، اور اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے، اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زیاد! تمہیں تمہاری ماں گم کرے! میں تو تم کو مدینہ کے لوگوں میں بڑا سمجھ دار سمجھتا تھا، کیا یہ یہود ونصاری توریت اور انجیل کو نہیں پڑھتے لیکن ان کی کتابوں میں جو کچھ ہے اس میں سے وہ کسی چیز پر عمل نہیں کرتے۔ (احمد، ابن ماجہ، اور اسی جیسی روایت ترمذی نے زیاد سے روایت کی ہے اور امام دارمی نے اسی کے ہم معنی حدیث ابوامامہ کے واسطہ سے نقل فرمائی ہے)

تشریح حدیث

احوال زیاد بن لبید:

آپ انصاری صحابی ہیں، مدینہ کے مشہور عقلمندوں میں تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ تشریف لانے سے پہلے حضرت زیاد مسلمان ہوگئے تھے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہنے کے مقصد سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ پہنچ گئے اور پھر جب تمام مسلمانوں کے لئے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف

(۱) أخرجه الترمذی فی العلم، باب ماجاء فی ذهاب العلم ۲ / ۹۴ وابن ماجه فی الفتن، باب ذهاب القرآن والعلم ۲ / ۲۹۳ واحمد ۴ / ۱۶۰ الرقم ۱۷۵۰۷ و ۴ / ۲۱۸ الرقم ۱۷۹۴۸.

(۲) أخرجه الدارمي في المقدمة ۱ / ۸۲ (۲۴۴)

ہجرت کا حکم نازل ہوا اور مسلمان ہجرت کرنے لگے تو زیاد بن لبید بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آ گئے، اسی لئے وہ مہاجر انصاری کہلاتے تھے، حضرات محدثین کے یہاں یہ ایک چیستاں بھی ہے کہ ایسے کونسے صحابی ہیں جو انصاری ہونے کے ساتھ مہاجر بھی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ زیاد بن لبید ہیں۔[1]

علم کیسے اٹھے گا:

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ علماء کو چاہئے کہ اپنے علم کے مقتضی پر عمل کریں اور قرآن میں تدبر کریں ورنہ خطرات لاحق ہوں گے، آفات وبلیات پیش آئیں گی، حدیث شریف کے پہلے جملہ **ذكر النبي صلى الله عليه وسلم شيئا** کی شرح ملا علی قاری نے اس طرح فرمائی **شيئاً أي هائلا** یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خوفناک چیز کا تذکرہ فرمایا اور فرمایا کہ یہ اس وقت ہوگا جب علم اٹھ جائے گا۔

ثكلتك أمك : تیری ماں تجھے گم کرے، یہ جملہ موت کی بددعا کے لئے استعمال ہوتا تھا پھر اظہار تعجب کے طور پر استعمال ہونے لگا، معنی یہ ہیں کہ تم سمجھدار ہوتے ہوئے ناسمجھی کی بات کر رہے ہو! یہود ونصاریٰ بھی تو توریت وانجیل پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے، اس لئے اللہ نے ان کو جاہل بلکہ اس گدھے کی مانند کہا ہے جو اپنے اوپر بوجھ لادے ہوئے ہو، اِس تنبیہ کا حاصل یہ ہوا کہ محض الفاظ کے پڑھنے پڑھانے کا نام علم نہیں، بلکہ حقیقی علم وہ ہے جس پر عمل کیا جائے، جب علم پر عمل نہیں ہوگا تو کہا جائے گا کہ علم اٹھ چکا ہے۔

۲۵۸ / ۸۲ : وَعَنْ اِبنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ لِي رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "تَعَلَّمُوْا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ، تَعَلَّمُوْا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْهَا النَّاسَ، تَعَلَّمُوْا الْقُرْآنَ وَعَلِّمُوْهُ النَّاسَ؛ فَإِنِّي اِمْرُؤٌ مَقْبُوْضٌ، وَالْعِلْمُ سَيُنْقَبِضُ، وَيَظْهَرُ الْفِتَنُ حَتّٰى يَخْتَلِفَ اِثْنَانِ فِي فَرِيْضَةٍ لَايَجِدَانِ أَحَداً يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا" (رواه الدارمي، والدارقطني)[2]

ترجمه : حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: علم کو سیکھو اور سکھاؤ، اور فرائض سیکھو اور اس کو لوگوں کو سکھاؤ، قرآن کو سیکھو اور

(۱) الإصابه ۲ / ۲۳٤ / — ۲۳٥.

(۲) أخرجه الدارمي في المقدمة ۱ / ۸۷ الرقم ۲۲٥ والدارقطني في الفرائض والسير وغيرذلک ٤ / ٤٦ الرقم ٤۰٥۹.

لوگوں کوسکھاؤ، اس لیے کہ میں ایک شخص ہوں جواٹھالیا جاؤں گا اورعلم بھی اٹھ جائے گا اور فتنے ظاہر ہونگے یہاں تک کہ دوشخص ایک فرض کے بارے میں اختلاف کریں گے اورکسی کو ایسا نہ پائیں گے جوان دونوں کے درمیان فیصلہ کرے۔(دارمی، دارقطنی)

تشریح حدیث

علم کے اٹھ جانے سے قبل اس کے حصول کی تاکید:

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم حاصل کرنے کی ترغیب دی بالخصوص قرآن اورفرائض کے اہتمام کا حکم دیا، حدیث کا حاصل یہ ہے کہ علم دین خود بھی سیکھو لوگوں کو بھی سکھاؤ قرآن اورفرائض کے علم کا خوب اہتمام کرو میری حیات کوغنیمت جانو کیونکہ میں دنیامیں ہمیشہ نہیں رہونگا وحی کے ذریعہ علم آنے کا جوسلسلہ ہے وہ عنقریب ختم ہوجائے گا اس لئے مجھ سے خوب علم حاصل کرلو، ایک وقت آئے گا کہ علم اٹھ جائے گا اورجب علم نہیں ہوتا تو فتنے پیدا ہوتے ہیں۔

قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: عبداللہ بن مسعودؓ کو خطاب کیا، یاتو اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت وہی تھے کوئی اور نہ تھا، یادیگر لوگ بھی موجود تھے لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود کے اندرفہم وفقاہت زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کوخطاب کیا، البتہ مراد عام لوگ ہیں۔

حتی یختلف اثنان فی فریضة: ''فریضہ'' سے کیا مراد ہے؟ اس میں دوقول ہیں:

(۱)مطلق فرائض اسلام مراد ہیں۔

(۲)علم الفرائض مراد ہے۔[۱]

مطلب یہ ہوا کہ علم کی قلت اورفتنوں کی کثرت کی وجہ سے اسلامی فرائض اورمیراث کے مسائل بتانے والا کوئی نہیں ملے گا۔

۲۵۹ / ۸۳: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَثَلُ عِلْمٍ لايُنْتَفَعُ بِهِ كَمَثَلِ كَنْزٍ لايُنْفَقُ مِنْهُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ.(رواه أحمدوالدارمي)[۲]

(۱)المرقاة ۱ / ۴۸۵.

(۲)أخرجه الدارمي في المقدمة، باب البلاغ عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وتعليم السنن ۱ / ۱۴۵ الرقم ۵۶۲ وأحمد في مسنده ۲ / ۴۹۹ الرقم ۱۰۴۸۱.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس علم کی مثال جس سے نفع نہ اٹھایا جائے اس خزانہ کی طرح ہے جس سے خدا کی راہ میں کچھ خرچ نہ کیا جائے۔ (احمد، دارمی)

تشریح حدیث

جس علم سے نفع نہ اٹھایا جائے اس کی مثال:

اس حدیث میں علم کے واجب حقوق کو ادا نہ کرنے پر وعید کا بیان ہے، حدیث کا ماحصل یہ ہے کہ اپنے علم کے مقتضی پر عمل کرنا چاہئے اور دوسروں کو سکھانا بھی چاہئے، یہ علم کے حقوق واجبہ ہیں، علم کے حقوق واجبہ کو ادا نہ کیا جائے تو وہ علم آدمی کے لئے وبال جان بنتا ہے، جیسے مال اور خزانہ کہ وہ اس لئے ہے تا کہ بندہ اسے اپنے اوپر بھی خرچ کرے اور اللہ کی راہ میں بھی خرچ کرے یہ مال کے واجب حقوق ہیں، اگر مال کے ان حقوق واجبہ کو ادا نہ کیا جائے تو وہ مال بھی صاحب مال کے لئے وبال جان بنے گا، جیسا کہ اللہ کا پاک ارشاد ہے: ''وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَایُنفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ''(۱)

یعنی اور جو لوگ سونا اور چاندی خزانہ بنا کر رکھتے ہیں اور اسے خرچ نہیں کرتے اللہ کے راستہ میں تو آپ انھیں بشارت سنا دیجئے دردناک عذاب کی جس دن جہنم کی آگ میں اسے گرم کیا جائے گا پھر اس کے ذریعہ ان کی پیشانی اور ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) کہ یہ وہ ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا تو اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

تم المجلد الاول من هذا الشرح

والحمد لله الذی تتم بنعمته الصالحات.

---

(۱) التوبہ: ۳٤–۳۵.